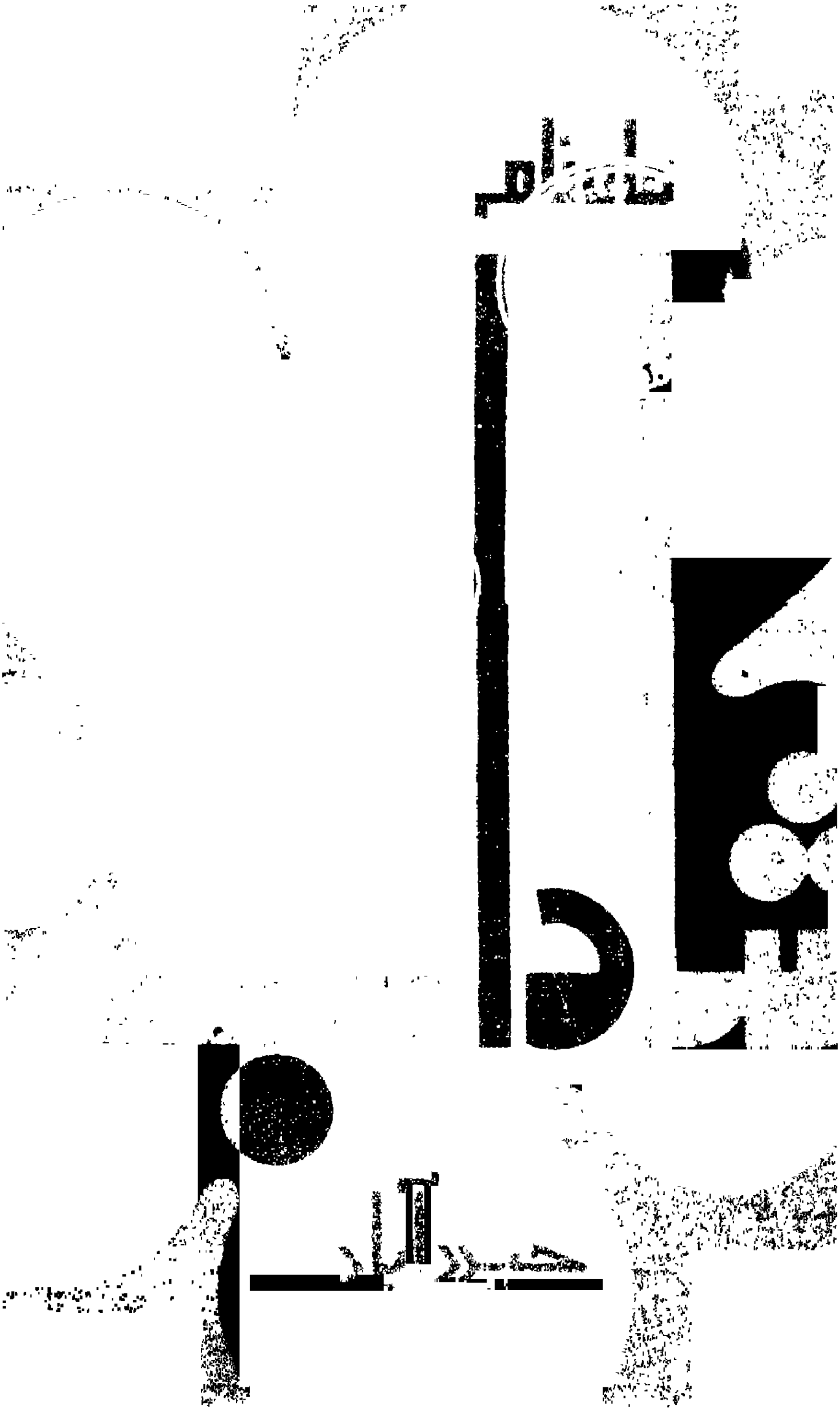


جلد ۴۲ شمارہ ۱
جنوری ۱۹۹۰

ماہنامہ شاداب

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری
مینجنگ ایڈیٹر: محمد کلیم الدین احسن

زرِ تعاون:

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ: 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ: 90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات 1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیلِ زر کا پتہ:
147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر
[illegible] ریڈ ہلز حیدرآباد [illegible] سے شائع کیا

حرفِ اوّل

"**شاداب**" اپنی زندگی کے تین سال پورے کرکے چوتھے سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ شاداب نے اپنے مقصد اشاعت میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اس کا تصفیہ تو شاداب کے قارئین ہی کریں گے۔ لیکن ہم اس کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ "شاداب" نہ کسی خاص جماعت کا نقیب ہے نہ کسی مخصوص مکتب فکر کا ترجمان۔ یہ زندگی کی صحت مند، تعمیری اور اعلیٰ قدروں کا حامل ہے۔

اردو کی خدمت "شاداب" کا اولین اور بنیادی مقصد ہے، اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی پلی بڑھی اور آج ایک بین الاقوامی زبان بن گئی ہے، "شاداب" اردو کی بقا و ترقی میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہے، ایک اردو جریدہ کے لئے ہر ماہ بلا ناغہ اور وقت پر شائع ہونا اپنی آپ مثال ہے۔ واقف کار قارئین جانتے ہیں ایسا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

اپنی تین سالہ زندگی میں شاداب نے پانچ خاص نمبر شائع کئے۔ سب سے پہلا خصوصی نمبر جولائی ۸۵ء میں "قومی ایک جہتی نمبر" شائع کیا گیا جس میں بتایا گیا ہے کہ سیکولرزم، لامذہبیت بدمذہبیت یا ناخدا ترسی کا نام نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ اپنے مذہب کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی "سیکولر" ہوگا۔ دوسرا خاص نمبر خواتین کے اقوام متحدہ دہے ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۵ء کے پیش نظر نومبر ۸۵ء میں خواتین نمبر پیش کیا گیا جس میں عورتوں کی فلاح و بہبود میں دنیا بھر میں جو کیا گیا اس کا ذکر ہے، نیز اسلام میں عورتوں کو جو حقوق دئیے گئے ہیں ان کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، اس کے فوری بعد نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کے اختتام کے پیش نظر دسمبر ۸۵ء میں نوجوانوں کا خصوصی نمبر پیش کیا گیا جس میں نوجوانوں کے مسائل خصوصاً تعلیم و تربیت کے بارے میں خاص مضامین شریک کئے گئے ہیں۔ نوجوان ہمارے ملک و ملت کا سرمایہ ہیں، ان کی تربیت و ترقی کا سامان کرنا ہمارا فرض ہے، اسی لئے شاداب کے تقریباً ہر شمارہ کے بیشتر مضامین میں ان ہی سے خطاب ہوتا ہے۔

شاداب کا ایک خصوصی نمبر جس پر ہمیں فخر ہے خواجہ حمید الدین شاہد اور اعجاز حسین کھٹا نمبر ہے، جو دونوں دکن کے سپوت ہیں اور اردو کے سپاہی، پاکستان منتقل ہوئے اور ایک مدت کے بعد
[illegible]

کیا جو بقول ڈاکٹر حسن الدین احمد اپنی نوعیت کا پہلا خاص نمبر ہے جو پاکستانی ادیبوں کے خیر مقدم کے طور پر ہندوستان سے یا ہندوستانی ادیبوں کے خیر مقدم میں پاکستان سے شائع کیا گیا۔

شاداب کا ایک قابلِ فخر نمبر سنہ ۸۶ء کا اقبال نمبر ہے جو اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے عالمی اقبال سمینار منعقدہ ۱۸ اپریل تا ۲۱ اپریل ۸۶ء کے موقع پر بہت ہی کم وقت میں مرتب کر کے پیش کیا گیا۔ لیکن اپنے مندرجات کے اعتبار سے پھر بھی منفرد ہے اور یقین ہے کہ اقبال شناسی میں نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔

ان خصوصی نمبروں سے قطع نظر "شاداب" کے ہر ماہانہ شمارہ میں ایسی تخلیقات شریک ہوتی ہیں جو "ادب برائے ادب" نہیں بلکہ "ادب برائے زندگی" کی ترجمان ہوتی ہیں۔ افادہ اور استفادہ کے ساتھ ساتھ قارئین کی دلبستگی بھی پیش نظر ہوتی ہے۔

قارئین سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تاثرات کے ساتھ یہ بھی بتائیں کہ وہ "شاداب" کو کیسے پسند کرتے ہیں اور اس میں کیا تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ "شاداب" قارئین کا ان کا اپنا ایک معیاری رسالہ ہے۔

ایڈیٹر

ضروری اطلاع

ماہنامہ شاداب نے اپنی زندگی کے تین سال پورے کر لئے ہیں، چوتھے سال میں قدم رکھ رہا ہے، ہمیں یقین ہے آپ شاداب کو پسند کرتے ہیں، اپنی پسند کے عملی اظہار میں آپ اپنے ذمہ سابقہ زرِ سالانہ روانہ فرما دیں اور نئے سال جنوری ۱۹۸۷ء کا زرِ تعاون پیشگی عنایت فرمائیں، رقم واجب الادا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائی جائے، شکریہ۔

مینجنگ ایڈیٹر



مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

قسطِ دوم

ایم۔اے اسلامیات ایل ایل بی

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مثالی و فکر انگیز خطاب

جس بات کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ سیرت طیبہ جس کے برپا کئے ہوئے انقلاب کے معجزانہ واقعات ہم اور آپ سنتے بھی ہیں، پڑھتے بھی ہیں، بیان بھی کرتے ہیں، اور ایسا انقلاب واقعتاً روئے زمین پر کسی جگہ برپا نہیں ہوا جیسا کہ انقلاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا۔

لیکن ذرا سوچنے سمجھنے کی بات ہے کہ جو انقلاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی بدولت تھا وہی سیرت طیبہ آج ہمارے پاس محفوظ ہے اور الحمدللہ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح شکل وصورت میں محفوظ ہے اور یہ خصوصیت تمام انبیاء علیہم السلام میں صرف سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کے حالات زندگی ولادت سے لے کر وفات تک، آپ کی ایک ایک ادا آپ کا ایک ایک قول حدیث کی شکل میں الحمدللہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ سیرت ہے۔ محفوظ بھی ہے، مدرسوں میں پڑھائی بھی جارہی ہے، سیرت النبی کے جلسے ہوتے ہیں ان میں اس سیرت کا بیان ہوتا ہے۔ مقررین اور واعظین اس کو بیان کرتے ہیں اور سننے والے سنتے ہیں۔ جس سیرت طیبہ نے چودہ سو سال پہلے اتنا عظیم الشان انقلاب برپا کیا وہی آج ہمارے پاس ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ آج ہمارے دلوں میں، ہماری زندگیوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ درحقیقت جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سیرت طیبہ جس کے بیان کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اور جو ہمارے لئے ایک عظیم سعادت ہے ہمارا فرض ہی ختم نہیں ہوتا آپ نے اس کا حکم اس لئے نہیں دیا تھا کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ لوگ میری تعریف کیا کریں میری شان میں قصیدے پڑھا کریں، میرے کارنامے بیان کریں۔ آپ کو لوگوں سے تعریف کرانے کا کوئی شوق نہیں

تھا۔ اگر یہ شوق ہوتا تو اس دن پورا ہو گیا ہوتا جس دن قریش نے آپؐ کو پیش کش کی تھی کہ آپؐ ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیجئے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تبلیغ چھوڑ دیجئے۔ اس کے بدلے میں اگر آپ مال و دولت چاہتے ہیں تو ہمارے مال و دولت کے خزانے آپؐ کے قدموں میں ڈھیر کئے جاتے ہیں۔ اگر آپؐ کو حسن و جمال کی خواہش ہو تو مکہ مکرمہ کا منتخب حسن و جمال آپؐ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر آپؐ کو سرداری کی تمنا ہے تو ہم سب آپؐ کے سر پر سرداری کے تاج کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ کو مقصود یہ ہوتا کہ میں سردار بن جاؤں، یا بادشاہ بن جاؤں، لوگ میری تعریف کیا کریں تو اس دن پیش کش قبول فرما لیتے اور سارا مسئلہ ہی حل ہو جاتا۔ بدر، احد، حنین اور احزاب کی جنگیں ہی لڑنے کی نوبت نہ آتی۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر تم میرے ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے ہاتھ میں ماہتاب رکھ دو تب بھی میں اپنی دعوت سے پھرنے والا نہیں۔ یہ دعوت آپؐ نے اپنی تعریف کرانے کے لئے نہیں دی کہ ہم تعریف کر دیا کریں اور آپؐ کا حق ادا ہو گیا۔ درحقیقت اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ آپؐ کے اقوال و افعال سے، آپؐ کی سیرت سے اپنی زندگی میں نمونہ بنا کر اس کی نقل اتاریں، اس کی اتباع کریں۔

جب تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اتباع کو اپنا شیوہ بنایا انہوں نے دنیا پر اپنی عظمت اپنے جلال کے جھنڈے گاڑ دئیے اور ایسے گاڑ دئیے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور اتباع کے وہ نمونے پیش کئے کہ جس کی کوئی حد و حساب نہیں۔ صحابہ کرامؓ کے جذبہ اتباع کا حال یہ تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مشہور صحابی تھے اور تمام صحابہ میں سب سے زیادہ فقیہ تھے۔ ان کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ بیٹھے سن رہے تھے کچھ لوگ اتفاق سے مسجد کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ آداب مجلس کے خلاف بات ہوتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "بیٹھ جاؤ"۔ ظاہر ہے یہ حکم ان لوگوں کے لئے تھا جو اس پاس کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اس وقت کہیں اپنے گھر سے آ رہے تھے مسجد کے اندر داخل نہیں ہوئے۔ سڑک پر سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز کان میں پڑی کہ "بیٹھ جا(ؤ)" آپ نے ایک قدم بڑھانا گوارا نہ کیا وہیں سڑک پر بیٹھ گئے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فقیہ صحابی انہیں یہ بات معلوم تھی کہ آپؐ کے ارشاد کا مقصد یہ نہیں تھا کہ چلتے ہوئے لوگوں کو سڑک پر بٹھا دو لیکن چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز کان میں پڑ گئی کہ "بیٹھ جاؤ" تو اس کے بعد پھر آگے بڑھ(نا) گوارا نہیں کیا طبیعت نے، عشق و محبت نے اور ذوق اتباع نے۔ یہ تھا اتباع کا جذبہ صحابہ کرامؓ آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور سیرتوں میں ہم نے تفریق کر رکھی ہے کہ جو اپنی خواہش...

کے مطابق پوری اترے وہ تو اپنا لو اور جو خواہشات کے خلاف نظر آئے تو کہہ دو اس کے اوپر عمل کرنا واجب نہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جس وقت آپؐ پورے صحابہ کرامؓ کے لشکر کو لے کر عمرہ کے لیے تشریف لائے تھے تو کفار مکہ نے روک دیا۔ کفار مکہ سے مذاکرات کے لئے آپ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ روانہ کیا تاکہ بات چیت کے ذریعہ مسئلہ حل ہو جائے۔ حضرت عثمان غنیؓ مکہ میں داخل ہوئے اور اپنے چچازاد بھائی کے گھر میں ٹھہرے۔ جب صبح کفار مکہ سے مذاکرات کے لئے جانے لگے تو حضرت عثمانؓ کا زیر جامہ سنت کے مطابق آدھی پنڈلی تک تھا۔ اہل عرب کے ہاں قاعدہ تھا کہ زمین پر ازار گھسیٹتا ہوا جائے گا اتنا ہی زیادہ قابل عزت ہوگا اور جس شخص کا ازار اونچا ہو اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے چچازاد بھائی نے آپ سے کہا کہ حضرت! آپ کفار مکہ سے مذاکرات کرنے جا رہے ہیں، آپ اس حالت میں جائیں گے تو لوگ آپ کو حقیر سمجھیں گے اپنا لباس کو نیچا کر لیجئے۔ یہ نہیں کہا کہ ٹخنوں سے نیچا کر لیجئے بلکہ ٹخنوں سے اوپر ہی لیکن آدھی پنڈلی سے ذرا نیچا کر لیجئے تو کم از کم ان لوگوں کی نظر میں حقارت کم ہوگی۔ سبحان اللہ حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس ایسا ہی ہے اس کے بعد یہ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، مذاق اڑاتے ہیں تو اڑایا کریں میں تو اسی حالت میں جاؤں گا۔ مجھے حقیر سمجھیں یا امیر سمجھیں میں اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اور آپؐ کے طریقے کو چھوڑنے والا نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں گئے اور اسی حالت میں اپنی عزت کروائی۔

ایرانی حکمراں کسریٰ جو ایک عظیم طاقت کا مالک تھا اس کے دربار میں مسلمان پہنچے ہیں تو کس شان سے۔ ربیع ابن عامر حاتمؓ ایک چھوٹی سی تلوار جو کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور جس کو چیتھڑے باندھ باندھ کر جوڑا گیا تھا ہاتھ میں لے کر کسریٰ کے دربار میں جانے لگے تو دروازے پر چوکیدار نے کہا کہ کیا تم اس تلوار سے ایران فتح کرنے آئے ہو جو اس قدر چھوٹی اور جس میں پیوند اور چیتھڑے لگے ہوئے ہیں۔ کہا کہ "ہاں اسی تلوار سے فتح کرنے آیا ہوں لیکن ابھی تک تم نے تلوار دیکھی ہے تلوار چلانے والا ہاتھ نہیں دیکھا"۔ کہا کہ "اچھا! ذرا دکھاؤ دکھاؤ"۔ کہا کہ "تمہارے پاس جو سب سے زیادہ مضبوط زرہ ہو اس کو لے کر کسی آدمی کو پیر سے منہ تک کھڑا کر دو، پھر میں دکھاتا ہوں اس تلوار کو چلانے والا ہاتھ"۔ اس نے ایک آدمی کو کھڑا کر دیا۔ زرہ اس کے ہاتھ میں دے دی جو بڑی وزنی تھی لوہے کی۔ ابن حاتم نے ایک ہاتھ جو مارا تو ایک سیکنڈ کے اندر زرہ کے ٹکڑے ہو گئے اور اس کے بعد کسریٰ کے دربار میں داخل ہوئے جہاں قالین رکھے ہوئے تھے جو دوستی کی علامت سمجھا جاتا تھی۔ لیکن ربیع ابن حاتم اپنی تلوار سے قالینوں کو کھرچتے ہوئے کسریٰ کے دربار میں آ گئے ان میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ بھی تھے۔ بات چیت کے بعد کسریٰ نے کھانے پینے کا سامان بھی وہاں منگوا کر پیش کیا۔ بیٹھ کر کھانا شروع کیا۔ حضرت حذیفہ بن یمانؓ کھا رہے تھے کہ ایک نوالہ منہ

کی طرف اٹھایا تو وہ نوالہ اتفاق سے زمین پر گر گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تمہارا نوالہ زمین پر گر جائے تو اس کو بیکار نہ کرو اللہ تعالیٰ کا رزق ہے اس کو پہلے صاف کر دو پھر کھا لو۔ یا اٹھا دیا کرو۔ اس حکم کی تعمیل میں حضرت حذیفہؓ نے گرے ہوئے نوالے کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو کچھ ساتھی نے کہا کہ حضرت اس وقت رہنے دیجئے، یہ کسریٰ کا دربار ہے، ایک غیر مسلم سربراہ کے دربار میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ اس عمل سے یہی سمجھیں گے کہ کیسے نادیدہ لوگ آگئے ہیں جن کو زمین پر گرا ہوا ایک نوالہ چھوڑنا بھی گوارا نہیں۔ ان کے دلوں میں حقارت پیدا ہو جائے گی۔ سبحان اللہ کیا جواب دیا حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے۔ فرمایا "نفرت کرے، حقارت سے پیش آئے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا طریقہ نہیں چھوڑنا۔ آپ دیکھ لیجئے کہ مسلمانوں نے پوری عزت کرائی چار دانگ عالم میں۔ اور جب سے کہ مسلمان نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ یہ کام کروں گا کہیں امریکہ نہ ناراض ہو جائے اور یہ کام کروں تو روس ناراض نہ ہو جائے اور یہ کام کروں تو انگریز برا سمجھنے نہ لگے اور یہ کام کروں تو فلاں قوم حقارت سے دیکھنے نہ لگے۔ جب سے یہ طرز فکر پیدا ہو گیا مسلمانوں میں اس وقت سے سیرت اور کردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت ہمارے لئے بے اثر ہو کر رہ گئی اس لئے کہ بجائے اس کے کہ ہر معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے ارشاد کو دیکھیں ہم نے دوسروں کی نقالی اختیار کر لی اور اس فکر میں پڑ گئے کہ لوگ ہمیں حقیر نہ سمجھیں۔

ایک شاعر نے بڑی پیاری بات کہی

ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے ‍ ‍ زمانہ تم پہ ہنستا ہی رہے گا۔
کسی کا آستاں اونچا ہے اتنا ‍ ‍ کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا۔

یعنی جب تک تمہارے دل میں یہ خوف ہے کہ فلاں تمہارا مذاق نہ اڑائے، ہنسی نہ اڑائے اس وقت تک زمانہ تم پہ ہنستا ہی رہے گا اور اب بھی ہنس رہا ہے۔ اس لئے اس آستانے پر تم اپنا سر کو جھکاؤ گے تو ساری دنیا تمہارے قدموں پر جھک جائے گی۔

درحقیقت سیرت و سنت نے اتنا بڑا انقلاب جو برپا کیا اس کی وجہ یہ تھی ایک ایک صحابیؓ کے دل میں یہ بات پیوست تھی کہ اس دنیا میں جینے کا طریقہ صرف وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے سکھایا اور باقی سب حماقت ہے، بیوقوفی ہے اور خواہ ہمیں کوئی حقیر سمجھے یا ذلیل سمجھے ہمیں اس کو نہیں چھوڑنا ہے۔ لیکن ہم نے اس طریقے کو چھوڑ دیا۔ زبانی طور پر محبت کے دعوے جتنے ہم کر لیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدے جتنے چاہے ہم پڑھ لیں، سیرت طیبہ بیان جتنا چاہے کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آئے تو انگوٹھے جتنے چاہے

چھوڑ سکتے ہیں لیکن جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضہ تھا کہ آپؐ کی سیرت ، آپؐ کی سنت کو ہم اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور ہمارے دلوں میں یہ بات پیوست ہو کہ آپؐ سے بہتر طریقہ کسی کا نہیں آپؐ سے بہتر زندگی گزارنے کے اصول کسی نے بیان نہیں کئے تو یہ بات ہمارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا ۔ زبان سے دعوے ضرور کرتے ہیں کہ واقعتاً یہ مانتے ہیں آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے صلاح و فلاح کا ضامن ہے لیکن عملی زندگی اس کی شہادت نہیں دیتی ۔ زبان سے ہم یہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں محبوب ہیں لیکن سر سے لے کر پاؤں تک ہماری ایک ایک ادا ہمارے اس دعوے کو جھٹلاتی ہے ۔ زبان حال سے ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں محبت ہے انگریزوں سے ، ہمیں محبت ہے روسیوں سے ، ہمیں محبت ہے امریکیوں سے ، ہمیں محبت ہے عیسائیوں سے ، ہمیں محبت ہے ہندوؤں سے اور دنیا کے ان تمام اقوام سے محبت ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں ۔ ہماری ایک ایک ادا اسی بات کی گواہی دے رہی ہے ۔ اس لئے یہ کہا ہے کہ سیرت موجود ، سنت موجود ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا طریقہ ہمارے پاس محفوظ ہے اس کے باوجود ہماری زندگیوں میں تبدیلی نہیں آتی ۔ عرض کرنا یہ ہے کہ سیرت طیبہ کے جلسے بہت ہوا کرتے ہیں ، تقریریں بھی بہت ہوا کرتی ہیں اور ان میں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی بہت کرتے ہیں لیکن یہ معاملہ اتنا ہو کہ بات کہی گئی اور سنی گئی اور جو کچھ سنا تھا اس کو دامن جھاڑ کر یہاں سے اٹھے تو یقین سمجھئے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کبھی خوش نہیں ہو سکتی نہ آپؐ کی محبت کا حق اس طرح ادا ہو سکتا ہے ۔

آپؐ کی محبت کا حق ادا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے ۔ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ہزاروں فرزندانِ توحید موجود ہیں جن کے دلوں میں الحمدللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی شمع روشن ہے ہم یہ عہد کر کے تو یہاں سے اٹھیں کہ ہم اپنی آئندہ زندگی میں حتی الامکان جتنا ہم سے ہو سکے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اختیار کر لیں گے ۔ کئی سنتیں ایسی ہیں جن کے اختیار کر لینے میں کوئی تکلیف نہیں ۔ اگر مسجد میں داخل ہوتے وقت آپ دایاں پاؤں داخل کریں ، بایاں نکالتے وقت کیا تکلیف ہے ؟ لیکن اگر آپ اتباع سنت کی غرض سے یہ کام کر لیتے ہیں تو یحببکم اللہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا ۔ ایک سنت پر عمل کرو گے اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے ، محبوب ہو جاؤ گے اللہ تعالیٰ کے ۔ اگر داہنے ہاتھ سے پانی پیا کریں اور تین سانسوں میں پئیں یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے ، کیا تکلیف ہے اس میں ؟ کیا پریشانی ہے ؟ لیکن محض اتباع سنت کی خاطر اس کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس پر کتنا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے غرض

زندگی کے گزارنے کے جو طریقے آپؐ نے بتلائے ہیں ان کو اختیار کرنے کا عزم لے کر اٹھیں۔ کتنی کتابیں چھپی ہیں ان میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں ایک ایک کر کے شمار کی گئی ہیں۔ نماز پڑھنے کی کیا سنت ہے، کھانا کھانے کی کیا سنت ہے، گھر میں داخل ہونے کی کیا سنت ہے، اور باہر نکلنے کی کیا سنت ہے، مسجد میں جانے کی کیا سنت ہے، باہر نکلنے کی کیا سنت ہے ان کو بھی اختیار کرنا کوئی دشوار ہے؟ کم از کم ان سے آغاز تو کریں۔ آغاز اپنی طرف سے اتنا کریں گے تو انشاء اللہ، ثم انشاء اللہ اس اتباع سنت کی برکت یہ ہوگی پوری سنتوں کی اتباع کا بھی اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائیں گے۔

جتنی اپنے بس میں ہے، جتنی اپنے اختیار میں ہیں آسان نظر آتی ہیں ان کو اختیار کرو پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا ہوں اپنے فضل وکرم سے مجھے اس کی توفیق فرما دیجئے اس کی راہ کی رکاوٹیں دور فرما دیجئے، اس کی ہمت عطا فرما دیجئے۔ یہ دعا روزآنہ رات میں کریں۔ جو سنتیں آسان ہیں ان کو برابر شروع کر دیں انشاء اللہ کچھ استفادہ اور کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے دعووں کے باوجود اتنا بھی ارادہ ہم نہ کر سکیں تو تف ہے بر حالِ ما۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

اور میرے بازو کو تھام لیا۔ وہ چلنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے والد صاحب کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے تو ہم نے اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ وہ اپنے بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے اور ایک سفید چادر نے گردن تک انہیں ڈھانپ رکھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرہ قبلے کی طرف مڑا ہوا تھا۔ مونچھیں بالکل سفید ہو چکی تھیں البتہ سر کے کچھ بالوں میں خضاب کی سیاہی جھلک رہی تھی۔ جیسے انہوں نے بہت پہلے میری خواہش پر لگایا تھا۔

خیرہ بدستور میرا بازو تھامے ہوئے تھی اور اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میں رو نہ سکا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ اگر میں اس وقت رویا تو والد صاحب اٹھ کر ہم کو قریب آنے کے لئے کہیں گے اور جب ہم ان کے قریب جائیں گے تو اپنے دائیں بائیں ہم دونوں کو بٹھا کر پیار سے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے کہیں گے "تم کو اس طرح نہیں رونا چاہئے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد نہیں رویا کرتے [illegible]

ماہنامہ شاب حیدرآباد جنوری ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبال: میرے والد

(انگریزی سے تلخیص و ترجمہ: محمد صفی الدین صدیقی)

میری پیدائش (۱۹۲۴ء) سے ایک سال قبل والد صاحب، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح کے مزار پر تشریف لے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس صوفی عالم دین نے ابن العربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور شہنشاہ اکبر کی مذہبی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ اس طرح وہ (مجدد الف ثانی) ہندوستان میں مسلم قومیت کے بانی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے مزار پر والد صاحب نے اولاد نرینہ کے لئے دعا مانگی تھی جس کی تربیت وہ اپنے مخصوص مذہبی و اخلاقی اصولوں کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا کیا تو اس بچہ کو وہ ایک دن اس مزار کی زیارت کو لے آئیں گے۔

مجدد الف ثانی سے عقیدت

والد صاحب کی دعا مقبول ہوئی اور جب میں خاص عمر کو پہنچ گیا تو سن ۱۹۳۴ کے موسم گرما میں وہ مجھے سرہند لے گئے۔ شیخ احمد رح کے مزار کی زیارت کا واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ والد صاحب مجھے مقبرے کے اندر لے گئے اور شیخ رح کی قبر کے قریب بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز نے مقبرے کی گنبد میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ آنسوؤں نے ان کے رخساروں کو بھگو دیا ہے۔

سرہند میں دو ایک روز قیام کے بعد ہم لاہور لوٹ گئے۔ اس وقت میں یہ نہ جان سکا کہ مزار کی زیارت کا آخر کیا مقصد تھا اور نہ ہی میں ان کے آنسوؤں کا سبب معلوم کر سکا کیوں کہ والد صاحب کو پہلی بار میں نے روتا ہوا دیکھا تھا۔

والد صاحب نے بہت کم اس کا موقع دیا ہے کہ اپنے تعلق سے میں اُن کی انسیت اور محبت کا اندازہ لگا سکوں۔ شاذونادر ہی کبھی انھوں نے اپنے قریب بلا کر مجھے پیار کیا ہے۔ اسی باعث مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہو سکا کہ پدری محبت کیا ہوتی ہے۔ بظاہر ان کی طرف سے سرد مہری کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ جب وہ مجھے گھر میں ادھر ادھر دوڑتا ہوا دیکھتے تھے تو ان کی ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل جاتی جیسے کوئی

انکو زبردستی مسکرانے پر مجبور کر رہا ہے۔ میں ان کا اکثر احترام کرتا ہوں آنکھیں بند کئے اپنے خیالات میں گم تھا۔ مگر میں ان باتوں سے بے خبر خلاف فطرت سمجھتا کہ وہ پیار اور محبت کے برتاؤ کے اہل نہ تھے۔

کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت و پرداخت کے معاملے میں ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوتے۔ چنانچہ اکثر دفعہ میں والد اور والدہ کے درمیان اختلاف کا سبب بنا ہوں۔ والدہ یہ سمجھتی تھیں کہ جب تک وہ مجھے اپنے ہاتھ سے نہیں کھلائیں گی میرا صحیح طور پر جسمانی نشوونما نہ ہوسکے۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح غیر ضروری لاڈ پیار سے وہ (والدہ) مجھے بگاڑ رہی ہیں۔ لہٰذا ان کا حکم تھا کہ میں خود اپنے ہاتھ سے کھاؤں۔ اس کے باوجود والدہ صاحبہ کبھی کبھار نظریں بچا کر مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاتیں۔ اور جب اس بات کا پتہ والد صاحب کو چلتا تو اس معصوم سی سازش پر وہ مسکرا دیتے۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود والدہ میرے تعلق سے کافی سخت تھیں اور شرارت پر مجھے سزا بھی دیتیں لیکن والد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ ہمیشہ میری بہتری کا سبب بنی ہے۔ بہت کم موقعوں پر ہی مجھے والد صاحب کی مار بھی سہنی پڑی ہے۔ خاص کر نوکروں سے بدسلوکی پر اور سخت دھوپ میں ننگے پاؤں دوڑنے پر۔ والد صاحب گھر میں مکمل خاموشی پسند کرتے تھے۔ جب میں لان پر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوتا تو وہ مجھے کہیں دور جا کر کھیلنے کے لئے کہتے۔ مگر کبھی کبھار وہ ہمارے کھیلوں میں بھی شامل ہو جاتے۔ جب میں پتنگ اڑا رہا ہوتا تو چھت پر آجاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور لے لیتے۔ شائد مجھے پتنگ اڑاتا دیکھ کر انھیں اپنا بچپن یاد آتا ہوگا۔

بچپن میں مجھے پینٹنگ (PAINTING) کا بے حد شوق تھا۔ مگر والد صاحب کو میری اس دلچسپی کا علم نہیں تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں پینٹنگ میں دلچسپی رکھتا ہوں اور جب انھوں نے میری پینٹنگ کے چند نمونے دیکھے تو نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ فرانسیسی، اطالوی، اور ہسپانوی آرٹ کے بڑے بڑے پرنٹس (PRINTS) خرید کر مجھے دئے۔ میں موسیقی کا بھی دلدادہ تھا لیکن گھر میں نہ تو گراموفون تھا نہ ہی ریڈیو۔ والد صاحب بھی موسیقی کا ذوق رکھتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے سے پہلے وہ ستار بجایا کرتے تھے۔ چنانچہ موسیقی سے ان کا لگاؤ کسی وقت کم نہیں ہوا۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کے ایک دوست نقیر نجم الدین ان کو ستار بجا کر سنایا کرتے تھے۔ جب کوئی موسیقار گھر آکر ان کی غزلیں گاتا تو والد صاحب مجھے ضرور بلا بھیجتے۔

۱۹۳۱ء میں جب والد صاحب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر ۶ سال کی تھی۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ کر گراموفون لانے کی فرمائش کی۔ گراموفون تو نہیں لائے لیکن میرے خط سے متاثر ہوکر انھوں نے یہ نظم لکھی تھی

جاوید کے نام

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر!
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر!
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر!
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر!
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر!
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

نیا گھر اور والدہ کی وفات

والد کے کوئی کام نہ کرنے کی وجہ سے والدہ کو ہمیشہ فکر لگی رہتی تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ آخر وہ کیا کام کرتے ہیں۔ جب کوئی مجھ سے ان کے پیشے کے بارے میں سوال کرتا تو مجھے سخت الجھن ہوتی۔ والدہ کی خواہش تھی کہ ہمارا اپنا کوئی مکان ہو (اس وقت ہم میکلوڈ روڈ پر واقع کرایہ کے مکان میں رہتے تھے) مئی ۱۹۳۵ء میں والدہ کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور ہم نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نئے مکان میں منتقل ہونے کے تیسرے روز والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میری عمر ۱۱ سال کی اور میری ہمشیرہ منیرہ کی عمر قریب پانچ سال کی ہوگی۔

والدہ کی وفات کے بعد منیرہ اور میں والد صاحب کے زیادہ قریب آگئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ والدہ کی وفات پر ہم دونوں خوب روئے تھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے والد صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُن دنوں والد صاحب کی صحت اچھی نہیں تھی۔ وہ اپنی آواز تقریباً کھو چکے تھے۔ اور صاف آواز میں گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ منیرہ اور میں کمرے کے دروازے میں کھڑے رہے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے ہم کو دیکھ لیا اور اشارہ سے قریب آنے کو کہا۔ جب ہم قریب گئے تو ہم کو دائیں اور بائیں بازو بٹھا لیا۔ پھر ہمارے کندھوں پر پیار سے

ہاتھ رکھ کر مجھے خفیف غصہ کے ساتھ یہ کہا۔ "تم کو اس طرح نہیں رونا چاہئے۔ یاد رکھو تم ایک مرد ہو اور مرد نہیں رویا کرتے"۔ اس کے بعد انھوں نے ہماری پیشانیوں کو چوما۔ شاید زندگی میں پہلی بار۔

اگلے سال مارچ ۱۹۳۶ء میں والد صاحب اپنے ساتھ مجھے بھوپال لے گئے۔ بھوپال میں میرا تمام وقت ان کے ساتھ گذرا۔ وہ میری تربیت اور پرداخت میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے اور نشست و برخاست کے آداب پر خصوصیت کے ساتھ زور دیتے تھے۔ چونکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے میں زیادہ شرمیلا واقع ہوا تھا اس لئے وہ بار بار جتلاتے تھے کہ میں خاموش نہ رہوں اور دوسروں سے بات چیت میں ہمیشہ پہل کروں۔

اپریل میں (بھوپال سے) واپسی پر ہم نے کچھ روز دہلی میں قیام کیا۔ والد صاحب مجھے دہلی کے تاریخی آثار دکھانے لے گئے۔ ہم نے لال قلعہ دیکھا، حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی زیارت کی، قطب مینار دیکھنے گئے میں نے جب مینار پر چڑھنے کی خواہش کی تو مجھے اوپر جانے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے مجھے خبردار کیا کہ بلندی سے نیچے کی طرف مت جھانکو کیونکہ اس سے ڈر اور خوف کا احساس ہوگا"۔

دن اور مہینے گزرتے گئے۔ والد صاحب نے جگر کی خرابی کے باعث ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ گرما کے دنوں میں رات کو وہ صحن میں سوتے تھے اور میرا بستر بھی ان کے قریب ہوتا۔ جب کبھی رات کی تاریکی میں میری آنکھ کھل جاتی تو میں دیکھتا کہ والد صاحب اپنے بستر میں گھٹنوں میں سر دئے بیٹھے ہیں کیونکہ عام طور پر راتوں کو درد کے شدید دورے پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی ان پر الہامی کیفیت طاری ہوتی تو ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ غیر معمولی کرب اور جسمانی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اکثر رات کے پچھلے پہر وہ تالی بجا کر اپنے ملازم علی بخش کو بلاتے تھے اور اس کو قلم اور بیاض لانے کے لئے کہتے۔ پھر جوں جوں بیاض پر اشعار لکھے جاتے تو ان کی حالت میں تغیر رونما ہوتا اور ایسا لگتا کہ انھیں تکلیف سے نجات مل گئی ہے۔ اس کے بعد وہ گہری نیند میں غرق ہو جاتے۔ کئی دفعہ میں نے والد صاحب کو بلا وجہ تبسم فرماتے یا پھر روتے دیکھا ہے۔ اکثر تنہائی میں وہ اپنے اشعار پڑھا کرتے۔ کبھی ہاتھ ہوا میں بلند کرتے اور کبھی نیچے چھوڑ

کچھ پیار بھری یادیں

عام طور پر دائیں کروٹ اور اپنے ہاتھ کو تکیہ کے نیچے دبا کر سوتے تھے۔ جب اس حالت میں سوتے تو ان کا ایک پاؤں ہلتا ہوا دکھائی دیتا جو اس بات کی نشاندہی کرتا کہ وہ سوئے نہیں بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ لیکن جب گہری نیند سوتے تو خراٹے بھرنے لگتے۔

والد صاحب نے شاذ و نادر ہی صبح کی نماز قضا کی ہوگی۔ صحن میں رکھے ہوئے ایک چوبی تخت ان کا مصلیٰ بچھا ہوتا۔ عبادات کی حد تک والد صاحب بہت زیادہ سادگی پسند تھے۔ تہجد اور

پہنتے تھے۔ اور نماز ادا کرتے وقت رومال سے سر ڈھانپ لیتے تھے۔ ان کا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوتا
بے ترتیبی سے ان کے اطراف بکھری رہتیں۔ گھر سے باہر نکلنا انھیں پسند نہ تھا۔ ہر وقت صوفے پر بیٹھے
یا اپنے بڈ پر لیٹے پڑھنے اور لکھنے میں معروف دکھائی دیتے۔ بعض اوقات مطالعہ میں وہ اس قدر
منہمک ہو جاتے کہ کھانے کا بھی خیال نہ رہتا۔ کتاب ختم کرنے پر سر اٹھا کر علی بخش سے بڑی معصومیت کے
انداز میں پوچھتے " کیا میں نے کھانا کھا لیا ہے ؟ "۔ شام کو وہ مکان کے صحن میں ٹہلتے تھے۔ اس کے
علاوہ اور کوئی جسمانی چل پھل نہیں تھی۔

والدہ کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنے بالوں میں خضاب لگانا ترک کر دیا تھا۔ ایک دن میں
نے انھیں یاد دلایا کہ ان کے بالوں کو خضاب کی ضرورت ہے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ " اب تو میں
بڈھا ہو چکا ہوں "۔ جواب میں میں نے کہا " نہیں ہم آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں "۔ انھوں
نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا مگر کچھ عرصے کے بعد بالکل ترک کر دیا اور اس کے بعد مجھے
ان کو اس طرف متوجہ کرنے کا کبھی موقعہ نہ ملا۔

والد صاحب سخت پریشان ہو جاتے جب انھیں پتہ چلتا کہ میرے اور منیرہ کے درمیان جھگڑا
ہو گیا ہے۔ جب میں اس (منیرہ) کی طرف سخت رویہ اختیار کرتا تو وہ ناراض ہو کر مجھے ڈانٹنے لگتے
" تم واقعی ایک پتھر دل انسان ہو۔ تم میں ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ
اس دنیا میں تمہارا ایک ہی دوست ہے۔ تمہاری والدہ مر چکی ہیں اور ایک دن جب وقت آئے گا
تو میں بھی نہیں رہوں گا۔ تب اکیلے (منیرہ) کے علاوہ تمہارے لئے کیا باقی رہ جائے گا۔ اور تم
نے اس سے جھگڑا کیا تو تمہاری حیثیت ایک تنہا آدمی کی رہ جائے گی اور میں تم سے کہتا ہوں
اس دنیا میں تنہا رہ جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے "

والد صاحب کی آرزو تھی کہ میں بہت بڑا خطیب (ORATOR) بنوں۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ
میں کشتی کا فن سیکھوں۔ اسی غرض سے انھوں نے مکان کے عقبی حصہ میں کشتی کا اکھاڑا بنوایا تھا۔ جب
عید الضحیٰ پر قربانی ہوتی تو وہ ضرور مجھے بلا بھیجتے حالانکہ وہ خود خون کو بہتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ان کے دوستوں میں ایک سعودی عرب تھے جو انھیں قرآن پڑھ کر سناتے تھے۔ وہ اچھی آواز
کے مالک تھے۔ جب بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو والد صاحب مجھے بلوا بھیجتے اور اپنے قریب
بٹھا لیتے۔ ایک مرتبہ ان عرب صاحب نے سورۂ مزمل کی تلاوت کی جسے سن کر والد بے حد متاثر
ہوئے اور جب سورہ کی تلاوت ختم ہوئی تو والد صاحب نے مجھ سے کہا میں چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح قرآن
پڑھا کرو۔

انھوں نے مجھے مسدس حالی میں سے کچھ اشعار پڑھنے کو کہا۔ اس وقت کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے مسدس کے وہ اشعار پڑھنے کی فرمائش کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت میں ہیں اور اس طرح شروع ہوتے ہیں

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
(مرادیں غریبوں کی بر لانے والا)

اس سے پہلے کہ دوسرا مصرعہ پڑھا جاتا والد صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ خود والد صاحب یہ اشعار اپنی پرعزم آواز میں پڑھتے۔ تاریخ اسلام کے بعض واقعات بھی وہ سنایا کرتے تھے۔ زیادہ تر حضرت عمرؓ، خالد بن ولیدؓ کے قصے بیان کرتے تھے۔ انھوں نے بتلایا تھا کہ نپولین کے قدیم اجداد کا تعلق ARABIA سے تھا۔ اور وہ عرب ہی تھے جنھوں نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا بحری راستہ بتلایا۔

والد صاحب یورپین لباس کے زیادہ شوقین نہیں تھے۔ مجھے ہمیشہ قومی لباس پہننے کا مشورہ دیتے۔ کپڑوں کے معاملے میں اسراف انھیں سخت ناپسند تھا۔ اور جب بھی انھیں پتہ چلتا کہ میں نے کپڑوں پر زیادہ روپیہ صرف کیا ہے تو مجھے ڈانٹ دیتے۔ جب انھیں بتلایا جاتا کہ پلنگ کی بجائے میں فرش پر سویا ہوں تو بہت خوش ہوتے اور ایک طرح کا فخر محسوس کرتے۔

آخری زمانے میں ان کی بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ تب میں روز اُن کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ رات کو خود ان کی نظمیں (یا پھر حالی کی نظمیں) پڑھ کر سناتا تھا۔ اگر تلفظ غلط طریقہ پر ادا ہوتا تو والد صاحب خفا ہو جاتے۔ شعر کے پڑھنے میں ذرا سی لغزش ہوتی تو وہ ناراض ہو کر کہتے۔ "یہ تم شعر پڑھ رہے ہو یا منتر؟"

منیرہ ان کی چہیتی تھی۔ منیرہ اور اس کی جرمن گورنس جن کو ہم "آپا جان" کہتے تھے دونوں زیادہ وقت والد صاحب کے کمرے میں گزارتیں۔ والد صاحب روانی کے ساتھ جرمن زبان بولتے تھے اور آپا جان سے جرمن زبان ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ منیرہ کو بھی انھوں نے جرمن زبان سیکھنے کی ہدایت کی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جرمن عورتیں نہایت بہادر ہوتی ہیں۔

شام کو کئی دوست اور عقیدت مند والد صاحب سے ملنے آتے تھے۔ کرسیاں پلنگ کے اطراف رکھ دی جاتیں۔ وہ حقہ کا کش لیتے ہوئے باتیں کرتے۔ ان کو شام کے کھانے کی عادت نہیں تھی صرف ایک دو کشمیری چائے کے پیالوں پر اکتفا کرتے۔

والد صاحب کی تاکید تھی کہ میں بھی ان کی مجلسوں میں شریک رہوں حالانکہ بزرگوں کی باتیں

سننا میرے لئے سخت مرحلہ تھا۔ جب بھی موصوف کی نظروں سے بچ کر باہر نکل جاتا۔ اس پر انہیں دُکھ ہوتا اور وہ اپنے دوستوں سے شکایت آمیز لہجہ میں کہتے ۔ "معلوم نہیں یہ لڑکا، مجھ سے یوں دور رہنا چاہتا ہے۔" زندگی کے اس موڑ پر انہیں تنہائی کا سخت احساس رہنے لگا تھا۔ وہ شکوہ کرتے تھے ۔ "دن دن بھر میں یہاں ایک اجنبی کی طرح لیٹا رہتا ہوں۔ نہ تو کوئی میرے پاس آتا ہے اور نہ میرے ساتھ بیٹھتا ہے"۔

آخری رات

۲۰/ اور ۲۱/ کی آخری رات کو والد صاحب اپنے بڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے اطراف احباب اور ان کے عقیدت مند بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کو نو بجے میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ انہوں نے پوچھا "یہ کون ہے؟" شاید وہ مجھے نہیں پہچان سکے تھے۔ "میں جاوید ہوں" میں نے جواب دیا۔ تب ہونٹوں پر تبسم لاکر فرمایا "مجھے اس وقت یقین آئے گا جب حقیقت میں تم جاوید ہو گئے"۔ تب اپنے دوست چودھری محمد حسن سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چودھری صاحب اتنی مہربانی کیجئے کہ اس کو وہ دعا "خطاب بہ جاوید" ازبر ہو جائے جو میری کتاب جاوید نامے "کے آخر میں ہے"۔

اس رات کو گھر میں ہر طرف تردد آمیز سرگوشیاں ہو رہی تھیں کیونکہ ڈاکٹروں نے بتلا دیا کہ والد صاحب صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ وہ خون تھوک رہے تھے اور ان کی حالت یک لخت تشویش ناک ہو گئی تھی۔ حالانکہ اطباء نے اس بات کو ان سے چھپایا تھا لیکن والد صاحب سمجھ چکے تھے کہ ان کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود خلافِ معمول وہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے

مجھ کو بھی ان کی تشویش ناک بیماری سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ صبح کو میں نے محسوس کیا کہ علی بخش مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "چلو، اٹھو، دیکھو تمہارے بابا کو کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ ہم سے رخصت ہونے جا رہے ہیں۔ میں تو اپنے بستر سے یہ سوچ کر اٹھا تھا کہ ان کے کمرے میں جا کر دیکھوں کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ والد صاحب کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جب میں منیرہ کے کمرے سے گزرا تو دیکھا کہ وہ ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی اپنے دونوں بانہوں سے منہ کو چھپائے زار و قطار رو رہی ہے۔

جوں ہی میں والد صاحب کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو منیرہ لپک کر میرے پاس آ گئی۔

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا

نوودیا ودیالیہ اسکیم

نئی تعلیمی پالیسی کا ایک زیادہ دلچسپ اور انوکھا پہلو نوودیا ودیالیہ اسکیم سے متعلق ہے۔ جو ایک واقعی عمدہ اور قابل تعریف خیال ہے۔ اس اسکیم کی تین بڑی ترجیحات یہ ہیں: (الف) قومی یک جہتی اور ثقافتی اتحاد کا فروغ۔ (ب) لسانی فارمولے کا زوردار ڈھنگ سے نفاذ۔ اور (ج) راہنمائی کرنے والے ایسے سکولوں کا قیام جو مساوات کی بنیاد پر تعلیم دیں اور ذہین بچوں کو اپنی صلاحیتوں کی پوری ترقی کے مواقع مہیا کریں۔

نوودیا ودیالیہ اسکیم کے زیادہ دلچسپ پہلوؤں میں سے کچھ یہ ہیں کہ یہ اسکول رہائشی اور مخلوط تعلیم والے ہونگے۔ یہاں شہری علاقوں کے بچوں کے داخلے کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی ہوگی۔ لہذا اس قول میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ یہ سکول سماج کے اعلیٰ طبقہ کے لئے ہوں گے مزید برآں یہ کوشش کی جائے گی کہ ہر نوودیا ودیالیہ میں کم از کم ایک تہائی طالب علم لڑکیاں ہوں اس سے آگے چل کر خواتین کی تعلیم کو تقویت ملے گی۔

حکومت ساتویں پانچسالہ منصوبے کی تکمیل سے پہلے پہلے ملک کے ہر ضلع میں اوسطاً ایک ایک نوودیا ودیالیہ کھولنا چاہتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ 1990 تک ملک بھر میں ایسے 28 اسکول قائم ہو جانے چاہئیں۔ لیکن ایک چیز خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ نوودیا ودیالیہ میں تعلیم کلیتاً مفت ہوگی جس میں رہائش اور خوراک کا خرچ، وردی کے اخراجات، نصابی کتابوں کاپی کاغذ اور گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر جانے کے لئے ریل اور بس کا خرچ شامل ہے۔ مفت تعلیم کی سہولت ہر ایک طالب علم کے لئے ہوگی جس سے حکومت کے ارادہ کا پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف سکولوں میں بہتری لانے کے عمل کے لئے سہولیات مہیا کرنا چاہتی ہے بلکہ ہونہار اور ذہین بچوں کو جو زیادہ تر دیہی علاقوں کے ہونگے ان کے کنبوں کی سماجی و اقتصادی حالت کا لحاظ کئے بغیر پورے پورے مواقع دینا چاہتی ہے۔

نو ودیالیہ میں داخلہ چھٹی جماعت سے ہوگا۔ اس امر کے پیش نظر کہ ان اسکولوں میں جو طالب علم داخل کئے جائیں گے وہ قبل ازیں اپنی مادری یا علاقائی زبان میں تعلیم حاصل کر کے آئے ہوں گے اس لئے انہیں ساتویں اور آٹھویں جماعت میں اسی زبان میں تعلیم دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی ان جماعتوں میں انہیں مضامین کی زبان یا متبادل ذریعہ تعلیم کے طور پر ہندی یا انگریزی کی تعدد وار تعلیم بھی دی جائے گی۔ ذرائع ابلاغ کے ہنرمندانہ استعمال اور زبانوں کی تعلیم کی جدید تیکنیکوں کے ذریعہ ساتویں یا آٹھویں جماعت کے بعد انگریزی یا ہندی کو ذریعہ تعلیم بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اس درجے کے بعد نو ودیالیہ میں سب طلباء کے لئے مشترکہ ذریعہ تعلیم ہندی یا انگریزی ہوگا۔

اس مرحلے پر ہر نو ودیا ودیالیہ کے 20 فی صد طلبا کسی مختلف لسانی خطے کے نو ودیا ودیالیہ میں منتقل کر دئے جائیں گے۔ طلباء کا یہ تبادلہ ہندی بولنے والے اور ہندی نہ بولنے والے اضلاع کے درمیان ہوگا۔ ہندی بولنے والے اضلاع میں نو ودیا ودیالیہ میں پڑھائی جانے والی تیسری زبان غیر ہندی خطے سے تبدیل ہو کر آنے والے 20 فیصد طلباء کی زبان ہوگی۔ اس زبان کی تعلیم لازمی ہوگی۔ غیر ہندی خطوں میں نو ودیالیہ سہ لسانی فارمولے پر عمل کریں گے یعنی علاقائی زبان ہندی اور انگریزی تا حسب کہ آٹھویں اور نویں درجے سے ذریعہ تعلیم ہندی یا انگریزی ہوگا۔ متعلقہ نو ودیا ودیالیہ میں تیسری زبان کی تعلیم کے لئے جس کا اوپر ذکر آیا ہے مطلوبہ قابلیت کے معلم مقرر کئے جائیں گے اس زبان کے لئے اچھے اور مقررہ وقت میں مکمل کئے جانے والے نصابات رائج کئے جائیں گے تا کہ متعلقہ ودیالیہ میں خصوصاً ایسے طلباء کو جو اس زبان کے گروپ کے باہر سے آئے ہیں اس زبان کے عالموں اور ادبی ورثہ سے واقف کرلینا چاہیئے۔ اس زبان کی خصوصیات سے شناسائی پیدا کی جائے اور اس کے خطے اور اس کو بولنے والے لوگوں کی پہچان کرائی جائے۔ اس طرح مختلف لسانی گروہوں کے درمیان تقابلی مطالعہ تعمیق باہمی سوجھ بوجھ اور قدر افزائی کا ایک وسیع میدان کھل جائے گا جس سے قومی یک جہتی کو تقویت ملے گی۔ اس سے بین لسانی حوالہ جاتی مواد کی بڑے پیمانے پر تیاری کے عمل کو تحریک ملے گی، ادبی لین دین ہوگا اور لسانی دیواریں نیز ان کے اخذ تعمیر کئے گئے تعصبات منہدم ہوں گے۔

نو ودیا ودیالیہ میں داخلہ متعلقہ ضلع میں کئے گئے امتحان کی بنا پر ہوگا جہاں سب طلباء نے تعلیم پائی ہو ضلع کے کسی سکول تحصیل یا بلاک کا طالب علم داخلے کے امتحان میں شریک ہوگا۔ امتحان کی زبان مادری زبان یا علاقائی زبان ہوگی۔ تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل اس امتحان کا نمونہ

تیار کر دیا ہے اور کونسل امتحان لینے نیز پرچوں کو جانچنے کے عمل میں بھی شریک رہے گی۔ امتحان اس ڈھنگ کے ہوں گے کہ دیہات کے اسکولوں کے ہونہار طالب علم کو محرومی کے بغیر ان امتحانوں میں مقابلہ کر سکیں۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے بچوں کے لیے ان اسکولوں میں نشستوں کا تخصیص متعلقہ اضلاع میں ان کی آبادی کے تناسب سے کی جائے گی۔ لیکن کسی اسکول میں بھی یہ تناسب قومی اوسط تناسب سے کم نہیں ہوگا۔ اگر ان دو زمروں کے طلبا کی کافی تعداد اس آزمائش پر پوری نہ اتری ہو تو ان دو زمروں میں نشستوں کی تعداد میں ادل بدل ممکن ہوگا۔ امتحان لینے کی تکنیک میں ضروری انتظام کیا جائے گا تاکہ ان دونوں زمروں کے بچوں کو ان کے لئے مخصوص نشستوں کے مطابق نوودیا ودیالیہ میں داخلہ مل سکے۔

نوودیالیہ ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ سے ملحق ہوں گے۔ ہر جماعت میں عام طور پر دو سیکشن ہوں گے اور ہر سیکشن میں طلبا کی زیادہ سے زیادہ تعداد چالیس ہوگی۔ اسکول چھٹی سے ساتویں جماعت تک ہوں گے۔ یہ رہائشی اسکول ہوں گے جہاں ہوسٹل کی سہولت تمام طلبا کو مہیا کی جائے گی وہاں کافی تجربہ گاہیں اور ریڈیو، ٹی۔ وی اور مائکرو کمپیوٹر جیسی جدید تعلیمی امدادی سہولیات ہوں گی۔ یہ سہولیات کافی تعداد میں مہیا کی جائیں گی تاکہ تمام جماعتیں ان کے استعمال سے مستفید ہو سکیں۔ ان اسکولوں میں انسانیات، سائنس، کامرس اور پیشہ ورانہ چاروں اقسام کے مضامین کی تعلیم دی جائے گی۔ جسمانی تعلیم، کھیل کود، یوگا، ثقافتی سرگرمیوں اور فنون لطیفہ پر اعلیٰ پروگرام، پیدل سیر، تعلیمی، ثقافتی اور تاریخی دلچسپی کے مقامات کے دورے اور حقیقی کام کے تجربے کو ان اسکولوں میں کافی اہمیت دی جائے گی اور اس مقصد کے لئے کافی انتظامات کئے جائیں گے

اسکولوں کے طلبا صفائی، درخت لگانے اور اسکولوں کے احاطے کو خوبصورت بنانے میں بھی ہاتھ بٹائیں گے۔ ان میں محنت کے وقار اور ماحول کی بیداری پیدا کرنے کے لئے خصوصی پروگرام شروع کئے جائیں گے۔ ہوسٹلوں کی زندگی تعلیمی عمل کا ایک لازمی جزو ہوگی۔ اختراع اور تجربات کے لئے نوودیا ودیالیہ میں پورا پورا امکان ہوگا۔ پوری تعلیمی سرگرمی اس ڈھنگ سے منظم کی جائے گی کہ پیدائش کے اتفاق اور سماجی ماحول کے سبب جو تعصبات و احساسات تعلیمی کامیابیوں اور شخصیت کی تعمیر میں حائل ہوتے ہیں ان نفسیاتی اور سماجی رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔

لیکچروں کے ذریعہ تعلیم دینے کی بجائے عملی تعلیم کو ترجیح دی جائے گی۔ طلبا کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ انہیں جن موضوعات میں دلچسپی ہے وہ اس کی نشاندہی کریں اور ان سے متعلق

جکیشن پر کام کریں گی۔ چونکہ یہ نصابی و غیر نصابی سرگرمیاں طلبا کی صلاحیتوں کے فروغ اور ین قدروں کو سمونے کے لئے اہم خام مال کا کام کریں گی۔ لہٰذا ان اسکولوں میں صرف ان ریمیوں کے لئے خاص طور پر ایک ایک معلم مقرر کیا جائے گا۔ چونکہ ان سکولوں کے بہت سے پہلو پریمنٹری نمائش ہیں اس لئے وہاں کے نصابات، امتحانی، غیر نصابی سرگرمیوں اور اساتذہ کی بیت کے عمل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے بین الاقوامی مرکز اور تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل مشورہ کیا جائے گا۔

ہر سکول میں تدریس، تجربہ گاہوں، نصابات کے متعلقہ کمروں، بورڈنگ یا وسیع اور عملے کوارٹروں کے لئے کافی تعداد میں عمارتیں مہیا کرنے کی تجویز ہے۔ ہوسٹل کی رہائش گاہ ڈارمیٹری سکی ہوگی جس کے ساتھ ہی واشڈن اور اس کے نگہبان کی رہائش گاہ ہوگی تاکہ طلباء کے لئے گھریلو ماحول پیدا کیا جا سکے۔ لڑکیوں کے لئے اسی قسم کا الگ انتظام ہوگا۔ سکولوں کے محل ے اور عمارتوں وغیرہ کے بارے میں فیصلہ فوری طور پر ریاستی سرکار کی پیشکش کی بنا پر کیا جائے گا۔ اسکولوں موجودہ عمارتوں، کام میں نہ لائی جا رہی پراجیکٹ عمارتوں اور دیگر ایسی ہی عمارتوں کے بارے میں بھی کیا جائے گا جن کے ساتھ کافی زمین خالی ہو۔ جہاں تک ممکن ہوگا یہ سکول دیہی علاقے میں ہی قائم ہو جائیں گے۔ مقامی لوگوں اور غیر اداروں سے چندے لینے کی بھی کوشش کی جائے گی نئی عمارتوں تعمیر صرف آخری چارہ کار کے طور پر ہی کی جائے گی۔ یہ عمارتیں بھی کام میں آنے والی نوعیت کی ہی بنائی جن کے لئے جہاں تک ممکن ہوگا مقامی عمارتی مسالہ بھی استعمال کیا جائے گا۔ یہ عمارتیں کم لاگت کی ہے اور ایسے ڈھنگ سے تعمیر ہوں گی کہ وہاں طلبا اپنے آپ کو اس ماحول سے اجنبی نہ سمجھیں ں سے وہ آئے ہیں۔

اساتذہ کی بھرتی کل ہند بنا پر ہوگی اور انہیں ایک سے دوسرے ودیالیہ میں تبدیل کیا جا سکے ان اساتذہ کے لئے ملازمت کے دوران تربیت کے نصاب تعلیمی تحقیق کی قومی کونسل کی طرف چلائے جا رہے تنظیم کے علاقائی کالجوں میں شروع کئے جائیں گے۔ اعلیٰ قابلیت اور تعلیمی ن رکھنے والے اساتذہ کو راغب کرنے اور کام میں لگائے رکھنے کے لئے مالی ترغیبات کے دہ خصوصی مراعات بھی دی جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نتائج کے لئے اساتذہ کی ذمہ اری جو مختلف پہلوؤں میں ہوگی) ایک اچھے سے ڈھنگ سے نافذ کیا جائے گی۔

ان اسکولوں کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت کے محکمہ ہم میں انجمنوں کے اندراج کے قانون کے تحت ایک خود مختار انجمن قائم کی گئی ہے۔ یہ انجمن

مناسب انتظامات کرنے کی ضرورت ہے نہ صرف ان سکولوں کی کارکردگی کی جانچ کی جا سکے بلکہ نوودیا ودیالیہ کے نظام کے بارے میں مثالی تجربہ کرنے اور مسلسل ترقی کا اہتمام ہو سکے۔ انسانی وسائل کے فروغ کے وزیر اس انجمن کے صدر ہوں گے۔ چونکہ یہ اسکول مقامی حالات کے سلسلے میں اپنی روایات اور اپنی مہارت قائم کر کے اچھی طرح ترقی کر سکتے ہیں لہٰذا ہر سکول کو ضروری حد تک روزمرہ کے انتظامیہ اور تعلیمی اہتمام کے اختیارات دینے کی تجویز ہے۔

ایک بار جب نوودیا ودیالیہ اہلیت کار کی معقول سطح پر کام شروع کر دیں گے تو وہ اپنے قرب و جوار میں دوسرے سکولوں کے ساتھ رابطے قائم کر سکیں گے۔ یہ رابطے پرائمری اسکولوں کی معیار بلند کرنے کے سلسلے میں رہنمائی کرنے اور سماعی و بصری سامان اور چھوٹے کمپیوٹروں وغیرہ میں حصہ داری کرنے کی صورت میں قائم ہو سکتے ہیں۔ دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں نوودیا ودیالیہ کے ایک رہنما کے کردار کا [illegible] اس سلسلے کی تربیت میں ان کی شرکت، مل کر سرگرمیوں کی تنظیم، تعلیم کے نئے طریقوں کی توسیع اور معلومات و جانچ کے عمل کے بارے میں علم کی ترسیل سے کیا جا سکے گا۔ اس خاص مقصد کے لئے رقوم مخصوص کی جائیں گی۔

نوودیا ودیالیہ سکیم کو جلد شروع کر دینے کے پیش نظر حکومت نے اسی برس کم از کم 60 اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو زیادہ سے زیادہ اگست کے وسط میں کام شروع کر دیں گے۔ ساتویں منصوبے میں اس اسکیم پر عمل کرنے کے لئے 500 کروڑ روپئے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس رقم سے یہ اسکول قائم کرنے کے اثاثی اور کاروباری اخراجات پورے ہو سکیں گے۔ نظرثانی کردہ شرائط کے مطابق اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ودیالیہ پر اندازاً ایک کروڑ روپیہ خرچ آئے گا نہ کہ قریب تین کروڑ روپئے جیسے کہ پہلے اندازہ لگایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ اسکیم مرکز کی ایما پر شروع کی جا رہی ہے لیکن یہ ریاستوں اور مرکز کی ایک ملی جلی کوشش ہے کیونکہ اس میں امید رکھی گئی ہے کہ ریاستیں یہ اسکول قائم کرنے کے لئے مفت زمین مہیا کریں گی۔

درحقیقت ہم یہ یقین رکھ سکتے ہیں کہ جب ایک بار یہ سکیم صحیح ڈھنگ سے شروع ہو جائے گی تو بھارت میں تعلیم کو سب سے بڑی تحریک ملے گی اور اس وسیع برصغیر کو مزید متحد اور یکجا کرنے کے لئے ایک بڑا اور زوردار قدم اٹھایا جا سکے گا۔

*****

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

قسط سوم　　خلیل الحمل

کینسر

(مردوں کا علاج)

اس سے قبل دو مضامین میں کینسر کے اسباب، تشخیص اور احتیاطی تدابیر کے بارے میں لکھا گیا ہے اس مضمون میں مردوں کو ہونے والے کینسر کے علاج پر ۲۵ سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

س۔ کینسر کا علاج کیسے کیا جاتا ہے؟

ج۔ کینسر کا علاج عمل جراحی، ادویات، ایکسرے یا کوبالٹ تھراپی اور بہت ہی کثیف الکٹران تھراپی سے کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ بیماری ابتدائی مرحلہ میں ہو۔

س۔ کیا ایکسرے کا استعمال ہر قسم کے کینسر کے لئے مناسب ہے؟

ج۔ نہیں اس کا انحصار کینسر کی نوعیت اور اس سے متاثرہ مقام پر ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض کینسر پر ایکسرے یا ریڈیم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے ایسے کینسر کا علاج صرف عمل جراحی یا ہارمون سے کیا جاتا ہے۔

س۔ ایکسرے اور ریڈیم کے علاج میں کیا فرق ہے؟

ج۔ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں کینسر کے خلیوں کو جسم کے صحت مند خلیوں کو نقصان پہنچائے بغیر ہلاک کر دیتے ہیں۔

س۔ ریڈیم کس طرح استعمال کی جاتی ہے؟

ج۔ ریڈیم کو سوراخ دار سوئیوں کے ذریعہ کینسر سے متاثرہ ریشوں میں داخل کیا جاتا ہے اور علاج کے بعد نکال دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ریڈیم کو ایک خاص آلہ میں رکھ کر جسم کو دور سے دکھا دیا جاتا ہے۔ جس سے ریڈیم شعاعیں اس آلہ سے متاثرہ حصہ سے گزر جاتی ہیں جیسا کہ جلدی کینسر میں ہوتا ہے۔

س۔ جراحی کینسر کے لئے کتنی موثر ہے؟

ج۔ جراحی ابتدائی مرحلے میں بہت موثر ہے۔ پلاسٹک جراحی اور دوسرے قسم کے عمل جراحی

سائنٹسٹ ۔ ریجنل ریسرچ لیباریٹری ۔ حیدرآباد

میں کافی ترقی ہوئی ہے۔

س۔ کیموتھراپی کا کیا مطلب ہے؟

ج۔ یہ وہ طریقۂ علاج ہے جس میں ادویات اور انجکشن استعمال کئے جاتے ہیں۔ اب تک (۴۰) اقسام کے بہت ہی طاقتور اور موثر ادویات کینسر کے علاج میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

س۔ کیا کینسر کے پھیلاؤ کو عارضی یا مستقلاً روکا جا سکتا ہے؟

ج۔ یہ وقت کی بات ہے۔ بعض اوقات کینسر کے لاعلاج اور ناامید مریضوں میں ایک علاج سے عارضی طور پر کینسر کو روکا گیا ہے۔ لیکن مزید علاج بعد میں ان کے لئے بے سود ثابت ہوا۔

س۔ اگر کینسر کا شبہ ہو تو سب سے پہلے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ سب سے پہلے مکمل جانچ اور طبی معائنہ کروانا چاہئے۔

س۔ کیا کینسر کا علاج ممکن ہے؟

ج۔ اگر کینسر کا ابتدائی مرحلہ میں بروقت علاج کیا جائے تو ۸۵ فیصد مریض صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کینسر میں مبتلا ایک دیرینہ مریض کا بھی علاج ہو سکتا ہے جس کا انحصار صرف کینسر کی نوعیت پر ہے۔

س۔ کیا یہ بات پورے وثوق اور اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ کینسر کا علاج ممکن ہے۔ اگر ایسا ہے تو کتنے عرصہ کے بعد یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ دوبارہ کینسر لاحق نہیں ہوگا؟

ج۔ اگر علاج کے بعد ۵ سال گزر جائیں اور مریض میں کینسر کی کوئی علامتیں موجود نہ ہوں تو یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مستقل علاج ہو چکا ہے لیکن بعض اوقات ۸ تا ۲۰ سال کے بعد بھی کینسر دوبارہ ظاہر ہوا ہے۔

س۔ ایک کینسر کے بعد کیا دوسری نوعیت کا کینسر اسی مقام یا جسم کے دوسرے مقامات پر ہو سکتا ہے

ج۔ اگر کوئی شخص ماضی میں کینسر میں مبتلا ہوا ہو تو بہتر ہے کہ وہ وقفہ وقفہ سے اپنا طبی امتحان کراتا رہے کیونکہ ایک مرتبہ کینسر سے رغبت ہونے کے بعد دوبارہ اسی مقام یا جسم کے دوسرے حصوں پر کینسر حملہ کر سکتا ہے۔

س۔ کیا کینسر کے خلاف جسم میں مدافعتی صلاحیت پیدا کرنا ممکن ہے؟

ج۔ مدافعتی صلاحیت (IMMUNITY) صرف ان بیماریوں میں بذریعہ ٹیکہ اندازی پیدا کی جا سکتی ہے جو جراثیم سے پھیلتے ہیں۔

س۔ کیا کسی مرہم کے ذریعہ کینسر کا علاج کیا جا سکتا ہے؟

ج۔ نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی مرہم جسم کے اندرونی ریشوں تک پہنچ کر کیانسر کے خلیوں کو تباہ نہیں کر سکتا۔

س۔ کیا کوئی کیمیائی مرکب کیانسر کے خلیوں کو تباہ کرنے کے لئے دریافت ہوا ہے؟

ج۔ ہاں۔ ایک کیمیکل جس کو "نائٹروجن مسٹرڈ" "NITROGEN MUSTARD" کہا جاتا ہے روی طور سے بعض کیانسر کے خلیوں کو تباہ کر سکتا ہے۔

س۔ کیا ہارمون سے کیانسر کا علاج ممکن ہے؟

ج۔ یہ طریقہ ابھی بھی تحقیق کا محتاج ہے۔ یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ یہ طریقۂ علاج کیانسر کے علاج میں کتنا کارگر ثابت ہوگا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ہارمون کے علاج سے مریض کی زندگی کو طوالت دی جا سکتی ہے اور درد کی شدت میں کمی کی جا سکتی ہے جو عموماً پستانوں اور اعضائے رئیسہ کے کیانسر میں ہوتا ہے۔

س۔ امینو تھیراپی کیا ہے؟

ج۔ امینو تھراپی (IMMUNO THERAPY) ایک بالکل نیا طریقۂ علاج ہے جس میں انسان کے جسم میں کیانسر کے خلاف مدافعتی استعداد پیدا کی جاتی ہے۔

س۔ کیانسر کے موجودہ علاج کے طریقوں میں سب سے زیادہ کامیاب اور موثر علاج کونسا ہے؟

ج۔ اگرچہ کئی تجربہ گاہوں میں کیانسر کے علاج پر تحقیق کام ہو رہا ہے لیکن جراحی، ایکسرے انجکشن اور کیمیائی ادویات ہی موثر ہتھیار ثابت ہوئے ہیں۔ بعض ہارمون اور آئسو ٹوپ (ISOTOPES) کے استعمال سے مدد لی جا رہی ہے لیکن ابھی بھی کچھ اعتماد سے بتانا مشکل ہے۔

س۔ کیا واقعی کیانسر پر تحقیق میں پیش رفت یا ترقی ہو رہی ہے؟

ج۔ درحقیقت اب تک تحقیق سے صرف جسمانی خلیوں کے معمول اور غیر معمولی نشوونما کے بارے میں معلومات فراہم ہو چکے ہیں۔ کیانسر کے اسباب اور اس کی روک تھام کی منزل مقصود کا پتہ تو صرف مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ کیانسر پر جن زاویوں سے تحقیق ہو رہی ہے ان میں کیمیائی علم کے لئے ہارمون کی کردار سازی، طبیعاتی علم کے لئے تابکار اشیاء اور طاقتور ایکسرے شامل ہیں اور ٹیومر کے متعلق بنیادی معلومات فراہم کئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانی تغذیہ اغذیہ اور کیمیا کے دوسرے شعبہ جات پر تحقیق جاری ہے۔

س۔ کیانسر کا علاج کہاں ہوتا ہے؟

ج۔ ٹاٹا میموریل ہسپتال بمبئی میں کوئی ۵۰ فیصد مریض صحت یاب ہو

مرض کے ابتدائی مرحلے میں علاج کروانے سے صحتیابی کے مواقع دوگنے ہو جاتے ہیں۔

س۔ کیا کینسر سے شفا پانے کے بعد کیا معمول کے مطابق زندگی گزاری جا سکتی ہے؟

ج۔ ہاں۔ اکثر مریض علاج کے دوران ہی معمول کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔

س۔ کیا [illegible] کا کینسر مختلف نوعیت کا ہوتا ہے؟

ج۔ کینسر مرد اور عورت کے درمیان تمیز نہیں کرتا۔

س۔ کونسا کینسر عورتوں کے مقابلہ میں مردوں میں عام ہے؟

ج۔ منہ، معدہ، جائے مخصوص، عضو تناسل، حلق، گردے، مثانہ، شش، دماغ اور جلد کا کینسر مردوں میں عام ہے۔

س۔ کیا کینسر جنسی اختلاط کا نتیجہ ہے؟

ج۔ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

س۔ کیا غدود (PROSTATE) کا کینسر بہت ہی عام ہے اگر ایسا ہے تو یہ کس عمر میں لاحق ہوتا ہے؟

ج۔ یہ عمر رسیدہ لوگوں میں عام ہے۔ مردوں کو چاہئے کہ ۶۰ سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل اس سے ہوشیار رہیں۔ مکمل طبی امتحان ہی اس مخفی کینسر کا پتہ دے سکتا ہے۔

س۔ کیا سگریٹ نوشی سے کینسر ہوتا ہے؟

ج۔ سگریٹ نوشی سے شش، حلق اور منہ کا کینسر ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ ترک کر دی جائے۔

غرض کینسر کے علاج میں بروقت یکسوئی اور تشخیص بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لئے ہم اپنا وقتاً فوقتاً طبی معائنہ کرتے رہیں۔ جس سے کینسر کو پہچاننے اور علاج کرنے میں سہولت ہوگی ورنہ لاپروائی اور غفلت موت کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ ★ ★

بشکریہ: (انڈین کینسر سوسائٹی)

بیجوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ پڑھائی کی تکمیل کے بعد نوکری کے لئے بھی خوشامد کرنی، سفارش کروانی اور رشوت دینی پڑتی ہے۔ سمنٹ کا حصول یا مکان کا الاٹمنٹ، راشن یا دودھ کارڈ بنوانا ہو یہ اور ایسے ہی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے کام کے جس سے زندگی میں خوشحالی آتی ہے ہمارے نکموں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ غرض قابل رشک و آسائش کی زندگی آج کل خوشامد، سفارش اور رشوت کی مرہون منت ہوگئی ہے ■

عابد معز

خوشامد
خوشحالی کا تکون

عنوان دیکھ کر آپ نے ہمارے مضمون کا تعلق خاندانی منصوبہ بندی سے قائم کیا ہے تو آپ کا اندازہ صحیح نہیں ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے لال تکون سے بھی زندگی میں وہ خوشحالی نہیں آسکتی جو ہمارے تکون میں مضمر ہے۔ ہمارا تکونِ خوشحالی "تین ش" پر مشتمل ہے خوشامد، سفارش اور رشوت۔ محنت کا پھل، مسئلہ کا حل، امتحان کا نتیجہ، مرضی کی قبولیت، آمدنی کی برکت غرض ہر پہلو سے زندگی میں خوشحالی کا دارومدار ہمارے تکون پر منحصر ہے۔

خوشحالی کے تکون پر عمل خوشامد سے شروع کرنا چاہئے۔ خوش آمد سے زندگی میں خوشی آتی ہے۔ خوشامد کے معنی لوگوں کو خوش کرنا ہوتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ دوسروں سے مسکرا کر ملیں، علیک سلیک میں پہل کریں اور خیر خیریت دریافت کرتے رہیں۔ ایسا کرنے سے لوگ آپ سے خوش رہیں گے، آپ کی تعریف کریں گے اور آپ کو با اخلاق اور باکردار سمجھا جائے گا۔ آپ کا حلقۂ احباب وسیع ہوگا۔ ہر جگہ آپ کو جاننے اور پہچاننے والے پیدا ہوں گے جو آپ کی مدد کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ لوگوں کو خوش رکھنے کا یہ ایک عام طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اشخاص کو خوش رکھنے کے لئے مختلف طریقے اپنانے پڑتے ہیں اس لئے کہ ان کے خوش ہونے کے معیار جدا ہوتے ہیں۔

کاروباری دنیا میں مسکراہٹ، میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس مسکراہٹ کا نام PROFESSIONAL SMILE ہے۔ مسکراہٹ اور لچھے دار باتوں سے

سامنے والے کو مسحور کرنے کے بعد اپنا اُلو سیدھا کیا جاتا ہے۔ آپ نے اخبار میں یہ خبر ضرور پڑھی ہوگی کہ امریکہ میں ایک دوکان پر سیلزمین کی باتوں سے متاثر ہوکر صحرائی شیخ نے پانی میں چلنے والی کشتی خرید لی تھی۔ دور کیوں جائیے ہم خود اپنی مثال پیش کرتے ہیں۔ آج تک ہم نے کپڑے اور جوتے پرکھ کر نہیں خریدے۔ بیچنے والے کی باتوں سے دھوکہ کھاتے رہے ہیں۔ مسکراہٹ، میٹھی اور [illegible] کرنے کے سبب آج کل سیلزمین کی سیلز گرل کو فوقیت دی جارہی ہے۔ سیلز گرل کی کوشش سے بھی کام نہ بننے پر ترغیباً کے طور پر "تحفتہً" کوئی نہ کوئی چیز دی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ صابن کے ساتھ صابن دانی، ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ برش، پوڈر کے ساتھ ظرفی حسینہ کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

سماجی زندگی میں آپسی تعلقات استوار رکھ کر اپنا کام نکالنے کے کئی طریقے ہیں۔ تعلقات کو تعلقات عامہ یعنی PUBLIC RELATIONS کا نام دیا گیا ہے۔ عید اور تہوار، شادی بیاہ اور دوسری تقاریب پر مبارکباد اور سانحہ یا حادثہ پر تعزیت کرنا معمولی باتیں ہیں۔ الفاظ اور جذبات کے اظہار سے تعلقات میں اتنی پختگی نہیں آتی جو لنچ یا ڈنر پارٹی دینے سے آتی ہے۔ اسی لئے وقتاً فوقتاً کام آنے والے دوست احباب ذی اثر لوگوں کی دعوت کرتے رہئے۔ سردی میں گرم چائے، گرما میں ٹھنڈا مشروب، آئس اور بلا قید موسم کھانے کی دعوت دلوں کو رام کر لیتی ہے۔ ہم ایک صاحب سے واقف ہیں کبھی نہ کبھی کسی عنوان سے پارٹی دیتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ خود اپنی سالگرہ، کئی مرتبہ لڑکوں کی سالگرہ، شادی کی سالگرہ، عید ملاپ، تہنیتی اور وداعی پارٹیاں دینا ان کا معمول ہے۔ دعوتوں سے اور دعوتوں میں آپسی تعلقات بڑھتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔

سیاسی زندگی میں خوشامد اہم مقام رکھتی ہے۔ لیڈر کا شایان شان استقبال کرنا پڑتا ہے۔ خیر مقدمی کمانیں، رنگین جھنڈیاں، پوسٹرس، گلپوشی سے لے کر جلوس نکالنا پڑتا ہے۔ جلسے منعقد کرنے پڑتے ہیں۔ جلسوں میں کئی اشخاص توصیفی اور غیر ضروری باتوں سے قائد کو خوش کرتے ہیں۔ وقفہ وقفہ سے اپنی وفاداری کا یقین دلانا پڑتا ہے۔ قائد کی ایک سالہ، دو سالہ [illegible] خدمات کے اعتراف میں جلسے کروانا پڑتا ہے۔ قائد کی سشٹی پورتی تقریب منانا پڑتا ہے قائد کو سکوں میں تولا جاتا ہے، نوٹوں کا ہار پہنایا جاتا ہے اور جب صاحب اقتدار قائد مہربان ہو جائے پھر کیا کچھ نہیں ہوتا!

خوشامد سے چند کام بنتے ہیں لیکن صرف خوشامد سے اکثر لوگ مطمئن نہیں ہوتے۔ خوشامد

ناکام ہونے پر اپنا کوششوں میں سفارش کا اضافہ کرنا چاہئے۔ سفارش دوسروں سے اپنے لئے کروائی جاتی ہے۔ سفارش کرنے والے کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔ جس شخص کے پاس سفارش کروانی ہے اس کے عادات و اطوار بلکہ چال چلن کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے دوست احباب کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ نیز اس کی کمزوریوں کے بارے میں معلومات کرنی پڑتی ہیں۔ ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد جو سفارش ہوگی وہ رد نہ کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہم ایک اہم نکتہ بتلاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی کمزوری ان کی نصف بہتر ہوتی ہیں۔ ہم ایک آفیسر کو جانتے ہیں جو اپنی ظرافت، ایمانداری اور سخت گیری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اُن کی طبیعت کے خلاف اُن سے کوئی کام کروانا ناممکن تھا۔ ایک صاحب نے اُن کی بیوی سے اپنے لئے سفارش کروائی۔ آفیسر نے لاکھ اپنی بیوی کو سمجھایا لیکن وہ "ارے لیکن" میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ کو میری بات ماننی ہی پڑے گی" اور آفیسر صاحب بقول اکبر الہ آبادی سے

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

سفارش کے تعلق سے ایک اور بات ہم آپ کے گوش گزار کرتے ہیں۔ آج کل سفارش بہت عام اور سستی ہو گئی ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی سے سفارش کرواتا ہے۔ لیکن وہی سفارش کامیاب ہوتی ہے جس میں سفارش کرنے والے شخص کا صحیح انتخاب ہوا ہو۔ جب سفارش کے لئے صحیح انتخاب نہ ہو یا سفارش کے ناکام ہونے کی صورت میں ہمارے ترکش کے آخری "تیر" کو آزمائیے۔

خوشامد اور سفارش کے ناکام ہونے پر اپنا کام نکالنے کے لئے رشوت موثر اور کامیاب ترین حربہ ہے۔ ہمارے ترکش کے آخری عنصر سے ہر دو رشوت لینے اور دینے والے کے حصہ میں خوشحالی آتی ہے۔ رشوت کے تعلق سے ہماری فلموں میں ایک ڈائلاگ اکثر دہرایا جاتا ہے۔

"یہاں ہر چیز بکتی ہے۔ قیمت لگانے والا چاہئے" رشوت پیش کرتے وقت رشوت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے۔ رشوت احتیاط اور ہوشیاری سے دینا پڑتی ہے۔ رشوت قبول کرنے والے کو محسوس نہ ہونے دیں کہ آپ بہ حالت مجبوری رشوت دے رہے ہیں۔ رشوت دیتے وقت اپنا رویہ ایسا رکھیں کہ قبول کرنے والا سمجھے کہ آپ خوش ہو کر اسے انعام دے رہے ہیں یا تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ رشوت ایک متنازعہ فیہ لفظ ہے۔ اکثر لوگ رشوت کے نام سے بدک جاتے ہیں۔ لیکن جب بھی رشوت انعام، تحفہ، محنتانہ، نذرانہ وغیرہ کے نام سے دی جاتی ہے تو اسے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ اس قسم کے حضرات کے علاوہ ہمارے درمیان کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے لئے سے

رشوت بھی احتیاط کی منزل میں آگئی

کچھ عرصہ پہلے خوشامد، سفارش اور رشوت کو یکے بعد دیگرے آزمایا جاتا تھا۔ لیکن جب
سے گرانی اور افراط زر میں اضافہ ہوا ہے تینوں حربوں سے ایک ساتھ شکار کرنا ضروری ہو
گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست نے نوکری کے لئے ان تین حربوں کا بہت خوبصورت استعمال کیا
ایک مینیجر صاحب کے گھر میووں کی ٹوکری پہنچا کر کہنے لگے "صاحب ماموں کی دکان ہے۔ جب ان
پتہ چلا کہ میں آپ کے یہاں جا رہا ہوں تو انہوں نے یہ پھل پھلاری آپ کی خدمت میں پیش کر
کے لئے دی ہے۔" مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ گئے تو کہنے لگے "میرے چچا کا شیرینی کا کاروبار
تازہ مٹھائی دیکھ کر میرا دل للچایا۔ شکم سیر ہو کر کھایا اور تھوڑی سی مٹھائی آپ کے لئے بھی لیتا چلا آ
میرے چچا آپ کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ انہوں نے سلام کہا ہے۔" بڑے بھائی صاحب کی آ
بہانہ بنا کر کپڑے، سینٹ اور سگریٹ پیش کرتے ہوئے صاحب کی تعریف کرتے "صاحب یہ سوٹ
کپڑا لگتا ہے صرف آپ کے لئے بنایا گیا ہے"۔ "کیا پسند ہے صاحب اتنا برانڈ کا سگریٹ تو
بڑے لوگ پیتے ہیں"۔ خالو کی کار میں صاحب کے بیوی بچوں کو تفریح کے لئے لے گئے تو صاحب کی
سے اپنے لئے سفارش کرنے کو کہا۔ نوکری ملنے کے بعد نوازشیں بند ہوگئیں تو صاحب نے تعجب ظاہر کیا
کی۔ ہمارے دوست نے رقت آمیز لہجہ میں فرمایا "شیرینی کی دکان والے چچا کا دیوالیہ نکل
ماموں صاحب انتقال کر گئے۔ خالو اور بھائی صاحبین وطن واپس کر دئے گئے۔ اب ان تمام خاندا
کا بار میرے نحیف و ناتواں کاندھوں پر ہے۔ صاحب! خدا کے لئے ہمارے حال پر رحم فرمائے
میری تنخواہ میں اضافہ اور میری ترقی کی صورت نکالئے۔ آپ کو اس کا اجر ملے گا۔"

احتیاط کا تقاضہ ہے کہ خوشحالی کے تکون پر عمل دو رخی ہونا چاہئے۔ لوگوں کی خوشامد کرنے
ساتھ خود بھی اوروں کی بے جا تعریف کے لئے مستعد رہنا چاہئے۔ اپنی سفارش کروانے کے سا
خود بھی دوسروں کی سفارش کرنا چاہئے۔ رشوت قبول کرنے کے ساتھ خود بھی اوروں کو رشوت پیش
کرنا چاہئے۔ یک طرفہ عمل سے خوشحالی کے امکانات کم اور بدحالی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں
آخر میں ہم اپنے تکون کی اہمیت کو چند مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ شادی انسان کی ز
میں انقلاب برپا کرتی ہے۔ شادی کے لئے لڑکے کو رشوت بہ شکل جہیز اور گھوڑے جو
کی رقم دی جاتی ہے۔ رشتہ دار لڑکی کی خوبصورتی اور دوسری خوبیوں (جو اکثر موجود نہیں ہوتیں)
کو بڑھا چڑھا کر سفارش کرتے ہیں۔ سسرال والے خوشامد کرتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ
کے لئے بھی تکون کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ رشوت بہ شکل چندہ یا عطیہ دینا پڑتی ہے

باقی ص

مصنف : امین مالوف
مترجم : قاضی جلیل احمد

صلیب کے سائے میں

قسط (۷)

"اپنے خاندان، اپنے لڑکے اور اپنی مسلمان رعایا کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے پہ یاغی سیان کے دل ہی دل میں ملامت کرنی شروع کی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے اور چکرا کر وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ اس کے ہمراہیوں نے اُسے دوبارہ سوار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے آپ کو گھوڑے کی پشت پر قائم رکھنے کے قابل نہ تھا۔ وہ مرنے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے ہمراہی اُسے راہ میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ایک ارمنی لکڑہارے نے جو قریب سے گزر رہا تھا اُسے دیکھ کر پہچانا اور اس کا سر کاٹ کر اپنی جھولی میں ڈال لشکرِ فرنگ میں پہنچا اور اس کے حوالے کر دیا"۔

(ابن الاثیر)

شہر میں آگ اور خون کی ہولی زور و شور سے کھیلی جا رہی تھی۔ مردوں، عورتوں اور بچوں نے کیچڑ بھری گلیوں سے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن فرنگی نائٹوں نے اُنہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مطلومین کی چیخ و پکار جوں جوں دھیمی پڑتی گئی نشے میں چور فرنگیوں کے گانوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں اور جلتے ہوئے مکانوں کے مرغولے اٹھتے گئے۔ دن ڈھلنے تک سارا شہر غم کی اُداسی میں ڈوب گیا۔

۳ر جون ۱۰۹۸ء کی اس خوں چکاں صبح کو صرف ایک شخص اپنے حواس بچا رکھ سکا۔ اور وہ تھا شمس الدولہ۔ جوں ہی شہر میں فرنگیوں کا داخلہ شروع ہوا اس نے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ اپنے آپ کو قلعہ بند (CITADEL) کر لیا۔ فرنگیوں نے اُسے اُس قبضہ سے بے دخل کرنے کی بار بار کوشش کی اور بار بار انھیں منھ کی کھانی پڑی۔ شمس الدولہ قلعہ میں مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فرنگیوں کا سب سے عظیم اور طاقت ور نائٹ بوہیمنڈ بھی ان معرکوں میں بُری طرح گھائل ہوگیا۔

---

۲ ۔ کولسٹن روڈ ۔ فاریسٹ گیٹ ۔ لندن ای/۷ (یو۔کے)

آخر اس نے شمس الدولہ کو پیش کش کی وہ اُسے بحفاظت شہر سے باہر جانے کی اجازت دے گا اگر بغیر لڑے بھڑے شمس الدولہ وہ قلعہ (CITADEL) اس کے حوالے کر دے۔ لیکن نوجوان امیر نے یہ پیش کش بڑے استحقار سے ٹھکرا دی۔ انطاکیہ کو وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور اپنے باپ کے بعد خود بھی وہ حاکم بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ قلعہ میں غذا اور سامانِ جنگ کی کمی نہ تھی۔ اور قلعہ میں بیٹھ کر وہ فرنگ کا مہینوں مقابلہ کر سکتا تھا۔ اور اگر فرنگ نے قلعہ پر چڑھ کر حملہ کرنے کی کوشش کی تو یقینی تھا کہ انھیں ہزاروں سپاہیوں کی قربانی دینی پڑتی۔

ان مدافعین کی عزم و ہمت نے بالآخر ان کے لئے کامیابی کی صورت پیدا کی۔ نائٹوں نے قلعہ پر حملے بند کر دیئے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ تسخیر انطاکیہ کے تین روز بعد قربوقا کی فوج انطاکیہ پہنچی جس کو دیکھ کر شمس الدولہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مسلم فوج کی زبان سے بے اختیار اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔ فرنگیوں نے شہر پناہ کے دروازے بند کر لئے محاصرہ کرنے والے خود محصور ہو کر رہ گئے۔

لیکن شمس الدولہ کی خوشی جلد ہی فکر و پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔ قربوقا کی فوج کے بعض جب قلعے کے اندر آئے تو شمس الدولہ نے ان سے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے فرنگیوں کو شہر انطاکیہ پر قبضہ کرنے کا موقعہ کیوں دیا؟ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب ان ہی امیروں اور سرداروں نے قربوقا کی مدافعت کرنے کے بجائے اس کی حماقتوں، کوتاہ نظریوں پر اپنا بخار نکالنا شروع کیا۔ انہوں نے قربوقا کو ایک مغرور، نکما اور بزدل آدمی بتایا۔

یہ صرف ذاتی عداوت اور دشمنی کی بات نہ تھی بلکہ یہ ایک سازش تھی جس کا سرغنہ خود دقاک تھا جو موصل کی فوج میں جب وہ دمشق کے قریب سے گزر رہی تھی شامل ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی فوج کسی طرح بھی ایک متحدہ طاقت نہیں تھی بلکہ وہ شہر یاروں کا وفاق تھا جن کے مفاد اکثر ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ اپنے سلطنت کی حدود کو وسیع کرنے کی اتابک کی خواہش کسی سے چھپی نہ تھی۔ اور دقاک کے لئے اپنے ساتھیوں کو یہ باور کرانا کچھ مشکل نہ تھا کہ ان کا اصلی دشمن قربوقا ہے اگر فرنگیوں کے مقابلے میں قربوقا کو کامیابی ہو جائے تو شام کا کوئی شہر اس کے تسلط سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ اس کے برخلاف اگر قربوقا کو شکست ہو جائے تو شام کے سر سے خطرہ ٹل جائے گا۔ قربوقا کے مقابلے میں فرنگیوں کا خطرہ کمتر درجے کا تھا۔ دوم اگر اپنے شہر انطاکیہ پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ فرنگی لوگ شام کے سارے شہروں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابن الاثیر کہتا ہے کہ اتابک نے اپنی حماقتوں سے مسلمانوں کو اس قدر بزدل کر دیا تھا کہ وہ میدانِ جنگ میں

ن کے ساتھ دغا کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

لہٰذا قربوقا کی یہ عظیم طاقت ایک ایسے سنگی مجسمے کی مانند تھی جس کے پیر مٹی کے بنے ہوں۔
ـمس الدولہ نے امیروں کی تنگ دلانہ ناچاقیوں کو دور کرنے کی بہت کوشش کی۔ اس کے خیال
ں بدلہ چکانے کا یہ کوئی مناسب موقعہ نہ تھا۔ لیکن اس کی امیدیں حباب آسا ایک لمحے کے لئے پانی
سطح پر ابھر کر ختم ہو گئیں۔ انطاکیہ پہنچتے ہی قربوقا نے شمس کو اپنے حضور طلب کیا۔ اور کہا کہ قلعہ
فوج کی کمان سے اُسے معزول کیا جاتا ہے۔ شمس کی ناراضی کی حد نہ رہی۔ کیا اس نے اپنی بہادری
رجفاکشی سے ابھی تک قلعہ کو فرنگیوں کے ہاتھ سے بچائے نہیں رکھا تھا؟ کیا وہ اس علاقے کا جائز
اِن نہ تھا؟ لیکن اتابک نے کوئی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اب وہ حاکم نہ تھا اور ہر ایک کو
تسلیم خم کرنا لازمی تھا۔

شمس الدولہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ مسلمان فوج یہ جنگ نہیں جیت سکتی۔ اب اس کے لئے
نیت کی بات صرف یہ رہ گئی تھی کہ دشمن کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ ابن الاثیر کے مطابق انطاکیہ
فتح کے بعد یہ بارہواں دن تھا کہ فرنگ فاقہ کشی کی حالت میں بسر کر رہے تھے۔ سرداران لشکر
نے مرکبوں کو کاٹ کاٹ کر پیٹ کی آگ بجھانے لگے تھے۔ اور غریبوں نے درخت کی چھالوں اور
ں پر گذارہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ فرنگیوں کو اس سے پہلے بھی قلتِ رسد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
ن اُس وقت وہ شہر کے باہر آزاد ہوا کرتے تھے۔ اور دور دور تک دھاوے کر کے کچھ نہ کچھ
سد فراہم کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ خود شہر پناہ کی دیواروں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے اور
ہر میں بھی کوئی رسد اُن کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ لہٰذا ان کی فوج میں بھی سپاہیوں کے فرار کے
اقعات کثرت سے ہونے لگے۔

شاید قدرت کے لئے بھی مشکل ہو رہا تھا کہ ان دو دل ہاری ہوئی طاقتوں میں سے کس کا
مقدر کرے کہ ایک غیر معمولی واقعے نے حالات کی نوعیت کو بدل کر رکھ دیا۔ فرنگیوں نے اعجاز، اعجاز
رکرامات کرامات کے نعرے لگائے۔ لیکن ابن الاثیر نے جو واقعات لکھے ہیں ان میں کسی معجزے
وجود نہیں پایا جاتا۔

"فرنگیوں کا سردار اعلیٰ بوہیمنڈ تھا۔ لیکن لشکرِ فرنگ میں ایک مکار پادری تھا جس نے فرنگیوں
یہ یقین دلایا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا ایک نیزہ قسیان کے مقام پر حوالی انطاکیہ میں کہیں دفن
ہے۔ اس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر فرنگی لوگ اس نیزے کو پانے میں کامیاب ہو جائیں تو سمجھو
فتح انہی کی ہے۔ بصورتِ دیگر اُن کی موت یقینی ہے۔ اس نے فرنگیوں سے کہا کہ تین دن تک مسلسل

روزے رکھیں اور عبادت کریں ۔ چوتھے دن وہ اپنے ساتھ کچھ زمین کھودنے والوں کو لے کر ایک عمارت میں داخل ہوا ۔ اور انہیں چاروں طرف کھدائی کا حکم دیا ۔ اور اس طرح کھدائی میں وہ نیزہ برآمد کر لیا گیا جو پہلے ہی سے اس پادری نے وہاں چھپا رکھا تھا ۔ خوشی مناؤ کہ فتح اب یقینی ہے ! پانچویں دن انہوں نے پانچ پانچ ٹکڑیوں میں شہر سے نکلنا شروع کر دیا ۔ مسلمانوں نے قربوقا سے کہا ہمیں چاہیئے کہ جلد از جلد فصیل کے دروازوں کے قریب پہنچ کر باہر نکلنے والوں کو تہ تیغ کر دیں ۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اب بھی قربوقا نے ان کی رائے سے اختلاف کیا ! کہا ٹھیر جاؤ ۔ جب سب فرنگی باہر نکل آئیں تب سب کو ایک ساتھ تہ تیغ کر دیا جائے گا ۔"

آتابک کا اندازہ غلط بھی نہ تھا جتنا کہ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے ۔ فرنگی فوج میں بے اطمینانی اور ناراضی کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ اس کی نظروں سے بھی پوشیدہ نہ تھی اگر اس وقت فرنگیوں پر حملہ کیا جاتا تو بہت ممکن تھا وہ پھر قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہتے ۔ اگر محاصرہ طول پکڑتا تو مسلمان فوج میں مزید بددلی اور انتشار کا پیدا ہونا لازمی تھا ۔ اس لئے وہ فرنگیوں کو قبل خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ قربوقا نے جس چیز کا اندازہ نہیں لگایا وہ یہ تھی کہ اس کے اس طرز عمل کا اس کی اپنی فوج پر کیا اثر ہوگا ؟ اور اس کے مخالفین اس کو کس رنگ میں پیش کریں گے ۔ لہٰذا ادھر تو پانچ پانچ چھ چھ کر کے فرنگی شہر سے باہر نکلتے رہے اور ادھر مسلمان فوجیوں نے لشکر کو چھوڑ کر فرار ہونا شروع کر دیا ۔ فوج کی یہ حالت دیکھ کر اور یہ سمجھ کر شاید فرنگیوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے جتنی کہ وہ سمجھتا تھا ۔ اس نے بو ہمینڈ سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی ۔ اس سے فوج اور دشمن دونوں میں اس کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا فرنگیوں نے اس کی صلح کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا ۔ اور مسلم فوج پر حملہ کر دیا — مجبور قربوقا نے اپنے تیر اندازوں کو تیر برسانے کا حکم دیا ۔ لیکن دقاق اور اس کے سردار جنگ سے الگ ہو گئے ۔ یہ دیکھ کر آتابک نے عام پسپائی کا حکم جاری کر دیا ۔ اور فوج میں بھگدڑ مچ گئی ۔ اور اس طرح ایک طاقت ور مسلم فوج کھائی ہوئی بھس کی طرح فضا میں تحلیل ہو گئی ۔ ابن الاثیر لکھتے

"خود اہل فرنگ کے لئے بھی یہ فتح اتنی غیر متوقع تھی کہ انہوں نے اسے بھی کوئی جنگی چال ہی سمجھا کیوں کہ اب تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی تو پھر بغیر لڑے یہ شکست کیسی ۔ اسی لئے انہوں نے سوچا کہ مسلمانوں کا پیچھا نہیں کرنا چاہیئے ورنہ ممکن ہے وہ لوگ پلٹ کر حملہ کر دیں ۔ اور اس طرح قربوقا صحیح سلامت موصل پہنچ گیا ۔ شہر انطاکیہ اب پوری طرح فرنگیوں کے ہاتھ میں تھا اور ملک شام میں کوئی طاقت فرنگیوں کے مدمقابل باقی نہیں رہی تھی ۔"

(جاری ہے)

محمد مرتضیٰ علی خاں ناصر

سُراغ رسانی اور تفتیش

حیدرآباد کا مشہور ڈاکو داوٗد ــــ سنٹرل جیل چنچل گوڑہ سے فرار

حیدرآباد کے مشہور ڈاکو داوٗد کے مختصر حالات اس واقعہ کے آگے آئیں گے۔ معائنہ موقعہ
ی اہمیت کے سلسلہ میں اس کی فراری کی نسبت یہاں ایک واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔
اوُد کو طویل میعاد قید کی سزا ہوگئی تھی۔ وہ حراستِ جائز سے فراری کے لئے مشہور تھا ــ
ں لئے حکام جیل نے اس کو جیل کے ایک کمرہ (سل) میں جس کے دروازے کو موٹی لوہے
ی سلاخیں تھیں اور تمام قیدیوں سے الگ دواخانہ جیل کے وارڈ میں رکھا تھا۔ ایک دن صبح
ں دیکھنے سے پتہ چلا کہ دروازہ کی دو سلاخیں کٹی ہوئی ہیں اور داوٗد فرار ہے۔ حکامان جیل
ور پولیس نے معائنہ موقعہ کیا۔ حالات کے لحاظ سے اس کے رسی کی مدد سے جیل کی دیوار
پڑھنے کے مواقع تو سمجھ میں آگئے۔ لیکن موٹی سلاخوں کو کاٹنے والی بات کسی کے سمجھ میں
ہیں آرہی تھی۔ کہ جب تک جیل کے ملازمین نہ مل گئے ہوں اور سوہن یا لوہا کاٹنے کا آرا فراہم
نہ کیا جائے سلاخوں کا کاٹنا ممکن نہیں۔

والد صاحب قبلہ نے بھی جیل کے اس کمرہ کو جاکر دیکھا اور حکامان جیل کو بتایا کہ داوٗد تاگے
سے لوہے کی سلاخوں کو کاٹ کر بھاگا ہے۔ معائنہ موقعہ کے وقت والد صاحب قبلہ نے دیکھا کہ
داوٗد کے کمرہ کے فرش پر جگہ جگہ چکنائی کے دھبے تھے اور اس کے کمرے کے ایک کونے میں پسی
ہوئی کانچ ان کو ہمدست ہوئی۔ دواخانہ کے کمپونڈ میں ہونے سے دوا وغیرہ کے شیشے توڑ کر اس
نے کانچ پیسی اور پھوڑا پھنسی کے لئے دواخانہ سے مرہم کی شکل میں چکنائی حاصل کی۔ تاگہ
پر چکنائی لگا کر اس کو کانچ کے ریزوں میں پھیر کر، اگر مسلسل کئی روز تک لوہے کی سلاخوں پر
رگڑا جائے تو سلاخ کٹ سکتی ہے۔ یہ کام کافی دقت طلب اور صبر آزما ہوتا ہے۔ داوٗد کو
جب والد صاحب نے بعد میں گرفتار کیا تو اس نے ان کے خیال کی تصدیق کردی کہ وہ ہر رات

میں تاگے سے سلاخ کاٹتا، صبح ہوتے ہوتے کٹے ہوئے حصہ میں خود کی گردن سے میل نکال کر بھر دیتا تاکہ دن میں لوہے کی سلاخ کا کٹا ہوا حصہ نظر نہ آسکے ۔ اور رات میں پھر وہی سلاخ کاٹتا اس طرح کئی دنوں کی بڑی سخت محنت سے اس نے دو سلاخیں کاٹیں اور ان کو اوپر کی طرف موڑ کر جیل سے نکلنے کا راستہ بنایا ۔ اس نے ۵ بجے صبح کے وقت جیل سے نکلنے کا منتخب کیا تاکہ جیل کی روشنی گل ہو تو کوئی شبہ نہ کیا جائے ۔ ایک رسی اس نے جیل کے دواخانہ کے کمپونڈر میں منگا کر رکھ لیا تھا جس کے ایک سرے پر اس نے ایک دو شاخہ لکڑی کا ٹکڑا منگوا کر باندھ لیا تھا ۔ اس نے اس رسی میں بندھی ہوئی دو شاخہ لکڑی کو جیل کے اطراف دیوار پر سب سے اوپر کے الکٹرک وائر کے اوپر پھینک کر طاقت کے ساتھ جھٹکے سے اس کو نیچے کھینچا تو اوپر کا وائر نیچے کے وائر سے چھو کر شارٹ سرکٹ ہو کر فیوز اُڑا ۔ کرنٹ بند ہو گیا ۔ ادھر اس رسی کی مدد سے وہ جیل کی دیوار کے ایک کونے سے اوپر چڑھ کر جیل کی دیوار پر سے جیل کے باہر کود کر فرار ہو گیا ۔

معائنہ موقع کے وقت والد صاحب قبلہ نے فرش پر کی چکنائی کے دھبوں اور معمولی سی کانچ کے ذرات کو تک جو کونے میں کہیں پڑے ہوئے تھے ۔ نظر انداز نہیں کیا اور ان سے اپنے تجربے کی بنا پر صحیح نتیجہ اخذ کیا ۔

چار چور ـــ شیخ و برہمن و سندی و سکھ

ایک زمانہ میں شہر حیدرآباد میں ہر سال پلیگ کا زور رہتا اور خاص کر سردیوں کے موسم میں پورا شہر خالی ہو جاتا اور لوگ گھروں کو قفل ڈال کر کیمپوں میں جا کر مقیم ہو جایا کرتے تھے ۔

~~جیسے جیسے~~ گرما کا موسم قریب آتا پلیگ میں کمی ہونا شروع ہوتی اور لوگ اپنے گھروں کو واپس آنا شروع کرتے ۔ لوگوں کے کیمپوں سے واپسی کیا شروع ہوتی گویا پولیس والوں کے لئے آفت آجاتی اور ان کے لئے سرقہ کی وارداتوں کا نمبر پر لینے کا موسم بہار آجاتا ۔ لوگ گھروں کو آتے اور دیکھتے کہ کسی کے مکان کا قفل ٹوٹا ہوا ہے اور قیمتی سامان غائب ہے تو کسی کے اس کمرے کی دیوار میں سوراخ پڑا ہوا ہے جس میں زیورات کا صندوق یا تجوری تھی ۔ تو کسی کے گھر میں چور کے دیوار پر چڑھنے اور کویلو ہٹائے جانے کے نشانات ہیں ۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد اور مضافات بلدہ (CITY SUBURBS) یعنے اطراف بلدہ کے علاقہ میں سرقہ کی متعدد وارداتیں ہوئیں ۔ ان وارداتوں میں صرف ایک چیز بطور قدر مشترک کے پائی جاتی تھی اور وہ یا تھی تھی ۔ ان وارداتوں

یں چڑھائی کی وارداتیں بھی نہیں، نقب کی بھی وارداتیں تھیں۔ یعنی دیواری نقب کی ۔
اور قفل شکنی کی کئی وارداتیں تھیں اور بلدہ پولیس کی طرح اضلاع پولیس کی سی آئی ڈی
بھی اطراف بلدہ میں کئی وارداتوں کے مرتکبین جرم کی تلاش میں تھی۔ ان وارداتوں کے
تعلق سے والد صاحب کا خیال حیدرآباد کی سارقوں کی ایک مشہور ٹولی کی طرف گیا۔ جس
یں ہر طرح کا کام کرنے والا موجود تھا۔ یعنی چڑھائی کرنے والا، نقب لگانے والا (یعنی
دیواروں میں سوراخ ڈالنے والا) قفل شکنی کرنے والا اور چھت سے اترنے والا بھی ۔۔
اس ٹولی میں شیخ بھی موجود تھا، برہمن بھی تھا، سکھ اور ہندی سب ہی موجود تھے۔ ان کا
اشتراک مثالی تھا۔ اور خوبی یہ تھی کہ وہ شہر حیدرآباد، اضلاع میں سکندرآباد کے علاقہ
یں اس سے پہلے کئی بار وارداتیں کر چکے تھے۔ کئی بار پکڑے جا چکے تھے۔ ہزارہا روپیوں کا
مال ان کی نشان دہی پر برآمد ہوا۔ لیکن یہ کبھی عدالت سے سزایاب نہیں ہوئے تھے۔ سکندرآباد
یں نواب بہرام الدولہ بہادر کے کئی لاکھ کے جواہرات کے سرقہ میں یہی ٹولی ملوث تھی۔ اس نے
سرقہ کیا تھا مال بھی کچھ برآمد ہوا تھا لیکن علاقہ انگریزی کی پولیس ان کو سزایاب کرانے میں کامیاب
نہ ہو سکی تھی۔ اس ٹولی کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس کے ارکان انفرادی طور پر خواہ کسی طرح بھی
جرم کرلیں لیکن بہ حیثیت پارٹی انھوں نے کوئی بھی واردات بلا باتھی کے نہیں کی یعنی وہ بحیثیت
پارٹی جب کسی کے مکان میں واردات کرنے کا ارادہ کرتے تو پہلے وہ اس مکان میں رکھے ہوئے
مال کی نسبت کسی نہ کسی ذریعہ سے معلومات حاصل کر لیتے۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ مال کس
کمرہ میں یا کس حصہ مکان میں ہے۔ وہ کئی روز پہلے اسکیم بناتے کہ اس کمرہ میں کیسے پہنچا جائے
اگر اس کمرہ کی کوئی دیوار کسی کھلے مقام پر یا کسی عام راستہ یا گلی میں ملی تو انہوں نے وہاں نقب
لگانے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا لیکن اگر اس کمرہ کی دیواریں چو طرف سے گھری ہوئی ہوں تو کئی روز
پہلے سے اسکیمیں بنتیں کہ وہاں کیسے پہنچا جائے۔ بعض وقت وہ اس کمرہ میں پہنچنے کے لئے
ہمسایہ کو ملانے کی کوشش تک بھی کر گذرتے۔ اور اس کے مکان سے اس مخصوص کمرہ میں نقب
لگاتے اور بعض وقت اس کمرہ میں پہنچنے انہیں دور کے کسی مکان میں نقب لگانا پڑتا اور وہ
مکان سے دوسرے، تیسرے مکان سے ہوتے ہوئے اس کمرہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ بہرحال
باتھی لے کر واردات کرنے والی یہی ٹولی اس زمانہ میں مشہور تھی۔ اور ان کے بعد باتھی سے واردات
کرنے والی ٹولی بدولی (راجندر نگر) کے وڈروں نے بنائی تھی۔ لیکن وڈر ہر طرح کا کام یعنی چڑھائی
قفل شکنی اور چھت کا نقب نہیں لگاتے تھے بلکہ وہ نقب کے ماہر تھے۔ بلدہ میں ۱۹۳۳ء

۱۹۲۶ء میں جو وارداتیں ہوئیں ان میں ہر قسم کا طریقہ اختیار کیا جانا پایا گیا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ جن وارداتوں میں زیادہ مال سرقہ کیا وہ باتھی کی ہونا پائی گئی۔ مقفول صندوق و سوٹ کیس اور تجوریوں کو بعض اوقات سارقوں نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور جس مٹی کی ٹھلیا میں مال رکھا گیا تھا اُسی کو لے کر چلتے بنے۔ بند کمروں کو بالکل چھوا نہیں گیا۔ اور نہ ان میں نقب لگایا گیا۔ معمولی چھوٹے سے کمرے پر ہی ان کی نظر منعطف رہی۔ ان امور سے ہر معمولی شخص یہ اندازہ کرسکتا تھا کہ چوروں نے پہلے سے پہلے مال کے وجود کا پتہ چلا لیا تھا۔ چونکہ باتھی کا شبہ اکثر وارداتوں میں موجود تھا۔ اس بنا پر والد صاحب نے اس ٹولی کی طرف توجہ کی۔ ٹولی کے شیخ (شیخ چاند) ٹولی کا برہمن (تاتا چاری) اور اس کا بیٹا نارائن، ٹولی کا حبشی (سہدی فرج) اور ٹولی کا سکھ (دیوان سنگھ) ان سب سے اطلاعات پولیس واقف تھے۔ یہ ٹولی بھی حیدرآباد کی تفتیش اور طریقوں سے بخوبی واقف تھی۔ اور تفتیش میں اقبالِ جرم کر کے مال دینے والی نہیں تھی۔ اس لئے والد صاحب نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اور کئی ماہ ان کے گاہکوں کا پتہ چلانے میں لگا دیئے اور ان کے گاہک اور ان کے درمیان جو کومٹی (بقال) ایجنٹ تھا وہ علی آباد میں رہتا تھا۔ اس کا پتہ کئی ماہ کی کوششوں میں چلا لیا اور اس کے بعد اس ٹولی کے ارکان کو ایک ایک کر کے گرفتار کر لیا۔ شہر کی پولیس اور اضلاع کی پولیس نے مل کر تفتیش کی اور ملزمین سے اقبال اور ان سے حصولِ مال کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ مشتریوں کا پتہ چلا کر ان کے رجسٹرات ضبط کر لئے گئے۔ تفتیش کے دوران احتیاط برتی گئی کہ ایک ملزم کو دوسرے سے الگ رکھا گیا۔ اور ان کو باہم گفتگو تو کیا اشارے وغیرہ کرنے اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کا بھی موقعہ نہ دیا گیا۔ اسی طرح مشتریوں سے بھی الگ الگ دریافت مال مسروقہ کی نسبت کی گئی۔ اور فن دریافت سوالات انسانی نفسیات سے کام لے کر کثیر مال مسروقہ کا پتہ چلانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب ملزمین سے جب پوچھا گیا تو وہ بخوبی واقف تھے کہ اب نوبت یہ پولیس میں انکار کرنے سے جب کہ پولیس ہر چیز سے تقریباً واقف ہو چکی ہے کوئی فائدہ نہیں۔ اسی لئے انہوں نے حقیقتوں کا انکشاف کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ مشتری (PURCHASER) اور درمیانی ایجنٹوں نے خود درمیان میں چور پر مور کی کہاوت پر عمل کیا تھا۔ اور ان کی پول کھلی اور اس طرح چوروں نے کچھ بتایا تو مشتریوں نے ان سے زیادہ کا اظہار کیا۔ اور درمیانی ایجنٹوں نے جو کچھ کھایا تھا وہ بھی ان کو اگلنا پڑا۔ اور اتنا کثیر مال برآمد ہوا کہ پولیس اسٹیشن میں مال رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ کوئی (۲۰) نقب کی سنگین وارداتوں کا اس ٹولی سے پتہ چلا۔

ملزمین عدالت سے سزایاب ہوئے اور والد صاحب کو انعام ملا۔

اس ٹولی کا سرغنہ تانا جاری برہمن تھا جو علاقہ مرہٹواڑہ کا جاگیر دار تھا۔ اور جس کی زمینات اور زراعت راج منڈری اور موسولی پٹم میں تھیں۔ یہ فن چڑھائی کا ماہر تھا۔ پستہ قد جسم کا دبلا پتلا ہر دیوار پر خواہ وہ کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو چڑھ جاتا۔ قانون سے ویسے ناواقف لیکن عدالتوں کا عملاً اُسے ایسا تجربہ ہو گیا تھا کہ اس نے کبھی کوئی چیز خود فروخت نہیں کی۔ خود کی نشاندہی سے برآمدگی یا یوں کہیے کہ دفعہ (۲۷) قانون شہادت کے تحت جو حصہ بیان ملزم کا قابل ادخال ہو سکتا ہے اس سے وہ ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ باقی حاصل کرنا اس کے فرائض میں تھا۔ اس کی چڑھائی کے فن کی نسبت اتنی شہرت تھی کہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ پیٹھ سے بھی دیوار چڑھ سکتا ہے۔

اس ٹولی کا دوسرا رکن ایک شیخ چاند نامی تھا۔ یہ قفل شکنی کا ماہر تھا۔ مکانات میں نقب لگانے کی اسکیم بناتا لیکن جب تک تانا جاری اس کی توثیق نہ کرتا اس پر عمل نہیں ہوا کرتا تھا۔

دیوان سنگھ یہ پارٹی کا سب سے کمزور ممبر سمجھا جاتا تھا۔ یہ ہمیشہ بھاگنے میں سامنے رہتا۔ مکان کے اندر جانے سے کتراتا اور ہر واردات میں چوکسی کرنے یہ کھڑا رہا کرتا۔ مقام واردات کے قریب راستہ میں دیکھتے رہتا۔ اور کوئی آتا جاتا نظر آتا تو پارٹی والوں کو مقررہ اشارہ دے کر سیٹی بجا کر آگاہ کرنا اس کا کام تھا۔ ایک آدھ واردات میں اس نے اوپر چڑھ جانے کی صورت میں کوپلو ہٹا کر چوری کی۔ اگر موقعہ آجاتا تو یہ اپنی تلوار سے موقعہ واردات پر آنے جانے یا ہوشیار ہو جانے والوں پر وار کرنے میں بھی کمی نہ کرتا۔ لیکن اکثر اوقات بھاگ جانے کو ہی ترجیح دیتا۔ اس نے اس ٹولی کے رکن کی حیثیت سے سزا بھگت کر جیل سے باہر آجانے کے بعد ایک عورت کا قتل کیا۔ اور فرار ہو گیا۔۔۔ برسوں گرفتار نہیں ہوا۔ شاید دس سال کے بعد گرفتار ہوا۔

ہنڈی فرج عربی النسل حبشی تھا۔ گٹھیلا جسم پستہ قد۔ ارتکاب جرم میں سب سے زیادہ محنت اس کو کرنی پڑتی اور سب سے کم معاوضہ اس کو ملتا۔ نقب لگانا اس کا کام تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کیسی سے کیسی دیوار بتا دیجیے اگر تین منٹ کے اندر اندر اس میں اتنی جگہ نہ بنا دوں کہ اس میں سے ایک آدمی آسانی سے گزر سکے تو یہ پیشہ ہی چھوڑ دوں۔ وہ پسینہ پسینہ ہو جاتا لیکن اپنے تین ساتھیوں کے لئے راستہ بنانے تک وہاں سے نہیں ہٹتا۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑے سے بڑا پتھر دیوار کا آسانی سے نکال دے سکتا ہے۔ ایک کاڑی کی ڈبی کو تین انچ کی اونچائی سے زمین پر گرانے سے جتنی آواز پیدا ہو سکتی ہے اس سے زائد آواز اس کے نقب لگانے میں کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ بعض وقت تو نقب کے مقام سے پانچ قدم کے فاصلے پر گھر والے سوتے ہوئے پائے گئے۔ ان کی نیند میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔

اس کے دس سالہ تجربہ نقب میں کبھی کوئی سوتا آدمی نہ جاگا۔

نارائن نے عملاً سرقہ کی وارداتوں میں حصہ نہیں لیا۔ یہ اس پارٹی کے ارکان اور باقی دھندوں میں اور مشتریوں میں رابطہ کا کام کرتا تھا۔ واقعہ کے بعد پارٹی کے ارکان مال مسروقہ تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ مال کے فروخت کا کام اس کے سپرد تھا۔ یہ اس سے پہلے گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ پارٹی کے ارکان کے وکیلوں کا انتظام یہی ممبر پارٹی کیا کرتا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے ہندی فرج جس کو اس کی پارٹی کے لوگ سندی باشاہ کہتے تھے سب سے زیادہ محنت طلب کام کرتا لیکن اس کو مال میں سب سے کم حصہ دیا جاتا۔ وہ اسی میں خوش رہتا۔ وہ کبھی زیور لینے کی کوشش نہ کرتا۔ کپڑے اور نقد مل جاتے تو بہت خوش اور زیور وغیرہ ملتا تو وہ بھی شیخ صاحب کو دے دیتا جو آدھی یا پون قیمت اس کو دیتا یا تاتا چاری کے سپرد یہ معاملہ کردیتا۔ راقم الحروف نے ایک بار اس سے چوری کے قصے پوچھے تو بتایا کہ "چوری بھی میاں قسمت کا معاملہ ہے۔ یہ برہمن قسمت والا ہے اس کے ساتھ جب بھی چوری کی خوب مال ملا اور میں تو جب بھی چوری کو گیا گھاٹے میں رہا۔ ایک بار اس بمن (برہمن) نے مجھے گنج کی ایک دکان بتائی اور کہا کہ کئی ہزار کا مال دکاندار دکان میں رکھ کر کیمپ کو چلا گیا ہے۔ اپن چوری کرینگے بن تیار ہوگیا۔ وہ مدراس کی طرف گیا تھا آنے میں دیر ہوگئی تو میں بولا میں خود چوری کیوں نہ کرلوں یہاں لوگ دن رات مر رہے تھے۔ محلہ سڑ رہا تھا۔ لوگ محلہ میں دن میں آنے سے ڈرتے تھے لیکن پلیگ بھی چوروں سے ڈرتا تھا۔ ہمارے نزدیک کبھی نہیں آیا۔ میں رات کے دس بجے سے نقب لگانے بیٹھا۔ لوہے کا ایک اسکرو نما آلہ اس نے مجھے دیا اور بتایا کہ اگر اس کا ایک انچ کا پہلا حصہ دیوار میں گھسا دینے میں کامیابی ہوگئی تو سمجھو کام بن گیا۔ سو صاحب دیوار سمنٹ چونے کی اتنی سخت کہ دو بجے تک بھی سوراخ نہیں پڑا۔ سوراخ پڑا۔ جب اندر گیا۔ اکیلا تھا۔ پوری دکان چھان مارا کہیں زیور نہ ملا۔ سب دکان غلہ کے، نمک کے، شکر کے اور مرچی کے تھیلوں سے پٹی پڑی تھی — آخر ڈھونڈ کر تھک کر دکان کے باہر آن بیٹھا۔ سر پکڑ کر اپنی بدقسمتی پر افسوس کرنے لگا کہ اتنی محنت کے بعد بھی کچھ نہ ملا۔ آخر خیال کیا کہ خالی ہاتھ اب کیا جانا۔ ایک شکر کا تھیلا ہی لے جاؤں۔ تو شکر کا تھیلا اپنی پیٹھ پر اٹھایا اور چلنا شروع کیا۔ وزن سے پسینہ آگیا۔ جب تھوڑی دور آگے بڑھا تو چٹ چٹ سی آواز آئی اور پیر گڑھے میں اتر گیا۔ گڑھے کے اوپر کا تختہ پیر میں چبھ گیا شکر کا تھیلا پیچھے گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد سنبھل کر دیکھا تو ایک گڑھے کے اوپر لکڑی کا تختہ رکھ کر بند کردیا گیا تھا۔ وہ لکڑی کا تختہ شکر کے تھیلے کے وزن سے ٹوٹ گیا۔ میرا پیر زخمی ہوگیا

باقی بر صفحہ

شکار اور شکاری

شیر کے مقابلہ میں بے حس و حرکت کھڑے رہنے کا عمل

جب کوئی شخص اچانک طور پر شیر کے سامنے آجائے تو دانت نکال کر پھنکار مارتا ہے اور "غوں" کی سی آواز دیتا ہے۔ ایسے وقت بھاگنے کی کوشش کرنا یا گڑبڑ مچانا حملہ کو دعوت دینا ہے۔ شکاریوں نے وثوق کے ساتھ سمجھا ہے کہ جب شیر یا کسی اور جنگلی جانور سے مٹ بھیڑ ہو جائے اور اس کو مار گرانے کا موقعہ حاصل نہ ہو تو ساکت و صامت کھڑے ہو جانا چاہیئے۔ اور آنکھ میں آنکھ ملا کر جانور پر نظر جمائے رکھنا چاہیئے۔ جب اس طرح کچھ وقفہ گذر جائے تو اسی حالت میں نظر ملائے ہوئے نا معلوم سی حرکت کے ساتھ آہستہ آہستہ اُلٹے پاؤں چلنا چاہیئے۔ جہاں کہیں یہ معلوم ہو کہ شیر حرکت کو محسوس کر رہا ہے پھر بے حس و حرکت کھڑے ہو جانا چاہیئے۔ یہ عمل جانور کو ایک تذبذب اور شک کے عالم میں ڈال دیتا ہے اور وہ حملہ کا ارادہ کرنے کی بجائے خود اس کشمکش و پیچ سے پیچھا چھڑا کر جانے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ ایسے موقعہ پر اگر کئی آدمی ہوں تو سب کا اسی طرح عمل کرنا لازمی ہے۔ ورنہ کسی ایک کی خفیف سی حرکت یا آواز شیر کے مہلک حملہ کی دعوت ہوگی۔

کرنل پیٹرسن نے متعدد ایسے واقعے لکھے ہیں جو اُن کو افریقہ میں ببر کے بالمقابل شکار میں پیش آئے۔ ہندوستانی چھوکرا "مہینا" اُن کے ساتھ رہتا تھا جو اُن کی زائد بندوق لئے چلتا تھا۔ جب کبھی ایسا موقعہ آیا کہ متعدد ببر سامنے آگئے اور بندوق چلانے اور سب کو ختم کرنے کا موقع باقی نہ رہا تو صاحب موصوف اور مہینا ہمیشہ یہی عمل کرتے تھے اور اسی کی وجہ سے کئی مہلک حملوں سے محفوظ رہے۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایسے موقع پر جو زیادہ گڑبڑ یا ہلچل کرے ببر اسی پر پلٹ پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب کہ موصوف بندوق کو لوڈ کر رہے تھے ببر نے ان پر حملہ کا ارادہ کیا۔ ہنوز حملہ شروع نہیں کیا تھا کہ روشن خاں ملازم بدحواس ہو کر یاز سے بھاگا۔ اس کا بھاگنا تھا کہ ببر بجائے پیٹرسن صاحب کے اس کی طرف

پلٹ پڑا۔ اسی اثناء میں اُن کو فائر کا موقع مل گیا۔ اور روشن خاں کو دبوچنے سے قبل انھوں نے ببر کو ختم کر دیا۔ مگر روشن خاں اُس وقت تک نہیں رُکا جب تک وہ ایک اونچے زبردست جھاڑ کی آخری چوٹی تک پہنچ گیا۔ اور بڑی مشکل سے نیچے اُتارا گیا۔

مسٹر چیمپین نے بھی بے حس و حرکت کھڑے ہونے کے تجربہ کی کامیابی کا ذکر کیا ہے۔ ان کو جنگلی جانوروں کی تصاویر لینے کا شوق تھا۔ کبھی آٹومیٹک کیمرہ اور لائٹ نصب کر کے تصاویر لیتے تھے کبھی خود بیٹھ کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک بڑے شیر کا گارا حاصل کیا اور آٹومیٹک کیمرہ لگایا۔ صبح جب پہنچے تو دیکھا کہ گارا غائب ہے اور تصویر نہیں آئی ان کو حیرت ہوئی کہ کس طرح شیر گارا کھینچ لے گیا۔ یہ اسی خیال میں گارا کھینچے جانے کے نشان پر آگے بڑھتے ہوئے چلے گئے۔ ان کا آدمی بھی ساتھ تھا۔ ایک چٹان پر موڑ مڑتے ہی یکایک شیر کا سامنا ہوگیا جو گارے پر بیٹھا ہوا کھا رہا تھا۔ واپس ہونا، شیر اور ان کے دونوں کیلئے مشکل تھا۔ یہ فوراً بے حس و حرکت کھڑے ہوگئے۔ اور شیر کو آنکھ میں آنکھ ملا کر گھورتے رہے۔ تقریباً ایک منٹ تک یہ ہوتا رہا۔ شیر غراتا اور اپنی دم زمین پر مارتا رہا۔ ایک منٹ بعد انھوں نے آہستہ آہستہ نامعلوم سی حرکت سے پیچھے کھسکنا شروع کیا۔ جوں ہی ان لوگوں کی حرکت شیر کو نظر آتی وہ زور زور سے غراتا اور یہ فوراً رک جاتے۔ پھر چلنا شروع کرتے یہاں تک کہ یہ چٹان کے موڑ تک پہنچ گئے۔ موڑ آہستہ سے مڑتے ہی وہاں سے بھاگے۔ شیر نے تعاقب نہیں کیا۔

کرنل ایبٹ فرتھ نے جو متعدد شکار اور سفر کی کتابوں کے مصنف ہیں اس قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ جو بلحاظ اس کے کہ شیر زخمی تھا اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ایک شیر کو انھوں نے زخمی کیا جس کی پیٹھ میں گولی لگی۔ اس کے تعاقب میں گئے۔ سامنے ایک نالہ سولہ فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ شیر اس میں سے گذرا ہوگا۔ اس کے پنجوں کے نشان دیکھنے کے لئے اس میں اُتر گئے۔ ان کا بیان ہے کہ بغیر اطمینان کئے ہوئے نالہ میں اس طرح اتر جانا سخت غلطی تھی۔ زخمی شیر کی تلاش میں نالہ کے اندر سے کبھی نہ چلنا چاہئیے۔ نالہ میں ایک پتہ پر خون نظر آیا۔ یہ اس کو لے کر کھڑے ہوئے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے شیر ان کو گھور رہا ہے۔ ۱۵ قدم کا فاصلہ تھا انھوں نے خیال کیا کہ ایک فائر میں ختم نہ کر سکے تو معاملہ خطرناک ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اس عمل کا تجربہ کیا جو کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ اگر کوئی شخص آنکھیں جما کر کسی جنگلی جانور کو گھورے تو اس کو عارضی طور پر ایک سکتہ سا ہو جاتا

ہے ۔ اور یہ سوچتے ہوئے خاموش کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی کیا کرنے والا ہے یا خود اس کو کیا کرنا چاہیئے ۔ یہ کیفیت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتی ۔ اور وقت ضائع کئے بغیر عمل کرنا چاہیئے ۔ چنانچہ موصوف نے شیر کی آنکھوں میں گھورنا شروع کیا ۔ شیر اسی طرح کھڑا رہا اور یہ نالہ کے اس پار نکل آئے ۔

ایک شکاری صاحب نے لکھا ہے کہ وہ شیرنی کے بچوں سے چند فیٹ کے فاصلہ پر پہنچ گئے ۔ شیرنی نے حملہ کیا یہ ساکت وصامت کھڑے ہو گئے ۔ شیرنی گرگراتی ہوئی ان کے چند فیٹ تک آگئی پھر لوٹ گئی ۔ دو مرتبہ شیرنی نے ایسا ہی کیا پھر واپس ہو گئی ۔

مسٹر ٹاڈ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور ان کی بیوی بچے والی شیرنی کے قریب چلے گئے ۔ شیرنی نے حملہ کیا ۔ مسز ٹاڈ بھاگیں ۔ مسٹر ٹاڈ نے روکا ۔ پانچ سات گز بھاگ کر وہ رک گئیں ۔ شیرنی ۱۵ گز پر آکر ٹھیر گئی ۔ اور غرانے لگی ۔ مسٹر ٹاڈ نے معمولی اور اطمینان کی آواز میں اپنی بیوی سے کہا " ڈرو مت ۔ خاموش بے حس و حرکت کھڑے رہو " (اس خیال سے کہ انسانی آواز شیر کے لئے ڈرانے والی ہوتی ہے) اس سے شیرنی کی ہمت اور پست ہو گئی دو تین منٹ بعد شیرنی پھر غرائی اور دوڑتی ہوئی پھر مسز ٹاڈ کے ایک گز تک چلی گئی ۔ پھر ٹھیری اور پھر پلٹ کر بھاگ گئی ۔

کیا شیر جھاڑ پر چڑھتا ہے ؟

یہ امر بھی غیر تصفیہ شدہ ہے کہ شیر جھاڑ پر چڑھ سکتا ہے یا نہیں ؟ یہ امر مسلمہ ہے کہ عام طور پر شیر جھاڑ پر نہیں چڑھتا ۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا ضرورت پڑے تو بھی چڑھ سکتا ہے یا نہیں ؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چڑھ تو سکتا ہے مگر درخت کی شاخیں عموماً ایسی مضبوط نہیں ہوتیں جو اس کا وزن سنبھال سکیں ۔ اس لئے نہیں چڑھتا ۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ بعض شیر درخت پر پنجوں اور دانتوں کو تیز کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور انھوں نے شیر کو درخت پر چڑھا ہوا دیکھا ۔ مسٹر شکسپیر بھی شیر کو درخت کے اوپر چڑھا ہوا دیکھنا بیان کرتے ہیں ۔ میسور کے عجائب گھر میں (۲۲) سال قبل میں نے دیکھا تھا کہ وہاں بڑے بڑے تنہ کے جھاڑوں پر چار پائیاں باندھ دی گئی تھیں ۔ جو زمین سے تقریباً ۱۱ یا ۱۲ فیٹ بلند ہوں گی اُن پر چڑھ کر شیر چارپائیوں میں بیٹھا کرتے تھے ۔ اس پر کئی بار میں نے شیروں کو چڑھتے اُترتے دیکھا ۔ مگر یہ ان کا چڑھنا اس طرح نہ تھا جیسے بلی جھاڑ پر چڑھتی ہے ۔ بلکہ درخت

ایسے تھے کہ تقریباً ۵۰ فیٹ بلندی ہی سے ان میں دو شاخے نکل گئے تھے ۔ اور بڑی بڑی شاخوں کا سلسلہ ۷۰ فیٹ سے شروع ہو گیا تھا ۔ شیر اچھل کر دو تین دو شاخوں پر جلد جلد پاؤں رکھ کر پھنگ پر پہنچ جاتا تھا ۔ برخلاف اس کے بلی اپنے پنجہ اور ناخن جما کر بالکل سیدھے درخت پر بھی چڑھ سکتی ہے ۔ شکاریوں کی تصنیفات دیکھئے یا حالات سنئے سے (بجز ایک کے) ایسا کوئی واقعہ ظاہر نہ ہوا جہاں شیر نے درخت پر چڑھنے کی باضابطہ کوشش کی ہو ۔ چھلانگ مارنا دوسری چیز ہے ۔ نتیجتاً نہ چڑھ سکنا بھی دوسری چیز ہے ۔ چڑھنے کی کوشش ابتداء ہی سے نہ کرنا عموماً شکاریوں کے تجربہ میں آیا ہے ۔ بعض شکاریوں نے لکھا ہے کہ شیر درخت پر چڑھتا تو نہیں مگر درخت کے تنہ کے قریب آ کر سامنے کے دونوں پاؤں اٹھا کر تنہ پر مضبوطی سے جما دیتا ہے اس کے بعد پچھلے پاؤں اٹھا کر اوپر جما دیتا ہے اور پھر سامنے کے پاؤں اوپر بلند کرتا ہے اس طرح تقریباً ۱۲ فیٹ تک اس کے اگلے پنجے پہنچ جاتے ہیں ۔ درخت پر چڑھنے کا واحد واقعہ جو میری نظر سے گذرا وہ مسٹر سمتھیز کا لکھا ہوا ہے ۔ جو ۳۱ ر ڈسمبر ۱۹۲۵ء کو جالا سال کے جنگل میں بمقام "ریالہ" ان کو پیش آیا ۔ ایک مچان میں وہ خود اور دوسری میں ان کی بیوی بیٹھی تھیں ۔ درخت کے تنہ کا گھیر جس پر مچان باندھی گئی چار پانچ فیٹ تھا ۔ اور ۱۴ فیٹ بلندی پر جہاں سے شاخیں پھوٹتی ہیں مچان باندھی گئی تھی ۔ پہلے مسٹر سمتھیز کی مچان کی طرف شیر نکلا انہوں نے فائر کیا مگر مس ہوا ۔ ۲۵ گز پر شیر آ رہا تھا ۔ دوسرا فائر کیا مگر وہ بھی مس ہوا ۔ شیر اونچی گھاس میں چھپ گیا ۔ جب ہانکے والے اور ہاتھی قریب پہنچ گئے تو گھاس میں سے نکلنے میں ضد کرنے لگا ۔ اور متواتر دھاڑتا رہا ۔ دونوں ہاتھی چنگھاڑتے رہے ۔ اور چھوٹے درخت اپنی سونڈ سے توڑ توڑ کر گراتے رہے ۔ یہاں تک کہ ایک درخت سیدھا شیر پر گرا ۔ جہاں وہ گھاس میں چھپا ہوا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی شیر نے ایک خوفناک آواز کے ساتھ ہاتھیوں پر حملہ کر دیا ۔ ایک ہاتھی بھاگا ۔ مگر اس کے مہاوت نے بڑی ہوشیاری سے روکا دوسرا ہاتھی ڈٹا کھڑا رہا ۔ شیر مڑ کر مسٹر سمتھیز کے سامنے سے گیلپ بھاگا ۔ انھوں نے فائر کیا مگر پھر مس ہوا ۔ شیر مسٹر سمتھیز کی مچان سے ۳۰ گز پرے سے گذرا ۔ جب مچان سے وہ تقریباً آگے نکل گیا تو مسٹر سمتھیز نے فائر کیا اور شیر گرا ۔ گولی ریڑھ کی ہڈی کے بازو لگی ۔ انہوں نے پھر فائر کیا ۔ مگر یہ گولی مس ہوئی ۔ جوں ہی مسٹر سمتھیز نے دوسرا فائر کیا ان کی ہل چل سے شیر ادھر متوجہ ہوا اور نہایت خوفناک آوازوں کے ساتھ پلٹ کر درخت پر حملہ کر دیا اور بلی کی طرح درخت پر چڑھنے لگا ۔ شیر کے ہاتھ درخت کے تنہ کے اطراف آ گئے تھے ۔ مسٹر سمتھیز مچان سے چلانے

اور جب دیکھا کہ اس گھبراہٹ میں جتنے کارتوس ان کی مچان میں رکھے ہوئے تھے نیچے جا پڑے۔ جب شیر تقریباً آدھا درخت پر چڑھ گیا۔ مسز سمتھیز نے فائر کیا مگر گولی چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ بندوق کو جھٹکے دینے اور چڑھانے کے لئے جب یہ پیچھے دیکھے تو معلوم ہوا کہ صرف ایک کارتوس بندوق میں باقی رہ گیا ہے۔ اب جو انھوں نے نظر کی شیر مچان تک پہنچ چکا تھا۔ مسز سمتھیز مچان پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور بندوق کی نالی شیر کے منہ میں دے دی تھی۔ شیر کے منہ سے خون آلود کف اڑ رہا تھا جو مسز سمتھیز کے کپڑوں پر پڑ رہا تھا۔ بندوق کی نالی شیر کے منہ میں دے کر جو مسز سمتھیز نے فائر کیا تو بس فائر ہوا۔ آٹھ انچ تک بندوق کی نال پر دانتوں کے نشان پڑ گئے۔ شیر اپنے پنجوں اور ٹھوڑی کے ٹیکے سے مچان سے لٹک رہا تھا۔ پچھلے پنجے درخت پر ٹکے ہوئے تھے۔ مچان شیر کے وزن سے ٹوٹنے کے قریب ہو رہا تھا اور شیر برابر نیچے چلا جا رہا تھا جس سے پلنگ کی بان اور لکڑی ٹوٹ کر شیر کا پنجہ مچان کے نیچے سے اندر داخل ہوا۔ اس کو بچانے کے لئے مسز سمتھیز جو پیچھے ہٹیں تو جھوک نکل گیا اور دس فٹ بلندی سے نیچے گریں۔ مگر ابھی شیر مچان ہی پر پنجے مار رہا تھا۔ مسز سمتھیز نے اپنا آخری کارتوس چلایا اور شیر نیچے گرا۔ درمیان میں گھاس حائل تھی۔ اس لئے نظر نہیں آ رہا تھا کہ شیر کہاں ہے؟ مسز سمتھیز نیچے گریں مگر اتفاق سے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ اور یہ گھاس اور ٹوٹے ہوئے درختوں میں سے بحالت بدحواسی بھاگنے لگیں۔ اور ہر لحظہ یہ خیال تھا کہ شیر نے اب پیچھے سے حملہ کیا۔ وہ مسز سمتھیز کے مچان کے نیچے آ گئیں۔ اتنے میں مہاوت ایک ہاتھی کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اور مسز سمتھیز کو اوپر اٹھا لیا۔ شیر دل کی گولی سے مر چکا تھا۔ شیر کا حملہ کر کے درخت پر چڑھنے کا یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

▬▬

(سلسلہ صفحہ)

لڑکے کو کھولا۔ تو صاحب ہزاروں روپے کے زیورات کا ٹھاٹ کا تھیلا ہاتھ لگ گیا۔ اب آپ ہی بتائیے یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے۔ چوری میں بھی قسمت ہونا صاحب"۔

جب میں کم سن تھا تو اور کئی قصے اس نے مجھے بتائے تھے۔ سدی یا شاہ سے اکثر خفیہ کے دوران قصے سنا کرتے تھے۔ میں بھی قصے کہانی کے طور اس سے پوچھا کرتا تھا۔ اب سال ڈیڑھ سال کے پیچھے تک بھی والد صاحب قبلہ سے نارائن آ کر مل کر جایا کرتا تھا۔ پتہ نہیں دوسرے ارکان زندہ ہیں یا مر گئے؟

▬▬

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

خدا بخش اورینٹل لائبریری کے خبرنامے

۱۔ دوسری زبان سیکھنے کا آسان طریقہ

خدا بخش لائبریری میں آمدہ مشہور مصنف اختر رائے پوری کی خود نوشت "گرد راہ" میں زبان سیکھنے کا بڑا اچھا طریقہ سامنے آیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"میں صبح سویرے انگریزی اخبار پڑھتا۔ پھر فرانسیسی روزنامہ میں انھیں خبروں کو دہراتا اور مشکل الفاظ کا مطلب ڈکشنری میں دیکھ لیتا۔ پھر دونوں کے نرخ ناموں سے اشیاء کے نام یاد کرتا ہوا فرانسیسی زبان کا درس لینے چلا جاتا اور اپنی میزبانوں سے تحریر و تقریر میں اصلاح لیتا رہتا۔ بس چند مہینوں میں گفت و شنید میں رواں ہو گیا اور مطالعہ میں مہارت ہو گئی۔" ○○

۲۔ ترقی پسندوں کی شراب پر شطرنج کو ترجیح

خدا بخش لائبریری میں آمدہ تازہ وارد "افکار" کے اختر رائے پوری نمبر میں سید انور نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"ہماری محفلوں میں شراب کی جگہ شطرنج نے لے لی تھی، ان محفلوں میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ن۔م۔ راشد، غلام عباس، شوکت صدیقی اور سید انور شریک ہوتے تھے۔ شراب پی کر آپ اپنے غم اور دنیا کے غم بھولنے کے بجائے ان کے بارے میں زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ اگر آپ سے کوئی اتفاق نہیں کرتا تو آپ فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ شطرنج کچھ عرصے کے لئے آپ کو غموں سے بالکل نجات دے دیتا ہے۔" ○○

۳۔ فیض کا جیل میں درس قرآن

خدا بخش لائبریری میں "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کے نام سے فیض پر ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب آئی ہے جو فیض کے بارے میں ایک نادر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں وہ فیض کا بات نقل کرتے ہیں:

"جیل میں میں نے درس قرآن اور حدیث کا سبق دینا شروع کیا۔ ایک نوجوان کرنل جو مجھ کو دہریہ سمجھتا تھا یہ تغیر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ایک دن اس نے مجھے الگ لے جا کر

پوچھا "آپ کا مذہب کیا ہے؟" میں نے اسے بتایا کہ "میرا مذہب وہی ہے جو مولانا روم کا تھا۔ کرنل صاحب مولانا کا نام سن کر مطمئن اور خوش ہو کر کہنے لگے "پھر ہم مسلمان بھائی ہیں۔ آپ اچھا درس دیتے ہیں۔ جیل سے رہائی کے برسوں بعد اکٹھے ہوئے تو کرنل صاحب کو اس مذہب نے پھر اکسایا۔ پوچھا "فیض صاحب مولانا روم کا مذہب کیا تھا؟" میں نے کہا "جو میرا ہے"۔

فیض کے بارے میں اس کتاب میں جو فیض کی زندگی میں ترتیب دی گئی فیض کی بے تکلف گفتگو، ان کے ذاتی خیالات، فیض کی گھریلو زندگی، ان سب کی بڑی اچھی تصویر آگئی ہے۔ ○○

شراب پی کر شاعری کرنے والا

قریب کا کوئی دوست جتنی باتیں بتا سکتا ہے وہ شاعر کو سمجھنے میں اتنی مددگار ہوتی ہیں جتنی ساری تنقیدیں اور مضمون بھی نہیں ہو سکتے۔ فیض پر ایوب مرزا کی اس کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" سے بعض دلچسپ انکشافات ہوتے ہیں۔ مثلاً شراب کے بارے میں فیض کی مندرجہ ذیل رائے:

"شراب پی کر انسان مدہوش اور بے ہوش تو ہو سکتا ہے مگر اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔ اور جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ پیتا ہوں اس لئے کہ اچھے شعر کہوں، غلط کہتا ہے۔ شراب اور اعلیٰ معیار کی شاعری یا کوئی بھی آرٹسٹک کام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شہر میں چار شرابی غل غپاڑہ کرتے ہوئے گرفتار ہوئے ہیں۔ غل غپاڑہ بری بات ہے اور شراب پی کر شاعری کرنے والے شعرائے کرام درحقیقت غل غپاڑہ ہی تو کرتے ہیں۔" ○○

کلچر صرف مذہب سے نہیں بنتا" فیض

"ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں ڈاکٹر ایوب مرزا نے لکھا ہے کہ فیض کہتے تھے:

"عقیدہ اور مذہب کلچر کے بہت اہم اجزا ہیں، مگر کلچر کے بنیادی اجزا اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مثلاً مصر کے مسلمانوں کا وہ کلچر نہیں جو پاکستان کے مسلمانوں کا کلچر ہے ہر چند کہ مذہب ایک ہے۔ ہر معاشرے کا کلچر جغرافیائی حدود کے اندر مخصوص طرزِ بود و باش اور آب و ہوا کے اثرات اور پیداواری رشتوں سے پیدا ہوتا ہے"

فیض احمد فیض کی مندرجہ بالا رائے، 'کلچر صرف مذہب سے نہیں بنتا، مصر اور پاکستان کے مسلمانوں کا کلچر الگ ہے' ______ ایسی ہی رائے گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی تھی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی رائے قائد اعظم جناح کی بھی تھی جب انھوں نے ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستانی قوم کے نام اپنے نشریہ میں کہا تھا کہ پاکستان کے ہندو اور مسلمان دونوں مل کر پاکستانی

ہم بتاتے ہیں: ۵۵

ایک انجانے پاکستانی نے انجانے گندرپال کی مہمان نوازی کی

حال ہی میں مشہور مصنف جوگندرپال کی 'پاکستان یاترا' کا ایک باب شائع ہوا ہے۔ یہ کراچی کے مشہور رسالہ 'افکار' کی تازہ اشاعت میں شامل ہے جو خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ جب وہ کراچی پہنچے تو:

"بڑی طوفانی رات تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی ضعیف ماں تین چھوٹے بچوں اور بیوی کو لے کر کہاں جاؤں؟ میں ہوٹل کے بارے میں پوچھ تاچھ کر رہا تھا کہ یک لخت مجھے خیال آیا کہ نیروبی میں ہماری "باجی" کے بڑے بھائی سوسائٹی کے ایریا میں رہتے ہیں۔ یہ باجی ایک مسلم خاتون تھیں جنھیں ہم اپنی بہن کا ہی درجہ دیتے تھے۔ انھوں نے اکثر ذکر کیا تھا کہ کراچی میں ان کے بڑے بھائی رہتے ہیں۔ میں اور میری بیوی ابھی باجی کے بھائی کے پتہ کی تفصیل یاد کر رہے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا سوسائٹی ایریا آگیا ہے۔ وہ بڑا وسیع علاقہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کو باجی کے بھائی کا بلاک بتایا لیکن اس بلاک میں ان کے مکان کا نمبر ہمیں یاد نہ آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہماری پریشانی دیکھ کر وہ وسیع بلاک بھی اس طوفانی فضا کے ساتھ مل کر ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔ یکایک میری نظر کونے کے ایک مکان پر پڑی جو باجی کی دی ہوئی تفصیل سے ملتا تھا۔ باجی کے بڑے بھائی ایک عمر رسیدہ اور شفیق انسان تھے جنھوں نے ہماری پریشانی کا قصہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں ان کے گھر کا راستہ دکھایا۔ پھر انھوں نے لذیذ و گرم چائے سے ہماری تواضع کی، ہماری باتوں کو پوری توجہ سے سُنا اور پھر ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

اس واقعہ کے بعد مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ جن بارلیش بزرگ نے ہمیں اپنا مہمان بنایا تھا وہ باجی کے بڑے بھائی نہ تھے لیکن میں نے کبھی باجی کو خط لکھ کر اپنا شبہ دور کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کیوں کہ میرے نزدیک وہ شریف شخص دنیا کے ہر انسان کا بڑا بھائی ہے۔ میری اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اسے ہمیشہ زندہ رکھے تاکہ وہ طوفانی راتوں میں راستہ بھٹکے ہوئے مسافروں کو پناہ دیتا رہے۔

جب میں کینیا میں تھا تو برطانوی پاسپورٹ پر کئی مرتبہ بے روک ٹوک پاکستان ہو آیا تھا لیکن ادھر ساٹھ کی دہے کے اوائل میں جب واپس ہندوستان آگیا تو میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے پڑوس میں پہنچ کر میں دراصل وہاں سے ناقابل یقین حد تک دور ہو گیا ہوں۔ دور دراز برطانوی جزیرہ سے تو پاکستان اتنا قریب ہے کہ ناشتہ یہاں کیجئے اور لنچ کے وقت تک آرام سے وہاں جا پہنچئے۔ مگر نکٹ قدر ہندوستان سے یہ ملک خوابوں سے بھی پرے سرک جاتا ہے، ان دونوں پڑوسی ملکوں کی ہم عصر تاریخ میں شبہات کی اتنی گنجائش روا رکھی گئی ہے کہ ان کی سرحد

تو ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں مگر یہ خود اتنے دور لگتے ہیں جیسے ملاقات نہ ہو۔

مجھے پاکستان گئے ہوئے بیس سال سے بھی اوپر ہو چکے تھے، اب میں وہاں جانے کی امید بھی ترک کر چکا تھا مگر اس دوران میری ملاقات ایک ہم قلم پاکستانی افسر سے ہو گئی۔ منیر احمد شیخ دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں پریس کونسلر تھے، میری درخواست دیکھ کر پہلے تو انھوں نے ایک دفتر شاہ کی حیثیت سے مجھے بتایا کہ پاکستان جانے کی اجازت صرف انھی لوگوں کو دی جاتی ہے جو وہاں اپنے عزیزوں میں اپنے سگوں سے ملنے جانا چاہتے ہوں، لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے اندر بیٹھا ہوا ادیب دفتر شاہ کو دھکیل کر باہر آ نکلا اور مجھے بڑی ہمدردانہ لہجے سے سمجھانے لگا، کسی پاکستانی سے آپ کا خون کا رشتہ نہ سہی مگر خیالات کیا خون سے کم گاڑھے ہوتے ہیں جو اس عظیم شخص نے غالباً اپنی ہی ذمہ داری پر مجھے اور میری بیوی کو اس وقت کراچی، اسلام آباد، لاہور اور میرے مولد سیالکوٹ کے لئے ویزا فراہم کر دیا۔ میں نے پاکستان کے لئے تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے سفر کے بارے میں کئی احباب کو خطوط بھی لکھ ڈالے جس کا سب سے پہلے جواب آیا وہ تھی راحیلہ، میرے کالج کے ایک دوست کی بیٹی، اس نے اپنی چٹھی میں اپنا، اپنے دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کا بڑی محبت سے تعارف کرایا اور لکھا کہ ہم سب اس بات پر شادماں ہیں کہ ہمیں پہلی بار کسی ہندوستانی سے ملاقات کا موقع ملے گا۔

میں نے اس کی یہ سطریں دوبارہ پڑھیں۔ آخر اس کے لئے کس بات کی اہمیت زیادہ ہے، اس بات کی، کہ میں اس کے والد کا قریبی دوست ہوں یا اس کی، کہ اسے زندگی میں پہلی بار ایک ہندوستانی کی میزبانی کا موقع حاصل ہوگا۔ میں نے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دینا چاہا کہ ہم پاکستان اور ہندوستان کے پرانی پیڑھی کے لوگ، جو ابھی کل تک ایک دوسرے میل جول سے رہتے تھے، اب اپنی اولاد کے لئے اتنے اجنبی بن چکے ہیں۔ چونکہ اب ہمارا رابطہ ان سے ٹوٹ چکا ہے اور ہمارے بچوں نے ہمارے تعلق سے صرف قصے کہانیاں ہی سن رکھی ہیں اس لئے اس قسم کے واقعہ پر وہ اپنا تجسس۔ زیادہ سے زیادہ ہمدردانہ تجسس۔ ہی ظاہر کر سکتے ہیں اور یہی تو وہ کرتے ہیں، اور کیا کریں؟

۱۴/ اپریل ۱۹۸۲ء کو جب میں اور میری بیوی کراچی جانے کے لئے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے تو معاً مجھے ۱۹۶۳ء کے سفر کی یاد آ گئی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ نیروبی سے بمبئی آتے ہوئے چند دن کے لئے کراچی میں قیام کریں گے۔ عدن میں ہمارے جہاز میں کچھ میکانکی خرابی پیدا ہو گئی اور اعلان کیا گیا کہ ہماری فلائٹ چند گھنٹے تاخیر سے پہنچے گی لہٰذا ہمارے میزبان یہ سمجھ کر گھر لوٹ گئے کہ اب تو کل صبح ہی ہم ان سے ملیں گے لیکن ہوا یہ کہ خلاف توقع رات کے دو بجے ہم کراچی پہنچ گئے۔ بڑی طوفانی رات تھی اور.....

جگمگاتے شہر کی رعنائیوں میں کیا نہ تھا ڈھونڈنے نکلا تھا جس کو بس وہی چہرہ نہ تھا

خدابخش لائبریری میں نئے پنچ تنتر کی دریافت

خدا بخش لائبریری میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ عربی کے استاد ڈاکٹر محمد مہدی الانصاری نے "عربی کی قدیم کہانیاں" پر لکچر دیتے ہوئے فرمایا کہ عربی زبان و ادب میں قرآن پاک سے قبل کوئی نثری سرمایہ تحریری شکل میں موجود نہیں ہے تاہم عربوں میں جو ضرب الامثال اور روایات مشہور ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے قبل عربوں میں قصہ گوئی کی روایت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر طہٰ حسین اور بعض دوسرے ناقدین کے خیال میں عہد ما قبل اسلام کے نثری شواہد مفقود ہیں اور عربی کی اولین نثری کتاب جو ضبط تحریر میں لائی گئی وہ قرآن پاک ہے۔ انھوں نے عربی کے مشہور نقاد محمود تیمور اور ان کے ہم خیال ادبا کے حوالے سے کہا کہ ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایام جاہلیہ میں قصہ گوئی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔

انھوں نے کہا کہ قرآن پاک کے نزول کے بعد چونکہ عربوں میں دینی علوم کی تدوین و ترتیب کا ذوق ابھرا اس لئے انھوں نے دیگر اصناف ادب کی طرف کم توجہ دی پھر بھی بنو امیہ کے عہد میں بہت سارے قصے ضبط تحریر میں لائے گئے جو سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے۔ اس سلسلہ میں انبیاء کرام اور پچھلی امتوں کے واقعات و قصص خاص اہمیت رکھتے ہیں جن میں دینی و اخلاقی باتیں ہوا کرتی تھیں اور جن کو بیان کرنے کی اجازت حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دی تھی۔ یہ قصے وہی ہیں جنھیں اسرائیلی روایات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ قیس اور لیلیٰ کے اور اس طرح کی کئی لو اسٹوری بھی عربوں میں مشہور تھیں۔

قصہ کہانیوں کے سلسلہ میں عربی کی معروف کتاب الف لیلہ و لیلہ کو عالمی شہرت حاصل ہے اور جس کے ترجمے اکثر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ عربی ادب کی تاریخ کے حوالہ سے انھوں نے بتایا کہ عہد عباسی میں ابن مقفع نے سنسکرت کی مشہور کتاب پنچ تنتر کا ترجمہ کلیلہ و دمنہ کے نام سے کیا تھا اور اس طرح سنسکرت کا ایک گمنام شاہکار عربی میں منتقل ہونے کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہوا۔ ڈاکٹر انصاری نے بتایا کہ خدا بخش لائبریری میں قیام کے دوران میں "کلیلہ و دمنہ" ہی کے انداز کی عربی کہانیوں کی ایک اتنی ہی قدیم قلمی کتاب دریافت کر لی ہے۔ اس کا نام "کتاب الاسد والغواص" ہے۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر مہدی انصاری خدا بخش لائبریری کے اس نادر مخطوطے "الاسد والغواص" کو ایڈٹ کریں گے۔ جو چھٹی صدی ہجری کے ایک نایاب نسخہ کی نقل ہے اور اب اس کی واحد کاپی خدا بخش میں موجود ہے۔ اس کتاب میں کہانیوں کے ذریعہ رعایا اور بادشاہ کے باہمی تعلقات کو استوار رکھنے سے متعلق حکیمانہ باتیں کہی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں بھی پنچ تنتر کے اسٹائل میں لکھی گئی ہیں۔ جنگلی جانوروں کو انسانی کردار کی طرح پیش کر کے ان کے مکالموں میں حکیمانہ اقوال اور سبق آموز واقعات بیان کئے گئے ہیں اور حکمت و دانائی کی باتوں سے پوری کتاب کو مزین کیا گیا ہے۔ ○

۸۔ شاہ ولی اللہ اور خدابخش لائبریری

علمی دنیا میں یہ خبر دلچسپی سے سنی جائے گی کہ شاہ ولی اللہ کی اہم ترین بایوگرافی کا نسخہ خدابخش لائبریری میں حاصل کر لیا گیا ہے۔ اس مخطوطے کا نام "القول الجلی" ہے جو شیخ محمد عاقل [illegible] (متوفی ۱۱۸۷ھ) کی تصنیف ہے اور ۱۲ ویں صدی ہجری کی کتابت معلوم ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۱۷۶ھ میں ہوا۔

شاہ ولی اللہ کی اپنے ہاتھ کی لکھی تحریر خدابخش میں پہلے سے محفوظ ہے، جس کا عکس لائبریری کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ تحریر "الجامع الصحیح البخاری جلد ۲" میں موجود ہے۔

شاہ صاحب کی متعدد کتابوں کے اردو ترجمے بھی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کے شاہکار حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ جو مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے کیا وہ دراصل عظیم آباد کے رئیس سید فضل الرحمٰن صاحب نے پچھلی صدی کے اواخر میں (۱۳۱۲ھ) مطبع احمدی واقع محلہ مغلپور، پٹنہ سے اپنے اہتمام اور خرچ سے چھپوا کے شائع کیا تھا۔

اس ترجمے کی زبان اور اسلوب دلکش ہے اور گہرے فلسفیانہ مباحث کو بڑی محنت کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ عرب دنیا کو اور عالم اسلام کو ہندوستان کی طرف سے وہ مایۂ ناز تحفہ ہے جس کا جواب عرب دنیا ایک پوری صدی کے بھی بہت بعد مفتی محمد عبدالاحد کی شکل میں پیش کر سکی۔ لیکن آج عرب دنیا اور عالم اسلام میں شاہ ولی اللہ کو امام فن اور مجتہد عصر کا جو درجہ حاصل ہے وہ مفتی عبدالاحد کو بھی نصیب ہوا۔

[illegible] بیان میں دعائیہ انداز ہے جو اس موضوع کی ضرورت تھی اور اس انداز نے تحریر کو اور زیادہ گہرائی دی ہے لیکن ساتھ ہی کہیں کہیں نثر شاعری کے بہت قریب ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں شاعرانہ زبان کا طلسم قاری کو اصل موضوع سے دور کر سکتا ہے۔

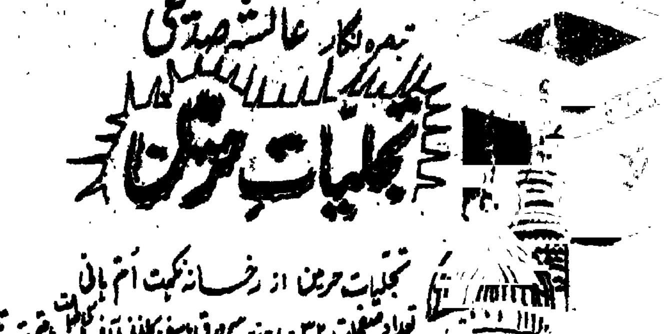
اُم ہانی بنیادی طور پر شاعرہ ہیں اور شاعری میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ مجموعہ میں شامل ان کی نظمیں اور نعت و سلام وغیرہ بھی ان کی پہچان ایک حساس شاعرہ کی حیثیت سے کراتے ہیں۔ ان کی مسلسل کاوش ضرور انھیں شاعروں کی صف میں ایک قابل قدر مقام دلائے گی۔

ذہن سے تاریک پردے جہل کے اٹھنے لگے
دل گئی جانی کو آ کر آگہی ہی آگہی

ابھی آگہی و جنوں میں ہے، مجھے لطف گفت و شنید بھی
مجھے عشق کہہ کے پکار لو، تجھے حسن حسن کہوں گا میں

اُم ہانی

تبصرہ نگار: عائشہ صدیقی



تجلیات حرمین از رخسانہ نکہت اُمِّ ہانی
تعداد صفحات ۳۲ دیدہ زیب سرورق سفید کاغذ آفسٹ کی طباعت، قیمت تین روپئے
ناشر: ادارہ رفیق عظیم آباد کالونی، پوسٹ مہندرو پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

اُمِّ ہانی کا نام ادبی دنیا میں نیا ضرور ہے لیکن اس نام نے اپنی پہچان بنانے کی جو سعی کی ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ ان کی کئی منثور اور منظوم تحریریں نظر سے گزری ہیں اور انھوں نے اردو حلقہ کو متوجہ کیا ہے گو یہ تحریریں زیادہ تر مذہبی نوعیت کی ہی ہوتی ہیں لیکن ان کی ادب سے دلچسپی اور گہرا خلوص انھیں اثر انگیز بنا دیتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ "تجلیات حرمین" اُمِّ ہانی کے پانچ مختصر مضامین پانچ نظموں، ایک غزل اور تین نعت پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین ایک ہی زمانہ میں یا یوں کہیے کہ ایک مختصر وقفہ میں یکے بعد دیگرے لکھے گئے ہیں اور عنوانات الگ الگ ہونے کے باوجود بھی سلسلہ وار سے محسوس ہوتے ہیں شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر مضمون میں اس سفر کے تجربات بیان کئے گئے ہیں جو فریضہ حج کے لئے اُمِّ ہانی نے کیا۔ مقامات کا مشاہدہ اور پھر انھیں بیان کرنے کا انداز کہیں کہیں ان مضامین میں سفرنامہ کا سا تاثر پیدا کر دیتا ہے۔

اُمِّ ہانی کی تحریریں ان کی مذہب کے ساتھ گہری دلچسپی کی مظہر تو ہیں ہی، ساتھ ہی زبان و ادب سے ان کی وابستگی کو بھی واضح کرتی ہیں۔ ان مضامین میں دین اور ایمان سے عقیدت والوں کے لئے وہ گہرائی، سوز اور خلوص کی آنچ ہے جو دلوں کو پگھلا دے جو انھیں اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے پر مجبور کر دے، اپنے تہی دست ہونے کا احساس کرا دے اور انھیں ابدی سکون ڈھونڈنے کے لئے اُکسائے۔

یہاں یہ بات خاص توجہ کی ہے کہ اُمِّ ہانی نے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہی ان کی تحریر کی اثر انگیزی کی ایک خاص وجہ بن گیا ہے۔ تجلیات حرمین میں شامل مضامین ایک ہی موضوع کا اظہار کرتے ہیں اور اس موضوع کے لئے جیسی زبان و بیان کی ضرورت تھی اُمِّ ہانی نے اس پر خاص توجہ کی ہے

باقی صفحہ ۵۱

لیکچرار آف ایجوکیشن، بالیکا ودیالیہ نکیتن، لکھنؤ۔

تبصرہ

نام کتاب : بچوں کی کہانیاں حصہ اول و دوم

مصنف : اکبر رحمانی ام۔اے۔بی۔ایڈ

ناشر : ایجوکیشنل اکیڈمی جلگاؤں (مہاراشٹرا)

بچوں کی کہانیاں حصہ اول و دوم ایجوکیشنل اکیڈمی جلگاؤں کے بچوں کا ادب سیریز میں شائع کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے پیش لفظ میں لکھا گیا ہے کہ "آزادی کے بعد ہمارے ملک میں اردو نے تیزی سے ترقی کی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے پھیلاؤ نے اس ترقی کی رفتار کو مزید تیز کیا"۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے یہیں پیدا ہوئی، پلی، پروان چڑھی مگر آزادی کے بعد سے اردو کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اور اس کی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں، ان کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ آج یو۔پی جو اردو کا گڑھ تھا اردو سے بہت دور ہو گیا ہے۔ آزادی کے بعد تعلیم پانے والی نوجوان نسل اردو پڑھ سکتی ہے نہ لکھ سکتی ہے۔ یہی حال پورے ہندوستان کا ہے۔ آج اردو والے خود اردو کی بجائے دوسرے میڈیم کے ذریعہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا رہے ہیں۔ مگر ان حالات سے بددل ہونے کی بجائے ہمیں چاہئے کہ اردو زبان و تعلیم کو فروغ دینے کے لئے کوششوں کو تیز تر کر دینا چاہئے۔ ایجوکیشنل اکیڈمی جلگاؤں قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اردو داں طبقے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، یہ حقیقت ہے کہ اردو میں تعلیمی و تدریسی لٹریچر، دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے، بچوں کا ادب، سائنسی، علمی و فنی کتابوں کی بے حد کمی ہے۔ ان حالات میں ایجوکیشنل اکیڈمی کا اشاعتی پروگرام نہایت خوش آیند ہے۔ بچوں کی کہانیاں حصہ اول و دوم کے ٹائٹل پر انگریزی میں بچوں کا ادب سیریز نمبر ۱، نمبر ۲ لکھا ہے۔ لیکن اندرونی اردو ٹائٹل پر سلسلہ مطبوعات نمبر ۱، نمبر ۲ لکھا ہے۔ البتہ سلسلہ مطبوعات نمبر ۱ کا پیش لفظ میں بھی ذکر نہیں ہے۔ غالباً بچوں کی کہانیاں کے یہی دونوں حصے ایجوکیشنل اکیڈمی کی پہلی مطبوعات ہیں اور نومبر و دسمبر ۱۹۸۵ء میں شائع شدہ ہیں۔ دونوں حصے ۳۲، ۳۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصے میں ۲۷ صفحات پر چار کہانیاں ہیں اور دوسرے حصہ میں ۲۷ صفحات پر تین۔ ہر حصہ کی قیمت تین روپے رکھی گئی ہے۔ چونکہ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئے

باقی ص ۵۶ پر

ماہنامہ شاداب حیدرآباد — جنوری سنہ ۱۹۸۷ء

علی بن ایاز

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

یہ ہمارا جنم جنم کا تجربہ ہے کہ جب ہم اپنا پیٹ بھرنے کے سلسلے میں کسی کے جسم کے کسی حصہ پر بیٹھ کر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں تو وہ شخص بے قرار ہو کر اس جگہ ہاتھ مار دیتا ہے جہاں ہم اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھ پڑنے سے قبل اگر ہم وہاں سے سرک نہ گئے تو پس کر رہ جاتے ہیں۔ ورنہ بالعموم اس متوقع حادثہ کو ہم ذہن میں رکھ کر ہی اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں۔ تا آں کہ اس جگہ سے اٹھا نہ دئیے جائیں۔

مگر ایک بار ایسا واقعہ رونما ہوا جو ہمارے عام تجربہ کے برخلاف تھا اور وہی واقعہ ہماری جانب سے اس آپ کی سمع خراشی کا سبب بنا ہے۔

ہوا یوں کہ میں ایک صاحب کی گردن پر بیٹھا اپنی سونڈھ کو اُن کی جِلد میں چبھائے اپنے کام و دہن کی لذت کشی میں مصروف تھا۔ مگر ساتھ ہی اپنی ساری دفاعی صلاحیتوں کو بیدار رکھا تھا کہ کب ان کا ہاتھ ماؤف جگہ کا رخ کرتا ہے تاکہ میں وہاں سے فوری سرک جاؤں۔

میں ان کا خون چوستا انتظار کرتا رہا۔ وہ صاحب کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے اور زبان سے الفاظ بھی ادا ہو رہے تھے۔ یہاں میں یہ بات صاف کر دوں کہ ہم لوگ جب اپنا پیٹ بھر رہے ہوتے ہیں تو صرف اپنی جان کے بچاؤ کی طرف ہمارا دھیان رہتا ہے اس کے سوا اور کوئی بات ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ لیکن جب میں نے ان صاحب کے انہماک کو دیکھا تو مجھے اپنی جان کا کوئی اندیشہ نہیں رہا۔ اس لئے میں نے ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ اس وقت ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے

نفرت تھی مجھ کو بے شک مچھر کے بولنے سے
کہتا تھا اپنے دل میں بے چارہ کیا برا ہے

آخر کھلا یہ عقدہ نفرت کا مجھ پہ اکبر — آواز بے تکی ہے کم بخت بے سُرا ہے

حضرت اکبر الہ آبادی کے کیا کہنے ۔ انھوں نے سنجیدہ شاعری میں عشق و محبت کے نغمے سنائے ہیں اور دریائے معانی سے دُرِّ شہوار برآمد کئے ہیں۔ حقیقت و معرفت کے بحر زخار میں غوطے لگاکر گوہر نایاب چن کر لائے ہیں۔ اور پھر طنز و مزاح کی صف میں سرِ لشکر بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف عشق و محبت اور معاملہ بندی کے بیان میں فطرت انسانی کے غوامض کو برملا کر کے پڑھنے والوں کے لئے فرحت و انبساط کا سامان مہیا کیا ہے تو دوسری طرف روح کی بالیدگی اور نشاط کے لئے خوان الوان فراہم کر دیا ہے۔

مگر ان کی زبان سے نفرت کا لفظ سن کر میرا سارا نشاط و کیف ہوا ہوگیا۔ نفرت ہم سے ؟ آخر کیوں ؟ کیا ہم نفرت کے لئے بنائے گئے ؟ خالق کائنات نے ہمیں اس لئے تخلیق کیا کہ آپ ہم سے نفرت کریں ؟ کیا ہماری تخلیق خالق کا فعلِ عبث ہے کہ آپ ہم سے نفرت کرتے ہیں ؟ آپ کو یہ نفرت کا حق کس نے دیا ؟ یا تو ہماری تخلیق آپ کے نزدیک خالق کا فعلِ عبث ہے یا پھر آپ کی سرشت ہی میں کوئی نقص ہے ؟ جو آپ یوں سوچتے ہیں۔

اس بات کو آپ ایک اور زاویہ سے دیکھئے۔ آپ تو انسان کہلاتے ہیں۔ کہلاتے ہیں نا آپ کا نام ہی مصدر انس سے مشتق ہے ، جس سے موانست ، مونس اور کتنے ہی مشتقات نکلتے ہیں۔ انس کے کتنے ہی معانی آپ نے متعین کئے ہیں۔ جن کے منجملہ ایک محبت بھی ہے تو پھر وہ مخلوق جس کے جنسی و قومی نام ہی میں محبت جیسے علوی جذبہ کی تجلیاں جھلک رہی ہوں اس کے دل میں شیطانی جذبہ نفرت کی سمائی کیسے ہوگئی۔ کیا کسی نے سنا ہے کہ کسی نے عطر کے ساتھ گندگی کو یکجا کیا ہے ؟ پھر آپ نے اپنے دل میں ہمارے تعلق سے جذبہ نفرت کی کیسے داشت و پرداخت کی ؟ پھر آپ نے اس جذبہ کی موجودگی کا جو اظہار کیا ہے اس کی کوئی تک ہے ؟ پھر آپ کا یہ فرمانا کہ " آواز بے تکی ہے ، کم بخت بے سُرا ہے " یعنی ہماری آواز بے تکی اور سریلے پن سے محروم۔ بے شک آپ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ آپ شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری کی اس ذیلی برِ اعظم ہی میں نہیں بلکہ اردو کی جہانگیری کے سبب دنیا کے کونے کونے میں دھوم ہے۔ اتنی دھوم ہے کہ غالب و اقبال کو چھوڑ کر سب شاعر آپ کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ شاعروں کا کام ہی مبالغہ سے کام لینا اور حقائق پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ آپ کو تو ترجمانِ حقیقت کہا جاتا ہے مگر آپ نے شعر گوئی کے جوش میں یہاں بہت سارے حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ آواز

کی خرابی کا دوش ہم پر رکھا ہے۔ حالانکہ اس میں ہمارا کوئی اختیار نہ تھا۔

۵ جیسے بنا دیا ہمیں پروردگار نے

(۱) کیا گدھے کی آواز سے بھی ہماری آواز بے سری ہے؟ حالانکہ خود خالق نے گدھے کی آواز کو انکر الاصوات قرار دیا ہے۔ توبہ کیجئے۔ آپ نے حد سے تجاوز فرمایا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تجاوز یا لغزش آپ کی فطرت بشری کی وجہ صادر ہوئی ہے۔ آپ کے لئے تو اللہ میاں نے ظلوم وجہول جیسے الفاظ فرمائے ہیں۔ تو کیا یوں ہی فرمائے ہیں؟

(۲) آپ نے اپنے پیشرو استاد ذوق کا یہ شعر سماعت نہیں فرمایا؟

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی　　جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

ہمیں اپنی قوت لایموت کے لئے جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ اگرچہ ذرۂ بے مقدار ہیں۔ تاہم اس کے لئے ہم چوری چھپے کوشش نہیں کرتے ہیں۔ جہد کے لئے نکلنے کے لئے فردوس گوش نغمے کی نہیں، طبل جنگ کی صاعقہ آہنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم اور بہت کچھ کہہ سکتے تھے، مگر آپ تو انسان ہیں، اشرف المخلوقات؟

العاقل تکفیہ الاشارہ

آپ نے یہ قطعہ کہہ کر ہماری خلقت ہی کی توہین نہیں بلکہ ہمارے خالق کے دست مشاطگی پر بھی انگشت نمائی کی ہے۔ توبہ کیجئے۔ لیجئے! ہم بھی آپ کی طرف سے اپنے کان پکڑتے ہیں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

★★★

ہیں اس لئے قیمت شاید کچھ کم رکھی جا سکتی تھی تاکہ بچے ان کتابوں کو خرید کر پڑھنے کی طرف راغب ہوتے۔ تاہم کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ زبان بھی ایسی ہے کہ آسانی سے بچوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ کتابیں مکتبہ آموزگار، اور مدینہ بک ڈپو جلگاؤں اور مکتبۂ جامعہ کے دہلی، بمبئی اور علی گڑھ کے مراکز سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ادارۂ مرکزِ ادب کا ماہانہ مشاعرہ بتاریخ ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۶ء بمقام ٹاؤن اسکول لے پی منعقد ہوا۔ مصرعِ طرح

"ان گنت مسائل ہیں اور وقت تھوڑا ہے" تھا۔

چند طرحی غزلیات ہدیۂ قارئین ہیں —

محمود شرفی

نعت

میں بھلا کہوں کیسے کس طرف اندھیرا ہے
نقشِ پائے احمدؐ کا ہر طرف اُجالا ہے

آپ کی یہ عظمت ہے آپ کا یہ رتبہ ہے
آپ کیلئے حق نے عرش کو سنوارا ہے

کیسی شان کا دیکھو ہے مقام او ادنیٰ
ہے نہ فصل ہی کوئی اور نہ کوئی پردا ہے

جانے والے طیبہ کو سب ہی جاتے ہیں لیکن
جا کے جو نہیں آتا وہ نصیب والا ہے

زندگی کی راہوں میں پیچ و خم جہاں آئے
ایسے موڑ پہ رہبر آپ ہی کو پایا ہے

خوف کیوں ہے طوفاں کا ڈر ہے کیوں تلاطم کا
لو لگا لے آقا سے پھر یہ پار بیڑا ہے

مرشدیں پہ پہنچے کو آئیے مدینہ میں
خوف کچھ ہی کم سا ہے فاصلہ بھی تھوڑا ہے

وہ زبان حسّان کی میں کہاں سے لاؤں گا
کرتا ہوں بیاں اتنا جتنا مجھ کو آتا ہے

وہ رہا نہ دنیا کا اور نہ دین کا محمود
[illegible]

محمد عبدالکریم ماہر
— سرپرست ادارۂ مرکز ادب —

وقت کی نزاکت سے جی مرا لرزتا ہے
پھول کو بھی چھوتا ہوں میں تو ہاتھ جلتا ہے

میں ہوں اور یاد اُن کی یوں بھی جی بہلتا ہے
آئیں یا نہ آئیں وہ اِک دیا تو سُلگتا ہے

شام میں نے دیکھا تھا جس کلی کو دل خستہ
صبح اس کی آہوں سے گلستاں مہکتا ہے

کچھ تو پاسِ رہزن ہے کچھ فضا بھی ہے رنگیں
جان بوجھ کر رہرو راستہ بھٹکتا ہے

دل بجھے بجھے سے ہیں چھیڑ دیجئے دیپک
راگ بھی بدلتے ہیں وقت جب بدلتا ہے

میں نے اپنے زخموں کو بے زباں بنایا تھا
خونِ آرزو ماہرؔ دور تک اچھلتا ہے

طرحی غزلیات

عزیز بھارتی
صدر ادارۂ مرکز ادب

اپنے ٹوٹے لمحوں کو جس کسی نے جوڑا ہے
اس نے اپنے ہاتھوں سے وقت کو نچوڑا ہے

ساتھ گر نہیں دیتے، ابتدا میں اچھا تھا
کس مقام پر آکر، تم نے ساتھ چھوڑا ہے

آپ نے جھنجھوڑا ہے آج تک تو اوروں کو
کیا کبھی خود اپنے کو آپ نے جھنجھوڑا ہے

اک صدی پہ بھاری ہیں پل دو پل کی سانسیں بھی
اس نظر سے دیکھو تو وقت کم نہ تھوڑا ہے

منطقی دلائل بھی رہ گئے ادھورے سے
گفتگو کے عنواں کو تم نے خوب موڑا ہے

لڑکھڑاتے قدموں سے چھو نہ پاؤ گے اس کو
وقت تو ازل سے ہی بے لگام گھوڑا ہے

اعتماد بے جا تھا، اس کو اپنے چہرے پر
بے سبب عزیزؔ اس نے آئینہ کو توڑا ہے

مومن خاں شوق
نائب صدر ادارۂ مرکز ادب

کون کس کو سمجھا ہے، کون کس کو جانا ہے
مطلبی زمانہ ہے کون ساتھ دیتا ہے

جو بھی کام کرنا ہے اُس کو آج کر گزرو
سچ کہا ہے اگلوں نے، کل کو کس نے دیکھا ہے

انجمن میں رونق تھی، سو چراغ روشن تھے
آپ کے نہ ہونے سے، ہر طرف اندھیرا ہے

مصلحت شناسوں نے، شکلیں کھڑی کر دیں
ایک ایک ذرے کو سنگِ رہ بنایا ہے

ایک آس جب ٹوٹی، دوسری پیدا ہو
اِک چراغ بجھتا ہے اک چراغ جلتا ہے

دولت اور طاقت شوقؔ سرخرو نہیں کرتی
سر بلند بس وہ ہے جس کا عزم اونچا ہے

محمد محمود شریف محمود

زندگی کی راہوں میں ہر قدم پہ روڑا ہے
" اَن گنت مسائل ہیں اور وقت تھوڑا ہے "

ہر طرح کی بیماری ہے سماج میں پھیلی
یہ غضب کی بے شرمی جیسے راج پھوڑا ہے

کیوں نہ زرد چہرے ہوں زر اُگانے والوں کے
غاصبوں نے جب اُن کے خون کو نچوڑا ہے

انقلاب آئے ہیں زندگی میں قوموں کی
وقت کے تقاضوں نے جب انہیں جھنجوڑا ہے

یہ بھٹکتی پھرتی ہے پُر فریب راہوں میں
آج کی سیاست اِک بے لگام گھوڑا ہے

زور و زر کی طاقت کا جن سروں میں غرّہ تھا
وقت کے ہتھوڑے نے اُن سروں کو توڑا ہے

رہ گیا کہاں محمودؔ پاس اب مروّت کا
سب نے رشتۂ اُلفت مال و زر سے جوڑا ہے

طرحی غزلیات

قمر رضا

بزم بزم خود اپنی لاش اُٹھائے پھرتا ہے
عہدِ نو کا شاعر بھی اک عجب معمّہ ہے

کھیلتے ہو جب چاہے توڑتے ہو جب چاہے
کیا تمہارے ہاتھوں دل بھی اک کھلونا ہے

وہ بھی اپنے ماضی میں ہم ہی جیسا تھا ہوگا
کہہ رہے ہیں ہم جس کو کیا لعیب والا ہے

برف برف ہیں سانسیں روئی روئی ہے منظر
چاند کی طرح کیوں آج آفتاب نکلا ہے

اونچے اونچے پیڑوں کے پُرشکوہ جنگل میں
آندھیوں کو کیا معلوم کیو نسلا بھی رہتا ہے

فاصلوں کو مت ڈھونڈو خوش نما کتابوں میں
یہ سبق تو راہوں کی ٹھوکروں سے ملتا ہے

دوڑتے ہیں سب رستے اے قمرؔ مری جانب
کیا مری [illegible]

ابوالفاروق شعورؔ

بے ضمیر انساں تو ہر لہر میں بہتا ہے
صرف باضمیروں نے رخ بحر کا موڑا ہے

انتشارِ باہم سے اب بھی باز آجاؤ
" اَن گنت مسائل ہیں اور وقت تھوڑا ہے "

یا خزاں ہو گلشن میں یا بہار کا موسم
باغباں ہیں ہم کو تو باغ ہی میں رہنا ہے

گلستاں کی بربادی کب کسے گوارہ تھی
خود حسیں بہاروں نے برق کو رجھایا ہے

نفرتیں ہیں اُلفت سے چاہتیں ہیں نفرت سے
ظلمتیں مٹانے کا طرز یہ نرالا ہے

طرزِ رحم و اُلفت سے ٹوٹے دل بھی جڑتے ہیں
نفرت و عداوت نے کب دلوں کو جوڑا ہے

کٹ گئی ہیں زنجیریں جہل اور توہم کی
جب شعورؔ کو اس کا اعتبار [illegible]

لیاقت افسر شرقی

وقت کی کلائی کو ہم نے جب بھی موڑا ہے
زندگی نے مڑ مڑ کر مسکرا کے دیکھا ہے

وقت ہے رواں دریا کس نے اس کو روکا ہے
زندگی تجھے کس نے جیت کر بھی جیتا ہے

خواب ہوئے بیداری شعور ہوئے تنہائی
تجھ کو ساتھ پایا ہے تجھ کو میں نے سوچا ہے

پاؤں بہکے بہکے تھے تیرے موسم گل میں
اے صبا یہ بتلانا اب مزاج کیسا ہے

ڈر رہا تھا میں تیری ہو نہ جائے رسوائی
آج میری حالت کا شہر بھر میں چرچا ہے

غم تمہارا، غم اپنا اور غم زمانے کا
"ان گنت مسائل ہیں اور وقت تھوڑا ہے"

یوں تو ہر طرف افسر اک سروں کا ساگر ہے
دیکھنے کے قابل بھی ان میں کوئی چہرہ ہے

طرحی غزلیات

عزیز ناگپوری

غم کا زندگانی سے ربط کتنا گہرا ہے
غم کے ساتھ جینا ہے غم کے ساتھ مرنا ہے

روح ہے جسد میں تو حرکتیں بھی کرتا ہے
ورنہ آدمی تو اک خاک کا ہی پتلا ہے

التجائیں میں نے کیں اک فقط ترے آگے
آج تک نہ غیروں کے میں نے ہاتھ جوڑا ہے

حادثات کا سورج جب سے سر پہ آیا ہے
چھاؤں میں بھی اب گرمی دھوپ سے زیادہ ہے

بول نہ بڑے بولو جس سے ہو خدا ناراض
فخر کرنے والوں کو ہم نے گرتے دیکھا ہے

قامتوں کی پیمائش کرنے والے کیا جانیں
کس کا ظرف کتنا ہے کس کا حوصلہ کیا ہے

زندگی عزیز اپنی کیا سکوں سے گزرے گی
ہر قدم پہ ٹھوکر ہے ہر قدم پہ دھوکا ہے

ساجد رضوی

آئینے میں جس دن سے خود کو اس نے دیکھا ہے
انجمن میں رہ کر بھی آج تک وہ تنہا ہے

دوستو! کہوں اب کیا دن یہ کیسا نکلا ہے
صبح تو ہوئی لیکن ہر طرف اندھیرا ہے

آپ کیوں تسلی کی زحمتیں اٹھاتے ہیں
آپ کی تسلی سے درد اور بڑھتا ہے

شام غم کی تنہائی زندگی کی رسوائی
صرف آپ کی خاطر مجھ کو سب گوارا ہے

جلوے اور پردے کی اصلیت بس اتنی ہے
دیکھئے تو جلوہ ہے سوچئے تو پردہ ہے

فرق تم جو کرتے ہو پھول اور کانٹوں میں
کھیل ہے نگاہوں کا گلستاں نہ صحرا ہے

اہل دل سمجھتے ہیں اس کو سجدہ اے ساجد
قید آستاں سے جو بے نیاز سجدہ ہے

ڈاکٹر نثار الرحمن خان منشا

ہوئے جو پاؤں سے معذور ہم جبیں سے چلے
ہمارا سر ہی ہمیشہ نشانہ بنتا ہے
کھلے طریقے سے ہم پر چلے نہیں خنجر
ہماری جرأتِ بے باک میں نہ فرق آیا
کبھی دھڑکتے دلوں کی بنے ہیں ہم دھڑکن
جبینِ ناز پہ تھیں سلوٹیں ندامت کی
فلک یہ دیکھ کے جن کو لرز گیا منشا

جنونِ شوق میں یہ سلسلے یہیں سے چلے
کسی بھی سمت سے پتھر چلے کہیں سے چلے
اگر چلے بھی تو یاروں کی آستیں سے چلے
ہزار تیرِ ستم وقت کی کمیں سے چلے
کبھی ہم اشک صفت چشمِ سرمگیں سے چلے
کچھ اس ادا سے ہم اس بزمِ نازنیں سے چلے
کچھ ایسے فتنے سراپردۂ زمیں سے چلے

11 - اسٹار کی ٹاؤن
ناگپور

غزلیں

ضمیر کی آواز

فاطمہ ضابطہ پروین

بہت معذور لگتے ہیں مقابل میں طبیعت کے
ری عظمت چھپائی ہے حسیں پیکر نے قدرت کے
ے اندر کے انساں سے مجھے تنبیہ ملتی ہے
رایا اس نے مجھ کو بارہا، یہ دہر فانی ہے
بائیں آرزو جتنی وہ آتی ہی ابھرتی ہیں
یحت پر خرد کی، کب یہ غافل کان دھرتا ہے
ہت معروف ہے انسان دولت جمع کرنے میں
ں کو اور پرندوں کو، کہاں ہے وقت یہ دیکھیں
ت ہی خوب رنگوں میں یہاں مصور
اروں نعمتیں پاکر بھی خواہش سے وہ نالاں ہیں

نکہت خان

میں جب بھی آئینہ دیکھوں مجھے یہ لگتا ہے
تو میری آنکھ میں ہے اور مجھ کو تکتا ہے
یہ انتظار کی مدت اذیتوں کا سماں
یہ جسم سوکھی ہوئی لکڑیوں سا جلتا ہے
وہ خد و خال جواب میری دسترس میں نہیں
انہیں کا روز رگِ جاں پہ پھول کھلتا ہے
وہ گہری نیند کا رسیا نہ جان پائے گا
تمام رات کوئی کروٹیں بدلتا ہے
عجیب بات ہے اک عمر سے جدا ہے تو
مگر یہ لگتا ہے ہر وقت ساتھ رہتا ہے

۸-۲-۲۰۸/۴۳/۴۴ روڈ نمبر ۱ حیدرآباد ۳۴
بمعرفت مس ایس اے خان سیلس ٹیکس آفس نزد ناگپور

پروفیسر جگناتھ آزاد

ایک غزل اور چند اشعار

شمع کی لو، صبح کی پہلی کرن جاتی رہی
کیا ہوا تھی انجمن کی انجمن جاتی رہی

در بدر، کوچہ بہ کوچہ میں بھٹکتا ہی رہا
لے کے خوشبوئے بدن تیرا بدن جاتی رہی

اک ذرا سی صبح کے ہنگام جھپکی آ گئی
رتجگے کی وہ جو تھی ساری تھکن جاتی رہی

زندگی بھر کا مخالف جب ملا تو اس طرح
زندگی میں جس قدر بھی تھی پھبن جاتی رہی

[illegible] بے علم و بے فن لوگ یوں حاوی ہوئے
آبروئے شیوۂ اربابِ فن جاتی رہی

بن گیا آزاد! ہر عیبِ ہنر حسنِ ہنر
شعر کے چہرے سے وہ پہلی پھبن جاتی رہی

میں کہ ہوں آج بھی جاں دادۂ اقدارِ کہن
سیکھ پایا نہ کسی طرح نئے دور کے فن

تو نظر باز نہیں ورنہ تغافل ہے نظر
تو زباں فہم نہیں ورنہ خموشی ہے سخن

جس پہ آزاد، تھی موقوف زباں کی رفتار
چال کے حسن کو اب بھول گیا ہے وہ چلن

ادھر ملاح ہے جس کے قویٰ شل ہوتے جاتے ہیں
ادھر دریا ہے جس کی شانِ طغیانی نہیں جاتی

عجب اک راز ہے جود و سخا بھی، بخل بھی ان کا
سمندر جس کو دیتے ہیں، اُسے دریا نہیں دیتے

میں جس کو ڈھونڈ رہا ہوں ابھی ملا تو نہیں
مگر ملے گا کسی دن کوئی خدا تو نہیں

شیخ سعد حسین سعد

کیا رنگ بہاراں رقصاں ہے آنچل کے لٹکتے رہنے سے
یہ شام سہانی کتنی ہے زلفوں کے مہکتے رہنے سے

ہے کیفِ سرورِ میخانہ ساغر کے چھلکتے رہنے سے
ہے لطفِ بہارِ ہستی بھی رندوں کے بہکتے رہنے سے

بہتر ہے ٹھہرنا پلکوں پر آنکھوں سے ڈھلکتے رہنے سے
توہینِ محبت ہوتی ہے اشکوں کے ٹپکتے رہنے سے

جب ذوقِ جنوں پیہم ہو، احساسِ خرد بھی ہمدم ہو
منزل کا پتہ کیا چلتا ہے ہر گام بھٹکتے رہنے سے

یہ جوشِ جنوں ہے، جوشِ جنوں! جو رونقِ گلشن بنتا ہے
گلشن میں بہاریں قائم ہیں کلیوں کے چٹکتے رہنے سے

وہ عالمِ سرمستی ان کا اک عرضِ وفا پر کیا کہیے
جیسے کہ سماں سا بندھ جائے ساغر کے چھلکتے رہنے سے

زنداں کی فضائیں جھوم اٹھیں جب اہلِ جنوں کا رقص ہوا
اک سازِ طرب سا گونج اٹھا زنجیر چھنکتے رہنے سے

اس زیست کی مشعل کیا بجھتی کچھ بادِ فنا کے جھونکوں سے
کچھ اور فروزاں ہوتی گئی ہر بار بھڑکتے رہنے سے

جو بات تھی دل کی دل میں رہی کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
کچھ اپنے جھجکتے رہنے سے کچھ ان کے جھجکتے رہنے سے

اس رات کو روشن صبح کریں جب مان بھی جائیں ہم ان کو
کیا فائدہ ماہ و انجم کے اس طرح چمکتے رہنے سے

صد قہر ہے جنوں کا عزمِ سفر، ہر منزلِ ہستی، راہگذر
ہم خالقِ راہِ شوق بنے دن رات بھٹکتے رہنے سے

رونا ہے تو جی بھر کر رو لو کچھ بوجھ تو دل کا ہلکا ہو
کیا فائدہ ہے اے سعد بتا چھپ چھپ کے سسکتے رہنے سے

علی بن ایاز ایازؔ

حالِ دل کیا کرے کوئی تحریر
ہاتھ میں ضعف کا ہو جیسے زنجیر

ان کے جلووں کی قہرمانی سے
سلب ہوتی ہے طاقتِ تقریر

صفِ مژگاں کی دلستانی سے
ہائے اقلیمِ دل ہوئی تسخیر

زخم سے وہ چارہ سازِ نظر
چھین لیتی ہے خواہشِ اکسیر

ذوقِ ہجراں چیرہ دستی نے
چھین لی آہ، آہ کی تاثیر

کاسہ اندھا ہے خود ستارہ کا
کیا بنائے گا وہ مری تقدیر

دولتِ فقر کی نوازش سے
اپنے در کا بنا لیا ہے فقیر

اک نگاہِ کرم، براہِ کرم
پھرے کب تک ایازؔ خوار و حقیر

اے۔ سی۔ گارڈز
حیدرآباد۔ ۴

مومن خاں شوقؔ

دوستی ہے کہ دشمنی ہے ابھی
ہم نے اک بات تو سنی ہے ابھی

دیکھ لو، جو دکھائے دنیا
اپنی آنکھوں میں روشنی ہے ابھی

ذکر پر اس کے لوگ ہنستے ہیں
آپ کی اس سے دوستی ہے ابھی

آپ سے اور کیا چھپانا ہے
عشق کرتے ہیں تشنگی ہے ابھی

انگلیاں کیوں اٹھیں زمانے کی
آنکھ اس شوخ سے لگی ہے ابھی

دوستوں میں ہے شوقؔ بھی اپنے
آپ کی اس سے کیوں ٹھنی ہے ابھی

اشرف ولا ۲۳-۷-۲۰۱۱ مٹی پیٹا، حیدرآباد۔ ۱

سلیم محی الدین

آئینوں میں بکھرا، تو
عکس لگے ہے میرا، تو

میں ہی محفل محفل ہوں —
سارے جگ میں تنہا، تو

اپنے اندر خوش ہوں میں
پاگل مجھ میں الجھا، تو

دھرتی کو آکاش کرے
میرے اندر بیٹھا، تو

میں تو ایک جزیرہ ہوں
چاروں اور ہے پھیلا، تو

سوچوں دریا، لکھوں ریت
ریت لکھے گا دریا، تو

عماڑی پورہ، پر

فروری

ماہنامہ شاداب

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابری

مینجنگ ایڈیٹر

محمد کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

زر تعاون

پاکستان	انگلستان	امریکہ	خلیجی ممالک	ہندوستان
125 پاکستانی روپے	20 پونڈ	35 ڈالر	150 روپئے	سالانہ : 50 روپئے
225 " "	36 "	65 "	270 "	دو سالہ : 90 "
2000 " "	300 "	450 "	2500 "	تاحیات : 1000 "

ترسیل زر کا پتہ : 147-5-11 ، ریڈ ہلز ، حیدرآباد 500004 اے پی

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے اعتماد پریس چارکمان میں چھپوا کر ، ریڈ ہلز حیدرآباد ۔ ۴ ، آندھرا پردیش سے شائع کیا ۔

حرفِ اول

مسلمانوں کی دینی تعلیم درسِ نظامی اور اس کے مرتبہ نصابوں پر مبنی ہے۔ ان دینی مدارس میں سائنس وٹکنالوجی اور جدید تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ کہنے کو ہر مسجد میں ایک مکتب موجود ہے جہاں زیادہ تر قرآن خوانی کی تعلیم دی جاتی ہے اور بنیادی ابتدائی دینی مسائل بتائے جاتے ہیں لیکن نصاب کو مقرر کرکے اس کی تعلیم وتکمیل کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان میں انگریزی اور جدید تعلیم کا انتظام کیا گیا، مسلمانوں نے اس جانب کوئی توجہ نہ کی اور اس طرح حصولِ تعلیم میں برادرانِ وطن سے پیچھے رہ گئے جدید تعلیم نہ ہونے سے کسبِ معاش پر بھی اثر پڑنے لگا اور تعلیم کے ساتھ معاشی حالت میں مسلمان دوسرے ہم وطنوں سے پیچھے رہ گئے۔ تعلیم کی اس کمی اور پسماندگی کو دور کرنے کے لئے سرسید نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی قائم کی اور دوسرے ادارے قائم کئے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کی کمی کو دور کرنے میں لگ گئے۔ مسلمان اس میدان میں اتنے پیچھے ہوگئے تھے کہ مسلسل کوشش کے باوجود آج بھی وہ پسماندہ اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو اس کا احساس ہے کہ انھیں اپنی پسماندگی کو دور کرنا اور اپنی حالت کو سدھارنا ہے۔ نیز مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتیں بھی اس جانب متوجہ ہیں کہ پسماندہ طبقات، جن میں مسلمان شامل ہیں، کے لئے تعلیمی ادارے قائم کریں اور مسلمان جو اقلیتی تعلیمی ادارے خود قائم کر رہے ہیں اس بارے میں انھیں مدد دیں۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاکر زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کرنا وقت کی ضرورت ہے۔

مزید ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کی افراط وتفریط کو دور کیا جائے اور ایک درمیانی راستہ اپنایا جائے۔ دینی مدارس میں سائنس وٹکنالوجی کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور جدید تعلیمی اداروں میں دینیات واخلاقیات کی تعلیم کا انتظام اسی طرح کیا جائے جس طرح حکومت حیدرآباد نے حضور نظام کے زمانہ میں اپنے اسکولوں اور کالجوں میں کیا تھا۔

سب سے زیادہ ضروری بات ہے کہ مساجد کو تعلیمی مرکز کا درجہ دیا جائے اور مسجد کے اطراف کے علاقہ کے تمام طلباء مدارس کے اوقات کے باہر اس مرکز پر جمع ہوں۔ وہاں میں عربی، قرآن وسیرت، بنیادی فقہی مسائل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے مدارس

کی تعلیم کا آموختہ کرائیے اور ہوم ورک کرائیے۔ محلہ کے وہ حضرات جو تعلیم میں دلچسپی رکھتے ہیں اس مرکز کی نگرانی کریں اور جہاں طلباء کو اسکول ہوم ورک کرنے میں کچھ مشکل درپیش ہو اس میں مدد دیں۔ اس طرح ہمارا سب سے اہم تعلیمی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ محلے کے تمام بچے تعلیم حاصل کریں گے۔ اور جب انھیں روزآنہ پڑھنے کے لئے بٹھایا جائے گا، ہوم ورک کی تکمیل میں مدد دی جائے گی اور ان کی مشکلات کو بھی دور کیا جائے گا تو ان کا تعلیمی معیار بھی بلند ہوگا اور اس مسابقتی دور میں تعلیمی مقابلوں میں کامیاب حصہ لے کر وہ قوم و ملک میں اپنا مستحقہ مقام حاصل کر سکیں گے۔

ضروری اطلاع

ماہ نامہ شاداب نے اپنی زندگی کے تین سال پورے کر لئے ہیں، چوتھے سال میں قدم رکھا ہے، ہمیں یقین ہے آپ شاداب کو پسند کرتے ہیں، اپنی پسند کے عملی اظہار میں آپ اپنے ذمہ سابقہ زرِ سالانہ روانہ فرما دیں اور نئے سال جنوری ۱۹۸۷ء کا زرِ تعاون پیشگی عنایت فرمائیں، رقم واجب الادا ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائی جائے اندرون ایک ماہ واجبات وصول نہ ہوں تو بصورت مجبوری آئندہ شمارہ بذریعہ وی۔پی روانہ کیا جائے گا۔

مینیجنگ ایڈیٹر

مولانا محمد منظور نعمانی

نبیِ امّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآنِ کریم

یہ ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ اب سے قریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے پانچویں، چھٹی صدی عیسوی میں پوری انسانی دنیا نورِ ہدایت سے محروم اور روحانیت و اخلاق کے لحاظ سے اندھیر نگری بنی ہوئی تھی، یورپ پر قرونِ وسطیٰ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، ایران اور اس کے زیر اثر ملکوں میں مزدکیت کا دور دورہ تھا جس نے اخلاق و شرافت کی حدود کو درہم برہم کر کے انسانوں کو حیوان بنا دیا تھا، ہندوستان پورا ایک عہد کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا، یہاں ایک طرف تو جمادات و حیوانات بلکہ سانپوں تک کی پرستش ہوتی تھی، اور دوسری طرف بیچارے ان انسانوں کے ساتھ جن کو نسلی اور پیدائشی طور پر اچھوت قرار دیا گیا تھا، حیوانوں سے بدتر سلوک ہوتا تھا۔ وہ انسان ہونے کے باوجود انسانی حقوق سے محروم تھے۔ جس کے کچھ اثرات اتنا طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود اب تک بھی باقی ہیں — کم و بیش یہی حال انسانیت کی پستی اور انسانوں کی بے راہ روی کے لحاظ سے اس وقت دنیا کے ان دوسرے ملکوں کا بھی تھا جن کی تاریخ معلوم ہے۔

پھر ان سب کے قلب میں گویا جزیرہ نمائے عرب تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مقام اتصال پر واقع تھا۔ اور اسی لئے پرانے زمانے میں اسے "دنیا کی ناف" کہا جاتا تھا، یہ بھی اس دور میں خداوندی ہدایت اور تعلیم و تہذیب کی روشنی سے یکسر محروم تھا، تاریکیوں اور گمراہیوں کے بادل تہ بہ تہ چھائے ہوئے تھے، ایک خدا کو چھوڑ کر بے شمار دیویوں، دیوتاؤں اور ان سے نسبت رکھنے والی پتھر کی مورتیوں کی پوجا ہوتی تھی، ان کے لئے انسانوں تک کی قربانی دی جاتی تھی، شہر مکہ کا وہ کعبہ جس کو خدا کے پیغمبر ابراہیم و اسماعیل نے خدا کی عبادت کے مرکز کے طور پر اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، وہ ایک بڑا بت خانہ بن گیا تھا، پورے ملک میں جنگل کا قانون چالو تھا، کوئی حکومتی نظام بھی نہ تھا،

۳۱ - نیا گاؤں مغربی، نظیر آباد، لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۱

انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا، سنگدلی اور قساوت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ خود اپنے نومولود بچیوں کو گڑھا کھود کے زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بے شرمی اور بے حیائی کا یہ حال تھا کہ بہت سے لوگ مادر زاد برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، بعض قبیلوں میں باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اس کی بیوہ بیوی کو اپنی بیوی بنا لیتا تھا، اور یہ گویا اس کا حق تھا۔ اخلاق و روحانیت کی اس تباہی کے علاوہ دنیا بھی برباد تھی، بہت بڑی تعداد ایسے غریبوں کی تھی جو غربت و افلاس کی مجبوری سے زمین کے کیڑے مکوڑے اور مردار تک کھا لیتے تھے۔

پوری انسانی دنیا کے اور خاص کر ملک عرب کے یہ حالات تھے کہ اب سے تقریباً چودہ سو سال پہلے عرب کے مرکزی شہر مکہ میں ابراہیم و اسماعیل علیہما کی نسل کے ایک معزز قبیلہ قریش کے ایک شریف گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا — یہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو چکا تھا یعنی ابھی یہ ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ باپ عبداللہ بن عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا اور بیوہ ماں ہی نے اس کو پالا، عمر کا چھٹا سال تھا کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو دادا عبدالمطلب نے اپنے آغوش تربیت میں لے لیا، اس کے دو ہی سال بعد دادا کا بھی انتقال ہو گیا تو آٹھ سالہ بچہ کو چچا ابو طالب نے اپنی کفالت میں لے لیا۔

اس بچہ کا نام "محمد" رکھا گیا جس کے معنی ہیں وہ ذات جو اپنی صفات اور کارناموں کی وجہ سے بہت ہی قابل تعریف ہے۔

چونکہ عربوں میں اس زمانہ میں تعلیم کا رواج نہیں تھا، اس لئے آپ بھی اُمّی یعنی نوشت و خواند سے بالکل ناآشنا رہے — لیکن فطرت کی سلامتی اور روح کی پاکیزگی جو خدا کا خاص عطیہ تھا، اس کی وجہ سے اس انتہائی فاسد ماحول میں بھی آپ کی زندگی نہایت معصومانہ اور شریفانہ رہی۔

جب سن شعور کو پہنچے تو کسب معاش کی فکر ہوئی تاکہ چچا ابو طالب پر (جن کے خود بھی کافی اولاد تھی) بوجھ نہ پڑے، تجارت خاندانی پیشہ تھا، اسی کا اپنے لئے انتخاب کیا، لیکن سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنا ذاتی کاروبار نہیں کر سکتے تھے اس لئے اپنی محنت دوسروں کے سرمایہ کے ساتھ لگا کر کام شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں معاملات میں آپ کی امانت و دیانت، سچائی اور نیک کرداری کی شہرت ہو گئی اور آپ کا لقب ہی "امین" پڑ گیا، جس نے آپ کے ساتھ کاروباری معاملہ کیا، اس نے آپ کو ایک فرشتہ صفت انسان اور بالکل نئے قسم کا ایک پاکباز تاجر پایا، اور وہ متاثر ہوا۔

مکہ میں قریش ہی کے قبیلہ میں خدیجہ ایک دولت مند بیوہ خاتون تھیں، جن کا اپنا

کاروبار بھی تھا اور دوسروں کو سرمایہ دے کر بھی وہ تجارت کراتی تھیں۔ بڑی صاحب فراست اور نیک فطرت خاتون تھیں، اُن سے بھی آپ کا کچھ کاروباری واسطہ پڑا تھا ــــ وہ اگرچہ صاحب اولاد تھیں اور ان کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی اور آپ کی عمر ابھی صرف پچیس سال ہی کی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے آپ سے نکاح کرنا چاہا اور یہ نکاح ہو گیا۔

اس نکاح کے بعد آپ کو اپنے معاشی مسئلہ کی زیادہ فکر نہیں رہی تو آپ زیادہ وقت خلق اللہ کی خدمت، خاص کر غریبوں، آفت رسیدوں اور ضرورت مندوں کی امداد و اعانت اور علاقہ میں امن و امان کی فضا قائم کرنے پر صرف کرنے لگے ــــ زندگی اسی طرح چل رہی تھی اور آپ کی معصومانہ سیرت، نیک روی، غربا نوازی اور خدمت خلق کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں عام طور سے آپ کی عظمت اور محبت پیدا ہو گئی تھی، اور اس طرح پوری قوم کی غیر رسمی سرداری آپ کو حاصل تھی کہ عمر کے چالیسویں سال میں آپ کے اندر ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوئی۔ دل میں شدت سے یہ داعیہ پیدا ہوا کہ گھر سے اور آبادی سے دور، سب سے الگ بالکل تنہائی میں عبادت اور دعا و مناجات کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کریں۔ مکہ سے قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک اونچی پہاڑی ہے، جس کی چوٹی پر پتھر کی بڑی بڑی چند چٹانوں سے گھرا ہوا ایک قدرتی غار ہے جو آج بھی غار حرا کے نام سے معروف ہے، آپ ایک ہفتہ کے لئے صرف چند دنوں کی ضرورت کے بقدر کھانے پینے کا مختصر سامان لے کر وہاں چلے جاتے، اور بالکل یکہ و تنہا اس غار میں رہتے، ہفتہ میں ایک دفعہ گھر آتے، اور پھر اسی طرح کھانے پینے کا مختصر سامان لے کر وہیں چلے جاتے اور سارا وقت توجہ الی اللہ اور تفکر و عبادت میں گزارتے۔

اگرچہ اس وقت خدا کی ذات و صفات کی وہ معرفت آپ کو حاصل نہیں تھی جو بعد میں وحی الٰہی سے حاصل ہوئی، اسی طرح طریق عبادت کی بھی کوئی خاص تعلیم آپ کو نہیں ملی تھی بلکہ کسی طالب کو جس کی فطرت سلیم، روح پاکیزہ اور دل نورانی ہو جس درجہ خدا کی مجمل معرفت اور اس کی رضا جوئی اور حصول قرب کا شوق پیدا ہو جانا چاہئیے، وہ یقیناً آپ کو حاصل تھا اور اپنے قلبی داعیہ کی رہنمائی کے مطابق آپ خدا کی عبادت اور اس کے حضور میں دعا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی مہینہ اسی طرح جاری رہا۔

اسی زمانہ میں ایک نئی کیفیت آپ میں یہ بھی پیدا ہوئی کہ آپ بکثرت خواب دیکھتے اور جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ اگلے دن واقعہ کی شکل میں سامنے آجاتا، لیکن آپ لوگوں کے سامنے اس کا اظہار و اعلان بالکل نہ کرتے ــــ یہ عالم بالا کے ساتھ آپ کے روحانی ربط

آغاز تھا اور شروع ہونے والے دن کی صبح صادق تھی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک دن جب کہ غار حرا کے اس مجاہدہ اور اعتکاف کے تسلسل چھ مہینے گزر چکے تھے، آپ غار حرا سے اس غیر معمولی حالت میں گھر آئے کہ رنگ پیلا تھا جیسا کہ کسی سخت دہشت زدہ انسان کا ہوجاتا ہے اور جسم پر لرزہ کی سی کیفیت طاری تھی، آپ آتے ہی پڑ گئے اور گھر والوں سے فرمایا "مجھے موٹے کپڑے اڑھادو، مجھے موٹے کپڑے ڈال دو" (زَمِّلُوْنِی زَمِّلُوْنِی) پھر جب حالت کچھ سنبھلی تو بیوی خدیجہ کے دریافت کرنے پر، غار میں خدا کے فرشتے کا ظاہر ہونا اور خدا کا پیغام پہنچانا اور اس کلام پڑھوانا اور اس سلسلہ میں جو کچھ پیش آیا تھا اور آپ کے قلب و روح پر اس کا جو غیر معمولی بوجھ پڑا تھا وہ سب آپ نے بیان کیا اور بتلایا کہ میری یہ حالت اس کے اثر سے ہے۔ خدیجہ جو بڑی صاحب فراست خاتون تھیں، انھوں نے پہلے تو خود آپ کو تسلی دی کہ آپ جیسے نیک اور سب کے کام آنے والے بندہ کے ساتھ اس کا خدا جو کچھ کرے گا وہ بہتر ہی ہوگا، اس کے بعد وہ آپ کو اپنے چچا ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو بہت بوڑھے تھے، آنکھوں سے بھی معذور ہو چکے تھے انھوں نے بہت پہلے اپنی بت پرست قوم کے کیش و مذہب کو چھوڑ کے نصرانیت اختیار کرلی تھی، وہ قدیم آسمانی کتابوں تورات و انجیل کے اچھے عالم بلکہ مترجم بھی تھے، انھوں نے غار حرا کا واقعہ سن کر یقین کے ساتھ کہا کہ تمھارے پاس جو فرشتہ آیا تھا، یہ اللہ کا وہی خاص فرشتہ ہے جو پیغمبروں کے پاس خدا کا پیام و کلام اور اس کے احکام لایا کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے تم کو منصب نبوت پر فائز کیا ہے اور پیغمبری کا کار عظیم تمھیں سپرد کیا جائے گا اور سن لو تمھاری قوم تمھاری دشمن ہوجائے گی اور تم کو جلا وطن کردے گی، پھر بوڑھے ورقہ نے حسرت سے کہا کہ کاش میں اس وقت زندہ و توانا ہوتا اور تمھارا ساتھ دے سکتا۔

بس یہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کا آغاز ہوا۔

آپ کا اب تک یہ حال تھا کہ اپنی ذات سے معصوم فطرت اور خادم خلق تھے لیکن خاموشی پسند تھے، اس دور میں عربوں میں شعر و سخن سے دلچسپی عام تھی لیکن آپ نے اس میں بھی کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی، نہ قوم کے سامنے کبھی خطیب اور مقرر بن کے کھڑے ہوئے۔ کبھی مصلحانہ حیثیت سے بھی کسی تحریک اور ہنگامہ خیزی کا آپ سے ظہور نہیں ہوا۔ حتی کہ قوم کی حد سے گزری ہوئی بداخلاقی و بے راہ روی کی اصلاح کے لئے بھی آپ نے کوئی تحریک کھڑی نہیں کی اور کوئی پلیٹ فارم نہیں

وحی و رسالت، قیامت و آخرت اور دین و شریعت کے موضوع پر بھی اس پورے چالیس سال میں کبھی آپ سے کچھ نہیں سنا گیا، اگلے پیغمبروں اور ان کی امتوں کے سبق آموز واقعات کا بیان بھی آپ کی زبان پر کبھی نہیں آیا، سیاسیات و عمرانیات، معاشیات و اقتصادیات کے بارے میں بھی اس پورے عرصے میں اپنی قوم کو آپ نے کوئی رہنمائی نہیں دی، الغرض چالیس سال کی عمر تک آپ کی زندگی کا ان باتوں سے کوئی ادنیٰ تعلق ظاہر نہیں ہوا، اور کسی نے کوئی ایسی بات آپ سے نہیں سنی جس سے اندازہ کیا جا سکتا کہ آپ ان مسائل کی الف ب سے بھی واقف و باخبر ہیں۔

لیکن عمر کے اکتالیسویں سال میں غار حرا کے مذکورہ بالا واقعہ کے بعد اچانک آپ میں ایک محیر العقول انقلاب پیدا ہو گیا، گویا آپ کے قالب میں ایک دوسری روح آ گئی اور آپ ایک بالکل دوسری قسم کے انسان بن گئے۔ اب آپ کی خاموشی ٹوٹ گئی اور اپنی قوم سے آپ نے کہا کہ مجھے خدا نے وحی و الہام سے نوازا ہے اور اپنی پیغمبری کی خدمت میرے سپرد کی ہے جیسے کہ کبھی پہلے ابراہیم و اسماعیل اسحٰق و یعقوب اور پھر موسیٰ و عیسیٰ کو سپرد کی تھی۔

آپ نے قوم کو بتایا کہ وہ خدا میرا اور تمہارا اور ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے، ہر نقص سے پاک اور عظمت و کمال کی ساری صفات کا جامع ہے، صرف وہی عبادت اور پرستش کے لائق ہے میری تمہاری اور سب کی موت و حیات اسی کے قبضہ میں ہے، ہر طرح کے بناؤ بگاڑ اور کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ کسی دوسرے کی یہ شان نہیں ہے، اس کے سوا جن بتوں اور دیویوں دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے اور جن کو حاجت روا سمجھا جاتا ہے اُن کے قبضہ و اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کی عبادت اور اللہ کے سوا کسی مخلوق کی بھی عبادت بہت بڑا گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے، اس لئے صرف ایک خدا کی عبادت کرو جو معبود برحق ہے، اسی سے لو لگاؤ، اس سے بھرپور محبت کرو اور اس سے بہت زیادہ ڈرو! یہ حکم میرے لئے بھی ہے اور تم سب کے لئے بھی!

آپ نے قوم کو یہ بھی بتایا اور ان کے دلوں میں اس کا یقین اتار دینے کی پوری کوشش کی کہ یہ دنیا جس میں ہم رہ بس رہے ہیں ہمیشہ نہیں رہے گی، جس طرح پیدا ہونے والا آدمی اپنی مقررہ زندگی پوری کر کے مر جاتا ہے، اسی طرح یہ پوری دنیا بھی ایک وقت خدا کے حکم سے فنا کر دی جائے گی۔ وہ قیامت کا دن ہوگا، پھر خدا ہی اپنی قدرت سے سب کو دوبارہ زندگی بخشے گا اور ایک دوسرا عالم برپا ہوگا یہ آخرت کا عالم ہوگا جس میں سب کو اپنے کئے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی جنہوں نے دنیا میں خدا کو اور خدا کے احکام کو مان کر پاکبازی اور نیک کرداری کی زندگی گزاری ہوگی، ان پر خدا کی رحمت ہوگی اور ان کو بھرپور لذتوں اور مسرتوں والی زندگی

عطا فرمائی جائے گی، اور اس کے برعکس جنھوں نے اس دنیا میں اپنے خالق و پروردگار کو بھلا کر ا
احکام سے بے پروا اور آخرت کے انجام سے بے فکر ہو کر مجرمانہ زندگی گزاری ہوگی وہ سخت عذاب میں گر

پھر آپ نے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بندوں پر اللہ کے حقوق اور بندوں پر دوسرے
کے حقوق اور اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی بھی قوم کو تعلیم و تلقین کی اور فواحش و منکرات اور
اور بد اخلاقیوں سے منع بھی فرمایا۔ اور اس کے برے انجام سے ڈرایا۔

اسی طرح آپ نے قوم کو خرید و فروخت، تجارت و سوداگری اور مالی لین دین اور محنت
مزدوری وغیرہ کے بارے میں بھی خدا کی ہدایات پہنچائیں اور بتایا کہ ان میں یہ طریقے صحیح
اور یہ غلط و ناجائز ہیں۔

کھانے پینے کے بارے میں بھی آپ نے بتایا کہ یہ چیزیں خدا نے حلال اور یہ حرام قرار
دی ہیں۔ پھر آپ نے ان باتوں کو صرف بتا کے اور بیان کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ یہی آپ کی زندگی کا
ہوگیا، اور ان سچائیوں کی دعوت اور اپنی قوم عرب کی اور پوری انسانی دنیا کی ہدایت کی فکر آپ
اس طرح چھا گئی کہ اس سے الگ کسی چیز سے گویا کوئی دلچسپی نہیں رہی، دن رات اسی کی فکر
جدوجہد میں مشغول رہتے اور اسی کے لئے اپنے خدا سے دعائیں کرتے۔

اس راستہ میں آپ نے سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں، ماریں کھائیں، ذلتیں برداشت
آپ کا اور آپ کے کنبہ کا طویل مدت تک بائی کاٹ کیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں کی بھی ناکہ بند
کی گئی، لیکن آپ نے اپنی دعوت اور جدوجہد میں کوئی کمی نہیں کی، مخالفین سے کسی آویزش
بغیر آپ امکان بھر اپنے کام میں اسی طرح لگے رہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ ا
سے ہدایت اور رحمت کی دعائیں کرتے رہے۔

قوم میں سے جن لوگوں کی روحوں میں نیکی کا جوہر اور حق کو قبول کرنے کی کم و بیش صلاح
موجود تھی، وہ ایک ایک دو دو کر کے آپ کی سچائی سے متاثر ہو کر آپ کی دعوت کو قبول کرتے
اور پھر وہ بھی مکہ کے شرارت پسند عنصر کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے، قریباً دس بارہ سال اسی ا
گزرے، اس کے بعد جب وہاں کے لوگوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ سے باہر نکل
پر مجبور کر دیا اور اس کا کوئی امکان نہیں رہا کہ مکہ میں رہ کر دین حق کی دعوت اور بندگان خدا
کی ہدایت کی خدمت کا سلسلہ جاری رہ سکے تو آپ نے خدا کے حکم سے مکہ سے ہجرت فرمائی ا
مدینہ کو اپنا مستقر اور اپنی دعوت و جدوجہد کا مرکز بنا لیا، یہاں پہنچ کر کام اور زیادہ جذبہ
محنت سے ہونے لگا اور خدا کے فضل سے دعوت قبول کرنے کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد مدینہ میں آپ کے پیرووں اور رفیقوں کی اجتماعیت سے ایک عجیب و غریب قسم کا حکومتی نظم و نسق بھی قائم ہو گیا — اس حکومت کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی پولس نہیں تھی، تھانیدار نہیں تھا، تحصیلدار نہیں تھا، جج نہیں تھا، منصف نہیں تھا، کوئی بھی عہدہ دار نہیں تھا اور سب تھے یعنی حسب ضرورت ان عہدوں کے سارے کام ہوتے تھے اور آپ کی دعوت کو قبول کرنے والے بندگان خدا صرف اللہ کی رضا اور ثواب کے لئے بغیر کسی تنخواہ اور حکومتی منصب و لقب کے یہ ساری خدمات انجام دیتے تھے۔

نئے طرز کی اس حکومت نے جس کے مؤسس اور سربراہ نبی اُمّی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے، دنیا کو عملی طور سے دکھا دیا کہ بغیر فوج اور خزانے کے بھی حکومت ہو سکتی ہے اور مقاصد حکومت بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام پا سکتے ہیں — دشمن طاقتوں سے اس حکومت کی جنگیں بھی ہوئیں جو دنیا کے مختلف پہلوؤں سے جنگوں کا بہترین نمونہ تھیں، اور جن سے بہت کچھ سبق سیکھا جا سکتا ہے۔ مخالف طاقتوں سے معاہدے بھی ہوئے، صلحیں بھی ہوئیں، اس حکومت نے اپنوں پر اور پرایوں پر ٹیکس بھی لگائے اور دنیا کو دکھا دیا کہ ٹیکسوں کے بارے میں اچھی حکومتوں اور ان کے عوام کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد صرف دس سال آپ اس دنیا میں رہے اور اتنی تھوڑی مدت میں قریب قریب پورا ملک عرب آپ کے لئے مسخر ہو گیا اور آبادی کے بہت بڑے حصہ نے آپ کی دعوت و ہدایت کو قبول کر لیا، ہزار ہا ہزار وہ آدمی جو پہلے خدا سے ناآشنا تھے، آخرت اور جزا سزا کے تصور سے جن کا ذہن بالکل خالی تھا اور ساری عمر انتہائی گمراہیوں اور بداخلاقیوں میں گزاری تھی وہ آپ کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت سے ایسے معیاری ہو گئے اور کامل انسان بن گئے کہ طویل انسانی تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے — افراد ہی نہیں بلکہ کامل انسانوں کی ایک پوری قوم پیدا ہو گئی جس کی مثال چشم فلک نے نہ اس سے پہلے دیکھی، نہ اس کے بعد دیکھی۔

یہ سب کچھ صرف دس سال میں — اور مکہ کے ابتدائی دور کو بھی شامل کر لیا جائے تو قریباً قریباً بیس یا تیس سال میں ایسے آدمی کے ذریعہ ہو گیا جس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ الف، با بھی نہیں جانتا تھا، اس کو اچھے مہذب اور دانشمند اور خدا پرست انسانوں کی کبھی صحبت بھی نہیں ملی تھی، اس کی زندگی میں چالیس سال کی عمر تک (جو اندرونی جذبات اور رجحانات کے ظہور کا خاص زمانہ ہوتا ہے) کسی قسم کی ہنگامہ پسندی، تحریکیت اور کسی مہم کی قیادت کے جذبہ کی ادنیٰ جھلک بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی، جو نہ شاعر تھا، نہ خطیب تھا، نہ شاعروں یا مقرروں کی کوئی ٹیم اس کے ساتھ تھی، رسالوں اخباروں اور ریڈیو کا تو وہ زمانہ ہی نہیں تھا — تو سوچنے کی بات ہے کہ اتنا عظیم الشان اور دنیا

کی تاریخ میں عدیم المثال یہ انقلاب اس آدمی کے ذریعہ کیسے ہوگیا ؟

خدا کا وہ بندہ کہتا تھا کہ خود مجھ میں کچھ نہیں ہے میں تو ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں پڑھا لکھا بھی کچھ نہیں ہوں ۔ میں خدا کی ذات و صفات اور توحید وغیرہ کے بارے میں جو بیان کرتا ہوں قیامت و آخرت اور دوزخ و جنت کے بارے میں جو بتاتا ہوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق جو احکام دیتا ہوں اور جو کچھ بھی تعلیم و تلقین کرتا ہوں یہ میرے اپنے فہم و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب میرے اور تمہارے خدا کی طرف سے ہے ، اس نے مجھے تمہاری ہدایت و خدمت کے لئے آلہ اور وسیلہ بنالیا ہے ۔ وہ ایک کلام پڑھ کر سناتا تھا جو اس تعلیم و ہدایت کا سرچشمہ تھا ، اس میں بلا کی تاثیر اور کشش تھی ۔ اگرچہ وہ عربی زبان میں تھا جو پوری قوم کی زبان تھی لیکن وہ بالکل کلام تھا ، خود لانے والے (پیغمبر) کے کلام سے بھی بالکل ممتاز ۔ اس کے دشمن بھی اس سے متاثر ہوتے تھے اور اس لیے اس کو "جادو" کہتے تھے ۔ لیکن وہ کلام سنانے والا کہتا تھا کہ اصل حقیقت ہے کہ یہ کلام میرا نہیں ہے بلکہ خدا کا کلام ہے اس نے مجھ پر نازل فرمایا ہے ، یہ میرے لئے اس کا ہدایت نامہ اور حکم نامہ ہے اور تمہارے لئے اور ساری دنیا کے لئے بھی ۔ یہ کی آخری کتاب قرآن ہے ۔

وہ قرآن آج بھی جوں کا توں محفوظ ہے ۔ اور اس میں غور و فکر کرکے آج بھی ہر سچا ہر طالب یہ یقین حاصل کر سکتا ہے کہ ۔ یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہو سکتا ۔

اس میں صفات الٰہی اور توحید جیسے مضامین کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ معرفت الٰہی کا آخری نقطہ ہے جس تک خدا کی ہدایت و تعلیم کے بغیر کسی ذہین سے ذہین انسان کی بھی نہیں ہو سکتی ، اسی طرح حیات بعد الموت اور اس قسم کے دوسرے مشکل مسائل پر قرآن میں جو کچھ کہا ہے وہ یقیناً انسانی علم و فکر سے بہت آگے کی چیز ہے ۔ پھر انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے میں جو ہدایات دی گئی ہیں جو زمانہ کی بڑی سے بڑی تبدیلیوں کے باوجود انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں ان کے بارے میں ہرگز نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ کسی انسان اور خاص کر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے کسی اُمی اور بالکل ناتعلیم یافتہ انسان کے فہم و فکر کا نتیجہ ہیں ۔

الغرض قرآن خود ہی اس کی دلیل ہے کہ وہ خدا کا کلام اور اس کا نازل کیا ہوا ہدایت نامہ اور اس کے لانے والے اور پیش کرنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں ۔

زمانہ آپ کے اوصاف کیا گنائے گا کسی کمی کا تصور نہیں ، یہ کیا کم ہے

خواجہ

عبدالعزیز عرفان

برار کے مایۂ ناز مؤرخ

سید امجد حسین خطیب اچلپوری

سرزمین برار زمانۂ قدیم سے ہی اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ہر لحاظ سے ہر دور میں اسے اولیت رہی ہے۔ زمانۂ قدیم میں چونکہ برار کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور پھر اچلپور برار کا صدر مقام تھا۔ دہلی اور دکن کی آمد و رفت کے لئے ایک اہم اور درمیانی مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی تعلق کی بنا پر ایلچپور علم و ادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔ سنہ ۱۱۰۰ھ تا سنہ ۱۳۰۰ھ کا زمانہ اردو ادب کا سنہری زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں کئی نامور ہستیوں نے جنم لیا۔ جن میں مرحوم سید امجد حسین خطیب اچلپوری کا نام سرفہرست ہے۔

سید امجد حسین خطیب بمقام اچلپور سنہ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم مبارک ابو الفتح ضیاء الدین محمد عرف سید امجد حسین خطیب اور امجد تخلص۔ خان بہادر کا خطاب سرکار انگریز سے عطا ہوا تھا۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ سنہ ۳۹۲ھ میں جب حضرت عبدالرحمٰن غازیؒ راجہ ایل کو شکست دینے اچلپور تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ بہت سے لوگ بھی شامل تھے۔ ان میں سید عبدالملک مشنی بھی شریک تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے داماد سر تیز ترکمان جب اچلپور تشریف لائے اور جامع مسجد اچلپور کی بنیاد ڈالی تو اس کی خطابت اسی خاندان کو عطا کی گئی۔ جو ابھی تک برابر چلی آرہی ہے۔ شہر اچلپور کے خطیب سید ذوالفقار حسین اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

امراوتی گزیٹیر کے مطابق سے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں محمد شریف الدین کو خطابات و قضارت کا کام سونپا گیا۔ سنہ ۱۱۸۲ھم سنہ ۱۷۶۸ء میں نظام علی خاں حیدرآباد کے [illegible]

قاضی کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۸۸۶ء میں خطیب صاحب کے خسر سید غلام حسین کا انتقال ہوا۔ انھیں کوئی اولاد نہیں تھی صرف ایک داماد سید امجد حسین تھے۔ ۱۸۹۱ء میں آپ کو قاضی شش محل مقرر کیا گیا۔ تب سے آپ خطیب کے ساتھ قاضی کہلائے۔ سید عظمت حسین غزنوی اپنی کتاب 'لوح الھدیٰ' ۱۳۴۵ھ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

مرحوم سید امجد حسین خطیب اپنے علم و فضل سے بہت مشہور تھے۔ وہ اپنے زمانے کے جید عالم تھے عربی اور فارسی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ مرحوم اپنی خود نوشت میں رقم طراز ہیں ؎

"یہ خاکسار ذرۂ بے مقدار سید امجد حسین، جناب مولانا سید محی الدین صاحب مغربی میر عدل برار سے علم صرف و نحو اور منطق، تفسیر و حدیث اور فقہ جتنا کہ تقدیر میں تھا حاصل کیا۔ بعدہٗ مولوی سید عبدالرحمٰن ولایتی سے ہدایہ اور علم اصول فقہ پڑھا۔ غرض کہ شروع عمل انگریزی میں خدمت ناظر محکمۂ میر عدل ضلع برار کا ملازم ہوا۔ بعدہٗ میر مہدی علی خان بہادر منصف اکوٹ نے رخصت لی تو حسب الحکم گیمٹ ٹل صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع برار کا انچارج منصف ہوا۔ منصف نے استعفیٰ دیا تو راقم منصف مستقل ہوا۔ مقدمہ سنگین دیوانی اور فوجداری کے فیصل کر کر پسند طبع ڈپٹی کمشنر صاحب کے ہوا۔ جب برار میں نوشت و خواند مراٹھی جاری ہوئی اور دفتر فارسی کا گاؤ خرد محکمات عدالت کہ دارومدار ان کا نوشت و خواند فارسی پر تھا موقوف ہوا اور راقم بھی خانہ نشین ہوا۔"

آپ کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے لوگ مذہبی مسائل حل کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ بادشاہ وقت بھی موصوف کو قابل احترام سمجھتے تھے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے موصوف منکسر المزاج انسان تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نماز و روزے کے پابند تھے۔ عبادات الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ بعد نماز اشراق دینیات کی تعلیم دیتے تھے۔ مرحوم نے 'مدرسۃ الجامع' نامی عربی مدرسہ قائم کیا تھا۔

مسجد سے متصل لنگر خانہ قائم کیا تھا۔ جہاں محتاج اور مسافروں کو کھانا کھلاتے تھے۔ محتاج اور بے سہارا لوگوں کو حسب ضرورت مدد کرتے تھے۔ لنگر خانے کے قریب ہی ایک کمرہ تھا جس میں بیٹھ کر دوست احباب سے ملاقات کیا کرتے جسے 'دُھالیہ' کہا جاتا ہے۔ مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد دُھالیہ میں تشریف فرما ہوتے۔ حاجت مندوں اور عزیزوں سے ملاقات کرتے تھے۔ ہر خاص و عام موصوف سے فیضیاب ہوتا تھا اور خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس طرح مرحوم سبھی لوگوں سے خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ گویا آپ کی زندگی اس آیت کریمہ کے مصداق ہو ؎

...نمازُ میری قربانی، میری زندگی، میری موت، یہ سب صرف اللہ کے لئے ہے"

یدامجد حسین خطیب نہایت رحم دل، انسان پرور اور انصاف پسند تھے۔ آپ منصف کے
ن فائز رہے ہیں۔ آپ نے ایمانداری اور انصاف پسندی کا ثبوت فراہم کیا۔ کہا جاتا ہے
میں جرمانہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہوتی تو جرمانہ کی رقم خود ادا کر دیتے تھے۔ واقعی مرحوم
یدار، خداترس، ہمدرد، سخی اور سادہ لوح انسان تھے۔ اس طرح آپ کا رہن سہن
ہ تھا۔ آپ کے لباس میں ململ کا کرتہ، ململ کی پگڑی، انگرکھا اور پاجامہ ہوتا تھا۔
پر رومال اور شال کا استعمال کرتے تھے اور پرانی طرز کی جوتی پہنتے تھے۔
یم اردو، فارسی اور عربی جانتے تھے۔ نظم و نثر دونوں پر مہارت رکھتے تھے۔ شاعری
؛ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کا بیان ملتا ہے۔ آپ کا ایک دیوان ہے جو 'دیوان امجد فی مدح احمدؐ'
سے موسوم ہے۔ آپ کی فارسی شاعری کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اشتہ باشد زِ جہاں ترا محبوب — بحق کریا فتد او گنج کامل ایماں را
بحشر امجد احقر معیت خواہ ست
بغیرِ تو چہ کند قصر و حور و غلماں را

یظم کے علاوہ نثری حصہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ آپ نے عالمانہ مضامین
مند کئے ہیں۔ یہ مجموعہ 'شعمۂ ہند' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ
یک بلند پایہ مورخ بھی تھے۔ آپ نے تاریخ برار تصنیف کی۔ جو تاریخ دکن یہ ریاض الرحمٰن
مارتخ امجدی ہے۔ یہ مصنف کی فارسی تصنیف ہے۔ اہلِ برار کے لئے ایک بیش بہا
ہ۔ موصوف کا دلی منشا بھی یہ تھا کہ اہلِ برار کتاب سے مستفید ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ
نے فارسی تصنیف کا اردو میں بھی ترجمہ کیا جسے اہلِ علم نے 'چراغ برار' کہا اور
احب کو آفتاب برار کا خطاب عطا کیا۔
یکار انگریزی نے اس تصنیف پر مرحوم کو انعام سے نوازا۔ یہ انعام دو سو پچاس روپیے
م کے متعلق ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن برار نے خط تحریر کیا تھا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

بنام سید امجد حسین خطیب

بلد مسٹر سانڈرس صاحب بہادر کے دفتر میں پہنچی۔ ضخامت بہت بھاری یعنی ۲۶۷ صفحات
ا لکھی ہوئی بہت صاف مصنف کے ہاتھ سے اور بہت صاف فارسی۔ حقیقت میں ہندوستان
منفعوں کے واسطے نہایت مشہور۔ ہندوستان کی تواریخ [illegible] جس سے کہ ضرورت کے وقت

مولف انجام دیا کرتا ہے ویسا ہی امجد حسین صاحب نے بھی لی اور نہایت ایمانداری سے اور دیانتداری سے تیار کیا ہے۔ وہ چند غلطیوں میں بھی مبتلا ہوئے۔

ریسیڈنٹ صاحب بہادر تاریخ امجدی کے انعام کو معقول سمجھتے ہیں۔ اول درجہ کا انعام ہے جو ۲۲ ر ستمبر ۱۸۹۹ء میں درج کیا گیا ہے یعنی دو سو پچاس روپیے۔ یہ قیمت سید امجد حسین خطیب کے ہاتھ میں دی جائے۔"

'تاریخ امجدی' سر سالار جنگ مختار الملک بہادر کے عہد وزارت میں تصنیف ہوئی۔ جب نواب خورشید جاہ بہادر برار تشریف لائے تو مصنف نے جناب نواب صاحب بہادر سے کتاب کی طباعت کی درخواست کی۔ جسے نواب صاحب نے قبول فرمایا۔ آپ کے نام سے بنام "تاریخ دکن بلقب ریاض الرحمٰن المعروف بتاریخ امجدیہ ایلچپور کے مطبع خورشیدیہ میں ۱۲۸۷ھ میں طبع ہوئی۔

تاریخ امجدیہ گیارہ ابواب اور ایک خاتمہ (مشتمل بر سہ فصل) کا مجموعہ ہے بعنوان تاریخ امجدی کے باب چہارم در بیان سلطنت شاہان بہمنیہ کا فارسی سے اردو نظم میں ترجمہ کیا گیا۔ جس کا ترجمہ برار کے ایک شاعر سہیل نے کیا تھا جسے انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب تاریخ منظوم سلاطین دہلی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

چونکہ تاریخ آئینہ ماضی اور درس حال ہوتی ہے اسی غرض و غایت کی بنا پر امجد حسین خطیب مرحوم نے احوال خطۂ برار لکھا۔ جس میں برار کی وجہ تسمیہ کے ساتھ برار میں مسلمانوں کی آمد، مسلم سلاطین کا برار پر قبضہ، ان کا عہد بعہد حالات و واقعات۔ جنگی امور۔ فتوحات و شکست عروج و زوال۔ برار کے قدیم شہروں مثلاً ایلچپور۔ بالاپور۔ جلگاؤں۔ جاموڈ۔ ماہور۔ ملکہ پور ـــــ قدیم قلعہ جات میں قلعہ نرنالہ اور قلعہ گاول گڑھ کا ذکر تعمیرات و واقعات اور سلاطین مسلم پر عہد بعہد روشنی دکھائی دیتی ہے۔

آخرکار سرزمین برار کا درخشندہ ستارہ اپنا عظیم یادگاریں چھوڑ ۲۷ ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو سدا کے لیے غروب ہو گیا۔ آپ کی خواہش کے مطابق حضرت شاہ عبدالرحمٰن غازی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف میں نوبت والا کے مقابل دفن کیا گیا۔

مختصر یہ کہ سید امجد حسین خطیب اچلپوری ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عالم دین۔ ایک سچے ہمدرد، مخلص، ایک تذکرہ نگار، ایک بلند پایہ مورخ بھی تھے۔ تاریخ امجدی ان کا لافانی شاہکار ہے اور اہل برار کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ آپ کی اس تصنیف نے مرحوم کا نام زندہ جاوید کر دیا ہے۔

◆◆◆ ◆◆◆

شریمتی راجیندر کماری باجپئی

اقتصادی ترقی کے پروگرام میں اقلیتوں کو مناسب حصے کی فراہمی

اقلیتی طبقوں کی تیز اقتصادی و سماجی ترقی ملک کے سماجی نظام کی مضبوطی کی کلید ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر متعدد رضاکار تنظیموں، تعلیمی اداروں اور عوام کا سرگرم تعاون اور اشتراک حاصل ہو تو تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی طبقوں کو ترقیاتی اسکیموں سے آگاہ کرنے اور ان طبقوں کو ترقیاتی پروگراموں میں مناسب حصہ دلانے کے لئے کئے گئے مختلف انتظامی اقدامات کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح اقلیتیں یقینی طور پر ملک کی ترقی کے عظیم کام میں پورا پورا حصہ لے سکیں گی۔

15 نکاتی پروگرام

سورگیہ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے 1983ء میں اقلیتوں کی فلاح کے لئے ایک 15 نکاتی پروگرام شروع کیا تھا جو قومی یکجہتی کونسل میں غور و خوض اور ممبران پارلیمنٹ نیز اقلیتی گروپوں کے نمائندوں سے موصول شدہ تجاویز کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے کے لئے تعلیم، ملازمتوں میں بھرتی، اقتصادی مواقع اور اقلیتوں کی شکایتوں کے ازالے سے متعلق اقدامات شامل ہیں۔

اس پروگرام پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لئے مرکزی سرکار میں ایک خصوصی اقلیتی دفتر قائم کیا گیا ہے۔ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرنے کے لئے تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی سرکاروں نے اقلیتوں کی فلاح کے لئے افسر مقرر کئے۔ اکثر ریاستوں

مرکزی وزیر فلاح و بہبود

اور مرکزی علاقوں میں اقلیتوں کی شکایات کے ازالہ کے لئے اقلیتوں کے دفاتر بھی قائم کئے گئے اس پروگرام کا ایک نکتہ یہ ہے کہ متعدد ترقیاتی پروگراموں پر عملدرآمد کرتے ہوئے جن میں 20 نکاتی پروگرام بھی شامل ہے یہ خیال رکھا جائے کہ ان پروگراموں سے ملنے والے فوائد اقلیتوں کو مناسب مقدار میں ملیں اور عملدرآمد کی نگراں کمیٹیوں میں ان فرقوں کے ارکان کا سرگرم تعاون رہے۔

وزیر اعظم کی طرف سے پروگرام پر عمل کی تلقین

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اگست 1985ء میں ریاستوں کے وزراء اعلیٰ کے نام ایک مراسلے میں 15 نکاتی پروگرام پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگرچہ بیشتر علاقوں میں پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے تاہم اس پر عملدرآمد ہر جگہ یکساں نہیں ہے اور اس میں کئی بڑی خامیاں بھی پائی گئیں۔ چنانچہ انھوں نے تجویز کیا تھا کہ پروگرام پر عملدرآمد کا جائزہ ریاست کے وزیر اعلیٰ کی سطح پر کیا جائے۔ اس سے اقلیتوں میں ضروری اعتماد بھی پیدا ہوگا۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم کے مراسلے میں فرقہ وارانہ امن کو برقرار رکھنے اور اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت کی بھرپور کوششوں پر زور دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہمیں امن و قانون کو برقرار رکھنے سے آگے بھی قدم اٹھانا ہیں کیونکہ اقلیتوں کی سماجی و اقتصادی ترقی ملک کے سماجی نظام کی مضبوطی کی کلید ہے اور 15 نکاتی پروگرام میں جو اقتصادی اقدامات شامل کئے گئے ہیں انھیں اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیئے۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ملک کے ترقیاتی پروگراموں کا خاطر خواہ فائدہ اقلیتوں کو حاصل ہورہا ہے یا نہیں ریاستی سرکاروں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسے تحقیقی ادارے قائم کریں جو یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اتر پردیش، بہار، آسام، تامل ناڈو اور مہاراشٹر نے اس قسم کے تحقیقی ادارے قائم کردئے ہیں۔ کرناٹک اور راجستھان نے اقلیتوں تک ان فوائد کے پہنچنے کی جانچ کے لئے پانچ سالہ منصوبے کی کارکردگی کے جائزے کے موجودہ عملے سے ہی کام لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اقلیتوں کے لئے مالیاتی کارپوریشنیں اور فلاحی بورڈ

اقلیتوں کی اقتصادی ترقی کے عمل میں مدد دینے کے لئے اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اقلیتوں کے لئے مالیاتی کارپوریشنیں قائم کی گئی ہیں۔ گجرات میں اقلیتوں کی فلاح کا ایک بورڈ اور آسام میں اقلیتوں کی ترقی کا ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

ترقیاتی پروگراموں سے آگاہی کے لئے خاص معلوماتی سلسلے

15 نکاتی پروگرام کے مطابق مرکزی حکومت نے ریاستی سرکاروں سے کہا تھا کہ وہ اس امر کا یقینی اہتمام کریں کہ اقلیتوں کو ترقیاتی پروگراموں میں مناسب حصہ ملے۔ چنانچہ ریاستی سرکاروں نے اس ضمن میں اپنے کارکن عملے کو مناسب ہدایات جاری کی ہیں۔ تاہم تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کو ترقی کے یہ فائدے مناسب سطح پر پہنچانے میں ایک اہم دقت یہ پیش آرہی ہے کہ انہیں ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں کافی علم نہیں تھا۔ یہ مشکل دور کرنے کے لئے فلاح کی مرکزی وزارت نے ریاستی سرکاروں کو لکھا کہ وہ اقلیتی گروہوں کے لئے ایسے خاص معلوماتی سلسلوں کا اہتمام کریں جہاں انہیں ترقیاتی پروگراموں اور خاص طور پر تعلیم، خواتین کی فلاح، بچوں کی بہبود، صحت نیز بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں کی طرف سے دی جانے والی مالی امداد کی اسکیموں کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ یہ سلسلے اتر پردیش کے کچھ ضلعوں میں شروع کئے گئے اور مفید پائے گئے ہیں۔ دوسری ریاستوں کی جانب سے بھی ایسی کارروائی مفید ہوگی۔

فلاح کی مرکزی وزارت نے الیکٹرانکس، (کمپیوٹر) شماریات، غیر روایتی ذرائع توانائی، ماحولیات کے تحفظ، سمندری وسیلوں کی ترقی اور خلائی تحقیق کے محکموں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے محکموں میں ٹکنالوجی کی تازہ ترین تبدیلیوں کے بارے میں اقلیتی طبقوں کو آگاہ کریں۔ اس مقصد کے لئے معلوماتی نصاب کا اہتمام کیا جائے یا پمفلٹوں وغیرہ کی تقسیم سے تشہیر کی جائے۔ ایسے نصابات سے پسماندہ اقلیتی طبقوں میں واقفیت کی سطح بلند کرنے اور جدید ٹکنالوجی کے شعبوں سے ان کا لگاؤ بڑھانے میں مدد ملے گی۔

روزگار دلانے والے دفتروں میں امتیاز کو روکنے کا اہتمام

ماضی میں روزگار دلانے والے دفتروں کے خلاف ناموں کے اندراج اور بھرتی کرنے والے اداروں کو ناموں کی فہرستیں بھیجنے میں امتیاز برتنے کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ وزارت فلاح کی درخواست پر ڈائرکٹر جنرل روزگار وتربیت نئی دہلی نے ریاستوں اور مرکزی علاقوں کی سرکاروں کو متعدد ہدایات جاری کی ہیں کہ اس کا یقینی اہتمام کیا جائے کہ روزگار دلانے والے دفاتر اقلیتی فرقوں کے امیدواروں کے خلاف کوئی امتیاز نہ کریں۔ ان ہدایتوں پر عملدرآمد کے بارے میں ریاستی سرکاروں سے مزید بات چیت کی گئی ہے۔ چونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض اقلیتی فرقوں کے امیدواروں کا روزگار کے دفاتر میں اندراج کافی تعداد میں نہیں ہے اس لئے ان فرقوں کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ آگے آئیں اور کسی امتیاز کے امکان کے خدشے کو دور رکھتے ہوئے کافی تعداد

میں اپنے نام درج کرائیں۔

یہ مفید ہوگا کہ اقلیتی آبادی والے علاقوں میں اور اقلیتوں کے زیر اہتمام لڑکیوں کے اسکولوں میں ایسے معلوماتی نصابات کا اہتمام کیا جائے جن میں خواتین اور بچوں کی فلاحی اسکیموں کے بارے میں واقفیت مہیا کی جائے نیز اقلیتی طبقوں کی خواتین کے فلاحی کاموں میں ریاستی وقف بورڈوں کو شامل کیا جائے۔ محکمۂ خوراک نے اقلیتی آبادی والے علاقوں اور اقلیتی انتظام کے لڑکیوں کے اداروں میں غذاؤں کو ملحوظ رکھنے، صحت و صفائی نیز غذائیت کے بارے میں معلوماتی نصاب شروع کرنا منظور کر لیا ہے۔ اقلیتوں کی زیادہ آبادی والے علاقوں میں تعمیر مکانات کی ترقیاتی اسکیموں اور لوگوں کے اشتراک سے صحت اسکیموں کے بارے میں واقفیت مہیا کرنے کے سلسلے بھی مفید ہوں گے۔

امداد باہمی کی تعلیم و تربیت

اقلیتی فرقوں کو امداد باہمی کی تحریک سے آگاہ کرنے، ان کو ایسی امداد باہمی انجمنیں بنانے میں مدد دینے اور خاص طور پر اقلیتی طبقے کے دستکاروں کی امداد باہمی انجمنیں بنانے کے عمل میں حوصلہ افزائی کرنے کے لئے امداد باہمی کے محکمے نے اقلیتوں کے تعلیمی اداروں اور اقلیتی آبادی کی کثرت والے علاقوں میں تربیتی پروگراموں کا اہتمام کرنا منظور کر لیا ہے

کاریگروں کو ہاتھ کرگھوں اور دستکاریوں کی تربیت

متعلقہ ریاستی اور مرکزی احکام کی جانب سے اقلیتی آبادی والے علاقوں میں ہاتھ کرگھوں اور دستکاریوں کی ترقی کے بارے میں ایسے معلوماتی نصابوں کا اہتمام بھی مفید ہوگا۔

بینک کے قرضوں کی تقسیم میں مناسب حصہ

وزارت فلاح کی درخواست پر بینکنگ کے محکمے نے تمام قومی ملکیت کے بینکوں کو ہدایت جاری کی ہے کہ وہ اقلیتوں کے لئے مناسب طور پر قرضوں کی بہم رسانی کے یقینی انتظامات کریں۔ ان سب بینکوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے صدر دفاتر میں اقلیتی دفتر قائم کریں جو ان ہدایات پر موثر ڈھنگ سے عملدرآمد کا جائزہ لیتے رہیں۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ بینکرز کمیٹیوں کے ریاستی سطح کے جلسوں نیز بینکنگ کے متعلق ضلعی مشاورتی کمیٹیوں کے جلسوں میں زیر بحث آنے والے امور میں مذکورہ بالا مد بھی شامل کی جائے۔

شری گردھر گومانگو

اقلیتوں کی تعلیمی پسماندگی کی بیخ کنی

سورگیہ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے مئی 1983 میں اقلیتوں کی فلاح کے لئے جو پندرہ نکاتی
رام جاری کیا تھا اس میں فرقہ وارانہ فساد سے نمٹنے، ملازمتوں میں بھرتی، اقتصادی ترقی کے
اقع مہیا کرنے، ان کی شکایات کا ازالہ کرنے کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے
قدامات اور تجاویز بھی شامل ہیں۔ ان اقدامات پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لئے وزارت داخلہ میں
خصوصی اقلیتی دفتر قائم کیا گیا جو اب وزارت فلاح میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تمام ریاستوں اور
یا زیر انتظام علاقوں میں اس پروگرام پر عملدرآمد میں تال میل پیدا کرنے کے لئے مقامی افسر
دکئے گئے ہیں اور بیشتر ریاستوں اور مرکزی زیر انتظام علاقوں میں اقلیتوں کی شکایات کے فوری
کے لئے اقلیتی دفتر قائم کئے گئے ہیں۔

وزیراعظم نے اگست 1983 میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کے نام ایک مراسلہ میں
۱۵ نکات کا اعادہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ اکثر ریاستوں اور علاقوں میں اس پروگرام
میں لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن پیش رفت یکساں نہیں ہے اور بعض بڑی خامیاں موجود ہیں۔
رام پر حکومت کے مکمل یقین کا ذکر کرتے ہوئے وزیراعظم نے تجویز کیا تھا کہ پروگرام پر عمل کی
رفت کا جائزہ لینے کا عمل وزرائے اعلیٰ کی سطح پر کیا جائے جس سے اقلیتوں میں اعتماد پیدا ہو سکے

تعلیمی ترقی کے اقدامات

اقلیتی دفتر کی درخواست پر تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل
([illegible]) نے اقلیتوں کے تعلیمی اداروں میں اساتذہ کو
ئنس، ریاضی، انگریزی، اور تلاش معاش میں رہنمائی کی تربیت نیز سری نگر، علی گڑھ، نئی دلی
یدرآباد اور اورنگ آباد کی یونیورسٹیوں میں ایسے ہی تربیتی پروگراموں کے لئے پانچ وسائلی مرکز قائم
نام کی ایک اسکیم شروع کی [illegible]۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ملک کی چند منتخب

نائب وزیر مرکزی وزارت فلاح و بہبود

یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اقلیتوں کے کمزور طلبار کے لئے الگ سے تعلیم (کوچنگ) کی اسکیم بھی شروع کی ہے۔

یونیورسٹیاں گوہاٹی، پٹنہ، دربھنگہ، سورت، ناگپور، لکھنؤ، آگرہ، میرٹھ، الہ آباد، گورکھپور، حیدرآباد، جموں، سرینگر، کالی کٹ، بھوپال، اندور، دلی، علی گڑھ اور روہتک۔

مندرجہ ذیل شہروں میں ڈگری کالج لکھنؤ، گونڈہ، فیض آباد، شاہجہاں پور، بھوپال، جوناگڈھ، تنجور، وائی ناڈ، کالی کٹ، کاسرکوڈ، ملاپورم، پال گھاٹ اور تریچور۔ یہ اسکیم ابھی تک زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ ایک سب کمیٹی اسکیم کی خامیاں دور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ محکمۂ تعلیم نے مندرجہ ذیل علاقات پر واقع پولی ٹیکنیکوں میں توسیعی مرکز قائم کئے ہیں: مرادآباد، علی گڈھ، اجمیر، لکھنؤ، رانچی، نئی دلی، گوا، بھوپال اور کیلاکرائے

وزارت محنت نے اقلیتی آبادی والے علاقوں میں صنعتی تربیت کے 12 چیدہ اداروں (ITIs) میں ان علاقوں میں رہنے والی اقلیتوں سے متعلقہ حرفتوں کے قیام و توسیع کی ایک اسکیم شروع کی ہے

1986ء کی قومی تعلیمی پالیسی 1986ء کی نئی قومی پالیسی میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کی تعلیم کے متعلق یہ کہا گیا ہے: "کچھ اقلیتی طبقے تعلیم سے محروم ہیں یا تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں۔ مساوات اور سماجی انصاف کے مفاد میں ان طبقوں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی جائے گی۔ اس میں قدرتی طور پر وہ آئینی ضمانتیں شامل ہوں گی جو انھیں اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے اور اپنی زبانوں اور تہذیب کے تحفظ کے لئے دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ نصابی کتابوں کی تیاری اور تمام اسکولی سرگرمیوں میں واقعیت پسندی سے کام لیا جائے گا نیز ایک بنیادی نصاب کے مطابق مشترک قومی آدرشوں پر مبنی قومی یک جہتی کے فروغ کے لئے ممکن قدم اٹھائے جائیں گے۔"

وزارت تعلیم نے 1986ء کی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت جو لائحہ عمل مرتب کیا ہے اس میں اقلیتی فرقوں کی پسماندگی کے مسائل سے موثر طور پر نمٹنے کے لئے مندرجہ ذیل مزید اقدامات کا اہتمام کیا گیا ہے

چھوٹے بچوں کے اور روایتی اسکولوں کی تعلیم پروگرام کے تحت ایک مرکزی اسکیم کے ذریعہ روایتی طور کے اسکولوں میں رضاکارانہ بنیاد پر سائنس، ریاضی، انگریزی اور سماجی افادیت کے

یداواری کاموں کی تعلیم دینے کی کوشش کی جائے گی ۔ ان اسکولوں میں اور ایسے علاقوں میں جہاں
لیمی طور پر پسماندہ اقلیتی فرقے کی آبادی اکثریت میں ہوگی ممکنہ حد تک چھوٹے بچوں کے لئے تعلیمی مرکز قائم کئے جائیں گے

پرائمری تعلیم

ریاستی سرکاریں لسانی اقلیتوں کے اساتذہ کی اسامیوں کی منظوری اور اساتذہ کی تقرری میں تاخیر کو ختم کرنے کے لئے کارروائی کریں گی۔
وگرام میں یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ریاستی سرکاریں اقلیتی زبانوں میں کتابوں کی دستیابی، اقلیتی
وں کے اساتذہ کے لئے تربیتی سہولیات کا جائزہ لینے ، اقلیتی زبانوں میں چھپائی کی سہولیات
ہیا کرنے اور جہاں ضروری ہو، اساتذہ کی تربیت میں اضافہ کرنے کے لئے قدم اٹھائیں۔ تعلیم کے
قت کا 15 فیصد حصہ مقامی دستکاریوں میں اور ہنروں کی تربیت دینے میں صرف کرنے نیز
یگروں و کھیت مزدوروں کے بچوں کے لئے شام کے وقت کلاسیں لگانے کی کوشش کی جائے گی ۔

ل اور ہائر سکنڈری تعلیم

پروگرام میں انتظام کیا گیا ہے کہ ریاستی سرکاریں تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسلوں کے ذریعہ اقلیتی
داروں کے اساتذہ کے لئے سائنس ، ریاضی ، سماجی علوم ، انگریزی ، تلاش معاش کی
ہنمائی میں تربیتی اسکیمیں شروع کریں ۔ ریاستی سرکاریں یہ انتظام بھی کریں گی کہ ان تعلیمی اداروں کو
موثر کی تعلیم دینے کی اسکیم میں مناسب نمائندگی ملے ۔

پیشہ ورانہ اور ٹکنکل تعلیم

اقلیتی فرقوں کے دستکاروں کی آبادی والے علاقوں میں دستکاری کے مرکز قائم کرنے کے لئے
روائی کی جائے گی ۔ ان مرکزوں میں 80 فی صد نشستیں ان علاقوں میں رہنے والے کاریگروں کے
یوں کے لئے مخصوص ہوں گی ۔ ایسے علاقوں کے ہائر سکنڈری اسکولوں میں تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی
بادی کی ضروریات کے مطابق پیشہ ورانہ نصاب مہیا کرنے پر بھی غور کیا جائے گا ۔ اس کے علاوہ یہ
شش کی جائے گی کہ تمام ٹکنکل اور پیشہ ورانہ پروگراموں کا پورا پورا فائدہ اقلیتوں کے چلائے
نے والے اداروں کو حاصل ہو ۔

خواتین کی تعلیم

چونکہ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں میں خواتین کی خواندگی اور اسکولوں میں ان کا داخلہ بہت کم ہے اس لئے پروگرام
ں کہا گیا ہے کہ لڑکیوں کے اسکول کھولنے ، استانیوں کی تقرری ، لڑکیوں کے ہوسٹل قائم کرنے اور
وپہر کے کھانے ، وردیوں وغیرہ کی فراہمی کی اسکیموں میں اقلیتوں کی تمام ضروریات پوری کی جائیں

بالغوں اور چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے رضاکارانہ کوششیں

پروگرام میں انتظام کیا گیا ہے کہ ریاستی سرکاریں اقلیتی طبقوں کے لئے صحیح اور مناسب حال نصابات کا اہتمام کریں تاکہ وہ ان اسکیموں سے آگاہ ہوں اور ان اسکیموں کو لاگو کرنے کے لئے رضاکارانہ کوششوں کو بڑھاوا مل سکے۔

لائبریریاں، مطالعہ گاہیں اور توسیعی کام پروگرام میں کہا گیا ہے کہ ریاستی سرکاریں اقلیتی علاقوں میں لائبریریاں اور مطالعہ گاہیں قائم کرنے کی اسکیمیں شروع کریں اور تجربہ کے طور پر کچھ بلاکوں میں تعلیمی توسیعی کام شروع کریں نیز ان کے تعلیمی اداروں کی منظوری اور ان کی درخواستوں کو وقت پر نپٹانے کے لئے واضح ہدایات تیار کریں۔

وظائف کی اسکیمیں پروگرام میں کہا گیا ہے کہ ریاستی سرکاریں اقلیتی اور معاشی طور پر کمزور طبقوں کے لئے "لیاقت مع وسائل کی بنا پر وظیفے دینے کی اسکیم شروع کریں اور ان بچوں کو اچھے اداروں میں لگانے کا انتظام بھی ہو۔ اسی طرح ان کمزور طبقوں کے بچوں کے لئے فیس کی چھوٹ اور امداد باہمی اور معاوضے کی اسکیمیں شروع کرنے پر بھی غور کیا جائے گا۔

تنظیمی مسئلے پروگرام میں کہا گیا ہے کہ ریاستی سرکاریں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اقلیتی آبادی کے علاقوں میں خواندگی اور تعلیم کے حصول میں اضافہ کا جائزہ لیں اور تحقیقی مطالعے بھی کریں۔ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی طبقوں کو مرکزی اور ریاستی سطح پر مختلف تعلیمی بورڈوں اور مشاورتی کمیٹیوں سے وابستہ کیا جائے گا۔

پروگرام میں کہا گیا ہے کہ مرکز اور ریاستوں کے تعلیم کے محکموں میں اقلیتی شعبے قائم کئے جائیں جو اقلیتوں کی تعلیم کے تمام پروگراموں کا ہر سال جائزہ لیں۔

تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی گروہوں، اقلیتوں کی تعلیمی سوسائٹیوں اور تعلیمی اداروں نیز افراد کا کردار:

تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کئے گئے لائحہ عمل پر ٹھیک ڈھنگ سے عملدرآمد کے لئے ان اقلیتی گروہوں، ان کی تعلیمی انجمنوں، تعلیمی اداروں اور افراد کا سرگرم اشتراک عمل درج ذیل امور کے لئے ضروری ہوگا:

۱. اساتذہ کی تربیت کے لئے تعلیمی تحقیق و تربیت کی کونسل (NCERT) کی اسکیم۔
2. اجتماعی پولی ٹکنک توسیعی مرکز 3. تعلیم بالغان اور ابتدائی بچپن کی تعلیم
4. پرائمری تعلیم 5. مڈل اور ہائر سکنڈری تعلیم 6. پیشہ ورانہ اور ٹکنکل تعلیم

باقی بر صفحہ ۳۴

ہمارے دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم ہونی چاہیے

وائس چانسلر سید ہاشم علی کا بیان

خدا بخش لائبریری جرنل کے تازہ شمارہ "علی گڑھ تحریک نمبر" میں شائع شدہ ایک اہم انٹرویو میں علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے سائنس کی تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آج دینی مدارس میں بھی سائنس کی تعلیم کی اہم ضرورت ہے ہاشم علی صاحب کے بیان کا متن درج ذیل ہے:

"ہمارے تعلیمی مسائل میں عربی مدارس کی اصلاح کا مسئلہ اہم ہے۔ اور معاشرتی مسائل میں عورتوں کے قرآنی حقوق کی بازیافت کا مسئلہ۔ مدارس کو یہ بات تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ سائنس کی تعلیم بھی دیں گے۔ سائنس پڑھائے جانے کے لئے، جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم تھا، ہر مضمون کے اعتبار سے سائنس کی اچھی کتابیں موجود تھیں۔ اب NCERT کی کتابیں مختلف مضامین کی زبانوں میں قومی سطح پر پورے ہندوستان کے طلبا کے لئے چھپ رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتابیں کافی ہیں۔ سب سے پہلے یہی سوال اٹھتا ہے کہ مدارس فیصلہ کریں کہ کیا ان کے لئے سائنس ضروری ہے، اور وہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسے اسکول ہیں جنہوں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ میرے پیشرو نے اس سلسلے میں کچھ کوشش کی تھی اور میں بھی کروں گا۔ میں نے ایسے بہت سے مسلم اداروں کو چار پانچ سو خط لکھے ہیں۔ ان میں جنوبی ہند سے بڑا اچھا جواب آیا ہے، اور شمالی ہند سے کم۔ تو یہ ایک کوشش ہو گی جو سرسید کے وقت سے جاری ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ کیونکہ توہم پرستی ہمیشہ ہر وقت میں اور ہر مذہب میں رہی ہے۔ اس کا خاتمہ سب کا فرض ہے۔"

*

خدا ایسے بندے سے کیوں پھر نہ جائے جو بیٹھا ہوا مانگنا جانتا ہے

قاضی جلیل احمد

گاندھی بنام نہرو

ذیل میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے خطوط سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن
ے اہنسا، سچائی، سادگی، معیشت اور تمدن کے بارے میں ہندوستان کے ان دو بڑے قائدین
ے نقاط نظر پر روشنی پڑتی ہے ۔

۵؍اکتوبر ۴۵ء : ہمارے نقاط نظر میں جو اختلاف ہے ان کا اخفا میں سمجھتا ہوں نہ صرف ہماری
جدوجہد کی راہ میں مخل ہوگا بلکہ مفاد عامہ کے بھی خلاف ہوگا۔ اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ آج کھل کر
ات چیت کرلی جائے تاکہ عوام کو ہمارے نظریات کا پتہ چل سکے ۔ میں نے اپنی کتاب ہند سوراج
ں جو چالیس برس پہلے لکھی گئی تھی سسٹم آف گورنمنٹ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان پر
ج بھی قائم ہوں کیونکہ اس عرصے میں جو واقعات پیش آئے اور جن تجربات سے گزرنا پڑا وہ ان
لات کو درست ثابت کرتے ہیں اور گو بوقت تحریر وہ کتاب میرے سامنے موجود نہیں ہے اور نہ مجھ
س کی ضرورت ہے کیوں کہ اس وقت بحث یہ نہیں ہے کہ اس وقت جو کچھ میں نے کہا تھا درست تھا یا
نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اب میرے خیالات کیا ہیں ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان کو سچی آزادی حاصل کرنی ہے اور ہندوستان کے ذریعے دنیا کو
سچائی کا سبق حاصل کرنا ہے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہندوستان کے لوگ شہروں کی جگہ گاؤں کی
زندگی اور محلوں کی جگہ جھونپڑیوں کی رہائش اختیار کرلیں۔ کیوں کہ شہروں اور محلوں میں لوگ کبھی بھی امن اور
شانتی سے نہیں رہ سکیں گے اور انھیں جھوٹ اور تشدد کا سہارا لینا ہی پڑے گا، جب کہ دنیا کی نجات صرف
اہنسا اور سچائی میں ہے ۔ اور اہنسا اور سچائی کا راستہ صرف گاؤں کی سادہ زندگی ہی ہے جو صرف
چرخے کے مارگ پر چل کر حاصل کی جا سکتی ہے ۔

نہرو :- مختصر الفاظ میں میں یہ کہوں گا کہ ہمارے سامنے اس وقت مسئلہ جھوٹ اور سچ اور
اہنسا اور تشدد کا نہیں ہے ۔ اور یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ دیہات اور دیہاتی زندگی کیوں کر

لندن

اہنسا اور صداقت کا مظہر بن گئی۔ عام طور پر تو دیہات کی [redacted] حیثیت سے یعنی زندگی علامت ہوتے ہیں جس میں کسی ذہنی ترقی کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جھوٹ اور تشدد، تنگ خیالی لوگوں میں زیادہ پایا جاتا ہے جن کی گاؤں میں بہتات ہوتی ہے۔

گاندھی جی :۔ لیکن میں جس دیہات کا تصور کرتا ہوں وہ وہ نہیں جو تم کہہ رہے ہو۔ میرے آئیڈیل دیہات کا تصور یہ ہے کہ وہاں کے لوگ ذہین اور سمجھ دار ہوں گے۔ وہ غلاظت اور گندگی میں جانوروں کی سی زندگی نہیں بسر کریں گے۔ وہاں مرد اور عورت دونوں اپنے سر کو بلند رکھ کر آزاد فضا میں زندگی بسر کریں گے اور دنیا میں کسی کے آگے دب کر نہیں رہیں گے۔ وہاں نہ ہیضہ ہوگا اور نہ پلیگ اور نہ دوسری وبائی بیماریاں ہوں گی۔ کوئی بیکار نہیں ہوگا اور نہ کوئی عیش وعشرت میں مبتلا۔ ہر شخص اپنا مفوضہ جسمانی کام انجام دے گا۔ ریل، ڈاک تار ضرور ہوں گے لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ اس نظام حیات کے ایک معاون کی حیثیت سے۔

نہرو :۔ لیکن آپ کے آئیڈیل کے دیہات کے لئے یہ بھی تو ضروری ہوگا کہ لوگوں کی ضروریات زندگی مثلاً غذا، کپڑا، مکان، تعلیم، صفائی وغیرہ کی چیزیں ضروری مقدار میں پیدا کی جائیں اور ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ یہ چیزیں وافر مقدار میں ہم کیوں کر تیار کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ زمانہ حال کے ترقی یافتہ ذرائع حمل ونقل اور رسل وترسیل سے نہ صرف کام لینا بلکہ انہیں ترقی بھی دینا ہوگا جس کے لئے بھاری انڈسٹری کی ترقی لازمی ہوگی۔ ایک بالکلیہ دیہاتی معیشت رکھنے والے ملک میں بھاری انڈسٹری کے امکانات کیا ہیں ان کے متعلق ہر شخص اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔ مجھے تو یہ دو چیزیں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہماری انڈسٹری کو چند مرکزوں میں محدود ہونا نہیں چاہئے بلکہ اسے سارے ملک میں پھیلایا جانا چاہئے۔

گاندھی جی :۔ میں فی نفسہ انڈسٹری کا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو قناعت پسند ہونا چاہئے اور ہر ایسی چیز کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہئے جس کی اس کو ضرورت نہ ہو اور اس طرح سے اپنے آپ کو خود کفیل بنانا چاہئے۔ اگر انسان کو اپنے آپ پر یہ قدرت حاصل نہیں ہوئی تو وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکے گا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ دنیا غلط راستے پر جا رہی ہے اور چرخے کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے۔ آج کے حالات میں بڑی مشینیں دولت اور طاقت کو چند ہاتھوں میں مرکوز کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ ایک طرف دولت کے انبار دوسری طرف افلاس اور غربت کی بہتات اور اس غرض کے لئے مشینوں کا استعمال میرے نزدیک گناہ ہے۔ ہماری معاشی ترقی کی بنیاد ریت پر کھڑی ہوگی اگر اسے معاشی مساوات پر

استوار نہیں کیا جائے گا ۔

نہرو :۔ لیکن عملی دنیا میں ہم اپنے گرد و پیش سے صرف نظر نہیں کر سکتے ۔ آزاد ہندوستان کو بیرونی جارحیت کے مقابلے اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے تیار رہنا ہوگا ۔ یہ جارحیت صرف فوجی ہی نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان اپنی آزادی کا تحفظ کر سکتا ہے جب تک وہ معاشی اور صنعتی اعتبار سے ایک طاقتور ملک نہ ہو ۔ موجودہ زمانے میں تہذیبی ارتقا بھی سائنسی ماحول کے بغیر ممکن نہیں ۔

جہاں تک آپ کی کتاب ہند سوراج کا تعلق ہے مجھے یہ کتاب اس وقت بھی عجیب اور غیر حقیقی لگی جب آج سے بیس برس پہلے میں نے اسے پڑھا تھا ۔ لیکن اس کے بعد کے زمانے میں آپ کی تحریروں اور تقریروں سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آپ کے خیالات میں کافی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور اسی لئے مجھے آپ کے اس بیان پر سخت تعجب ہوا کہ آپ کے خیالات آج بھی وہی ہیں جو اپنی کتاب ہند سوراج میں آپ نے ظاہر کئے تھے ۔ لیکن ہند سوراج کی اشاعت کے بعد کے اڑتیس سالوں میں دنیا کافی بدل چکی ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلی غلط سمتوں کی طرف جا رہی ہو لیکن آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے کسی خیالی دنیا کو نہیں بلکہ حقیقی دنیا اور حالات حاضرہ کو مد نظر رکھنا ہوگا ۔ جس میں بڑی مشینوں کو چرخوں پر فوقیت حاصل ہے ۔

موت نے گاندھی جی کو مہلت نہیں دی کہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کر سکتے ، لیکن اگر ایسا ہو سکتا تو یہ بالکل ممکن تھا کہ چین کی طرح ہندوستان میں بھی کوئی کلچرل ریولیوشن برپا ہوتا ۔ جس میں سادگی ، سچائی اور اہنسا کی قدروں کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی جاتی ۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

(✿)

زندگی کو زخم کی لذت سے مت محروم کر راستے کے پتھروں سے خیریت معلوم کر
ٹوٹ کر بکھری ہوئی تلوار کے ٹکڑے سمیٹ اور اپنے ہار جانے کا سبب معلوم کر

راحت اندوری

بہائیت

یورپ میں سامراجیت کی پیدائش ہی مذہب دشمنی ایک اہم عنصر رہا ہے، سامراجیت کو نہ صرف
نوں سے ہی سابقہ تھا اور وہ اپنی عالمگیر سامراجی منصوبوں پر اس وقت تک کامیابی حاصل نہ کر لیتے
تک کہ مسلمانوں کو بے اثر اور بے دم نہ کر لیا جائے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت پیغمبر اسلام
ت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین ماننے میں ہے۔ اس اسلامی طاقت کو توڑنے کے
سامراجیت نے نئے دین کو ایجاد کیا تاکہ مسلمانوں کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبین ہونے
یمان کو کمزور کر دیا جائے۔ ان ہی منصوبوں کے تحت سامراجی طاقتوں نے برصغیر ہند میں قادیانیت
یران میں بہائیت کے شیطانی فتنوں کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب ممالک میں مغربی طرز
طن پرستی کی بیماری کو عام کیا گیا۔ ۱۹ ویں صدی کے وسط میں روسی سامراجیت کے اشاروں پر
نامی ایک پاگل شخص نے سب سے پہلے امام مہدیؑ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

اس شخص کا نام علی محمد شیرازی تھا۔ مہدویت کے دعوے کے فوری بعد اس شخص نے پیغمبر اور نئے دین
نا ہونے کا بھی اعلان کیا تھا۔ اس شخص نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "کتاب البیان" ہے۔
تاب میں اس شخص نے پیغمبری کے دعوے کے علاوہ خدائی کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اس شخص نے روسی سامراجیت
کی امداد اور تائید کے ذریعہ ایران کے مختلف شہروں میں قتل و خون کے بازار کو گرم کیا۔ قاچاری حکومت
نے محمد شیرازی کو فتنہ و فساد برپا کرنے اور رازِ عقائد کی ترویج کرنے کی بنا پر سزائے موت دی۔

اس واقعہ کے ساتھ ہی علی محمد شیرازی کے ماننے والے ایران سے فرار ہو گئے اور برطانوی حکومت
ن شر پسند عناصروں کو قبرص اور حیفہ میں پناہ دی۔ علی محمد شیرازی کے پیروؤں میں دو بھائی تھے جن
نام مرزا یحییٰ اور مرزا حسین علی تھے۔ مرزا یحییٰ نے علی محمد شیرازی کی موت کے بعد قبرص میں اس
دین کے قائد ہونے کا اعلان کیا۔ لیکن مرزا حسین علی نے شہر حیفہ جو موجودہ اسرائیل میں موجود ہے سے
قیادت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد مرزا یحییٰ اور مرزا حسین علی کے پیروؤں کے درمیان خونی جھڑپیں ہوئیں
ن میں مرزا یحییٰ کی ہلاکت واقع ہو گئی۔ تب مرزا حسین علی نے شہر حیفہ میں اپنے نئے دین کے وجود کا اعلان
۔ اور خود کو بہاء اللہ (یعنی خدا کی روشنی) قرار دیا۔

حسین علی بہاء اللہ نے علی محمد شیرازی کی پیغمبری اور خدائی کو منسوخ کرتے ہوئے خود پیغمبری اور خدائی

کا دعویدار ہو گیا۔ حسین علی بہاء اللہ کے پیرو "بہائی" نام سے مشہور ہو گئے۔ برطانوی سامراجیت نے بہائیت کی مکمل حمایت کی۔ حسین علی بہاء اللہ کے جانشین عبدالبہا اور شوقی آفندی نے پہلی جنگ عظیم میں برطانوی افواج کے ساتھ مکمل طور پر ہمکاری کی تھی۔ جس کی بنیاد پر عبدالبہا کو برطانوی سامراجیت نے "سر" کا خطاب دیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد فلسطین کی مقدس سرزمین میں ناجائز صیہونی حکومت کے قیام کے لئے بہائیت نے صیہونیت اور سامراجیت کا مکمل ساتھ دیا۔ اور آج بھی بہائیوں کا صدر مرکز اسرائیل کے شہر حیفہ میں واقع ہے۔ بہائیت کے ماننے والے امریکی جاسوس ہونے کے علاوہ اسرائیل کے آلۂ کار ہیں۔

دنیا بھر میں بہائیت کے مراکز امریکی خفیہ تنظیم C.I.A اور اسرائیلی خفیہ تنظیم MOSSAD کے مراکز ہیں۔ بہائیت کا بنیادی مقصد دنیا کے تمام دین و مذاہب کے بنیادی اصولوں کو کھوکھلا اور نابود کرنا ہے۔ تاکہ امریکہ اور اس کی ناجائز اولاد اسرائیل کے سامراجی منصوبوں کو کامیاب بنایا جاسکے اسی لئے تمام دین و مذاہب کے ماننے والوں کو بہائیت کے شر پسند کرتوتوں سے آگاہ و ہوشیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ بہائیت ایک دین نہیں بلکہ صرف صیہونیت اور سامراجیت کی ایک شاخ ہے ●●

(بشکریہ پندرہ روزہ ایرانیوز حیدرآباد)

(سلسلہ ۴۶ /

"پھر اپنی جیپ پر ہی لے چلئے ـــــ"

"امپاسبل ـــ"

سیٹھ ہچکچایا، چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر وہ بولا ـــــ

"مجھے پندرہ منٹ کا سمے دیجئے صاحب، میں اندر سے آتا ہوں ـــ" اس نے گودام سے متعلق اپنی رہائش گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــ

تھانہ انچارج چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

سیٹھ ٹھیک پندرہ منٹوں کے بعد آگیا مگر اس کا حلیہ اور چہرہ دیکھ کر تھانہ دار بھونچکا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ تھانہ انچارج کچھ بولے سیٹھ نے خود ہی اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی۔

"کیا کرتا صاحب! آپ نے ہماری ایک بات بھی سویکار نہیں کی۔ عزت دار آدمی ہوں۔ پر کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔ اپنی عزت بچانے کے لئے سنیاسی کا حلیہ بنا لیا ہے۔ اور چہرے پر بھبھوت مل لی ہے۔ اب مجھے کوئی پہچان نہ سکے گا۔" ■■■

آخری قسط خلیل اکمل

کینسر

(عورتوں اور بچوں کا علاج)

گذشتہ مضمون میں مردوں کو لاحق ہونے والے کینسر کی نوعیت اور اس کے طریقہ علاج کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔ کینسر پر سلسلہ وار مضامین کی اس آخری قسط میں عورتوں اور بچوں میں کینسر کے اسباب اور علاج کے بابتہ ۱۸ سوالات کے جوابات دئیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں کینسر کی تشخیص اور علاج کی سہولتوں سے آراستہ دواخانوں کے پتے بھی قارئین کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں تاکہ وقت ضرورت مریضوں کی رہبری کی جاسکے۔

س: کیا عورتیں۔ مردوں سے زیادہ کینسر سے فوت ہوتی ہیں؟

ج: نہیں۔ یہ غلط فہمی ہے کہ کینسر عورتوں کی بیماری ہے جو عموماً چھاتیوں اور رحم میں پیدا ہوتا ہے بلکہ مردوں میں یہ زیادہ عام ہے۔ مردوں میں کینسر جسم کے ایسے مقامات پر ہوتا ہے جس کی تشخیص اور علاج بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

س: کیا کینسر کنواری یا شادی شدہ خواتین میں عام ہے؟

ج: وفاتی سرٹیفکٹ کے بموجب کینسر کے اموات کی شرح شادی شدہ عورتوں کے مقابلے میں ۴۰ سال سے زیادہ کنواری عورتوں میں زیادہ ہے۔ عموماً غیر شادی شدہ عورتیں پستانوں اور شادی شدہ، رحم کے کینسر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ کئی ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دودھ پلانے سے کینسر کی شرح اموات میں کمی ہوتی ہے اور زچگی سے کینسر کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

س: کیا چھاتیوں میں کوئی گٹھلی نما ابھار ظاہر ہونے پر لاپرواہی کرنی چاہئے؟

ج: ایسا کرنا بہت خطرناک ہے۔ وقت کینسر کے علاج اور اس کو کنٹرول کرنے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لاپرواہی سے قابل علاج کینسر بھی لاعلاج ہوجاتا ہے۔

س: کیا پستانوں کی تمام گٹھلیاں کینسر کو ظاہر کرتی ہیں؟

ج: نہیں، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اس کا پتہ تو صرف تفصیلی طبی معائنہ سے ہو سکتا ہے

س: پستانوں کے کینسر سے بچاؤ کے لئے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کئے جائیں؟

ج: ایسے کپڑے پہننے سے گریز کریں جو پستانوں کو سختی سے رگڑتے ہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے پستانوں کا معائنہ سال میں دو مرتبہ کسی ڈاکٹر سے کروائیں۔

س: عورتیں خود اپنے پستانوں کا معائنہ اور امتحان کس طرح کر سکتی ہیں؟

ج: ۱) اپنے دونوں ہاتھ سیدھے رکھ کر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو جائیں اور اپنی چھاتیوں کو بغور دیکھیں کہ کہیں کوئی گٹھلی یا غیر معمولی تبدیلی تو ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔

۲) دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر دوبارہ غور کیا جائے۔

۳) ایک ہموار جگہ یا بستر پر لیٹ جائیں پھر ایک تکیہ بائیں کندھے کے نیچے رکھ کر بائیں ہاتھ کو سر کے نیچے رکھ دیں۔ پھر سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے بائیں چھاتیوں کے اطراف اور بغل کو سختی یا نرمی سے دبا کر سوجن یا گٹھلی کا پتہ چلائیں۔

۴) اب بائیں ہاتھ کو سر کے نیچے سے نکال کر بازو رکھ دیں۔ اب سیدھے ہاتھ سے بغل میں کوئی غیر معمولی ابھار کا پتہ چلائیں۔

۵) اسی طرح چھاتیوں کے نچلے حصہ کا بھی معائنہ کریں۔

۶) یہی عمل دائیں پستانوں کی جانچ کے لئے دہرائیں۔

س: رحم کے کینسر سے بچاؤ کے لئے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کئے جائیں؟

ج: زچگی سے پیدا ہونے والے تمام زخموں کا اندرون ۶ ماہ علاج کروالیں۔ اندام نہانی سے غیر فطری مادہ کے اخراج کی روک تھام کریں۔ ۳۵ سال کی عمر کی خواتین سال میں دو مرتبہ اور اس سے زیادہ عمر کی خواتین سال میں ایک مرتبہ اپنے ڈاکٹر سے طبی معائنہ کروائیں

س: کیا زخم کی سختی کینسر میں بدل سکتی ہے؟

ج: نہیں، اس کے کینسر میں تبدیل ہونے کا بہت ہی کم امکان ہے۔

س: بچوں میں کینسر کس عمر میں پیدا ہوتا ہے؟

ج: اس کے لئے عمر کی قید نہیں، خصوصاً آنکھوں اور خون کا کینسر بہت ہی کم عمری میں لاحق ہوتا ہے۔

س: کیا والدین کے کینسر سے فوت ہونے پر بچوں میں اس کی امید کی جا سکتی ہے؟

ج: عملاً نہیں۔ کئی ایسے خاندان ہیں جن میں والدین کینسر کا شکار ہوئے لیکن

بچے محفوظ رہے اور بعض خاندان میں والدین کینسر سے محفوظ رہے لیکن بچے کینسر کا شکار ہوئے۔

س: کیا کینسر عمر رسیدہ اشخاص کے مقابلے میں بچوں میں بہت تیزی سے بڑھتا ہے؟

ج: شاید نہیں۔ کینسر کے نشو و نما کی شرح اس کی نوعیت پر ہے۔

س: اگر کینسر کی وقت پر تشخیص ہو جائے تو کیا یہ بڑوں کے مقابلہ میں بچوں کے لئے تیزی سے قابل علاج بن جاتا ہے؟

ج: کینسر کے علاج کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا انحصار اس کی نوعیت، طریقۂ تشخیص کا وقت، علاج، اور اس کی افزائش پر ہوتا ہے۔

س: کینسر سے کس طرح اموات کم ہو سکتی ہیں؟

ج: چار طریقوں سے (۱) ابتدائی تشخیص جس میں مریض کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پابندی سے اپنا طبی معائنہ کراتا رہے اور ڈاکٹر کو چاہئے کہ وہ بیماری کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج بتائے (۲) مکمل اور باقاعدہ علاج۔ یہ ڈاکٹر کی ذمہ داری ہے جو علاج کر رہا ہو۔ (۳) نئے نئے علاج کے طریقوں کی دریافت (۴) کینسر کے اسباب کی دریافت۔ آخر کے دونوں طریقے صرف تحقیق سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

س: کیا کینسر میں مبتلا ہونا کوئی ذلت یا تحقیر ہے؟

ج: اس میں کوئی ذلت نہیں ہے۔

س: کیا کینسر کے علاج میں ایک عام بیماری کے مقابلہ میں زیادہ صرفہ ہوتا ہے؟

ج: ہاں، اکثر ہوتا ہے مگر اس کا انحصار کینسر کی نوعیت پر ہے۔ ٹاٹا میموریل ہسپتال بمبئی میں غریب اور نادار مریضوں کے لئے مفت علاج کی سہولت ہے۔

س: نیم حکیم کیوں خطرناک ہیں؟

ج: اس کے حسب ذیل وجوہات ہیں:

(۱) ان حکیموں کو کینسر کے تعلق سے مکمل معلومات نہیں ہوتے۔

(۲) یہ لوگ اپنے طریقۂ علاج سے قیمتی وقت برباد کرتے ہیں اور کینسر بڑھتا رہتا ہے۔

(۳) حکیموں کی دوائیں اور مرہم کینسر پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔

(۴) حکیم مریض سے علاج کا سبز باغ دکھا کر پیسے حاصل کرتا ہے جس سے مریض صحیح علاج سے محروم ہو جاتا ہے۔

س: ایک نیم حکیم اور اچھے ڈاکٹر کی پہچان کیا ہے؟

ج : نیم حکیم کیانسر کی گیارنٹی دیتا ہے۔ اور ایسا طریقۂ علاج تجویز کرتا ہے جو طبی میدان میں غیر مصدقہ ہوتا ہے۔ ایک اچھا اور مستند ڈاکٹر ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔

س : کیا کیانسر سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔

ج : ہاں، اس کو ہم مسلسل نظرانداز کرتے ہیں۔ آجکل لوگ کیانسر سے نہ صرف صحت یاب ہو رہے ہیں بلکہ معمول کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔

ذیل میں کیانسر کی تشخیص اور علاج کی سہولتیں رکھنے والے دواخانوں کے پتے دئیے گئے ہیں :

۱۔ کیانسر ڈیٹکشن سنٹر، سینٹ جارج ہاسپٹل، سینٹ جارج روڈ۔ بمبئی ا

۲۔ کیانسر ڈیٹکشن سنٹر، پری وینٹیو اینڈ سوشیل میڈیکل ڈپارٹمنٹ ۰ اولڈ پی۔ ڈی بلڈنگ، جے جے ہاسپٹل، بمبئی - ۸

۳۔ کیانسر ڈیٹکشن سنٹر، روباریل میڈیکل سنٹر، روبرو گلاگرز و لیباریٹریز ڈاکٹر انی بسنت روڈ۔ ورلی۔ بمبئی - ۱۸۔

قارئین کو چاہیے کہ کیانسر کے متعلق سات خطرناک اشارے ذہن نشین کریں۔

۱ــــ وہ زخم جو مندمل نہ ہو۔
۲ــــ جسم کے کسی حصہ میں ابھار پیدا ہو۔
۳ــــ وقفہ وقفہ سے خون کا غیر معمولی اخراج ہو۔
۴ــــ مسّہ یا تل میں کوئی تبدیلی ظاہر ہو۔
۵ــــ دائمی قبض اور نگلنے میں دشواری ہو۔
۶ــــ مستقل کھانسی یا آواز کا بیٹھ جانا۔
۷ــــ اجابت کے معمول میں کوئی تبدیلی ہو۔

بشکریہ : (کیانسر سوسائٹی آف انڈیا)

7۔ عورتوں کی تعلیم ـ 8۔ تحقیقی مطالعے

کسی بھی پروگرام کی کامیابی کا دارومدار حکومت اور لوگوں کے مشترکہ عزم پر ہے۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم کے مرکزی اور ریاستی حکام، اقلیتی تعلیمی انجمنوں، اقلیتی تعلیمی گروپوں اور دوسرے متعلقہ افراد کے بھرپور تعاون اور اشتراک عمل سے اقلیتوں کے تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کے مسائل کو مؤثر طور پر حل کیا جا سکتا ہے اور ان طبقوں کو ایک ایسی سطح پر لایا جا سکتا ہے جہاں وہ قومی ترقی کے تمام شعبوں میں پوری طرح شریک ہو سکیں۔

محمد لطیف احمد

سب رس

جب تک اردو زندہ ہے، کچھ کتابیں ایسی ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، نیرنگ خیال، فسانۂ آزاد، داستان اردو، امراؤ جان ادا، غالب کے خطوط، سی پارۂ دل، غبار خاطر، اور سب رس یہ تمام کتابیں ہمارا گراں قدر ادبی سرمایہ ہیں۔ ہم ایک ایسی کتاب کا ذکر کرتے ہیں جو اردو زبان کے نثری کارناموں میں سب سے پہلا مکمل نمونہ اور تمثیل نگاری کی سب سے پہلی شاہکار تصنیف ہے۔ یہ کتاب ہے "سب رس"

"سب رس" تاریخی و ادبی لحاظ سے بڑا اونچا درجہ رکھتی ہے۔ یہ اردو انشائیہ کے اولین نقوش ہی نہیں بلکہ پہلی صوفیانہ تمثیل بھی ہے۔ آج سے ساڑھے تین سو سال قبل یعنی سن ۱۶۳۵ عیسوی میں دکن کے فرمانروا عبداللہ قطب شاہ کے عہد حکومت میں "ملا وجہی" نے نثر میں لکھی۔ وہ خود سن تصنیف یوں لکھتے ہیں:

"بارے جس وقت تھا۔ ایک ہزار و چہل و پنج ہتا وقت ظہور پکڑ یا یو گنج" اصل کتاب ٹائپ کے تین سو صفحات پر چھپی ہے۔ سب رس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے:

"تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے۔ مستقیم، ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے کریم"۔

داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ "نقل۔ ایک شہر تھا۔ اس شہر کا ناؤں سیستان، اس سیستان کے بادشاہ کی ناوں عقل، دین و دنیا کا تمام کام اس تے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرا کیں نیں ہلتا"۔

سب رس میں آب حیات کی تلاش کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تمثیل اس قصہ کو

لکچرار، شعبۂ اردو و فارسی، ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور

کیسے کیا جس میں مجرد احساسات و خصوصیات جیسے عقل، عشق، دل، نظر، فریب، رقیب، وغیرہ کو چلتے پھرتے کردار کا روپ دیا جاتا ہے۔ ہر کردار اسم با مسمّٰی ہوتا ہے۔ وجہی خود اس تمثیل کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

"ناموس بولیا کہ اس تازہ آب حیات کا قصہ ایک تاویل دھرتا ہے۔ ایک تمثیل دھرتا ہے۔"

اصل قصہ اس طرح ہے کہ "شہر تن کا والی جس کا نام "دل" تھا، اپنے ایک مصاحب سے آب حیات کا قصہ سنتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ آخر کار اس کا ایک جاسوس "نظر" اس کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ دیدار نامی شہر میں ایک باغ ہے جس کا نام "رخسار" ہے۔ اس باغ میں "دہن" نامی چشمہ ہے۔ اس کا نام "آب حیات" ہے۔ نظر تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں کا پاسبان "غمزہ" ہے۔ غمزہ سے ملتا ہے جو کہ اس کا بھائی ہے۔ جو بچپن میں جدا ہو گیا تھا۔ نظر و غمزہ حسن سے ملتے ہیں۔ حسن دل سے محبت کرتی ہے۔ اور دل کو لانے کے لئے نظر اور اپنے غلام خیال کو روانہ کرتی ہے۔ ادھر وہم نامی وزیر کے کہنے سے عقل بادشاہ دل اور نظر کو نظر بند کرتا ہے۔ نظر جادوئی انگوٹھی کی مدد سے شہر دیدار پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہاں شہر "سنگسار" میں رقیب قید کر لیتا ہے۔ پھر وہ لٹ کی مدد سے شہزادی حسن تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد نظر و غمزہ دل کو رہا کرنے کے لئے نکلتے ہیں۔ راستے میں ان کی جنگ عقل کے سپہ سالار توبہ سے ہوتی ہے۔ لڑائی میں توبہ کو شکست ہوتی ہے۔ عقل اپنے بیٹے دل کو آزاد کرتا ہے اور شہر دیدار پر حملہ کرتا ہے۔ حسن کی مدد کے لئے اس کا باپ عشق اپنا لشکر بھیجتا ہے۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک جنگ ہوتی ہے۔ عقل ہار کر بھاگ جاتا، حسن کی فتح ہوتی ہے۔ دل اور حسن دونوں آپس میں ملتے ہیں۔ لیکن غیر، حسن اور دل میں تفرقہ ڈالتا ہے۔ دونوں میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں معاملات کی صفائی ہو جاتی ہے۔ آخر میں عشق و عقل کے باہمی مشورے سے، حسن و دل کی شادی کر دی جاتی ہے۔ دل، ہمت اور نظر تینوں کو "باغ ہمت" میں آب حیات نظر آتا ہے، جہاں حضرت خضر علیہ السلام کو کھڑا پاتے ہیں۔ اس طویل داستان کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے۔

"الحمد للہ دونوں کوں ہوا وصال، اپنا دل خوش تو سب عالم خوش حال، دل کوں ملیا جیو کا جانی۔ یو وصال مبارک۔ یو خوش ارزانی"۔

"سب رس" کا قصہ عشق مجازی کی بہترین نظیر ہے۔ عشقیہ واقعات، داستانوں یا افسانوں

کی طرح ہیرو، ہیروئن اور ویلن کا یہ تکون ابد تک قائم و دائم رہنے والا بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ باقی تمام کردار ذیلی ہیں یا ہیرو، ہیروئن کا ساتھ دیتے ہیں۔ یا پھر مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"سب رس" کی روشنی میں ساڑھے تین سو سال قبل کے دکنی کلچر، معاشرے اور تہذیب و تمدن کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ تمام معاشرے پر تصوف غالب تھا۔ بادشاہ کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ رعایا بادشاہ کو ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ کہتی تھی۔ بادشاہ دوسرے ممالک کو اپنے جاسوس بھیجتے اور اپنی سرحدوں کی ناکہ بندی بھی کرتے تھے۔ معاشرہ مردوں کا تھا۔ مرد کی صفات میں قناعت، صبر و شکر پایا جاتا تھا۔ عورتوں میں پردے کا رواج سخت تھا۔ وہ شوہر پرست ہوتی تھی۔ عورتوں میں مکر و ریا بھی پایا جاتا۔ وہ سوکن کا غم برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے خاص زیور نتھ، بنگڑیاں، گھنگرو، چھاگل توڑے، کنٹھ مالا، ہار، آرسی، کردھنی یعنی زر کمر وغیرہ ہوتے تھے۔ وہ عطر، کاجل اور مہندی لگایا کرتی تھیں۔ گال پر تل بنانا اور گھونگھر والے بال پسند کئے جاتے تھے۔ عوام اور شاہی محل میں پان کھایا جاتا تھا۔ مسافر نوازی عام تھی۔ گداگری کو لعنت بتایا جاتا۔ لوگ تکالیف و پریشانیوں کے عالم میں نجومیوں اور جوتشیوں سے رابطہ پیدا کرتے تھے۔ لالچ، حرص و ہوس اور ظاہر پرستی کو برا کہا جاتا۔ عشق معاشرے کی آن بان اور شان تھی۔ شادی میں منڈھے گڑتے، شامیانے تانے جاتے، فرش بچھتے، آرائش کی جاتی خوب روشنی ہوتی۔ رقص و سرود کی محفل جمتی، طوائفیں ناچتی تھیں۔

"سب رس" کا قصہ ملا وجہی کا طبع زاد نہیں ہے۔ بلکہ فارسی شاعر محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کے نثری قصے حسن و دل اور ان کی مثنوی دستور عشاق سے اخذ کیا گیا ہے۔ دراصل فتاحی کی اس تصنیف اور موضوع کو کافی شہرت ملی۔ چنانچہ ترکی زبان میں عمری، لامعی، وائلی اور صدقی نے لکھی۔ آرتھر براؤن اور ولیم پرائس نے انگریزی زبان میں، جرمنی زبان میں ڈاکٹر اے ڈریف ڈوراک اور آر ایس گرین شیلڈس نے شائع کیا۔ فارسی میں صلاح الدین صرفی اور داؤد ایلچی نے اور دکنی اردو میں عہد عالمگیری میں ملا جامی، محمود اور خواجہ محمد بیدل نے لکھا۔ یہ تصنیف ایک خالص اور بے مثل تمثیل کے لحاظ سے جس زمانے کی طرح آج بھی بے مثال ہے اور ساڑھے تین سو سال تک یہ کتاب [illegible] ادب کو متاثر کرتی رہی اور یورپ کے ماہرین ادب میں مشہور و مقبول ہو [illegible] یہی وجہ ہے شیکسپیئر نے بھی کہا تھا کہ :

"جو کوئی صاحب فن ا پچھے گا، اسے یو سخن اثر کرے گا، مست بے خبر کرے گا
عجب مرد تھا کہے گا، عجب صاحب درد تھا کہے گا"

ملا وجہی اردو انشائیہ کا باوا آدم ہے۔ سب رس میں اکثر انشائیے ملتے ہیں۔ ملا وجہی دنیا میں سب سے پہلا انشائیہ نگار فرانس میں مائیکل ڈی مونٹین MICHAEL DE MONTAIGN اور انگلش ESSAY کے موجد بیکن BACON کا ہمعصر تھا۔ عالمی ادبیات میں بھی ملا وجہی کا نمبر تیسرا تھا۔ اول نمبر پر فرانسیسی انشائیہ، دوسرے نمبر پر انگریزی اسے اور تیسرے نمبر پر اردو انشائیہ یعنی سب رس۔ ملا وجہی خود فخر انداز سے کہتے ہیں کہ "ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نیں کیا، اس دھات بات کوں سلامت نیں دیا"۔

"سب رس کا اسلوب فسانہ عجائب کی طرح مرصع و مسجع ہے۔ لیکن فسانۂ عجائب کی طرح ثقیل، دقیق اور عربی فارسی سے گراں بار نہیں۔ قدیم دور میں شاعرانہ نثر دنیا کے تمام ادبیات میں بے حد مقبول رہی ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی ادب میں اس قسم کی نثر کا رواج رہا تھا۔ جس کے بہترین ادبی نمونے لائلی LYLY کی کتاب EUPHOES میں اور سڈنی SIDNEY کی کتاب آرکیڈیا ARCADIA میں موجود ہیں۔ لائلی کی نثر مقفّٰی نثر اور سڈنی کی نثر میں رنگین بیانی ہے۔ سب رس کی نثر مقفّٰی بھی ہے۔ اور رنگین بھی۔ جس سے اس کے حسن و دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ وجہی کے زمانے میں دکنی نثر ابتدائی حالت میں تھی نثر کا بنیادی مقصد صرف عوام تک اپنے خیالات کو پہنچانا تھا۔ اس میں ادبی چاشنی نام کو نہ تھی۔ وجہی کا کمال یہ کہ اس نے ادبی چاشنی پیدا کی اور نظم و نثر کو گھلا ملا کر ایک نرالا اسلوب ایک نئی لطافت، اور ایک ادا پیدا کی ہے جس کی ایجاد کا سہرا اسی کے سر ہے۔ وہ خود فخر کے انداز میں کہتے ہیں کہ

"آج لگن کوئی، اس جہاں میں، ہندوستان میں، ہندی زبان سوں اس لطافت، اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کر یوں نیں بولیا، اس بات کوں، اس نبات کوں، یوں آب حیات میں نیں گھولیا"۔

وجہی نے قافیہ پیمائی کا جس قدر التزام کیا ہے اردو کی قدیم و جدید کسی بھی کتاب میں دکھائی نہیں دیتا۔ ابتدا سے آخر تک تمام کتاب دیکھ لیجئے ہر سطر اور ہر جملے میں قافیہ قافیہ نظر آئے گا۔ قافیہ پیمائی کا التزام ملاحظہ فرمائیے:

"جس کوں خدا دیا امان، جس کوں خدا کا دھیان، جس کوں خدا کی پہچان

باقی ص ۴۵

بلقیس شبیہ

ڈوبتے تارے

مٹی کا دیا تو بار بار جلایا اور بجھایا جا سکتا ہے لیکن آسمان سے ستارہ ٹوٹ کر گرجاتا ہے تو پھر دوبارہ روشن نہیں ہوتا۔ ۔۔۔ مجبور

(حیدرآباد کے چار مینار سے کود کر ایک بھائی اور چار بہنوں کی اجتماعی خودکشی کی خبر سے متاثر ہوکر)

آج پھر گھر میں ہنگامہ ہوا ہے ۔۔۔ بڑی بہو کی لگائی بجھائی نے چھوٹی بہو اور ساس کے درمیان لڑائی کی آگ بھڑکائی ہے ۔۔۔

ننھی تارا کے رونے اور اماں کے دھاڑنے کی آواز باہر گلی تک آرہی تھی ۔

انجم باہر ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا ۔ اور سوچنے لگا

آدھا پیٹ کھانا کھاکر پورے گھر کا کام کرنے والی ستارہ نے ضرور کوئی نقصان کیا ہوگا ۔ پیالی، گلاس، طشتری توڑ دی ہوگی یا روٹیاں جلائی ہوں گی ۔ یا پھر دودھ اُبال دیا ہوگا ۔ جس کی سزا میں اماں نے اُسے مارا ہوگا اور ستارہ نے گود میں سہمی ننھی تارا کو زمین پر پٹک دیا ہوگا اور خود گھر کے اندھیرے کونے میں قسمت کا ماتم کرنے بیٹھ گئی ہوگی ۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے ۔ بھابی ستارہ کو شوہر اور ساس سے پٹوا کر اپنے بڑے پن کی ساکھ برقرار رکھتی ہیں ۔ ستارہ احتجاج میں بھوک ہڑتال کرتی ہے ۔ جہاں تک ستارہ کے بھوکے رہنے کا تعلق ہے اماں اور بھابی کو اس سے بڑی روحانی طمانیت ملتی ہے ۔ لیکن ستارہ یہ ستم کرتی ہے کہ ننھی تارا کو بھی اپنا دودھ پلانے سے انکار کردیتی ہے اور اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ شیر خوار بچی بھوک سے بلبلاتی ہے اور سارا گھر پریشان ہوتا ہے ۔ کیا اماں اور کیا بھابی ۔ حتیٰ کہ بھیا بھی اسے چپ کرانے کے جتن کرکے ہار جاتے ہیں ۔ شائد اسی بات سے ستارہ کو تسکین ملتی ہے تب ہی تو وہ اپنی مامتا پر جبر کرکے معصوم بچی کا رونا بلکنا گوارا کرلیتی ہے

انجم چھجے کے نیچے اپنی بیساکھیوں کے سہارے کھڑا یہ سب سوچ رہا تھا ۔

بمعرفت ایم ۔ جی ۔ رحمن ایڈوکیٹ ۔ ڈھنڈہ بیس ۔ اکولہ 444002 (ایم ایس)

بچاری کی ایک بک جھک ختم ہونے کو نہ آئی۔ نارا کے رونے کی آواز قدرے دور سے سنائی دے رہی کہ کوکب اسے لئے گلی کے دروازے میں کھڑا باہر کے اندھیرے سے ڈرا کر اسے سلانے کی کوشش کر رہا ہے اور بھوک کی شدت پر اندھیرے کا خوف غالب آگیا ہے۔ ضرور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں گی اور بھائی سے چمٹ کر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا ہوگا۔

اماں بھی چپ ہو گئی ہیں۔ چیختے چلاتے وہ بھی تھک گئی ہوں گی۔ اندر مکمل سکوت ہے۔ شاید عورتیں باہر سے آنے والے مردوں کا انتظار کر رہی ہیں۔

انجم نے اندر جھانکا۔ ستھیل کرے کے وسطی ستون کے سہارے بیٹھا چولہے کی طرف تاک رہا ہے اسے زور کی بھوک لگی ہے۔ بھابی وہیں بیٹھیں اوپلوں کی راکھ کرید رہی ہیں۔ راکھ کرید کر چنگاریاں ڈھونڈنا اور پھر ان چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلے بنانا بھابی کا محبوب مشغلہ ہے۔ بے چاری ستارہ جانے کمرے کے کونسے کونے میں دبکی ہے جہاں کڑوے تیل سے جلنے والے چراغ کی ٹمٹماتی روشنی نہیں پہنچ پا رہی ہے۔ البتہ اس کی دبی دبی سسکیوں سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ اسی کمرے میں موجود ہے

اپاہج زہرہ اپنی پلنگڑی پر پڑی رہ رہ کر کھانس رہی ہے۔ جب بھی گھر میں کوئی ہنگامہ ہو یا کوئی بات اس کے دل کو چوٹ پہنچائے وہ اسی طرح کھانس کھانس کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتی ہے اور زور زور سے اپنے مرنے کی دعائیں مانگتی ہے۔ لیکن ابھی تک اسے موت نہ آئی۔ آئے بھی کیوں — اس کے جراثیم زدہ استخوانی پیکر سے موت کو بھی گھن آتی ہوگی۔ لاحول سے چالیس قدم دور رہنے والے شیطان کی طرح موت بھی اس گھر سے دور بھاگتی ہے۔ مدت گزری اس گھر سے ایک جنازہ اٹھا تھا۔ دادا کا۔ جو دمے کے مرض میں مبتلا ہو کر برسوں پلنگ پر پڑے موت موت پکارتے

انجم بھی تو موت کا خواہش مند ہو کر ملٹری میں بھرتی ہوا تھا۔ لیکن گولیوں کی بوچھار میں سے بھی زندہ سلامت لوٹ آیا۔ صرف اپنی دونوں ٹانگوں کی قربانی دے کر۔ اس گھر میں تو اعضا اعضا کی موت الگ الگ ہوتی ہے۔ زہرہ کے تمام اعضا مر چکے ہیں صرف سانسیں چل رہی ہیں۔

انجم کی خواہش تھی کہ اس گھر سے کوئی جنازہ اٹھے۔ محلے والے اس کے پاس تعزیت کو آئیں۔ بھابی اور اماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگے۔ ان سوکھے بادلوں کو برستا دیکھنے کا اسے کتنا ارمان ہے جو صرف گرجتے رہتے ہیں۔ ان کی زبانیں سوگ اور غم سے نہ سہی دنیاداری کے لحاظ سے ہی کچھ دن کے لئے چپ رہیں۔ اور گھر پر ایک سوگوار لیکن طمانیت بخش خاموشی چھا جائے — کاش! ایسا ہو .... کبھی تو ایسا ہو ....

زندگی کی سختیاں جھیل جھیل کر اور اپنوں کی بے مہری سہہ کر انجم اذیت پسند بنتا جا رہا تھا

ب کے سب مر کیوں نہیں جاتے ـــ سب ہی ـــ اس نے دعا کی ـــ بھوک
جھیلنے والی ننھی تارا ساس کا ظلم اور جیٹھ جیٹھانی کی زیادتیاں سہنے والی ستارہ،
لے ستون کا سہارا لئے ہوئے اونگھتا سہیل، ننھی بہن کو کندھے پر سلانے والا کوکب، چلنگری
یڑیاں رگڑتی نیم مردہ زہرہ، جس میں چنگاری ڈالنے والی بی جمالو بھابی اور اپنی زبان سے
ب کے گولے برسانے والی ہٹلر اماں، گھر کی ذمہ داریوں سے مستعفی شرابی بدمست باپ،
بی اور اماں کو تانا شاہی اختیارات دینے والا بے انصاف بھائی ـــ اور وہ خود بھی ـــ
اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ بیڑی کے ادھ جلے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا نکالا۔ ان ہی ٹکڑوں
مع کرنے کی خاطر وہ ہر روز گھر سے باہر بازار کی ایک چکر لگاتا تھا۔ رات کو جب اسے نیند نہ آتی اور
ا زیادہ ستاتی تو وہ ان ادھ جلے ٹکڑوں کے سہارے بے ہی رات گزارتا تھا۔
اس نے بیڑی کا ٹکڑا ہونٹوں میں دبایا۔ ان میں کسی کے ہونٹوں کا گیلا پن ابھی تک موجود ہے۔
انے دیاسلائی جلائی۔ ایک ننھا سا کوندا لپکا۔ ماضی کے اندھیرے میں چھپے اچھے برے دنوں کی یاد
وشنی میں اجاگر ہوگئی۔ دیوار کے سہارے کھڑے ہوکر جیسا گھٹنوں پر اس نے اپنی ٹھوڑی ٹیک دی۔
اپنی نوکری کے دوران دنیا بھر کے خوبصورت علاقوں میں گھوم پھر کر آخر اسے اس گھر پر لوٹ
ا پڑا جہاں سے کہ وہ ایک دن موت کی تلاش میں نکلا تھا۔ اپنی پانچ سالہ سپاہیانہ زندگی میں
بم کے دھماکوں اور توپوں کی گھن گرج میں اس نے باپ اور بھائی کی گالیاں، ڈانٹ پھٹکار،
ا کے کوسنے اور بھابی کے طعنے تشنے سب بھلا دیئے تھے۔ ایک طاقت تھی جو اسے کشاں کشاں
لوٹنے پر مجبور کر دی تھی۔ شائد وہ گھر گاؤں اور وہاں کی مٹی کی کشش تھی۔ یا پھر ماں باپ بھائی
خون کے رشتے کی مقناطیسیت ـــ یا پھر اپنی وفادار بیوی زہرہ کی محبت اور یاد ـــ اور وہ
ٹ آیا ـــ ان سب کے لئے ـــ زہرہ اسے اس عالم میں ملی ـــ ہڈی کا ڈھانچہ ـــ اسے دیکھنے کو
مرف زہرہ کی آنکھیں اور اس سے بات کرنے کے لئے اس کے ہونٹ زندہ تھے۔ باقی سب کچھ مر چکا تھا۔
دوسرے گھر والے سب ویسے ہی چاق و چوبند تھے۔ اماں کی آواز میں وہی طعنے کا لعاب کی
نک تھی۔ بھابی بھی تو بیاہتا دلہن کی طرح بے اولاد، نینوں میں کجرا، بالوں میں گجرا، ہاتھوں
ا کنگن، ہونٹوں پر مسی مہندی، سرخی پاوڈر غرض سولہ سنگھار کئے ہوئے۔ بھیا کے چہرے پر
ہی جھلاہٹ اور ماتھے اور ابھری ہوئی لکیریں جو ان کی شخصیت کا ایک جزو بن گئی تھیں۔ ابا
ا تو ند ویسے ہی ترینکی طرح، کثرت شراب نوشی سے ابھی تک ان کے پھیپھڑے، جگر کچھ بھی خراب نہیں ہوا تھا
اس کے گھر سے گمنام ہوئے پانچ سال گویا پانچ گھنٹے تھے کہ جب اُسنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا

تو نہ کسی کو حیرت مسرت ہوئی اور نہ کسی نے خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن جب اس نے اپنی جان پر کھیل کر کمائی ہوئی دولت ماں کے حوالے کی تو ان کے سینے میں ایک دم ممتا کا جوش ابل پڑا "میرے لال" کہہ کر انھوں نے انجم کو سینے سے لگالیا تب بھیا بھی اس کی ٹوٹی ٹانگوں پر افسوس کرنے لگے۔ بھابی بھی اس کی خیر خواہ بن گئیں۔ اس کے پیسوں سے گھر میں دن میں عید اور رات شب برات منائی جانے لگی۔ اماں نے بھینسیں خریدیں۔ بھابی نے مرغیاں، بکریاں اور بطخیں اور بھیا نے بڑی سی کرانا شاپ کھول لی۔

انجم نے زہرہ کے علاج پر بھی کافی روپیہ خرچ کیا۔ اماں اور بھابی کو بڑا ناگوار گزرتا۔ وہ کہتیں جتنا روپیہ زہرہ کے علاج پر خرچ ہو رہا ہے اتنے میں ایک نئی دلہن آسکتی ہے۔ جیسے وہ لڑکی بیاہنے نہیں بلکہ خریدنے کی بات کر رہے ہوں۔ سب ہی گھر والوں نے اسے دوسری شادی کی ترغیب دی۔ خود زہرہ نے بھی اسے شادی کے لئے مجبور کیا بولی۔ "میں بیماری سے معذور ہوگئی ہوں تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ تم شادی کرلو تو مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ اس گھر میں تمہاری محبت کرنے، تمہاری فکر رکھنے اور تمہاری پرواہ کرنے والا کوئی ہے۔ زہرہ کے بہت مجبور کرنے پر انجم نے ستارہ سے شادی کرلی۔ جس کے دم سے انجم کے افق حیات پر سہیل، کوکب، اور تارا نمودار ہوئے۔ لیکن ان ستاروں کے دم سے اس گھر کا اندھیرا بڑھنے لگا۔ نوٹوں کی گڈیاں تاش کے پتوں کی طرح اماں، بھابی اور بھیا کے ہاتھوں میں کھیلنے لگیں۔ وہ خود اک ہارا ہوا جواری بن کر بے غیرت، نکما اور منحوس کہلایا جانے لگا۔ ماں کی ممتا، بھابی کے لہجے کی مٹھاس، بھیا کی شفقت ژالہ باری سے اڑنے والے کھڑکیوں دروازوں کے رنگ پینٹ کی طرح غائب ہو گئے۔

بھائی رائج الوقت نہیں گھر میں اپنا سکہ چلا رہی تھیں حالانکہ انجم کے پیسوں سے خریدی ہوئی بھینسیں اب بھی آنگن میں بندھی تھیں جن کے دودھ کی آمدنی اماں کے گھر میں اڑسی ہوئی تھیلی میں چھن چھن بجا کرتی۔ مرغیوں اور بطخوں کے انڈوں کی آمدنی پر بھابی نے چاندی کے کڑے اور پازیب بنالئے تھے۔ جن کی جھنکار گھر آنگن میں گونجتی رہتی تھی۔ انجم ہی کے روپیوں پر کھولی گئی کرانہ شاپ پر بھیا عیش کر رہے تھے۔ اس کے روپیوں پر سارا گھر مزے کر رہا تھا۔ اور اسے اور اس کی بیویوں بچوں کو کنگال بنادیا گیا تھا۔ یہ بات ایک مرتبہ ستارہ نے اپنی زبان پر لائی تھی تو اماں نے اس کے منہ پر گھونسوں کی بارش کر دی تھی اور بھابی نے اس کے بال نوچ کھسوٹ کر اس کی اوڑھنی تار تار کر دی تھی۔ پھر تو روز ہی مار پیٹ، گالی گلوج بے چاری کا مقدر بن گئے۔

گلی میں بھیا کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ انجم نے جھانک کر دیکھا۔ بھیا گھر میں داخل ہو گئے

وہ بھی اپنی بیساکھیاں کھڑکھڑاتا اندر آیا۔ انھیں دیکھ کر اماں اور بھابی ڈال پر بیٹھے کوّوں کی طرح غل مچانے لگیں۔ اس نے دونوں کی ایک بات بھی نہ سنی۔ سیدھا تارا کے پاس پہنچا۔ وہ ہر روز کی داستان کل کل سے بیزار ہو گیا تھا، اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا تھا، وہ ستارا کو دالان کی طرف لے جاتا ہوا بولا "ستارا! اب تم اس گھر سے چلی جاؤ—" گھٹی گھٹی سسکیوں کو اس نے اپنے گلے میں بھینچ لیا۔ تارا پھر جاگ گئی اور اماں کی گود میں مچلنے لگی۔

"اماں! اسے چپ کراؤ—" انجم چیخ پڑا۔ درد و کرب نے غصے اور جھلاہٹ کی صورت اختیار کر لی

"حرامزادی—!" اماں تارا کے ملائم گال میں گھونسا لگاتی ہوئی حقارت سے بولیں "مر جائے زباپ کٹے—"

بیساکھیاں پھینک کر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ شدت کرب سے اس کا دل دماغ پھٹا جانے لگا۔ اس نے چاہا کہ خوب چیخ چیخ کر روئے۔ تارا سے بھی زیادہ۔

بھوک سے بھی بے قرار تارا دادی کا گھونسا کھا کر اور بھی قیامت برپا کرنے لگی۔ بھیا بھی جھلا گئے۔ چیخ کر بولے "کم بخت اگر چپ نہیں ہوتا تو زہر پلا کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دو—"

"زہر....." انجم کے ہونٹ کپکپائے۔ زہر... زہر... زہر... جیسے اس کے دماغ میں کوئی لفظ زہر کی گردان کرنے لگا۔

وہ اٹھا۔ بیساکھیاں سنبھالیں۔ آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں آیا— نڈھال سا— غم اور غصے نے اس کے جسم کی ساری طاقت چھین لی تھی۔ اسے چکر سا آ گیا۔ اس نے ستون کا سہارا لیا۔ کھمبے کے سرے پر بڑی احتیاط سے ایک ننھی سی پوٹلی بندھی ہوئی تھی۔ جو دھوئیں سے کالی ہو گئی تھی۔ اسے یاد آیا ایک مرتبہ ستارا نے یہاں چوہوں کا زہر باندھ کر رکھا تھا—

اگر یہ خاموش نہ ہو تو اسے زہر دے کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دو—.....

زہر دے کر خاموش کر دو.......

خاموش کر دو........

زہر دے کر........

اس نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ بڑھا کر وہ پوٹلی کھولی۔ اس کی انگلیاں کانپنے لگیں..... بلکہ پورا بدن کانپنے لگا

"کوکب!" اپنی کوٹھری میں جاتے ہوئے وہ بڑے بیٹے سے بولا جو مشکل سے چھ سات سال کا تھا "تارا اور شکیل کو لے کر میرے پاس آؤ—" وہ جا کر اپنی پلنگڑی پہ گر سا گیا۔

کچھ دیر بعد تارا اور سہیل کو لے کر کوکب سہمے سہمے قدموں سے باپ کے پاس آیا۔ انجم جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔ تارا کو اپنی گود میں لیا اور سہیل کو اپنے بازو بٹھا کر کوکب سے گلاس میں پانی منگوایا۔ دھول میں اٹی زہر کی پوٹلی کھولتے وقت اس کا پورا بدن پسینہ میں نہا گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا لیکن پھر اس نے اپنا دل مضبوط کیا۔ بسورتی ہوئی تارا کو کندھے پر ڈال کر وہ پانی میں زہر گھولنے لگا۔ تارا باپ کے پھٹے ہوئے قمیص کو نپل کی طرح چوسنے لگی۔ کوکب اور سہیل پاس کھڑے چپ چاپ دیکھتے رہے۔ باپ سے کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سب سے پہلے اس نے تارا کے منہ میں یہ امرت ٹپکایا۔ تارا نے بڑی بے تابی سے اپنے ہونٹ کھولے تھے لیکن جب کڑوی کسیلی چیز حلق میں اتری تو اس نے کراہیت سے منہ پھیر لیا۔

"اب یہ سوجائے گی ـــ" انجم بچی کو پلنگ پر لٹاتا ہوا بولا۔ پھر اس نے وہ گلاس چار سالہ سہیل کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ تو وہ بنا سانس لئے ہی پی لیا۔ لیکن دوسرا گھونٹ اس سے نہ نگلا گیا۔

"سو جاؤ ـــ" انجم نے سہیل کو بھی تارا کے بازو لٹا دیا

"یہ لو بیٹے کوکب" وہ گلاس اس کے منہ کے پاس لے جاکر بولا

"یہ کیا ہے اباجی .....؟" کوکب للچا کر بولا

"شربت ہے ....." اس کی آواز رندھ گئی۔

"بہت کڑوا ہے یہ تو ـــ" ایک گھونٹ پینے کے بعد کوکب منہ بنا کر بولا

"ہا.... ں ...." اس کے منہ سے کئی سسکیاں ابھر گئیں۔ اپنے گیلے رخساروں کو ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے بولا "تمہارا باپ تمہیں روٹی نہیں دے سکتا ..... اسی لئے آج وہ تمہیں یہ کڑوا شربت پلا رہا ہے ....."

سسکیوں کو روکنے کے لئے اس نے گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اچانک اسے زہرہ کا خیال آگیا۔ فوراً گلاس اس نے اپنے ہونٹوں سے ہٹا لیا۔

"ہے نا اباجی بہت کڑوا ....." کوکب لڑکھڑاتی زبان سے بولا ..... "تم سے بھی نہ پیا..."

"نہیں بیٹے ..... تھوڑا سا تمہاری بڑی ماں کے لئے بچا لیا ہے ....." وہ کوکب کو زمین پر لٹاتا ہوا بولا "تم سو جاؤ ـــ"

"زہرہ ....." وہ اس کی نیم تاریک کوٹھری میں جاکر پکارا ـــ سو گئی .....؟"

"نہیں ـــ" زہرہ لمبا سانس لے کر بولی "تارا سو گئی کیا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا

"ہاں ـــ" انجم رو پڑا۔ "میں نے ہی اسے .... چپ کرادیا ہے ...."
"ستارا معصوم بچی کو کیوں سزا دیتی ہے ......" زہرہ تیز تیز سانس لیتے ہوئے بولی
"بچے کہاں ہیں؟ سوگئے سب؟"
"آج میں نے سب کو اپنے ہاتھوں میٹھی نیند سلا دیا ہے ـــ"
"اچھا کیا۔ جی! میرا دل ان بچوں کے لئے بہت کڑھتا ہے ـــ"
"یہ لو ـــ" انجم گلاس زہرہ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا
"کیا ہے؟" زہرہ اپنے نحیف ہاتھوں میں گلاس تھامتے ہوئے بولی۔
انجم سے بیساکھیوں کے سہارے کھڑا رہنا دشوار ہورہا تھا۔ وہ زہرہ کے پلنگ پر گر سا گیا۔
"شاید دودھ ہے ـــ" زہرہ بولی۔ "بچوں کو نہیں پلایا ...... ؟ وہ بھوکے ہیں"
"بچوں کو بھی پلایا ہے ......" انجم بدقت تمام بولا۔ "مگر یہ دودھ نہیں زہرہ! زہر ہے
...... زہر ...... !" وہ اپنے گلے میں پھنستی ہوئی سانسوں کو قابو میں کرتا ہوا بولا۔
"ہے اللہ ...... !" زہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ "تو ... تم نے ... بچوں کو
...... بھی ... یہی پلایا ہے ؟"
"ہاں زہرہ ...... !" وہ ٹوٹتی ہوئی سانسوں میں اٹک اٹک کر بولا ......
"آسمان پر ... کبھی ... ایک ... تارہ ... نہیں ڈوبتا ... صبح ہوتے ہوتے سارے
ہی تارے ڈوب جاتے ہیں ... جیسے آج میرے ساتھ ...... یہ ستارے ڈوب رہے ......
"نا ... نہیں ......" زہرہ پوری طاقت سے چلائی ... اور گلاس اس کے ہاتھ سے
چھوٹ کر دور جا گرا ـــــــ

فلک کے تاروں سے کیا دور ہوگی ظلمت شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ہوئی (ذکا)

جس کا موضوع انسان، جس کا بڑا گیان" ـــــ
وجہی نے جا بجا قرآنی آیتوں، حدیثوں اور عربی اقوال سے کام لیا ہے اور نثر کو باغ و بہار
بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایرانی، دکنی، برج بھاشا، مرہٹی، گجراتی اور دہلوی زبان کے اقوال
محاورے، ضرب الامثال، مقولے اور کہاوتوں سے عبارت کو سجا رکھا ہے۔ جس سے اسلوب بیان
میں رنگینی و دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ جگہ جگہ اردو، فارسی، دکنی کے اشعار اور برج بھاشا کے دوہے
کا استعمال کیا گیا ہے جس سے نثر میں تازگی و لطافت پیدا ہوگئی ہے۔

✶ ✶ ✶

حسین نظامی کیرانی

عزت دار آدمی

نئے تھانہ انچارج مسٹر عادل خان نے اپنے علاقہ کے ایک ہول سیل بیوپاری سیٹھ روپ چند کے گودام پر اچانک چھاپہ مار کر کروسین تیل، چینی اور ڈالڈا گھی کے ایک بڑے اسٹاک پر قبضہ کر لیا تو سیٹھ نے اپنی دیرینہ عیاری سے کام لیتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا:

"صاحب آپ نے کاہے کو کشٹ کیا، سیوک کو یاد کر لیا ہوتا۔"

"بکومت"

"غصہ تھوک دیجئے بڑا بابو، ہم تو آپ کے سیوک ہیں جو آگیاں ہو حاضر کر دوں" پھر سیٹھ نے اپنے کرتے کے داہنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر تھانہ انچارج کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک آنکھ دبا کر کہا "پورے پانچ ہزار ہیں بڑا بابو۔"

"سیٹھ تم چھپا رہے ہو۔"

"دس ہزار — پندرہ ہزار — بیس ہزار —" سیٹھ بکتا گیا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو سیٹھ روپ چند۔ سارے شہر میں کروسن تیل، چینی اور ڈالڈا کے لئے ہاہا کار مچی ہوئی ہے اور تم لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے کے جنون میں ان پر ناگ بنے بیٹھے ہو۔ تم کو اپنے کئے کی سزا ملنی چاہئے۔ بھیانک سزا۔" پھر تھانہ انچارج نے سپاہیوں کو گرجدار آواز میں حکم دیا۔ "گودام کو فوراً سیل کر دو اور سیٹھ کو ہتھکڑی لگا کر پیدل تھانہ لے چلو۔" سیٹھ نے یہ سنا تو سن رہ گیا۔ اس نے بڑی منت سماجت کی کہ اسے ہتھکڑی لگا کر پیدل نہ لے جایا جائے۔ مگر سب بے کار —

"ٹھیک ہے صاحب۔ مجھے تھانہ تک اپنی کار پر جانے کی اجازت دیجئے۔"

"نو" تھانہ انچارج عادل خان کی گرجدار آواز سنائی پڑی۔

باقی ص۶۲ پر

پروڈکشن ۸۔بی، آئی ٹیلکو ورکس، جمشید پور۔۱۰

عابدہ ریحانہ ایم۔فل



میں ناشتہ کرنے کے بعد اپنی اسکوٹر سنبھال کر چل پڑا۔ میں دراصل گھر سے کسی خاص ارادے سے نہیں نکلا تھا بلکہ آج میں نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی اور سوچا تھا کہ آج کا دن گھر پر رہ کر گزاروں گا لیکن ناشتہ کرنے کے بعد عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی اور میں اسکوٹر سنبھال یوں ہی بے مقصد گھر سے نکل پڑا۔ جب میں ہری کمان پار کر کے مین روڈ پر آیا تو بازار کی بارونق لگی بیدار ہو چکی تھی۔ کمان کی دونوں جانب پھول کی دوکانوں پر حسب معمول پھول بار سے پھول پرونے میں مصروف تھے۔ سیدھے طرف کی پھول کی دوکان کے بازو والا حلوائی شوکیس میں باسی مٹھائیوں کو بڑے سلیقے سے سجا رہا تھا۔ اور آگے بڑھا تو کیفے شاد نظر آیا وہاں اچھی خاصی رونق تھی۔ لوگ پیالی چائے کا آرڈر دیئے بیٹھے رعب سے اخبار پڑھ رہے تھے اور ٹیپ پر ڈسکو ریکارڈ بج رہا تھا۔ میں کیفے شاد کے سامنے یہ سوچ کر رکا تھا کہ میں بھی ایک کپ کافی پیتا چلوں ۔۔ لیکن موڈ نہ بن سکا۔ اس لئے ایک نظر جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ گیا ۔۔ بائیں جانب نواب صاحب کی حویلی کو جانے والی گلی کے نکڑ پر سمنٹ کے بنے ہوئے چبوترے کے درمیان لگے ہوئے پیپل کے درخت سے چسپاں پتھر پر لوگ ماتھا ٹیکے پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔ سیدھی طرف مسجد سے معصوم بچوں کے عربی پڑھنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ۔۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ ماحول ان آوازوں کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا اور آگے بڑھا تو میرے سامنے مارکٹ کی دکانیں تھیں۔ یہاں لوگ ترکاری کا بھاؤ تاؤ کرنے میں لگے ہوئے تھے ۔۔ کبھی کبھی ان کے درمیان کسی پاردن کی چیختی ہوئی آواز میں کوئی گالی بھی سنائی دے جاتی ۔۔ تو دوسری طرف لاٹری والا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ۔۔ آیئے ایک روپئے کی صورت مت دیکھئے ۔۔ لکی ڈرا قسمت آزمائیے ۔۔

کیا معلوم ایک لاکھ کی لاٹری آپ ہی کے نام اٹھ جائے ــــ اس کے اس طرح بھانے پر لوگوں کا ہجوم لاٹری کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے اس پر ٹوٹ پڑا تھا ــــ میں اس تماشے کو دیکھ کر اس سے محظوظ ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا ــــ یہاں پہنچ کر بازار کی رونق ختم ہوگئی تھی اب یہاں سے پل کا قدرے سنسان راستہ شروع ہوگیا تھا ــــ ٹریفک تو ابھی خاصی تھی لیکن گڑبڑ، ہاؤ ہو کی آوازیں نہ تھیں ۔ البتہ پل کے دونوں طرف بنے ہوئے فٹ پاتھوں پر بیٹھی ہوئی زندہ لاشیں اپنے بے جان ہاتھ آگے بڑھائے صدائیں دے رہی تھیں ــــ "کچھ دے دو بابو جی" ــــ "اللہ کے نام پر مائی" "دو دن سے بھوکے بچے ہیں ــــ" "روٹی کے چند ٹکڑے مائی" بھیک مانگنے والوں میں کچھ اپاہج اور چند عورتیں تھیں ــــ میں کچھ حقارت اور کچھ بے اعتباری سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا ــــ ارے یہ بھی لوگوں کو خوب بے وقوف بناتے ہیں ۔ کیا محنت مزدوری نہیں کر سکتے ۔ اس طرح بھیک مانگتے ہوئے ان کو شرم بھی نہیں آتی ادھر ۔ لیکن جوں ہی میری نظر نقاب پوش عورت پر پڑی مجھ کو اپنا خیال بدل دینا پڑا ــــ اگر یہ سماج کی زندہ لاشیں ہیں تو پھر ان میں یہ احساس کیسے زندہ ہے کہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا جائے ــــ تاکہ اپنے خاندان کی ناموس رسوا نہ ہو ــــ لوگ بیتے ہوئے اچھے دنوں کے طعنے نہ دیں ــــ نہیں ابھی یہ پوری طور پر فنا نہیں ہوئے ــــ ابھی ان میں زندگی اور اچھے برے کا احساس باقی ہے ــــ کیا ان کو اس بے حسی کے دلدل سے نکالا جا سکتا ہے ــــ کیوں نہ میں ان ہی سے یہ سوال کروں کہ تم لوگ بھیک مانگنے کی بجائے محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے ہیں ۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اپنی اسکوٹر کو فٹ پاتھ کے کنارے پر روک کر ایک نقاب پوش عورت سے دریافت کرنے لگا ــــ تم لوگ بھیک کیوں مانگتے ہو ــــ عورت نے میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا ــــ اس کی نگاہوں میں بے چارگی، شکست خوردگی، ہراسانی اور کچھ دوسروں کے لئے حقارت کیا کچھ نہ تھا ــــ گویا اس کی نگاہیں مجھ پر حقارت و نفرت کے تیر برسا رہی تھیں ــــ پھر اس نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ــــ "پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے میاں جی" "پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے" ــــ جواباً میں نے بھی اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا ــــ "اگر تم لوگ اپنے پیٹ کی آگ ہی بجھانا چاہتے ہو تو کہیں محنت مزدوری کرو اور پھر اس کی اجرت سے اپنا پیٹ پالو ــــ اس طرح بھیک مانگنا کچھ مناسب نہیں لگتا" اچانک اس میں تھرتھری ہوئی اور سسکتی ہوئی کمزور آواز میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی ــــ وہ کہنے لگی "کیا کہا محنت مزدوری کریں ــــ بابو جی یہ بات آج آپ ہم

سے کہہ رہے ہیں ۔۔۔ اور ہم نہ جانے کب سے اس زمانے سے کہہ رہے ہیں کہ ہم غریب ہیں تو کیا
شریف تو ہیں ۔۔۔ ہم کو کوئی عزت کا کام دے دو ۔۔۔ پتھر ہی اٹھوالو مگر کچھ کام دے دو
۔۔۔ لیکن ہماری کمزور آواز پر کون کان دھرتا ہے ۔۔۔ سب اپنے آپ میں مگن ہیں ۔۔۔
کبھی کسی کے دل میں رحم جاگ بھی جاتا ہے تو وہ دن کی روشنی میں دنیا کی نظروں سے
اپنے چند ٹکے ہماری ہتھیلی پر رکھ کر کبھی ہم سے ڈاکہ ڈلواتے ہیں تو کبھی چوری کرواتے ہیں
رت کی زبان سے یوں حقائق کو بے نقاب ہوتے دیکھ کر میری نظریں شرمندگی سے جھک
تا ۔۔۔ عورت نے میری شرمندگی کو فوراً بھانپ لیا اور کہنے لگی ۔۔۔ ارے بابو جی
نا سنتے ہی آپ کی نظریں شرم سے نیچے جھک گئیں ۔۔۔ جب سوال کیا ہے ۔۔۔
کے ناسور کو چھیڑا ہے تو پھر کچھ آگے کی بھی تو سنو ۔۔۔ شاید آپ یقین نہیں کریں
کہ ہم نے اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کبھی نرس بن کر چوری کی ہے
بھی رات کی تاریکیوں میں ناری بن کر پیروں میں گھنگرو بندھوا کر رقص بھی کیا ہے ۔۔۔ پہلے
سے یہ رسوائی کے کام کروائے گئے ۔۔۔ پھر ہم کو نفرت سے دیکھا گیا ۔۔۔ ٹھکرایا گیا ۔۔۔
کیا گیا ۔۔۔ پیروں تلے ہماری انا، خودداری اور شرافت کو روندا گیا ۔۔۔ اتنا روندا
کہ اب ہم تقریباً اپنی شناخت کھو چکے ہیں ۔۔۔ اور آج آپ ہم سے محنت مزدوری کی بات
رہے ہیں ۔۔۔ نہیں اب ہم اس کھیل سے تنگ آ چکے ہیں ۔۔۔ ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دو ۔
۔ ہم میں کسی اور فریب کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ۔۔۔ بھیک مانگنے سے صرف ہماری انا اور
دداری ہی تو مجروح ہوگی ۔۔۔ مگر ہماری عزت و شرافت پر تو کوئی حرف نہ آئے گا ۔ وہ تو محفوظ
ہے گی ۔۔۔ میں اس نقاب پوش عورت کی تڑپتی سسکتی ہوئی آواز کے ان کلمات کو سن کر
سناٹے میں آگیا ۔۔۔ اور اس کے المیہ پر غور کرنے لگا ۔۔۔ اچانک عورت کی آواز پھر سے
میں ابھری ۔۔۔ اور میں اپنے خیالات سے چونک پڑا ۔۔۔ وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے اپنا
ال دہرا رہی تھی ۔۔۔ بابو جی ۔۔۔ بی بی جی روٹی کے چند ٹکڑوں کا سوال ہے بہت بھوک لگی
بابو جی روٹی کے چند ٹکڑے چاہئے ۔۔۔ ارے کوئی تو دے دو ۔۔۔ اب برداشت نہیں
ا ۔۔۔ مگر لگتا ہے کہ اب بھیک بھی نہیں ملے گی ۔۔۔ لوگ پڑھ لکھ کر کافی سمجھدار ہو چکے
۔۔۔ اب تو وہ بھیک جیسے کار ثواب سے بچنے کے لئے کافی وزنی دلیلیں ڈھونڈھ
لیتے ہیں ۔ ہاں اب یہ پڑھے لکھے لوگ بھیک دینا بھی ایک جرم سمجھنے لگے ہیں ۔ جس نے
بھیک مانگو وہی نصیحت کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے مگر عملی طور پر کوئی کچھ نہیں کرتا ۔ لگتا ہے

پھر ایک بار ہم پر آزمائش کی گھڑی آنے والی ہے — اس انقلابی زمانے میں ایک
پھر ہم ہی کو ہارنا پڑے گا — پھر ایک بار ہم اپنے آدرشوں کو باندھ کر رکھ دیں گے آ
اب بچارہ ہم سے ہماری شخصیت اور ہماری انا وخود داری سے کھیلو — آؤ آگے بڑھو
تم لوگ تو اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہو پھر جھجک کیسی، ہاں ہاں کھیلو — اب
ہماری شخصیت سے کھیلو — اب ہم سے بھوک برداشت نہیں ہوسکتی — روٹی کے چ
کے لئے ہم ہر رسوا کن کام — چوری — ڈاکہ — فریب — مکر — ناچ گانا سد
کرنے کے لئے تیار ہیں — ہم کو کیا فرق پڑتا ہے — روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے ت
کھو گے ہم وہی کریں گے — ہم نہ تو نر ہیں اور نہ ہی ناری — ہم تو صرف ایک کچلی ہوئی رو
ہاں بھوکی، پیاسی۔ صدیوں سے سسکتی، تڑپتی ہوئی ایک روح، ایک عہد — ایک سما
ایک صدی — نہیں نہیں بلکہ کئی صدیوں، کئی سماجوں اور نہ جانے کتنے ہی عہدوں کی کچ
روح — صرف روح — اور اس روح کا ایک ہی سوال ہے — روٹی — روٹی کے چ
وہ عورت آہستہ آہستہ کہے جا رہی تھی — اور اس تلخ حقیقت جس کو ہم روز پاپ
ریڈیو اور ٹی۔ وی کی صداؤں کے درمیان دبا دینا چاہتے ہیں، فرار حاصل کرنا چاہتے
تھے اس کو یوں کھلم کھلا سر بازار سن کر میری حالت عجیب سی دگرگوں ہونے لگی اور میں ا
طور پر بغیر سوچے سمجھے اپنے جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ بھی میرے ہاتھ لگا — پتہ
وہ سو کا نوٹ تھا یا پچاس کا، اس عورت کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ کر فوراً پلٹ گیا
اسکوٹر اسٹارٹ کرنا ہی چاہتا تھا کہ وہ عورت میری پشت پر آ کھڑی ہوئی اور بو
لگی — کام کیا ہے بابوجی — کام کے بارے میں بھی تو کچھ بتلاتے جائیے۔ نوٹ اس
ہاتھ میں مضبوطی سے بھینچا ہوا تھا — میں اس کی طرف کوری نظروں سے دیکھتا ہوا بِ
کوئی جواب دیئے اسکوٹر آگے بڑھا لے گیا۔ میں پیچھے مڑ کر اس رہگذر کی طرف دیکھنا
چاہتا تھا کیونکہ اس رہگذر پر ایک تلخ حقیقت کھڑی میرا منہ چڑا رہی تھی اور مجھ کو ایسا محسوس
تھا کہ میں ہی اس کا مجرم ہوں — اور وہ کوئی زندہ عورت نہیں بلکہ اپنے عہد کی بھٹکی ہوئی
روح ہے جو ہم جیسے سماج کے مجرموں کو تلاش کر رہی ہے اور بہت دور تک اس روح
زخمی قہقہے میرا پیچھا کرتے رہے اور جیسے جیسے اس کے قہقہے کی آواز بلند ہو رہی تھی مجھے
محسوس ہو رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس قہقہے کی آواز میں کئی اور آوازوں کا اضافہ ہوتا ہی جا رہا
اور پھر آخر کار اس قہقہے کی آواز جو مجھ کو اگلے موڑ پر سنائی دی اس میں ایک مجمع کے قہقہوں کی آواز تھی۔

علی بن ایاز

[illegible]

۱۔ اسٹالن سخت گیر اور کم آمیز ہونے کے باوجود طنز و مزاح سے بھی محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

مشہور امریکی صحافی جان گنتھر ایک دفعہ روس گیا اور کریملن میں اسٹالن سے ملاقات کی۔ اسٹالن نے اس سے پوچھا کہ امریکی اس کے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں۔ گنتھر نے جواب دیا کہ آپ کے متعلق امریکہ میں عجیب قسم کے لطیفے مشہور ہیں۔ پوچھا۔ مثلاً۔ گنتھر نے جواب دیا کہ امریکہ میں مشہور ہے کہ اسٹالین کے سر میں جوئیں ہیں۔ کسی قسم کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ اسٹالن نے پوچھا: امریکہ نے میرے سر کی جوؤں کا کچھ علاج بھی تجویز کیا ہے یا نہیں؟ گنتھر نے جواب دیا: امریکہ کی تجویز ہے کہ آپ اپنا دیسی علاج کریں۔ امید ہے صد فی صد کامیاب رہے گا۔ اسٹالن نے پوچھا۔ وہ دیسی علاج کیا ہے؟ گنتھر نے جواب دیا: اشتراکیت۔ سر میں اشتراکی نظام رائج کریں۔ ایک ایک جوں غائب ہو جائے گی۔

۲۔ ایک دوسری ملاقات میں اسٹالن نے گنتھر سے پوچھا "تم کس راستے سے روس آئے ہو؟" گنتھر نے جواب دیا "میں فن لینڈ سے آیا ہوں"۔ اسٹالن نے دریافت کیا "راستے میں کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا؟" کہا "ہاں! ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ خرگوش ہزاروں کی تعداد میں روس سے بھاگ کر فن لینڈ میں داخل ہو رہے تھے"۔ اسٹالن لطیفے کی تہ تک پہنچ گیا۔ ذرا گنتھر کو طول دینے کی غرض سے پوچھا کہ "بھاگنے والے خرگوشوں نے فرار کی کوئی وجہ تو بتائی ہوگی!" گنتھر نے برجستہ کہا "وہ بھاگے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اسٹالن نے زیبروں کو روس سے نکل جانے کا حکم دیا ہے"۔ میں نے ان سے کہا "تم خرگوش ہو تمہیں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے؟" خرگوشوں نے چڑ کر کہا "بات یہ ہے کہ ہم خرگوش ہیں زیبرے نہیں، ہم سے تو کہتے ہو، ذرا اسٹالن سے بھی کہہ کر دیکھو"۔

اسٹالن زیر لب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

۳۔ جنگ عظیم دوم کے دوران یالٹا (Yalta) میں روس کے اسٹالن، امریکی صدر روزولٹ اور وزیر اعظم برطانیہ سر ونسٹن چرچل کی کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے بحث و مباحثہ کے بعد روس، امریکہ اور برطانیہ کے سربراہ رات میں مئے نوشی کے دوران پرلطف گفتگو کرتے رہے۔ روزولٹ اور چرچل کی کوشش تھی کہ اسٹالن کو اتنا پلا دیں کہ وہ مدہوش ہو جائے۔ چنانچہ دور جام اسٹالن کے لئے المضاعف کیا جاتا رہا۔

باتوں باتوں میں چرچل نے کہا "میں نے آج ایک خواب دیکھا ہے" روزولٹ اور اسٹالن اس کی صورت دیکھنے لگے۔ سوالیہ انداز میں مسٹر چرچل کہتے گئے "کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عالمی حکومت قائم ہوگئی ہے اور میں اس کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس کا نظم و نسق چلا رہا ہوں"۔

مسٹر روزولٹ نے پنجہ میر چھکا پھینکا۔ "میں نے بھی خواب دیکھا ہے۔ دیکھ رہا ہوں کہ عالمی حکومت قائم ہے اور میں اس کا صدر بنا ہوا ہوں"۔

پھر یہ دونوں، صدر اور وزیر اعظم اسٹالن کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ جو مدہوشی کی حد تک نشہ میں دھت ان کی باتیں سن کر جیسے چندھیائی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، پھر اس انداز سے جو متانت کا آئینہ دار تھی کہنے لگا "مجھے یاد نہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے تم دونوں کا ان اہم اسامیوں پر تقرر کیا ہے"۔

۴۔ سر ونسٹن چرچل کے ایک مداح نے ان سے پوچھا "کیا اس بات سے آپ کو خوشی محسوس نہیں ہوتی کہ جب آپ آڈیٹوریم میں تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو سارا ہال سامعین سے بھر جاتا ہے؟"

"کیوں نہیں!" چرچل نے جواب دیا "لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہوتا ہے اگر تقریر کرنے کی بجائے کسی دن مجھے پھانسی پر چڑھایا جاتے تو تماشائیوں کا مجمع اس سے کئی گنا زیادہ ہوگا"۔

۵۔ دارالعوام کی ایک خاتون نے گرج کر کہا "جب مردوں کو کوئی بات اچھی کہی جائے تو وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں"۔

ایک مرد رکن جھٹ اٹھ کھڑے ہوئے اور برجستہ کہنے لگے "جب عورتوں سے کوئی راز کی بات کہی جاتی ہے تو وہ دونوں کانوں سے سنتی ہیں مگر منہ سے نکال دیتی ہیں"۔ ★★★

رباعی

دنیا کی ہوس دل سے نکالی نہ گئی　　فردوس میں گھر کے لئے جا لی نہ گئی
عیش و طرب دہر کو سب کچھ سمجھا　　افسوس مری خام خیالی نہ گئی

تاج کریم نگری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نہرو کا ایک یادگار استقبالیہ

خدابخش اورینٹل لائبریری کے خبرنامے سے

برصغیر کے طول و عرض میں مشہور مصنف سبط حسن مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اختر رائے پوری کی علی گڑھ کی زندگی کا بیان کرتے ہوئے نہرو کی تاریخی وزٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ تذکرہ خدابخش لائبریری ماہنامہ 'افکار' کے اختر رائے پوری نمبر میں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"ہمارے زمانے میں علی گڑھ کی فضا خاصی لبرل تھی۔ وہاں عقل و خرد ہی کا سکہ چلتا تھا۔ اساتذہ عموماً روشن خیال اور فراخ دل تھے۔ پروفیسر حبیب، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر عبد العلیم، پروفیسر محمد شریف، پروفیسر حیدر خان، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ہادی حسن کسی کو بھی مذہبی جنون نہیں ستاتا تھا۔ اور طلبہ بھی وہی مقبول تھے جو ملک کے سیاسی، سماجی مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے۔ یونیورسٹی کی فضا کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک بار جب ہم لوگوں نے پروفیسر محمد حبیب کے کہنے سے پنڈت جواہر لال نہرو کو یونیورسٹی میں تقریر کی دعوت دی تو سر راس مسعود وائس چانسلر، ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے آئے۔ ان کو اپنی کوٹھی پر ٹھہرایا اور جلسے کی صدارت کی۔"

نہرو کی اس تاریخی وزٹ کی تفصیلی کہانی اختر رائے پوری نے اپنی خود نوشت "گرد راہ" میں بڑے لے کر سناتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"ہندوستان کے سیاسی ذہن کو بین الاقوامی مسائل سے روشناس کرنے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش قدمی کی۔ ۱۹۳۳ء میں ڈیرہ دون جیل سے رہا ہو کر وہ فاشیزم کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ ان کے ہم نوا تو ہم تھے ہی، اب ان کے دیدار کے مشتاق بن بیٹھے۔ ۱۹۳۴ء کا آغاز تھا کہ اخباروں نے ان کا پروگرام شائع کیا جس کے مطابق فلاں تاریخوں میں دہلی کے قیام کے بعد وہ بذریعہ ٹرین علی گڑھ کے راستے الہ آباد جانے والے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی پر حکومت ہند کا کنٹرول

تھا۔ لہٰذا وہاں پنڈت نہرو کے آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے منصوبہ بنایا کہ دہلی جاکر پنڈت نہرو سے درخواست کریں کہ سربراہ علی گڈھ کانگریس کمیٹی کے صدر ٹھاکر لکھن سنگھ کے یہاں ٹھہر جائیں۔ اور رات کے کھانے کے بعد پروفیسر حبیب کے دولت کدہ پر ہمیں نصیحت فرمائیں اسے جرأتِ طفلانہ سے زیادہ کیا کہا جائے، مگر حبیب صاحب نے بڑے جوش سے اس تجویز کی تائید کی، کیونکہ سب سے زیادہ وہی پنڈت جی کے گرویدہ تھے۔ بس یہ منصوبہ بناکر سبط حسن کے ہمراہ میں دہلی چل پڑا۔ اور پنڈت جی کو ڈاکٹر انصاری کے گھر سے ڈھونڈھ نکالا۔ ہم نے بڑی سادگی سے اپنے تعارف میں کہا کہ "ہم علی گڈھ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور ملتجی ہیں کہ کل سہ پہر کی ٹرین سے الہ آباد جاتے ہوئے رات بھر علی گڈھ ٹھہر جائیں، تاکہ ہماری جماعت آپ کی صحبت سے فیض یاب ہو سکے"۔ پنڈت نہرو اور ڈاکٹر سید محمود ہم سے خندہ پیشانی سے ملے، آپس میں مشورہ کیا اور حامی بھر لی۔ چنانچہ ہم نے فون کے ذریعہ یہ اطلاع ٹھاکر لکھن سنگھ اور حبیب صاحب کو دے دی۔ مگر ادھر جب ڈاکٹر انصاری نے فون پر وائس چانسلر کو یہ ماجرا سنایا تو ان کے تعجب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم سر راس مسعود کی عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر نہ ہونے دی۔ ہمیں اس واقعے کی خبر نہ تھی۔ لہٰذا جب ٹرین علی گڈھ پہنچی اور ہم نے کانگریس کے رضاکاروں کی بجائے طلبا کا ہجوم دیکھا اور لاغر اندام لکھن سنگھ کی بجائے بھاری بھرکم راس مسعود پنڈت نہرو کے استقبال کو بڑھے تو ہوش کے طوطے اڑ گئے اور میں بھیڑ میں اس طرح گم ہو گیا، گویا مہمان گرامی کا ہم رکاب تھا ہی نہیں۔ آن کی آن میں سر راس مسعود اور ان کی بیگم، پنڈت جی اور ڈاکٹر محمود کو موٹر میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور میں کف افسوس مل ہی رہا تھا کہ اعلان ہوا کہ رات کے نو بجے اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوگا۔ وقت سے پہلے میں احباب کے ساتھ کرسیٔ صدارت کے پیچھے مورچہ جماکر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا کہ جانے اب پنڈت جی سے آنکھیں چار ہوتی ہیں یا نہیں اور یونیورسٹی کے حکام اس کرتوت کی کیا سزا دیتے ہیں۔ پنڈت نہرو پہلی بار علی گڈھ آئے تھے۔ اس لئے سردی کے باوجود ان کے مداح اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اور باہر بھی سینکڑوں لوگ جگہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جلسے کی صدارت سر راس مسعود نے کی اور موقع کے لحاظ سے پنڈت نہرو نے ادھر ادھر کی باتیں کرکے سب کو رخصت کر دیا۔

جب صاحب صدر اُن کے لئے راستہ بنانے آگے بڑھے تو میں نے موقع غنیمت جانا اور

پنڈت جی سے کہا۔ "آگے بڑی بھیڑ ہے، پیچھے کے راستے نکل چلیں"، وہ میری بات میں آگئے اور ہال کے دریچے کو پھاند کر ہم سرسید ہوسٹل کے تاریک برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن وہیں روش پر ایک موٹر نظر آئی جس کے سامنے اوورکوٹ پہنے کوئی کھڑا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پنڈت جی کے ساتھ بالکل سے موٹر میں بیٹھ گیا۔ شخص نامعلوم نے پوچھا، کہاں جائیے گا، میں نے جواب دیا، پروفیسر حبیب کے گھر۔ موٹر جب میدان کی تاریکی سے نکل کر سڑک کی روشنی تلے گزری تو ڈرائیور کے رخ انور پر نظر پڑی اور مجھ پر اختلاج کا دورہ طاری ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ارے یہ تو پروفیسر شریف (میاں افتخار الدین کے خسر) اور یونیورسٹی کے نامی گرامی استاد تھے۔ میں راستے بھر فکر مند رہا کہ کس بری گھڑی پنڈت نہرو کو بلانے کا منصوبہ باندھا اور اس سے کیا حاصل ہوا؟ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان پر بھرم کھلے، اس لئے اپنی گستاخی کی معذرت بھی نہ کی۔ ذرا دیر میں حبیب صاحب کے گھر پہنچے تو وہ چند لوگوں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ دیر تک سیاستِ عالم پر گفتگو ہوتی رہی اور جب پنڈت جی چلے گئے تو حبیب صاحب نے مجھے گلے لگا کر کہا کہ تم قول کے صادق ہو۔ کوئی باور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جواہرلال یونیورسٹی اس طرح آئیں گے۔

ہمارے لئے تو یہ مذاق رہا لیکن خمیازہ سر راس مسعود کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ ۱۹۳۵ء میں جب ان کے عہدے کی میعاد ختم ہوئی اور وہ دوبارہ انتخاب کے امیدوار ہوئے تو حکومت ہند نے ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور انتخاب ہار کر وہ وزیر تعلیم کے عہدے پر بھوپال چلے گئے جہاں چند سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

نہ کر شمار کہ ہر شے گنی نہیں جاتی
یہ زندگی ہے حسابوں سے جی نہیں جاتی

یہ نرم لہجہ، یہ رنگینیٔ بیاں، یہ خلوص
مگر لڑائی تو ایسے لڑی نہیں جاتی

پھسلتے پانی میں اونچائی کی تلاش فضول
پہاڑ پر تو کوئی بھی ندی نہیں جاتی

فضل تابش

کیوں مرا ساتھ چھوڑے جاتے ہو
راستہ رہنما نہیں ہوتا

اپنا دل بھی ٹٹول کر دیکھو
بے سبب فاصلہ نہیں ہوتا

سعادت وسیم

اختر اورینوی کی یاد

(ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ کے مجلہ سے)

ادارۂ تحقیقات اردو (قائم کردہ قاضی عبدالودود) کے تیسرے ماہانہ جلسہ میں جو اختر اورینوی کی یاد کے لئے وقف تھا عابد رضا بیدار صاحب اور احمد یوسف صاحب نے تحریری شکل میں اور پروفیسر محسن، جناب فضل احمد، بیگم شکیلہ اختر، بیگم ریاست حسین، جناب غلام سرور، جناب بے تاب صدیقی جناب ظہیر صدیقی اور جناب عبدالمعز منظر نے زبانی اپنے خیالات پیش کئے۔

" اختر صاحب جو نظر آتے تھے وہ نہیں تھے، اختر صاحب کے اندر کا فن کار باہر کے کنٹرمبلغ سے مستقل ستیز میں رہا، نتیجہ میں فن کی پیش کش کے وقت فن کار بیرونی شخص پر غالب آجاتا، اور سماجی رویہ اور رد عمل میں بیرونی شخص اندرونی شخص پر حاوی آجاتا۔ یہ فن کار اختر اورینوی اور سماجی اختر اورینوی کی آویزش بڑی تفصیل کے ساتھ اختر صاحب کے ناول 'حسرت تعمیر' کے تجزیاتی مطالعہ سے واضح ہو جاتی ہے۔ جب جا بجا یہ کیفیت ملتی ہے کہ ؎ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'! "

ان جملوں سے اس اورینوی یاد بسود محفل کا آغاز ہوا جو ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے ۲۷ ستمبر کو برپا کی۔ یہ جملے عابد رضا بیدار کے مقالے کی شروعات تھیں جو محفل میں فرض کفایہ کے طور پر پیش کیا گیا۔

مقالہ نگار کا تھیسس یہ تھا کہ فن کار اختر بیرونی اختر سے مختلف شخصیت تھی ——— اور یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا اندرون خود اپنے اوپر پوری طرح روشن نہیں ہو پاتا کہ شعوری طور سے وہ اپنے اعمال کو ایک خاص موڑ، ایک خاص رنگ، ایک خاص چھاپ دیتا ہوتا ہے جب کہ اس کا اپنا تحت الشعور اسے بالکل دوسرے رخ پہ لے جاتا ہوتا ہے؛ کہ یہ عمل حساس اور جذباتی لوگوں میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور یہ کہ فنکار تو کوئی فنکار ہی نہیں اگر وہ حساس نہ ہو، جذباتی نہ ہو ——— اور اس سے کم ہی کوئی انکار کر سکے گا کہ اختر صاحب فن کار نہیں تھے۔۔

فن کار شخص اور سماجی شخص کی آویزش کے ثبوت میں عابد رضا بیدار نے ناول

حسرت کمیر نے چند نکتوں کی طرف اشارہ کیا :۔۔۔۔۔ (۱) مذہب کے حقیقت پسندانہ تصور کے مقابلے میں اختر صاحب کا مذہب کے روحانی تصور پر زور (۲) عملی زندگی میں مسلم لیگ کی طرف رجحان ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگ کے "اکھڑے پن" سے بیزاری اور کانگریس کی "نتہ داری" کی ستائش کانگریس کی "سیاسی مسائل کے ساتھ سماجی اور اقتصادی مسائل کی طرف توجہ" سے اس کی طرف غیر مشروط طور پر کشش (۳) ساری عمر یک زوجی ہونے کے باوجود اس پر اصرار کہ "میں ایک سائنس داں کی طرح دوسرا تجربہ چاہتا ہوں ۔ شاید میں اس سے محبت کرنے لگوں یا وہی مجھ سے محبت کرنے لگے" (۴) اقبال سے شدید لگاؤ کے باوجود اقبال کی "تازہ الہام" سے بڑی محرومی کے لئے اظہار ہمدردی کہ "مذہب کے صالح ارتقا کے لئے تقوی اور تازہ الہام کی ضرورت ہے ؛ تازہ الہام سے محبت اور یقین کی پیدائش ہوتی ہے ۔ اقبال اس سے محروم تھے ۔" (۵) معاشرتی انسان کی حیثیت سے معتدل اور نرم دل ہونے کے باوجود ان کا یہ نظریہ کہ "آزادی بلا مشین کے آہی نہیں سکتی" کہ "ہندوستان کو ایسے مردان انقلاب کی ضرورت ہے جو ملک میں صنعتی انقلاب برپا کردیں" (۶) اسلام کو بطور نظام حیات اپنانے اور اس کے لئے پرجوش تبلیغ کرتے رہنے کے باوجود لکایک اُبل پڑنا کہ : "بھوک سے آزادی ، افلاس سے آزادی ، دکھ درد سے آزادی ؛ جہالت سے آزادی ، بیماریوں سے آزادی ، جب تک یہ آزادیاں حاصل نہ ہوں محض سیاسی آزادی ایک سوانگ ہے ۔" (۷) کمیونسٹوں سے عملی زندگی میں بیزاری بیزاری کے باوجود آدی باسیوں کے ہیرو برسا یا منی کے لئے پورا ایک 'قصیدہ' اور پھر اسی لے میں کیفی اعظمی کے مصرع

بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا

میں گویا گرہ لگانا کہ :۔ "انھوں نے نسلوں کی عرق ریزی سے جنگلوں کو صاف اور ڈھلوانوں کو تراش کر کے دھان کے کھیت بنائے اور پہاڑی ندیوں اور چشموں اور جھرنوں کو پاٹ کر کے آبپاشی کا سامان مہیا کیا ، حریص نگاہوں نے دامن کوہسار میں بھی ان بے چاروں کو پناہ نہ لینے دی ۔ زبردستی ان کی زمینوں پر قبضہ جمایا ، بنیوں نے سودی قرضوں کا جال بچھایا مقدمہ بازی میں پھنسا کر ان کے املاک چھین لئے اور زمینداری کی بنا ڈالی ۔ اصلی مالکوں کو رعیت بنا ڈالا لگان میں ظالمانہ اضافے کئے اور اُن کے گلوں میں بیگار کی لعنت کا طوق ڈال دیا۔" (۸) عملی سیاست میں تحفظات کے لئے گرم جوشی دکھانے کے باوجود اصل خیالوں کا یہ اظہار کہ: "پسماندہ قوموں کے لئے حفاظتی اور ترجیحی قوانین مضر ہوتے ہیں ۔ اس مربیانہ کارروائی کی وجہ سے رفتہ رفتہ قومیں ناکارہ ہو جاتی ہیں ۔ اپنی حفاظت آپ نہیں کرسکتیں اور جہد للبقا کے قابل قطعاً نہیں رہتیں۔

اس لئے تدریجی طور پر دس سال کے عرصے میں ان کو ترقی یافتہ قوموں کے برابر حیثیت دی جائے سارے ترجیحی اور حفاظتی قوانین آہستہ آہستہ منسوخ کر دئے جائیں تاکہ ان کو صحت مندانہ ما میں ترقی کا موقع حاصل ہو جائے۔"

مقالہ میں اس خاص تجنیس کے علاوہ اختر اورینوی کی دانشوری، ان کے ناول کی فنکار حیثیت اور نوعیت، ان کی لفظ تراشی ("ارضیہ") ناول کی علاقائی اہمیت، ناول کے تقاضا فردوس بریں کا منفی اثر، میدان عمل کا صرف نام کا اثر اور خوبیاں خامیاں ان سب امور پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی۔

دوسرا مقالہ احمد یوسف صاحب نے پیش کیا جو اختر اورینوی کی زندگی کے آخری دور میں لکھا تھا۔ یہ شخص اور فنکار کا ایک خاکہ تھا۔ (اس خاکے کی اہمیت کے پیش نظر اسے تمام و کمال الگ پیش کیا جا رہا ہے)

پروفیسر محسن نے اختر صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا "اختر میرے گہرے بھی تھے، ساتھی بھی، حقیقی خالہ زاد بھائی بھی، میں ان سے ۲۲ دن بڑا ہوں۔ اس نسبت سے وہ مید لحاظ بھی کرتے تھے لیکن اس لحاظ کے باوجود وہ مجھ سے جتنے بے تکلف تھے اتنا شاید کم ہی کسی دوست رہے ہوں۔ اسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بیک وقت بہت زیادہ ریشنل تھے اور بہت زیادہ جذباتی بھی

بیگم شکیلہ اختر نے کہا۔ ناول کے کئی کردار ہوتے ہیں کبھی ناول نگار کسی ایک کے ذ اپنا اظہار کرتا ہے کبھی کسی دوسرے کے ذریعہ۔ کوئی ایک ما تھ پیس ہو تو بھی ضروری نہیں کہ فن کار اپنا اظہار اسی کے ذریعہ کرے۔ حسرت تعمیر کا مطالعہ کرتے وقت یہ امر پیش نظر رکھنا ہوگا۔

فضل احمد صاحب (اختر صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی) نے ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:— اختر صاحب کی شخصیت میں ایک کانفلکٹ (آویزش / کشمکش تھی یہ صحیح ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں خطرناک ٹائیفائیڈ ڈاکٹری کے چوتھے سال میں ٹی بی، اسی زمانہ والدہ کی موت جب وہ صرف ۱۴ سال کے تھے، بی۔ اے آنرز میں سل کی بیماری پھر سینی اور یہ جو عرصے صحت مند پھر جوڑوں کے مریض ـــ اور آخر میں بنگلہ دیش کا قتل عام جس نے انھیں تین ایک پل کے لئے سونے نہ دیا، اور اس بے خوابی کے سبب وہ اس خطرناک مرض میں مبتلا ہو ـــ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انھوں نے کہا :- کانگریس، لیگ وغیرہ سلسلے کی بات کی وضا کروں کہ اختر صاحب پر شروع میں جے پی اور نہرو دونوں کا اثر تھا مگر ۴۶-۴۷ء تک نہرو کا ختم ہو چکا تھا اور آخر میں جے پی نے احمد آباد کے ۶۹ء کے فسادات کے بعد جو خیالات ظاہر

زبان سے جو امیدیں تھیں وہ ختم ہو گئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ احمدیہ جماعت وہ تنہا مسلم جماعت تھی جو مسلم لیگ کے ساتھ تھی اور اس سلسلہ میں بات کا ایک قسم کا ڈائریکٹیو تھا جس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔

اقبال پر ان کی جس تنقید کا ذکر ہوا دراصل اس پر اختر صاحب سے پہلے تیج بہادر سپرو اور نیاز فتحپوری بھی تنقید کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں اختر صاحب کی بہت سی چیزیں ہیں جو شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اردو کے لئے دیوناگری لپی کی ایک بار بات چلی تو انھوں نے بڑی بیباکی سے کہہ دیا، پہلے یہ مشورہ عرب کی زبان لکھنے والوں کو دیجئے اس کے بعد اردو والوں سے کہیئے۔

غلام سرور صاحب نے کہا:— اختر صاحب کا سیاسی موقف واضح تھا۔ انھوں نے ذاتی طور سے صوبہ سرحد کی رائے شماری میں حصہ لیا تھا آسام کی رائے شماری میں حصہ لیا تھا، لیکن وہ سیاسی آدمی نہیں، تہذیبی آدمی تھے۔ اور جب ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کا نام لینا اور پاکستان کا گن گانا دونوں برابر تھے جب اردو کا نام لینے سے لوگ کتراتے تھے اس وقت وہ چند لوگ جو اردو کا جھنڈا لیکر آگے بڑھے ان میں سب سے لانبا قد اختر اورینوی کا تھا۔ اس وقت انھوں نے ہوشمندی سے کام لیا اور فیصلہ کیا کہ اقتدار میں جو پارٹی ہو اس سے جھگڑا کرکے اردو کا حق لینا شاید ممکن نہ تھا۔

جناب صدیقی صاحب نے کہا:— ہم کانگرس میں تھے اور سرور صاحب مسلم لیگ میں لیکن اردو کے سلسلے میں ہم دونوں ایک تھے اور اختر صاحب اردو کے سلسلے میں ہم دونوں کے ساتھ تھے۔ اختر صاحب کا خیال تھا کہ اب ابوالکلامی اردو اور نیاز فتحپوری اردو کے بجائے ہندوستانی اردو چلے گی۔

پروفیسر محسن صاحب نے کہا:— اختر ایک مفکر تھے، خاص کر ایک صحافی دانشور کی حیثیت سے وہ جس درجے کے مستحق ہیں وہ انھیں ابھی نہیں ملا ہے۔ معاصر میں ان کی "گزارش" کالم اس سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اختر کی صحافتی دانشوری پر ہمارا ایک تفصیلی مضمون چھپ چکا ہے۔ معاصر میں ان کے یہ اداریے چلتے رہتے تو اردو میں بڑے قیمتی عنصر کا اضافہ ہوتا لیکن کلیم الدین احمد صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، حسن عسکری صاحب نے انھیں معاصر میں چلنے نہیں دیا ورنہ اختر کسی طرح نگار کے نیاز فتحپوری سے کم نہ ٹھہرتے۔

ظہیر صدیقی صاحب نے کہا:— اختر صاحب دانشور تھے یا نہیں اس کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن بیدار صاحب کا یہ کہنا کہ ایک دانشور کو نان کمیٹڈ ہونا چاہیئے ہم صحیح نہیں مانتے۔

عبدالمعز منتظر صاحب نے کہا :—— ظہیر صدیقی صاحب صحیح کہتے ہیں۔ بلکہ ہمارے یہاں دانشوروں کے لئے کوئی نہ کوئی عقیدہ ضروری ہے چاہے وہ دہریت ہی کا عقیدہ ہو۔

غلام سرور صاحب نے کہا :—— ۳۰ر جنوری ۴۸ء کو خبر آئی کہ گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا۔ اختر صاحب مسلم ہوسٹل کے وارڈن تھے اس کے سامنے لان میں آ گئے اور اس وقت تک روتے رہے جب تک یہ اعلان نہ ہو گیا کہ گاندھی جی کو مارنے والا ناتھورام گوڈسے ہے اور یہ اعلان پہلے بی۔بی۔سی سے ہوا۔ جواہر لال نہرو نے صرف اتنا کہا کہ ایک پاگل آدمی نے۔ ناتھورام گوڈسے کے نام کا اعلان سردار پٹیل نے کیا۔

مسز ریاست حسین نے کہا :—— جی ہاں جی ہاں، اور یہ اعلان سردار پٹیل نے پنڈت جی کے کہنے پر ہی کیا تھا۔ آج کل جو ٹی۔ وی سیریل آرہا ہے اس میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ پنڈت جی کا خیال تھا کہ اگر وہ اعلان کریں گے کہ قاتل ناتھورام گوڈسے ہیں تو کوئی یقین نہیں کرے گا اور سردار پٹیل کے اعلان کو کوئی جھوٹ نہیں سمجھے گا۔ اس لئے انھوں نے بہت سوچ بوجھ کر اعلان کا کام ان کے سپرد کیا تھا۔

اختر صاحب ہر تہذیب کے ہر رنگ کے قدرداں تھے۔ وہ ہم سے کہا کرتے تھے کہ "میں قدرداں ہے کہ تامیوں کر آپ اتنے عرصے سے بہار میں ہیں مگر آپ نے لکھنؤ کا لہجہ چھوڑا نہیں"

غلام سرور صاحب نے آخر میں کہا :—— ادارہ تحقیقات اردو کے بانی قاضی عبدالودود صرف بڑے محقق ہی نہیں تھے، بہت اچھے انسان بھی تھے۔ ایسے آپ ان کے خیالات سے اختلاف بھلے ہی کریں ان کی ایمانداری اور دیانت داری پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ اختر اورینوی صرف ناول نگار اور افسانہ نگار ہی نہیں تھے وہ ایک انسان بھی تھے۔ ہم کہ آج اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

وہ نگاہِ مستانہ کچھ جھکی سی جاتی ہے — میری بیخودی شائد آ گئی ہے [illegible]
سرد ہو گیا شائد سوزِ قلبِ پروانہ — آج شام ہی سے کیوں شمع بجھ گئی
جرأتِ محبت پر مجھ کو خود ندامت ہے — زندگی میں انساں سے چوک ہو ہی جاتی ہے
اس نے ایک دن آ کر مسکرا کے دیکھا تھا
وہ گھڑی محبت کی روز یاد آتی ہے

جناب دلاور فگار موجودہ دور کی اردو طنزیہ شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تین سال قبل حیدرآباد کے نمائش گراؤنڈ میں منعقدہ "ادبی ٹرسٹ" کے مشاعرہ میں دلاور فگار صاحب نے راقم کی فرمائش پر اپنی مندرجہ ذیل نظم پڑھ کر حیدرآبادی عوام سے دادِ تحسین حاصل کی تھی۔

مصطفیٰ شروانی

موسیقی اور علاج

جناب دلاور فگار

اک محقق نے نئی تحقیق فرمائی ہے آج
فنِ موسیقی سے بھی ممکن ہے جسمانی علاج

سچ ہے یہ دعویٰ تو رخصت اے اطبائے کرام
مسہلی کو بندگی، قرصِ ملیّن کو سلام

اب تو ٹھمری میں بھی ہوگا علاجِ سائلین
الفراق اے گلِ بنفشہ، الوداع اے پنسلین

اب مداوائے مرض ہوگا نئے انداز سے
اب "ھُوَ الشّافی" کی آواز آئے گی ہر ساز سے

جو بھی ہیں قوال پورے ڈاکٹر ہو جائیں گے
صرف سازندے جو ہیں کمپونڈر ہو جائیں گے

اب اطبا بھی نظر آئیں گے شہنائی بدست
شربتِ عنّاب کی بوتل کو پیغامِ شکست

چونکہ نسخوں میں سفارش ہوگی صرف اشعار کی
صرف شاعر کو جگہ دی جائے گی عطار کی

پڑ گئے معجون میں کیڑے، خمیرہ سڑ گیا
بوعلی سینا کی امیدوں پہ پانی پڑ گیا

حضرتِ اجمل کے جادو کا اثر زائل ہوا
آدمی فیاض خاں کے آرٹ کا قائل ہوا

اس کو کہتے ہیں خدا کی دین، یہ ہوتی ہے دین
اب سول سرجن بنے گا جانشینِ تان سین

اُن کو مژدہ مبتلا ہیں جو کسی آزار میں
اب شفاخانے کھلیں گے حسن کے بازار میں

روز اخباروں میں شائع ہوں گے ایسے اشتہار
جملہ امراضِ نہاں کی ہے دوا طبلہ ستار

قبض کے مارے ہوئے بیمار کو کر دو خبر
ایک ٹھمری میں ہے اطریفل زمانی کا اثر

جملہ امراضِ نہانی کی دوائے کارگر
نغمۂ ساحر بہ آوازِ لتا منگیشکر

کیا ضروری ہے کہ پیچش کی دوا ہو اسبغول
ادویہ تو اور بھی ہیں بین، باجا، بینڈ، ڈھول

اختلاجِ قلب کی بس یہ دوا ہے آج کل
بیکل اُتساہی سے سنئے اے مری جاں اک غزل

ضعفِ معدہ ہو تو مس کجّن کی قوالی سنو
خشک کھانسی ہو تو نظمِ حضرتِ عالی سنو

اس طرح نسخہ لکھے گا چارہ سازِ نکتہ چیں
دادرا دس بار، ٹھمری دو عدد، اک بھیرویں

صبح دم مثلِ شکیلہ مشقِ قوالی کنند
خاکِ قبرِ مشتری باقی بوقتِ شب خورند

غزل

شیخ سعد حسین سعد صدیقی

کچھ فلک ظلم پہ مائل ہے خدا خیر کرے
کچھ عنایت تری شامل ہے خدا خیر کرے

سیل طوفاں کا ہے، منجدھار میں کشتی میری
جانے کس سمت میں ساحل ہے خدا خیر کرے

دل میں ہم عزم سفر لے کے نکل آئے ہیں
بیچ میں کوچۂ قاتل ہے خدا خیر کرے

آنے والے کسی طوفاں کی خبر دیتا ہے
کتنا خاموش یہ ساحل ہے خدا خیر کرے

یہ افق آگے کو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
دور کتنی مری منزل ہے خدا خیر کرے

تیغ سے قاتل ہے خفا، جھوٹ سے نفرت مجھ کو
کتنی دشوار یہ مشکل ہے خدا خیر کرے

برق و باراں بھی ہے، طوفان بھی ہے اور صرصر بھی
آشیاں ان کے مقابل ہے خدا خیر کرے

ان کی محفل میں ہے دستور زباں بندی کا
ضبط بھی آج تو مشکل ہے خدا خیر کرے

رنگ مستوں کے جدا، اور ترے تیور ہیں جدا
کچھ دگرگوں تری محفل ہے خدا خیر کرے

سعد اللہ پہ بھروسہ ہے کفن ہے سر پر
دار ہے، کوچۂ قاتل ہے خدا خیر کرے

مقام معراج، ۶۶۲، خیریت آباد، حیدرآباد

صالح بن سعید المصلی

کہا تھا کب تجھے، میرا کہا کر
جو تیرے جی میں آئے وہ کیا کر

خرام ناز ہے فتنہ بہر گام
ستمگر روز اک محشر بپا کر

بہر صورت رہے کچھ شغل جاری
وفا کے بدلے تو ہم پر جفا کر

یہاں پر جان پر اپنے بنی ہے
وہاں بیٹھے ہیں وہ مہندی لگا کر

تصور ہی ترا بہتر ہے تجھ سے
رکھا ہے جو مجھے اپنا بنا کر

رہے گا غیر کب تک ہم بھی دیکھیں
تری محفل میں ہاں میں ہاں ملا کر

خوشی ہوتی ہے ان کو دیکھو کتنی
ہماری حسرتوں کا خوں بہا کر

ارے بے مہر، او چرخ ستمگر
رلایا ہے بہت، تھوڑا ہنسا کر

ستم کچھ اور باقی ہیں تو کر لے
رکھا ہے تو نے کیوں ان کو اٹھا کر

بتوں کی زندگی کو چھوڑ حامی
ارے مرد خدا، یاد خدا کر

رباعیات

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا

غمِ تازہ کی حسیں کاہکشاں تک آؤ
نور ہی نور جہاں تک ہے وہاں تک آؤ

پیار کے دالے، محبت کے کنول، درد کے پھول
دیکھنا ہو تو مرے گلشنِ جاں تک آؤ

تم تو اپنے ہو، بھلا تم سے تکلف کیسا
بے خطر دل کے شفق رنگ مکاں تک آؤ

ہو فرصت تو گھڑی بھر کے لئے میرے ساتھ
میرے افکار کی فردوس جواں تک آؤ

روشنی کے سبھی سامان یہاں ملتے ہیں
غم فروشانِ محبت کی دکاں تک آؤ

بن سنے ہو جائے گی آسان یقیں کی منزل
گام دو گام رہِ وہم و گماں تک آؤ

جس زمیں والے نے افلاک کو رونق بخشی
اس کے قدموں کے درخشندہ نشاں تک آؤ

نظر آ جائے گی گہرائی فکرِ منشاء
اس کی تہ داریٔ الفاظ و بیاں تک آؤ

11 - اسٹارکی ٹاؤن ، ناگ پور

رازِ حیات

انور کھام گانوی

کیاں کے ساحل پہ تھا اک روز میں محوِ خرام
ذہن کو الجھن تھی کیا ہے زندگانی کا نظام

زندگی کا راز پانے قلب کو تھا اضطراب
سامنے میری نظر کے واتھی فطرت کی کتاب

موجیں سطحِ آب پر یوں کر رہی تھیں شوخیاں
جیسے بچے ماں کے سینے پر کریں اٹھکیلیاں

سطحِ دریا سے [illegible] تھے یوں حباب
جیسے دینا چاہتے ہوں میری الجھن کا جواب

ایک موج ابھری، ابھر کر جانبِ ساحل بڑھی
یوں زبانِ حال سے مجھ سے مخاطب ہو گئی

زندگی بیتابیٔ نا مختتم کا نام ہے
مہرِ ہستی کی سکوں و بے حسی ہی شام ہے

اضطراب و بیقراری میں ہے پنہاں زندگی
جنبش و جد و جہد سے ہے نمایاں زندگی

حرکتِ پیہم میں مضمر زندگی کا راز ہے
ہے جو متحرک اسی پر راہِ ہستی باز ہے

تشنۂ مضراب ہو تو ساز بے آواز ہے
چھیڑتے ہی تارِ نغمہ مائلِ پرواز ہے

توڑ دے رشتہ سکوں کا مثلِ تارِ عنکبوت
جنبش و حرکت سے دے تو اپنی ہستی کا ثبوت

چھیڑ مضرابِ عمل سے زندگی کے ساز کو
جلد ہی پا جائے گا تو زندگی کے راز کو

جلال پورہ ۔ کھام گاؤں ۔ 444303 ، مہاراشٹرا

نثار اختر انصاری

یوم آزادی

کیف و نشاط کا یہ دن
ہر سال آتا ہے ۔
نئی امنگ ، نئے حوصلے
نیا ماحول ساتھ لے کر
آزادی کی یہ نعمت
ثمرہ ہے قربانیوں کا
غریبی پر ہم نے پالیا قابو
خود کفیلی کا چل گیا جادو
لیکن فرقہ پرستی کا
چھوت چھات کا
راون آج بھی زندہ ہے
ابھی ہماری کامیابی ادھوری ہے
آزادی کا دن دعوت عمل دے رہا ہے
بُرائی مٹانے کی
منزل پانے کی

قومی یکجہتی

قومی یک جہتی عظیم ہے
بالا ہے ۔
فرقہ پرستی سے اعلا ہے
اک نور اک اجالا ہے

لیکن آج یک جہتی کا
پاکیزہ درس کسے یاد ہے ۔
قومی یکجہتی کی مقدس کتاب
الماری میں بند ہے !
فرقہ پرستی کی گرد سے آلود
دیمک اس کا وجود مٹادیں

اس سے قبل مطالعہ ضروری ہے

ایڈیٹر 'ہمہ گیر' ۔ مومن پورہ چوک ۔ ناگپور ۱۸

ستمبر ۱۹۸۶ء
جلد: ۴ شمارہ: ۳

شاداب

حیدرآباد

زرِ تعاون:

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ: 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ: 90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات: 1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیلِ زر کا پتہ:
147/5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد۔ 500004 (اے پی) انڈیا

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری
مینیجنگ ایڈیٹر: محمد کلیم الدین احسن

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل پریس چارکمان سے چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

ماہنامہ شاداب حیدرآباد — مارچ سنہ ۱۹۸۷ء

حرفِ اوّل

جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے ہندی اردو ملاپ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں فرمایا (موصوف کا انٹرویو اس شمارہ میں شریک اشاعت ہے) کہ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ ہندی ہندوستان کی عام بول چال کی زبان ہے، اس میں دوسری زبانوں مثلاً فارسی اور عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں اور جب یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اُردو ہے — نیز یہ کہ گاندھی جی دونوں زبانوں کے ملاپ کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر اسی وقت اس ہندوستانی زبان یعنی "دونوں رسم الخط (دیوناگری اور فارسی) میں لکھا جانا تسلیم کرلیا جاتا تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔

مگر ایسا نہ ہوا اور آج جو ہندی اور اردو، دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہندی ایسی سنسکرت آمیز ہے کہ ہندی والے عوام بھی اُسے نہیں سمجھ پاتے ہندی جنوب والوں کے لئے اسی لئے قابل قبول نہیں ہے کہ سنسکرت کے الفاظ بڑھا کر اسے زیادہ مشکل بنا دیا گیا ہے۔ اردو میں بھی ہندوستان کی تمام دیگر زبانوں کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی زیر استعمال ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے درمیان خلیج بڑھتی جاتی ہے اور دونوں زبانوں میں ملاپ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اردو والوں کے لئے مفید راہ عمل یہی ہے کہ اردو میڈیم اسکول میں اسٹیٹ کی زبان کو زبان اول کی طرح پڑھیں اور انگریزی کو زبان سوم کی طرح — اسی طرح اسٹیٹ لینگویج میڈیم میں اردو زبان اوّل کی طرح پڑھ لی جائے اور انگریزی زبان سوم کی طرح۔ اور دونوں صورتوں میں ہندی کو اردو کے ساتھ کمپوزٹ کورس میں پڑھا جائے۔ اس طرح اردو والوں کو کالج سے پہلے چار زبانیں پڑھ کر تھوڑی زیادہ محنت کرا[illegible]

اردو والوں میں چند شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والوں کا خیال ہے کہ اردو میڈیم سے تعلیم پاکر ہمارے بچے قومی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے اور اس تعلیم سے انھیں روزگار یا ملازمت حاصل نہیں ہوتے۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ آج کل میٹرکیولیشن کے بعد نہ کوئی روزگار ملتا ہے اور نہ ملازمت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ طلباء کو اس کے بعد بھی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے جو انگریزی میں ہوتی ہے۔ ہماری آزادی کو ۴۰ سال ہونے کو آئے لیکن آج بھی ہندی، تلگو اور مرہٹی وغیرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کالج کی تعلیم انگریزی ہی میں حاصل کرنی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان زبانوں میں تعلیم پاکر طلباء کالج کی تعلیم انگریزی میں حاصل کرسکیں

فہرست

اور اردو میڈیم والے ہی کالج کی تعلیم میں پیچھے رہیں جبکہ یہی ایک ہندوستانی زبان ہے جس میں کالج کی تعلیم کا کامیاب تجربہ ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو میڈیم کی تعلیم کے ساتھ بین الاقوامی معیار کے سائنس داں اور محقق پیدا کئے۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے طلباء اسکولی تعلیم اردو میڈیم میں حاصل کرکے کالج کی تعلیم (انگریزی میڈیم) میں پیچھے رہیں اور عصری تعلیم میں نمایاں مقام حاصل نہ کرسکیں ضرورت ہے کہ اسکولی تعلیم میں اردو بطور میڈیم یا زبان اول اختیار کی جائے ●●●

کام کر رہے ہیں، لائبریری کے ہوسٹل میں ان کے قیام کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔

خدابخش لائبریری کی ایک اور اسکیم ہے جس سے عام یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور خصوصاً تسلیم کرنے والی یونیورسٹیوں کے استاد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ اسکیم وزیٹنگ فیلوشپ کی اسکیم ہے جس میں قیام کے دوران سو روپیے روز اسکالرز کی نذر کئے جاتے ہیں تاکہ وہ خدابخش لائبریری کے مواد سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا کر اپنے ریسرچ پروجکٹ کی تکمیل کرسکیں ——— یا پھر ایک دو سال کے لئے خدابخش کے ساتھ مستقلاً منسلک ہوکر کوئی تفصیلی کام کرسکیں۔

طلبار کی اسکیم میں مختلف جگہوں سے منتخب متعدد اچھے طالب علم خدابخش فیلوشپ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اساتذہ کی اسکیم کے تحت علی گڑھ، جامعہ، کشمیر، گلبرگہ، کلکتہ، احمدآباد اور بعض دوسرے تحقیقی مرکزوں کے اسکالر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

امید ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبار کو بھی اب خدابخش لائبریری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ ✕✕✕

ضروری اطلاع

ماہنامہ "شاداب" نے اپنی زندگی کے تین سال پورے کرکے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ **شاداب** کو پسند کرتے ہیں۔ اپنی پسند کے عملی اظہار میں آپ اپنے ذمہ سابقہ زر سالانہ روانہ فرمائیں اور نئے سال سالانہ (۱۹۸۷ء) کا زر تعاون پیشگی عنایت فرمائیں۔ رقم واجب الادا بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائی جائے، **شکریہ**

منیجنگ ایڈیٹر

محمد کلیم الدین احسن

قائدِ ملت بہادر یار جنگؒ

محمد بہادر خاں ۳ر جنوری ۱۹۰۵ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ یہ ابھی سات ہی دن کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا نانی نے انھیں پالا پوسا۔ چودہ برس تک نانی کے زیر تربیت رہے۔

نانی نیک دیندار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ وہ تلاوتِ قرآن اور ادائی نمازیں بہادر خاں کے ساتھ غفلت کی روادار نہیں تھیں۔ اگر کسی دن بہادر خاں تلاوت نہ کرتے تو نانی کہتیں کہ آج تم نے اللہ سے باتیں نہیں کیں میں تم سے بات نہیں کرونگی۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ، مفید الانام اور دار العلوم میں ہوئی۔ میٹرک کا امتحان دینے سے قبل ہی سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ خانگی طور پر مولوی سعادت اللہ خاں اور مولوی سید اشرف شمسی سے عربی تعلیم حاصل کی۔ مولانا شمسی تفسیر، فقہ اور حدیث کے جید عالم تھے۔ انھوں نے بہادر خاں کے شوق و انہماک کو دیکھ کر بے حد دلچسپی سے ان علوم کی تعلیم دی۔

دس برس کی عمر میں والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اور خاندان اور جاگیر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ۵ لاکھ روپے کا کثیر قرضہ بھی اپنے شاہ خرچ والد سے ورثہ میں ملا۔ بہادر خاں ان مصائب اور حوادث سے پریشان ہوئے نہ مایوس۔ بڑے استقلال و ہوشمندی سے ایک ایک مشکل پر قابو پاتے گئے۔ بالآخر آٹھ سال کے عرصے میں قرضے سے نجات حاصل کی۔ جاگیر کے حالات درست ہوئے اور آمدنی میں بچت کی صورت نظر آنے لگی۔

اس نوبت پر اپنے منشی سے کہا: اس سال ہم زیارتِ کعبہ کا شوق رکھتے ہیں۔ منشی نے کہا حضور کو برسوں کے بعد اب ذرا سکون ملا ہے۔

دو ایک سال بعد استعفٰی فرمائیں۔
بہادر خاں نے پنشن کر لیا۔ کیا تم مجھ کو اپنی عمر کی گیارہویں دے سکتے ہو
چونکہ عزم راسخ تھا سنہ ۱۹۳۱ء میں اپنے خاندان کے اسی افراد کے ساتھ زیا
کعبہ سے مشرف ہوئے۔ اس سال حکومت کی جانب سے بھی حجاج کے قافلہ کے
بہادر خاں تھے۔
بلادِ اسلامیہ کا سفر انھوں نے چھ ماہ تک کیا۔ ان کا یہ سفر تفریحی نوعیت
نہ تھا بلکہ انھوں نے اسلامی ممالک اور مسلمانانِ عالم کی سیاسی، مذہبی، اقتصادی
اور معاشرتی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ان کی غفلت و پستی کے اسباب پر
ڈالی۔ عراق، شام، فلسطین، تل ابیب، وسط ایشیا، مصر، ترکی، ایرا
افغانستان وغیرہ کے مسلمانوں کی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا، عرب ممالک
عربوں کا انتشار بھی دیکھا، بیت المقدس میں یہودیوں کی شیرازہ بندی
سنہ ۱۹۲۷ء میں بہادر خاں نے مجلس تبلیغ اسلام قائم کی اور حیدرآباد
مختلف حصوں میں ایک ایک مبلغ مقرر کیا جس کا کام انتہائی ضبط و نظم اور
اسلامی سے اسلام کی تبلیغ کرنا اور غیر مسلموں کو مشرف با سلام کرنا تھا۔
بیل گاڑی میں مختصر سامان کے ساتھ دور دراز کا سفر کرتے اور غیر مسلموں
سامنے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور وہ جاہل مسلمان جو صرف نام کے
تھے جنھیں کلمۂ نماز سے بھی واقفیت نہ تھی ان کے سامنے ٹھیٹ دکنی
میں تبلیغ کرتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلیل عرصہ میں پانچ ہزار بےدین اور
حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔
۳۱ مئی سنہ ۱۹۳۸ء کو بمقام بمبئی آل انڈیا تبلیغ اسلام کانفرنس
اجلاس چہارم کی صدارت نواب صاحب نے فرمائی۔ اس اخبار کے
جس کرسیٔ صدارت کو ان سے پہلے مولانا ظفر علی خاں جیسے بزرگ عز
دے چکے ہیں، ان کا انتخاب ایک عزت افزائی ہے۔ نواب صاحب
اپنے خطبۂ صدارت کے آخر میں بتایا کہ: "اسلام نے تبلیغ مذہب
کبھی جبر و اکراہ کو جائز نہیں رکھا۔ قرآن صاف کہتا ہے۔ لا اکراہ فی
تبلیغ کے لئے سب سے پہلے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ سرمایہ اس لئے نہیں،

معاندین کے برخود غلط الزام کے مطابق آپ اس سے کسی کے ضمیر کو خریدیں بلکہ اس لئے کہ مبلغین کا خرچ برداشت کریں۔ قبولیت اسلام کے بعد نومسلمین کی تعلیم و تربیت کا سامان کریں اور ان پر جو مصائب و آلام آئیں ان سے ان کی حفاظت کریں۔"

تبلیغ کے لئے دوسری اہم ضرورت مخلص، سچے اور صلاحیت یافتہ مبلغین کی فراہمی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم میں کا ہر شخص مبلغ ہوا کرتا تھا لیکن آج ڈھونڈنے سے ایسے لوگ نہیں ملتے۔ جو تبلیغ کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

تبلیغ کی تیسری ضرورت مقامی مسلمانوں کی ہمدردیوں کا حاصل کرنا ہے جن کو صدیوں کی صحبت و ہمسائیگی نے چھوت چھات کے اعتبار سے پورا ہندو نہیں تو آدھا ہندو ضرور بنا دیا ہے۔ مبلغین کو چاہیئے کہ غیروں کو مسلمان بنانے سے پہلے ان مسلمانانِ ہند و صفات کو مسلمان بنائیں نیز دیہات میں افراد کو مسلمان بنانے کی بجائے کوشش کیجئے کہ پوری جماعت مسلمان بنے۔ اس وقت تک چند آمادۂ اسلام افراد کو کلمہ پڑھانے میں دریغ کرنا مناسب ہوگا جب تک کہ ان کے اثر سے گاؤں کی اکثر آبادی کو آمادۂ اسلام نہ کر لیا جائے۔"

نواب صاحب کی باضابطہ تعلیم کا سلسلہ امتحان میٹرک سے قبل ہی ختم ہو گیا تھا، آگے چل کر جو وسعت معلومات انھوں نے بہم پہنچائی وہ ان کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ معمولاً روزآنہ دو ڈھائی سو صفحات کا مطالعہ کیا کرتے، جب وقت ملتا پڑھتے۔ حتیٰ کہ موٹر یا بگھی میں بیٹھے ہوئے بھی کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ جاری رہتا۔ ان کا کتب خانہ بہت وسیع تھا اور اس کا بڑا حصہ مختلف قدیم و جدید تفاسیر و دیگر مذہبی کتب پر مشتمل تھا۔ ان کتابوں میں اکثر عربی زبان میں تھیں جن کا مطالعہ وہ پورے غور و خوض کے ساتھ کیا کرتے۔ چنانچہ مطالعہ کے نشانات ان کی تقریباً ہر کتاب پر آج بھی موجود ہیں۔ ان کی اردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی میں بھی ان کی مہارت مسلمہ تھی۔

عربی میں اس حد تک مہارت تھی کہ جب بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے

دوران مصر پہنچے اور نحاس پاشا سے ملنے گئے تو ایک قادیانی مبلغ کو بطور ترجمان ساتھ لے گئے۔ دوران گفتگو محسوس کیا کہ وہ صحیح ترجمانی نہیں کر رہے ہیں، خود گفتگو شروع کی دوسرے دن اخبارات میں تصویر کے ساتھ تعارفی نوٹ چھپا کہ "حیدرآباد کا ایک نواب جو عربی فصاحت میں گفتگو کرتا ہے۔" ان کے انتقال سے ڈیڑھ سال قبل مصر کے قونصل جنرل حیدرآباد آئے۔ مرحوم نے عربی میں ایک پُرجوش اور اثر آفریں تقریر کی تو سب متحیر ہوئے۔ قونصل جنرل نے آپ سے کہا کہ "ہندوستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بے تکلفی اور فصاحت سے عربی میں تقریر کر سکتے ہیں۔"

اپنے مطالعہ سے انگریزی پر اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ ایک جلسہ میں محترمہ سروجنی نائیڈو کی موجودگی میں کہا۔ جب وہ اردو جیسی مشکل زبان میں تقریر کر سکتی ہیں تو کیا بہادر خاں انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کر سکتا، چنانچہ ایک گھنٹہ سے زیادہ انگریزی میں ایسی پُراثر اور دلنشین تقریر کی کہ محترمہ سروجنی نائیڈو عش عش کر اٹھیں۔

مرحوم نے تجوید و قرارت کو باضابطہ قاری روشن علی صاحب سے حاصل کیا تھا۔ ہر سال شب قدر میں قرارت کا جلسہ اپنی دیوڑھی میں منعقد کرتے جس میں بڑے بڑے اہلِ فن قرارت سبع و فنِ تجوید میں اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے، خود مرحوم اس میں حصہ لیتے اور قراءت خوانی کا یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا۔

قرآن کی تعلیم و تبلیغ کو انھوں نے ایک لمحہ بھی فراموش نہ کیا۔ مجلس اتحاد المسلمین کے جلسۂ سالانہ ۱۳۶۰ھ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ رکنیت کی شرطِ اولیں کے طور پر یہ پابندی عائد کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک عمل کی نیت سے اور معنی و مطلب کو سمجھ کر قرآنِ مجید کی کم از کم تین آیتیں روزانہ تلاوت کیا کرے۔ میری اس عمل پر مزاولت نے ثابت کیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح و صلاح انفرادی و اجتماعی کے نئے نئے دروازے کھولتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ قرآن اور اس کے تراجم سے استفادہ نہیں کرتے۔ ہمیں چاہیئے

ہر مسجد میں قرآن اور اس کا کوئی مستند ترجمہ سنانے کا انتظام کیا جائے۔

قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کا یہی جذبہ تھا جس کے تحت مرحوم اپنے محلہ کی چھوٹی سی مسجد میں روزآنہ بعد نماز فجر ایک گھنٹہ تک تفسیر کا درس دیا کرتے جو بلاناغہ گڑگڑاتے جاڑے، پریشان کن گرمی اور موسلادھار بارش میں بھی جاری رہتا۔ مرحوم اور تقریروں کے لئے تو شاید ہی کبھی تیاری کرتے تھے لیکن درس تفسیر کا بڑا اہتمام کرتے، رات میں سونے سے قبل یا صبح نماز سے پہلے جس آیت کی تفسیر بیان کرنی ہوتی اس سے متعلق مختلف نئی پرانی تفسیریں دیکھ ڈالتے تھے۔ ساتھ ہی مختلف ترجمے پیش نظر رکھتے۔

کچھ ساتھیوں نے کہا۔

"تمہارا یہ مقام نہیں"۔

خود بھی فرماتے۔ "میرا یہ مقام نہیں"۔

لیکن دونوں کے کہنے میں مشرق و مغرب کا فرق تھا۔ ساتھی منع کرتے کہ چٹائی پر بیٹھنا اور عوام سے اس طرح ملنا "جاگیر داریت" کے خلاف ہے۔

وہ یہ فرماتے کہ:

"مفسر کا مقام بہت بلند ہے۔ میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سناتا ہوں، تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزآنہ صبح دیکھی ہوئی چیزوں پر غور کرلیتا ہوں۔ خیال آیا اگر یہی کام مسجد میں ہو اور بجائے خاموش سوچنے کے باآواز بلند کہتا جاؤں (LOUD THINKING) تو دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ بس اسی وجہ سے مسجد میں بیٹھ کر کہنا شروع کردیا۔۔۔"

ان الفاظ میں فی الواقع کوئی تصنع نہیں ورنہ پندرہ بیس آدمیوں ایک گھنٹہ تک تفسیر نہ سنائی جاتی۔ انھوں نے کبھی سامعین کی تعداد کو اہمیت نہ دی۔ بعض دفعہ تو صرف دو سامعین کو برابر تفسیر سناتے رہے۔ کبھی یہ شکایت بھی کی کہ جو لوگ میری تقریروں کو دلچسپی سے سننے کے عادی ہیں وہ تفسیر میں شرکت کیوں نہیں کرتے حالانکہ میری یہ گفتگو ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے۔ اب تو ہر شخص انفرادی کوشش کرے، یہاں

چند سامعین آدمی اللہ رسول کی باتیں سنتے ہیں۔ یہ لوگ جا کر اپنے گھر
بیان کریں اس طرح پورے شہر میں تبلیغ ہو جائیگی۔

درس تفسیر میں آیت کی تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ مختلف ا
سناتے حتیٰ کہ انگریزی ترجمہ بھی بتا دیتے۔ سامعین کو ہدایت تھی کوئی
مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھیں جب خود ترجمہ کر چکتے تو پوچھ
ترجمہ چھوٹ تو نہیں گیا۔ پھر فرماتے میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ
ترجیح ہے آپ جسے چاہیں اختیار کریں۔ اس کے بعد قواعد کے موٹے
بتاتے، لغات کی تشریح ہوتی پھر مطالب و مسائل زیر بحث آتے۔ د
بڑے بڑے کلامی مسائل حل ہوتے۔ فلسفہ کی گتھیاں سلجھائی جاتیں، و
نکات بیان کے سجاتے اور عارفانہ باتیں سنائی جاتیں۔ آیات کو پڑ
دہراتے اور فرماتے۔ "اہاہا کیا بات فرمائی گئی ہے"۔ روزانہ بالعموم ایک
آیت کی تفسیر ہو سکتی۔ بعض دفعہ تو ایک آیت کی تفسیر چار چار، پا
ہوتی۔ جب کوئی سورت ختم ہو جاتی تو اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جا
ایک اجمالی مفہوم ذہن میں محفوظ رہے۔ ایک پارہ ختم ہو جاتا تو بشا
سے اللہ کی جناب میں حمد و ثنا کرتے ہوئے شکر بجا لاتے اور اپنی طرف
تمام سامعین کی مٹھائی سے تواضع فرماتے۔

غرض اسی ڈھنگ اور اسی رفتار سے تفسیر بیان ہوتی ر
چھ برس میں پورے کلام پاک کی تفسیر بیان کی جا سکی۔ اس تکمیل پ
و انبساط کی کیفیت بیان سے باہر ہے، بار بار اللہ کا شکر ادا کر
میں آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ اسی مسرت میں تمام سامعہ
کھانے پر مدعو کیا۔ پُرتکلف دعوت دی، نوکروں کے باوجو
سربراہی میں مصروف رہے۔

دوسرے ہی دن تفسیر پھر شروع ہوئی اور یوم و
جاری رہی۔

۳ / رجب سنہ ۱۳۹۳ھ ۱۱ اتوار، آپ کی تفسیر کا آخری د

سورۂ بقرہ کے چوبیسویں رکوع کی پانچویں آیت زیرِ درس تھی۔ تفسیر سے پہلے کہنے لگے۔ "آج میں زیادہ تیار نہیں ہوں، روزآنہ جو مطالعہ کرکے یہاں آتا تھا وہ آج نہیں کرسکا۔ گزشتہ دو راتوں سے سالگرہ تقریب حضور نظام ہ کے عشائیوں میں وقت گذرا اور یہ ہماری ایمانی کمزوری ہے کہ ہم کبھی کبھی اللہ کی طرف سے ہٹ کر اس طرح دنیوی کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ خدا ہمیں بھلائی کی توفیق دے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ مرحوم درسِ تفسیر کو کتنی اہمیت دیتے اور اس کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔

شاید کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ نواب بہادر خاں صحافی نہ ہونے کے باوجود دنیا کے بڑے بڑے صحافی سے زیادہ اس فن پر عبور رکھتے تھے حیدرآباد کے ایک سابق وزیر پٹنہ کے سید عبدالعزیز صاحب کے بھانجے بیرسٹر سید محمود نے جب اوریئنٹ پریس آف انڈیا کی داغ بیل ڈالی تو اس کے ایک ڈائریکٹر خود نواب صاحب تھے اور حیدرآباد کا دفتر تقریباً ہیڈ آفس کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی صحافتی اصول نہیں توڑے اور اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی پبلسٹی نہیں کروائی، کبھی کوئی عقیدت مند چُوک بیٹھتا تو وہ بعد میں اُسے بتلاتے کہ مخالفین کے نقطۂ نظر کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

دکن کا ہندو پریس یا بیرونی ملک کے اخباروں کے ہندو نمائندے اپنی مخالفانہ روش سے باز نہ آتے لیکن پریس کانفرنس، انٹرویو یا پبلک جلسوں میں ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک روا نہ رکھا۔ وہ آزادیٔ صحافت کے اتنے قائل تھے کہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہر ٹیڑھے میڑھے مخالفانہ بلکہ معاندانہ سوالات اور تنقیدوں کا بھی اس شگفتہ انداز میں جواب دیتے کہ مخالفین کو بھی بعد میں ستائشی الفاظ استعمال کرنے پڑتے۔ نواب صاحب کی وفات پر ان

سب صحافیوں نے ان کی خوش اخلاقی، مروّت اور خدمت کا اعتراف کیا۔
آداب صحافت کا اتنا لحاظ تھا کہ خطاب واپس کرنے سے پہلے ایک خبر اس بارے میں فیلر (FEELER) کے طور پر اورینٹ پریس سے جاری کرنے کی خواہش کی۔ نیوز ایجنسی کے مینجنگ ڈائریکٹر نے اس خبر کو جاری کرنا احتیاط کے خلاف جانا تو ایجنسی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اثر انداز نہ ہوئے بلکہ دوسرے ذرائع کو دے دیا اور دوسرے ہی دن وہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایک بیان ڈاکٹر لطیف نے لیگ، قائداعظم اور خود نواب صاحب کے خلاف دیا۔ چاہتے تو دبا سکتے تھے لیکن ہدایت دی کہ من وعن مقامی پریس کو دیں اور باہر بھی بھیجیں۔

بہادر خان فن خطابت کے ماہر تھے، ان میں بیک وقت مولانا آزاد کا زور بیان، ظفر علی خان کی آتش نوائی، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری کی بذلہ سنجی، سروجنی نائیڈو کی طاقت، قائداعظم کی منطق، استدلال اور جامعیت، شاستری اور سرراد ھاکرشنن کی روانی جمع تھی۔ گویا:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کی تصویر تھے۔

وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو لاکھوں کا مجمع جو ان کی تقریر کے انتظار میں رات بھر جاگتا ہوتا، سنبھل کر بیٹھ جاتا۔ تقریر کے دوران ایسا سکوت طاری ہوتا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ وہ تقریر کرتے اور مسلسل کئی گھنٹے تقریر کرتے لیکن جب تقریر ختم ہوتی تو سامعین کو محسوس ہوتا جیسے ابوالہول نے اپنا سکوت توڑ دیا ہے۔ تقریر کی خوبی یہ کہ جو الفاظ، جو تشبیہ، جو استعارہ ایک بار استعمال ہوتا اس کی تکرار نہ ہوتی۔ ہر ہر لفظ اپنی جگہ نپا تلا، اور موزوں جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا تقریر کیا کرتے سامعین پر سحر کرتے۔ اس لحاظ سے انھیں لوگ جادو بیان مقرر سمجھتے تو غلط نہ کہتے تھے۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا! میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی لئے وہ "لسان الامت" کہلائے۔

خواجہ حمید احمد

کشن منڈی (حیدرآباد دکن) کا آفتاب — چند شعاعیں

حیدرآباد کے محلہ کشن منڈی میں ڈاکٹر حمید اللہ کا آبائی گھر ہے۔ اسی محلہ میں حضرت حبیب علی شاہ ؒ کی درگاہ اور مسجد واقع ہے۔ اس درگاہ کی ایک جانب جنوب میں حمید اللہ صاحب کا مکان ہے تو دوسری جانب شمال میں بلبلِ ہند آنجہانی سروجنی نائیڈو کا مکان ہے (اب اس مکان میں حیدرآباد یونی ورسٹی ہے)۔ بلبلِ ہند اس مسجد سے اذان کی آواز سنتی تھیں۔ ان کی انگریزی نظموں میں اس اذان کا سرود جگہ جگہ نمایاں ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے خوش قسمتی سے مجھے اور میرے بڑے بھائی مولوی خواجہ محمد احمد کو ڈاکٹر حمید اللہ سے ہمسائیگی کے روابط تھے ڈاکٹر صاحب صبح کی نماز پڑھ کر قریب کے میدان میں جہاں اب ملکی مصنوعات کی نمائش ہوتی ہے دوڑ لگاتے تھے۔ اس دوڑ میں میرا اور ان کا ساتھ رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ دوڑ ہاکی، فٹ بال یا کرکٹ میں حصہ لینے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ تو اس کی تیاری کر رہے تھے کہ حجازِ مقدس جا کر وہاں کے مقاماتِ مقدسہ کی پاپیادہ زیارت کر سکیں۔ اور عہدِ نبوی کے جنگوں کے میدانوں کی پیمائش کر سکیں۔ چنانچہ ان کی اس بادہ پیمائی اور نقشہ کشی کے نمونے صفحاتِ قرطاس پر نمودار ہو کر تمام عالم میں پھیل گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی اسکول کی زندگی دار العلوم میں بسر ہوئی۔ اس زمانے کے حالات سے راقم الحروف واقف نہیں۔ البتہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں بھائی خواجہ محمد احمد صاحب سے ڈاکٹر صاحب جونیر تھے اور راقم الحروف سے ایک دو سال سینیر۔ عثمانیہ کالج میں بزم عربی قائم ہوئی، صدر خواجہ محمد احمد صاحب قرار پائے تو معتمدی کے فرائض ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس خوبی سے انجام دیئے کہ جامعہ عثمانیہ کے در و دیوار بھی

گویا عربی میں تکلم کر رہی تھیں۔ بزم قانون جب خواجہ محمد احمد صاحب کے سپرد ہوئی ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کی معتمدی کے فرائض اپنے ذمہ لے لیا۔ اب اس بزم قانون میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی فقہ سے لے کر مجلس اقوام کے تمام قوانین و ضوابط کا جائزہ لیا جانے لگا۔ اسی سلسلہ میں ایک یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ اسلامی شریعت پر قانون روما کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نے ڈاکٹر حمید اللہ کے ذمہ یہ کام کیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ یہ معلوم کریں کہ خود قانون روما پر اسلامی شریعت کا کیا اثر ہوا۔ قانون روما کی قدامت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی تھی کہ مذہب مابعد کے اثرات اپنے ماقبل پر کیسے مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کے محققانہ ذہن نے اس بات کا پتہ چلانا شروع کیا کہ ROMAN LAW تو اسلام سے پہلے تتر بتر حالت میں تھا۔ یہ کام تو عربوں نے کیا کہ اسے پرانے ذخائر سے نکال اس کے تراجم تدوین اور تہذیب کا کام انجام دیا۔ اس طرح یہ ظاہر ہو گیا کہ قانون روما کی جو کتابیں اسلام کی نشو نما کے بعد تدوین ہوئیں، ان کے خدوخال اسلامی نقش و نگار سے مزین تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے جو کام حیدرآباد میں بزم قانون جامعہ عثمانیہ میں شروع کیا اسے یوروپ میں جا کر مشرح طور پر اقوام یورپ میں پیش کر رہے ہیں۔

پروفیسر ہارون خان شروانی کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ میں ایک بزم تاریخ بھی قائم ہوئی تھی۔ اس کی معتمدی اور صدارت میرے ذمہ ہوئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا اس بزم سے کوئی راست تعلق نہ تھا لیکن ان سے ہماری دوستی کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے بزم تاریخ کے مباحث میں بھی حصہ لیا۔ اور جب عہد صحابہ کے زمانہ کی آپس کی جنگیں موضوع بحث بنیں اور سامعین نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ کون ان میں جارح تھا تو ڈاکٹر صاحب نے صدر شعبہ دینیات علامہ عبدالقدیر حسرت کو بحث کے اکھاڑے میں اتارا۔ مولانا نے اپنے عالمانہ خطبہ میں قرآن مجید کی اس آیت کو یاد دلایا۔ وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما (سورۃ الحجرات) اور مومنین کی دو جماعتوں میں مقابلہ کے امکان کا قرآنی ثبوت پیش فرماتے ہوئے مولانا نے یہ وضاحت کی

اللہ تعالیٰ نے ایسے مقاتلہ میں دونوں فریقین کو مومن قرار دیا ہے بعد ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا کام ان میں صلح کرا دینا ہے۔ غرض مولانا عبدالقدیر صاحب کے اس خطبہ سے تاریخ اسلام کی کئی گتھیاں سلجھ گئیں اور ڈاکٹر حمید اللہ کو اپنی تصنیف INTRODUCTION TO ISLAM میں ان ہدایات سے استفادہ کرنے میں بڑی مدد ملی۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے جامعہ عثمانیہ سے قانون میں L.L.B کی ڈگری حاصل کی اور فقہ میں ایم اے کیا۔ اس زمانے میں امیر جامعہ مہاراجہ سرکشن پرشاد تھے۔ اور ان کی دستخط سے تمام اسناد تقسیم ہوتی تھیں۔ حمید اللہ کے تقویٰ اور تفقہ نے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ فقہ کے ایم اے کی سند ایک غیر مسلم امیر جامعہ کی دستخط سے حاصل کریں۔ چنانچہ انھوں نے انتظار کیا اور جب سر اکبر حیدری امیر جامعہ ہوئے تو دوسرے سال ان کی دستخط سے فقہ کی سند لی۔ بعد میں اسلامی فقہ اور بین الاقوامی قانون کا متفقہ مطالعہ کر کے وہ جامعہ عثمانیہ میں قانون اور فقہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

حمید اللہ صاحب نے اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سیاسی مجاہدوں میں بھی حصہ لینا شروع کیا۔ چنانچہ نواب بہادر یار جنگ کی جدوجہد میں وہ ان سے اشتراک عمل کرنے لگے۔ یہاں تک کہ مجلس اقوام میں مملکت آصفیہ کا جو مقدمہ پیش ہوا اس میں حمید اللہ صاحب بھی بہت پیش پیش تھے۔ مملکت آصفیہ کی جدوجہد کے خلاف جب حکومتِ ہند کی جانب سے فوجوں کا محاصرہ بندی شروع ہوئی تو حیدرآباد میں رضاکاروں کی قیادت کا سوال پیش ہوا اور آپس میں مباحثے ہونے لگے کہ کیا حیدرآباد کی چھوٹی سی مملکت حکومتِ ہند کی بڑی قوت کا مقابلہ کر سکے گی! اس نوبت پر کچھ ایمان میں تزلزل آنے لگا لیکن اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ۔ اس قرآنی بشارت نے سبھوں کے دلوں میں بڑا استقلال پیدا کیا۔ پھر کیا ہوا' وہ تاریخ کا حصہ بن گیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے تیغ و تفنگ پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اپنے زورِ قلم سے قرآن مجید کا ترجمہ یورپی زبانوں میں کر کے قلمی جہاد کو اپنی جدوجہد کا وسیلہ بنایا ہے اور اب اس کے نتائج اظہر من الشمس ہو رہے ہیں۔

باقی بر صفحہ ۲۸

عائشہ بیگم

اُردُو مدارس میں معیارِ تعلیم کی ترقی کے لئے چند مشورے

آج ہر طرف معیارِ تعلیم کے گھٹ جانے کی چیخ و پکار ہے۔ یہ معیار روز بروز گھٹتا ہی جارہا ہے۔ مشن اسکولوں، پبلک اسکولوں اور چند وہ اسکول جنھیں درد دل رکھنے والے ذمہ دار سوسائٹیز نے کھولا ہے۔ باقی تمام اسکول خصوصاً اردو ذ[ریعہ] تعلیم رکھنے والے اسکول نہایت ہی گھٹیا درجے کے ہیں۔ میں ان ہی اردو اسکولوں [کے] معیارِ تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔

سرکاری مدارس کا حال تو نہ پوچھئے۔ ان کا کون پُرسانِ حال ہے ! اگر مضمون ٹیچر نہیں تو کس کو فکر ہے ؛ طلبا اور طالبات مٹی پر بیٹھتے ہیں تو کوا[ن] پوچھنے والا ہے ؛ عمارت بالکل ناکافی ہے اور دو، دو شفٹ میں نامکمل اور ادھوری تعلیم ہوتی ہے تو کس کی بلا سے ؛ الیکشن آتے ہیں اور آتے ہی رہتے ہیں تو مدارس سے قابل مدرسین کو اس کام کے لئے لے لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ مہینو[ں] مدارس سے غائب رہتے ہیں۔ ان کی جماعتوں کی اور ان کے مضامین کی تعلیم [کا] جو ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا ہے بھلا گورنمنٹ کو اس کی کیا فکر ؛ پبلک کتنی جا[ہل،] نادان اور بھولی بھالی ہے کہ گورنمنٹ کو پھر بھی اپنے ماں باپ کہتی ہے۔ حالان[کہ] ان کے بچوں کے مستقبل کو ایسے گورنمنٹ اسکولوں میں برباد کیا جارہا ہے۔ کاش ان غریبوں کے پاس دولت ہوتی تو وہ بھی اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا[] تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ اسکولوں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں اور ان کا تع[لق] گورنمنٹ کے انصاف اور رحم و کرم سے ہے۔ اس میں بھلا ہم کیا کہہ سکتے ہیں !

جب تک چھوٹے مدارس میں بیٹھنے کے لیے فرنیچر مہیا نہ ہو اُسے سجانے میں دیر کرنا چاہیے۔ ان مدارس کے معیارِ تعلیم کی ترقی کی بات ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارے اختیار میں کیا ہے؟ ان مدارس کے نتائج بے حد خراب اور اکثر صورتوں میں صفر فیصد رہتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ مدارس ہیں جنھیں سوسائٹیز چلاتی ہیں۔ عموماً کوئی سوسائٹی اپنی کمیونٹی کے لئے اسکول کھولتی ہے تو اس کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے طلباء کو معیاری تعلیم دی جائے۔ انھیں قابل ترین شہری بنایا جائے۔ اس تعلیم سے ان کا شعور بیدار ہو۔ ان کی صلاحیتوں میں ترقی ہو۔ وہ ماحول پر اثرانداز ہونے والی قوتوں کو پوری طرح سمجھیں اور اپنے مستقبل کی عظمت بڑھانے کے لئے ماضی کا ورثہ استعمال کریں۔ وہ توہمات، ظلمت پسندی اور جہالت سے آزادی حاصل کریں۔ اور تعلیم کی رہنمائی میں مقررہ نصب العین تک پہنچیں۔ اس قسم کے پرانے اسکول شروع شروع میں اس مقصد کو لے کر چلتے رہے اور یہاں سے تعلیم پاکر نکلے ہوئے طلباء کافی اونچے مدارج پر پہنچے مگر اب گوناگوں وجوہ کی بنا پر حالات بدل گئے ہیں اور ان کا وہ پرانا معیارِ تعلیم قائم نہیں رہا۔

سوسائٹیز اپنے مدارس کے معیارِ تعلیم کو بڑھانے کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ چونکہ انتظامیہ ان کے اختیار میں ہے اس لئے وہ جو اصلاحی قدم چاہیں اٹھا سکتے ہیں وہ اپنی کمیونٹی کے دولت مند اور صاحبِ خیر اصحاب سے مل کر اس کام کے لئے خاطر خواہ پیسہ بھی جمع کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں میری، حسبِ ذیل تجاویز ہیں:

(۱) جو تعلیمی ادارے عمارت کی تنگی کی وجہ سے دو شفٹ میں اسکول چلاتے ہیں وہ کسی صورت مالیہ فراہم کر کے مدرسے کی عمارت میں توسیع کریں اور اپنے اسکول کو ایک ہی شفٹ میں چلائیں۔ کیونکہ دو شفٹ میں اسکول چلنے سے طلباء صرف ساڑھے چار گھنٹے ہی تعلیم پا سکتے ہیں، باقی وقت بیکار پھرتے ہیں۔ جبکہ ایک شفٹ ہونے کی صورت میں وہ (۶) گھنٹے تعلیم پاتے ہیں اور زائد نصابی مصروفیات میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

(۲) ہر سوسائٹی اس بات کا پوری طرح دھیان رکھے کہ اس کے

پارٹی بندی مقصد ہو اور اساتذہ میں بھی یہ میلان آنے نہ پائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اساتذہ میں گروپ بندی ہونے کی وجہ سے اس کا اثر ان کے تدریسی کاموں پر پڑتا ہے اور وہ درس و تدریس میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی کہ انھیں لینا چاہیئے اور طلبار بھی ایسے معاملات میں شامل ہو کر مختلف گروپوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور حصولِ تعلیم کے عوض سیاسی دلچسپیوں میں پڑ جاتے ہیں۔

(۳) ہر سوسائٹی میں چند ماہرین تعلیم مقرر ہونے چاہئیں۔ جنھیں یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً اسکول جا کر بچوں کا تحریری کام دیکھیں۔ آج کل جماعتوں میں یہ ہو رہا ہے کہ طلبار کو ہوم ورک نہیں دیا جاتا۔ استاد سبق پڑھاتا ہے اور خود ہی تختۂ سیاہ پر سوال و جواب لکھ دیتا ہے اور طلبار کو اس کی نقل کرنے اور پھر زبانی یاد کرنے کہہ دیتا ہے۔ اساتذہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ طالب علموں نے نقل صحیح کی ہے یا نہیں؟ اور نہ انھیں یہ معلوم کا موقع رہتا ہے کہ طالب علموں نے سبق کو سمجھا یا نہیں؟ اور گھر جا کر وہ پڑھائے ہوئے سبق کا آموختہ کرتا ہے یا نہیں؟ وہ صرف تختۂ سیاہ پر لکھے ہوئے سوال و جواب کو زبانی یاد کر لینے کی تلقین پر اکتفا کرتے ہیں۔ ماہرین تعلیم اساتذہ کو پابند کریں کہ وہ طلبار کو ہوم ورک دیا کریں، ان کی کاپیاں جانچیں، عام غلطیوں پر کمرۂ جماعت میں بحث کی جائے تاکہ یہ مشکل حصے سبھی طلبا کے ذہن نشین ہو جائیں۔ آج طلبار میں تجسس کا مادہ بالکل نہیں۔ سوالات دے کر انھیں خود حل کرنے کہا جائے تو ان میں تجسس پیدا ہوگا۔

(۴) اساتذہ کا یہ کہنا ہے کہ ہوم ورک دینے کی صورت میں طلبار گھر سے کر کے نہیں لاتے اور یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ پبلک اسکولوں اور مشن اسکولوں میں ہوم ورک پابندی سے دیئے اور جانچے جاتے ہیں۔ اگر طالب علم اس میں کوتاہی کرے تو سرپرست کو ہدایت دی جاتی ہے کہ اس کی نگرانی کرے بصورت دیگر عدم تکمیل ہوم ورک کی وجہ سے طالب علم اسکول سے خارج بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے ان اسکولوں میں یہ طریقہ مفید نہیں ہو سکتا۔ ان مدارس میں بچے اکثر تعلیم یافتہ اور امیر ماں باپ کے ہوتے ہیں۔ یہاں [illegible] ہے۔ اردو میڈیم والے طلبار کے ماں باپ یا سرپرست [illegible] معاشی اعتبار

ہوتے ہیں اگر ان کے بچوں کو اسکول سے نکال دیا جائے تو وہ انھیں کسی
پر لگا دیں گے اور ان کی تعلیم منقطع ہونے کا انھیں غم نہ ہوگا اس لئے
طے میں دوسری تدبیر کرنی ہوگی یعنی ان کے سرپرستوں کو نہایت نرمی
ستانہ طریقے سے، فہمائش اور موثر طریقہ سے ہوم ورک کی اہمیت اور
ے سے درخشاں مستقبل کی خوشخبری دینی ہوگی، بہت کچھ سمجھانا ہوگا،
یک، مختلف مثالیں دے کر سمجھا کر ان کے دماغوں میں یہ خیال پیوست
ن کے بچے کو تعلیم دلانا ضروری ہے اور انھیں خود ان کی پڑھائی کی
ضروری ہے۔

بہت کم سرپرست صدر مدرس کے بلانے پر اسکول آتے ہیں لیکن
سے ملنا تو ناگزیر ہے جب تک انفرادی طور پر بچے کے باپ یا ماں
گفتگو نہیں کی جاتی اور اسے CONVINCE نہیں کیا جاتا وہ بچے کی
ہم ہی سمجھا رہے گا اس لئے اسے بار بار، اصرار کر کے، چٹھیاں لکھ کر،
کے گھر بھجوا کر، اس کے فرصت کے وقت اسے بلوانا ہی ہوگا۔ اگر
وہ نہ آئے تو آخری صورت یہ ہے کہ مدرس کلاس کے گھر جا کر اس
چیت کرنی ہوگی اور اسے سمجھانا ہوگا کہ گھر میں اس کی (ماں یا باپ کی
ی ہے اور ہوم ورک کی تکمیل تو بہر صورت ضروری ہی ہے۔

اکثر اوقات گھروں میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ جہاں بچہ بیٹھ کر اپنے
دہ اور ہوم ورک کر سکے۔ اس وقت بڑی مشکل ہوتی ہے۔ چھوٹے
جہاں گنجائش بہت کم اور افراد خاندان بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ بچوں
ما لگی رہتی ہے۔ وہاں ہوم ورک کرنا اور اسباق کا اعادہ کرنا
ہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں بچے کے کسی دوست کے گھر، جہاں جگہ
محلے کی مسجد میں اس کے ہوم ورک اور اعادۂ سبق کا انتظام کرنا ہوگا
یا اور ساتھی بھی اس کام میں اس کے شریک ہو سکتے ہیں لیکن وہاں کسی
نگرانی رہنا ضروری ہوگا۔

یہ سب انتظامات ہو بھی جائیں تب بھی بچے کا اپنے طور پر ہوم ورک
باقاعدگی [illegible] بہت ہی مشکل ہوتا ہے [illegible]

اتنا وسیع، مشکل اور پیچیدہ ہو گیا ہے کہ کمرۂ جماعت میں استاد بھی ۴۵ منٹ تک پڑھاتا ہے۔ بچہ نصاب کا حصہ سمجھ نہیں پاتا۔ اتنی سی پڑھائی اس کے لئے کافی نہیں۔ اسے تو سبق سمجھنے کے لئے اور استاد کو اچھی طرح سمجھانے کے لئے مزید وقت درکار ہے اس لئے وہ بہت ہی کم سمجھتا ہے۔ استاد ہر بچے پر فرداً فرداً توجہ نہیں دے سکتا۔ اسے صرف (۴۰) منٹ ملتے ہیں اور بچوں کی تعداد پچاس تا ساٹھ ہوتی ہے وہ کسی طرح مقررہ حصہ پڑھا کر چھٹکارا پانا چاہتا ہے اس لیے جلدی جلدی وہ حصہ پڑھا کر، اس پر خود ہی سوال اور پھر جواب تختۂ سیاہ پر لکھ کر بچوں کو اس کی نقل کر کے زبانی یاد کرنے کہہ دیتا ہے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ ادھر بچے کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور وہ طوطے کی طرح سوال و جواب رٹ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ نہ سوال کا مطلب سمجھتا ہے اور نہ جواب کا۔ اس طرح بچے کے دس سال اسکول میں گذر جاتے ہیں اور وہ ناشاد و نامراد امتحان ایس ایس سی میں ناکام ہو کر سڑکوں کی زینت بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے بچوں کی بڑی بدنصیبی ہے۔ ہمارے سماج کو فوری اس کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

ہمارے جو طلباء مشن اسکولوں اور پبلک اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں، ہماری آبادی کے لحاظ سے ان کی تعداد بے حد کم ہے لیکن جن بچوں کے بارے میں میں کہہ رہی ہوں ان کی تو اکثریت ہے اور ان میں کافی ذہین بچے بھی نظر آتے ہیں لیکن سوسائٹیوں کی عدم توجہی، استادوں کے تغافل اور سرپرستوں کی جہالت کی وجہ سے یہ بچے برباد ہو رہے ہیں۔

(8) میرے ایک رشتہ دار تین بار جاپان گئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا وہاں بہترین مدارس ہیں۔ بہت ہی اعلیٰ قابلیت کے ٹرینڈ اساتذہ کو ہی پڑھانے کا کام دیا جاتا ہے۔ ہر بچے کو کتب خانے سے عام معلومات کی کتابیں لے کر پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ T.V. پر وہی درس جو جماعتوں میں ہوتے ہیں اعادے کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کمرۂ جماعت کی تعلیم بچے نے اچھی طرح سمجھی اور وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ دیئے ہوئے ہوم ورک کو کر سکے۔ اس کے باوجود وہاں گلی گلی اعادے اور ہوم ورک کے لئے مراکز قائم کئے گئے ہیں اسکول کے گھنٹہ دو گھنٹہ بعد ہر بچے کو اس مرکز پر جا کر پڑھے ہوئے اسباق کا

بچوں کی مدد دیتے ہوئے ہوم ورک کی تکمیل کی ضروری ہوتا ہے۔ وہاں ایسے قابل اساتذہ موجود رہتے ہیں جو بچوں کو کسی مشکل آنے پر مدد کرتے ہیں۔ ــــ تو ہمارے اردو اسکولوں کی تعلیم کس شمار میں ہے۔ ان بچوں کے لئے تو کوچنگ سنٹرز نہایت ضروری ہیں اور تمام سوشیل ورکرز کے لئے اس طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

مسلمانوں کے اس متوسط اور نچلے طبقے کی معاشی حالت اتنی پست ہے کہ وہ انفرادی طور پر اپنے بچے کو ٹیوشن نہیں دلا سکتے کیوں کہ ایک استاد کو ہر مضمون کی کوچنگ کے لئے کافی رقم دینا پڑتی ہے اس لئے اجتماعی کوچنگ سنٹرز ان کی مشکلات کا حل ہیں جن میں انھیں برائے نام خرچ دینا ہوگا۔ ماں باپ کو اس بات کی واقفیت دلوانا ضروری ہے کہ یہ مراکز ان بچوں کی بہبودی کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ اور پورے بچے ان مراکز میں پابندی سے حاضر ہیں۔ مدد دینے والے اصحاب کا فرض ہے کہ ایسے مرکزوں کے لئے اپنے مکانوں میں بلا معاوضہ جگہ فراہم کریں۔ اگر کسی محلہ میں ایسی جگہ فراہم نہ ہو سکے تو کسی مسجد و خانقاہ کا حصہ اس مرکز کے لئے فراہم کیا جائے اور محلے کے تعلیم یافتہ حضرات اپنا تھوڑا وقت مرکز کے لئے دیں تاکہ وہ ان طلباء کے ہوم ورک کی نگرانی کریں اور جہاں طلباء کو کچھ مشکل ہو اُسے دور کرنے میں ان کی مدد کریں۔

(۹) مدرسین اور سرپرستوں کا وقفے وقفے سے ملتے رہنا اور بچے کی تعلیمی ترقی سے متعلق بات چیت کرتے رہنا بالکل ضروری ہے۔ سرپرست کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح سے بٹھا دینی چاہیئے کہ اس کے بچے کی تعلیم و تربیت کا اصلی ذمہ دار وہ ہے۔ مدرسہ تو اس کو مدد کرنے کا ایک ذریعہ ہے

ہمارا سرپرست طبقہ جو اردو مدرسوں سے تعلق رکھتا ہے یہ بات بالکل بھولا بیٹھا ہے کہ اس کے بچے کی تعلیم و تربیت کا وہ خود ذمہ دار ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ استاد اور مدرسے کی یہ ذمہ داری ہے۔ اسے سمجھانا ہوگا اور مسلسل سمجھاتے رہنا ہوگا۔ ہمارے مسلم معاشرے میں سرپرست خصوصاً ماں اس بات سے بالکل ناواقف ہے کہ کون سا خرچ انتہائی ضروری ہے کون سا کم ضروری اور کون سا غیر ضروری ہے۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر ہونے والے خرچ کو

کالم فرقہ میں شامل دیتی ہے اور بلند مقامات، درگاہوں کی زیارت، منت مرادوں کی تکمیل، بھٹی چھلے، کسب جادو رسومات، ملاؤں سے گنڈے تعویذ، صنعتی نمائشوں میں نمائشی چیزوں کی خرید و فروخت کو لازم بنا رکھتی ہے جس کی وجہ سے بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے پیسہ نہیں بچتا۔ ماں کو یہ درجہ بندی بدلنی ہوگی۔ بچے کی تعلیم و تربیت کو اولیت دینی ہوگی اس کے لئے پیسہ جمع کرنا ہوگا اور اسکول کی ادھوری تعلیم کی تکمیل اور ہوم ورک سمجھنے کے لئے یہ پیسہ اسے خرچ کرنا ہوگا۔ غریب سے غریب عورت بھی کچھ پیسہ پس انداز کرسکتی ہے اور اپنے بچے کے اسکول سے آنے کے بعد اسباق کے سمجھنے اور ہوم ورک کرسکنے کے لئے کسی قابل استاد سے ماہانہ کچھ معاوضہ دے کر استفادہ کرسکتی ہے۔ مشن اسکولوں اور پبلک اسکولوں کے طلبا کے سرپرست یہی تو کرتے ہیں تب کہیں ان کے بچے اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

جب تک اردو میڈیم والے طلباء کے سرپرستوں اور خصوصاً ماؤں کے بجٹ میں بچے کی تعلیم پر خرچ سرفہرست نہیں آجاتا اس وقت تک سوسائٹی ماں باپ کا فرض ادا کرے اور اپنی کمیونٹی کے بچوں کو بربادی سے بچائے۔ بچے کے سرپرست اور خصوصاً ماں کو یہ بات سمجھانے اور اس کے دماغ سے روایتی خیالات کو نکالنے کے لئے سماجی کارکن اور اہل مدرسہ کو بڑی جد و جہد کرنی ہے اور یہ کام رفتہ رفتہ ہوگا۔

اس لئے یہی مناسب ہوگا کہ سوسائٹیز خود اپنے اپنے اسکول ہشتم نہم دہم کے لئے وہیں کوچنگ سنٹر قائم کریں جن میں مشکل مضامین مثلاً انگریزی، تلگو، سائنس اور ریاضی کی بنیاد کو ایسا مضبوط کیا جائے کہ طالب علم کو امتحان میں اچھے نمبرات سے کامیاب ہونا یقینی ہو جائے۔

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے — پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے — غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

انیس

سید ہاشم علی اختر

ہندی اُردو ملاپ

خدابخش لائبریری جرنل کے تازہ شمارہ ' علی گڑھ تحریک نمبر ' میں شائع شدہ ایک اہم انٹرویو میں علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے زبان کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اہل وطن کو مشورہ دیا ہے کہ ہندی کو آسان بنائیں اور عام فہم بھی۔ اسے مشکل بنانا ہندوستان کے آئین کی خلاف ورزی بھی ہے اور ہندی سے دشمنی بھی۔

انھوں نے کہا ہے کہ گاندھی جی دونوں زبانوں ہندی اردو ملاپ کے لئے کوشاں تھے۔ ہاشم علی صاحب کے بیان کا متن درج ذیل ہے :

"قومی سطح پر ایک اہم مسئلہ ہمارا لسانی مسئلہ ہے۔ ایک ہندی چلنے والی تھی جس کو لوگ ہندی کہتے ہیں، اور ہم سب لوگ روزمرہ میں بولتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اسکو اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ جنوبی ہند کے صوبے اس کو تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں۔ ہندوستان میں ہمیشہ ہندی سے مشتق ایک زبان لنگو افرانکا رہی ہے۔ اسکا نام، ڈھانچہ اور رسم الخط بدلتا رہا ہے مگر ہندی ہندی رہا ہے۔ اردو میں ہندی اور فارسی زبانوں کا ملاپ ہوا، جبکہ دکنی زبان اردو کی بہ نسبت اور زیادہ دوسری زبانوں کے اشتراک سے بنی جیسے، تیلگو، مراٹھی، کنڑی اور فارسی وغیرہ۔ عوام کی زبان ہی عام زبان ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ہم نے کوشش نہیں کی۔ ایک بہت اچھی کتاب آندھرا پردیش کے چیف جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے کی آئی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۵۱ میں آیا ہے کہ ہندی کو فروغ دے کر عوام کی زبان بنایا جائے۔ لیکن زبان کے فروغ دینے کا کام نہیں کیا گیا۔ ہمیں ہندی کو اس طرح بنانا چاہیئے کہ وہ لوگوں میں خود بخود مقبولیت حاصل کر سکے۔ اس کے لئے ہندی والوں نے کوشش نہیں کی اس

وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستانی ہندی کا فروغ تھی لیکن اسے قابل تسلیم بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ہندی میں اگر ہیں تو دوسری زبانوں سے لینا چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو ہندی زبان آسان اور عام فہم ہو اور بھی کہیں اور ہندی کا بھی۔ جس طرح انگریزوں نے انگریزی کو عوام کی زبان بنانے تبدیلیاں کیں اور آسان انگریزی شروع کی، تب ہم ہندی میں ایسا کیوں نہیں کرتے والے جب اس کو قابل قبول بنائیں گے تو یہ سارے ملک کی بین الصوبائی زبان ہو سکے گی۔ ہم اپنے کے بارے میں عقل کی روشنی میں غور کرنا چاہئے اور فضول جھگڑے کو ختم ہو جانا چاہئے۔ ہندی بے شک ہمارے ملک کی زبان ہے لیکن اسے تنگ نظری سے دور رہنا چاہئے ہندی عوام کی زبان ہے جو ہم سب بولتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنہیں اردو نہیں آتی بہت سے ایسے ہیں جنہیں ہندی نہیں آتی۔ لیکن بولتے دونوں ایک ہی زبان ہیں۔ یہ ہے۔ اگر یہ دور کر دیجئے تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا

ہر سمجھدار شخص اس ملی جلی زبان کو پسند کرے گا۔ ہمارا ذہن صاف ہونا چاہئے کہ ہندوستانی مختلف زبانوں کے اشتراک سے ایک عام زبان بنی ہے۔ جو بھی سرکاری زبان ہوتی ہے وہ عوام کو متاثر کرتی ہے۔ اس وقت ہم پورے ہندوستان میں بغیر انگریزی زبان کے الفاظ شامل کئے نہیں بول سکتے۔ پانچ چھ برس تک جب فارسی سرکاری زبان رہا تو اس کا اثر بھی پڑا۔ تیلگو فارسی الفاظ ہیں، تامل میں چار ہزار فارسی الفاظ ہیں اور کنڑ میں پانچ ہزار۔ اسی طرح ہندی تھے۔ تو ہر زبان فارسی الفاظ کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن ہندی کو اس میں کیا اعتراض ہے مروج ہے اس میں ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ "بالکل" یا "مطلب" بولتے ہیں تو یہ فارسی الفاظ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ ہندی ہندوستان کی عام بول چال کی زبان ہے۔ وہ شمالی اور جاتی ہے۔ اسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور اس میں دوسری زبانوں مثلاً فارسی الفاظ بھی شامل ہیں، اور جب یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اردو ہے۔ اس طرح دونوں زبانوں کے ملاپ کی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں آزادی کے بعد اور تقسیم انہوں نے گورنر کے نام ایک خط لکھا کہ تم جو زبان بولو، وہ دونوں رسم الخط میں لکھا کرو۔ اگر یہ بات اسی وقت تسلیم کر لیتے کہ ایک ہی زبان دو رسم الخط میں لکھی جائے گی تو مسئلہ ختم ہو جاتا، لیکن دونوں طرف سے تعصب اختیار کیا گیا۔"

این۔ کے۔ رے

تعلیم یافتہ افراد کے لئے ملازمتیں

لوگوں پر سرمایہ کاری ترقیاتی منصوبہ بندی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ایک طرف تو تعلیم صحت وغیرہ سہولیات کی سطح میں اضافے سے لوگ ترقی کے عمل میں حکومت کے بہتر شریک کار ثابت ہوں گے اور دوسری طرف تعلیم یافتہ کارکن جو کہ کسی ملک کا بہترین سرمایہ ہیں ہر محاذ پر [illegible] کفالت حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

لہٰذا سرکار کی کوشش ہے کہ یہ اثاثہ بیکار نہ رہے اور تعلیم و تربیت یافتہ افراد کو بروقت [illegible]ت نہ ملنے کے سبب ضائع نہ ہو جائے۔ حالانکہ نئی آسامیاں پیدا کی جاتی ہیں لیکن [illegible] کمی قائم رہتی ہے بلکہ ہر سال اس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا صورت حال کا تقاضہ [illegible] مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کو مدنظر رکھتے ہوئے متحدہ کوششیں کی جائیں۔

اس وقت بھارت میں 15 سے 59 برس کی عمر کے کل کارکنوں میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب [illegible] فیصد ہے۔ اس طبقہ کی روزگار کے مسئلے کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے کیونکہ [illegible] ان کی تربیت پر پہلے ہی بھاری سرمایہ کاری کر چکا ہے۔

ساتویں پنج سالہ منصوبے کی دستاویز کے مطابق مارچ 1985ء میں ملک بھر میں 15 سے [illegible] برس کی عمر کے محنت کشوں کی تعداد 26 کروڑ 98 لاکھ دس ہزار تھی۔ یہ تعداد 1990ء میں [illegible] ہزار ہو جانے کی توقع ہے۔ تخمینہ جات کے مطابق تعلیم یافتہ افراد کی قوت 1985ء میں چار کروڑ 22 لاکھ 20 ہزار تھی 1990ء میں بڑھ کر چھ کروڑ [illegible] امکان ہے۔

[illegible] تعلیم یافتہ افراد اقتصادی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوں گے کیونکہ [illegible] اعلیٰ تعلیم کی تحصیل میں لگ جاتی ہے [illegible] ہو سکتا ہے کہ کچھ [illegible] اقتصادی شعبے میں سرگرم تعلیمی افراد کی تعداد 1985ء [illegible]

تین کروڑ آٹھ لاکھ 40 ہزار تھی جن میں سے قریب 76 فی صد میٹریکولیٹ، گریجویٹ یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ ڈگری دار رکھنے والوں کا تناسب قریب ایک فی صد تھا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر بے روزگاری کی شرح میں اضافے کو روکنا ہے تو ساتویں منصوبے میں کم از کم 94 لاکھ آسامیاں پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔

خود روزگاری کی اسکیمیں

اجرت پر روزگار دینے سے تعلیم یافتہ افراد کے لئے روزگار کے محدود مواقع ہی مل سکتے ہیں۔ چنانچہ حکومت ہند 84-1983ء سے صنعت، سروس اور تجارت کے شعبوں میں اولوالعزم بے کار نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنا روزگار خود حاصل کرنے کے مواقع مہیا کرنے کی اسکیم پر عمل کر رہی ہے۔

تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کے لئے یہ اسکیم میٹرک اور اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ایسے بے روزگار افراد کے لئے ہے جو 1981ء کی مردم شماری کے مطابق دس لاکھ یا اس سے زیادہ آبادی والے شہروں میں رہتے ہیں اور جن کے پاس سرمایہ لگانے کا کوئی متبادل ذریعہ نہیں ہے۔ خواتین اور ٹکنیکل تربیت یافتہ افراد پر اس اسکیم کے تحت خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ تمام مستحق افراد کو بنکوں سے قرضے اور سرکاری مالی مدد دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے روزگار کے لئے منافع بخش کاروبار کر سکیں۔

اس اسکیم کے تحت امداد کے مستحق نئے کاروبار شروع کرنے والوں کو 25 ہزار روپئے تک کا مجموعی بنک قرضہ دیا جاتا ہے۔ بنک کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ قرضے میں سے کاروباری سرمائے کا الگ سے حساب لگائیں اور قرضے کے صرف میعادی جزو کی واپسی کے اوقات کا تعین کریں۔

چنانچہ میعادی قرضے کی رقم تین سے سات برس میں واپس لی جاتی ہے جس میں سے پہلے چھ سے 18 ماہ تک کوئی ادائیگی نہیں کرنی پڑتی۔

بنکوں کو چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ قرض کی واپسی نہ ہونے کی صورت میں قرض لینے والے کے حقیقی حالات کی بناء پر قرضے کی واپسی کی مدت بڑھا سکتے ہیں یا واجب الادا قسطوں کے اوقات کو پھر سے ترتیب دے سکتے ہیں۔ قرضوں پر شرح سود پسماندہ جماعتوں کے لئے دس اور دوسروں کے لئے ۱۲ فی صد ہے۔ مقررہ میعاد کا قرض واپس کرنے پر نیا کاروبار کرنے والا اپنی مرضی کی ضروریات کی بناء پر کاروباری سرمایہ کی سہولت کا استعمال عام شرح سود پر جاری رکھ سکتا ہے۔

سٹیٹ بینک آف پاکستان نے تمام بینکوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ کاروبار کے مالک سے سرمایہ میں اس کے حصے کا مطالبہ نہ کریں بلکہ وہ ہی قرضے کے لئے برابر کی کفالت یا تیس فیصد فریق کی ضمانت طلب کریں۔ بینک کی رقم سے جو املاک کھڑی کی جاتی ہیں وہی بینک کے لئے کفالت ہیں۔

حکومت کی طرف سے امداد بینک کی طرف سے دئیے جانے والے قرضے کے 25 فی صد کے برابر سرمایہ میں امدادی شکل میں دی جاتی ہے۔ امداد کی یہ رقم قرض لینے والے کو نہیں بلکہ متعلقہ بینک کو دی جاتی ہے۔ بینک کے قرض سے جو املاک کھڑی کی جاتی ہیں وہ قرضے کی پوری واپسی تک بینک کے پاس گروی رکھنی ہوتی ہیں۔

اس اسکیم پر عمل ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سینٹرز کے ذریعہ متعلقہ علاقوں میں ترقیاتی کاموں کے لئے مخصوص بڑے بینک کے مشورے سے کیا جاتا ہے۔ ہر علاقے میں جانچ پڑتال کے لئے بھی ایک جماعت عاملہ قائم کی گئی ہے جس میں ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سینٹر کے جنرل منیجر متعلقہ بینک اور چھوٹی صنعتوں کے سروس انسٹی ٹیوٹ کے ایک ایک نمائندے کے علاوہ ضلع کا روزگار افسر بھی شامل ہوتا ہے۔

یہ جماعت تجارت، خدمتی اداروں اور گھریلو و چھوٹی صنعتوں کے لئے اسکیموں کی نشاندہی اور تیاری کے علاوہ ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے والے افراد کا انتخاب کرتی ہے اور انہیں کام شروع کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ جماعت قرضوں کی سفارش بھی کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ متعلقہ حکام یہ قرضے جلدی سے منظور کر دیں۔ ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سینٹر نئے روزگار لگانے والوں کا انتخاب کرنے اور پراجیکٹ مرتب کرنے کے علاوہ بینکوں اور متعلقہ مقامی اداروں سے بھی واسطہ قائم رکھتے ہیں۔

اس اسکیم کو نئی تقویت دینے کے لئے اسکیم میں حال ہی میں کئی ایک تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ 1986-87 سے صنعتی کاروبار کے لئے قرضے کی حد بڑھا کر 35 ہزار کر دی گئی ہے۔ خدمتوں کے شعبہ میں قرض کی حد اب بھی 25 ہزار روپئے ہی ہے جب کہ تجارتی کاموں کے لئے یہ کم کر کے 15 ہزار کر دی گئی ہے۔

[illegible] کے لئے نئے کاموں کا تناسب بھی مقرر کیا گیا ہے جو 1984-85 میں مختلف تھا۔ ان میں سے کم از کم 50 فیصد ادارے صنعتی ہوں گے اور 50 فیصد سے زیادہ [illegible] ادارے تجارتی نہیں ہوں گے۔

پارٹی موقعوں کے تحت اسکیم میں اس حد تک نرمی پیدا کی گئی ہے کہ صنعتی اداروں کا نائب ٹھیکیدار کے 30 فیصد کر دیا گیا ہے جبکہ چھوٹے جانے کے کاروبار کے لئے تناسب کی کوئی قید نہیں رکھی گئی ہے۔ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مدد کی سطح 25 فیصد رہے گی صنعتی یا خدمتی کاروبار کے لئے امداد کے استحقاق کی شرائط میں وہی نوجوان شامل ہوں گے جنہوں نے کسی صنعتی تربیتی ادارے سے تربیت حاصل کی ہو۔ اسکیم کے تحت استحقاق کا تعین کرنے کے لئے فی کنبہ آمدنی کی سالانہ حد ۱۰ ہزار روپئے سالانہ مقرر کی گئی ہے۔ اسکیم پر عمل درآمد کی نگرانی اور جائزہ کے لئے صنعتی مشاورتی کمیٹی میں پارلیمنٹ اور قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان شامل ہوں گے۔ اسکیموں سے فائدہ اٹھانے والوں میں تین فی صد تحفظیں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لئے کی گئی ہے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس اسکیم کو بہت پسند کیا ہے۔ 84-1983 میں ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سنٹرز کی جماعت عاملہ کو 13 لاکھ 71 ہزار درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے 4 لاکھ 42 ہزار درخواستیں سفارش کے ساتھ بنکوں کو بھیجی گئیں اور ان میں سے 2 لاکھ 42 ہزار درخواست دہندگان کو 401.54 کروڑ روپئے کے قرضے دئے گئے۔ 85-1984 میں 8.97 لاکھ درخواستیں موصول ہوئیں جن میں سے 3.68 لاکھ درخواستیں سفارش کے ساتھ بنکوں کو بھیجی گئیں۔ بنکوں نے 2.29 لاکھ درخواستوں پر 429.53 کروڑ روپئے کے قرض منظور کئے گئے۔ 86-1985 میں بنکوں نے 2.16 لاکھ درخواستوں پر 416 کروڑ روپئے کے قرض دئے گئے۔

اسکیم کو جو نئی تقویت دی گئی ہے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ اور زیادہ تعلیم یافتہ نوجوان اسکیم کا فائدہ اٹھانے کے لئے آگے آئیں گے۔ اور خود روزگاری کے مواقع استعمال کریں گے۔

المختصر یہ آفتاب جو کشن منڈی کے مشرق سے طلوع ہوا حبیب الملّت شاہ کی مسجد سے کسب انوار کر کے یورپ کے مطلع پر تابانی اور حقیقت اسلام کی افشانی کر رہا ہے۔ خدا اس کو تادیر سلامت اور تاباں رکھے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب [illegible] نیت سے [illegible] تشریف لے گئے قرآن کے مطالعہ کی غرض سے پروفیسر [illegible] ترجمہ "قرآن المجید" اس صراحت کے ساتھ پیش کیا گیا [illegible]

سید ہاشم علی اختر

طلباء میں ڈسپلن

خدابخش لائبریری جرنل کے تازہ شمارہ "علی گڈھ تحریک نمبر" میں شائع شدہ ایک اہم انٹرویو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر نے علی گڑھ کے فرزندوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں سماجی برائیوں سے اسی طرح لڑنا ہوگی جس طرح سرسید کی عادت تھی۔ انھوں نے آج کے علی گڑھ کے اساتذہ کے بارے میں کہا ہے کہ آج ہمارے یہاں کچھ ہی اچھے اساتذہ ہیں اور اچھے اساتذہ ہمیشہ قابل عزت ہوتے ہیں، لیکن افسوس ہے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو استاد کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

انھوں نے یونیورسٹی کی فلاح وبہبود پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈسپلن اور طلباء کی بھلائی ان کی سب سے پہلی ترجیح ہے، ہاشم علی صاحب کے بیان کا متن درج ذیل ہے:

"سرسید کے خوابوں کی، میں سمجھتا ہوں، پوری طرح تکمیل نہیں ہوئی! جس طرح ان کو سماجی برائیوں سے لڑنے کی عادت تھی، جس طرح ان کی لوگوں نے مخالفت کی اور وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، اسی دیوانگی کی اب بھی ضرورت ہے۔ میرا ہم اور غیر قانونی اختلافات کی پرواہ کئے بغیر آج ہم سب کو یونیورسٹی کی اور ملک کی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔"

"ضبط ونظم پورے ملک کے لئے ضروری ہے۔ ضبط ونظم کی کمی تمام ہندوستان میں ہے اور علی گڑھ میں بھی ہے، اور جب کبھی کوئی اسے شروع کرے گا، ابتدا میں لوگوں کو ناگوار معلوم ہوگا لیکن کسی نہ کسی شخص کو تو شروع کرنا ہے۔ میں اپنے پروگرام میں ضبط ونظم کو سب سے پہلے اہمیت دوں گا۔ ہم لوگ اتنا بڑا ملک ہونے کے باوجود آج ترقی نہیں کر سکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ورنہ جاپان اور جرمنی وغیرہ وہ چھوٹے ملک جو جنگ میں تباہ ہوگئے تھے، آج معاشی اور صنعتی حیثیت سے امریکہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں! اس لئے ہندوستان کی ترقی کے لئے ضبط ونظم کی سخت ضرورت ہے۔"

"آئے دن یہاں ہر روز ہم کو سینکڑوں فیصلے کرنا ہوتے تھے جن میں ایک پارٹی کا فائدہ ہوتا تھا

وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اور دوسروں کا نقصان۔ ظاہر ہے یہاں چند ایسے لوگ ہمیشہ مخالف رہے کیونکہ ان کے خلاف فیصلہ ہوا۔ کسی بھی بڑے کام کے ساتھ مخالفت اور نکتہ چینی تو ہوتی ہی ہے، اگر ہر بڑے آدمی یا ہر بڑے عہدہ دار کو اپنے دفتر کے ان لوگوں کی باتیں سننے کا موقع مل جائے جو ان کے خلاف باتیں کر رہے ہیں تو وہ ایک دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی میں مختلف قسم کے لوگوں کا ہمیشہ ساتھ رہتا ہے پھر جہاں آپ کام کروانا چاہیں گے ظاہر ہے وہ بھی مخالفوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ لہٰذا مخالفت کی پرواہ کئے بغیر ہم طلباء کے زیادہ سے زیادہ فائدے کے لئے کام کرنا چاہئے۔

" ہمیں اپنے ذہن کو مقصد کی تکمیل کے لئے تیار کرنا ہے۔ ہندوستان میں اس کی بہت کمی ہے کتنے ایسے طالب علموں سے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، میں نے پوچھا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو، لیکن انہیں اپنی منزل کا علم نہیں ہے، میں نے امریکہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں سے جو دس سال سے بھی کم عمر کے تھے معلوم کیا کہ تم کیا بننا چاہتے ہو؟ کسی نے کہا ڈاکٹر، کسی نے انجنیئر، یہاں تک کہ ایک بچے نے کہا کہ میں ٹرک ڈرائیور بننا چاہتا ہوں۔ یعنی ہر شخص کا شروع سے ہی اپنا ایک مقصد ہے، اس لئے ہمیں اپنا مقصد شروع سے ہی متعین کرنا چاہئے اور پھر اس کو پانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

" حالات اتنے مایوس کن نہیں جتنی کہ مایوس کن خود ہماری اپنی کاہلی ہے، ہمیں حالات کے صحیح تجزیہ کی توفیق نہیں، ترقی کی راہیں ہمارے لئے وا ہیں، ضرورت ہے سخت محنت اور کوشش کی، ہمیں سماج میں ایک مقام بنانے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہئے، ہر شخص کو چاہیے وہ استاد ہو یا طالب علم، اپنے سے بہتر کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے، جہاں تک ہماری یونیورسٹی کا معاملہ ہے، بہت اچھے اساتذہ ہمارے پاس ہیں۔ قابل عزت لوگ ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس قابل نہیں کہ استاد کہلائیں۔ بدقسمتی سے یہ عام خیال رہا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادارے کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ جہاں اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے، وہاں نالائق لوگوں کے ساتھ جو ادارے کے لئے نقصان دہ ہیں ایسا رویہ اختیار کرے جس سے ان کو شرمندگی ہو اور اپنی غلطی کا احساس ہو۔

" آپس میں میل جول اور اتحاد پر سوچنے کا انداز، فکر پر مبنی ہو، اور سائنسی نقطۂ نظر ہو، ہم تمام مقاصد کی اشاعت اور تہذیب الاخلاق کے ذریعہ تشہیر ہونا چاہئے۔ کیونکہ اشاعت ہندی رسم الخط میں ہے اور ہمارے ہندی قارئین تک بھی پہنچتا ہے، اس طرح متحد ہو کر ملک کی ترقی کی راہ ہموار کی جا سکے گی سرسید جیسی ایسی بہت سی تصنیفات ہیں جو تعصبات کو دور کرتی ہیں اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جو آپسی تعلقات میں خوش گواری پیدا کرتے ہیں۔ انہیں سامنے لانا چاہئے۔ مثلاً ایک جلسے میں سرسید شامل تھے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ جو مسلمان طالب علم بی۔ اے میں اعلیٰ آئے گا، اسے

ڈی۔ کے۔ سنگھ

ضروری اشیاء کی بہتر فراہمی

اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا سرکاری نظام بھارت میں کسی نہ کسی شکل میں گذشتہ چالیس
موجود ہے۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اس نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ شروع میں اس نظام
صورت حال میں فوری راحت پہنچانے کا ایک طریقہ خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے
ساتھ اس کے مقاصد بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

نظام اور سماجی انصاف کے ساتھ ترقی کے ہمارے نصب العین کے سلسلے میں اور
عام اور خاص طور سے سماج کے کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے معیار
زندگی کی بہتری کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگوں کو مناسب قیمتوں پر ضروری اشیاء
فراہم ہوں گی۔ چنانچہ ایک ایسے عوامی نظام تقسیم کے نظریہ کا انعقاد ہوا ہے
دیہی اور شہری علاقوں اور خاص طور پر سماج کے کمزور طبقوں کے لوگوں کو
اتار چڑھاؤ سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری اشیاء کی مناسب قیمتوں پر
بہم رسانی یقینی بنائی جا سکے۔ یہ نظام نہ صرف قیمتوں میں اضافہ کو روکنے کا
ذریعہ ہے بلکہ یہ غریبوں کے غذائی معیار کو بہتر بنانے میں بھی نمایاں مدد دیتا ہے۔
اس نظام تقسیم کی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی دونوں حکومتوں پر ہے۔ جہاں
حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مقدار ضروری اشیاء حاصل کرے، ان کا ذخیرہ کرے
بیچ کرے اور انہیں مرکزی گوداموں تک پہنچائے وہاں ریاستی حکومتوں اور مرکزی
علاقوں کے انتظامیہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ یہ اشیاء مرکزی گوداموں سے
لے کر انہیں شہری و دیہی علاقوں میں مناسب قیمتوں کی دکانوں کے ذریعہ
تقسیم کرے

مناسب قیمتوں کی دکانیں: لہٰذا اس نظام کی افادیت اور اثر پذیری کا بہت حد تک انحصار ضروری اشیاء کی ذخیرہ اندوزی، نقل و حمل اور مناسب قیمتوں کی دکانوں کے ذریعہ تقسیم کے لئے ریاست، ضلع، بلاک اور گاؤں کی سطح پر ایجنسیوں کی موجودگی پر ہے جو کہ اس نظام کی بنیاد ہے۔

گزشتہ برسوں میں مناسب قیمتوں کی دکانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے جس سے آبادی اور خاص طور پر دیہی، پسماندہ اور دور افتادہ علاقوں کے لوگوں کی ضروریات پوری کی جا رہی ہیں۔ 1979ء میں ان دکانوں کی تعداد 2.39 لاکھ تھی جو 1981ء میں بڑھ کر 2.77 لاکھ ہو گئی۔ 1963ء میں یہ تعداد 2.93 جو 1985ء میں بڑھ کر 3.18 لاکھ اور 1986ء میں 3.39 لاکھ ہو گئی۔ مناسب قیمتوں کی کل دکانوں میں سے 80 فی صد دکانیں دیہی علاقوں میں ہیں۔ اگرچہ زیادہ دکانیں دیہی علاقوں میں ہیں لیکن اشیاء کی مسلسل بہم رسانی کے ذریعہ ان کی افادیت میں ابھی کافی بہتری لائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اب عوامی نظام تقسیم کا زیادہ زور دیہی، دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں میں نظام کی توسیع پر ہے۔ تاکہ اشیاء کی بہم رسانی کو بہتر بنایا جائے اور لوگ مناسب قیمتوں کی دکانوں تک آسانی سے پہنچ سکیں۔

نئے بیس نکاتی پروگرام میں عوامی نظام تقسیم کو مستحکم بنانے اور اس کے مقاصد کی تکمیل پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے تاکہ حکومت جو مالی امداد دیتی ہے اس کے فوائد غریب لوگوں تک پہنچ سکیں۔ یہ مقصد عوامی نظام تقسیم کی خامیوں کا پتہ لگا کر انہیں دور کر کے اور ملک کے تمام لوگوں کو راشن کارڈ جاری کرنے کی خصوصی مہم چلا کر حاصل کیا جائے گا۔ اب تک جن علاقوں میں اور خاص طور پر دیہی، دور افتادہ، پہاڑی، قبائلی، اندرونی اور دشوار گزار علاقوں میں یہ نظام موجود نہیں ہے یا پوری طرح موجود نہیں ہے وہاں جلد ہی پکی یا چلتی پھرتی دکانیں کام کرنا شروع کر دیں گی۔

مناسب قیمتوں کی دکانوں کے مالکوں کو ادارہ جاتی قرضے کی سہولیات مہیا کرنا اور صارفین کے امداد باہمی نظام کی توسیع اس سلسلے کے دیگر اہم اقدامات ہیں۔

ملک کے کچھ ایسے حصوں میں جہاں قبائلی آبادی کا زیادہ حصہ ہے اور بعض پہاڑی اور دور افتادہ علاقوں میں مناسب قیمتوں کی دکانیں مناسب تعداد میں موجود نہیں ہیں ایسے علاقوں میں ضروری اشیاء کی بہم رسانی کے یقینی انتظامات کرنے میں ریاستی حکومتوں کی

کرنے کے لئے حکومت ہند نے 86-1985ء میں آندھرا پردیش، آسام، بہار، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور راجستھان کو 53 موٹر گاڑیاں خریدنے کے لئے 95.20 لاکھ روپئے کی مالی امداد دی۔ 87-1986ء میں منی پور کو نو موٹر گاڑیاں خریدنے کے لئے 19 لاکھ روپئے کی مالی امداد دی گئی۔ مزید چلتی پھرتی دوکانیں بھی چلائی جائیں گی جس کے لئے ایک کروڑ 50 لاکھ روپئے 88-1987ء کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

خصوصی اسکیمیں : حکومت ہند اس بات کو بھی کافی اہمیت دیتے رہی ہے کہ عوامی نظام تقسیم کے ذریعہ جو ضروری اشیاء مہیا کی جائیں ان کا معیار اچھا ہو۔ چنانچہ محکمہ شہری رسدات نے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے گوداموں سے گیہوں، چاول، چینی کے اجراء کے وقت جانچ پڑتال کے ایک مشترکہ نظام کے علاوہ ایک اور اسکیم بھی شروع کی ہے جس کے تحت آیوڈین ملا نمک اور چھوٹی تھیلیوں میں لیوی کی چینی فراہم کرنے کی غرض سے شمال مشرقی خطے کی ریاستوں، اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو پیکنگ کی لاگت پورا کرنے کے لئے صد فی صد امداد دی جاتی ہے۔ چھوٹی تھیلیوں میں آیوڈین ملے نمک اور لیوی کی چینی کی فراہمی اس بات کا یقینی اہتمام کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے کہ اس خطے کی مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے یہ اشیاء جلد خراب نہ ہو جائیں۔ اس اسکیم کے تحت 87-1986ء میں اروناچل پردیش، اور میزورم کو 18.64 لاکھ روپئے کی رقم دی گئی۔

عوامی نظام تقسیم کو غریبی دور کرنے کے پروگرام کا ایک آلۂ کار بنانے کی غرض سے حکومت ہند نے مربوط قبائلی ترقی کے پراجیکٹوں کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لئے نومبر 1985ء میں اناج مہیا کرنے کی ایک خصوصی مالی امداد کی اسکیم کا اعلان کیا تھا۔ اب یہ اسکیم غریبی دور کرنے کے پروگرام کا ایک لازمی جزو بن گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت گیہوں 1.50 روپیہ فی کلوگرام اور عام، اچھا اور بہت اچھا چاول بالترتیب 1.85 روپیہ، 1.95 روپیہ اور 2.10 روپیہ فی کلوگرام کی شرح پر مہیا کیا جاتا ہے۔ ملک کی مختلف ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو دسمبر 1985ء سے ستمبر 1986ء کی مدت کے دوران 13.5 لاکھ ٹن اناج مہیا کیا گیا ہے۔

عوامی نظام تقسیم اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہی ایک پیچیدہ عمل ہے جس میں متعدد ادارے شامل ہیں۔ مختلف سطحوں میں مناسب باہمی رابطے اور بنیادی ڈھانچے کی مناسب سہولیات کے باوجود، اگر پس منظر میں کام کرنے والے لوگوں میں نظام کو کامیاب کرنے کی لگن نہ ہو تو یہ نظام مطلوبہ انداز میں کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اگر یہ لوگ مناسب سوجھ بوجھ

اور تمام ریاستوں کو نظام کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔
انتظامی ہنر مندیوں میں اضافہ کرنے اور رجحانات کو مناسب رُخ دینے کے لئے حکومت
مکمل مالی امداد سے مختلف ریاستوں میں تربیتی پروگرام کا اہتمام کرتی رہی ہے۔ شہری رسد
کے محکمے نے 86-1985ء میں ایسے سترہ پروگراموں کا اہتمام کیا۔ 88-1987ء
ایسے 52 نصابات شروع کرنے کی تجویز ہے جن کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ مخصوص کیا

چونکہ عوامی نظام تقسیم صارفین کی ضروریات پر مبنی ایک نظام ہے اس لئے حکومت
محسوس کرتی ہے کہ اس نظام میں صارفین کے نمائندوں کی شمولیت بہت اہم ہے۔ مختلف
پر صارفین کی مشاورتی کمیٹیوں کے ذریعہ صارفین کے نمائندوں اور سرکاری حکام کے درمیان
تبادلۂ خیال سے اس نظام کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔
صارفین کی اس قسم کی مشاورتی کمیٹیاں تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے
میں ریاستی اور ضلعی سطحوں پر قائم کی گئی ہیں اور زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ ان
کو زیادہ سرگرم بنایا جائے اور مقامی خواتین کو بھی مناسب نمائندگی دے کر انھیں
قیمتوں کی دکانوں کی سطح پر کام میں شامل کیا جائے۔

میں انعام دوں گا۔ سرسید ایک بڑے سیکولرسٹ تھے، وہ سمجھتے تھے ہم سب میں آپس میں
فرق نہیں ہے۔ آج بھی ہمارے بیچ بہت سے ایسے لوگ جو اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ہندوستان ہوا
اسی میں ہے کہ ہم سب آپس میں مل کے رہیں۔
"میں تمام وائس چانسلروں کو خطوط میں تحریر کر رہا ہوں کہ اس دسمبر یا جنوری میں ہر
سے دس دس طالب علم یہاں آئیں اور ہمارے طالب علموں کے ساتھ رہیں، جس سے ان کو معلوم
کے طلبا کتنے شائستہ اور مہذب ہیں۔ ہمارے طلبا کو سب سے مختلف اور دیگر یونیورسٹی کے
لئے مثالی ہونا چاہئے۔ آزاد ہندوستان میں ہماری نوجوان نسل کو تعصب اور نا اتفاقی سے دور رہنا
بہت اہم کام ہے۔"

تبدیل کرنے کا نام ہے۔
ادب اور صحافت کی زبان ایک ہے لیکن لب و لہجہ جداگانہ۔ د
اپنی اپنی جگہ انفرادیت کے حامل ہیں۔ حقیقت اور سچائی دونوں کا شعو
گو ایک واضح ہے اور دوسری مبہم لیکن اہمیت و افادیت دونوں کی

عفت یاسمین*

ادب اور صحافت

ادب کیا ہے اور ادب کسے کہتے ہیں، صحافت کیا ہے اور ادب و صحافت میں کیا فرق ہے؟ نیز وہ کیا قدر مشترک ہے جو ان دونوں کو آپس میں مربوط کرتی ہے ایسے کئی سوالات، قاری کے ذہن میں ابھرتے ہیں جن کا بہ نظر غائر جائزہ لینا ضروری سا ہے۔ کیوں کہ ادب اور صحافت کی مشترک اقدار اور ان میں مابہ الامتیاز چیزیں ہیں ان کی کوئی ماہر فن ہی تجزیئے کے بعد واضح طور پر تشریح کر سکتا ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس سوال پر عالمی فلسفیوں نے مختلف انداز سے بہت کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں لیکن آج تک بھی ادب کی کوئی جامع تعریف متعین نہ ہو سکی۔

جوں جوں وقت گذرتا جا رہا ہے اور حالات بدلتے جا رہے ہیں، اس مفہوم میں مسلسل وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ غالباً اس امر پر دنیا کے تمام مورخ متفق ہیں کہ ادب کوئی ماورائی شئے نہیں ہے۔ اور نہ کوئی حیوانی تخلیق بلکہ اختراع عقل انسانی ہے۔ انسان نے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے جذبات و احساسات کو بغیر کسی دباؤ کے حروف کا جامہ پہنا کر صفحات پر منتقل کیا گیا اس کا منبع اور مخرج ہمیں انسان نظر آتا ہے جسے ہم ادب کہتے ہیں۔ ادب، ماحول کے علاوہ ادیب کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے اور شخصیت ذات کے داخلی و خارجی، فکری اور حقیقی پہلوؤں کے خمیر سے تکمیل کے مدارج طے کرتی ہے۔ دراصل سماجی شعور اور احساس جمال کے امتزاج اور ان دونوں کے اشتراک سے اچھا ادب تخلیق پاتا ہے۔ ادب، بنیادی طور پر ایک آفاقی چیز ہے اس میں موجودہ کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی گذشتہ اور آئندہ کی ہے" ادب ایک پائیدار شئے ہے جس پر وقت کی تبدیلیاں اثر انداز نہیں ہوتیں۔

---

* ایم اے فائنل، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

ادب اپنے عہد کا ترجمان رہا ہے اور ہر بہتر ادبی تخلیق اس دور کی تہذیب و تمدن اور حالات کی بازگشت ہوتی ہے۔

ادب اگر ہیئت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہو اور زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری ہو تو ماہ و سال کی گردش اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور وہ پتھر کی لکیر طرح تاریخ کی سطح پر نقش ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصے کے لئے ادب کا کوئی نمونہ نظروں سے اوجھل ہو جائے لیکن وہ فنا نہیں ہو سکتا۔

جب ادب کے بعض گمشدہ نمونے دریافت ہوئے تو دنیا نے ان کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کیا۔ اس قسم کے ادب کی حقیقت کا تعلق ہیئت کے مواد و متن سے ہوتا ہے اگر اس میں امتدادِ زمانہ کے زیر اثر تبدیلی ہو بھی جائے تو اگر ہیئت چست و درست ہو تو ادب کے اس فنی نمونے کی اہمیت کبھی ختم نہ ہوگی۔

ادب آج کی تازہ خبر قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ادب ایک پائیدار شئے ہے جس پر وقت کی تبدیلیاں اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ ادب ایک جامع، واضح فکر و فن اور مواد و ہئیت کا حامل اور معاشرے کے تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے۔

ادب اگر صرف موجودہ زمانے کا آئینہ ہو، نہ تو گذشتہ سے اس کا تعلق ہو اور نہ آئندہ زمانے سے اس کا ربط تو اس کا مفہوم یہ سمجھنا چاہیئے کہ دراصل یہ ادب نہیں بلکہ صحافت ہے یعنی روز آنہ شائع ہونے والے اخبار کا ایک ٹکڑا جس کی سرخی صبح کے وقت چاہے کتنی ہی تازہ بہ تازہ کیوں نہ معلوم ہوتی ہو شام ہوتے ہوتے بالکل دھندلی ہو کر مٹ جائیگی اور دوسری صبح ویسی ہی کوئی اور سرخی اس کی جگہ لے لے گی۔

گو، ادب اور صحافت الگ الگ صنف سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ اصناف ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی مربوط ہیں۔ ہم ان کے درمیان نہ تو کوئی واضح خط کھینچ سکتے ہیں اور نہ ان کے درمیان کوئی واضح حد بندی قائم کر سکتے ہیں کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بعض اوقات کوئی تحریر ادبی ہونے کے باوجود صحافت کے زمرے

میں شمار کی جاتی ہے اور کبھی کوئی صحافتی تحریر ادب کے حدود میں شامل قرار دی جاتی ہے۔ مغربی ادب اور خود اردو ادب میں کئی ایسی نگارشات ہیں جن کو صحافت کا درجہ دیا گیا ہے اسی طرح جب اخبارات و رسائل کی کتاب کی شکل میں منظرِ عام پر آجاتے ہیں تو ان کی حیثیت ادبی ہو جاتی ہے۔ بقول برنارڈ شاہ:

"ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM."

(پورا ادبِ عالیہ صحافت میں شامل ہے)

صحافت کا مقصد دراصل گرد و پیش کے حالات و واقعات سے قاری کو آگاہ کرنا، پھر ان کی توضیح و تشریح و رہنمائی اور ذہن و فکر کے لئے تفریحِ طبع کے سامان فراہم کرنا ہے۔ کوئی بھی صحافی اپنی تحریروں میں جن حالات کو پیش کرتا ہے اس کا مقصد حالات سے روشناس کرانے کے علاوہ قاری کے ذہن کو ایک مخصوص نقطۂ نظر کا حامل بنا دینا ہے۔ صحافت رائے عامہ کو ہموار کرنے، موثر بنانے اور فعال حیثیت دینے میں نمایاں رول انجام دیتی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک خصوصاً مغربی ممالک میں ادیبوں کیلئے صحافتی ٹکنک سے واقفیت لازمی ہوتی ہے۔ چند ایسے ادیب جنھوں نے اخبارات و رسائل کے لئے مضامین لکھے ان میں سے بعض کی تحریروں نے ادبی حیثیت حاصل کرلی۔ برطانیہ میں ایسے بے شمار ادیب ہیں جنھوں نے دونوں حیثیتوں سے شہرت حاصل کی، ان میں جوزف، رچرڈ اسٹیل، کپلنگ، جی کے چسٹرٹن، برنارڈ شا، اور ایچ جی ویلس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کئی ایسے امریکی ادیب بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں میں ادب و صحافت کو بڑی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ ان میں مارک ٹوئین، ولیم کولن برائنٹ، ارنسٹ ہیمنگوے وغیرہ جن کی تخلیقات ادبی اور صحافتی نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہیں۔

اردو صحافت بھی مغرب کی دین ہے گو اس کی عمر دو صدی ہو چکی ہے لیکن پھر بھی یہ مغربی صحافت کے مقابلے میں نو عمر ہے۔ "اودھ پنچ"، "تہذیب الاخلاق"، "زمیندار"، "نگار"، "الہلال"، "البلاغ"، "پیام" اور اسی طرح کے متعدد اخبارات و رسائل نے تاریخ، ادب، سماج اور تہذیب کو جو زندگی اور

نمائندگی بخشتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اخبارات آج بھی سیاسی واقعات، تبصروں اور ترقیاتی سرگرمیوں کے علاوہ زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آج ملک میں اردو اخبارات، تعداد کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر ہیں اور ملک بھر سے اس وقت بارہ سو چوبیس اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد سب سے زیادہ اخبارات اردو میں شائع ہو رہے ہیں اور ان اخبارات کی تعدادِ اشاعت ۲۵ لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ یہ اخبار سیاسی واقعات اور ترقیاتی سرگرمیوں کے علاوہ زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اردو کے بے شمار اخبارات و رسائل نے آزادی کی جدوجہد میں نہ صرف صحافت بلکہ ادب کو بھی نئے مزاج سے روشناس کیا۔

ادب اور صحافت میں فرق: ادب اور صحافت میں مشترک خصوصیات ہونے کے باوجود ان میں بنیادی فرق موجود ہے۔ ادیب یا صحافی کسی مقصد یا نصب العین سے وابستہ ہوتا ہے۔ ادب کو ہم ذاتی واقعات کا نمونہ قرار دیتے ہیں جبکہ صحافی اپنے طبقے یا اپنی کمیونٹی کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب کم حقیقت پسند، تخیلی اور آئیڈیل ہوتا ہے۔ صحافت میں حقیقت پسندی اور واقعات کی تعبیر و تشریح کی جاتی ہے۔ صحافت کو ایک تیز رو ادب یعنی "LITERATURE IN HURRY" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ صحافت میں وقت اور موقع TIME-LINESS کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جبکہ ادب زمان و مکان سے ماورا ہوتا ہے۔

صحافت اپنے دور اور معاشرے کی عکاس اور صحیح قسم کی صحافت دور کی تاریخ کہلاتی ہے۔ معیاری قسم کی صحافت انسانوں کے معاملات کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ گویا اعلیٰ پیمانے کی صحافت کا مقصد انسانیت کی خدمت ہوتا ہے۔

صحافتی تحریریں مختصر، جامع اور واقعات کو جوں کا توں بیان کرنے والی ہوتی ہیں۔ ادب میں اسلوب اور تصورات پر زیادہ زور دیا جاتا

جبکہ صحافت کا زیادہ تر تعلق اس کے مواد و متن سے ہوتا ہے۔ ادب میں ہیئت کو ترجیح دی جاتی ہے اور ایک مضمون کے تحت بے شمار موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے جبکہ صحافت میں ایک ہی واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ادب واقعات کی تشریح اور ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ صحافت میں کسی بھی واقعہ کا کلائمکس ابتداء میں ہوتا ہے جبکہ ادبی تحریر میں اس کی نوعیت بالکل جدا ہوتی ہے۔ ادب اور صحافت کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہے کہ ادیب کے پیشِ نظر مخصوص قاری نہیں ہوتے اور اس کو پڑھنے والا ایک مخصوص حلقہ ہوتا ہے جو علمی سطح، قابلیت اور جذب کرنے کی صلاحیت سے عام طور پر واقف رہتا ہے۔ صحافی کو پڑھنے والے مختلف علمی سطح اور معیار رکھنے والے قارئین ہوتے ہیں۔ صحافی کے پاس جو خبر کی ابتدا ہوتی ہے وہ ادیب کے پاس انتہا ہوتی ہے۔ صحافت ایک موقتی چیز ہے اور اس کی حیثیت وقتی ہوتی ہے جب کہ ادب لازوال ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ہمہ وقتی ہوتی ہے۔ صحافت میں تخیل کم اور واقعیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ادب کی اہمیت ہر دور میں ہوتی ہے جب کہ صحافت یعنی کل کے اخبار سے ہم کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ قول ایک ممتاز صحافی کا ہے "NOTHING IS SO DEAD AS YESTERDAY'S PAPER"

یعنی "گذشتہ اخبار کی طرح شاید ہی کوئی ناکارہ ہو۔"

صحافت میں صحت و اختصار لازمی ہے اور مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں ہے جبکہ ادب میں مواد کے علاوہ حاشیہ آرائی، مبالغہ آرائی، تخیل زبان و بیان، اسلوب نگارش، عبارت آرائی وغیرہ ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے تبھی وہ شہ پارہ کہلاتا ہے۔ ادب کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن جیسے جیسے سماجی اندازِ فکر میں تبدیلی آئی ادب کے سانچے بھی بدلتے گئے

ادب اب زندگی کا ترجمان بن گیا ہے اور زندگی اب واقعات کے گرد و پیش سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔ اس اعتبار سے روز بروز صحافت کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ خود ادیب صحافت کے ذریعے زندگی کے نت نئے تجربات سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور ادیب کے زاویۂ فکر سے تاثر قبول کرتا ہے اور کسی بھی واقعے کے پس منظر میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ ادیب کا

مار
مقصد زندگی کی تہذیب و تعمیر ہے۔ اس نے صرف انسان کی ذہنی تفریح
ہی فراہم نہیں کئے بلکہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔ ادب۔
مختلف کام لئے گئے ہیں۔ فرانس میں روسو کی ادبی تحریریں انقلاب فرانس
اس طرح ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں "الہلال" "البلاغ" اور دیگر
انگریزوں کے خلاف ایک ہتھیار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سر سید نے اد
مذہبی و سماجی اصلاح کے کام لئے اور ذریعہ تبلیغ بنایا۔ سیاسیات
ادب ہی وسیلہ بنایا گیا۔ غرض ادب ہر دور میں زندگی کا ترجمان رہا
سے ہم ادب کو محدود یا مرکوز قرار نہیں دے سکتے ہیں۔ یہی ادب کبھ
اختیار کر لیتا ہے اور صحافت کے مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب
و فکر اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ صحافت کا بھی انسانی جذبات و
سے گہرا تعلق ہے۔ بعض اوقات کسی ناول سے زیادہ ایک اخبار کی
پھیلا دیتی ہے۔

ادب میں داخلیت یعنی (SUBJECTIVITY)

صحافت میں حالات کی تازگی اور ہنگامیت بنیادی شرط ہے۔ خبر
یہ بھی کی گئی ہے کہ دلچسپی کے حامل واقعات کا بیان جو فوری اور
اس میں نہ رپورٹر اپنی رائے کا اظہار کرے نہ ایڈیٹر اس میں کسی قسم کی
اگر وہ اپنی جانب سے کسی قسم کی جانب داری برتے یا اپنی رائے ظاہر
کی شکل مسخ ہو جائے گی اور اس کی اہمیت گھٹ جائے گی۔

صحافتی مضامین کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ سچائی،
صاف گوئی، آسان زبان و بیان الفاظ کا کم سے کم استعمال اور غیر
پر مبنی ہوں۔ تحریر میں چستی، روانی، سادگی، بے ساختگی، مواد
صحافت کا معیار ہے۔

اخبار ایک ایسا ادارہ ہے جس میں کئی اشخاص کی کاوشیں
ہیں۔ کسی ایک فرد کو غالب حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ خبریں کئی اش
ہوتی ہیں۔ اداریہ بھی مختلف لوگ لکھتے ہیں۔ اس طرح اخبار ایک
مکتبۂ فکر کی اجتماعی رائے کی نمائندگی کرتا ہے اس کے برعکس ادب

پائی جاتی ہے خواہ کتنا ہی بلند پایہ ادیب کیوں نہ ہو اس کے خیالات انفرادی ہوں گے۔ صحافت میں روز آنہ زندگی، زمانہ اور معاشرہ کے وقتی پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ جیسے مختلف جرائم یا ناگہانی حادثات اور بیشتر ایسے حادثات جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔ واقعات کی صورت میں اخبار میں پیش کئے جاتے ہیں۔ گویا عارضی اور وقتی مسائل اخبار میں خبر کی صورت میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مستقل اور دائمی قدروں کو ادب کا موضوع بنایا جاتا ہے۔

ادیب کسی انفرادی واقعہ کو بھی اجتماعی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ علمی اور ادبی تحریروں کے تخلیقی عمل میں بھی واضح فرق موجود ہے۔ صحافی کو ہر روز مقررہ وقت یا مدت میں اپنا کام کرنا پڑتا ہے اور خبریں تیار کرنے والوں کو محدود وقت میں خبریں تیار کرنی ہوتی ہیں جن سے کاپی مکمل ہو جائے۔ اداریہ نویس کو محدود وقت میں مقررہ جگہ کے لئے نپے تلے انداز میں اداریہ لکھنا پڑتا ہے۔ صحافی کے پاس سوچ بچار، الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی بندش کا وقت نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اخبار کے قاری ہر طبقہ اور ذہنیت کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے صحافی کو عام فہم زبان استعمال کرنی پڑتی ہے تاکہ ہر قسم کے ذہن و مزاج اور مزاج کا قاری اس تحریر کو سمجھ سکے۔ اس لئے اس کی تحریروں میں ضرورت سے زیادہ سادگی اور اختصار ہوتا ہے جو ایک فطری امر ہے۔ اس کے برخلاف ادیب کو کسی قسم کی عجلت نہیں ہوتی اور کسی بھی قسم کے ادب کی تخلیق کے لئے گھنٹوں یا ہفتوں اور مہینوں بھی لگا سکتا ہے۔ ظاہر ہے عجلت میں لکھی جانے والی تحریر اور سکون و اطمینان سے لکھی جانے والی تحریر میں واضح فرق ہوگا۔ ادب کا تخلیقی عمل آہستہ روی یا سہل روی سے عبارت ہے اور صحافت زود نویسی اور تیز نویسی کا نام ہے۔ ان تمام مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادب اور صحافت میں مشترک قدروں کے باوجود ان میں بنیادی فرق نمایاں ہے۔ غرض زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کے لئے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جارج سنتیانا نے کہا تھا کہ:

" صحافت واقعات کا اظہار ہے اور ادب واقعات کو خیالات ۔۔۔

مفتی قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

یکساں سیول کوڈ

(اقتباسات خطاب)

بزرگان محترم! ہمارے دوستوں نے آج کے اس اجتماع کا خاص موضوع مقرر کیا وہ ہے "ہندوستان میں یونیفارم سیول کوڈ کے اجراء وانعقاد کا مسئلہ" واقعی یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم اور بہت نازک اور مسلمانوں کو اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا اصل نشانہ کہاں پر ہے۔ دوستو! جیساکہ آپ جانتے ہیں اسلام عرب کے ریگستانوں سے عرب کے بدوؤں کے کاندھوں پر نہیں بلکہ ان کے دلوں میں ایک پوری قوت کے ساتھ، پوری طاقت کے ساتھ، پورے جوش کے ساتھ عرب کے صحراؤں سے باہر نکل کر دنیا کے تمام مہذب ممالک تک جا پہنچا اور اس نے زمینیں تو فتح کیں ہی ساتھ ہی ساتھ دلوں کو بھی فتح کیا۔ زمینوں پر تو ان کی حکمرانی کا جھنڈا لہرایا ہی، لوگوں کے قلوب پر بھی ان کی حکمرانی کا جھنڈا لہرایا۔ عربوں کے ذریعہ جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کی زبان، بول چال، تہذیب معاشرت، ان کی رہائش کا طریقہ، یہاں تک کہ ان کی تعمیرات اور ان کے کھانے پینے پر اور ہر چیز پر اسلام نے اپنا اثر ڈالا۔ اس کی وجہ بھی صاف تھی کہ اسلام چند رسوم کا نام نہیں تھا بلکہ زندگی کے جتنے پہلو اور جتنے رخ ہو سکتے ہیں ان سب پر اسلام محیط ہے۔ ان سب کے بارے میں اسلام نے واضح اور مکمل احکام بیان کر دیے۔ حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایتیں دیں کہ کیا کھاؤ اور کیا نہ کھاؤ اور ارشاد فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی وحی میں فلاں فلاں چیزوں کو حلال پاتا ہوں اور فلاں فلاں چیزوں کو حرام پاتا ہوں جس کا قرآن شریف میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ چاہے کھانے پینے کے بارے میں کسی قوم کی عادت کچھ ہی رہی لیکن اسلام نے ان عادتوں کو بدل ڈالا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے طریقے بتلائے کیسے بیٹھ کر کھانا چاہیے اور کیسے نہیں کھانا چاہیے۔ خود آپ نے کس طرح کھایا اور کس طرح نہیں کھایا۔ حدیث کے صفحات کو پڑھئے تو آپ کو ملے گا ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح

جاتے تھے جیسے کوئی ذلیل بندہ ، بہت ہی پست غلام کھاتا ہو۔ یعنی کھانے کے وقت بھی ان کے دل دماغ پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ایسا تصور حاوی رہتا تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جیسے کسی مالک کے بارے کسی غلام کو کچھ کھانے کے لئے دیدیا جاتا ہے اتنی عاجزی کے ساتھ وہ کھائے۔ انسانوں کی غلامی تو العیاذ باللہ وہ کرنے کو تیار نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی غلامی میں وہ ذرہ برابر کمی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اسی لئے وہ عبد کامل تھے۔ اور کھانے کے دستر خوان پر بھی ان کے کھانے کے انداز میں اس عبدیت کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ کپڑا کون سا پہنتے۔ ریشم مرد پہنیں یا نہ پہنیں اس کے بارے میں ہدایتیں موجود ، سونے کے ذریعہ مرد زینت حاصل کریں یا نہ کریں اس کے بارے میں ہدایتیں موجود ، آپ ازار پہنیں تو ازار ٹخنوں سے نیچے نہ جائے۔ غرض اس طرح کی بہت سی باتیں ہماری آپ کی اس تہذیب کا پتہ دیتی ہیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عقیدۂ توحید اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور اپنی عاجزی اور اپنی تواضع اور اپنے انکسار کا جگہ جگہ مظاہرہ موجود ہے۔ میں اس طرح کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا ورنہ ان احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کو ملے گا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تہذیبی اور معاشرتی حالت کے بارے میں واضح احکام دئیے۔

آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے ظاہر ہونے سے پانسو سال پہلے مصر کی زبان کچھ اور تھی ، عراق کی زبان کچھ اور تھی ، شام کی زبان کچھ اور تھی اسی طرح مراقش کی زبان کچھ اور تھی لیکن اسلام جب باہر نکلا تو اسلام کے ساتھ ساتھ ان سب ممالک کی زبان بھی عربی ہوگئی۔ تہذیب ان کی تہذیب محمدی ہوگئی ، معاشرت ان کی معاشرت اسلامی ہوگئی۔ ایک عظیم الشان انقلاب پورے عالم میں برپا ہوا۔ ہاں جہاں غیر عربوں کے ذریعہ دین آیا وہاں اتنا زیادہ اثر نہیں ہوا ، واسطے کا جو اثر ہوتا ہے وہی ہوا۔ تبدیلیاں تو وہاں بھی آئیں لیکن اتنی بڑی تبدیلی نہیں آئی جتنی بڑی تبدیلی صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین کے مبارک قدموں کے ذریعہ دنیا کے ان حصوں میں آئیں جہاں وہ خود تشریف لے گئے۔

جب مسلمان کمزور پڑے ، ان کا اعتقاد کمزور پڑا اور دوسری قومیں آئیں تو ان کے سامنے بڑا اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان کی حکومتیں چھن گئیں ، ان کی زمین چھن گئی ، اندلس ان کے ہاتھ سے نکل گیا ، اسپین ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اندلس اور اسپین جہاں ابن عربی اندلسی گزرے ، جہاں ابن رشد گزرے ، جہاں ابن خیاط اندلسی گزرے ، جہاں ابن خلدون گزرے ، بڑے بڑے علماء ، ائمہ ، بڑے صاحب فن ، صاحب علم و صاحب فکر

لوگ گزرے، اولیاء اللہ گزرے، مسلمان حکمراں گزرے، قصر الحمراء، مسجد قرطبہ کے باقی گزرے، ایسے ایسے شہروں میں بھی آپ کے ہاتھ سے آپ کی زمین نکل گئی۔ کوئی بھی تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کے ہاتھ سے حکومت اس وقت نکلی جب آپ نے اپنا اتحاد ختم کر دیا، آپ نے اپنے کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا، مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے، اپنے اقتدار کی جڑ کاٹنی شروع کر دی۔ جب آپ تفرقے کا شکار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی آپ سے خلافت چھین لی جس کے ذریعہ آپ آٹھ سو برس تک حکمراں تھے۔

ابھی ابھی ماضی قریب میں ایک بڑا تاریخی حادثہ روسی انقلاب کے ذریعہ آیا جس میں ترمذ، قازان، تاجکستان، ترکستان پورے علاقے جہاں پر آپ عرصہ دراز سے حکمراں تھے اور جہاں آپ نے دین کا بڑا بڑا کام انجام دیا، بخارا کا مدرسہ میر عرب جہاں امام بخاریؒ بیٹھ کر بخاری کا درس دیا کرتے تھے اور لاکھوں علماء ماوراء النہر پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑے بڑے کام انجام دیے لیکن آج صورت حال یہ ہے وہاں کوئی کلمہ پڑھنے والا موجود نہیں ہے۔ ابھی کچھ تازہ خبریں آ رہی ہیں کہ ان میں پھر کچھ زندگی کی رمق پیدا ہو رہی ہے، پھر ان میں کچھ جان آ رہی ہے اور ان میں کچھ تعلق اسلامیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس احساس کو زندہ و تابندہ کرے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا زمانہ انقلاب کی کونسی کروٹ اپنے پردہ میں رکھے ہوئے ہے۔ یہ تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے کوئی بات بعید نہیں ہے لیکن آج تو ہمارے لئے سوائے مرثیہ پڑھنے کے کوئی چارہ نہیں۔ لیکن مرثیہ پڑھنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ عبرت پکڑنا زیادہ عقلمندی کی بات ہے کہ آخر وہ کیا حالات پیدا ہوئے، کس طرح وہاں یہ سارے لوگ ختم ہوئے؟ ظاہر ہے کہ روسیوں کے آتے ہی بخارا، ترمذ یہاں وہاں سے کئی مسلمان بھاگ گئے لیکن بھاگنے والوں کی تعداد اور وہاں رہنے والوں کی تعداد کا مقابلہ کریں تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ پوری آبادی مسلمانوں ہی کی تھی، وہاں غیر مسلم تھے ہی کہاں؟ وہاں سے مسلمان تیس، چالیس، پچاس ہزار بھاگ گئے ہوں تو بھی وہاں جو آبادی رہ رہی تھی وہ تو مسلمان آبادی تھی۔ پھر ان کا اسلام کہاں گیا؟ خطرے کی جو گھنٹی ہے وہ آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی رہتے ہوئے مسلمان نہیں رہے آخر اس کے کیا معنی ہیں؟ کسی کو ... نہیں ہوا کہ کلمہ کی بجائے عیسائیت کا کلمہ پڑھا دیا گیا ہو یا یہودیت کا یا اور کوئی کلمہ پڑھا دیا گیا ہو۔ ایسی کوئی بات ان مسلمانوں میں نہیں ہوئی اور نہ یہ ہوا کہ سارے لوگ وہاں قتل کر ڈالے گئے ہوں اور نہ یہ ہوا کہ ساری آباد

ہاں ہے جیسا کہ مدد سری آبادی وہاں بسا دی گئی ہو۔ ان ساری باتوں میں سے کوئی بات بھی
ہوتا۔ وہی لوگ موجود ہیں۔ وہی محمد بن اسمٰعیل بخاری کی اولاد ہیں، وہی ابن ماجہ، ترمذی
اولاد ہے۔ سارے لوگ وہی ہیں، نسل وہی ہے جن کے آباواجداد مسلمان تھے اور
ام کے داعی تھے اور اسلام کے بڑے بڑے ہیروز تھے لیکن اس کے باوجود آج وہاں
م موجود نہیں ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ آخر ہوا کیا؟ دوستو! شروع میں وہاں بھی
یا کہا گیا تھا کہ آپ نماز نہ پڑھئے۔ کسی آرڈر کے ذریعہ نماز کو روکا نہیں گیا۔ کسی سرکاری
امہ کے ذریعے لوگوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ آپ روزہ نہیں رکھ سکتے۔ آج کے دور میں اس کی
ضرورت نہیں کہ ہم حکم دے کر نماز رکوادیں، آج کے دور کا فرعون موسیٰ کے خوف سے
ہونے والے بچے کو قتل کرے۔ آج کے عہد کا فرعون اپنی تعلیم کے ذریعہ مختلف Medias
متعال کرکے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کرتا ہے کہ کوئی موسیٰ پیدا ہونے ہی نہ پائے
طرح Brain wash کیا جاتا ہے، اس طرح دماغ کی دھلائی اور صفائی کی جاتی ہے
طرح ذہنی ارتداد پیدا کیا جاتا ہے کہ مسجد کی کشش خود بخود ختم ہو جائے۔ بجائے
کے کہ کسی کو لاٹھی کے بل کہیں کہ تو مسجد کو نہ جا، یہ زیادہ آسان ہے کہ یہ کیا جائے کہ
اس کے اندر سے مسجد میں جانے کا داعیہ باقی نہ رہے۔ یہ وہ تکنیک تھی جو ہمارے
اختیار کی گئی۔ اس طرح یہ ہوا کہ آج ساری اسلامی نسل کے موجود ہونے کے بھی
مسلمان موجود نہیں ہیں، اسلام موجود نہیں ہے، کلمہ موجود نہیں ہے، قرآن موجود نہیں ہے
ساجد ہیں تو میوزیم ہیں۔ اگر مسجدیں ہیں تو اس لئے ہیں کہ باہر سے آنے جانے وال[illegible]
کو دکھلا کر فوٹو کھنچوا کر باہر کی دنیا میں شائع کیا جائے کہ یہاں بھی مسلمان رہتے ہیں یعنی
اسی مصالح کے تحت مسجدوں کو ایک عجائب خانے کی حیثیت سے زندہ رکھا گیا ہے لیکن زندہ
ادارے کی حیثیت سے مسجد کا وجود باقی نہیں ہے۔

دوستو! ۱۸۵۷ء کے بعد اس ملک میں بھی شروع میں یہی کیا گیا اور اس کے لئے عیسائیت
تبلیغ کا ایک بہت بڑا مشن یہاں لایا گیا لیکن اس وقت کے علماء نے اس کا مقابلہ کیا۔
علماء بوریا نشین تھے۔ وہ علماء آپ کے دیئے ہوئے چندوں پر جیتے تھے۔ وہ آپ
دروازوں پر بھیک مانگتے تھے لیکن آپ کے بچوں کو پڑھاتے تھے، آپ کے بچوں کو
کھلاتے تھے، آپ کے بچوں کو کپڑا پہناتے تھے، آپ کے بچے مریض ہوں تو
علاج کراتے تھے لیکن کسی طرح بھی مسیحیت کے جبر کر کچھ نہ کچھ لڑکوں کو

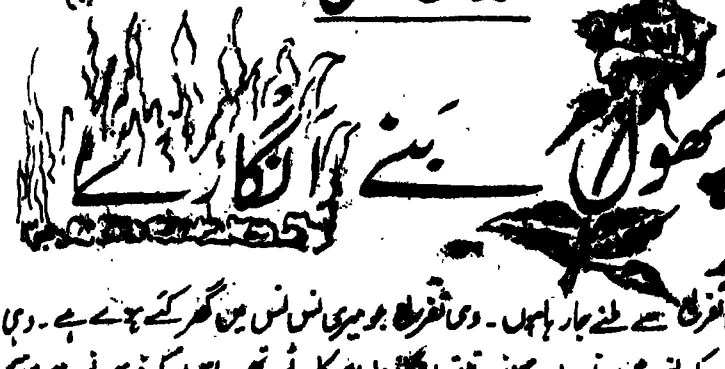
اپنے اپنے حلقوں میں لیکر بیٹھ جاتے تھے اور ان کو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و[سلم]
کے رشتے کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم اخلاق و اعمال کی تربیت دیتے ر[ہتے]
تھے۔ اس کے نتیجے میں کسی گلی کوچے میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اس چٹائی پر بیٹھنے و[الا]
عالم موجود ہوگا جو آج بھی اس کس مپرسی کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی بات کہیں ن[ہ]
کہیں کچھ کہتا ہوا نظر آئے گا۔ دوسرا بڑا سخت وقت ۱۹۴۷ء کا ہے ۔ آپ بھی تو
اس کی سختی سے آشنا ہیں اور ہم بھی آشنا ہیں ۔

۱۹۴۷ء کے بعد انقلاب آیا۔ یہ خونیں انقلاب تھا۔ فوری طرف مسلمان گھبرا گئے او[ر]
پریشان ہوگئے۔ ایک طرف تو ان کے اندر یہ جوش تھا کہ ہمیں پاکستان حاصل کرنا ہے ا[ور]
اچانک جب پاکستان بنا تو انھوں نے کہا کہ یا خدا! ہم تو کہیں نہیں ہیں۔ جس نقشے پر پاکستا[ن]
بنا وہاں تو ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم تو ایک ایسے ملک میں بیٹھے ہوئے ہیں جہاں اکثریت اور اقت[دار]
دوسروں کے ہاتھ میں ہے ہمارے لئے تو جینا مشکل ہے۔ چند برس یہ ہولی، رنگا ولی چلی
آہستہ آہستہ اب لوگ زیادہ عقلمند ہوگئے۔ انھوں نے شروع سے یہ بات سمجھی اور محسوس ک[ی]
ہم کسی بھی ملک سے دس سے لے کر پندرہ کروڑ کی اس عظیم الشان آبادی کو، جو آبادی ا[پنا]
مذہب رکھتی ہے، اپنا عقیدہ رکھتی ہے، اپنا نظام قانون رکھتی ہے، اپنی مستقل تہذیب [رکھتی]
ہے، اپنے اصول معاشرت رکھتی ہے، اپنا اصول اخلاق رکھتی ہے، جینے اور مرنے کا، شا[دی]
اور بیاہ کا، اٹھنے اور بیٹھنے کا، ہر چیز کا اس کے ہاں ایک منضبط قانون ہے، ایسی ز[ندہ]
منضبط امت کو ہم چند فسادات کے ذریعہ کاٹ کر ختم نہیں کر سکتے اور نہ ان کے عقائد وا[عمال]
کو یوں بدلا جا سکتا ہے تو لازمی صورت اس کی یہ ہے کہ جب تک ہم ان کا رشتہ ان کے
سے نہیں کاٹ دیتے اس وقت تک یہ امت ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ قوت اور پاور کی
سپلائی لائن ہے اور ان کا جو رشتہ ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب
برقرار رہتا ہے اور جب تک یہ Main Stream ہے اور یہ اصل قومی دھارا ہے جب
ان کو اس میں مدغم نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک یہ اپنے وجود کو قائم اور باقی رکھیں گے
علیحدہ اور ممتاز رہیں گے اور کبھی بھی یہ مل کر فنا نہیں ہو سکتے۔ تو دوستو! اب یہ ترکیب
سوچی گئیں اسکولوں کا نصاب تعلیم بدل ڈالو۔ نصاب تعلیم میں ان کے بچوں کو ایسی با[تیں]
پڑھاؤ کہ ان کو اپنے کو مسلمان کہنے میں شرم محسوس ہو۔ مثلاً تاریخ کی ایک کتاب میں
خود دیکھی کہ اس میں علاء الدین خلجی کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ پکا مسلمان تھا، کٹر مسلمان

قرآن کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ یہ تین جملے اس کے شروع میں تھے، بیچ میں کچھ اور واقعات اور اس کے پانچ دس سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ اس نے دس برہمنوں کو آگ میں جلوا دیا۔ ایک مسلمان حکمران کے بارے میں پہلا تصور یہ کہ وہ معمولی مسلمان نہیں تھا بلکہ قرآن کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا تھا اور دوسری طرف یہ تصور کہ اس نے دس زندہ انسانوں کو آگ میں جلوا دیا سوائے اس کے کہ ایک مسلمان پڑھنے والا بچہ شرم کے مارے اپنی گردن جھکالے کہ ہمارا مذہب زندہ انسانوں کو آگ میں جلا دینے کی بات کہتا ہے وہ اپنے کو خود مسلمان کہلانے میں عار اور شرم محسوس کرے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس طرح ذہنوں کو بدلا جاتا ہے۔ کلاسس میں ہاتھ جڑوانے کی عادت ڈلوانا، السلام علیکم کے طریقے کو چھڑوانا، غیر اسلامی اور مشرکانہ تہذیب کے زہریلے اثرات کو تعلیم اور تربیت کے ذریعے کچے اور خام ذہنوں میں اس طرح سمونا کہ یہ تو گیلی مٹی ہیں انکو جس طرح چاہیں کمہار کی طرح صورت دے دیں۔ یہ سمجھدار اساتذہ اور غیر ہمارے ان بچوں کے ذہن کی ایسی تشکیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آہستہ آہستہ خود اپنے مذہب کے بارے میں بدظن ہوکر، اپنی تاریخ کے بارے میں بدگمان ہوکر، اپنی تاریخ کے عظیم الشان ہیرو اور ابطال اور بڑے بڑے بہادروں کے کارناموں سے ناآشنا رہ کر خود اپنی تاریخ فراموش کر بیٹھیں، اپنے وجود کو بھلا بیٹھیں، اپنے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب کو بھلا بیٹھیں، اسلام کی تہذیب کو بھلا بیٹھیں۔ ایک ایسی ذہنی مرعوبیت تعلیم کی راہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی تاکہ مسلمان لڑکے آنے والے زمانے سے صلح کر لیں۔

جب ہندوستان کا دستور بن رہا تھا اس وقت سے ان کی اسبابات کی کوشش رہی کہ ہندوستان کی تعریف یوں کرتے کہ یہاں کی ہندو تہذیب بڑی وسیع الظرف اور بڑی فراخ حوصلہ ہے کہ باہر سے جو آیا اسے سمیٹ کر کلیجے سے لگایا اور مسلمان جب سے آئے ہیں یہ الگ الگ سے رہتے ہیں۔ اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جتنی بھی تہذیبیں آئیں انھوں نے ان کو اس طرح اپنے اندر ہضم کر کے فنا کر دیا کہ کسی بھی تہذیب کا وجود یہاں باقی نہیں رہا وہ فراخ حوصلگی نہیں ہے۔ دراصل کسی ایسی تہذیب کو یہاں زندہ نہیں رہنے دیا گیا جو اپنا الگ امتیازی نشان رکھ سکتی۔ کسی بھی ملت کے امتیازی خطوط کو، تہذیبی امتیازات کو، ان کی ملی شناخت کو برقرار نہیں رہنے دیا گیا۔ اس لیے بے شک مسلمان جب آئے تو انھوں نے کسی بھی قیمت پر اپنے تہذیبی خطوط کی حفاظت کی ہے۔ پہلے تو خیر حاکم ہی تھے لیکن جب یہ محکوم ہوئے اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی شناخت کو مٹنے نہیں دیا۔ (باقی آئندہ)

شجاع کامل



میں تفریح سے ملنے جا رہا ہوں ۔ وہی تفریح جو میری نس نس میں گھر کئے ہوئے ہے ۔ وہی تفریح جس کے بغیر میں نے چار مہینے تپتے انگاروں پر کاٹے تھے ۔ اس کے نہ ہونے سے موسم بہار مجھے تپتا ہوا ریگستان محسوس ہوتا تھا ۔ میں سوچنے لگا "تفریح مجھے دیکھ کر حیران رہ جائے گی ۔ دوڑ کر میری کھلی باہنوں میں چلی آئے گی اور پھر ہر دن روز عید اور ہر شب شب برات !!"

میرے قدم تیز تر سے تیز تر ہوتے گئے ۔ میں اپنی منزل سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جا رہا تھا ۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں ۔ میرا دل خوشی اور انجانی مسرت سے سرشار ہوا جا رہا تھا ۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اس لفافہ پر چلا گیا جو میرے اور تفریح کے سہانے خوابوں کی تعبیر تھا ۔ وہی حسین اور رنگین خواب جنہیں ہم دونوں نے اٹھتے بیٹھتے ، سوتے جاگتے دیکھا تھا ۔ میرا ذہن ماضی کی گہری جھیل میں ڈوبتا چلا گیا ۔ تب میں بی اے کے آخری سال میں پڑھتا تھا ۔ میں امتحان دے کر اپنی چھٹیوں کو پرلطف بنانے کے لئے حیدرآباد آنٹی کے گھر چلا گیا تھا ۔ وہیں تفریح سے میری ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات میرے لئے زندگی کا پیغام بن کر آئی ۔ میری آمد نے جہاں بیٹی کے پیار کی جوالا آنٹی کے دل میں بھڑکا دی تھی وہیں دوسری طرف تفریح کے خوابیدہ ارمانوں کو بھی بیدار کر دیا تھا ۔

تفریح متوسط قد اور خوبصورت خدوخال کی لڑکی تھی ۔ شاخ گل کی طرح لچکتا ہوا مرمریں جسم ، جھیل کی طرح گہری اور سمندر کی موج کی طرح متلاطم آنکھیں جن میں شدت سے ابھرتا عکس ہی بیٹھا تھا ، گلاب سے سرخ و شاداب رخسار ، سیب کی قاشوں کی طرح پتلے پتلے رسیلے ہونٹ ، ناگن کی طرح لہرانی کالی زلفیں ، بات کرے تو ایسا محسوس ہو جیسے فضاؤں میں مترنم گھنٹیاں بج اٹھی ہوں ۔ غرض قدرت کا لائق ترین شاہکار ۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے لگے ۔ اندھیروں نے اجالوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں ۔ گھر کا کونہ کونہ ہماری محبت کی خوشبو سے مہکنے لگا ۔ باغ کی ہر روش گواہ بنا

مکان ۸-۳-۵۳-۲ ، آزاد روڈ - پربھنی ۴۳۱۴۰۱ (مہاراشٹرا)

محبت کی راز دار اور امین تھی۔ محبت کی مسند و سے چڑھتی اس حسین و جمیل بیل پر آنٹی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض تو بس فاروق کرتا تھا۔ [illegible] کا گرویدہ تھا۔ رنگین مزاجی اور سرپھرے کرتوتوں ہوا دولت کا نشہ کبھی اسے تفریح کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔ میری شوخیوں کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا میں تفریح کو چھیڑا کرتا "تیری محبت میں تمہارے رخسار شعلوں کی طرح دہکنے لگے ہیں، آنکھیں شراب سے لبریز پیمانے بن گئی ہیں، تمہاری جوانی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی ہے، تمہارا حسن چاند کی چاندنی کو شرمانے لگا ہے۔" وہ سچ مچ شرما جاتی اور میری باہوں میں سمٹ آتی اور مجھے لگتا کہ وقت یہیں ٹھہر جاتا۔

جب فاروق کے جذبۂ اشتیاق نے زور مارا تو اس وقت تک میں تفریح کو لے کر پیار و محبت کے حسین چمن میں بہت دور نکل چکا تھا۔ فاروق نے لاکھ کوشش کی کہ وہ تفریح کا دل جیت لے مگر اسے سرفرازی نہ حاصل ہو سکی جو میرا مقدر بن چکی تھی۔

ایک دن اچانک مجھے ٹیلی گرام ملا۔ ابا کی طبیعت خراب تھی۔ میں نے اپنا سامان باندھا اور تفریح سے پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ گھر آکر میں پریشانیوں میں گھر گیا۔ اباجی مرحوم زندگی میں ہی اپنا سارا اثاثہ اپنی فضول خرچیوں کی نذر کر چکے تھے۔ باقی پونجی آخری دنوں میں کام آ چکی تھی۔ اس دوران تفریح سے برابر خط و کتابت جاری رہی۔ پہلے دو چار خطوط میں تفریح میری ہمت بندھاتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ خطوط کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد تو خط آنا بند ہو گئے۔ لیکن تفریح میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ اس کا تصور میرے دل کو فرحت بخشتا رہا اور مجھے زمانے سے لڑنے کا حوصلہ دیتا رہا۔ میں ہمیشہ اس کی یاد میں گم رہتا۔ تھکی تھکی سانسوں کے ذریعہ یہ دن بھی گزر گئے اور آج تمام گلے شکوے بھول کر اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور خواہشات کو لالہ زار بنانے، تپتے ہوئے ریگستان کو سیراب کرنے خود اپنی غرض کے لئے تفریح سے ملنے جا رہا ہوں۔ ماضی کے خوبصورت دنوں کو دیکھتے ہوئے راستہ کا پتہ نہ چلا۔ جو نکلا تو تفریح کے مکان کا خوبصورت گیٹ میرا منتظر تھا۔ لان میں ہی آنٹی سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے لگا کہ وہ اچانک مجھے اپنے سامنے پا کر کچھ گھبرائی ہوئی ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد میں اُن کا بتلایا ہوا مشورہ خود ذہن نشین کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دل انجانے خطرات پر نہ چاہتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا۔ انجانا خلش انتظار کی لذت میں عجیب سی گھٹن گھول رہا تھا۔ یہ انتہا ہو گئی جب میں لان میں آیا تو کچھ ہی دیر بعد وہ سماں میرے سامنے آگیا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ تفریح، فاروق کی باہوں میں باہیں ڈالے جھکتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی ہی خوشی تھی۔ کہیں بھی میری.......!

فاروق کا چہرہ جیتے ہوئے جواری کی طرح خوشی سے چمک رہا تھا جو مجھے غیر متوقع طور پر دیکھ کر پھیکا پڑ گیا۔ "تفریح! چلو چلیں! کل تیار رہنا فلم دیکھنے چلیں گے۔ اور ہاں سنو.....!! وہ فضا میں بوسہ

اچھال کر چلا گیا تو تفریح میری طرف پلٹی "آپ!" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی اور بنا کچھ کہے اپنے کمرے کی طرف مڑی۔ میرے سامنے دیئے جیسا آگ ہوا آنچل بھیگتی چلی گئی۔ لانبی کی شفاف صحن کی گھاس پر گرے گرے مجھے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے دیکھتے ہوئے شعلے میرے پیروں تلے رکھ دیئے گئے ہوں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا تفریح کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ میری نظر ٹیبل پر رکھے ہوئے صفحہ نما پر پڑی جس پر تصویر تھی اور فاروق دونوں شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔ جہاں شادی کی ...... تفریح کی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی نے تصویر کا مطلب اور واضح کر دیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

"منگنی مبارک ہو"......! تفریح خاموش رہی۔

"شادی کب ہے ـــ؟" میں نے پھر پوچھا۔

"پہلی جنوری کو......!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا! تو میرے لئے نئے سال کا تحفہ یہی ہے؟ ـــ"

"تم یہی سوچ لو ـــ..." تفریح نے ایک طمانچہ میرے گال پر رسید کر دیا۔

"کیا تم فاروق سے محبت کرتی ہو ـــ؟"

"کرنا سیکھ جاؤں گی ـــ! اور پھر زندگی میں محبت ہی سب کچھ نہیں۔ محبت بھوک نہیں مٹا سکتی۔ تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نہیں مہیا کر سکتی۔ صرف محبت سے اونچی سوسائٹی میں کوئی اعلیٰ مقام نہیں مل سکتا اس کے لئے دولت چاہیئے ـــ اور مجھے تو ایک بہت ہی خوشگوار زندگی چاہیئے۔ رہنے کے لئے عالی شان فلیٹ کار اور پہننے کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے اور زیور جو سوسائٹی میں مجھے منفرد مقام دلا سکیں" تفریح جب سانس لینے کے لئے رکی تو میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا "اور یہ سب میں تمہیں......!"

"......نہیں دے سکتے! یہی کہنا چاہتے ہو نہ؟ میرا فیصلہ اٹل ہے جو میرے مستقبل کے پیش نظر غلط نہیں۔ اور اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ـــ"

میری گرفت جیب میں رکھے ہوئے اس لفافے پر مضبوط ہو گئی جس میں وہ حکم نامہ تھا جس کے ذریعہ فورڈ کمپنی نے مجھے منیجر شپ کے عہدے کے لئے بلایا تھا۔ کمپنی کے مالک ابا جی کے گہرے دوست تھے۔ خط میں صاف لکھا تھا کہ مجھے رہنے کے لئے ایک خوبصورت بنگلہ، مرسڈیز کار اور پانچ ہزار روپئے ماہانہ تنخواہ ملے گی جو میرے اچھے کام کرنے پر بڑھ بھی سکتی ہے۔ میں تفریح سے بنا کچھ کہے اس کے کمرے سے باہر نکل آیا لان پار کیا اور اب میں اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا ہوں۔ قریب کے پوسٹ آفس سے میں نے ٹیلیگرام دیا ایک کمپنی کے مالک کو کہ "میں کل شام کی ٹرین سے پہنچ رہا ہوں ـــ" اور دوسرا ابا جان کو کہ "مجھے آپ کی

[illegible]

مصنف : امین مالوف
مترجم : قاضی جلیل احمد

صلیبی جنگیں عربوں کی نظر میں (قسط ۸)

معرۃ کے آدم خور

"یہ میرا پیارا وطن، نہیں معلوم وہ میرا گھر باقی رہے گا یا جنگلی جانوروں کی چراگاہ بن جائے گا"
معرۃ کے ایک گمنام شاعر کے یہ الفاظ محض شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ ۱۰۹۸ء کے دنوں میں جو شیطانی ال شام کے شہروں میں فرنگیوں سے سرزد ہوئے ان کی سچی عکاسی ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والا کل کیا لائے گا؟

فرنگیوں کے آنے تک معرۃ کے لوگ امن اور چین کی زندگی گذار رہے تھے۔ ان کے انگور، انجیر اور زیتون کے باغات ان کے لئے ایک آسودہ زندگی بسر کرنے کا ذریعہ تھے۔ شہر کے ارباب حل و عقد شہر کے بااثر امراء اور اہل دانش تھے جن کی امنگیں، حوصلے اور خواہشیں بس اوسط اور واجبی سی تھیں۔ یہ لوگ برائے نام حلب کے بادشاہ رضوان کے زیر حکومت تھے۔ اس شہر کی شہرت آج بھی اس عظیم نابینا عرب شاعر کی وجہ سے ہے جس کا نام تھا ابوالعلی معرّی جس کا ۱۰۵۷ء میں انتقال ہوا۔ یہ نابینا شاعر ایک آزاد مفکر تھا جس نے اپنے دور کے امراء اور عمائد کی نفس پروری پر ضرب لگائی۔ عوام کی توہم پرستی کا مضحکہ اڑایا۔ واقعی اس قسم کے اشعار کہنے کے لئے بڑی آزادی فکر کی ضرورت ہے۔

اس سرزمیں پہ دو طرح کے لوگ بستے ہیں
ایک وہ جن کے پاس دماغ ہے لیکن مذہب نہیں
اور دوسرے وہ جن کے پاس مذہب ہے لیکن دماغ نہیں

۲۔ گولسٹن روڈ۔ فارسٹ گیٹ۔ لندن ای/۷ (یو۔کے)

اس کی موت کے چالیس سال بعد عصبیت کا ایک سیلاب مغرب سے اٹھا اور اس شہر پر نازل ہوگیا جس نے معرّی کے اس فرزند کے کہے ہر لفظ کو سچ کر دکھایا ۔ نہ صرف اس کی لاادریت کو بلکہ اس کی قنوطیت کو بھی ۔

" تقدیر ہمیں پٹک کر یوں چکنا چور کرتی ہے جیسے ہم شیشے کے بنے ہوئے ہوں
اور ہمارے بکھرے ہوئے یہ ریزے پھر کبھی نہیں جوڑے جاتے "

عنقریب اس کا شہر بھی ایک تباہ شدہ ڈھیر میں تبدیل ہونے والا تھا ۔ اور شاعر کی اپنے ابنائے وطن کی عقل و دانش سے مایوسی سچ ثابت ہونے والی تھی ۔

۱۰۹۸ء کے پہلے چند مہینے اہل معرّی انطاکیہ میں برپا جنگ کو تشویش کی نظر سے دیکھتے رہے یہ دونوں شہر صرف تین دن کی مسافت پر تھے ۔ انطاکیہ کی شکست کے بعد فرنگیوں نے آس پاس کے شہروں پر تاختیں شروع کیں، اور گو خود معرّی ان کی دست برد سے عرصہ تک بچا رہا لیکن شہر کے اکثر خاندانوں نے شہر کا تخلیہ کر کے دور دراز مقامات جیسے حلب، حمص، حما وغیرہ میں سکونت اختیار کرنی شروع کی ۔ اُن کا یہ تردد واقعی درست ثابت ہوا کیوں کہ اُسی سال ماہ نومبر میں فرنگیوں کی ہزاروں کی فوج نے معرّی کا محاصرہ کر لیا ۔ بعض اہل شہر اس محاصرے کے باوجود نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے لیکن اکثروں کو قلعہ ہی میں محصور ہو جانا پڑا ۔ شہر میں کوئی فوج نہ تھی بس اہل شہر کاٹنے ہتھیار اٹھالئے تھے جن کی نہ جنگی تربیت تھی نہ ہتھیار چلانے کی مشق ۔ پھر بھی دو ہفتوں تک انہوں نے جم کر دشمن کا مقابلہ کیا بلکہ ایک بار تو شہد کی مکھیوں کے چھتے فرنگیوں پر پھینک کر انھیں کافی نقصان پہنچایا ۔

ابن الاثیر لکھتا ہے کہ محصورین کی ہمتوں کو پست کرنے کے لئے فرنگیوں نے لکڑی کے متحرک مینار بنائے جو شہر پناہ کی برجیوں کے برابر اونچے تھے ۔ بعض مسلمانوں نے خوفزدہ ہو کر سوچا کہ فصیلوں کو چھوڑ کر شہر کی اونچی اونچی عمارتوں میں پناہ لیں ۔ اس لئے وہ شہر پناہ کی فصیلوں سے ہٹ آئے اور یکے بعد دیگرے کسی فصیل پر ایک محافظ بھی باقی نہیں رہا ۔ فرنگیوں نے اطمینان کے ساتھ سیڑھیاں لگا کر شہر پناہ کی فصیل پر چڑھنا شروع کیا ۔ اور اتنی بڑی فوج کو شہر کی فصیلوں پر دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے ۔

۱۱ر ڈسمبر کی ایک گہری سیاہ رات تھی ۔ فرنگیوں نے ابھی شہر میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کی تھی ۔ اہل شہر نے انطاکیہ کے نئے بادشاہ بوہمینڈ سے صلح کی بات چیت شروع کی جو اس حملہ کی قیادت کر رہا تھا ۔ فرنگی کمانڈر نے وعدہ کیا کہ اگر شہر کے باشندے ہتھیار ڈال دیں اور شہر کا

بعض عمارتوں سے ہٹ آئیں تو ان کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ ناچار اس کے وعدے پر اعتماد کرکے انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور شہر کے ایک مقام پر جمع ہوگئے، اور ساری رات خوف و ہراس کے عالم میں بسر کی۔

فرنگی علی الصبح شہر میں داخل ہوئے۔ اور ہر طرف بربادی پھیل گئی۔ تین دن تک عام باشندگانِ شہر کے قتل کا بازار گرم رہا۔ لاکھوں قتل ہوئے یا غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے۔ ابن الاثیر کے اعداد و شمار ہمیشہ کی طرح مبالغہ آمیز ہیں، کیوں کہ شہر کی پوری آبادی بھی دس ہزار سے کم تھی۔ لیکن اس معرکہ کی خون آشام درندگی مرنے والوں کی تعداد میں نہیں بلکہ اُن واقعات میں ہے جو پیش آئے۔ یہاں ابن الاثیر کے بجائے ایک فرنگی وقائع نگار رروڈالف آف کین کا بیان نقل کیا جاتا ہے:

" شہر معرہ میں ہماری فوج نے ان کافر نوجوانوں کو پکانے کے برتنوں میں ڈال کر اُبالا۔ بچوں کو سیکڑیوں اور انگیٹھیوں پر بھون کر چٹ کر گئے۔ وقائع نگار کے یہ الفاظ آس پاس کے گاؤں والوں نے نہیں پڑھے لیکن جو کچھ ان کی آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا اس نے عربی شاعری کا چولہ پہن کر بقائے دوام حاصل کر لیا۔ اُسامہ بن منقذ جو اس سانحے کے تین سال بعد شہر شیراز میں پیدا ہوا اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

" وہ لوگ جو فرنگیوں سے بہتر واقف تھے وہ انھیں برتر جسمانی طاقت، بلند ہمتی اور اعلیٰ جنگی قابلیت میں اپنے سے بہتر تسلیم کرتے تھے۔ لیکن اس ہٹ کر کچھ نہیں۔ جیسے جانور جسمانی طاقت میں انسان سے برتر ہوتا ہے۔"

اہلِ فرنگ کے تعلق سے یہ تخمین خواہ کتنی ہی بیدردانہ کیوں نہ دکھائی دیتی ہو ان کی اس وقت کی حالت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اہلِ فرنگ کے برتاؤ نے سارے ملک شام میں خوف اور حقارت کی ایک ملی جلی کیفیت پیدا کی۔ کیوں کہ فرنگ کے برعکس عرب ایک ایسی قوم بن گئے تھے جو تہذیب اور اخلاق میں بلند لیکن شجاعت اور بہادری میں بہت پست ہو چکے تھے۔ ترک اہلِ یورپ کی اس مردم خوری کو کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ ان کے سارے رزمیہ ادب میں اہلِ فرنگ کو (Anthropophagi) کہا گیا ہے۔

فرنگ کے متعلق یہ تاثر کیا غلط تھا؟ کیا یہ مغربی حملہ آور اپنے مفتوحہ شہروں کے شہیدوں کا گوشت صرف غذا کے لئے استعمال کرتے تھے؟ ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں نے پوپ کے نام اپنے مراسلات میں اس عمل کی یہی توجیہ بیان کی ہے۔ معرہ کے محاصرے کے دوران فوج کو ایک

زبردست قحط سالی سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کی وجہ سے ان عرب کافروں کا گوشت کھانے کی نوبت آگئی۔ لیکن اس توجیہہ میں کچھ جان نہیں ہے۔ کیوں کہ معرّی کے باشندوں نے ان فرنگیوں کا جو گھناؤنا طرزِ عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کی توجیہہ محض بھوک سے نہیں ہوسکتی ۔ مثلاً انھوں نے دیکھا کہ گلی کوچوں میں چکر لگانے والے فوجی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ وہ عربوں کو گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے ۔ اور اپنے رات کے الاؤ کے پاس بیٹھ کر انہوں نے ایسا کرکے دکھایا ۔ کیا یہ مردم خوری کسی خاص سبب سے تھی ؟ یا اُن کی حد سے بڑھی ہوئی عصبیت کی وجہ سے اس سلسلے میں البرٹ آف اکیس کا صرف ایک جملہ یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔ یہ شخص اس معرکہ میں شریک تھا ۔ اور اس نے اپنا چشم دید حال تحریر کیا ہے :

" ہماری فوج کے لوگ صرف مردہ عربوں اور ترکوں کا گوشت ہی کھاتے تھے بلکہ کتوں کا گوشت کھانے میں بھی انہیں کوئی باک نہ تھا "

ابو العلیٰ کے شہر پر آفت بالآخر اس وقت اختتام کو پہنچی جب سارے لوگوں کو تہ تیغ کرنے اور شہر کی دیواروں کو مسمار کرنے کے بعد فرنگیوں نے شہر کی عمارتوں کو گلی گلی کوچہ کوچہ چھان کر آگ لگا دی۔ معرّی کے سانحے نے عرب اور فرنگ کے درمیان دشمنی اور عداوت کا ایک ایسا باب کھول دیا جو صدیوں تک بند نہ ہوسکا ۔ اگرچہ کہ وقتی طور پر اہلِ شام کے حواس معطل ہو گئے تھے اور ان میں مدافعت کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی ۔ اس لئے جب اہلِ فرنگ نے جنوب کی طرف اپنا سفر شروع کیا تو شامی امیروں نے تحفے تحائف سے لدے ایلچی ان کے پاس روانہ کرکے اُن سے خیر سگالی کا اظہار اور ہر طرح کی امداد کا پیش کش کرنا شروع کر دیا تھا ۔

ایسا کرنے والوں میں سب سے پہلا شخص سلطان ابن منقذ تھا جو مشہور وقائع نگار اُسامہ بن منقذ کا چچا تھا ۔ اور شیراز نامی ایک چھوٹی سی ریاست کا حاکم تھا ۔ فرنگی معرّی سے نکلنے کے بعد بہت جلد اس کی ریاست کے حدود میں پہنچ گئے ۔ ان کا سالارِ اعلیٰ ریمنڈ سینٹ جائیلس تھا جس کا عرب مورخوں کے وقائع میں کثرت سے ذکر ملتا ہے ۔ امیر شیراز نے ریمنڈ کے پاس ایک سفارت روانہ کی اور فی الفور ایک معاہدہ طے پا گیا ۔ سلطان نے نہ صرف ان کی رسدات کی فراہمی کی ذمہ داری لی بلکہ شیراز کے بازاروں سے گھوڑے خریدنے کی بھی اجازت دی اور آگے راستہ بتانے کے لئے ماہر راہ بر بھی مہیا کئے ۔

اب سارے ملک شام کو فرنگیوں کی پیش قدمی کی اطلاع ہو چکی تھی ۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کی منزلِ مقصود بیت المقدس (یروشلم) ہے جہاں ان کے پیغمبر حضرت عیسیٰ کا

ہے۔ لہٰذا راستے میں پڑنے والے تمام شہروں اور بستیوں نے حفاظتی اقدامات کرنے شروع کر دئے۔ جو لوگ غریب تھے انہوں نے اطراف کے جنگلوں کی پناہ لی اور شیروں بھیڑیوں اور ریچھوں کی رفاقت کو فرنگیوں پر ترجیح دی۔ جن کے پاس پیسہ تھا وہ اندرون ملک دور دراز مقامات پر منتقل ہو گئے۔ بعض لوگوں نے قریبی گڑھیوں اور قلعوں کا رخ کیا جیسے جنوری ١٠٩٩ء میں بکایا کے کسانوں نے اپنے اہل و عیال اور جانوروں کو لے کر حسن اُل ارکاد میں پناہ لی جو ایک بڑی پہاڑی پر واقع تھا اور جہاں سے بحیرہ روم کے ساحل تک کا سارا علاقہ دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ یہ قلعہ عرصۂ دراز سے غیر آباد تھا لیکن اس کی دیواریں اب بھی بدستور قائم تھیں لیکن اہلِ فرنگ جن کے پاس رسدات کی ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ اُن کے پیچھے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ٢٨ رجنوری کو فرنگیوں نے فصیل کی دیواروں پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر اہلِ شہر نے قلعہ کا پھاٹک کھولا اور اپنے جانور باہر ہانک دئے۔ اس کو دیکھ کر فرنگ ساری جنگ بھول گئے اور اُن جانوروں کی طرف لپکے۔ فرنگی فوجوں کی اس افراتفری نے قلعے والوں کی اتنی ہمت بڑھائی کہ انہوں نے فرنگی کیمپ پر حملہ کر دیا۔ اور سینٹ جائیلس بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا اور گرفتار ہونے سے بچا۔

اہلِ شہر کو پتہ تھا کہ اب ان کی خیر نہیں۔ فرنگی فوج جب واپس ہوگی تو اُن کا سامنا کرنا مشکل ہوگا۔ چنانچہ دوسرے دن فرنگیوں نے پھر قلعہ پر حملہ کر کے فصیلوں پر چڑھائی شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ قلعہ کی عمارتوں سے باہر نکل کر کوئی اُن کے مقابلے پر نہیں آیا۔ وہ حیران تھے کہ اہلِ قلعہ کی یہ کون سی نئی چال ہے؟ اور واقعی یہ اہلِ قلعہ کی سب سے زیادہ شاطرانہ چال تھی۔ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر وہ قلعہ سے کوچ کر چکے تھے۔

١٠٩٩ء میں یہ قلعہ کئی دنوں تک فرنگیوں کا مستقر بنا رہا۔ جہاں اطراف و اکناف دور دور شہروں اور علاقوں کی سفارتیں فرنگیوں سے شرائط صلح و امان طے کرنے کے لئے پہنچ گئیں۔ یہ سفارتیں نہ صرف بڑے شہروں بلکہ راہ میں پڑنے والے چھوٹے چھوٹے قریوں سے بھی آرہی تھیں۔ خچروں پر سونا، چاندی، کپڑے اور رسد کا سامان لادے۔ اس عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف شہر بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبے بھی اپنی حفاظت کی خود ہی فکر کر رہے تھے۔ اور کوئی سلطان کی مدد پر تکیہ نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ایک آزاد والیٔ ریاست کی طرح اپنے معاملات راست خود ہی طے کر رہے تھے۔ اور اس طرح قومی سیادت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک اور چیز جو اس عمل سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سارے علاقے میں کوئی والی، کوئی حاکم، کوئی سلطان اور کوئی شہریار ایسا باقی نہیں رہ گیا تھا جو فرنگیوں سے مقابلے کا خیال بھی دل میں لا سکتا ہو۔ جذبۂ وطن پروری کا تو خیر سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ ہر علاقہ اپنی سلامتی کی فکر میں تھا۔ عربی کی ایک کہاوت ہے "جس بازو کو تم توڑ نہیں سکتے اُسے بوسہ دو اور خدا سے اس کی شکست کی دعا کرو۔ شام کے عرب اس مقولے پر پوری طرح عامل تھے ۔ چنانچہ حمص کا والی جناح الدولہ بھی اس مقولے پر کاربند تھا ۔ یہ شجیع اور بہادر سردار شام میں آتابک قربوقا کا سب سے وفادار ساتھی تھا ۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ آتابک کے ساتھیوں میں جناح الدولہ وہ آخری سردار تھا جو انطاکیہ سے ناچار فرار ہوا ۔ لیکن اب جنگ بازی اور مذہبی جوش کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اس لئے اس نے بھی سینٹ جائیلیس سے صلح جلہانی شروع کی اور پیش کش صلح میں فرنگیوں کو کثیر تعداد میں گھوڑے اور خچر فراہم کئے کیوں کہ اُن دنوں فرنگیوں کو سب سے زیادہ انہی دو چیزوں کی ضرورت تھی ۔

لیکن سب سے زیادہ بیش بہا تحائف کے ساتھ آنے والی سفارت ترپولی کی تھی ۔ ترپولی کے سفیر نے فرنگیوں کا اپنے والی قاضی جلال الملک کی طرف سے استقبال کرتے ہوئے ان کے سرداروں کی خدمت میں بیش بہا جواہرات پیش کئے ۔ قاضی جلال الملک بنو عمّار کے قبیلے سے تھا جس نے ترپولی کو بلادِ عرب کا نگینہ بنا دیا تھا ۔ بنو عمّار کا خاندان لڑنے بھڑنے والے جنگ بازوں کا خاندان نہ تھا جیسے اور عرب خاندان تھے جو اپنے بازو کی طاقت سے ملکوں اور شہروں کے مالک بن جاتے تھے ۔ بلکہ یہ شروع ہی سے علماء اور فضلاء کا خاندان تھا۔ اس خاندان کا بانی ایک قاضی شہر تھا اور اسی نام پر وہاں کے سب حکمراں قاضی کہلاتے تھے ۔ قاضیوں کے اس خاندان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت ترپولی خوش حالی کی اعلیٰ منزلیں طے کر رہا تھا جو سب کیلئے باعث رشک تھی ۔ ان کا سب سے قابلِ ذکر کارنامہ وہ تہذیبی مرکز تھا جو دار العلم کہلاتا تھا ۔ اس دار العلم سے ملحقہ ایک لائبریری تھی جس میں اس عہد کی قدیم و جدید بہترین تصانیف کے نسخے تھے جن کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ کے قریب پہنچتی تھی ۔ شہر کے اطراف زیتون، CAROT، نیشکر اور دیگر پھلوں کے سرسبز و شاداب مزارعے اور باغات تھے ۔ اس کی بندرگاہ پر آنے اور جانے والے سامان تجارت کی ریل پیل رہا کرتی تھی ۔ لیکن شہر کی یہی خوشحالی اور شادابی اس کے لئے بلائے جان بن گئی ۔ جلال الملک نے سینٹ جائیلیس کو دعوت دی کہ وہ عہدنامہ صلح طے کرنے کیلئے اپنی ایک سفارت ترپولی روانہ کرے ۔ یہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی ۔ یہ فرنگی سفارت جب ترپولی پہنچی تو وہ اس شہر کی خوش حالی سرسبزی و شادابی دیکھ کر حیران رہ گئی ۔ بازاروں میں تر بتر تازہ بہ تازہ میوے ترکاریاں، کپڑوں کی دکانوں پر نفیس پارچہ جات کے ڈھیر اور جوہریوں کی دکانوں میں سونے چاندی اور درِ شہوار کے بنے ہوئے زیورات کی ریل پیل ۔ کون تھا جس کی رال نہ ٹپک گئی ہو ۔ جسے یہ سب مال لوٹ میں مفت ملے اُسے صلح سے کیا دلچسپی ۔ چنانچہ جیسے ہی وہ لوگ اپنے علاقہ میں لوٹے انہوں نے سینٹ جائیلیس کو ترپولی کی فتح کیلئے اکسانا شروع کیا ۔ لہٰذا جلال الملک کی جواپنی سادگی سے سینٹ جائیلیس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ۱۴ فروری ۱۰۹۹ء کو فرنگیوں نے ترپولی کے دوسرے بڑے شہر آرکہ کا محاصرہ کر لیا ہے اب جلال الملک کو یقین ہو گیا کہ فرنگیوں کی آنکھیں اس کے ملک پر ہیں اور آرکہ کے بعد دوسرا نمبر ترپولی کا ہوگا ۔ مارے ہیبت کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اُسے ماہ آسمان کا حشر یاد آنے لگا ..... (جاری ہے)

شکار اور شکاری

کیا شیر شیر کو کھاتا ہے؟

مسٹر واڈیا نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں وہ جبل پور کے شمالی جنگل میں ٹھیرے ہوئے تھے شکار کیمپ میں معلوم ہوا کہ دو شیر رات کو قریب کے جنگل میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی کی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ صبح کو ایک شیر مرا ہوا پایا گیا جو لڑائی کے مقام سے تھوڑی دور تک کھینچا بھی گیا تھا۔ اور اس کا پچھلا بہت کچھ حصہ کھایا گیا تھا۔ اس کے اطراف صرف شیر ہی کے پنجوں کے نشان تھے۔ اور کسی جانور کے نشان نہ تھے۔ مسٹر واڈیا اور مسٹر وارڈ والا اس عجیب غریب گارے پر بیٹھے۔ شام کو دوسرا شیر وہاں آیا اور مرے ہوئے شیر کو کھینچنا شروع کیا جیسا کہ شیر اپنی عادت کے موافق اپنے مارے ہوئے جانور کو کھینچتا ہے۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض دفعہ شیر دوسرے شیر کو کھا جاتا ہے۔

لفٹننٹ کمانڈر کومب نے ببر ببر کو کھانے کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک زیبرا مار کر یہ بطور گارے کے آفریقہ کے جنگل میں چھوڑ آئے اور دوسرے روز صبح روشنی ہونے سے قبل اس مقام پر پہنچ گئے۔ دور سے ایک بڑا نر ببر اور تین مادہ ببر گارے کے پاس لیٹے ہوئے نظر آئے۔ یہ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل (۶۰) گز کے فاصلہ تک پہنچ گئے۔ اور پہلے بڑے ببر کو اور پھر یکے بعد دیگرے چاروں کو ایک منٹ کے اندر ختم کر دیا۔ اسی شام کو یہ اس مقام سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں (۱۰) ببر نظر آئے۔ جو ایک بارہ سنگھا مار کر کھا رہے تھے۔ اور آپس میں فرش کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر (۹) ببر جھاڑی میں چھپ گئے۔ اور ایک بڑا وہیں کھڑا رہا۔ انھوں نے ایک گولی میں اس کو ختم کر دیا۔ چونکہ مغرب ہو گئی تھی اور اطراف میں متعدد ببر موجود تھے اس لئے انھوں نے خیال کیا کہ بجائے اس ۔۔۔ت کے صبح کو اس ببر کو لے جائیں گے۔ چنانچہ اس کو گھسیٹ کر بارہ سنگھے کی لاش کے بازو ڈال دیا۔ اور واپس چلے آئے اور دوسرے دن پہنچے تو وہاں (۴) ببر موجود تھے۔ ان میں سے دو کو انھوں نے ختم کر دیا۔ تیسرے پر ایک فیر کیا جو خم

کا فائر کیا۔ (جس کا انجام بعد میں صاحب موصوف کے سخت زخمی ہونے پر ہوا) باقی ببر بھاگ گئے۔ گزشتہ شام کو جو ببر انھوں نے مارا تھا، وہ جہاں پڑا ہوا تھا وہاں سے کچھ فاصلہ پر کھینچ لیا گیا تھا۔ اور صرف ببر کا سر۔ ایال اور سامنے کے پنجے باقی تھے۔ اور باقی تمام کھا لیا گیا تھا۔ خیال ہوا شاید ترس کھا گئے ہوں مگر ان کے پنجوں کا نام و نشان وہاں نظر نہ آیا۔ آخر میں یہی ماننا پڑا کہ دوسرے ببر ہی اس ببر کو کھا گئے ہوں۔ کرنل اسٹیونس ہیملٹن نے بھی اپنی کتاب میں اس قسم کے واقعات درج کئے ہیں۔

شیر ببر اور ہاتھی وغیرہ کا تقابل

مسائل شکار میں شیر اور ببر کا مقابلہ ہمیشہ سے ایک دلچسپ مبحث رہا ہے۔ مختلف بڑے شکاریوں نے مختلف آراء ظاہر کئے ہیں۔ اکثر شکاری ایسے ہیں جن کو صرف ہندوستان یا صرف آفریقہ میں شکار کا موقعہ ملا ہے۔ بعض ایسے ہیں جو افریقہ اور ہندوستان دونوں جگہ شکار کر چکے ہیں۔ اور ان کو شیر اور ببر دونوں کے شکار کا تجربہ ہے۔ میجر رابرٹ فوران نے (۶) خطرناک جانوروں کا سلسلہ حسب ذیل قائم کیا ہے:

۱۔ ہاتھی ۲۔ شیر ۳۔ جنگلی بھینسہ ۴۔ تیندوا ۵۔ گینڈا ۶۔ ببر

شکاری صاحب موصوف ببر کی جراءت و ہمت کے بہت کم قائل ہیں۔ اور انھوں نے اپنے ہاں سے فوٹو بھی شائع کئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف تیر و کمان سے بآسانی تمام ببر کا شکار کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف مسٹر سٹیگینڈ ببر کو پہلا درجہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہاتھی گینڈے تیندوے اور جنگلی بھینسہ کو قرار دیتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اور بھی بہت سے شکاری ببر کا نمبر اول قائم کرتے ہیں۔ مسٹر ماڈن میلٹ یہ ترتیب قائم کرتے ہیں۔

۱۔ ببر ۲۔ شیر ۳۔ ہاتھی ۴۔ بھینسہ ۵۔ تیندوا ۶۔ گینڈا ۷۔ ریچھ

ببر کو پہلا درجہ دینے کی یہ وجہ انھوں نے قائم کی ہے کہ جب تعاقب نہ بھی کیا جائے تو اکثر حملہ کر بیٹھتا ہے۔ سیلس نے بھی ببر کو پہلا درجہ دیا ہے۔ کننگھم اور ٹارلٹن نے بھی ببر اور ہاتھی دونوں کو مساوی رکھا ہے۔ (نیومین) اور سر سیموئیل بیکر نے ہاتھی کو سب سے زیادہ خطرناک ٹھہرایا ہے۔ مسٹر ڈنبار برینڈر کی رائے اس بارے میں یہ ہے "مسئلہ زیر بحث پر جن لوگوں نے رائے دی ہے اُن کا تجربہ تمام تر افریقہ تک محدود ہے۔ ہندوستانی مصنفین نے شیر کو مسلمہ طور پر اول درجہ دیا ہے۔ ہاتھی اور بھینسہ دونوں ہلاک کرنے یا مار گرانے کے اعتبار سے

قوی اور مشکل جانور ہیں۔ حالانکہ ان پر نشانہ لگانا زیادہ آسان ہے۔ حملہ کرتے ہوئے ہاتھی کے سر پر نشانہ لگایا جائے تو وہ لازمی طور پر رک جاتا ہے۔ یا پلٹ جاتا ہے۔ دونوں جانور بہت جسیم ہوتے ہیں۔ اور چھپنے کی قابلیت ان میں مطلق نہیں ہوتی جیسی شیر میں ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے شکار میں اچانک حملہ کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ حملہ کریں تو مقابلتاً ایسے آہستہ آتے ہیں کہ ایک پھرتیلے آدمی کو بچنے کا کچھ نہ کچھ موقعہ مل سکتا ہے شیر کے مقابلہ میں ایسا کوئی موقعہ نہیں مل سکتا۔ زخمی ہاتھی یا زخمی بھینسہ کا تعاقب کرنے کا جو طریقہ سیلس نے بیان کیا ہے وہ اگر شیر کے ساتھ اختیار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یقینی موت ہوگا۔ دنیا کا سب سے خطرناک ترین کام جو کسی شکاری کے سپرد کیا جائے وہ زخمی شیر کا تعاقب کرنا ہے۔"

شیر اور ببر کی جراءت کے مقابلہ کا ایک موقعہ اس طرح بھی ملتا ہے کہ جب کبھی ہاتھی کے ذریعہ سے شیر کو گھیرا جائے تو وہ ہاتھی پر حملہ کر دیتا ہے۔ مگر ببر ایسی صورت میں حملہ نہیں کرتا۔ یقیناً یہ واقعہ شیر کی بلند ہمتی پر دلالت کرتا ہے۔ شیر اور ببر کی جسامت و قوت صورت ظاہری آواز اور جرأت و ہمت بھی تقابل طلب ہیں۔ جسامت کے اعتبار سے یہ مسلّمہ ہے کہ شیر زیادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے باغ عامہ میں جس قدر شیر اور جس قدر ببر ہیں ان میں ہر ایک ببر کی جسامت وہاں کے ہر شیر سے زیادہ ہے (اور کم از کم ۲۵ سال سے میں ایسی ہی کیفیت دیکھ رہا ہوں۔ بڑے شیر سوا دس یا ساڑھے دس فیٹ تک کے دیکھے اور مارے جا چکے ہیں۔ مگر اتنے بڑے کسی ببر کا ریکارڈ دیکھنے میں نہیں آیا۔)

کرنل پیٹرسن جنہوں نے افریقہ میں بکثرت ببر مارے ہیں دس فیٹ سے زیادہ کسی ببر کا ناپ درج نہیں کیا۔ ہندوستان میں بڑے سے بڑا ببر ۹ فٹ ۱۱ انچ کا مارا جانا ظاہر ہوا ہے۔ بعض شکاریوں نے افریقہ میں ۱۰ فٹ ۷ انچ کا ببر بھی لکھا ہے۔ ببر کی اوسط لمبائی ۸½ اور ۹ فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔ اونچائی ۴۲ انچ اور وزن ۴۰۰ پونڈ ہوتا ہے۔ قوت بھی اسی تناسب سے شیر میں زیادہ ہوتی ہے۔ آواز اس میں شک نہیں کہ ببر کی بہت شاندار ہوتی ہے۔ جنگل میں ببروں کی آواز کو شکاریوں نے مہیب ترین آواز تسلیم کیا ہے۔ صورت ظاہری کے اعتبار سے ببر کا سر یقیناً شکاریوں کے لئے بڑا جاذب نظر ہوتا ہے۔ جرأت و ہمت کی نسبت تمام شکاریوں کی رائے اور ان کے وجوہ کو ملا کر دیکھا جائے تو شیر ہی قابل ترجیح قرار پاتا ہے۔ ببر کی قوت شامہ بہ نسبت شیر کے تیز ہوتی ہے۔ اور شکار کرنے میں وہ زیادہ تر سماعت اور قوت شامہ سے کام لیتا ہے۔ ببر بعض دفعہ کئی کئی مل کر اور بعض دفعہ نر مادہ مل کر شکار کرتے

ہیں۔ ایسی صورت میں نر گھیر کر لاتا ہے۔ اور مادہ شکار کو ہلاک کرتی ہے۔ ببر کو تین سال کی عمر میں ایال نکلنا شروع ہوتی ہے۔ اور ۶ سال کی عمر میں مکمل ہو جاتی ہے۔ مادہ ڈھائی یا تین سال کی عمر میں بچے دیتی ہے۔ دو یا تین بچے پیدا ہوتے ہیں۔ مدتِ حمل ۱۰۸ دن ہے۔ دو سال پہلے میسور کے عجائب خانہ میں ایک دلچسپ واقعہ دیکھنے میں آیا۔ ایک پنجرے میں نر شیر اور مادہ ببر چھوڑے ہوئے تھے۔ شام کو گوشت ڈالنے کے وقت عجائب خانہ کے آدمی نے ان کے پنجرے میں بہت سا گوشت ڈالا جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ کچھ ابتدائی جھگڑے اور غرانے کے بعد یہ تھوڑے تھوڑے گوشت پر قابض ہو گئے۔ شیر کے حصہ میں زیادہ آیا۔ ببرنی اور شیر ایک دوسرے سے تقریباً (۶) قدم کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب یہ اپنے اپنے حصہ میں سے تقریباً نصف کھا چکے تو ببرنی اٹھی اور شیر کے حصہ میں سے ایک بڑا ٹکڑا اٹھا لائی۔ شیر نے بہت کچھ بُرے منہ بنائے اور پنجے بھی چلائے۔ مگر ببرنی بلا کسی قسم کی غیر معمولی صورت بنائے اٹھا لائی۔ اسی طرح ببرنی تین چار دفعہ نہایت سہولت کے ساتھ شیر کے منہ کے سامنے سے باوجود شیر کی ناراضگی اور پنجے مارنے کے گوشت اٹھا لائی۔ یہاں تک کہ ببرنی کے پاس شیر سے زیادہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اور شیر نے جب اپنا گوشت ختم کر دیا تو ببرنی کے پاس بہت سا جمع تھا۔ اب شیر آہستہ سے اٹھا اور ببرنی کے قریب آکر غرا کر ایک ڈانٹ بتائی۔ ببرنی گوشت چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اور شیر بیٹھ کر اطمینان سے کھاتا رہا۔ اس واقعہ سے کوئی صحیح نتیجہ نکالنا مشکل ہے۔ کیونکہ اولاً تو شیر نر تھا۔ اور ببرنی مادہ تھی۔ پہلے ببرنی شیر سے گوشت چھین لائی۔ حالانکہ ایک شیر دوسرے شیر کے سامنے سے بمشکل ہی چھین سکتا ہے جب تک وہ زیادہ قوی نہ ہو۔ بعد میں شیر ببرنی کے گوشت پر قابض ہو گیا۔

یہ دونوں واقعے بظاہر ایک دوسرے کے متضاد ہیں مگر ببرنی کی ڈھیٹ طبیعت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ باغِ عامہ میں میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب گوشت ڈالا جاتا ہے تو ابتداً ہی جو کچھ جھپٹ ہو جاتی ہے اس کے بعد کوئی شیر دوسرے شیر کے سامنے سے لینے کی جرأت نہیں کرتا۔ گو کہ کسی ایک کے پاس آخر میں گوشت بچ ہی کیوں نہ رہے۔ اگر کوئی زیادہ قوی ہے تو وہ ضرور چھین لیتا ہے۔ مگر برابر والا نہیں چھین سکتا۔ اور دوسرا منہ ڈالے تو بُری طرح پہلا اس سے لڑتا اور بھگا دیتا ہے۔ یہ برابر کے شیروں کی کیفیت ہے مگر کمزور کبھی زور دار کے مقابلے سے نہیں چھین سکتا۔ اس کے برخلاف ببرنی کا دو دفعہ چھین لینا ضرور تعجب پیدا کرتا ہے مگر شیر کا آخری عمل بھی "سو سنار کی ایک لوہار کی" کا مصداق ہے۔۔۔۔ (باقی آئندہ)

غزل

شیخ سعد حسین سعد صدیقی

ری ادائیں کبھی تیرے بانکپن میں رہا
کمالِ فن مرا بس تیری انجمن میں رہا

حسن جو نہ کبھی لالہ و سمن میں رہا
وہ حسن کیسے نہ جانے ترے بدن میں رہا

ورات میں، خوابوں میں، آرزوؤں میں
ترے حضور میں، تیری ہی انجمن میں رہا

پوچھ کیسی قیامت ہے نیش غم کی کسک
وہ درد جو نہ کسی خار کی چبھن میں رہا

ہے عشق ہمیشہ رہین رنج و الم
سدا سے محو مگر حسن بانکپن میں رہا

ا کا درس ملا ہے قدم قدم پہ مجھے
تمام عمر میں تحصیل علم و فن میں رہا

العین بھی جھٹلا سکے نہ مجھ کو کبھی
خلوص دل مرا شامل مرے سخن میں رہا

بھی تو جھلکا ہے پھولوں میں میرے خون کا رنگ
کبھی شفق میں، کبھی صبح کی کرن میں رہا

سنگِ راہ نہ خاروں نے راستہ روکا
ملی بس اس کو ہی منزل جو اس لگن میں رہا

اری بزم میں رنگینیاں تھیں خوابوں کی
تمام رات میں تاروں کی انجمن میں رہا

ابِ تلخئ غم ہم نے اتنی پی لی سعد
سرور اب نہ کسی بادۂ کہن میں رہا

مقام معراج ۶۶۲، خیریت آباد - حیدرآباد

غزل

شاداں احسانی

رہ کے آنسوؤں کو کہاں تک چھپائے دل
دامانِ تر کو دھوپ میں کب تک سکھائے دل

لیا کیا گزر گئی یہ کوئی جانتا نہیں
زخموں کو کون دیکھے ہمارے سوائے دل

رہ جانے والا ولولۂ زیست دے گیا
کب تک غمِ فراق کے صدمے اٹھائے دل

بکھیں کہ ہوتے ہیں ہم پر عتاب کیا
اُن تک پہنچ گئی ہے ہماری صدائے دل

ب بھی شکستِ دل کی صدا یاد آ گئی
بے ساختہ زبان سے نکلا کہ ہائے دل

شاداں ہمارے زخم کا عالم نہ پوچھئے
شعلہ رکھا ہے سینہ میں اب تو بجھائے دل

مقابل بیگم پارک، پردیسی پورہ، کھنڈوہ (ایم پی)

شاغل ادیب

ایک نظم — ایک غزل

چادر

سرِ راہ کل ایک ننگی بھکارن
چلی جا رہی تھی
سبھی ہنس رہے تھے
تماشائی تھے سب
مگر دے نہ پائی
کسی نے بھی بڑھ کر
اسے ایک چادر ..... !

غزل

تری نگاہ ملی اک غم زمانہ ملا
ترے نثار! تری انجمن میں کیا نہ ملا

وہ بدنصیب جو تیرے ستم سے بچ نکلا
انھیں کہیں بھی زمانے میں آسرا نہ ملا

ہمیں نہ بھول سکی دار پر تو یادِ دوست
انھیں حرم کی فضاؤں میں بھی خدا نہ ملا

ہزار دیر و حرم راستے میں آئے مگر
سوائے میکدے کے ہم کو راستہ نہ ملا

سنائی جب بھی غزل ہم نے اک نئی شاغل
زمانہ سمجھا اسے اک نیا ترانہ ملا

معتمد عمومی، نیرنگ ادب، حیدرآباد ۴۸

خدا بخش فیلوشپ، آزاد تحقیق، پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی۔لٹ ڈگریوں کے لئے خدا بخش لائبریری مرکز تحقیق

یہ خبر علمی دنیا کے لئے باعثِ مسرت ہوگی کہ خدا بخش لائبریری کو مگدھ یونیورسٹی نے بھی اپنی یونیورسٹی کا مرکز تحقیق تسلیم کرلیا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل کشمیر یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، اور گلبرگہ یونیورسٹیوں نے اسے مرکز تحقیق کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدا بخش لائبریری ایک تحقیقی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور لائبریری میں محفوظ اہم مخطوطات اور نادر مطبوعات پر ریسرچ کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے نہج پر جونیئر، سینئر فیلوشپ اور ہسٹاریکل ریسرچ کونسل کے انداز پر ٹریننگ اور نیشنل فیلوشپ کے انتخاب کا اختیار رکھتی ہے۔ خدا بخش فیلوشپ کے تحت والوں کے لئے ریسرچ کے علاوہ آزاد ریسرچ بھی ہوتی ہے جس میں کسی ڈگری کا حصول مطمح نظر نہیں ہوتا۔ پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں کے لئے بھی جو کام ہوتا ہے وہ یونیورسٹی اور خدا بخش کی مشترکہ نگرانی میں کیا جاتا ہے اور اس کے لئے خدا بخش کے نوادر پر کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ڈگری ریسرچ کے لئے کشمیر یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، اور گلبرگہ کے علاوہ اب مگدھ یونیورسٹی میں بھی وہ طلباء اپنا رجسٹریشن کراسکیں گے، جو خدا بخش کے نادر مواد پر فارسی، عربی، اردو، تاریخ، طب، اسلامیات، متحدہ کلچر، تصوف وغیرہ پر کام کریں۔ ان طلباء کو انٹرویو میں کامیابی کے بعد ایک ہزار پچاس روپئے ماہوار وظیفہ دیا جاتا ہے اور تھیسس پورا ہونے کے بعد انھیں یونیورسٹیوں سے ڈگری دی جائے گی۔

اس سلسلے میں خدا بخش فیلوشپ کمیٹی کام کرنے والے طلباء کا انتخاب کرتی ہے پھر وہ خدا بخش لائبریری سے منسلک ہوکر اپنا پی ایچ ڈی کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے خدا بخش فیلوشپ کمیٹی کے اجلاس ملک کے مختلف حصوں میں اور خصوصاً تسلیم کرنے والی یونیورسٹیوں کے مرکز میں ہوتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ، لکھنؤ، سرینگر، دہلی اور پٹنہ میں مختلف موقعوں پر یہ کمیٹی طلباء کو انٹرویو کر چکی ہے اور وہ لائبریری کے ساتھ منسلک ہوکر [illegible]

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے لیل و نہار

سال ۸۶-۱۹۸۵ء

- **تشکیل جدید :** ۱۲ اگست ۱۹۸۵ء
- **مطبوعات پر انعام :** سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کی (۲۵) بہترین تصانیف نظم و نثر مطبوعہ ۸۲ء-۸۳ء-۸۴ء کو انعامات دیے گئے۔
- **طلبہ و طالبات کو میرٹ اسکالر شپ :** سال ۸۶-۸۵ء میں ریاست کے ساتویں جماعت سے ایم اے تک کے سرکاری امتحان میں کامیاب (۵۹) طلبہ و طالبات کو اردو مضمون میں میرٹ کی بنیاد پر اسکالر شپ دیے گئے۔
- **سمینار، سمپوزیم اور مشاعروں کے انعقاد کیلئے اداروں کو امداد :** سال ۸۶-۸۵ء میں ریاست کے (۸) اداروں کو سمینار، سمپوزیم اور مشاعروں کیلئے امداد دی گئی۔
- **شاعروں، ادیبوں، صحافیوں وغیرہ کو علاج و معالجہ کیلئے امداد :** سال ۸۶-۸۵ء میں اردو کے (۵) ممتاز شاعروں، صحافیوں، فنکاروں، ادیبوں اور دانشوروں کو علاج معالجہ کے سلسلے میں امداد دی گئی۔
- **لائبریریوں کو امداد :** سال ۸۶-۸۵ء میں ریاست کے (۴۶) عوامی کتب خانوں اور لائبریریوں کو بہ شکل کتب امداد دی گئی۔
- **رسائل و جرائد کو امداد :** سال ۸۶-۸۵ء میں ریاست کے (۷) علمی، ادبی رسائل اور جرائد کو امداد دی گئی۔
- **اشاعتی پروگرام :** سال ۸۶-۸۵ء تلگو اور اردو زبان و ادب کے مابین باہمی ارتباط کے اہم مقصد کے پیش نظر تلگو کے ایک مشہور ناول کے اردو ترجمہ "روشنی سائے" کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔
- **شعراء کی عزت افزائی اور مشاعرہ :** سال ۸۶-۸۵ء میں یکم نومبر، یوم تاسیس آندھرا پردیش کی سرکاری تقاریب کے ساتھ زیر اہتمام اردو اکیڈمی حکومت کی طرف سے ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر ریاست کے (۱۶) شعرا کی عزت افزائی کی گئی۔ گورنر آندھرا پردیش ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور چیف منسٹر این ٹی راما راؤ نے شرکت کی۔
- **مہمان شعراء اور دانشوروں کا خیر مقدم :** ایک پُر اثر تقریب میں روس، پاکستان اور ملک کے مہمان شعراء اور دانشوروں کا اردو اکیڈمی کے دفتر میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک محفل شعر بھی منعقد کی گئی۔

محمد خلیل الرحمٰن
ڈائرکٹر / سکریٹری

11.4.637 اے سی گارڈز
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴ تلنگانہ

اپریل ۱۹۸۷ء
جلد ۴: شمارہ ۴
حیدرآباد
ماہنامہ

شاداب

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری منیجنگ ایڈیٹر: محمد کلیم الدین احسن



زرِ تعاون

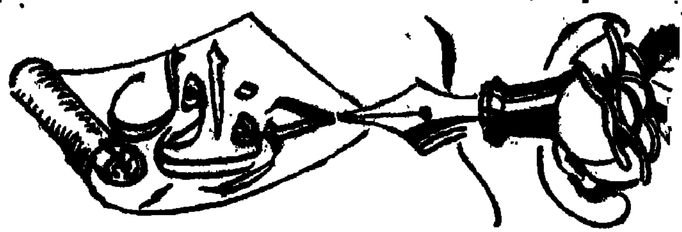
ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ 90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات 1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب 147 ... حیدرآباد

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے ... پریس چار کمان ... دفتر شاداب روڈ ... حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

۱



حکومت آندھرا پردیش اور حیدرآباد کو کئی امور میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ کم آمدنی والے پسماندہ طبقات کے لئے رزیڈنشیل اسکول کھول کر ہماری اسٹیٹ نے دوسری تمام ریاستوں میں اولیت کا مقام حاصل کیا اور ان پچھڑے ہوئے بچوں کے لئے پبلک اسکول کے مماثل تعلیم کا انتظام کیا۔ آج اسٹیٹ کے ہر ضلع میں کم از کم دو ہائی اسکول ایسے ہیں جہاں کم آمدنی والے پس ماندہ طبقات کے بچے ایک پیسہ خرچ کئے بغیر پبلک اسکول کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان مدارس کی تعلیم اتنی اچھی اور کامیاب ہے کہ ایس۔ ایس۔ سی امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کی اکثریت انہی مدارس سے متعلق ہے۔

اس سلسلے میں دوسری اولیت جو ہماری اسٹیٹ نے حاصل کی ہے وہ اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول کا قیام ہے۔ حیدرآباد کے پرانے شہر میں قلی قطب شاہ ڈولپمنٹ اتھارٹی کے تعاون سے ہماری حکومت نے اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول قائم کیا ہے۔ اور وعدہ کیا گیا ہے کہ مزید ایسے اسکول قائم کئے جائیں گے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ ہمارے ملک کی دوسری اسٹیٹوں میں بھی ایسے رزیڈنشیل اسکول قائم کئے جائیں۔

ہماری نئی قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر ضلع میں کم از کم ایک اسکول نو ودیا اسکیم کے تحت قائم کیا جائے گا چند اسکول اس اسکیم کے تحت قائم بھی کئے جا چکے ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ ہمارے ملک کے ایسے علاقوں اور ضلعوں میں جہاں اردو مادری زبان رکھنے والوں کی کافی تعداد بستی ہے نو ودیا اسکیم کے تحت اردو میڈیم اسکول قائم کئے جائیں۔ تاکہ دوسری ہندستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کے ساتھ بھی انصاف ہو اور اردو بولنے والے بھی نئی قومی تعلیم سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں ●●●

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا (حیدرآباد)

کامیابی کی کہانی

کامیاب صنعت کار

یہ ایک ایسے انجنیئر کا حقیقی واقعہ ہے جو بی۔ای (میکانیکل) کرنے کے بعد ایک صنعتی ادارہ میں سائنٹفک آفیسر بنے اور پھر بعد میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی مالی امداد کی بدولت آج ایک پلاسٹک فیاکٹری کے مالک بن گئے ہیں۔ یہ ہیں مسٹر ایس۔پی۔وائی ریڈی جو ضلع کڑپہ (آندھراپردیش) میں ایک روایتی کسان خاندان میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۷۳ء میں ریجنل انجنیئرنگ کالج ورنگل سے بی۔ای (میکانیکل) کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی اور اس کے بعد وہ بی۔اے۔آر۔سی ادارہ میں بہ حیثیت سائنٹفک آفیسر شامل ہوگئے جہاں پر وہ نومبر ۱۹۷۷ء تک چار سال خدمات انجام دینے کے بعد اپنی خدمات سے مستعفی ہوگئے اور خود روزگار اسکیم کے تحت آندھراپردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن اور اسٹیٹ بنک آف انڈیا نندیال برانچ کی مالی امداد سے نومبر ۱۹۷۷ء میں نندیال ضلع کرنول میں ای ایس بی آئی پلاسٹک پائپ انڈسٹری ایک چھوٹے پیمانہ کی صنعت کے طور پر قائم کی۔ مسٹر ریڈی نے اس میں اپنا جو ذاتی سرمایہ لگایا تھا وہ صرف ۱۰ ہزار روپئے تھا۔ اس طرح اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی بروقت مالی امداد کے باعث اس فیکٹری نے ترقی کے ساتھ پیداوار کا آغاز کر دیا جس کی بنیاد پر بنک نے بوقت ضرورت مزید امداد فراہم کی۔ مسٹر ریڈی نے ۱۹۸۰ء میں اس کارخانے میں پلاسٹک کی دوسری اشیاء بشمول پانی کے برتن وغیرہ ڈھالنے شروع کئے جنھیں ان کے اچھے معیار کی بدولت بہت مقبولیت ملی۔ ان اشیاء پر بہت زیادہ بھروسہ کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں انھوں نے پی وی سی پائپ کی تیاری کا آغاز کر کے ترقی کی سمت ایک اور جست لگائی۔ آج ان کے کارخانے کی پیداوار کی مانگ ریاست آندھراپردیش کے علاوہ ریاست کرناٹک کے چند بازاروں میں بھی ہے۔ ان کے کارخانے میں اب ۱۵۰ افراد کو روزگار حاصل ہو رہا ہے اور وہ سخت محنت اور لگن اور اپنے کام کو

باقی صلہ پر

نامہ شاداب حیدرآباد — اپریل ۱۹۸۰ء

مفتی و قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

سلسلہ گذشتہ — قسط دوم

یکساں سیول کوڈ

(اقتباسات خطاب)

شہر حیدرآباد کی حد تک جب تک آپ کی اپنی حکومت تھی آپ کو اپنے تہذیبی وجود اور ملی
تشخص کی حفاظت کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی فکر اب آپ کے قلوب میں ہے۔ جتنے بڑے بڑے کام
آج آپ کے شہر میں ہو رہے ہیں مختلف دینی محاذوں پر شاید حضور نظام کے زمانے میں اتنے کام نہیں
ہوتے ہونگے۔ اس وقت تو آپ اپنے کو فطری طور پر محفوظ تصور کرتے ہوں گے لیکن آج آپ محسوس
کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے ملی تشخص کے لئے زیادہ کچھ کرنا ہے اور یہ بڑا انقلاب برپا ہوا ہے

جب ہندوستان آزاد ہوا اور دستور بننے لگا تو ہندوستان کے لوگوں کا بڑا Achievement
کامیابی کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی حقوق مان لیئے گئے اور لوگوں نے باہم مل جل کر زندہ رہنے کے لئے
اصول بنا لئے اور اصول یہ وضع کیا گیا کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا رہتے ہوئے بھی
اس ملک میں زندگی گزار سکے۔ دستور کے بنیادی حقوق میں یہ بات کہی گئی کہ یہاں رائے کی آزادی
رہے گی، ضمیر کی آزادی رہیگی، اظہار خیال کی آزادی رہے گی، فکر کی آزادی، عقیدے کی
آزادی، مذہب کی آزادی، مذہب پر عقیدے کی، مذہب پر عمل کی اور مذہب کی تبلیغ کی آزادی
رہے گی اور صاف صاف دستور کی آرٹیکل ۲۹ میں ایک اور بات کہہ دی گئی کہ ہندوستان میں بسنے والی
سبھی تہذیبی اقلیتوں کے تحفظ کی گیارنٹی دی گئی۔ گویا مذہب کی بھی حفاظت اور تہذیب کی بھی
حفاظت۔ ہمارے لئے یہ دونوں اہم ہیں اس لئے کہ ہماری تہذیب کی بنیاد مذہب پر ہے
دوسروں کی تہذیب ان کے خاندانی روایات، ان کے سماج ان کی دوسری اقدار پر ہوں گی
لیکن مسلمانوں کی تہذیب ان کے مذہب پر ہے۔ اس لئے کہ تہذیب کی جڑ تصور خیر و شر پر ہے۔
کہ کس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اور کس چیز کو برا سمجھتے ہیں۔ خیر و شر کا فیصلہ ہمارے ہاں نہ عقل انسانی

نائب امیر شریعت بہار

کر سکتی ہے، نہ لوگوں کی روایات، نہ خاندانی طور طریق، نہ سماج کی قدریں بلکہ ہمارے خیر ا
فیصلہ رسول کرتا ہے اور یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئی ہوئی وحی کی روشنی میں ہوتا
باغ میں پودوں کی جو شاخیں بڑھ جاتی ہیں Unbalanced اور غیر موزوں ہو
تو پودوں کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لئے مالی زائد شاخوں کو کاٹ دیتا ہے حد سے
نہیں دیتا۔ تہذیب کا عربی لغت میں یہی ترجمہ ہے۔ پس تہذیب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ ت
دی ہوئی انسان کی فطری صلاحیتوں کو ان کے حدود میں باقی رکھنا جس حد تک وہ انسا
لئے باعث خیر ہیں اور اس سے آگے کو کاٹ دینا ہے۔ مثلاً غصہ اگر باطل اور ناحق
آتا ہے تو اس سے بہادری پیدا ہوتی ہے شجاعت پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے میں انسان بڑے
کارنامے انجام دیتا ہے لیکن یہی شجاعت اور غصہ کسی مجبور پر ظلم کی شکل میں ظاہر ہو
وقت شاخ کو کاٹ دینا ضروری ہے اس شاخ کو بڑھنا نہیں چاہئے۔ اسی طرح انسا
حیا و شرم ہے۔ یہ حیا اگر آدمی کو برائی سے روکتی ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن اچھے کام
کو حیا آنے لگے یا حیا کے نتیجے میں آدمی کے اندر بزدلی پیدا ہونے لگے تو بزدلی کو
گوارا نہیں کرتے۔ بزدلی کی شاخ کاٹ دی جانی چاہئے۔ اسی طرح دوستو! اپنی
کا احساس بہت ضروری ہے۔ اس احساس خودی کے نتیجے میں انسان کائنات کی بڑی
قوتوں کے سامنے بھی سر نہیں جھکا سکتا۔ وہ کہے گا کہ میں اشرف المخلوقات ہوں،
کا شاہکار ہوں میں جھکنے کے لئے نہیں کائنات کو اپنے سامنے جھکانے کے لئے پیدا ہ
ہمارے فرشتے میرے سامنے سجدہ ریز ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ساری
ہمارے لئے مسخر کیا ہے۔ ہم نہ سورج کے سامنے سر جھکا سکتے ہیں، نہ چاند
کے پھول کے، نہ دریائے گنگا اور جمنا کے اور نہ ہمالیہ کی پہاڑی کے۔ انسان کا سر ا
نشانی ہے۔ انسان کی ناک اس کی عزت کی نشانی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شاہکار مخلوق
فطرت کے منافی ہے کہ یہ کائنات اور مخلوقات کے سامنے سر جھکائے۔ لیکن یہی خودی ا
درجے میں داخل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے سر جھکانے کی بجائے
کا دعویٰ کرنے لگے تو اس شاخ کو کاٹ دینا چاہئے۔

اب فکر کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ فکر انسان کے اعمال میں آثار اور نشانیاں
یہیں سے تہذیب کی ظاہری حدود شروع ہوتی ہیں۔ اسی طرح تہذیب کی بنیاد اخلاق
اخلاق کا فلسفہ کیا ہے؟ وہی خیر و شر، کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے۔ کسو

ہے جنسی میں ہمارا فائدہ ہو ہمارے نفس کی لذت اور حظ ہو۔ کسی نے کہا کہ نہیں نہیں اپنا
جس میں دوسروں کا فائدہ ہو چاہے اپنا نقصان ہو وہ بہتر ہے چاہے اس میں تھوڑی تکلیف
ہو لیکن اس میں انسانیت کی راحت کا اگر ذریعہ ہو تو وہ بہتر ہے۔ اعلیٰ اخلاق یہ ہے کہ اپنے
دوسروں کے فائدے کے لئے قربان کردیں۔ یہاں پر اخلاق بدل گئے۔ اس نقطۂ نظر سے
کچھ اور ہوگئے، اس نقطۂ نظر سے کچھ اور ہوگئے۔ تہذیبوں کی بنیاد مذہب پر ہو سکتی ہے
گروں کے اپنے اپنے نظریات پر ہوتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اسلامی تہذیب
وخاندانی روایات پر نہیں ہے۔ اس لئے دستور ہند نے اگر تہذیب کے تحفظ کا عہد کیا ہے
شادی ہماری تہذیبی اقدار ہیں۔ شادی آگ کے گرد گھیرا ڈال کر بھی ہو سکتی ہے۔ کورٹ اور
ٹ کے سامنے جاکر اقرار کرنے سے بھی ہو سکتی ہے اور امام کے خطبے اور ایجاب وقبول کے ذریعہ
سکتی ہے۔ جو اصول جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا وہی ہمارا ایمان ہے
ہاں مردہ جلایا نہیں دفن کیا جائے گا۔ یہ دو الگ الگ تہذیبیں ہیں۔ یورپ کی تہذیب یہ
ہے کہ بیوی ایک رکھو چاہے فلیٹ میں، کلب میں اور رقص گاہوں میں کئی ہوں یہاں ہوں اعتدا
وہ کہتے ہیں کہ زناکاری جرم نہیں ہے۔ یہ فلاں فلاں حالات میں جرم بنتی ہے برضائے طرفین
جرم نہیں۔ ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ زناکاری بدترین جرم ہے۔ بے شک جنسی اور شہوانی
ہشیں فطری ہیں لیکن ان کی تکمیل کا وہ راستہ جس میں انسان اس عمل کے نتیجے کی ذمہ داری اپنے
اوپر قبول کرنا نہیں چاہتا ایسے کسی طریقے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ نسل انسانی کی بقا
ری ہے اور اس کے لئے مرد اور عورت کا ملنا ضروری ہے۔ اگر ان کو نکاح کے ذریعہ منضبط
جائے گا تو جنسی انارکی پیدا نہیں ہوگی اور بے باپ کی اولاد چاروں طرف یورپ کی طرح
زاروں میں نہیں پھیلے گی۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ نکاح احصان ہے۔ احصان کے معنی
بندی: مرد اور عورت کو قلعوں میں بند کردیتے ہیں یعنی خواہشات جنسی کو آزاد نہیں چھوڑا گیا۔
ذیب اور مذہب کی قینچی سے اس کو کاٹ دیا گیا۔ قرآن میں کہا گیا کہ یہ لوگ اپنی شرمگاہوں اور
جنسی خواہشات کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہیں سوائے اپنی بیویوں کے۔ محل استعمال اس
شہوانی قوت کا کہاں ہونا چاہیئے اس کے لئے تہذیب کا بھی الگ قلعہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے ہاں
اسلامی نقطۂ نظر سے اصل مقصود نسل انسانی کی بقا ہے جس کے لئے جنسی تعلق ضروری ہے
اور جنسی تعلق کو منضبط رکھنے کے لئے نکاح ضروری ہے۔ نکاح کے ذریعہ قلعہ بندی ہوگی۔
آنکھیں محفوظ ہوجائیں گی، نظر محفوظ رہے گی۔ قرآن کہتا ہے "مسلمان مردوں سے کہو

تیجے اپنی نگاہیں جھکی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور مومن عورتوں سے کہہ
اپنی نظریں جھکی رکھیں اور اپنی آبرو کی حفاظت کریں۔ جس قرآن نے یہ پاکیزہ تعلیم دی ہوا
اس کی تہذیب کی بنیاد ہوگی۔ اسلامی تہذیب میں غیر محرم کو دیکھنا، غیر عورت کی طرف نظ
دیکھنا، شہوت اور جنسی خواہش کے تحت دیکھنا، کسی سے جنسی خواہش کے تحت اور شہوا
کے ساتھ ملنا، کسی غیر عورت کے ساتھ کمرے میں تنہا ہونا ان تمام چیزوں کو ممنوع قرا
ہماری پوری تہذیب کی اساس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین
مسئلہ یہ ہے کہ دستور ہند میں تہذیب اور مذہب دونوں کے تحفظ کی گیارنٹی د
اور دراصل یہ وہ معاہدہ ہے جس معاہدہ کے تحت اس سرزمین پر بسنے والی مختلف
نے ایک ساتھ مل جل کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ملت اپنی تہ
کے ساتھ آزاد رہے گی اور اس کے تحفظ کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ لیکن نیتیں پہلے سے
ہیں اس لئے دستور کے جب رہنما اصولوں پر بحث کا وقت آیا تو وہاں دفعہ ۴۴ آ
یونیفارم سیول کوڈ کی بات کہی۔ اس وقت بھی مسلمانوں نے، حالانکہ وہ خاک و خو
کھیل رہے تھے، اپنی آواز پہنچائی جو مسلمانوں کا اس کے خلاف مطالبہ پارلیمنٹ کی ر
میں آج بھی موجود ہے۔ خیر یہ دفعہ اس کے باوجود بھی پاس ہوگئی۔ جب کبھی لوگوں کو مو
لوگوں نے اسی دفعہ کو اٹھایا اور یونیفارم سیول کوڈ کی بات شروع کردی۔ جب لوگوں نے د
اس معاملہ میں غیر معمولی حساس ہیں تو انھوں نے یہ طے کیا کہ یونیفارم سیول کوڈ وغیرہ کی بات
۱۹۷۲ء میں یہ پالیسی طے پائی۔ دلی میں سیمینار بلائے گئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی م
پروفیسر انڈرسن انگلینڈ سے تشریف لائے۔ اس میں طے کیا گیا کہ Legislature t
بالواسطہ قانون سازی پر عمل کیا جائے۔ براہ راست ان معاشرتی امور کے بارے میں کوئی
نہ بنا کر دوسرے جو معاشرتی اور سیشل لاز بن رہے ہیں ان میں ایسی ایسی بات
جس سے اسلامی قانون خود بخود بے اثر ہو جائے یا ایسی متوازی قانون سازی کی جا
جس سے خود بخود شریعت ختم ہو جائے اس سلسلے میں متبنیٰ بل لایا گیا اور اسی
کہاں .Cr.P.C اور کہاں نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ ۔ ۔ .Cr. P. C کی دفعہ ۱۲۵ سے
بہت زمانے سے دفعہ ۴۸۸ کی شکل میں موجود تھی۔ ہندوستان کے قانون .C.P.
اس کو دفعہ ۱۲۵ بنا کر اس میں جو پرانی بات لکھی ہوئی تھی کہ شوہر کو بیوی کا،
اولاد کا گزارہ کا خرچہ دینا ہوگا۔ دینا تو ہے ہی۔ شریعت میں بھی دینا ہے اور قا

بھی دیتا ہے۔ اگر کوئی نہ دے، نظر انداز کرے، غفلت کرے تو مجسٹریٹ کے ذریعہ پوری ریلیف کے طور پر خرچہ دلوا دیا جائے گا۔ تھی چھوٹی سی بات۔ لیکن جب دفعہ ۱۲۵ کا نیا قانون آیا تو اس میں ایک لفظ بڑھا دیا گیا۔ یہاں پر یہ لکھا تھا کہ بیوی کا خرچہ میاں سے دلوا دیا جائے گا۔ اتنی بات تو ضرور ٹھیک تھی لیکن اس میں صرف ایک شہد کا ٹیکہ لگا یا گیا کہ بیوی کے معنی صرف بیوی ہی نہیں بلکہ وہ بھی ہے جو کبھی بیوی تھی۔ یعنی طلاق دینے کے بعد بھی بیوی ہی شمار کی جاتی رہے گی۔ اس قانون کی حد تک اس کو بھی نفقہ دلایا جائے گا جب تک وہ نکاح ثانی نہ کرے۔ اس طرح گویا بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ شریعت میں مداخلت کی کوشش کی گئی۔ آل انڈیا مسلم بورڈ نے اس موقع پر تحریک چلائی۔ خیر اس میں خدا خدا کر کے Amendment آ گیا بہت اچھا ہوا۔ دفعہ ۱۲۷ میں 3B کا اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن سرکار جس کام کو نہ کر سکی ہمارے جج صاحبان کے ذریعہ وہ کام ہو گیا۔ سب سے پہلے کرشنا ایر نے یہ کیا کہ 127 B کے اضافے کو بالکل بیکار کر دیا۔ لیکن اب بھی کام نہیں چلا۔ اب سپریم کورٹ کی فل بنچ کو بیٹھنا پڑا اور فل بنچ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ایک بات تو اس میں لکھ دیجئے کہ سرکار کو یونیفارم سیول کوڈ جاری کرنا چاہئے۔ اگر سرکار سوسائٹی کی اصلاح کے لئے یہ کام نہیں کرتی تو ہم ججوں کو یہ کرنا پڑے گا۔ اور سب سے خطرناک کام انہوں نے یہ کیا جو ہمیشہ جسٹس بیگ کہا کرتے تھے۔ یہ ہمارے جسٹس بیگ جن کا نام اتفاق سے مسلمانوں جیسا ہے انہوں نے ایک بڑے فتنہ کی بات کہی تھی کہ خواہ مخواہ لوگ ہنگامہ کر رہے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں یکساں سیول کوڈ جاری کرنے کی۔ مسلمان اس پر بہت خوش ہوئے۔ لیکن اصل میں انہوں نے کیا کہا یہ لوگوں نے غور نہیں کیا۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ یونیفارم سیول کوڈ جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن و حدیث کا قانون ہے۔ وہی جاری رہے۔ لیکن قرآن کی کس آیت کا کیا مطلب ہے یہ طے کرنے کا اختیار ججوں کو دے دیا جائے۔ قرآن و حدیث کی آیتوں کا مفہوم متعین کرنا، ان کا مطلب بیان کرنا، ان کی تعبیر، ان کو Interpretate کرنے کا right ججس کو دے دیا۔ مطلب یہ کہ خود قرآن کی آیت کا کوئی مطلب اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سمجھا ہو تو ضروری نہیں کہ آج کا جج اسے تسلیم کرے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کے الفاظ کا ڈھانچہ باقی رہے گا۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کا جسم تو برقرار رہے گا اور یہ اپنے ناپاک اور فرسودہ خیالات کی روح قرآن کے ان مقدس اور پاکیزہ الفاظ میں ڈال دیں گے یعنی تحریف معنوی کی ایک بہترین بنیاد قائم کی گئی کہ ہم الفاظ قرآن کو باقی رکھتے ہوئے

معانیٔ قرآن میں ایسی تحریف کر ڈالیں کہ پورا قرآن مسخ ہو کر رہ جائے۔ مسلمان خوش ہے کہ قرآن ان کی ہے اور ہمارا progressive So called طبقہ خوش ہے کہ قرآن کے لباس (الفاظ) کے اندر ہم نے اپنے خیالات کا جسم تو ڈال ہی دیا۔ وہ ہے الفاظ کے سانچے اوپر تو رہا کریں اندر کی حقیقت تو ہم نے بدل ہی ڈالی۔ یہ خطرناک زہریلی بنیاد تھی جس پر چندرا چوڑ کے فیصلے کی۔ یہ جو لڑائی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے لڑی دراصل یہ اس چھوٹے سے مسئلے کے لئے نہیں تھی کہ عورت کو اتنا سارو پیہ مل گیا۔ یہ دراصل اس بات کے لئے فیصلہ کن لڑائی لڑی تھی کہ قرآن کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جو تعبیر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعین، علماء، ائمہ مجتہدین نے سمجھا ہے وہی مفہوم معین رہے گا۔ آج کے جس کو، اپنے خیال کے اعتبار سے چلنے والے نئے مجتہدین کو اس کا حق نہیں دیا جائے گا کہ وہ معانیٔ قرآن کی نئی تعبیر و تاویل کر کے قرآن و حدیث کو اس کی جگہ سے منحرف کر دیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے کلام کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کرنے دی جائے گی۔ اور خدائے بزرگ و برتر کا ہزار ہزار شکر ادا کیجئے ہماری ساری کمزوریوں کے باوجود آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی دانشمند قیادت کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس جنگ کے جیتنے کی سعادت عطا فرمائی۔ ہماری اصل جنگ یہی تھی کہ تعبیر وہی معتبر ہوگی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی۔ جس کو قرآن کی تعبیر مقرر کرنے کا حق نہیں دیا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد سے آج تک کسی اقلیتی مسئلہ پر (چاہے وہ نیشنل لیول کا ہو یا انٹرنیشنل لیول کا ہو) ہندوستان کے نیشنل پریس نے اتنا نہیں لکھا ہوگا جتنا تنہا اس مسئلے پر ہندوستان کے پورے پریس نے لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سارے ہندوستان پر پتہ نہیں کتنا بڑا ایک زلزلہ طاری ہو رہا تھا کہ اس ایک چھوٹے سے مسئلہ کو اتنا اچھالا گیا کہ کوئی مجلس، کوئی ہوٹل، کوئی کلب، کوئی محفل، کوئی سمپوزیم، کوئی اخبار، کوئی رسالہ، کوئی میگزین اس کے تذکرے سے خالی نہیں تھے۔ کیوں کہ اس کے اصل نشانے کو وہ جانتے تھے کہ ان کی اصل چوٹ کہاں پڑنے والی ہے۔ جوتا پہننے والا ہی جانتا ہے کہ جوتا کہاں کاٹتا ہے۔

(باقی آئندہ)

چند خوانی حکمتِ یونانیاں حکمتِ ایمانیاں را ہم بخواں
صحتِ ایں ارض زمعموری تن صحتِ آں ارض مجوشید از حبیب

ماہنامہ شاداب حیدرآباد
اپریل [illegible]
سلسلہ گذشتہ
قسط دوم

محمد کلیم الدین احسن

قائدِ ملت بہادر یار جنگ

سر اکبر حیدری کے زمانۂ وزارتِ عظمیٰ میں حکومت نے دستوری اصلاحات کا اعلان کیا، ان کی وضاحت کے لیے دارالسلام میں کئی دن تک مسلسل عام جلسے ہوتے رہے اور نواب صاحب نے ان اصلاحات کے مضمرات بیان کئے۔ ایک روز دورانِ تقریر میں سر اکبر کا ذکر آگیا۔ نواب صاحب نے ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے کرتے ہوئے کہا کہ جب سر اکبر نے فلاں تجویز پیش کی تو طبیعت چاہی کہ جھک کر چار.... اور یہاں تک کہہ کر نواب صاحب رک گئے۔ چند ثانیوں کا یہ وقفہ بڑا معنی خیز تھا اور ناتمام فقرہ کا عجیب سا تکملہ سب کے ذہنوں میں تھا۔ اس پس منظر میں کہ سر اکبر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے حامی تھے یہ ناتمام فقرہ اور لطف دے رہا تھا کہ نواب صاحب نے اپنا جملہ مکمل کر دیا...... طبیعت چاہی کہ جھک کر چار سلام بجا لاؤں اور اس جملہ کے ساتھ ہی مجمع زعفران زار بن گیا۔

سحرِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ اکثر دارالسلام کے جلسۂ عام میں نواب صاحب تقریر کر رہے ہوتے کہ بارش شروع ہو جاتی۔ مجمع میں تھوڑی ہلچل مچتی تو نواب صاحب کی گرجدار آواز سنائی دیتی: "بارانِ رحمت ہے کوئی مسلمان اپنی جگہ سے نہ ہلے" اس کے بعد لوگ شرابور ہو جاتے مگر ایک بھی اپنی جگہ سے نہ ہلتا۔

دھول پیٹھ کے فساد کے دوران ہندوؤں نے دو پٹھان نوجوانوں کو قتل کر دیا جو نواب صاحب کے دور کے عزیز تھے۔ یہ خبر پٹھانوں تک پہنچی تو آتشِ انتقام بھڑک اٹھی۔ ہزاروں نوجوان پٹھان جلوس کی شکل میں نکل پڑے ہندو ہراساں ہو گئے۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔ حکومت دم بخود تھی، حکام پریشان۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ مشتعل مجمع کو روکتا۔ نظام دکن سے درخواست کی گئی کہ صرف بہادر خاں ہی اس مجمع کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ نظام نے بہادر خاں سے ٹیلیفون پر بھی [illegible]

اکبر حیدری نے، رحمت یار جنگ کوتوال نے بھی درخواست کی۔ بہادر خاں نے اس مجمع کو آدھے راستے میں جالیا اور انھیں مخاطب کرتے ہوئے دو گھنٹے تک تقریر کی۔ مجمع متاثر ہوا اور الٹے پاؤں گھروں کو لوٹ گیا۔

یہ بات معجزہ سے کم نہ تھی۔ یہ سحر خطابت تھا جو کام فوج اور پولیس کے دستے نہ کر سکتے تھے بہادر خاں کی جادو بیانی نے کر دیا۔ حکومت ان کی ممنون احسان تھی مگر اس ممنونیت کا صلہ انھیں عجیب صورت میں دیا گیا۔ نظام کو یہ تاثر دیا گیا کہ جو شخص اپنی تقریر کے سحر سے پر جوش، پر غضب اور مجسم آتش مجمع کو سرد کر سکتا ہے کسی وقت ان کی آتشِ انتقام کو بھی بھڑکا سکتا ہے۔ اگر یہ آگ قصرِ حکومت کا رُخ کرے تو اسے جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔ نتیجہ بہادر خاں کی زبان بندی کی صورت میں نکلا۔

زبان بندی کے دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک ریلوے جنکشن پر جب مقامی لوگوں کو معلوم ہوا کہ بہادر خاں گذر رہے ہیں انھیں مجبور کیا گیا کہ مخاطب کریں مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد بہادر خاں نے مجمع سے کہا کہ حضرات! میری زبان بندی ہے لیکن اگر مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ کہتا ..... اس طرح ایک گھنٹہ تک خطاب کرتے رہے۔ درمیان میں وقفہ وقفہ سے یہ عذر کرتے رہے کہ میری زبان بندی ہے اگر کچھ کہتا تو یہ کہتا۔

لاہور میں سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے قرارداد پاکستان والے اجلاس میں جبکہ خاکساروں کا ایجی ٹیشن نقطۂ عروج پر پہنچا تھا، مسلم عوام میں انتشار اور بے چینی تھی، مجمع قابو سے باہر تھا، قائد اعظم کی آواز کا جادو بھی کام نہیں کر رہا تھا ایسے وقت قائد اعظم نے اعلان کیا کہ اب بہادر خاں تقریر فرمائیں گے۔ سارا مجمع ساکت ہو گیا۔ نواب صاحب کو تقریر کرنی پڑی جس کے لئے وہ پہلے سے تیار نہ تھے۔ یہ تقریر ایسی معرکتہ الآرا اور سحر انگیز تھی کہ اس کے بعد قائد اعظم نے بڑی مسرت سے اعلان کیا کہ اب نواب صاحب کی تقریر کے بعد کسی کا مخاطب کرنا بد ذوقی ہے نیز خود انھوں نے بھی کوئی تقریر نہیں کی۔

انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل میں "فن خطابت" پر تقریر کرتے ہوئے قائد ملت نے فرمایا کہ:

۱۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات رکھنے والا مقرر یا خطیب اپنی تقریر یا خطبہ میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ جس زبان میں تقریر کر رہا ہو اس زبان کے الفاظ و محاورات کا ذخیرہ اپنے دماغ میں محفوظ نہ رکھے۔ الفاظ و محاورات کا صحیح استعمال رات دن لغتوں کے مطالعہ یا رٹنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ مسلسل مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے اور کم از کم ایک مرتبہ اس کے صحیح استعمال سے وہ ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

۲۔ اگر آپ کا لہجہ درست نہ ہو تو آپ ہرگز مقرر کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ایک ہی جملہ آپ کے لہجے کے بدل جانے سے بالکل جداگانہ معنی پیدا کرتا ہے اسی لئے تقریر میں لہجہ کو درست رکھنا مقرر کا کمال اور کامیابی کا گُر ہے۔

۳۔ جب تک آپ کے پاس معلومات کا ذخیرہ نہ ہو تقریر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ تقریر میں معلومات کا پیش کرنا آپ کی تقریر میں جان ڈال دیتا ہے۔ بغیر معلومات کے تقریر بے جان ہے۔ معلومات کا ذوق صرف کثرت مطالعہ سے پیدا ہوسکتا ہے۔

۴۔ طرز بیان میں ترتیب و ربط ہونا ضروری ہے ورنہ تقریر بے مطلب اور بے معنی ہوجائے گی جس سے سامع بیزار ہوجائے گا۔

صاف ظاہر ہے کہ خطابت کی اپنی خداداد صلاحیت کو قائد ملت نے حسب الا محنت کرکے اسے جلا بخشی اور سحر انگیزی میں کمال حاصل کیا۔

نواب بہادر خاں خوشامد تو درکنار اپنی تعریف بھی سننے کے روادار نہ تھے

ایک بار مجلس کا اجلاس عام اکبر یار جنگ کی صدارت میں ہو رہا تھا بہادر خاں اسٹیج پر موجود تھے لاکھوں کا مجمع ان کی تقریر کا مشتاق تھا کہ ایک نوجوان شاعر اپنی نظم پیش کرنے اٹھا۔ شاعر نے پہلا شعر خوش الحانی سے پڑھا ہی رہا تھا کہ بہادر خاں بے چین ہوگئے، چہرہ سرخ ہوگیا، چہرہ پر شکن پڑگئی لیکن جوں ہی شاعر نے دوسرا شعر پڑھا بہادر خاں بے اختیار رونے لگے اور روتے ہوئے انھوں نے صدر سے درخواست کی کہ بہادر خاں بے اختیار رونے لگے اور روتے ہوئے انھوں نے صدر سے درخواست کی کہ شاعر کو نظم پڑھنے سے روک دیا جائے۔ عجیب نظارہ تھا۔ نواب صاحب کے رونے کی آواز [illegible]

سے نشر ہو رہی تھی اور نواب صاحب صدر اجلاس سے ہچکیوں کے درمیان رسول مقبولؐ کی اس حدیث کا واسطہ دے کر شاعر کو خاموش کرانے کی التجا کر رہے تھے کہ "مومن کے منہ پر اس کی تعریف کرنا اس کے ہلاک کرنے کے مترادف ہے"۔ شاعر نواب صاحب کے احساسات کا پاس کرتا ہوا اسٹیج سے اتر آیا۔ صدر جلسہ نے تلافی کے طور پر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بہادر خاں کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ان کے قلب پر ان اشعار سے جو چوٹ لگی تھی اس کے اثرات ان کی اس روز کی تقریر سے بھی ہویدا تھے۔ وہ دو شعر جو شاعر نے پڑھے تھے یہ ہیں —

اے مسلمانوں کے پیارے اے بہادر یار جنگ
رحمتیں نازل ہوں تجھ پر اے بہادر یار جنگ
خدمتِ اسلام کا تو کر رہا ہے حق ادا
دے رہے ہوں گے دعا تجھ کو محمد مصطفٰےؐ

نواب صاحب خاکسار تحریک کے ڈسپلن کے سخت پابند تھے۔ ایک بار انھیں مجلس کے ایک اجلاس سے خطاب کرنا تھا مگر خاکسار تحریک کے کسی جلسہ میں ٹرین کی تاخیر کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے۔ اس کی سزا میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور مجلس کے جلسہ میں وہ اس حالت میں پہنچے کہ ان کے دونوں جانب دو خاکسار انھیں گرفتار کئے ہوئے تھے لوگوں نے اپنے محبوب قائد کو اس حالت میں دیکھا اور پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

ایک دفعہ انھیں یہ سزا دی گئی کہ وہ حیدرآباد کی سب سے بارونق سڑک افضل گنج کے پل پر دوڑ لگائیں لوگوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ یہ نوجوان جاگیردار یہ سزا ہنسی خوشی برداشت کر رہا ہے۔

شعر و ادب سے قلبی ربط تھا۔ خلق تخلص کرتے تھے۔ سیاسی مصروفیات کی وجہ سے شعر گوئی کا موقعہ کم ملتا تھا۔ اکثر سفر میں گذرتی تھی۔ جب ادھر ادھر کی باتوں سے تھک جاتے تو طبیعت خود بخود شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتی۔ شعر دوسروں کو لکھوا دیا کرتے۔ شاعری ان کا فن نہیں تھا لیکن شعر فہمی، سخن سنجی اور نکتہ رسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے چنانچہ ان کے انتقال کے کئی برس بعد

رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے اپنے مجموعۂ کلام "آتشِ گل" کو ان کے نام سے معنون کرتے ہوئے لکھا :

"میں اپنے اس مجموعہ کلام کو قائدِ ملت مولوی بہادر خاں مرحوم (سابق نواب بہادر یار جنگ) کے نام نامی سے منسوب کرتا اپنا اخلاقی اور ادبی فرض تصور کرتا ہوں جو سراپا مجسم اخلاق، فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور جری انسان تھے جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا وہ بیک وقت تمام محاسنِ شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے ایسی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا خوش مذاق انسان نہ دیکھا"

دنیا کا ہر بڑا آدمی اپنی نجی زندگی میں بڑا زندہ دل، شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور حاضر جواب ہوتا ہے، نواب صاحب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ان کی زندگی کے چند واقعات پیش ہیں ۔

پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم نواب صاحب سے بے تکلف تھے اور اکثر ان دونوں میں فقرہ بازی ہوتی ۔ پروفیسر صاحب نے نواب صاحب کی قوتِ خطابت پر ایک لطیف چوٹ کی ۔ "نواب صاحب چھوٹے کی زبان بڑی چلتی ہے۔" نواب صاحب نے اس چوٹ کو فوراً محسوس کر لیا۔ بولے۔ "جی ہاں، تب ہی تو خلیفہ پروفیسر ہو جاتے ہیں۔"

اتحاد المسلمین کے ایک مشہور لیڈر نے نواب صاحب کو خط لکھا جس میں 'اتحاد المسلمین' سے "د" لکھا جانا چھوٹ گیا تھا۔ ملاقات پر نواب صاحب نے ان سے پوچھا تھا۔ "مولانا! یہ دال خوری آپ نے کب سے شروع کر دی ہے۔"

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی نواب دولت خاں نے ایک دن اپنی بھاوج (بیگم بہادر یار جنگ) سے کہا کہ "بھائی صاحب سے کہہ کر مجھے کسی پیڈ پرو بیشنری (PAID PROBATIONARY) کی آسامی پر مامور کرا دیجئے ۔" بیگم صاحبہ نے نواب صاحب سے کہا۔ "آپ دولت خاں کی 'پیٹ پرورش' کا کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے ۔" نواب صاحب نے

منہ سے یہ واقعہ سناتے اور فرماتے پیڈ پر و میشنری کا ترجمہ پیٹ پرورش سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔

نواب بہادر خان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مجلس اتحادالمسلمین کی قیادت تھی۔ ان کی وجاہت اور گرجدار آواز، ان کا حسنِ اخلاق اور دلچسپ شخصیت، ان کا وسیع و عمیق مطالعہ، ان کی حیدرآبادی تاریخ و روایات سے واقفیت، ان کی مشرقی اور اسلامی تعلیم سے آگاہی اور ان کی بے باکی اور حق گوئی ان کی کامیاب قیادت کے راز ہیں۔ ان کی غیر معمولی ذہانت اور دماغی صلاحیت سے زیادہ ان کے قلب و نظر کی صلاحیتیں بے مثال تھیں۔ اسلام کے مطالعہ اور تہذیبِ اسلامی کے فیضان نے ان کی ذات کو بے پناہ بنا دیا تھا کسی رہنما نے کسی ملک میں اتنی جلد اور اتنی کم عمری میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ ۲۵ سال کی عمر میں انھوں نے جماعتی زندگی شروع کی اور چالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، دوسرے قائد جہاں سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں، نواب صاحب نے اس نوبت پر اپنی منزل کو پا لیا تھا، ان کا پیام، ان کا مسلک، ان کی جد و جہد، ان کی سیاست خالص اسلامی تھی۔ مذہب و سیاست کا یہ صالح امتزاج ان کی قیادت کی کامیابی کا ضامن بن گیا۔

بہادر یار جنگ اور ٹیپو سلطان میں کئی مماثل خصوصیات تھیں۔ دونوں نے نامساعد حالات میں مسلمانانِ دکن اور بالواسطہ مسلمانانِ ہند کو دوبارہ اوجِ کمال تک پہنچانے کی سر توڑ کوشش کی اور دونوں آصف جاہی سازشوں کا شکار ہوئے۔ ایک نے سنتِ حسینی پوری کی اور دوسرے نے سنتِ حسنی۔

۲۵ جون ۱۹۴۴ء / ۳ رجب ۱۳۶۳ھ کو بہادر خان ایک بے تکلف دوست اور رکنِ عدالت العالیہ ہاشم علی خان کے یہاں رات کو دعوت میں مدعو تھے۔ کھانے میں ابھی دیر تھی نواب صاحب اقبال کے ایک شعر کی تشریح کر رہے تھے حقہ لا کر سامنے رکھا گیا نواب صاحب نے جونہی کش لیا ان کی روحِ مقدس زندگی، قیدِ جسم سے آزاد ہو گئی۔ حقہ کو زہر آلود کر دیا گیا تھا۔

وہ اٹھ گیا جو پیکرِ احساس و درد تھا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

قائدِ ملت برق و باد کی طرح اٹھے، ابرِ رحمت بن کر برسے اور پھولوں کی مہک بن کر رخصت ہو گئے۔ ٭٭٭

نظر برنی

مولانا محمد علی کے تعلیمی نظریات

کسی دانش ور کا یہ قول نہایت معقول معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم صرف کتابیں پڑھ لینے کا نام ہی نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم نام ہے اس تیاری کا جو ہمیں زندگی کے کاموں میں حصہ لینے کے لائق بناتی ہے۔ اگر ہندوستانی تاریخ تعلیم کے اوراق پلٹ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ تعلیم کے اعتبار سے بیسویں صدی کی خاص اہمیت ہے۔ یہ وہ صدی ہے جس میں صدیوں کی غلامی کے بعد ملک میں آزادی اور قومی شعور کا جذبہ بیدار ہوا اور بغاوت کی لہروں کو دنیا کی سب سے زبردست سامراجی قوتوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ نصیب ہوا۔ حب الوطنی ہندوستانی قوم کے فرزندوں کی رگوں میں دوڑنے لگی۔ اور ملک میں ایک نئے تعلیمی مزاج کا خمیر تیار ہونے لگا۔ جس رفتار سے آزادی کی تحریک شدت اختیار کرتی رہی، اسی رفتار سے تعلیمی میدان کے نشیب و فراز اجاگر ہوتے گئے۔ انگریزی نظام تعلیم عوام کی نظروں میں بُری طرح کھٹکنے لگا اور دانش ور طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ نظام تعلیم نہ صرف فرسودہ، غلامانہ اور دقیانوسی ہو گیا ہے بلکہ اس کا وجود ہی ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔

اکبر الہ آبادی جو انگریزی تعلیم کے سخت ترین مخالفین میں سے تھے اس موقع پر کتنے پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

امر واقعہ بھی یہی تھا کہ انگریزوں نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ ہندوستانی باشندے علم و دانش سے بیگانہ رہیں۔ اور وہ زیور تعلیم سے آراستہ نہ ہونے پائیں۔ اسی لئے انہوں نے تعلیم کا جو نظام مرتب کیا وہ محض تبلیغ عیسائیت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ

نے ایک موقع پر کہا تھا:

"تم ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہو؟ تعلیم دے کر انھیں اپنی بے انصافیوں سے آگاہ کرو گے۔ تم نے ان کا ملک لوٹ لیا ہے، تم نے ان کے ہم وطنوں کو برباد اور ذلیل و خوار کیا۔ تم نے ان کے بادشاہوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ لہٰذا تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو اسی طرح فریب خوردہ، خود فراموش اور جاہل رہنے دو۔"

انگریزوں کی اس تعلیمی سازش کا سر ڈی ہیلٹن کے بیان سے بھی پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اسی طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومیوں نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظانِ صحت کا سامان بجز دولت۔"

ہنٹر اور میکالے نے نظامِ تعلیم کا ایک ایسا تصور ہندوستان کے لئے پیش کیا جو انگریزوں کے مقاصد کو تو پورا کرتا ہی تھا بلکہ اس سے مستزاد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے ذہن و مزاج صحیح نشو و نما نہیں ہو سکی۔ مسلمانانِ ہند محض سرکاری ملازمتوں کے حصول اور یورپ کی کورانہ تقلید کو ہی تعلیم سمجھ بیٹھے تھے۔ طفیل احمد منگلوری رقم طراز ہیں:

"اس ترقی کے دو پہلو ہیں۔ ایک نوعیتِ تعلیم دوسرے مقدارِ تعلیم۔ نوعیتِ تعلیم میں تبدیلی کرنا اس لئے زیادہ اہم اور ضروری ہے کہ اس نے موجودہ نسل کے دماغوں کو فرقہ پرستی اور تنگ نظری سے محدود و مضمحل کر دیا ہے اور جب تک کہ تعلیم کو ہندوستانیوں کی ضروریات کے صحیح سانچے میں نہ ڈھالا جائے گا نوجوانوں کے دماغوں میں وسعت اور شگفتگی پیدا نہ ہوگی۔" (ماخوذ از مسلمانوں کا روشن مستقبل)

انگریزی نظامِ تعلیم کے خلاف قومی نفرت کا یہ رجحان اتنا شدید ہوتا گیا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں قومی تعلیمی ادارے قائم ہو گئے۔ آریہ سماج نے ڈی اے وی کالج اور گورو کل پاٹھ شالاؤں کی طرح ڈال دی تو دوسری طرف محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (جو بعد میں یونیورسٹی میں تبدیل ہوا) کے قوم پرست طلباء بھی اس تحریک میں سرگرمی اور جوش کے ساتھ شامل ہو گئے۔ قوم پرست طلباء کی رہنمائی کی ذمہ داری مولانا محمد علی نے اپنے اوپر لے لی۔ ان اداروں کے مقاصد، نصاب اور انتظامی ڈھانچہ میں باہمی اشتراک نہیں تھا۔ تاہم ایک بات ضرور مشترک تھی اور وہ تھی تو:

تعلیم کا فروغ ، قومی تعلیم کے ان پیشواؤں نے جو عوام کو انگریزی حکومت کے نظام تعلیم سے بیزار کرنا چاہتے تھے ۔ ان اداروں میں تعلیم کا رُخ موڑنے کیلئے اہم اقدامات شروع کر دیئے ۔

علی گڑھ میں سرسید احمد خاں کے کالج کے طلبا نے ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکوں کا اتنا اثر قبول کیا کہ انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کالج کا سارا انتظام ہی درہم برہم کر دیا اور اس بات کا پُر زور مطالبہ کیا کہ یہ کالج انگریزوں کے سرکاری بندوبست سے مطلقاً آزاد کر دیا جائے لیکن کالج کے اربابِ حل و عقد نے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا ۔ حکام کا شدید ردِ عمل دیکھتے ہوئے قوم پرست عناصر نے جن میں اساتذہ ، کارکنان اور طلبہ شامل تھے ، کالج کے انتظامیہ کے ساتھ عدم تعاون اختیار کیا اور کالج کی تطہیر اور اس کو سچے اسلامی و قومی خطوط پر چلانے کا مصمم ارادہ کر لیا ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ قومی اشتراک کے اسی سیکولر اندازِ فکر کی پیداوار ہے جو ۱۹ ؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو معرضِ وجود میں آئی ۔ مولانا محمد علی جو نہ صرف ایک عظیم قومی رہنما ہی تھے ۔ بلکہ ان کی نبض تعلیم پر بھی بھرپور تھی ۔ انہوں نے اپنی ہمہ جہت شخصیت کے پرتو سے ایوانِ تعلیم کو بھی منور کر دیا ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشنِ سیمیں (۱۹۴۶) کے جلسہ میں مولانا محمد علی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا :

" مولانا محمد علی اس عہد کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بے تابی بھی ودیعت فرماتی ہے ۔ ان کا ذہن انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے ۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانہ فرزانہ کی شاگردی اور ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں ۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمیٔ قلب ملی جو مایوسیوں میں امیدوار اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے ۔ اور اگرچہ بے وسیلگی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پا کر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبانِ حال سے فرمایا ۔

یہ سادگی تو رحم آمدم در این بازار
کہ تنگدستی و امیدوار می گذری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دلِ شکستہ و ویران کی قدر کرنا سکھا دیا تھا اور ہم بھی عرفی

کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ

مرغی دلِ آباد بہ یک جو دخرد عشق
من ہم دلِ ویراں بہ دو عالم نفروشم

۱۹۲۰ء کا زمانہ ہندوستانیوں کے جذبۂ حریت کی آزمائش کا زمانہ تھا۔ ملک میں ہر طرف "انگریزو بھارت چھوڑو" اور خلافت کا شورِ پیہم بلند ہو چکا تھا۔ علی برادران اور مہاتما گاندھی جو کہ ہندوستانی عوام کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے، دوروں پر شباب آگیا وہ جہاں جاتے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اس ریزولیوشن کا ہر جگہ خیرمقدم ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ تعلیم کا ایسا ادبی، سائنسی اور تکنیکی نظام منظم و مرتب کیا جائے جو قومی خطوط پر مبنی ہو اور قومی نگرانی میں ملک کی ضروریات کے لئے موزوں ترین قرار پائے۔ مولانا محمد علی نے کانگریس کے اس ریزولیوشن کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے علی گڑھ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اپنے ہم خیال اور جوشیلے طلباء کی ایک خاصی بڑی تعداد اپنے گرد جمع کرلی۔ اور کالج کے حدود میں ایک عظیم الشان جلسہ کا انعقاد کیا۔ جس وقت مولانا محمد علی مہاتما گاندھی کو اپنے ساتھ لے کر یونین ہال میں داخل ہوئے تو وہاں طلبا کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جس نے ان عظیم رہنماؤں کا استقبال بڑے پُرجوش طریقہ پر کیا۔ اس جلسہ میں ان قومی رہنماؤں نے ایک ایسے ادارہ کی داغ بیل ڈالنے کی اہمیت پر زور دیا جو سرکاری معاونت سے مطلقاً آزاد ہو اور جس کے ذریعہ میں حب الوطنی، "ثقافت شناسی" اور اجتماعی نقطۂ نگاہ کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ کالج کے اس جلسہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد علی اور ان کے رفقاء کو کالج سے نکال دیا گیا۔ لیکن مولانا محمد علی شیر دل محب وطن تھے۔ وہ بھلا اس تشدد آمیز ردِ عمل کا کیا اثر لیتے۔ انھوں نے کالج کے حکم نامۂ اخراج سے قبل ہی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ سرسید ہال کی مسجد کے صحن میں بپھرے ہوئے طلبا اور اساتذہ جمع ہو گئے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ہاتھوں اس قومی تعلیمی ادارہ کی رسم تاسیس عمل میں آئی۔ مولانا محمود الحسن کمزوری اور ضعیفی کے باوجود محض حب قومی میں دیوبند کی طویل مسافت طے کرکے علی گڑھ پہنچے تھے۔ علالت کے باعث ان کی تقریر مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنائی۔ مولانا محمود الحسن کی تقریر میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، جذبۂ حریت کے فقدان اور دینی تعلیم کی افادیت پر ولولہ انگیز ڈھنگ سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ انھوں نے فرمایا:

اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے

میری بیڑیاں پگھل جاری ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں میں زیادہ ہے تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیو بند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

انھوں نے قومی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بھی کہا:

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقاید وخیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال۔ ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہیئں بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بنالیتے"۔

مولانا محمد علی نے علی گڑھ کالج کے متوازی ایک تعلیمی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا تصور پیش کرنے سے پیشتر ایک تعلیمی نصاب تیار کیا تھا جس میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر اعلیٰ جماعتوں کے لئے دریسات موجود تھے۔ اس نصاب میں آنرز کلاسوں کا بندوبست بھی شامل تھا۔ اور ابتدائی وثانوی نیز اس کی تمام منزلوں میں صنعت وحرفت و دینی تعلیم کو اہمیت دی گئی تھی۔ جس کا مقصد طلباء کے ذہن و دماغ کی صحیح نشوونما کے علاوہ دستکاری کے کاموں میں دلچسپی پیدا کرنا تھا تاکہ وہ تعلیم سے فارغ ہوکر زندگی کے مختلف معاشی شعبوں میں نمایاں برتری حاصل کرسکیں۔ مثلاً قفل سازی، الیکٹروپلیٹنگ، صحافت، کپڑا بننا، جلد سازی، لیتھو اور ٹائپ کی طباعت، تصاویر، لائن اور ہاف ٹون بنانا، کاپی رائٹنگ، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ وغیرہ کی تعلیم۔

حکومت نے مسلمانوں کے اس نوزائید ادارہ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا لیکن ارباب جامعہ اس رویہ سے دل برداشتہ نہ ہوئے۔ انہوں نے جامعہ کو سرکاری اعانت کے بغیر کامیابی کے ساتھ چلانا شروع کردیا۔ اور ملک میں بہت جلد اس کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوگئی۔ چونکہ سودیشی تحریک زوروں پر تھی اور عدم تعاون کا سلسلہ جاری تھا اس لئے تھوڑے عرصہ میں اس ادارہ کے ساتھ ملک کے کئی مدارس نے اپنا الحاق مکمل کرالیا۔ اور ایک ناظر المعارف

انسپکٹر آف اسکولز) کا عہدہ مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ ۱۹۲۳ء کے اواخر تک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ۱۷ اسکولوں نے اپنا الحاق مکمل کرالیا تھا ۔

یہ تو تھا وہ تاریخی و سیاسی پس منظر جس کے تعارف کے بغیر مولانا محمد علی کے نظریات و معتقدات کی شناخت کرنا بعید از قیاس ہے ۔ مولانا محمد علی کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا ایک مقالہ میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے تاہم یہاں میں صرف ان کے تعلیمی مشاغل اور تعلیمی خدمات و نظریات پر اظہارِ خیال کرنے پر اکتفا کروں گا ۔

عہدِ حاضر میں تعلیم کے تین مختلف نظریات ہیں اور تینوں کے حامیین موجود ہیں ۔ ان میں پہلی جماعت کا خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف ترقی کے مواقع بہم پہونچانا اور رخنوں کو دور کرنا ہے ۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ افراد کو ثقافت سے بہرہ ور کرنا اور ان کی تمام تر صلاحیتوں کو نقطۂ عروج تک تربیت دینا ہی تعلیم کی غایت ہے ۔ لیکن تیسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ تعلیم انفرادی زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے بجائے اجتماعی زاویۂ نگاہ کی قائل ہے ۔ اور اس کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ مفید شہریوں کی تربیت کا کام انجام دے ۔ مولانا محمد علی موخر الذکر نظریۂ تعلیم کے قائل تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزی تسلط کو پسپا کرنے کے لئے ایسے نظامِ تعلیم کی سخت ضرورت ہے جس میں دینی و دنیوی تعلیم کی یکجائی ہو ۔ مادرِ وطن سے الفت کا جذبہ استوار ہو ۔ اور فطری نشو و نما کے ساتھ ساتھ پیشہ کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے نظامِ تعلیم کو جامعیت کے آئینے میں دیکھا اور برتا جاسکتا ہے ۔

یوں تو مولانا محمد علی کی اعلیٰ تعلیم یورپ میں بھی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے مغربی معاشرہ کا کوئی اثر قبول نہیں کیا ۔ ان کو اسلامی تہذیب و تمدن سے جو فطری لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہرچند وہ مزاجاً جذباتی واقع ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنے عقلی غور و فکر اور گہرے مشاہدہ کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ اسلام نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے سب سے بہترین نسخہ ہے ۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو نہ صرف مسلمانانِ عالم ہی نہیں بلکہ تمام دنیا ہی مادی و روحانی نجات حاصل کرسکتی ہے ۔ مولانا نے اپنے شوق سے قرآن، تفسیر، فقہ، حدیث، تاریخِ اسلام اور علم الکلام وغیرہ ایسے اسلامی علوم کا مطالعہ کیا تھا ۔ اور انھوں نے بہت جلد ان پر عبور حاصل کرلیا ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت بھی مولانا نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جامعہ میں تعلیم کا ڈھانچہ اس طرح کا ہو جس میں دینی تعلیم قدیم اور جدید طرز کے ساتھ موجود رہے ۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہر سطح پر

قرآن پاک کی تعلیم دی جائے ۔ اسی لئے انہوں نے اپنے نصاب میں اسلامیات کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے دوسری طرف غیر مسلم طلبہ کے لئے اسلامی تعلیمات کو اختیاری مضمون قرار دیتے ہوئے جامعہ میں ہندو اخلاقیات کا بندوبست بھی کیا جو آج تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جاری ہے ۔ وہ اپنے اخبار "ہمدرد" (۲۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء) میں ایک قاری کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں :

"جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو "جامعہ" اور "ملیہ" ہے یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور نہ وہ تو دیوبند اور مدرسۂ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دین کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے پھر یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے اور دیگر مذاہب کے پیروؤں کے لئے اس کا دروازہ بند نہیں ہے"

دینی تعلیم کو لازمی مضمون قرار دینے کی توجیہ پیش کرتے ہوئے اور قرآن پاک کے مطالعہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ایک تقریر میں کہا :

"یہ مقصد پیش نظر رہا ہے کہ اس ادارہ سے جدید معیار کے مطابق نہ صرف مہذب نوجوانوں کی تربیت کی جائے بلکہ ایسے پکے مسلمان تیار کئے جائیں جو کے دلوں میں اسلام کی پکی لگن ہو ۔ اور جو اپنے مذہب کی خاطر خواہ معلومات بھی رکھتے ہوں ۔ اور جو اسلام کی تبلیغی فوج کے آزاد دستوں کو کھڑے ہونے کی اہلیت رکھتے ہوں ۔ اس مقصد کے لئے مقصد قرآن کی گہری معلومات کو ناگزیر بنیاد تصور کیا گیا ہے"

قرآنی تعلیم کو اسلام کی روح اور تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہوئے وہ اپنے مولفہ نصاب تعلیم میں لکھتے ہیں:

"ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنے درس گاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسب معیار زمانہ حال تعلیم و تربیت یافتہ شمار کئے جانے کے مستحق ہوں بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب کی تعلیمات سے اس قدر بہرہ اندوز ہو چکے ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی و بے نیاز ہو کر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے

بنیادی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہر منزل میں ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ کلام اللہ کی تعلیم مکمل کر دی جائے تاکہ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اقتصادی یا دیگر وجوہ کی بناء پر منزل ابتدائی سے آگے بڑھنے کی استطاعت نہ رکھتی ہو۔ قرآن مقدس صرف ناظرہ ہی نہ پڑھ لے بلکہ اُردو یا دوسری مادری زبان میں اس کے بین السطور ترجمہ سے بھی واقف ہو جائے۔"

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مولانا محمد علی نے جس دور میں ایک قومی ادارہ کی اہمیت کو سمجھا تھا، وہ دور ہندوستانیوں کے لئے ابتلاء و آزمائش کا دور تھا۔ ہر طرف ترکِ موالات اور خلافت تحریک کا غلغلہ تھا اور عوام غیر ملکی تسلط کے خلاف نبرد آزما ہو چکے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے بعد ملک میں رفتہ رفتہ بہت سے قومی ادارے تشکیل پانے لگے جو اپنی مالی دشواریوں اور بے سروسامانیوں کے باوجود سرکاری امداد کے بغیر فروغ پاتے رہے۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا لکھتے ہیں:

"ملک کے مختلف حصوں میں قومی یونی ورسٹیاں، قومی کالج اور قومی اسکول قائم ہونے شروع ہو گئے۔ یوپی، پنجاب، اور بمبئی یونیورسٹی میں طالب علموں کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ بنگال بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہ رہ سکا۔ کلکتہ نے بھی پرجوش مناظر دیکھے جن کی تعداد ان اٹھارہ مہینوں کی یادگار مدت میں کچھ کم نہیں تھی ـــ تقریباً وسطِ جنوری میں دیش بندھو اور سی آر داس کی اپیل پر ہزاروں طالب علموں نے کالجوں اور امتحانوں کو خیرباد کہا۔ مہاتما گاندھی کلکتے گئے اور ۴ فروری کو نیشنل کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ وہ دوسری مرتبہ پٹنہ گئے اور نیشنل کالج کھولا۔ اور بہار ودیا پیٹھ کا افتتاح کیا۔ قومی تعلیم کو زبردست بڑھاوا ملنے کی وجہ سے اس طرح چار ماہ سے بھی کم مدت میں علی گڑھ کی نیشنل مسلم یونیورسٹی، گجرات ودیا پیٹھ، بہار ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ، بنگال نیشنل یونیورسٹی، تلک مہاراشٹر ودیا پیٹھ، اور ایک بہت بڑی تعداد میں مختلف گریڈ کے نیشنل اسکول ملک کے تمام حصوں میں قائم ہو گئے ہیں جن میں ہزاروں طالب علم تعلیم پانے لگے۔"

(باقی آئندہ)

کے۔ کے۔ کھلر

رنجیت سنگھ کا سیکولرزم

(مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے مذہب کے سختی سے پابند تھے اور اتنے ہی وہ سیکولر تھے جناب کے۔ کے۔ کھلر کے اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اپنے مذہب کا جتنا پابند ہوگا اتنا ہی سیکولر ہوگا۔ آج پوری دنیا میں مذہب کا احیاء ہو رہا ہے یہ سیکولرزم کے لئے فال نیک ہے)
ادارہ شاداب

رنجیت سنگھ کی پیدائش قریب 305 برس پہلے ہوئی۔ پھر بھی وہ پنجاب کے دلوں کے بادشاہ ہیں۔

رنجیت سنگھ مذہب میں گہری عقیدت رکھتے تھے۔ صبح سویرے وہ عبادت کرتے، دھارمک گرنتھوں کا پاٹھ سنتے اور خدا سے دعائیں مانگتے۔ گوربانی سے انہیں ترغیب عمل ملتی اور بھگتی سنگیت سے انہیں خوشی حاصل ہوتی۔ کوئی مہم شروع کرنے، کسی سفر پر روانہ ہونے یا کسی معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے وہ اکھنڈ پاٹھ کراتے اور گرنتھ صاحب سے فال لیتے ہر فوجی مہم کی کامیابی کے بعد سورن مندر امرتسر میں شکر گزاری کے لئے حاضر ہوتے اور چڑھاواں کے لئے خصوصی عطیات منظور کرتے۔ وہ دھارمک گرنتھ میدان جنگ میں بھی لے جاتے اور صبح گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے آدی گرنتھ اور دسم گرنتھوں کے اشلوک پڑھا کرتے۔

انہوں نے اپنے راگی گہری توجہ سے منتخب کئے تھے اور جن کی حوصلہ افزائی کے لئے موسیقی کے مقابلے کرایا کرتے۔ ان کی فوج کی ہر رجمنٹ کو دو دو مقدس کتابیں دی گئی تھیں۔ وہ نہ کوئی تاج پہنتے نہ شاہی لبادہ۔

انہیں دسویں گرو سے بہت عقیدت تھی۔ دسم گرنتھ انہیں زبانی یاد تھا۔ انہوں نے ایک بار ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا تھا کہ اگر کسی شخص نے گرو کو دیکھا ہو تو وہ اس کا عزت افزا

کریں گے ۔ ایک 166 سالہ شخص لاٹھی ٹیکتا اس کے دربار میں حاضر ہوا اور گورو جی کے بارے میں بیان کیا جسے اس نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا ۔ مہاراجہ نے اس شخص کے پاؤں چومے اور اسے بہت سے تحائف اور جاگیر دے کر واپس بھیجا ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے نام سے راج نہیں کرتے تھے ۔ اکثر وہ ایک چٹائی پر بیٹھے رہتے تھے اور ان کے سب درباری کھڑے رہتے تھے ۔ اگرچہ دوسرے راجاؤں نے انھیں مہاراجہ کا لقب دیا تھا جسے انھوں نے ہچکچاتے ہوئے قبول بھی کر لیا تھا لیکن انھیں سرکار کہہ کر پکارا جاتا تھا ۔

وہ بڑے شوق سے کہا کرتے تھے کہ وہ تو محض گورو گوبند سنگھ کا نقارہ ہیں ۔ ہر جیسا کبھی بھی وہ آنند پور صاحب جاتے اور اس مقام پر کھڑے رہتے جہاں گورو گوبند سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو تحریک دی تھی اور سکھ دولت مشترکہ کی بنیاد رکھی تھی ۔

بھاری عطیات : انھوں نے ننکانہ صاحب مندر کے لئے بڑے بڑے قطعات زمین دان میں دیئے اور سورن مندر امرتسر کی خوبصورتی اور چراغاں کے لئے لاکھوں روپیے خرچ کئے ۔ نظام حیدرآباد نے انھیں جو جھولداری دی تھی وہ انھوں نے سورن مندر کو دان کر دی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کا دربار تو گورو کے دربار کا ایک سایہ ہے ۔

انھوں نے گورو مت یعنی ست سنگت کی طرف سے جاری کئے جانے والے فرمان کا سلسلہ قائم کیا ۔ یہ وہ نام ہے جس سے قبل ازیں سکھوں کے فیصلوں کو پکارا جاتا تھا ۔ اپنی سرکار کا ذکر وہ ہمیشہ "خالصہ جی" یا سرکار خالصہ کے نام سے کرتے تھے ۔ ان کے سکوں کو نانک شاہی سکے کہا جاتا تھا ۔ ان کے تمام سکوں پر " اکال سہائے رنجیت " یعنی خدا رنجیت کا مددگار ہو کے الفاظ نقش تھے ۔

رنجیت سنگھ اپنے دشمنوں سے جو ہمدردی رکھتے تھے اور حیوانات کے لئے جو ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے وہ براہ راست ان کے مذہبی خیالات کا نتیجہ تھا ۔ انھوں نے اپنے ایک جرنیل کو کوئل ہلاک کرنے پر سزا دی تھی ۔ کوئی شخص کسی ہنس طوطے بلکہ ایک چھوٹی چڑیا تک کو زخمی نہیں کر سکتا تھا ۔ ان کی سلطنت میں ذبیحہ گاؤ پر پابندی تھی اور گورو کا لنگر مفت تقسیم کرنے کا فرمان تھا ۔

وہ اکثر مقدس مندروں میں تیار ہونے والا پرشاد لینے کے لئے لوگوں کی بھیڑ میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے ۔ سکھ دھرم کے اصولوں کے مطابق وہ بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے جیسا کہ گورووں کا فرمان تھا ۔ وہ تمباکو کو چھوتے تک نہیں تھے ۔ وہ بے کا کرتا ، کپڑا کر بند

تھے، لمبے بال رکھتے تھے اور ان میں کنگھا رہتا تھا۔ ان کی تمام شادیاں ماسوائے
م رقاصہ لڑکی مہران کے ساتھ شادی کے، سکھ دھرم کے مطابق ہوئیں۔

مہران کے سلسلے میں بھی ظاہر ہے کہ انھوں نے سکھ سنگت کی رضا کے سامنے مکمل طور پر
ڈال دیتے تھے۔ مہاراجہ دربار میں رقاصہ لڑکیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق کیا کرتے
سے درباری برداشت کر لیتے تھے لیکن جب وہ مہران کو گھوڑے پر بٹھا کر ...
ں میں گئے تو درباریوں نے اس پر سخت اعتراض کیا۔

ان کی اس اخلاقی کوتاہی کے لئے جو ایک بادشاہ کے شایان شان نہیں تھی دربار صاحب
میں طلب کیا گیا۔ وہاں ان کی سماعت ہوئی اور انھیں کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا۔ ان
ہ اں کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دئے گئے۔ یہ درخت آج بھی وہاں موجود
حکم دیا گیا کہ جو بھی پہلا شخص دربار میں داخل ہو وہ مہاراجہ کو سو کوڑے لگائے لیکن
مارنے والے کے ہاتھ کانپ گئے۔ مہاراجہ کے اعلیٰ مرتبہ کو دیکھتے ہوئے سزا معاف
ئی۔ مہران کو پٹھان کوٹ بھیج دیا گیا لیکن اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ مہاراجہ کو
ین اختیارات کے مالک کی حیثیت سے سکھ سنگت کا کتنا احترام تھا۔

ے مذاہب کا احترام: خالصہ کی عقیق روایات کے مطابق رنجیت سنگھ اپنے
کے علاوہ دیگر مذاہب کا بھی پورا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے ہری دوار، کورو کیشتر
اور جنوبی ہند کے مندروں کو فراخدلانہ عطیات دئے۔ وہ پوری میں جگناتھ کا مندر
جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے کونارک کے سوریہ مندر کے بارے میں معلومات طلب
۔ ان کی آخری خواہش تھی کہ کوہ نور ہیرا جگن ناتھ کے مندر کو دان کیا جائے۔ ڈوگرہ
انے پوری نہیں ہونے دی۔ وہ وکرما دتیہ اور مین برش کی طرح ہر قسم کے نجومیوں اور
ئیاں کرنے والوں کو اپنے دربار میں بلایا کرتے تھے۔ کیرالا کے ایک نجومی مدھوسودن کے
یک دل میں بہت احترام تھا۔ جو کوئی گائے ہلاک کرنے کی جرأت کرتا وہ اسے سخت
یا کرتے تھے۔ انھوں نے شاہ شجاع پر سومناتھ کے مندر کے دروازے واپس
کے لئے زور دیا جو محمود غزنوی اکھاڑ کر لے گیا تھا۔

مصر بیلی رام ان کے وزیر خزانہ تھے اور دیوان دینا ناتھ، دیوان بھوانی داس اور دیوان
م ان کے دربار کے کمپٹرولر جنرل، پے ماسٹر جنرل اور اکاؤنٹنٹ جنرل تھے۔ دیوان ساون
نا موتی رام ان کے دو بہترین صوبائی گورنر تھے جو اپنی انتظامیہ قابلیت اور تدبر کے لئے مشہور

تھے۔ دیوان حکم چند، دیوان رام دیال اور دیوان چند ان کی سلطنتوں کو کہیں سے کہیں لے گئے۔ میدان جنگ کا قہر حکم چند ایک عظیم فوجی ذہانت کا مالک تھا اور محض اپنے محاسن کی بنا پر جنرل کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ یہ لوگ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سیکولر پالیسیوں کے تئیں خراج عقیدت ہے جو سکھ دھرم کو ہندو دھرم اور اسلام کے درمیان ایک حقیقی رابطہ سمجھتے تھے جیسے کہ گورونانک دیوجی نے سوچا تھا۔

رنجیت سنگھ نے اپنی مسلمان رعایا کے تئیں جس احترام اور بردباری کا اظہار کیا وہ قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنی فوجی زندگی کے آغاز سے ہی محسوس کر لیا تھا کہ ان کا ایک آزاد ملک قائم کرنے کا خواب اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب وہ آبادی کی اکثریت یعنی مسلمانوں کو خوش رکھیں۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کی نسبت مسلمانوں نے اماں شاہ کو پنجاب سے نکالنے اور لاہور کے قلعہ پر قبضہ کرنے میں اس کی زیادہ مدد کی تھی۔ وہ پنجاب کے مسلمان دیہاتوں پر بہت اعتماد کرتے تھے چونکہ مسلمانوں نے دیکھ لیا تھا ان کے ہم مذہب حملہ آوروں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا لہٰذا وہ مہاراجہ کا بڑے پیار سے احترام کرتے تھے۔

مہاراجہ مسلمانوں کے جذبات سے پوری طرح آگاہ تھے اس لئے انھوں نے مسلمانوں کو اپنی حکومت اور پنجاب کے سماج میں باعزت مقام دیا۔ وہ مسلمانوں کے تہوار عید کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے جتنی کہ ہولی اور دسہرہ کو۔ فارسی کو دربار کی زبان رکھا گیا اگرچہ وہ ان پڑھ تھے۔ لیکن انھوں نے تمام کاج کے لئے ضروری فارسی اور اردو سیکولی تھی۔ انھوں نے ایک مسلمان عورت سے شادی کی اور اقلیتوں کے تعصب کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کی۔ ان کے دور حکومت میں نہ کبھی تبدیلی مذہب ہوئی نہ فرقہ وارانہ فساد نہ کوئی لسانی کشیدگی تھی اور نہ دوسرے درجے کی کوئی شہریت تھی۔ کوئی بھی ہنرمند اور ذہین شخص ان کے دربار میں آکر اپنا حصہ طلب کر سکتا تھا۔

انھوں نے مسلمان علماء کو فراخ دلی سے عطیات دئے اور اپنی سلطنت کے فقیروں اور درویشوں کے تئیں اظہار عقیدت کیا۔ جس طرح انھوں نے پرانوں، رامائن اور بھگوت گیتا کا ترجمہ پنجابی اور فارسی میں کرایا ویسے ہی انھوں نے مسلمانوں کی مقدس کتابوں کے دوسری زبانوں میں بھی ترجمے کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے مسلم یادگاروں اور باغات کی مرمت کرائی۔

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے سرکاری طور پر پہلا کام یہ کیا کہ وہ اورنگ زیب کی تعمیر کردہ بادشاہی مسجد میں گئے۔ انھوں نے اردو فارسی کے مرکز قائم کئے اور میاں واڈہ لاہور کے فارسی مدرسے کے لئے کئی دیہات کی آمدنی وقف کر دی۔ ہیرا منڈی

سسی پنوں، مرزا صاحباں اور مستی مراد کے پیار کی داستانیں پہلے سے پنجابی میں لکھی گئیں
کے ایک خوش نویس نے اپنی تخلیق کی قیمت دس ہزار روپئے طلب کی تھی جو ملک کا اور
مسلم نواب دینے کو تیار نہیں تھا لیکن رنجیت سنگھ نے یہ کام کرنے کے لئے اتنی مطلوبہ
ادا کردی۔ پشاور کے مسلمان فقیروں کے تئیں عقیدت کے طور پر انھوں نے تمام
خانقاہیں واپس کردیں۔

فتح کے جلوس میں پشاور کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے انھوں نے اپنے
سرداروں کو حکم دیا کہ نہ کوئی کھیت روندا جائے نہ کسی عورت کی بے حرمتی کی جائے
نہ کسی مسجد کو کوئی نقصان پہنچایا جائے۔ مسلم علماؤں نے اس فتح کو دعائیں دیں
کہ انھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کوئی حیرانی کی
بات نہیں ہے کہ مسلمان جرنیل مہاراجہ کا جھنڈا پنجاب کی سرحدوں سے بہت دور لے گئے
...کی فوج نے جس میں زیادہ تر مسلمان فوجی ہی تھے رنجیت سنگھ کے آخری
دنوں میں کابل فتح کیا۔

انھوں نے محمد بخش جیسے فن کار اور شاہ محمد جیسے شاعر کی عزت افزائی کی۔ پنجابی
مشہور شاعر فضل شاہ نے رنجیت سنگھ کی ترغیب پر سوہنی مہینوال کا ڈرامہ لکھ کر کھیلا
شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں بھی پنجابی میں لکھے گئے۔ لاہور کے شاہ حسین نے صرف سوہنی مہینوال
قریب 50 الگ الگ قصبوں کا ذکر کیا ہے۔ مسلم مکتبوں اور مدرسوں کو ہر سال دو لاکھ
روپئے کے عطیات دئے جاتے تھے۔

مہاراجہ نے اپنے ہاتھوں شکست خوردہ مسلمان دشمنوں سے جتنا اچھا سلوک کیا
اس کی مثال نہیں ملتی۔ شکست خوردہ افغان گورنر سلطان محمد خاں کو تین لاکھ روپئے
سالانہ آمدنی کی کوہاٹ کی جاگیر دی گئی۔ مہاراجہ اپنی مسلم رعایا کے جذبات کے اتنے
پاس تھے کہ "سکھ اور افغان" کتاب کے مصنف شہامت علی کے بیان کے مطابق کہ
انھوں نے گورکھ ناتھ کے متنازعہ مندر کے قریب ہی ایک مسجد تعمیر کروائی اور پشاور کے
گورنر کو حکم دیا کہ وہ سکھ فوجیوں کے ہاتھوں مسلم آبادی کی بے حرمتی نہ کرنے دینے کے لئے
معقول حفاظتی اہتمام کرے۔ ملتان کے شکست خوردہ گورنر سے بھی نہایت فیاضی کا سلوک کیا گیا۔

بخاری برادران: تین بخاری بھائیوں نے پنجاب کو سیکولر قدروں کی بہشت
بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ فقیر عزیز الدین [illegible] کے

خزانوں کے امین تھے۔

شہری اور فوجی خدمتوں میں مسلمان افسر بڑی تعداد میں موجود تھے اور پنجاب کی آبادی میں بھی مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی اس لئے وہ مہاراجہ کی وفات پر دوگروں کی مانند اپنی ایک مسلمان جماعت بنا سکتے تھے اور اپنا حصہ طلب کر سکتے تھے۔ جکیم لشن داس جو ہر روز مہاراجہ کی خوراک چکھا کرتے نورالدین کے سب سے بھروسہ مند شخص تھے۔ جب کابل کے دوست محمد نے عزیزالدین کی جو پشاور میں گفت و شنید کے لئے گئے ہوئے تھے یہ کہہ کر تضحیک کی کہ وہ ایک کافر کی خدمت کر رہے ہیں تو لاہور کے وزیر خارجہ نے یہ کہہ کر منہ توڑ جواب دیا "کیا یہ میرا فرض نہیں کہ میں غیر ملکی جارحیت کا مقابلہ کر کے اپنے ملک کا دفاع کروں اور اس طرح نمک حلال کروں؟" آپ اقتدار کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اسلام کے لئے نہیں " فقیر وحیدالدین نے اپنی شاندار کتاب "حقیقی رنجیت سنگھ" میں جو ان کے خاندان کے محفوظ دستاویزات کی بناء پر پاکستان میں شائع کی گئی ہے ایسے بہت سے واقعات بیان کئے گئے ہیں جہاں بخاری بھائیوں کی وفاداری کی بدولت پنجاب کی عزت بچائی گئی۔

فقیر وحیدالدین نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے فقیر نورالدین کو بھیجی گئی ایک انتظامیہ ہدایت کے لئے اپنے خاندانی کاغذات کا حوالہ دیا ہے۔ اس فرمان کا لب لباب یہ ہے کہ اگر رنجیت سنگھ خود بھی کسی بے ادبی یا زیادتی کا مرتکب ہو تو وزیر داخلہ کو اس کے خلاف کارروائی سے بھی گریز نہیں کرنا چاہئے۔

اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مہاراجہ نے جو سلطنت قائم کی وہ نہ تو سکھ حکومت تھی نہ کوئی فوجی آمریت تھی۔ بلکہ یہ ایک سیکولر نظریہ رکھنے والی فلاحی حکومت تھی یا جیسے کہ وی۔ ایس سمتھ نے اسے بیان کرنا چاہا ہے "یہ ایک دوسرے فرقوں کے ساتھ حصے داری تھی"۔ اگرچہ مہاراجہ ان پڑھ تھے لیکن انہوں نے بول چال کی فارسی پر مہارت حاصل کر لی تھی اور کئی بار کھلے دربار میں فقیر عزیزالدین کے مسودے درست کر دیا کرتے تھے۔ اپنی حکومت کے آخری دور میں مہاراجہ نے انگریزی اور فرانسیسی تعلیم کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے عیسائی مشنریوں کو لوگوں کا مذہب تبدیل کرنے یا سکولوں کے نصاب میں بائیبل کی تعلیم شامل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

1837 میں 18 سال کے لڑکے راجہ ہیرا سنگھ نے انگریزی میں ایسی مہارت

باقی بر صفحہ ۴۴

اردو ریسرچ اور ادارۂ تحقیقاتِ اردو

ادارہ تحقیقاتِ اردو' اور خدا بخش لائبریری کے تعاون سے منعقدہ چار روزہ اردو ریسرچ کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نمایندوں نے اردو تحقیق کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لئے تجاویز و مشورے پیش کئے اور ان پر بحثیں کیں۔ ڈاکٹر عبدالحق دہلی یونیورسٹی نے اپنی تجویز میں اس بات پر زور دیا کہ تحقیق کے کام کو پورے ذوق و شوق سے کرنے کے لئے ریسرچ اسکالر کے اندر مسابقت پیدا کرنا ضروری ہے اور اس کے لئے ضروری اور مناسب ہے کہ کوئی بڑا ایوارڈ ہر سال کے سب سے بہتر مقالہ نگار کو دیا جائے جس نے ہندستان کی تمام یونیورسٹیوں میں پیش کئے جانے والے مقالوں میں سب سے بہتر مقالہ پیش کیا ہو۔ یہ ایوارڈ کم از کم دس ہزار روپے کا ہو جس کا فیصلہ ادارہ تحقیقات کی جانب سے بنائی محققین کی کمیٹی کرے۔ سکریٹری ادارہ تحقیقات اردو نے اس تجویز سے اصولی طور پر اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ نقد انعام کے بجائے ہر سال کے بہترین مقالوں کو چھپوانے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اس کے اندر پیش کردہ معلومات سے عوام کو فائدہ بھی پہنچے اور اس کے منافع کی رقم سے ریسرچ اسکالر کو رائلٹی بھی ملے۔ کانفرنس چاہے تو اس کا ذمہ ادارۂ تحقیقاتِ اردو لے سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن' جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے اپنے وسیع تجربات کی روشنی میں فرمایا کہ ریسرچ کے لئے چھوٹے موٹے دیوان کی تدوین یا معمولی قسم کے موضوعات کے انتخاب کے بجائے ایک لمبا پروجیکٹ بنا کر اس کے مختلف حصے کر کے حسبِ ضرورت دو تین ریسرچ اسکالرس میں تقسیم کر کے کام کروانا چاہیے تاکہ یہ تمام کڑیاں مل کر ایک مربوط اور مستقل کام کی شکل میں سامنے آ سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن نے ایم اے کی سطح پر تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلے میں اس بات پر زور دیا کہ طلبا کو کم از کم ایک ایسا کام دیا جانا چاہیے جس سے ان کے اندر

ادب کی شناخت کا رجحان پیدا ہو۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کے لئے پیش کئے جانے والے مقالوں کا سالانہ جائزہ لئے جانے پر بھی زور دیتے ہوئے اپنے مخصوص ادبی انداز میں فرمایا کہ یہ اجتماع تو ہم تحقیق کے "مجرموں" کا تھا۔ اب ایک اجتماع تحقیق کے مدعیوں یعنی طلبہ کا بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ ریسرچ کے سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کو بتا سکیں۔ پٹنہ یونیورسٹی شعبۂ نفسیات کے ریٹائرڈ پروفیسر محمد محسن صاحب نے اپنی تجاویز پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو تحقیق کو عصری مسائل سے ہم آہنگ کرنا چاہیئے اور اسے ملازمت کے حصول کا ایک ذریعہ بنانے کے بجائے سماجی اور عصری مسائل کا حل بنانا چاہیئے۔ کانگریس میں شریک اکثر دانشوروں نے اس بات پر زور دیا کہ جامعات میں کی جانے والی تحقیق کے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کرنے کے لئے ادارۂ تحقیقات اردو، وقفہ وقفہ سے اردو میں ہونے والی تحقیق کے موضوعات کی کل فہرست شائع کرتا ہے اور تمام یونیورسٹیاں اس کام میں ادارہ کے ساتھ اشتراک کریں۔ اردو ریسرچ کانگریس میں شریک یونیورسٹی کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے ادارۂ تحقیقات کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ ادارۂ تحقیقاتِ اردو تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلے کیا ریسرچ میں کام آنے والی تمام حوالہ جاتی کتب کو جمع کرے گا اور ایک ریسرچ سنٹر کے طور پر یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کو سہولتیں بہم پہنچائے گا۔ ڈاکٹر عبدالحق دہلی یونیورسٹی نے اس بات پر زور دیا کہ اردو تحقیق کے سلسلے میں ادارہ کو ایک مرکز بنایا جائے اور تمام ریسرچ میں معاون کتب ادارہ میں جمع کی جائیں۔

بہار کے معروف مصنف جناب احمد یوسف نے اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں فرمایا کہ ریسرچ کے مقالوں میں اکثر موضوع سے غیر متعلق کئی ابواب ہوتے ہیں جن میں اصل موضوع دب کر رہ جاتا ہے۔ تحقیقی مقالوں میں موضوع سے غیر متعلق ابواب نہ ہوا کریں تاکہ مقالہ نگار پوری توجہ سے اصل موضوع کا حق ادا کر سکے۔ ڈاکٹر قدوس جاوید، کشمیر یونیورسٹی نے مشورہ دیا کہ پی ایچ ڈی کے لئے رجسٹریشن سے پہلے طلبہ کے رجحان کا ٹسٹ لیا جانا چاہیئے اور جس صنف میں اس کو دلچسپی ہو اس سے متعلق تحقیق کا موضوع دینا چاہیئے۔ پروفیسر سید حسن، سابق صدر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے فرمایا کہ ایران میں ریسرچ اسکالر کو سند دینے سے پہلے اپنے موضوع پر اہل علم کے عام جلسہ میں لکچر دینے کے لئے کہا جاتا ہے اور اس لکچر کے بعد لوگ اس پر سوالات

پیش کرتے ہیں اور وہ ان کا "دفاع" کرتا ہے۔ ہندوستان میں بھی "دفاع" کی یہ رسم جاری کرنا چاہیے تاکہ ریسرچ اسکالر کی تحقیق سے عوام باخبر ہوسکیں اور اس کے معیار کا عوامی سطح پر جائزہ لے لیا جائے۔ بند کمرے میں ممتحن کے سامنے سوال و جواب ے بجائے تعلیم یافتہ افراد کے درمیان "دفاع" کرنا مقالہ کے معیار کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

واضح رہے کہ ادارۂ تحقیقات اردو کی جانب سے منعقد کی گئی اردو ریسرچ نگریس میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ، گلبرگہ، علی گڑھ یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، یدرآباد یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، مگدھ یونیورسٹی، بھاگلپور یونیورسٹی ر یونیورسٹی، متھلا یونیورسٹی، روہیلکھنڈ یونیورسٹی، انامالائی یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے نمایندوں نے شرکت کی اور ۴۴ مقالے پیش کیے گئے جن میں ۳۶ تحقیقی مقالات کا مفصل اور اردو کے مختلف اصناف میں کی گئی تحقیقات کا سرسری جائزہ لیا۔ جن تحقیقی مقالوں کو ہدف تنقید و تحقیق بنایا گیا ان میں سے اکثر شائع ہو چکے ہیں رجن کے پیش کرنے والے کسی نہ کسی یونیورسٹی میں اردو کی تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ اور خدا بخش لائبریری کے اشتراک سے پہلی ن انڈیا اردو ریسرچ کانگریس کا افتتاح خدا بخش لائبریری ۲۴ر جنوری ۱۹۸۷ء کو رنر بہار جناب پی وینکٹ سبیا کے ہاتھوں ہوا۔ گورنر بہار نے ادارہ تحقیقات کے جناب قاضی عبدالودود کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قاضی عبدالودود تعلق خدا بخش لائبریری سے گہرا تھا۔ وہ اس کی گورننگ باڈی اور دوسری کمیٹیوں ممبر کی حیثیت سے لائبریری کو اپنی ذات سے فائدہ پہنچاتے رہے اور پچاس سال سے اپنی تحقیقی نگارشات کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ وہ یقیناً اس د مقام کے مستحق تھے جو ہندوپاک کی علمی دنیا میں انھیں حاصل تھا۔ جناب قاضی عبدالودود دو تحقیق کے گرتے ہوئے معیار پر ہمیشہ تشویش کا اظہار کیا کرتے تھے اور دو تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی فکر انھیں ہمیشہ دامنگیر رہی۔ یہی مناسب ہوگا ادارہ تحقیقات اردو ایک پروجیکٹ کے ذریعہ اس کام کو جاری رکھے جس سے رحوم کو عشق تھا۔

گورنر موصوف نے اس کانگریس کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے

توقع ظاہر کی کہ اس پانچ روزہ کانگریس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوگا۔ انھوں نے خدا بخش لائبریری کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ چند برسوں میں خدا بخش لائبریری ایک عظیم تحقیقی کتب خانہ کی حیثیت سے ابھری ہے اور اس نے بڑے پیمانے پر علوم کی نشر و اشاعت کا ہمہ جہتی طریقہ اختیار کیا ہے۔ تحقیقی کام کو برق رفتاری سے آگے بڑھانے کے لئے لائبریری نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور انڈین کاونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی سطح کے اسکالرشپ بھی دینا شروع کر دیئے گئے ہیں جو پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے طلبا اور یونیورسٹی اور کالج کے دانشور اساتذہ کے لئے مہیا ہیں جو ان دانشوروں کے لئے گمنامی میں پڑے ہوئے جواہر پاروں کو تدوین و ترتیب کرنے میں سہولت کا موجب ہوں گے۔ وہ نادر مخطوطات جو خدا بخش یا دوسرے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

گورنر بہار نے مزید فرمایا کہ کتب خانوں کی تاریخ میں، ہندوستان میں پہلی بار، بہار کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ اس کی ایک لائبریری کو متعدد (کشمیر، جامعہ، گلبرگہ اور مگدھ) یونیورسٹیوں نے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے لئے ایک تحقیقی مرکز کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ انھوں نے یہ مژدہ بھی سنایا کہ خدا بخش لائبریری نے ایک گراں قدر ایوارڈ کی بنیاد ڈالی ہے۔ جو اردو، عربی، فارسی، اسلامیات، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کی تاریخ ہند سے متعلق محققین کو ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جائے گا۔ ایوارڈ کی یہ رقم تیس ہزار سے پچاس ہزار تک ہوگی۔ گورنر بہار نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ اس کانگریس میں پڑھے گئے تین بہترین مقالوں پر پانچ پانچ سو روپیوں کا انعام بھی دیا جائے گا اور مقالہ نگار کو سرکاری خرچ پر بہار کے دیگر علمی مرکزوں سے استفادہ کا موقع بھی فراہم کیا جائے گا۔

مورخہ ۲۵ر جنوری کو تحقیقی مقالات کے جائزہ کی نشست کا آغاز ہوا۔

آغاز میں پروفیسر محمد محسن نے طریق تحقیق کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ریسرچ میں سب سے اہم چیز طریق تحقیق ہے۔ قاضی صاحب نے ایک خاص طریق تحقیق کو اختیار فرمایا تھا۔ مناسب ہوگا کہ اس کانگریس کے موقع پر کم از کم طریق تحقیق کا ایک خاکہ بنا لیا جائے۔

جناب شہاب الدین دسنوی نے فرمایا کہ ریسرچ اسکالر کی سہولت کیلئے مقالوں کے اقتباسات و تلخیص کی اشاعت کا اہتمام ہونا چاہئے اور یہ کام

خدابخش لائبریری بہ حسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔

ڈاکٹر کلیم الحق قریشی نے اپنے دو مقالات "یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کی رفتار۔ ایک جائزہ" اور "یونیورسٹیوں میں غیر معیاری تحقیق۔ ایک تنقیدی جائزہ" پیش فرمائے۔ موصوف نے اپنے مقالات کے تمہیدی کلمات میں فرمایا کہ قاضی عبدالودود، جناب امتیاز علی عرشی اور جناب مالک رام نے تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں اگرچہ اردو کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ مگر وہاں تحقیقی کام کی رفتار سست ہے۔ انھوں نے پاکستانی مصنفین کے حوالہ سے بتایا کہ پاکستان میں تحقیقی کام کی رفتار غیر تشفی بخش ہے۔ ہندوستان میں ابتدا میں اردو تحقیق کی کوئی جہت مقرر نہیں تھی مگر رفتہ رفتہ ایک جہت مقرر ہوئی ہے اور اس کام میں تنقید نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ تنقیدی بصیرت تحقیقی کام کیلئے بہت ضروری ہے۔ جامعات سے باہر بھی اچھے کام ہوئے ہیں جس نے جامعات میں ہونے والے کام پر بھی اچھا اثر ڈالا ہے۔ جناب کلیم الحق نے تمام یونیورسٹیوں کے اعداد و شمار کی روشنی میں تحقیقی کام کی رفتار کا جائزہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ شخصیتوں پر کام کرنے والے مقالہ نگاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ شخصیات پر پٹنہ یونیورسٹی میں ۳۹ مقالے لکھے گئے جب کہ لکھنؤ اور علی گڈھ یونیورسٹی میں ۲۸ مقالے لکھے گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر گیان چند کے حوالے سے شخصیات پر کی جانے والی تحقیق کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ زندہ شخصیتوں پر کام کرنے میں بہت سے گوشے خالی رہ جاتے ہیں اور [illegible] و تعلقات کی بنا پر بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی بہترین مثال فراق گورکھپوری پر لکھے گئے مقالے ہیں۔ ان کی زندگی میں جو کام ہوئے وہ ان کے انتقال کے بعد کے مقالے سے مختلف تھے۔ مقالے کے بعد جناب شہاب الدین دسنوی، ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی، جناب احمد یوسف، ڈاکٹر انیس رفیع، جناب احمد جمال پاشاہ، جناب ظہور الدین، ڈاکٹر نذیر ملک، ڈاکٹر کمال الدین، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، جناب شبیر احمد، کامریڈ حبیب الرحمٰن، پروفیسر عطا الرحمٰن کاکوی اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بحث میں حصہ لیا۔ بحث میں حصہ لینے والوں نے زندہ شخصیتوں پر تحقیقی مقالے لکھنے کی

مخالفت و موافقت میں دلائل دیتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر سیدہ آر نے فرمایا کہ بالعموم زندہ شخصیتوں پر ریسرچ اسکالر اس لئے مقالے لکھنا پسند کرتے ہیں کہ زندہ ادیب اپنے بارے میں اور اپنے فن کے بارے میں بہت کچھ خود ہی لکھ دیتا ہے اور بقیہ پوچھنے پر بتا دیتا ہے۔ زندہ ادیبوں میں تفریق کرنا ہوگی۔ قاضی عبدالودود اور محسن در بھنگوی میں امتیاز کرنا ہوگا۔ انھوں نے تحقیقی موضوعات میں تنوع پر زور دیتے ہوئے کہا کہ شعرا اور ادبا کے علاوہ مورخین اور سیرت نگاروں پر بھی کام ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اصناف سخن کے علاوہ فرہنگ پر بھی کام ہونا چاہیئے۔

اناملائی یونیورسٹی کے جناب قادر محی الدین نے اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے لئے "دکنی اور اردو لسانی تحقیق" کا جائزہ پیش کیا۔

ڈاکٹر کلیم الحق قریشی نے اپنے مقالے کا دوسرا حصہ "یونیورسٹیوں میں غیر معیاری تحقیق" پیش کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین اور مالک رام کی تعریف کی اور تحقیق کے اعلیٰ معیار کے سلسلہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور جناب قاضی عبدالودود کا بطور خاص ذکر فرمایا اور جناب مالک رام کے حوالے سے فرمایا کہ مالک رام کا یہ خیال ہے کہ ایک پروفیسر دوسرے پروفیسر کے امیدوار کو ناکام نہیں کرتا ہے اور وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر کلیم الحق قریشی نے اپنا یہ تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ لوگ یونیورسٹی میں ملازمت حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کا مطالعہ سطحی اور ناکافی رہ جاتا ہے۔ چند کو چھوڑ کر اکثریت کا یہی حال ہے۔ قریشی صاحب نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے معروف اساتذہ کی تھیسس کی خامیوں کی نشاندہی کی اور جامعات میں تحقیق کے گرتے ہوئے معیار پر گہری تشویش ظاہر کی۔ مقالہ کے بعد ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، جناب احمد جمال پاشاہ، ڈاکٹر سیادت نقوی اور جناب شہاب الدین دسنوی نے بحث میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے قریشی صاحب کے عقیدتمندانہ رویہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ قریشی صاحب نے حسن صاحب کو اپنا ہیرو بنایا ہے۔ ان کے یہاں سرقہ کی مثال موجود ہے۔ انھوں نے چند معیاری تھیسس کا حوالہ دیتے ہوئے چیلنج کیا کہ اگر مالک رام یا کوئی

صاحب اس میں خامی نکال دیں اور ناقص ثابت کر دیں تو وہ اسکالر اپنے منصب سے استعفیٰ دیدیں گے۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ گیان چند جین اور ملک رام نے اگر اس قسم کی باتیں کہی ہیں تو یہ افسوسناک ہیں۔ انھوں نے سکریٹری ادارۂ تحقیقات اردو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کانفرنس میں ایسے مقالات پڑھے جائیں جن میں غیر جانب داری سے جائزہ لیا گیا ہو۔ قریشی صاحب نے اس مقالہ کے ذریعہ بت پرستی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ جناب احمد جمال پاشاہ نے اپنے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر قریشی صاحب نے یہ مقالہ خود تیار کیا ہے تو انھوں نے زیر بحث مقالوں کو نہیں پڑھا ہے اور اگر کسی دوسرے نے تیار کیا ہے تو انھوں نے بھی وہ مقالے نہیں پڑھے ہیں۔ انھوں نے قریشی صاحب سے فرمائش کی کہ عقیدت کے کلمات اس مقالہ سے نکال دیں۔

مباحث سے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ڈاکٹر کلیم الحق قریشی نے 'اردو تحقیق' کی دکھتی رگ چھو دی ہو۔

ڈاکٹر قدوس جاوید نے 'پٹنہ یونیورسٹی میں ناول کی تحقیق' کا جائزہ پیش فرمایا۔ ڈاکٹر قدوس جاوید نے اپنے چونکا دینے والے جملے سے مقالے کی ابتدا کی کہ "بغیر حوالہ ایک کتاب سے نقل کو سرقہ کہتے ہیں اور دس بیس کتابوں سے نقل کو پی۔ ایچ۔ ڈی۔" یہ پُرمذاق فقرہ خواہ کسی کا بھی ہو ان دنوں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو میں لکھے جا رہے تحقیقی مقالوں پر کسی نہ کسی حد تک ضرور چسپاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قدوس جاوید نے یونیورسٹیوں کی تحقیق کے گرتے ہوئے معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ گذشتہ ایک ڈیڑھ دہائی سے 'اب عام طور پر پیٹے پٹائے موضوعات پر فرسودہ اور روایتی اصولوں کے مطابق ہی تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ موضوعات کے انتخاب' تحقیقی اشاریے یا اسناپسس کی تیاری' ابواب کی تقسیم' تحقیق کے طریقۂ کار اور کتابیات کی تیاری وغیرہ میں نہ تو کوئی جدت ہوتی ہے اور نہ ہی ان سے مقالہ نگار اور نگران کے مطالعہ، سوجھ بوجھ اور انفرادی صلاحیت کا ہی اندازہ ہوتا ہے لہٰذا یہی وجہ ہے کہ آج کل لکھے جانے والے مقالوں میں موضوع کے تعلق سے نہ تو کسی طرح کی تحقیق کا، نہ تلاش و جستجو' بازیافت یا انکشاف کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی ان کے لسانی

ادبی، سماجی و ثقافتی مسائل و تناظرات کی بنیاد پر تحقیق کے موضوع پر اپنی جانب سے حکم لگانے یا فیصلہ دینے کی کوئی کوشش ہی غلط ہے۔ ڈاکٹر ... نے پٹنہ یونیورسٹی میں ناول کے موضوع پر پیش کی جانے والی تحقیق کا جائزہ لیا۔

پروفیسر محمد حسن، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" کا جائزہ پیش فرمایا۔ انھوں نے مقالہ کے ابتدائی صفحات میں تحقیق سے متعلق چند اصولی باتیں پیش کرتے فرمایا کہ تحقیق کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف یا پرانے حقائق اور معلومات کی نئی تفسیر و توجیہہ ہے۔ عام طور پر تحقیق کسی سوال کا جواب فراہم کرتی، کسی مسئلے کے حل کی طرف اشارہ کرتی ہے ان چاروں شرائط سے عاری تحقیقی مقالے پورا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اردو میں تحقیق کا مزاج زیادہ تر (ISSUE-ORIENTED) جانبداری رہا ہے۔ (PROBLEM-ORIENTED) تجزیاتی نہیں رہا اس لئے ہمارے اکثر تحقیقی مقالے معلومات یا دستاویزوں کا ... ہیں مگر معلومات سے استخراج نتائج تو درکنار اصل مسئلے کا رشتہ قائم نہیں کیا جاتا۔ انھوں نے اردو تحقیق سے متعلق مزید فرمایا کہ دوسری بڑی کمی سائنسی ربط و ترتیب اور معروضی لہجے کی ہے۔ بعض محققین نے معروضیت سے مراد لی ہے کہ زیر بحث موضوع پر کام کرتے وقت اس کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی رائے پہلے سے قائم نہ کی جائے اور حقائق جس طرف لے جائیں اسی قسم کے نتیجے پر پہنچا جائے مگر افسوس یہ ہے کہ معروضیت کی اس تعریف پر خود یہ محقق عمل پیرا نہیں ہوتے اور کسی معاملے کے حق میں یا اس کے خلاف وکیلوں کی سی دلیلیں پیش کرتے وقت انھیں معروضیت کا خیال نہیں آتا۔ گویا تحقیق میں سخن فہمی کم بقول غالب طرف داری زیادہ۔ پھر ایک اور معاملہ تحقیق کی زبان کا بھی ہے اگر کوئی معنی ہیں تو تحقیق میں جذباتی یا نجی لہجہ ممنوع ہونا چاہئے اور جھگڑالو ... اس کے دائرے سے خارج کیا جانا چاہئے۔ اس کے علاوہ بیانات اور تنازع مصنف کی رائے زنی کے جوش و خروش کے بجائے مدلل اور گذارش واقعی کا انداز قائم ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے تحقیق کے مبادیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تحقیق کے ضابطوں کی مبادیات میں یہ بھی شامل ہے کہ زیرِ بحث موضوع کی تعریف اور احاطۂ بحث متعین کر لیا جائے۔ اسی تعین کی بنا پر عام طور پر معیاری تحقیقی مقالے کے عنوانات طویل اور کسی قدر غیر شاعرانہ ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ زیرِ بحث موضوع پر سبھی دستیاب ہونے والی معلومات یکجا کر لی جائیں اور اس میں احتیاط برتی جائے کہ ان معلومات کا کوئی اہم حصّہ چھوٹنے نہ پائے۔ تیسری بات یہ کہ حاصل شدہ معلومات کی مناسب توثیق اور تجزیے سے غفلت نہ برتی جائے اور ان شواہد پر پوری چھان پھٹک کے بعد نتیجے اخذ کیے جائیں۔

مورخہ ۲۸ر جنوری کی پہلی نشست میں ہندوستان کی جامعات میں ہونے والی تحقیق کی مکمل فہرست پیش کی گئی جو خدا بخش لائبریری نے تیار کی تھی۔

اردو ریسرچ کانگریس نے مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کیں :

۱۔ یونیورسٹیوں میں ریسرچ کی پالیسی کا ایک مرتب پروگرام ہونا چاہیے اور مناسب ہوگا کہ پلاننگ میں ایک عہد کو سمیٹا جائے یا جلتے ہوئے سماجی مسائل پر یکے بعد دیگر کام کیا جائے۔

۲۔ ریسرچ کے کام بہت ہی منظم و مرتب انداز میں کیے جائیں اور یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ وہ آپس میں ریسرچ کے کاموں میں اس طور پر تعاون کریں کہ ایک ہی کام کا اعادہ نہ ہو۔

۳۔ دیگر شعبوں کے اشتراک سے مشترکہ قسم کے ریسرچ پروجکٹ پر کام کیا جائے تاکہ ریسرچ کے زیادہ مفید نتائج سامنے آسکیں۔

۴۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے سلسلہ میں ایک قومی پالیسی ہونی چاہیے جس میں طلبا کے سامنے دو واضح اختیاری مضامین ہوں۔ ایک وہ جس کا مقصد تعلیم برائے ملازمت ہو اور دوسرا جس کا مقصد تعلیم برائے ریسرچ ہو۔

۵۔ اساتذہ کا بنیادی کام پڑھانا ہے جب کہ ریسرچ انھیں ضمنی طور پر ان کے افکار سے اُبل پڑتا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹیوں میں پڑھانے کا کام زیادہ سنجیدگی اور خلوص سے کرنا چاہیے تاکہ ایک ایسا طالب علم جس کا مقصد تعلیم برائے ریسرچ ہے جب ایم اے کی ڈگری لے کر آئے تو اپنے آپ کو ریسرچ اسکالر کے

طریقۂ کار کے نئے ذرائع وساز وسامان سے بھرپور محسوس کرے۔

۶۔ ریسرچ کے موضوعات ترجیحاً کسی مسئلہ سے متعلق ہونے چاہئیں تاکہ پورا معاشرہ جس کا وہ ریسرچ کرنے والا پروردہ ہے اس کے ریسرچ سے مستفید ہوسکے۔ ایسے موضوعات جو مستقبل میں ریسرچ اسکالر کو کسی مفید کام کے لئے تیار نہ کرسکیں ان سے احتراز کیا جانا چاہیئے۔

۷۔ ریسرچ میں گیرائی سے زیادہ گہرائی پر زور دیا جانا چاہیئے تاکہ ایک غیر تربیت یافتہ کچھ سیکھ سکے۔

۸۔ ریسرچ کی بنیادی اخلاقیات پر طلبا، نگراں یا گائڈ اور ممتحن تینوں کو اگر وہ رضاکارانہ طور پر کاربند نہ ہوں تو سختی سے کاربند کرلیا جائے۔

۹۔ یہ کانگریس چونکہ یونیورسٹی کے اساتذہ یعنی نگراں طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے لہٰذا اس طرح کا ایک قومی اجتماع ریسرچ طلبا کا بھی ہونا چاہیئے تاکہ اس میں طلبا کے مسائل پر خود ان کے نقطۂ نظر سے نظر ڈالی جاسکے۔

۱۰۔ اردو ریسرچ کانگریس کا انعقاد ایک ورکشاپ کے طور پر یو جی سی کے اشتراک سے ہر سال کیا جانا چاہیئے تاکہ اس سال میں جمع کئے گئے مقالوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاسکے۔

۱۱۔ زندہ اشخاص پر ریسرچ کو لازمی طور پر بیکار قرار نہیں دیا جانا چاہیئے بالخصوص جب کہ ریسرچ کا موضوع اس معیار کا ہو جس پر ریسرچ اس کی زندگی ہی میں کیا جانا مناسب سمجھا جائے۔ صرف ایک بات جو پیش نظر رکھی جائے وہ جرأت مندی کا

۱۲۔ ڈگری دیئے جانے سے قبل عوام کے سامنے زبانی امتحان لیا جانا چاہیئے اور تحقیق کے نتائج کو طالب علم کے ذریعہ شہر/ریاست کے تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جانا چاہیئے جنھیں حوالہ اعلان کے ذریعہ تحقیق کے نتائج کو سننے اور سوالات کرنے کی دعوت دی جائے۔

۱۳۔ اردو ریسرچ کانگریس کو ایک رجسٹرڈ ادارہ بنایا جانا چاہیئے جس کے ذریعہ ہر سال ایک ریسرچ کانفرنس منعقد کی جائے۔ اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اس سلسلہ میں اقدامات کرنے چاہئیں۔ ۱۴۔ کانگریس کے فیصلوں کو یو جی سی اور یونیورسٹیوں کے پاس غور اگر وہ چاہیں تو اس پر عمل کرنے کے لئے بھیجا جانا چاہیئے۔

ڈاکٹر کے وینکٹ سبرامنین

تعلیم میں ایک نئے دور کا آغاز

تین مزدوروں سے متعلق مشہور کہانی سے واضح طور پر ایک ہی نصب العین کے بارے میں لوگوں کے مختلف رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

تین مزدور سنگ بنیاد کو تراشنے کا کام کر رہے تھے۔ کسی نے پوچھا "وہ کیا کر رہے ہیں؟" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ "پتھر تراش رہا ہوں"۔ دوسرے نے کہا میں ایک دن میں پانچ ڈالر کما رہا ہوں اور تیسرے نے ادب سے کہا۔ میں گرجا تعمیر کر رہا ہوں۔

یہ لوگ ہی ہیں جو گرجا گھر تعمیر کر سکتے ہیں جو قوم کو تبدیل کر سکتے ہیں اور یہی ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں مضمر ہے کہ ہمارے اساتذہ محض پتھر ہی نہیں تراشیں اور نہ ہی خوراک کے پیالے کے لئے کام کریں گے بلکہ وہ گرجا گھر تعمیر کریں گے۔

تعلیم کو انسانی وسائل کے فروغ کے ذریعہ سماجی و اقتصادی تبدیلی کا آلۂ کار بنانے کے مقاصد کے مطابق ملک میں انسانی وسیلوں کے فروغ کی نئی وزارت قائم کی گئی ہے یہ وزارت نئی تعلیمی پالیسی کو جو تعلیم سے متعلقہ کم و بیش ہر فورم میں قومی سطح پر بحث کے بعد ترتیب دی گئی ہے واضح خد و خال دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

شاید پہلی بار اس حقیقت کو ٹھوس طور پر تسلیم کیا گیا کہ تعلیم ترقی کے کام آنے والا ایک بڑا اہم عامل ہے اور "انسانی سرمایہ" میں لگائی گئی رقم بالآخر کوئی معنی رکھتی ہیں۔

اگر بھارت میں تعلیمی نظام کی پیش رفت اور ترقی کا سائنسی ڈھنگ سے جائزہ لیا جائے تو اس سے واضح طور پر کچھ اہم چیلنجوں کا پتہ چلتا ہے۔

ہم سب کے لئے ابتدائی تعلیم اور کام کے دوران تدریس کے پروگراموں کے ذریعے تعلیم بالغان کو ترقی دے سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہونہار بچوں کی

نہیں کیا جاسکتا۔ ہونہار اور ذہین بچوں کے لئے تعلیم کے مناسب مواقع حاصل نہ ہونے کے سبب بہت سے پھول ان دیکھے مسکراتے ہیں اور اپنی مٹھاس صحرائی ہواؤں میں کھو دیتے ہیں زمانے کے اس نقصان کو روکنے کے لئے کوئی خصوصی ادارہ موجود ہونا چاہئے۔ اگر ہم سب کے لئے تعلیم اور عمدہ ترین تعلیم چاہتے ہیں تو ملک بھر میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنے ہوں گے جو فضیلت کی بلندیاں چھو سکتے ہوں۔ صرف چند اول درجہ کے اسکولوں سے جہاں ہر قسم کی سہولیات موجود ہوں مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ایسے اسکول دیہات کے عوام کے گھروں تک لے جانے ہوں گے جو ہماری آبادی کی اکثریت ہیں۔

ہم نے تعلیم کا جو نظام مستعار لے رکھا تھا اس کا جھکاؤ شہروں کی جانب تھا اور دیہی علاقوں کے ذہین بچوں کو اپنی قابلیتوں کو فروغ دینے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ دیہات میں ایسے اسکولوں کی تعداد افسوسناک حد تک ناکافی تھی جو ذہین بچوں کی نشوونما کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ رہا ہے کہ طالب علموں کی دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف آمد مسلسل جاری رہی ہے جس سے دیہی خطوط کی ترقی کا مقصد ہی فوت ہو گیا ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم پر اکثر کم توجہ دی گئی ہے۔ ان سب کے لئے ابتدائی تعلیم کا مقررہ نشانہ بہت سی سماجی و اقتصادی پابندیوں کے سبب کبھی پورا نہیں ہو سکا۔ لڑکیوں اور سماج کے اقتصادی طور پر محروم طبقوں کی تعلیم ہمیشہ ہماری کوششوں میں سد راہ رہی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے مختلف خصوصی کوششوں کی ضرورت ہے۔ یہ بات دیہی علاقے کے ذہین بچوں کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ دیہات میں اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کی ذہین لڑکیوں کو اپنے ہنر کو جلا دینے اور ملک کا بیش قیمت سرمایہ بننے کی کوئی ترغیب حاصل نہیں ہوتی۔

راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر ایک مرد کو تعلیم دی جاتی ہے تو صرف فرد واحد تعلیم یافتہ ہوتا ہے لیکن اگر ایک عورت تعلیم یافتہ ہوتی ہے تو پورا کنبہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے یہ ایک ایسا شعبہ ہے جسے اعلیٰ ترجیح کی ضرورت ہے چونکہ ہائر سکنڈری درجے تک تعلیم مفت ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جانی چاہئے۔

بھارت چونکہ ایک بڑا برصغیر ہے جہاں مختلف لسانی اور مذہبی گروہ آباد ہیں لہٰذا یہاں کثرت میں وحدت پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے خصوصی طور پر

یا معقول اور بامعنی پروگراموں سے کام لیا جائے۔

ایک اضافی زبان کا علم جھگڑے کا سبب بننے کی بجائے ایک دوسرے سے بات چیت کرنے اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کا ذریعہ بننا چاہیئے۔ ملک کی مختلف ریاستوں اور خطوں کے لوگوں کی طرف سے اپنی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کے مطالعہ سے کشیدگی کو کم کرنے اور بھارت کو ایک متحدہ برصغیر بنانے میں مدد ملے گی۔

ہر ضلع میں ماڈل اسکولوں کے قیام کا خیال غریب لوگوں کو اٹھانے کے سلسلے میں ایک شاندار منصوبہ ہے اور اس قسم کے قومی اداروں کا سلسلہ تمام ریاستوں کے لئے مشترکہ قومی نصاب کے اجراء کے پرانے مسئلے کو حل کر دے گا۔

" نوادویا ودیالیہ " ذہین بچوں کی خصوصی ضروریات پوری کرنے، ہونہار بچوں کے لئے اسکولوں کی کمی، ہنرمند لڑکیوں اور ذہین غریب طلباء کے لئے خصوصی توجہ اور قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے جو بہت سے موجودہ مسائل کا واحد حل ہے۔ یہ اسکول مذکورہ بالا مسائل پر کثیر طرفہ حملہ ہے اور اس سے ذہین بچوں کی عمدہ تعلیم کا اہتمام ہوسکتا ہے جس کے نتیجے میں بہتر انسان پیدا ہوں گے اور قومی ترقی ہوگی۔

یہ اسکول مخلوط تعلیم کے سکونتی ادارے ہوں گے جو دیہات میں واقع ہوں گے جہاں اسکول کے کل طلباء کی تعداد میں شہروں سے آنے والے طالب علموں کی تعداد ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ایک تہائی نشستیں ہونہار لڑکیوں کے لئے مخصوص کی جائیں جن میں اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کی انتہائی نظرانداز کردہ لڑکیاں بھی شامل ہوں۔

ایک ودیالیہ کے بیس فیصد طلبا کو دوسرے ودیالیہ میں خاص طور پر ایک لسانی خطے سے دوسرے لسانی خطے میں منتقل کرنے سے طلباء کی حوصلہ افزائی ہوگی کہ وہ اس خطے کی زبان سیکھیں جہاں انھیں بھیجا جارہا ہے اور انھیں اس خطے کے طلباء کے ساتھ ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی اس سے واقعی طور پر قومی یکجہتی اور اتحاد کا عمل مضبوط ہوگا۔

لیکن یہ کافی نہیں کہ صرف سر کو ہی مضبوط کیا جائے۔ ہاتھوں اور دل کی تربیت بھی لازم ہے۔ محنت کے تئیں دلچسپی اور دوسروں کی قدروں کے احترام کی قیمت پر اگر شعور کی تربیت کی جائے تو اس سے سنگ دل "روبوٹ" جیسے افراد

کی ہی تشکیل ہوگی۔ چنانچہ عمدہ مقامات پر قائم ہوسٹلوں میں رہائش کی تجویز
فنون و دستکاریوں پر زور دینے سے طلبا میں جمالیاتی، ثقافتی اور سماجی صلا
کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

اساتذہ وہ مرکز ہیں جس پر تعلیم کا نظام گھومتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی
اس نکتے کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس ساری اسکیم کی کامیابی کا دارومدار بہت حد تک تدریسی طریقے پر
لہٰذا اس تجویز کو منظور کرلینا بہتر ہوگا کہ اساتذہ کی بھرتی کل ہند پیمانے پر کی جا
ترغیبات کے ذریعہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہمیں ایسے پُرلگن اساتذہ
قومی کیڈر کی ضرورت ہے جو ایک قومی نصب العین کے حصول کے لئے قوا
کرنے کے تحت میں کام کرسکے۔

حاصل کر لی تھی کہ مہاراجہ اسے انگلستان بھیجنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے لئے کوئی ا
بیوی تلاش کر سکے۔ میجر لوری پنجابیوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ ان کی ذ
اور تیزی سے ذہن نشین کرنے کی اہلیت سے بہت متاثر تھے۔ مہاراجہ نے کچھ نوجوا
کو انگریزی سیکھنے کے لئے لدھیانہ بھی بھیجا۔ رام سنگھ جس نے چھاپہ خانہ لگانے کی تر
حاصل کی تھی۔ لاہور واپس آکر ایک چھاپہ خانہ لگایا۔ مہاراجہ نے ایک انگریز جراح
لاہور میں ایک ایلوپیتھک ہسپتال کھولنے کی بھی اجازت دے دی۔

مہاراجہ جدید علوم کے حامی ہونے پر بھی توہم پرست تھے۔ اور شگون پر اعتـ
رکھتے تھے۔ وہ مختلف مواقع پر سورج اور چاند کے مقامات کی مناسبت سے کئی قسم
ہیرے جواہرات پہنا کرتے تھے۔ انہوں نے انگریز مشنری ڈاکٹر جوزف وولف کے ساتھ د
بہشت اور خدا کے موضوع پر جو مناظرہ کیا وہ بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔

"آپ کہتے ہیں کہ آپ مذہب کے لئے سرگرداں ہیں تو آپ ہندوستان میں انگ
کو وعظ کیوں نہیں کرتے جن کا کوئی مذہب ہی نہیں؟ جب وولف نے یہ بات گورنر جنرل
ولیم بینٹنگ کو بتائی تو وہ گہری سانس لے کر بولے "افسوس کہ سب مقامی باشندوں کی
بھی یہی رائے ہے"۔ رنجیت سنگھ نے انگریز مبلغ کو یہ یاد دلا کر پھر لا جواب
اگر آپ خدا کے بندے ہیں تو آپ کشتی میں دریا پار کرتے ہوئے کانپ کیوں رہے تھے"

ڈاکٹر مسز وسیم دُردانہ باسط

برار کا مرکزِ علم و فن اچلپور

ماہ فروری ۱۹۸۷ء کے شاداب میں عبدالعزیز عرفان صاحب کا مضمون "برار کے مایۂ ناز مورخ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون میری کتاب موسوم بہ "ایلچپور کے چند قدیم اردو شعراء" جس پر مجھے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے سے اخذ کرکے عرفان صاحب نے الفاظ کی الٹ پھیر اور جملوں کو توڑ مروڑ کرکے اپنے نام سے شائع کروالیا۔ توڑ جوڑ کرتے وقت موصوف کو سرقہ کا احساس تک نہیں ہوا۔ اور نہ ہی مطلب کے فوت ہونے کا۔ مضمون کے تیسرے پیرے گراف پر نظر ڈالئے۔ سب جملے بے جوڑ ہیں۔ میری تحریر کو توڑ مروڑ دیا ہے ——— میری تحریر یہ ہے:

"شاہ عبدالرحمٰن غازی جنھیں عوام دولھا رحمٰن غازی کہتے ہیں راجہ ایل کے ظلم و تشدد کا خاتمہ کرنے لشکرِ کثیر لے کر یہاں آئے انھیں کے ہمراہ سید عبدالملک بھی تشریف لائے۔ برار میں اس خاندان کے بانی عبدالملک ہی تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب گیارھویں پشت میں حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔"

اصول ہے کہ کسی کی تحریر یا خیال جب لیا جاتا ہے تو مصنف کا نام، کتاب کا نام دیا جاتا ہے۔ موصوف نے دن دھاڑے پورے مضمون کی چوری کرلی اور نام تک نہیں لیا۔ انڈین کاپی رائٹ ایکٹ میں یہ گناہ ہے۔ ان پر کیس چلانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو بھی زحمت ہوگی۔

"برار کا مرکز علم و فن اچلپور" کے عنوان سے مضمون ارسال خدمت ہے۔ رسالہ "شاداب" میں شائع کرکے ممنون فرمائیں۔

(اگر واقعی جناب عبدالعزیز عرفان صاحب سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو شاداب کو ان کے مضمون کی اشاعت پر افسوس ہے۔ ویسے آپ کا خط شاداب میں شائع کردیا گیا ہے۔ جناب عبدالعزیز عرفان یا کوئی اور جواب ...)

نزد کانگرس نگر، اچلپور 444606، مہاراشٹرا

وضاحت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں ۔ ایڈیٹر)

اچلپور کو علمی و فنی حیثیت سے اجاگر کرنے سے قبل مناسب سمجھتی ہوں کہ اچلپور اور برار کا مختصر تعارف اور وجہ تسمیہ بیان کردی جائے ۔ برار مہاراشٹر میں مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش کے درمیان واقع ہے ۔ زمانہ قدیم میں کندن پور عرف کنڈل پور ایک مقام تھا وہاں کے راجہ کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا ۔ لڑکی کا نام رکمنی تھا جو اپنی خوبصورتی میں لاثانی تھی ۔ اس کے بھائی نے رکمنی کی شادی راجہ سیس پال سے طے کی تھی لیکن رکمنی ، شری کشن سے جو بہت حسین و جمیل تھا شادی کرنا چاہتی تھی ۔ اس نے شری کشن کو خفیہ پیغام بھیجا کہ وہ رواج کے مطابق شادی سے قبل بھوانی کی پرستش کے لئے آئے گی ۔ اسے وہیں سے اپنے قبضہ میں کرلینا اور ایسا ہی ہو راجہ سیس پال کے براتی منہ دیکھتے رہ گئے اور شری کشن رکمنی کو تھیلی میں بٹھا کر جا بکدستی سے روانہ ہو

مراٹھی زبان میں دلہن والوں کو وراڑی کہتے ہیں ۔ متعلقان شری کشن ، رکمنی کے عزیزوں کو وراڑ کہتے تھے رفتہ رفتہ یہی علاقہ وراڑ کہلایا اور مسلمانوں کی عملداری میں وراڑ سے برار ہو گیا ۔ بعض کہتے ہیں کہ راجہ ہیرات کے نام پر علاقہ ہی ہیراٹھ کہلایا اور بعد میں برار کہلانے لگا ۔ "

اچلپور برار کا نہایت ہی قدیم شہر ہے جو انگریزوں کی عملداری تک برار کا صدر مقام رہا ۔ اس کی کا پتہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قبل سے چلتا ہے ۔ ایل خاندان کے کئی راجہ یہاں حکومت کرتے رہے ۔ پرانی کتب سے ثابت ہے کہ راجہ ایل کے نام پر اس کا نام پہلے ایل پور اور پھر ایلچپور ہوگیا اور اب اچلپور کہلاتا ہے ۔ مورخ تاریخ امجدیہ ، سید امجد حسین خطیب و قاضی خان بہادر خانی جاتی سے نقل کرتے لکھتے ہیں کہ اس کا نام ایرچ پور تھا پھر ایلچپور ہو گیا ۔

اچلپور دریائے پورنا کی سطح سے تین سو چھتیس فٹ بلندی پر واقع ہے ۔ شمال کی جانب ست پڑا پہاڑ کی چوٹیاں ہیں اور اس پر مشہور تاریخی قلعہ گاویل گڈھ واقع ہے ۔ اچلپور بہترین دیو کے لئے مشہور ہے ۔ یہاں کے خطیب صاحب کی امرائی کا آم سلطان شیر اور نواب نامدار خاں کے باغ کا آم شیر ساگر بہت مشہور ہیں ۔ اس علاقہ کی سرزمین ، سبزہ زار ، پہاڑی علاقوں کے قدرتی مناظر ، چٹانوں سے آبشاروں کا گرنا ، لاتعناہی پہاڑوں کا سلسلہ ، ندیوں کا منبع ، ان کا جوش و بہاؤ ، سینکڑوں ہی قدرتی مناظر ایسے ہیں جو شاعروں ، ادیبوں اور فن کاروں کے خیالات کو ابھارنے ، ور بلندیوں تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت کے مشہور کالی داس نے اپنی بہترین تخلیق " میگھ دوت " یہیں قلم بند کرکے اپنی محبوبہ کو بھیجا تھا ۔ مراٹھی ز

کے پہلے ادیب شری چکردھر مہاراج تھے۔ جس اپنے ادب کی یہیں سے ابتدا کی تھی۔ اچلپور کے تقریباً ہر محلے میں مسجد اور مندر ہے جس سے اہالیانِ اچلپور کی مذہبی رواداری کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں کی تعمیرات میں مسجد، مندر، فصیلیں وغیرہ میں ہندو مسلم آرٹ کا امتزاج نظر آتا ہے۔ بعض مقامات پر تو یہ سنگم بہت ہی لطف پیدا کرتا ہے۔ اس مرکب آرٹ کا نمونہ وہاں کی جامع مسجد اور عیدگاہ ہے۔ عیدگاہ اپنے نوع کی علاحدہ حیثیت رکھتی ہے۔ اچلپور سے قریب بہرام 'کا ایک مقام ہے جہاں ہندو مسلم تارک الدنیا حضرات نے چلہ کشی کی تھی۔ موسم سرما میں عرس اور جاترا اب بھی منائے جاتے ہیں۔

ایل خاندان کے آخری راجہ سے شاہ عبدالرحمٰن غازی کی جنگ اچلپور اور اطراف وجوانب میں ہوئی۔ شاہ مرحوم و مغفور کے ہمراہ کئی صوفیائے کرام اور گیارہ ہزار ترک سپاہی تھے۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ فتح شاہ غازی کے ہاتھ رہی۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ میں مزارات دیکھ کر Gray کا مرثیہ Elegy written in a Country Churchyard کے یہ اشعار یاد آتے ہیں:

Some mute in glorious Milton here may rest
Some cromwell guiltless of his country's blood.
The applause of listening senates to command
The threats of pain and ruin to despise
To scatter plenty of a smiling land
And read their history in a nation's eyes.

اس سرزمین میں صرف کرامویل اور ملٹن ہی نہیں بلکہ صوفیائے کرام، مجاہد، غازی، شاعر، مصنف، طبیب تہِ خاک ہیں۔ جنھیں ناسازگاریٔ زمانہ نے منصبِ شہود پر رہنے نہ دیا۔

چپے چپے میں ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

میری تحقیق کے پیش نظر سنہ ۱۰۱۱ھ تا ۱۲۱۰ھ یعنی سنہ ۱۶۰۰ء تا ۱۸۰۰ء شہر اچلپور کی تاریخ میں یہ علم کا سنہری زمانہ تھا۔ ممکن ہے اس سے قبل اہل علم وکمال ہوں گے کیونکہ برار کے تاریخی شہروں میں بلدہ اچلپور نہایت ہی قدیم ہے۔ اس کا ستارہ راجا ایل سے مغلیہ سلطنت تک بہت عروج پر رہا لیکن انگریزوں کے دور آغاز ہی سے ستارہ زوال پذیر

ہوتا گیا۔ اور یہ قدیم شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوتا گیا، شہر کی وسعت، عظیم الشان عمارات کے کھنڈرات، ضعیف العمر مردوزن کی زبان، زبان کی برجستہ گوئی، روزمرہ میں دورازکار تلمیحات واستعارات کا استعمال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ شہر بارونق، باعظمت، ادبی و علمی محفلوں سے آراستہ تھا۔ غالباً یہ صوفیائے کرام کے فیضان صحبت کا اثر نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے کہ آج بھی وہاں کے لوگ مذہب پرست، بامروت اور قناعت پسند ہیں۔ ہر مذہب وملت کے اشخاص یک جہتی کے ساتھ رہتے ہیں

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے، نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

گیارہ ہزار شہداء کے خون سے سرزمین اچلپور متبرک ہو گئی ہے۔

سلاطین دہلی کے عہد میں دہلی سے دکن کی آمدورفت کے لئے اچلپور درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی قدیم تہذیب سے رسم و رواج، زبان اور رہن سہن میں دہلی اور دکن کی آمیزش ہے۔ سلاطین کی آمد سے قبل ترکی وفارسی زبان اور تہذیب کی داغ بیل یہاں پڑ چکی تھی اب اردو بھی شامل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ برار براہ راست مسلمانوں اور خصوصاً نظام حیدرآباد کے زیر اقتدار آ گیا۔ انہی کے مقررہ نواب اچلپور کی مسند وزارت پر رونق افروز ہوتے۔ ان کی علم دوستی، بلا تفریق رنگ ومذہب اہل علم وفن کی قدردانی کی وجہ سے اہل علم وہنر جوق درجوق یہاں آ بسے۔ نوابوں کی اعلیٰ ذوقی، تعلیم، زراعت صنعت وحرفت اور تعمیرات کی ترقی یہاں تک پہنچی کہ سرزمین اچلپور اپنی خوشحالی اور فارغ البالی کی وجہ سے گلستان کہلانے لگا۔

زپائے تابسرش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء اردو ادب کا سنہری زمانہ تھا۔ دہلی، لکھنؤ اسکولس اپنے شباب پر تھے۔ مشہور زمانہ شعراء اور مصنفین جو اپنے فن کے مرد میدان تھے اسی دور سے تعلق رکھتے تھے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ لگ بھگ اسی دور میں سرزمین اچلپور نے بھی کئی اہل علم وکمال کو جنم دیا، سینچا اور پروان چڑھایا۔ یہ دور اچلپور کا بھی علم وفن اور تعمیرات کے لحاظ سے سنہری زمانہ تھا۔ نواب نامدار خان جو حیدری تخلص کرتے تھے خود بھی صاحب دیوان تھے۔ ان کے محل میں اکثر مشاعرے ہوتے۔ نعت گو

ڈاکٹر بانو سرتاج قاضی

زززٹر

دو گھنٹے سے پلیٹ فارم پر بیٹھا بیٹھا میں بور ہو رہا تھا۔ وہ بہت دیر میں آئے۔ شاید انھوں نے پہلے پتہ کر لیا تھا کہ ٹرین اپنے مقررہ وقت سے تین گھنٹے لیٹ چلے گی۔

میرے پاس اٹیچی ایک اٹیچی کے علاوہ ایک بہت بڑا صندوق تھا جسے لے کر گھومنا میرے بس سے قطعی باہر تھا ورنہ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا میں مر جانے کی حد تک نہ اوب جاتا۔ اسٹیشن سے باہر نکل ایک کپ چائے پی آتا۔ کچھ کھا آتا یا سگریٹ ہی خرید لاتا۔ بک اسٹال پر کے بھی اردو ہندی، انگریزی رسائل پر ایک نظر دوڑا لیتا۔ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے تمام آنے جانے والی گاڑیوں کے نام اور اوقات یاد کر لیتا۔ کچھ کرتا ضرور۔ یوں عورتوں کی طرح صندوق پر بیٹھ کر دل ہی دل میں کڑھتا نہ رہتا۔

پلیٹ فارم پر ہمیشہ کی طرح گہما گہمی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر کوئی کہیں جانے کو بے قرار ہے یا کہیں سے آیا ہوا ہے۔ مسافروں کی زیادہ تعداد خصوصاً عورتیں بیزار نظر آ رہی تھیں...... یہ تو مزاج مزاج کی بات ہے۔ عورتیں عموماً جلدی چڑھ جاتی ہیں۔ ٹرین دیر سے آئی تو کیوں آئی؟ ٹرین لیٹ چل رہی ہے تو کیوں چل رہی ہے لیٹ؟ کیا کرتا ہے اسٹاف؟ ٹرین میں سیٹ نہیں مل رہی ہے تو کیوں ایسا؟ زیادہ ڈبے کیوں نہیں لگاتے ریلوے والے......؟

بچے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ سو رہے تھے..... کچھ مسافر ایسے بھی تھے جو لائن میں نہ کھڑے ہو کر یا لائن میں اپنے کسی نمائندہ کو کھڑا کر قلیوں سے یا قلیوں کے توسط سے ڈیوٹی پر تعینات سپاہیوں سے گٹھ جوڑ میں مصروف تھے۔

ابھی خالی لمبی ٹرین ہوتی ہے مگر بغیر ریزرویشن کئے چلنے والوں کے لئے صرف دو ڈبے

مخصوص ہوتے ہیں۔ جنرل ڈبے ہو اور ان میں سفر کرنے والا کن قطار شیطان کی آنت سے
طویل۔ اب ریزرویشن ہر کوئی تو کرا نہیں سکتا۔ بزنس، میٹنگ، کانفرنس، بیماری، موت وغیرہ
بہا سوں کاموں سے آدمی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا ہے ..... وہ وہاں!
کام چھوڑے یا گھنٹوں ریزرویشن کی لائن میں کھڑے ہو کر سیٹ ریزرو کرائے؟ ......
میٹنگ، کانفرنس کی بات چھوڑو، پتہ رہتا ہے کہ کام کب ختم ہوگا اور کب لوٹا جا سکتا۔
..... مگر کسی کی عیادت کو گئے تو خدا کے سوا کون جان سکتا ہے کہ مریض صحت یاب
ہوگا یا وفات پا جائے گا۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ کل تک مر جائے گا تو پرسوں نکل چلیں گے۔
ٹرین میں سیٹ ریزرو کرا لیں۔

ریزرویشن کراتے ہیں وہ جنھیں فرصت ہوتی ہے، جن کے پاس ریزرویشن کرانے
کے لئے فالتو آدمی ہوتے ہیں۔ وسیلہ ہوتا ہے۔ فون کرتے ہی سیٹ مل جاتی ہے۔ کب کہاں
ہے؟ وہاں سے کب لوٹنا ہے، گرمیوں میں پہاڑ جانا ہے تو سردیوں میں کہیں اور..... پروگرام
طے ہوتا ہے۔ آرام کی زندگی ہوتی ہے، آرام سے سفر کرتے ہیں۔

جگر بھی ہونا چاہیے جنرل ڈبے میں سفر کرنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات
کا مقابلہ کرنے کے لئے۔ عام آدمی کو دیکھو ایک اٹیچی ہاتھ میں اٹھائے ہندوستان کے
ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھاگتا رہتا ہے۔ دن کے اوقات میں کام کرتا ہے، رات
جنرل ڈبے میں کھڑے کھڑے سفر کرتا ہے۔ بیٹھنے کی جگہ مل گئی تو خوش نصیبی اس کی.....
ورنہ پاؤں لٹکانے بھر کو جگہ تو مل ہی جاتی ہے۔ رات کھڑے کھڑے بھی کاٹی جا سکتی ہے

کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں جنرل ڈبے میں بھی پاؤں پھیلا کر سونے
کا زرین موقع مل جاتا ہے۔ وہ جن کے جسم پر وردی، سر پر کیپ اور کاندھے پر بند
چہرے پر اکڑ ہوتی ہے انھیں سیٹ پر قبضہ جمانے میں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ کندھے
بندوق چاہے نہ ہو، چہرے پر رعب، آواز میں کڑک اور گفتگو میں ڈھٹائی ہو تب بھی کامیابی
کے امکانات سو فی صد ہوتے ہیں۔

ٹرین کی پلیٹ فارم پر آمد کے ساتھ ہی وہ شور مچتا ہے، وہ بھگدڑ مچتی ہے
کیا قیامت ہی مچے گی؟ سب کے سب ٹرین کی طرف یوں بھاگتے ہیں جیسے سیٹی بجنے ہی
کے گھوڑے بھاگتے ہیں۔ جو کوئی اندر پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے، چاہے دروازہ ہے،
کھڑکی سے ..... وہ اٹیچی، چادر یا انچی رکھ کر ضرورت سے زیادہ سیٹ گھیر کر

ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ضرورت سے زیادہ اس لئے کہ بعد ازاں کسی کو سیٹ آفر کرکے احسان
جا سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی ۔

خالی ٹرین میں لوکو شیڈ سے سپاہی آکر بیٹھ جاتے ہیں ۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگنے
کے بعد یہ وہ کمپارٹمنٹ کے دروازے اندر سے کھولتے ہیں ۔ باہر والے سپاہی اشارے
سمجھا دیتے ہیں اندر والے آخری خالی سیٹیں روک لیتے ہیں ۔ پہلے یہ کام قلی کیا کرتے تھے ۔
بھرشٹاچار کہا جاتا تھا ۔ جب بھرشٹاچار بہت بڑھ گیا تو پولس والے [illegible]
م کرنے لگے اور اب یہ انتظام پولس کی کارکردگی کے تحت آتا ہے ۔

گھنٹوں جس کیو کو بنائے رکھنے کے لئے سپاہی سیٹیاں اور ڈنڈے بجاتے رہتے ہیں
و ٹرین کی آمد کے ساتھ یوں تتر بتر ہوتی ہے جیسے نمک پڑتے ہی چیونٹیوں کی قطار بکھر جاتی
۔ لائن میں کوئی آگے نہیں بڑھتا ۔ جو بھاگ سکتا ہے وہ آگے بڑھ جاتا ہے ۔ باقی پیچھے
ا گئے ہیں ۔ سپاہی بھی اپنے والوں کو سیٹ دلانے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
م کی سہولت کے لئے کوشاں رہنا ان کا فرض جو ٹھیرا ۔

ایک سیٹ کا معاوضہ تیس سے چالیس روپئے تک ہوتا ہے ۔ معاوضے کی زیادتی ، کمی
ت سی باتوں پر منحصر ہوتی ہے ۔ جیسے کہ مسافر سیٹ پانے کے لئے کتنا بے تاب ہے اور
ں تک خرچ کر سکتا ہے ؟ تنہا ہے یا ساتھ میں بیوی بچے بھی ہیں ۔ موٹی مرغی ہے یا کنجوس
مارواڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ایک نگاہ میں سب کو بھانپ کر بات کی شروعات کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔
تیس روپئے صاب ! ہاں صاحب ایک سیٹ کا ! جلدی بولو ۔ نہیں تو پسنجر کئی ہیں ۔ ۔ ۔
ت ملتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

مسافر بھاؤ تاؤ کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ روپیہ زیادہ مانگا جانے پر دبی زبان سے احتجاج کرتا ہے
ہنتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "ٹیم خراب مت کرو صاب ۔ ہم کیا اکیلے کھانا مانگتا ہے ؟ سپاہی لوگ ہیں
سارجنٹ صاحب ہیں ۔ نہیں پٹتا تو جانے دو ۔"

مسافر کے نرم پڑتے ہی اپنا بڑپن جتانے کو فقط پانچ روپیہ کم کر دیتا ہے ۔ ۔ ۔ "ٹھیک ہے
ٹا موٹا سامان لے کر ایک آدمی ہمارے ساتھ آئے ۔ ہم سے بات نہیں کرنا ۔ ہمارے
پیچھے آنا بس ۔ بات کرے گا تو دوسرا سپاہی شک کرے گا ۔ ہم آنکھ سے اشارہ کرے گا
ب سمجھ جانا ۔ گھس پڑنا ڈبے میں ۔"

کہتے ہی مسافر کمرے سے باہر نکل قلیوں کے ساتھ پلیٹ فارم کے آخری سرے کی طرف

جا رہے تھے۔ چھلاوے کی مانند وہ دن دھاڑے مسافروں کو بہکا کے لئے جا رہے تھے اور مسافر خوشی خوشی بہکاوے میں آ رہے تھے۔

دیکھا جائے تو آج سیٹ پانے کے تعلق سے میں بھی فکرمند تھا۔ بھیڑ روز کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھی اور میرے پاس تھا بڑا سا صندوق۔ اپنا ہمیشہ کا چھوٹا سا اٹیچی ہوتا تو بے حد آسانی سے میں ٹرین میں چڑھ جاتا۔ سفر کرتے کرتے میں لنگوروں کی طرح چھلانگ لگانے اور دھکا پیلی کرنے میں ماہر ہو چکا تھا مگر آج میرے پاس تھا صندوق۔ نانی سے ملنے گیا تو انھوں نے صندوق پکڑا دیا کہ اپنی چھوٹی خالہ کو پہنچا دینا۔ پتہ نہیں کیا اینٹ پتھر بھر دئے تھے کہ اسے اٹھا کر ٹرین میں چڑھنا میرے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں کوئی سینک سلائی نہیں، اچھا خاصا کسرتی جسم کا نوجوان ہوں..... بے حد پھرتیلا بھی..... مگر اس میدان میں ان کی بہ نسبت ڈھٹائی اور وحشیانہ صفات (اگر یہ صفات ہیں) کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ میں سر جھکا کر اقبال کرتا ہوں کہ مجھ میں یہ صفات (اگر یہ صفات ہیں) نہیں ہیں۔

گزشتہ مرتبہ کے سفر میں ایک موٹی پنجابی عورت کا قصہ مجھے یاد آ گیا۔ جنرل ڈبے کا دروازہ اندر سے کھلتے ہی وہ سب سے پہلے دروازے پر پہنچی تھی۔ ایک پاؤں اوپر رکھا تھا اور دوسرے پاؤں پر جسم کا بوجھ سنبھال نہیں پا رہی تھی کہ کسی دل جلے نے کمر کے نیچے دونوں ہاتھ لگا کر بوری کی مانند اسے کمپارٹمنٹ میں داخل کرا دیا تھا۔ بڑا ہی مضحکہ خیز منظر تھا۔ کہاں تو اس ہڑبونگ میں دو دو آدمی ایک ساتھ دروازے سے گزرتے تھے کہاں اس اکیلی عورت نے پورا دروازہ گھیر لیا تھا۔ گھسنے والوں کی بے تابی اپنی جگہ بجا تھی۔ سیٹوں پر قبضہ کر لینے کے بعد اس واقعے کو دہرا کر فلک شگاف قہقہے لگے تھے۔ موٹی عورتوں کے قصے سنانے میں بھی میں..... پیش پیش تھا۔

کیو میں میرے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا بیوپاری تھا۔ کچھ دیر قبل میں اسے قلی سے بات کرتے دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے پیار محبت کی باتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ وہی بات ہوگی سیٹ دلانے کی۔ میں نے مڑ کر اس سے پوچھا..... "کیوں سائیں؟ کتنا مانگتا تھا؟"

"تیس روپئے!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا..... "اپن کو ہفتہ میں دو بار بمبئی آنا پڑتا ہے۔ ہر ٹیم تیس روپئے دے کر سیٹ لے کا تو ہو گیا، ہو گیا دھندا! وہ تو لوٹو کر اس بار دو راتکا رات بھر سویا نہیں اس کا واسطے سوچا رات کو تھوڑا نیند ہو جائے تو اچھا۔ مگر تیس روپئے پھوکٹ کا نہیں ہے ہمارے پاس..... اندھیر ہے بابا..... اندھیر۔"

"سنو سائیں!" میں نے تجویز رکھی۔ "تم سیٹ کی بات کرلو۔ تھوڑے صحت مند ہو۔ دیکھو

میں نے غلط کیا۔ بیوپاری تھوڑا نہیں بہت زیادہ صحت مند تھا) کچھ پھیل کر بیٹھتا۔ مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں تمھیں دس روپئے دے دوں گا۔ اس طرح سیٹ تمھیں جیسے بیٹھے میں پڑ رہے گا۔ پکا بیوپاری تھا سائیں۔ بولا .... "نہیں تم بیٹھی رہو مجھے دینا۔ قلی کو پٹاؤں گا میں۔ جگہ روکوں گا میں۔ تم کیا کرو گے؟"

مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کچھ نہ کہہ کر میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا .... اور تبھی مجھے نظر آگئی۔ وہ .... جس کا ذکر میں شروع میں کرچکا ہوں۔ شاید انھوں نے پہلے پتہ کر لیا تھا کہ ٹرین مقررہ وقت سے تین گھنٹے لیٹ چلے گی .... یا ... ہوسکتا ہے کہ انھیں آنے میں دیر ہوگئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اچانک ہی انھوں نے سفر کا پروگرام بنایا ہو .... یا .... خیر جو بھی ہو۔ وہ دونوں پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار کی کوفت سے نکل گئے تھے۔

دونوں میاں بیوی سے لگتے تھے۔ بعد میں قطعی طور پر یہ ثابت بھی ہوگیا کیوں کہ دونوں بات بات پر لڑ رہے تھے۔ شوہر ... چالیس برس اور بیوی تیس بتیس کے آس پاس تھی ... نیلے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس، اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے تھی۔ آہستہ آہستہ نشہ طاری کرنے والا حسن تھا اس کا۔ میری نظر پڑی، میں دیکھتا رہ گیا۔ مجھے خواہش ہوئی اسے قریب سے دیکھنے کی۔ ایک انجانی کشش سے کھنچا میں اس کی طرف چلا۔ موٹے بیوپاری سے کہتا گیا کہ قطار آگے بڑھے تو میرا صندوق کھسکا دینا اور صندوق پر نگاہ رکھنا۔ اس حسینہ کے نزدیک پہنچ کر میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور ہولے ہولے کش لے کر اسے گھورنے لگا۔

بلا کی سیکس اپیل تھی اس میں۔ میری طرح کئی اور نوجوان بھی اسے گھور رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر حسین چہروں کی کمی نہ تھی مگر اس کا حسن بے مثال تھا۔ تاروں کے جھرمٹ میں چاند تھی وہ۔

جنرل ڈبے میں سفر کرنے والوں کی طویل قطار دیکھ کر وہ قدرے فکرمند ہوکر بولی۔ "ایسے میں کیا جگہ ملے گی ہمیں" اس کی آواز میں چاندی کے گھنگروؤں کی سی کھنک تھی جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھی۔

"میں تو پہلے ہی سے کہہ رہا تھا۔ مگر تم کسی کی سنو تب نا۔" چڑچڑے لہجے میں بولا "بھگتیں گے اب اور کیا کر لیں گے؟"

شوہر اپنے سامنے کھڑے ہوئے مسافر سے بات کرنے لگا۔ بیوی کا چہرہ چڑھ گیا اور غصہ سے لال ہوگیا۔ شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "کچھ کہتے کس طرح سے بات کیوں نہیں کرتے

دیکھئے کچھ کر کے سیٹ دلا دے تو۔"

شوہر بغیر کچھ بولے لائن سے نکل کر ایک طرف چلا گیا۔ ایک قلی سے بات کی ہر بات کا!

"کیوں؟ کیا ہوا؟" بیوی نے بے صبری سے دریافت کیا۔

"بات نہیں بنی۔ تم ایسا کرنا کہ زنانہ ڈبے میں بیٹھ جانا۔"

"نہیں میں زنانہ ڈبے میں نہیں بیٹھوں گی"۔ بیوی نے سختی سے کہا۔

"وہاں بھیڑ کم ہوتی ہے۔ ادھر جگہ ملنا مشکل ہے" شوہر نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا

"نہ ملے پھر میں زنانہ ڈبے میں نہیں بیٹھوں گی۔ بیوی نے اپنی بات دہرائی۔ آس پاس کے لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ "مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ کچھ کھلا دیتی ہیں جادو ٹونا کر دیتی ہیں"۔

"کیا بچپنے کی باتیں کرتی ہو۔" شوہر تیز ہو کر بولا " جنرل ڈبے میں جگہ نہ ملی تو رونا بسورنا نہیں۔ تمہاری ضد کی وجہ سے یہ دھکے کھانے پڑ رہے ہیں۔"

اس وقت ایک قلی نے شوہر کو اشارے سے ایک طرف بلا لیا۔ وہی تھا شاید جس سے شوہر نے بات کی تھی۔ دو منٹ کے بعد شوہر آ کر بولا "تم یہ اٹیچی لے کر اس کے ساتھ جاؤ"۔

"اکیلے!" وہ جھجکی۔

"یہاں اس بھیڑ میں وہ تمہیں کہاں لے جائے گا" شوہر جھنجھلا گیا "سیٹ دلانے جا رہا ہے۔ تمہیں بٹھا کر مجھے لینے آئے گا۔"

"کتنے روپئے لے گا؟"

"چالیس"۔ شوہر نے لاپرواہی سے کہا۔

"ایک سیٹ کے؟" بیوی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "یہ تو...!"

"ہاں"۔ شوہر یوں بولا جیسے چالیس کوئی بڑی رقم نہ ہو"

"یہ تو بہت ہوئے۔" بیوی نے پریشانی سے کہا۔

جھک جھک نہ کرو۔ سیٹ نہیں مل رہی تھی تو گڑگڑا رہی تھیں۔ سیٹ مل رہی ہے تو روپئے کی فکر کر رہی ہو۔ کھڑے کھڑے سفر تم نہ کر سکو گی۔ فرش پر بیٹھنے میں تمہیں شرم آئے گی۔ بے کار ہمارا بھیجا کھاؤ گی۔ اب جاؤ بھی۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آنے ہی والی ہے۔" شوہر نے آخری جملہ ڈانٹ کر کہا

ایک اٹیچی اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ قلی کے پیچھے چل دی۔ میں اپنے سامان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ٹرین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میں نے قلی کے سر پر صندوق رکھوایا اور

ن ہوگیا۔ نیلی ساڑی پر نظریں جمائے رکھی تھیں۔ اس کی ایک جھلک جس ڈبے کے
یکھی اسی ڈبے میں اور دوسرے دروازے سے میں بھی گھس پڑا۔ تھوڑی سی جگہ دیکھ کر
دیکھنا چاہتا تھا کہ میں نے روک دیا۔ مسافروں کو دھکا دیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔
آ گئی۔ کھڑکی کے پاس کی ایک تنہا سیٹ پر بیٹھی سامنے والی سیٹ کو پاؤں رکھ کر روکے ہوئے تھی
میں کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ پھر بھی میں نے صندوق اتروا لیا۔ قلی کو مزدوری دے کر
نے کے بعد میں نے سیٹ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ موٹے بیوپاری پر نظر پڑی
کس طرح مجھ سے پہلے کمپارٹمنٹ میں پہنچ کر سیٹ پر قابض ہو گیا تھا۔ میں نے اس
پر کہا " سائیں! تھوڑی جگہ دے دو!"

کہاں جگہ ہے بھائی" سائیں نے ذرا بھی شناسائی کا اظہار نہ کرتے ہوئے کہا۔
سے پر وہیں بیٹھ جاؤ۔"

کیسے پر بیٹھ سکتا تھا مگر اس صورت میں مجھے اس حسینہ کی پیٹھ ہی دکھائی دیتی
یا کے دلکش چہرے کو نگاہوں کے دائرے میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے ہٹ دھرمی
" جگہ ہے کیسے نہیں! تم نے دو ٹکٹ لی ہیں کیا؟ اتنے موٹے ہو۔ دو کی سیٹ گھیر رکھی
ادھر۔"

ٹھنسا کر بیٹھ ہی گیا میں۔ موٹا بیوپاری خجل ہو کر خاموش رہ گیا۔ بیٹھتے ہی میں نے اس
عورت کا قصہ سنا دیا جسے تھیلے کی مانند کمپارٹمنٹ میں پھینکا گیا تھا۔ ایک
قہقہہ لگا۔ موٹا بیوپاری جھینپ کر کچھ اور سکڑ گیا۔ میں نے اطمینان سے پھیل کر
اپنی پشت کمپارٹمنٹ کی دیوار سے ٹکا لی۔

نے ساتھ بقیہ سامان لئے شوہر آیا۔ اس کے بیٹھتے نہ بیٹھتے بیوی بولی " کیسے سر پر چڑھے
ب۔ اس سیٹ پر بیٹھنے میں تمام وقت آنے جانے والوں کی لاتیں کھانا پڑیں گی۔"
دھر والی سیٹ کیوں نہ لی؟" شوہر نے دوسری طرف کی کھڑکی کے قریب کی سیٹ کی طرف
کے کہا۔

" پہلے ہی گھیری جا چکی تھیں۔"

یا تو خاموش بیٹھو۔ جب پتہ ہے کہ ادھر کی سیٹ مل نہیں سکتی تو خواہ مخواہ کڑھنے
نہ؟ سیٹ مل گئی غنیمت جانو۔"

ختم نہ ہوا تھا کہ کمپارٹمنٹ کی گنجائش سے دگنے مسافر کمپارٹمنٹ میں سما گئے۔ ایک

سروانیفر مجھے سے پہلے میرے صندوق پر بیٹھ گیا۔ میں نے احتجاج نہیں کیا۔ صندوق ٹوٹنے والی چیز نہ تھی۔ پھر صندوق سے اگر کسی کا بھلا ہوتا تو اس میں برائی کیا تھی؟

گرمی غضب کی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ڈبے میں ہوا آنے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ ٹرین چلی تو سب کی جان میں جان آئی۔ میں نے بھی ایک طویل سانس لے کر مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اوپر کی دونوں برتھ سینا فوج کے دو افسر گھیرے پڑے تھے۔ بیوی کے علاوہ مسافروں میں صرف ایک عورت اور تھی۔ ایک بوڑھی گجراتن۔ باقی سب عام سے مسافر۔ جنھیں سب سے علیحدہ کر کے دیکھنا آسان تھا نہ اس کی ضرورت تھی۔

گجراتن بار بار ساڑی کے پلو سے چشمہ صاف کرتی اور پھر اس حسینہ کو گھورنے لگتی۔ اسے نزدیک ہی کے کسی اسٹیشن پر اترنا تھا شاید۔ اسی لئے جھولا ہاتھ میں لئے مستعد بیٹھی تھی مسافروں میں کچھ گپ شپ میں مشغول تھے۔ کچھ اونگھنے لگے تھے مگر تھوڑی تھوڑی دیر میں ہر کوئی اس حسینہ پر نظر ڈال لیتا۔ اس نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ کچھ بے چین سی ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ وہ شوہر کی طرف جھک کر آہستہ سے بولی تھی۔ "سب کے سب اس طرح سے گھور رہے ہیں جیسے اس سے قبل عورت دیکھی نہ ہو۔"

شوہر سے دلاسہ پا کر وہ خود کو اطمینان دلانا چاہتی ہوگی۔ مگر پتہ نہیں وہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ بے زاری سے بولا۔ "جنرل ڈبے میں یہ تو ہونا ہی ہے۔ کہا تھا کہ زنانہ ڈبے میں بیٹھ جاؤ۔ میں کچھ کہتا ہوں تو آگا پیچھا سوچ کر ہی کہتا ہوں۔ دنیا دیکھی ہے میں نے مگر تمہاری آنکھیں تو آسمان پر رہتی ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ خواہ مخواہ کی ضد نہ کرتیں تو ......"

"خواہ مخواہ کی ضد کیا؟" بیوی بھبک کر بولی۔ "آپ کی اماں بیمار ہوتی ہیں تب آپ دوڑے نہیں جاتے۔"

"جاتا ہوں۔ تمہاری اماں کے بیمار ہونے پر بھی جاتا ہوں۔ مگر تم نے تو ایسی جلدی مچائی... ابھی چلئے ..... ابھی چلئے کہ بس۔ تمہارے بھائی نے صاف لکھا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ..... پھر میں نے تمہاری اماں سے ملنے لے جانے سے کب انکار کیا تھا؟ سوچا تھا کہ ریزرو کروا کے اطمینان سے نکلیں گے مگر تم ..... تم نے ایڈجسٹ کرنا تو سیکھی ہی نہیں۔"

ہر چند کہ دونوں نہایت آہستگی سے بات کر رہے تھے ..... بیوی کی غصہ سے لال بھبوکا رنگت اور شوہر کی چڑھی ہوئی تیوریاں سب پر آشکار کئے دے رہی تھیں کہ ان کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ عجیب تھے دونوں۔ جب سے میں نے انھیں دیکھا تھا وہ ہر بات بات پر ایک

دوسرے کو کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹھنڈے مشروب والا آیا تو شوہر نے لمکا لے کر بیوی کی طرف بڑھایا...... وہ نفی میں سر ہلا کر بولی "لمکا نہیں۔ گولڈ اسپاٹ پیوں گی۔"

سردار جی نے بھی گولڈ اسپاٹ لیا۔ دو تین گھونٹ میں خالی کر کے وہ شوہر سے بولا "بابو جی (صاحب) کو لے کر اس ڈبے میں کیوں آئے؟ برتھ کے لئے کوشش کرنا تھا۔ بی بی جی کو بڑی تکلیف ہوگی یہاں۔ کہاں جانا ہے؟" "بڑی" لفظ کو خوب لمبا کھینچا تھا اس نے۔

"ضروری کام سے اچانک نکلنا پڑا ہمیں"...... دراصل بچوں کے امتحان چل رہے تھے۔ انہیں ان کی پھوپھی کے پاس چھوڑ دینا ہی اچھا ہوا ورنہ اور مشکل ہوتی۔ ریزرویشن کرانے کا وقت نہیں تھا۔ اب ٹی۔ ٹی کے پیچھے گھومنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ٹرین یہاں سے چل رہی ہے۔ برتھ ملنا ناممکن ہے

"کوشش کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے" بیوی درمیان میں بول پڑی۔ شوہر نے اسے گھور کر دیکھا۔ مگر اس کے گھورنے کو نظر انداز کر بیوی نے کہا "اگلے اسٹیشن پر ٹی۔ ٹی سے بات کر کے تو دیکھئے"

"اول تو یہاں سے اتر کر جانا ہی ممکن نہ ہوگا۔ پھر میں جانتا ہوں کہ جانے سے کوئی فائدہ نہ ہو" شوہر نے صاف انکار کر دیا۔ بیوی پھر کچھ نہیں بولی۔

کون سا ضروری کام انہیں آ پڑا تھا۔ یہ جاننے کی سردار نے کوشش نہیں کی۔ وہ بیوی کو گھورنے میں منہمک تھا۔ بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے کے پیچھے شاید یہی جذبہ کارفرما تھا کہ بیوی کو گھورنے کا موقع ملتا رہے۔

بیوی سیٹ پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ شوہر کچھ سوچ کر اٹھا۔ اٹیچی دونوں سیٹوں کے درمیان رکھ کر اس پر ہولڈال رکھ دیا۔ تین سیٹ کی برتھ سی بن گئی۔ بیوی نے پاؤں آگے پھیلا کر شوہر کی سیٹ پر رکھ دئے۔ سردار دانت نکال کر ہنستا ہوا بولا۔ "لو بی بی کے لئے برتھ تیار ہوگئی۔ آرام کرو بی بی جی اب۔"

بیوی کچھ نہ بولی۔ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ شوہر نے آنکھیں بند کر کے سر ڈھیلا چھوڑ دیا میں اس کی بیوی کو گھور رہا تھا۔ جیسا کہ شوہر نے کہا تھا اس کی بچی اسکول جانے والی ہوگی اس کی ماں ہے.... پھر بھی کتنی خوبصورت ہے۔ کیسی تر و تازہ۔ گلاب کی سی کشش ہے اس میں۔ غصے میں اور بھی حسین لگتی ہے۔ اسے اپنے حسن کا غیر معمولی حسن کا احساس ہے۔ تبھی مزاج کی بڑی تیز ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصے میں نتھنے پھلا لیتی ہے۔ خیر یہ فطری بھی ہے۔ حسن، غرور اور غصہ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ شوہر پر البتہ مجھے حیرت تھی۔ اپنی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک قطعی بے اعتنائی کا تھا۔ بات بات پر اسے جھڑک دیتا تھا۔ نظر انداز کر دیتا

بے احساس کتنی تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

کسی پل سے گاڑی گزر رہی تھی۔ میں چونک گیا۔ ادھر دیکھا۔ شوہر گہری نیند میں ڈوب رہا تھا شاید۔ بیوی جاگی ہوئی تھی مگر کچھ بے چین نظر آرہی تھی۔ سیٹ پر اسے پہلو بدلتے دیکھ کر میں سمجھا شاید اسے باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ باتھ روم کا راستہ مسافروں سے اٹا پڑا تھا۔ یقیناً وہ باتھ روم جانے میں ہچکچا رہی ہے ...... میں نے دل میں کہا۔ بے جا شرم ہے یہ۔ اٹھ کر جاتی کیوں نہیں وہ؟ یہاں اپنا راستہ خود بنانا ہوتا ہے۔ کوئی ایک طرف ہٹ کر راستہ نہیں دیتا۔ ارادہ ہوا کہ اس سے کہوں کہ اپنے شوہر کو جگاؤ اور فارغ ہو آؤ۔ کیا فائدہ بلاوجہ کی بے چینی سے۔

مگر اتنی شاید پہلے کے کسی اسٹیشن پر اتر گئی تھی ورنہ وہی اس کے ساتھ چلی جاتی۔ میں انتظار کرنے لگا کہ وہ میری طرف دیکھے اور میں اسے شوہر کو جگانے کی صلاح دوں...... اچانک سردار پر میری نظر پڑی اور سارا ماجرا میری سمجھ میں آگیا۔ میرے صندوق پر بیٹھا ہوا سردار اس کے بالکل قریب جا پہنچا تھا...... وہ یقیناً اس سے بدتمیزی کر رہا تھا۔ غور سے دیکھتے رہنے پر میں نے سردار کی انگلیاں واضح طور پر بیوی کی پیٹھ پر رینگتی دیکھیں۔ بیوی نے کسمسا کر پہلو بدل لیا۔

مجھے غصہ آگیا۔ بدمعاش میرے صندوق پر بیٹھ کر حرام پن کر رہا ہے۔ جی چاہا اس سے کہوں۔ اٹھ میرے صندوق پر سے۔ کیا اس لئے تجھے صندوق پر بیٹھنے کی جگہ دی تھی کہ شریف عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ میں بھی بیوی کو مستقل گھور رہا تھا مگر میرے دل میں کوئی برا جذبہ نہ تھا۔ پھول کا دھرم خوشبو پھیلانا ہے، آنکھوں کو سرور بخشنا ہے۔ اس کے رس سے پیاس بجھانا بھنورے کا دھرم ہے۔ خوبصورت عورت کو دیکھنا مرد کی فطری خواہش ہے۔ مجھے وہ اچھی لگ رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا مگر اس کی خوبصورتی کو نظروں کی گندگی سے آلودہ کرنا میرا مقصد ہرگز نہ تھا ـــــ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہر خوبصورت پھول توڑ لینے کے لئے، ہر کسی کالر میں کھونسنے کے لئے نہیں ہوتا۔ وہ سردار شاید یہ نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو پانچ پچاس لوگوں میں بیٹھ کر ایسی رذیل حرکت نہ کرتا۔

سردار کے دل میں چور تھا۔ ادھر ادھر چور نگاہوں سے دیکھتا جاتا کہ کوئی اس کی حرکت دیکھ تو نہیں رہا۔ مجھ سے ایک بار نظریں ملیں۔ میں نے کڑی نظروں سے اس کی تنبیہ کی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ پیچھے کر لیا...... مگر پانچ منٹ بعد ہی پھر اس نے وہی حرکت شروع کر دی... صاف الفاظ میں، میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں کیا؟ اس حسینہ کا شوہر بھی اس سے کچھ نہیں سکتا تھا۔ بدنامی ہوتی ہے، ہاتھ کچھ آتا نہیں۔

گزشتہ سال کی بات ہے۔ سفر کے دوران ایک نوجوان ایک ٹرین والے سے الجھ پڑا تھا جیسا کہ اس نے مسافروں کو بتایا، وہ ٹرین والا دیر سے اس کی نئی نویلی بیوی کے چٹکیاں کاٹ رہا تھا۔ ٹوکے جانے پر الٹا وہ نوجوان پر برس پڑا .... دھونس جمانے لگا ... بولا "کون سی حور پری ہے تیری عورت سُڈّے! (حور پری تو واقعی نہیں تھی مگر شباب اس پر ٹوٹ کر آیا ہوا تھا) غلطی سے ہاتھ لگ گیا تو لگا اودھم مچانے۔ ایسی ہی پیاری تھی عورت تو ریزرویشن کرا کے کیوں نہیں چلا؟ یا فرسٹ کلاس میں بٹھایا ہوتا؟ جورو کو لے کر اس ڈبے میں کیوں آ گیا؟ یہاں تو غنڈے بدمعاش بیٹھتے ہیں۔ تو شریف ہے تو جا دوسرے ڈبے میں"۔

اسے ہی کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔ کسی نے بھی اس جوان کی طرف داری نہیں کی تھی بات بڑھتی دیکھ نئی نویلی بیتی ہی نے اپنے پتی کو خاموش رہ جانے کی صلاح دی تھی۔

اب اس حسینہ کا شوہر جاگ بھی جائے تو کون سا تیر مار لے گا؟ ٹرینوں، بسوں کے سفر میں آج کل یہ عام بات ہو گئی ہے۔ بوالہوس بڈھے ہوں یا جوان کمینہ پن کر ہی گزرتے ہیں۔ ماں بہن بیٹی کے مقدس رشتوں کا لحاظ بھول جاتے ہیں ... گھریلو عورت اور بازاری عورت میں فرق نہیں کرتے۔ وہ حسینہ سردار کی بیٹی کی عمر کی ہوگی۔ سردار ہوگا پچاس پچپن کا۔

کوئی اسٹیشن آیا۔ شوہر جاگ گیا۔ ایک ککڑی والا کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر چیخ رہا تھا "ککڑی۔ تازہ ککڑی"۔ شوہر نے بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پہلی بار دونوں کسی بات پر متفق ہوئے تھے۔ چاہے وہ ککڑی کھانا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ ککڑی کھاتے کھاتے بیوی نے شوہر کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا "پیچھے بیٹھا ہوا سردار جی تنگ کر رہا ہے" شوہر نے کنکھیوں سے سردار کو دیکھ کر کہا "جنرل ڈبے میں بیٹھنے پر یہ سب تو برداشت کرنا ہی ہوگا"۔

"آپ ذرا اس پر نگاہ رکھیں تو ہمت نہیں کرے گا" بیوی نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"میں کیا تمہاری پہرہ داری کرتا بیٹھوں؟" شوہر نے اسے جھڑک دیا۔

"آپ نہیں دیکھیں گے یہ معاملہ تو کیا دوسرے دیکھیں گے؟ پہرہ داری کرنے کے لئے دوسروں سے کہوں؟" بیوی بھی تیز ہو کر بولی۔

"دوسرے پہرہ داری نہیں کرتے۔ تنگ کرتے ہیں۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پہرہ داری کرنے کے لئے، خدمت بجا لانے کے لئے شوہر ہوتا ہے۔" شوہر نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم سے کہا نہیں تھا ......"

"خدا کے لئے خاموش رہئے۔ کتنی مرتبہ دہرائیں گے یہ بات۔ کچھ کر نہیں سکتے تو خاموش ہی رہئے"

بیوی نے جھک کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کردیا۔ ٹرین چل پڑی تھی۔ اسی وقت مجھے اپنے سامنے کی سیٹ کے نیچے خالی جگہ دکھائی دی۔ سردار کو کھڑا کرکے میں نے فوراً اپنا صندوق نیچے کھسکا دیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ سردار کھڑا ہو جائے اور وہ حسینہ اس کی دست درازیوں سے محفوظ ہو جائے۔ مگر وہ بھی ایک ہی بدمعاش تھا۔ چند لمحے کھڑا رہا پھر اپنا دھا آئی۔ پی بیگ اتار کر نیچے رکھا اور اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ 'سور کا بچہ' اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

شام گہری اتر آئی تھی۔ مسافر اونگھنے لگے تھے۔ ٹرین کے اس ڈبے میں کھانے کا انتظام نہیں ہوتا۔ جنہیں کھانا تھا وہ پچھلے اسٹیشن پر پوریاں بھاجی خرید کر کھا چکے تھے۔ پیچھے کی سیٹوں پر کالج کے چند طلباء کورس میں فلمی گیت گا رہے تھے۔ شوہر نے بیوی کی طرف جھک کر کہا ....

"لیٹ کر آرام کرو۔ میں یہاں پہرہ داری کے لئے۔"

بیوی نے اسے ایک نظر دیکھا پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ لیٹی نہیں۔ حالانکہ نیند کا خمار اس کی آنکھوں سے چھلکا پڑ رہا تھا۔

میرے سامنے بیٹھا ہوا ایک نوجوان بہت دیر سے جھکولے کھا رہا تھا۔ ایک مرتبہ زور سے اس کا سر پچھلی دیوار سے ٹکرایا تو جھنجھلا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی اٹیچی کھولی، ایک چادر نکالی اور سیٹ کے نیچے درمیانی جگہ میں بچھانے لگا۔ ایک مسافر نے اسے روکا "یار، رات ہمیں بھی کاٹنی ہے۔ چین سے پاؤں بھی پھیلانے نہ دو گے کیا؟"

نوجوان چادر پر لیٹتا ہوا بولا "میرے جسم پر پاؤں رکھ لینا بھائی۔ مگر روکو نہیں نیند نہیں سہاری جاتی اب۔"

بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال مجھے آیا۔ نوجوان کی خالی سیٹ کو پاؤں سے روک کر میں نے آواز دی "سردار جی آجاؤ۔ تمہارے لئے سیٹ روکی ہے۔"

سردار کم بخت وہاں سے ہٹنا کب چاہتا تھا۔ بیدلی سے بولا "رہنے دو۔ یہاں بھی ٹھیک بیٹھا ہوں۔ جا بھائی، تو وہاں بیٹھ جا۔ بہت دیر سے کھڑا ہے۔" اس نے اپنے پاس کھڑے دوسرے مسافر سے کہا۔ "تم ہی آؤ سردار جی۔ تمہارے لئے روکی ہے سیٹ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ سردار کو اٹھنا پڑا۔ اس کے اٹھتے ہی ایک دوسرا مسافر اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ شوہر و بیوی دونوں کے چہرے پر سکون و کشادگی دوڑنے لگا ـــــ بیوی کو پہلی مرتبہ میں نے مسکراتے دیکھا۔ قیامت تھی اس کی مسکراہٹ۔ دل نشین .... جابجا نشہ طاری کرنے والی مسکراہٹ ..... اس نے

سوتی ہی آنکھیں میں کچھ کہا۔ شوہر نے اپنے بیگ سے چادر نکال دی۔ بیوی نے ڈال رکھ
رتے پر لیٹ کر میری طرف کروٹ لی۔ پاؤں سیٹ کے شوہر کی سیٹ پر رکھ دئے ۔
نے سر کو بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کرلیں
ایسا یوں خوش تھا جیسے پھولوں کے دیش کی راجکماری کو کسی راکشس کے شکنجے سے
ن کامیابی پائی ہو۔
ستہ بھی بیوپاری گلے سے عجیب طرح کی آوازیں نکالتا ہوا مجھ پر لدا پڑ رہا تھا۔ اس کے
سر نے میرا بایاں کندھا شل کر دیا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے رات کاٹ دینے کی بات
ڑا کھڑا سو جاتا اور گر جاتا تو کیا حال ہوتا ان کا جن پر وہ گرا ہوتا؟ مجھے سوچ
گئی۔
ہے میرا سر بھاری ہو رہا تھا لیکن سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بیوی نے اپنے چہرے
پکل ڈال لیا تھا۔ چاند بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے مگر سرمئی کرنیں ادھر ادھر سے
بادلوں کو سنہری گوٹ سے سجا کر چاند کی موجودگی کا پتہ دیتی رہتی ہیں۔ بسنتی ساڑی کا
اند سا چہرہ میری آنکھوں کو مخمور کر رہا تھا۔ میں سویا نہیں لیکن مدہوش ہو گیا۔
شی کی کیفیت نہ جانے کتنی دیر مجھ پر طاری رہی۔ آدھا گھنٹہ یا پون گھنٹہ۔ اس سے زیادہ
کھلتے ہی میری نظر اس طرف گئی۔ وہ بدحواس بیٹھی اپنا بازو مسل رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی
یر۔ اس قلیل مدت میں یہ کیا جذباتی رشتہ میرا ہو گیا تھا اس سے کہ اس کی خوشی میں
نہ رہا تھا۔ اس کی تکلیف سے میرے دل کو چوٹ پہنچ رہی تھی۔ میں اس کی نیند سو رہا تھا
جاگ رہا تھا ...... ورنہ میری نیند مشہور ہے۔ میرے احباب و خاندان کے افراد
نی نیند کہتے ہیں ..... یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں بے بس تھا۔ اس کی مدد کرنے
۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تھی۔ اس کا شوہر کیوں پسند کرتا کہ کوئی غیر شخص اس کی بیوی
تیار کرے۔ وہ بھی کیوں اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے میری طرف مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتی؟
اس وقت بھی میری طرف تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا جب میں نے اسے سرداری کی
بیوں سے نجات دلائی تھی ..... لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ میں فضول ہی اسے
رہا ہوں۔ اسے تو پتہ ہی نہیں ہے کہ میں اس کے سحر کن حسن سے متاثر ہو کر اس کے لئے یہ
ہوں۔ یہ تو میرے اپنے جذبات ہیں جو خود کو اس سے وابستہ کر اس کے لئے فکرمند ہو رہا ہوں۔
نے آنکھ جھپک کر شوہر کا کندھا ہلایا۔ اس کے جاگتے ہی آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگی۔ ذلت

غصے اور بے بسی کے ملے جلے احساسات سے وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس کی بات سننے سے
پہلے بیوی کے پیچھے کی طرف دیکھا۔ میری نظر بھی ادھر گئی۔ اف! وہ کم بخت سردار پھر اپنی پرا
جگہ جا بیٹھا تھا۔ حالانکہ اس نے آنکھیں بند کر سونے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا لیکن یقیناً وہ جا
رہا تھا۔ پپوٹوں کے نیچے اس کی حرکت کرتی ہوئی پتلیاں صاف محسوس کی جا سکتی تھیں۔ اب م
سمجھا اس نے پھر کوئی نامناسب حرکت کی ہوگی جس سے بیوی حواس باختہ تھی۔ کمپارٹمنٹ
سنسان تھا۔ مسافر ایک دوسرے پر لڑھکے پڑتے تھے۔ ٹرین تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔

.... جاگ رہے تھے صرف چار لوگ .... شوہر اور بیوی .... میں اور وہ سردار ....

بیوی کی بات ختم ہونے پر شوہر نے کچھ کہا۔ بیوی نے انکار میں سر ہلایا۔ شوہر دانت پیسنے
لگا .... رب جانے اپنی نافرمان بیوی پر یا اس سردار پر دانت پیس رہا تھا وہ
مگر بیوی پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ایک جھٹکے سے وہ سیٹ پر لیٹ گئی۔ اس مرتبہ ا
نے ڈبے کی دیوار کی طرف کروٹ لے رکھی تھی۔

شوہر چند منٹ بیٹھا ہونٹ کاٹتا رہا۔ پھر جیب سے سگریٹ نکالی۔ سلگا کر د
دھیرے کش لینے لگا۔ اس کی نظر سردار پر تھی۔ دس منٹ نہ گزرے ہوں گے کہ سردا
آنکھیں کھول لیں۔ تھوڑا سا ترچھا ہوا مگر شوہر پر نگاہ پڑتے ہی اسے جاگتا دیکھ کر فوراً
آنکھیں بند کر لیں۔ دو تین بار ایسا ہی ہوا۔ ایک سگریٹ ختم ہونے کو آتی تو شوہر دوسر
سگریٹ جلا لیتا۔ سردار وقفے وقفے سے آنکھیں کھولتا۔ شوہر کو باخبر دیکھ آنکھیں بند کر ل

میں بہت دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا ——— میرے بابا بہت بڑے شکاری تھے۔ وہ آ
خونخوار شیر کے شکار کا قصہ اکثر سنایا کرتے۔ بابا نے کئی مرتبہ پاڑہ باندھ کر پوری پوری را
مچان پر گزاریں، وہ سامنے نہ آیا۔ بابا کہا کرتے۔ — "جیسے میں جانتا تھا کہ وہ نزد
یہیں کہیں جھاڑیوں میں موجود ہے اور پاڑے پر جھپٹنے کی تاک میں ہے اسی طرح وہ بھی
موجودگی سے باخبر ہوتا۔ وہ میرے غافل ہونے کا انتظار کرتا تھا میں اس کے غلط قدم
کا"۔ پورے چودہ دن بعد بابا اسے شکار کر پائے تھے۔ شوہر کو چوکنا بیٹھے دیکھ کر
بابا کی بہت یاد آ رہی تھی۔ اُدھر سردار اس کوشش میں تھا کہ شوہر کی نظر چوکے اور وہ کچھ کر گز

آدھی رات تک میں یہ آنکھ مچولی دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خیال آیا یہ بیوقوفی ہے۔ میں
جاگ کر اپنا وقت برباد کر رہا ہوں۔ اس سے مجھے کیا ملے گا؟ شوہر نے شادی کے
میں بندھ کر بیوی کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ وہ اپنا فرض نبھا رہا ہے۔ چلو اسے اپنا معاملہ

خواہش بھی اسی نے کی تھی۔ ۔ ۔ یہ میرا فرض ہے۔ مجھے کریڈٹ دے گا۔ ۔ ۔ ، یہی اس
خیال کے ذہن میں پختہ سے پختہ ہوتے ہوتے میں نے آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تب سویرے کے چار بج رہے تھے۔ سگریٹ کا دھواں
آتا شوہر اب بھی جاگتا ہوا چوکنا بیٹھا تھا۔ سردار بیٹھا اژدوں کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اچانک
اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر سے کھل آئی لنگی کو ٹھیک کرنے لگا۔ شوہر نے مشتبہ نظروں
سے اُسے دیکھتے ہوئے سخت لہجہ میں پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ "کیوں؟ کیا ارادہ ہے؟"

"باتھ روم جائیں گے ذرا۔" کہہ کر سردار مڑ گیا۔ اس کی طرف کے باتھ روم کے راستے
میں مسافر ایک دوسرے پر لدے سو رہے تھے۔ وہ سامنے کی طرف بڑھا۔ شوہر اسے کڑی
نظروں سے گھور رہا تھا۔ سردار کو اس کے سامنے سے ہو کر گزرنا تھا۔

دھڑام!!! پتہ نہیں کیا ہوا؟ سردار اوندھے منہ ڈبے میں نیچے گر پڑا۔ گرتے گرتے
اس کا سر اوپر والی سیٹ سے ٹکرایا تھا۔ نیچے سوئے ہوئے جن مسافروں پر وہ گرا تھا وہ
چیختے ہوئے اٹھ بیٹھے تھے۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" پوچھتے ہوئے کئی اور مسافر جاگ اٹھے۔
ایک دو مسافر سردار کو اٹھانے لگے۔ شوہر سب سے پہلے پہنچا تھا۔ بیوی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی
تھی اور حیران نگاہوں سے سارا ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔

سب جاننے کو بے چین تھے کہ کیا ہوا؟ سوا میرے۔ میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔
سردار کو اٹھا کر ایک جگہ بٹھا دیا گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے آنکھیں بند کیے
بیٹھا تھا۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ شوہر کہہ رہا تھا ـــــ میں جاگ رہا تھا۔ سردار جی
باتھ روم جا رہے تھے۔ لنگی میں پاؤں الجھ گیا۔ میں نے دیکھا۔ ۔ ۔ "

لیکن میں نے جو دیکھا وہ اس سے قطعی الگ تھا۔ میں نے صاف دیکھا تھا۔ سردار کو
اٹھاتے اٹھاتے بھی شوہر نے دو چار گھونسے دے ڈالے تھے۔ اور اس سے پہلے
باتھ روم جاتے وقت سردار کو ٹانگ اڑا کر گراتے ہوئے بھی صاف دیکھا تھا میں نے

مسلسل

عطاد اور تعاون کے ذریعہ ترقی کی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان کے کارخانے میں
پیداوار ۱۹۷۸ء کے مقابلے میں کم از کم سو گنا بڑھ گئی ہے۔ مسٹر یدی نے کہا کہ
ریاست کے مالیاتی ادارہ اور بینک کی مستقل امداد اور تعاون کے نتیجے میں
ایک کامیاب صنعت کار کی حیثیت سے ابھر سکے ہیں۔

کی محفلیں ہوتی ہیں۔ غرض کہ قدیم و جدید شعراء اور مصنفین کا مذاق علم و فن ادبی و لکھنو کے دبستان سے آنکھ ملانے کا مستحق ہے اس عہد کے چند شعراء کے نام درج ذیل ہیں:۔
شاہ غلام حسین، بھجو میاں عرفان، چندولال، حشمت رائے جانباز، ابو الفتح ضیاء الدین، محمد عرف سید احمد حسین خطیب آتید، انبا پرشاد دائم، بہنم، رضا عبدالوہاب، جانی میاں، بابا راجہ شفق، ہاشمی خان حسرت، مراد خان مراد، مولوی نعیم الدین شیخ شاہ محمد احسن، طاہر یار بیگ، فرہاد، ککر منشی سیوک صاحب شنگرفی، میر حید محمود عظیم
آج یہ قصبہ تعلیمی میدان میں اچلپور بہت ترقی پر ہے۔ کئی اردو، ہندی اور مراٹھی ہائی اسکولس ہیں۔ دو کالج ہیں اور پولی ٹکنک کالج بھی ہے۔

●●●

سنجیدہ ادبی ذوق رکھنے والے تشنگان علم کے لئے:
شاداب سے بہتر اور کوئی ماہ نامہ نہیں۔
اسے گھر گھر پہنچایئے اور اس کے خریدار بنانے میں تعاون کیجئے۔
(ادارہ)

فارم نمبر ۴
تحت تفصیلات ملکیت بابتہ ماہنامہ شاداب حیدرآباد

زبان بعراحت وقفہ: اردو ماہنامہ "شاداب"
مقام اشاعت: ۱۴۷-۵-۱۱، ریڈ ہلز، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر اور مالک کا نام: محمد قمر الدین صابری
قومیت اور پتہ: ہندوستانی۔ ۱۴۷-۵-۱۱، ریڈ ہلز، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴
اس ماہ نامہ کے کوئی اور مالک یا شراکت دار نہیں ہیں۔
میں، محمد قمر الدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع اور یقین کی حد تک صحیح ہیں۔ فقط محمد قمر الدین صابری

مئی ۱۹۸۷ء

شمارہ

شاداب

ایڈیٹر	مینیجنگ ایڈیٹر
قمرالدین صابری	محمد کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب — یوسف ناظم — ڈاکٹر محمد یوسف الدین
پروفیسر رضی الدین احمد — منیر احمد صدیقی — محمد منظور احمد منظور
اے۔ جی۔ فاروقی۔ ڈاکٹر نشاء الرحمٰن خان نشاء۔ پروفیسر میر تراب علی

زرِ تعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

[illegible]ل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004

[illegible] قمرالدین صابری نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر [illegible] حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول

حکومت آندھرا پردیش نے ریاستی نظم و نسق میں مکمل طور پر تیلگو کے استعمال کے بارے میں حال ہی میں جو احکام جاری کئے ہیں، اس سے اردو حلقوں میں سخت تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ ریاستی حکومت سہ لسانی فارمولے کے تحت سرکاری نظم و نسق میں تینوں زبانوں تیلگو، اردو اور انگریزی کے استعمال کی پابند ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ریاست کے ہر گوشہ اور اردو والوں کے ہر حلقہ کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اردو کو ریاست کی دوسری زبان قرار دیا جائے اور اس طرح اسے اس کا مستحقہ مقام دیا جائے۔ حکومت نے اس سمت میں کچھ اقدام بھی کئے جو حکومتی کارپردازوں کی سرد مہری اور عدم توجہ کی وجہ سے روبہ عمل نہ آسکے۔ برخلاف اس کے ریاستی قانون ساز اسمبلی میں پیش کئے جانے والے تمام مسودہ قوانین کی تیلگو زبان میں پیشکشی اور سرکاری دفاتر میں تیلگو ٹائپ رائٹروں کو ترجیح دینے اور جملہ مراسلت صرف تیلگو میں کرنے کے فیصلہ نے ایک لسانی تنازعہ کھڑا کر دیا ہے۔ اردو والے تیلگو کے خلاف نہیں ہیں۔ وہ تیلگو کے سرکاری زبان قرار دئے جانے کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اردو کے ساتھ ناانصافی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔ جیسے ہی حکومت نے اپنے احکام کا اعلان کیا، محبانِ اردو نے بلا لحاظ مذہب و ملت و تعلق تنظیم و جماعت اردو کے ساتھ اس ناانصافی کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ تمام اردو تنظیموں، مختلف اداروں اور سیاسی جماعتوں کے قائدین علحدہ علحدہ انفرادی طور پر اپنی آواز اٹھا رہے ہیں۔ اردو کے ان بہی خواہوں سے ہماری خواہش ہے کہ وہ اپنے سیاسی اور تنظیمی اختلافات سے اوپر اٹھ کر اردو کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور اپنا متفقہ اور متحدہ مطالبہ پیش کریں تاکہ حکومت اسے نظر انداز نہ کر سکے اور اس عوامی مطالبہ کو مانتے ہوئے اردو کے ساتھ انصاف کرے۔ ہم جانتے ہیں کہ حکومت اردو کے خلاف نہیں ہے۔ جس طرح حکومت اپنے سابقہ فیصلہ کے پیش نظر دفاتر معتمدین میں تختیوں وغیرہ پر تیلگو کے ساتھ اردو کا بھی اندراج کروا رہی ہے اسی طرح امید ہے کہ نہ صرف حسب سابق حکومتی قوانین، سرکاری مراسلت و ٹائپ وغیرہ کا اردو سلسلہ جاری رہے گا بلکہ اردو کو زبان دوم قرار دیا جا کر اس کے استعمال میں اضافہ کیا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت ریاست کی دوسری اکثریتی زبان بولنے والوں کے مطالبہ پر نیک نیتی اور ہمدردی کے رویہ کا مظاہرہ کرے گی۔ ●●●

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا (حیدرآباد)

ساتویں منصوبے میں زرعی تعلیم و تحقیقات

زرعی تحقیقات کی بھارتی کونسل (آئی سی اے آر) ملک میں زرعی تحقیقات زرعی تعلیم کو بڑھاوا دینے میں زبردست رول ادا کر رہی ہے۔ یہ کونسل مرکزی اور کے علاوہ مختلف ریاستوں کی زرعی جامعات سرکاری، غیر سرکاری اور خانگی اداروں سے تعاون عمل کر رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زرعی کونسل (٦٦) مربوط تحقیقاتی پراجکٹوں سے بھی وابستہ ہے۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں مندرجہ ذیل نکات کو فوقیت دی جا رہی ہے

۱۔ کاشت کے رقبے اور پیداوار کے درمیان تفاوت کو گھٹانا۔

2۔ نچلی اور اوپری زمین میں کاشت کرنے والے کسانوں کو ایسی تکنیک کی فراہمی جس کے ذریعہ چاول کی پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو۔

3۔ خشک زمینوں کے لئے موزوں تکنیک کی فراہمی۔

4۔ دالوں اور تیل کے بیجوں کی پیداوار میں اضافہ۔

5۔ پودوں کے بیجوں کا منصوبہ بند تحفظ اور ان کے صحیح استعمال کے علاوہ جانوروں اور مچھلیوں کے حیاتیاتی بنیاد کا استحکام۔

٥۔ انسانی وسائل کی ترقی اور خاص طور پر سماج کے کمزور طبقات کے وسائل میں اضافے پر زور۔

7۔ بایو۔ ٹیکنالوجی کی سرگرمیوں کا استحکام اور۔

8۔ اگرو میٹورولوجی کی تحقیقات میں بڑھاوا۔

امید کی جانی چاہیئے کہ ساتویں منصوبے کے دوران زرعی سرگرمیوں کو غیر معمولی کامیابی ملے گی کیونکہ یہ منصوبہ زرعی ترقیات سے متعلق تمام تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔

قسط اول

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

سلم پرسنل لا اور یکساں سیول کوڈ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس ہشتم منعقدہ بمبئی بتاریخ ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء کا خطبہ صدارت صابو صدیق مسافر خانہ میں پڑھا

...رات!

...اجازت دیجئے کہ میں اپنا خطبہ دو بیش قیمت تاریخی، فکر انگیز اقتباسات سے شروع کروں۔
...ک کے سیاسی و انقلابی، اصولی و اخلاقی اور جمہوری و سیاسی تاریخ میں سنگ میل اور روشنی
... حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے اس ملک کی سیاسی، انتظامی و فکری قیادت اور عوام کو ہمیشہ
...رہنمائی حاصل کرنی چاہئے اور کبھی ان کو فراموش اور نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

...اقتباس جنگ آزادی کے نہ صرف معتبر و مستند بلکہ قابل فخر و مایۂ ناز قائد و محسن مولانا
...آزاد کے اس خطبۂ صدارت کا ہے جو انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڈھ
...۱۹ء میں دیا تھا۔

...نا نے فرمایا:-

...مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی
...ندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ

بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنا ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔

لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتا ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں۔ میں اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔[1]

دوسرا اقتباس ملک کے مشہور دانشور، محب وطن، بین الاقوامی شہرت کے حامل، ماہر تعلیم اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے اس خطبہ کا ہے جو موصوف نے کاشی ودیا پیٹھ (بنارس) کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۴ر اگسٹ ۱۹۳۵ء کو پڑھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:-

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میں اس معزز مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خودغرضیاں تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما گلستاں میرد اگر میریم ما"[2]

---

[1] خطبات آزاد مطبوعہ ساہتیہ اکادمی ص ۲۹۷-۲۹۸

[2] ترجمہ: اگر ہم غنچہ کی طرح دل گرفتہ اور غم زدہ ہیں، لیکن اگر ہم نہ رہے تو گلستاں بھی نہ رہے گا۔
تعلیمی خطبات (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم) مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی فروری ۱۹۷۲ء ص ۲۴۳-۲۴۴

حضرات!

ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی و عائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں اس حقیقت کے نہ صرف اعتراف بلکہ احترام، اس خصوصیت کے نہ صرف باقی رہنے کی اجازت بلکہ اس کے تحفظ و ترقی اور اس کے ساتھ بقائے باہم اور مشترک ملکی اور قومی مفادات میں سرگرم اشتراک و تعاون کا ثبوت دیا ہے، اور جس کے لئے نامذہبی (SECULAR) اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانبداری اور ذہن و ضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام ہو سکتا ہے، یہی طرز فکر مناسب ہے، اور یہ نہ صرف کہنے والوں کی اپنے اپنے ایمان و عقیدہ اور قلب و ضمیر کی صحیح ترجمانی ہے، بلکہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام و ملل تمدنوں اور تہذیبوں اور علوم و فلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ اور کہنے والوں کی بلند نگاہی، روشن ضمیری، اصول پسندی اور اس کے ساتھ اس اخلاقی جرأت کا نمونہ و مظاہرہ بھی ہے، جو ان دونوں قائدین فکر و سیاست کے ہر طرح شایان شان ہے۔

اسی حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف النوع عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب و عقائد، اپنے تمدنوں اور تہذیبوں اور اپنے معاشرتی اور عائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت و دفاع میں صرف کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر و ترقی، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت و مقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لئے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

"امن عامہ، اخلاق اور صحت اور اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو محفوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ و اشاعت کا یکساں حق ہوگا۔"

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدنی، تہذیبی، مذہبی و نفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزم و فیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

لیکن اس قابل احترام دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی اعلیٰ ترین ذہنی، قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں، جس نے بہت وقت لیا، اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ

ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئیں، یہ عجیب و غریب تضاد بلکہ دنیا کی دستور سازی کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اس کے باوجود دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) کی دفعہ شامل کی گئی، اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPLE) کا درجہ دیا گیا، اس دفعہ کا متن حسب ذیل ہے:

"مملکت، ہندوستان کے پورے علاقہ میں شہریوں کے لئے یکساں مدنی ضابطہ (UNIFORM CIVIL CODE) کے حصول کی سعی کرے گی۔"

جس وقت دستور کی ترتیب عمل میں آئی تھی، اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستور ہند کے بنیادی حقوق (FUNDAMENTAL RIGHTS) کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا ہے، اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول سے زیادہ اہم ہیں، لیکن دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جہاں تک مسلمانوں کے عائلی قوانین اور نظام معاشرت کا تعلق ہے (جو ان کے مذہب کا جزء لاینفک (INSEPARABLE PART) ہے)، دستور ہند کے اس تار و پود میں ایک آتش گیر (EXPLOSIVE MATTER) مادہ رکھ دیا گیا ہے، جو کسی وقت بھی کسی ادنیٰ تحریک، یا باہر کی گرم ہواؤں کے اثر سے آگ پکڑ سکتا ہے، اور ان مذہبی و قانونی تحفظات کو جلا کر فنا کر سکتا ہے، جن کی دستور نے ضمانت دی تھی، چنانچہ واقعات کی قدرتی رفتار اور ان مختلف عوامل و محرکات (FACTORS) کے ماتحت جن کا تعلق مسلمانوں کے عائلی قوانین (PERSONAL LAW) کی صحیح نوعیت اور اس کے ان کے مذہب سے تعلق اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے عقائد و جذبات اور نفسیات سے ناواقفیت، فکر و نظر کی سطحیت سے بھی ہے، اور ہندو احیائیت (HINDU REVIVALISM) کے جذبہ اور سیاسی و انتخابی مصالح اور اکثریت کو خوش کرنے کے جذبے سے بھی ہو سکتا ہے، یہ خطرہ سامنے آ گیا، اور ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد ۱۹۷۱ء میں مختلف اسباب و محرکات کی بناء پر ہندوستان میں مختلف فرقوں کے عائلی قانون (PERSONAL LAW) کی وحدت اور مسلم پرسنل لا کی اصلاح و ترمیم کی پھر ایک بار بلند آہنگی کے ساتھ آواز بلند ہوئی، یہ آواز تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ مختلف وقتوں میں مجلس قانون ساز کے اندر اور مجلس قانون ساز کے باہر بلند ہوتی رہی، لیکن مختلف سیاسی مصلحتوں سے اور مسلم رائے عامہ کی برہمی کے خوف سے (جس کا الکشن پر بھی اثر پڑنے کا خطرہ تھا) دبائی جاتی رہی، اور حکومت ہند نے کئی بار اپنے اعلیٰ ذمہ داروں کی زبان سے اس کا اعلان کیا کہ ایسا کرنے کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے، اور جب تک متعلق فرقے خود اس خواہش کا اظہار اور اس کا مطالبہ نہ کریں اس کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن اس کے ساتھ خود ان فرقوں کے متعدد افراد پارلیمنٹ کے

اندر اور پارلیمنٹ کے باہر یہ آواز اٹھاتے رہے اور بعض دوربین نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ محض ان کے ضمیر کی آواز نہیں ہے، بلکہ ان کی زبان حال کہتی ہے کہ ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہمہ می گویم

حقیقت جو کچھ بھی ہو اتنا اندازہ ہو گیا کہ ملک کے قانون سازوں اور ارباب اختیار کے ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہیں، اور کسی وقت بھی خاکستر کے نیچے یہ چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک ہیں، ایک یہ کہ "سلطانیٔ جمہور" کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے اور عائلی قوانین زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے، جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں "آسمانی قانون" کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے، اور وہ عائلی قوانین کو محض زندگی کے ضروریات کا نتیجہ اور خواہشات و ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں (اور بدقسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں، اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں، بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیل پایا جاتا ہے) ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل فطری امر و بدیہی حقیقت ہے، اس لئے کہ وہ قانون انسانوں ہی کے اپنے زمانے کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیل ہو جانے سے انسانوں ہی کے ہاتھوں ان میں اصلاح و ترمیم اور تبدیلی نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات فرض و واجب ہو جاتی ہے۔

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزاء میں زیادہ سے زیادہ ہم رنگی اور وحدت UNIFORMITY کا وہ عالمگیر رجحان ہے، جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے قوت و شدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا، اور اس میں ادب و شاعری، علم و سیاست، اور صحافت و خطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے، یورپ سے (جہاں کے اکثر ملکوں میں ایک ہی تہذیب، ایک معاشرتی نظام ایک ہی عائلی قانون اور اکثر ایک ہی مذہب اور زبان رائج ہے) یہ خیال ان مشرقی ملکوں میں آیا جہاں کئی کئی مذہب، مختلف تہذیبیں اور مختلف معاشرتی نظام کبھی بھی باہمی زور آزمائی اور انتشار کا باعث نہیں ہوئے، انتشار و افتراق کا اصل سبب ہمیشہ ملکوں کے باہمی اغراض اور قوموں کے سیاسی رہنماؤں کے ذاتی مفادات ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمل تہذیبی اور عائلی وحدت کے باوجود دو دو خون آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے

مشرقی وایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا، پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی۔ جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون ومعاشرت تقریباً ایک ہے۔ پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سیول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور برد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے، تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جاکر دیکھ آئیے کہ مسلمان مدعی ہے، اور مسلمان ہی مدعا علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے، کہ اس میں بھی عائلی قانون Personal Law کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی، اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت اور دولت پرستی کے جنون سے اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کردیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہوجانے سے اخلاقی صورت حال پر قطعاً ایک ذرہ کا بھی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سیول کوڈ ہونا چاہئے، تاکہ آپس میں اتحاد والفت پیدا ہو؟ طوطے کی طرح اس بات کو دہراتے رہنا سطحیت (LOOSE THINKING) مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

ان دو محرکات کے ساتھ یہ بھی اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ بعض فرقوں کے عائلی قوانین میں ایسی ناہموارہاں اور نقائص پائے جاتے ہیں کہ ان کی اصلاح اور جدید حالات کے مطابق نئے قوانین کا وضع کرنا ایک رفاہی جمہوری (WELFARE DEMOCRATIC) حکومت کا بھی فرض ہے، اور اس فرقہ کے فرض شناس اور حقیقت پسند رہنماؤں اور نمائندوں کا بھی، اس لئے ہمیں اس معاملہ میں جہاں تک ان قوموں کا تعلق ہے نہ ملامت کا حق ہے، نہ احتجاج کا۔

لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزو ہے کہ ان کا عائلی قانون (FAMILY LAW) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے، جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے،

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم و خبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے، اور اس کائنات کا بھی، اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (سورہ الملک ـ ۱۴)

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال و مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی و عملی نفاق کے سوا کچھ نہیں، پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل متوازن اور عادل ہونے اور زمان و مکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی و علمی شواہد، اور مسلم اور غیر مسلم، مشرقی و مغربی فضلا، جری و انصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی "شپرہ چشم" ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے، اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

ہندوستان میں جب مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہو گئی ہیں، اور یہ بادل جو ابھی کسی وقت گرجتا ہے، کسی وقت ضرور برسے گا، تو انھوں نے "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے نام سے ڈسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رُخ کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہا ہے، تاکہ اچانک ان پر یہ، یا کوئی دوسرا مسئلہ شبخون نہ مارنے پائے، یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا، جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رخ معلوم ہو گیا، اور اتنا ثابت ہو گیا کہ مسلمان اس مسئلہ میں صدفی صد متفق ہیں، اس لئے دانشمندی، حقیقت پسندی، اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

یہ صورت حال قائم تھی، اور مسلمان اقلیت اور اس معاشرہ و ماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی کہ ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں وہ

ہنگامہ خیز فیصلہ دیا جس سے ملت اسلامی، مسلم معاشرہ اور علماء و دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی نظیر اپنی وسعت و عمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت و کرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات، خوں ریزی و انسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کی موجودگی میں بھی نہیں ملتی، اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے تہذیبی، معاشرتی ارتداد، شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور :

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (سورۃ المائدہ - ۴۴)

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں ۔

کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا اور اس سے غیر مسلم جج صاحبان یا قرآن و حدیث و تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان میں مہارت خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لئے قرآنی آیات اس کے الفاظ و اصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد سے چند معلومات، سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات "ترقی پسندی" یا بیرونی اثرات و مؤثرات سے تأثر کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے، من مانی تفسیر اور خواہشمندانہ تشریح (WISHFUL THINKING) کا آزادانہ موقع مل سکتا ہے، اور یہ نہ صرف دین و شریعت، مذہبی صحیفوں بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول، اختصاص (SPECIALISATION) اور علوم و فنون میں اتھارٹی (AUTHORITY) کے تسلیم و احترام کے اس اصول کے خلاف تھا جو ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جا رہا ہے، اور جس پر زبان و ادب، فلسفہ، منطق، سائنس و ٹکنالوجی، اجتماعیات، و دینیات کا نظام چل رہا ہے ۔

اس موقعہ پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملی غیرت و خودداری کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر عرصۂ دراز سے ملی و دینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے، جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسۂ عام میں جو ۶/اپریل سنہ ۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ (نصف ملین) انسان تھے، شمال ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی نیلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا جس میں بورڈ کے ذمہ دارترین ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، ان کے علاوہ وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں ۔

(باقی آئندہ)

ماہنامہ شاداب حیدرآباد مئی ۱۹۸۷ء

مفتی و قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

بسلسلۂ گذشتہ آخری قسط سوم

یکساں سیول کوڈ

(اقتباسات خطاب)

اب ان کا نشانہ ڈائرکٹ حملہ کا ہے کہ یونیفارم سیول کوڈ جاری کیجئے۔ ہم جو کچھ یادہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، الحمدللہ اپنے اسلام پر فخر کرتے ہیں، ہم ہندوستانی یا اور اپنے ہندوستانی ہونے کا بھی ہمیں فخر ہے۔ اور ہم کسی طرح کسی سے بھی کم اپنے ہندوستانی سمجھنے کو تیار نہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے قربانیاں دی ہیں میں کہتا ہوں کہ انہوں نے حسین احمد مدنی جیسی قربانیاں نہیں دیں، شیخ الہند محمود الحق سی قربانیاں نہیں دیں، عبیداللہ سندھی سی نہیں دیں، برکت اللہ بھوپالی سی نہیں دیں۔ ل حق خیرآبادی سی نہیں دیں، مولانا جعفر تھانیسری سی نہیں دیں۔ آپ نے شہزادہ بیدار بخت سی قربانیاں نہیں دیں، آپ نے سلطان ٹیپو شہید جیسی قربانیاں نہیں دیں، آپ نے سراج الدولہ سی قربانیاں نہیں دیں، آپ نے صادق پور کے شہیدوں کی جس طرح گردنیں لٹکائی گئیں اس طرح مثال پیش نہیں کی۔ الغرض ہندوستان کے خطے کا کون سا کونہ ہے جس پر ہمارے خون کی آج بھی موجود نہ ہو۔ ہم نے قربانی دی ہے ـــــ اس ملک سے ہم کو محبت ہے۔ اس بھلائی چاہتے ہیں۔ جو بات اس ملک کی بھلائی کی ہو اس کو ایمانداری کے ساتھ کہنے میں کیا حرج ہے۔ ہم ایمانداری سے سمجھتے ہیں کہ یہ ملک اسی وقت تک بہتر ملک رہے گا تک کہ اس ملک کی بسنے والی ہر ملت، مذہب اور تہذیب کو اس بات کا اطمینان رہے گا کہ کے مذہب کو، اس کی تہذیب کو، اس کے افکار کو، اس کی معاشرت کو، اس کی زبان کو [illegible]

نائب امیر شریعت، بہار

نہیں جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے وزیراعظم نے ناگاؤں اور میزوؤں کے ساتھ مصالحت فرمائی اور وہاں لوگ یہ کہتے ہوئے نہیں ہچکچاتے کہ ان کے اوپر پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون لاگو نہیں ہوگا اور جو ان کا اپنا جرگہ سسٹم ہے۔ ان کا پنچایتی سسٹم ہے وہی عدالت ان کے معاملات کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ آپ نے محض اس لئے مانا کہ اگر یہ اطمینان ان کو نہیں دلایا جائے گا تو وہ ملک کے ایک سانچے میں رہنے کو تیار نہیں رہیں گے، بغاوت کریں گے۔ تو ملک کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے، ملک کی سالمیت اور بقا کے لئے آپ نے ملک کے ان فرقوں کو آزادی دی جو اپنی Identity، اپنا تشخص اور اپنا امتیاز برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ہم سب سے پہلے اس کی تائید کرتے ہیں کہ ملک کے تمام ہی فرقوں، تہذیبوں، مذاہب، افکار، زبانوں کو اس قسم کی آزادی ہونی چاہئے۔ بلکہ آزادی تو حاصل ہے۔ پس اسی حاصل شدہ آزادی پر کبھی کوئی حملہ نہیں ہونا چاہئے تبھی یہ ملک ایک رہے گا۔

اس ملک کا ایک ہونا ہی ہماری دین ہے۔ ہم نے اس ملک کو ایک کیا ہے ورنہ یہ رجواڑوں کا ٹکڑے ٹکڑے بنا ہوا ملک تھا جس کو گالیاں دیتے ہو انھوں نے ایک کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کا شکریہ ادا کرو جس نے اس ملک کو ایک کیا۔ اگر آئندہ بھی اس ملک کو ایک رکھنا چاہتے ہو تو اس ملک کی بسنے والی مختلف تہذیبوں کو اپنے اپنے مسلک پر، اپنے اپنے مذہب پر، اپنی اپنی تہذیب پر جینے دو تب وہ خوش ہو کر اطمینان سے تمھارے ساتھ زندگی گزار سکیں گے ورنہ اگر تم نے ان کی تہذیب، ان کی زبان، ان کے مذہب، ان کے عقائد، ان کے قانون اور ان کی معاشرت پر حملہ کیا تو اس طرح یہ ایسا گھر ہوگا جس گھر میں بیوی، بیٹی، بہن، بھائی کوئی ایک دوسرے سے مطمئن نہیں رہے گا۔ ہانڈی ٹوٹے گی اور بیچ چوراہے پر پھوٹے گی اور اس ملک کی سالمیت اور اس کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہم اپنے اس ملک کا یہ نقصان کیسے برداشت کریں۔

اسی طرح ہم پکے مسلمان ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے علاوہ جو کچھ نظام ہے وہ غلط ہے ہم ایک خیر کو چھوڑ کر شر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم اپنے اعتقاد کے نتیجے میں بھی اور اپنے عقل و فکر کے نتیجے میں بھی یہ سمجھتے ہیں کہ طلاق کا وہ نظام، نکاح کا وہ نظام جس میں غیر فطری یا دو ناموافق مزاج کے لوگوں کو تا قیامت میاں بیوی بنا کر رکھنا ضروری ہے غلط ہے۔ ان کی فطرت کی صحیح رعایت نہیں۔ طلاق اور علٰحدگی کی بنیادیں میاں بیوی میں نفسیاتی ہوا کرتی ہیں اور نفسیاتی وجوہ ضروری نہیں کہ قابل دست اندازی عدالت بھی ہوں۔ عدالتیں امور ظاہر کو deal کرتی ہیں اور انسان کی نفسیات اندر کی چھپی ہوئی چیزوں کو deal کرتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ یہ کہیں کہ آپ کیوں بیوی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے؟ کیوں آپ کو الجھن ہے؟ کیوں ا

نفرت ہے؟ کیوں دونوں میں موافقت نہیں ہے؟ ان باتوں کو دلائل اور قانون سے نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ اس لئے ایسا کوئی قانون نہیں جس کے تحت تم کسی کو عدالت جانے پر مجبور کر سکو۔ اس کا نتیجہ وہی ہوگا کہ آج ہندو کوڈ بل بن جانے کے باوجود بھی ہندو جوڑے جب آپس میں خوشی نہیں پاتے اور قانونی طور پر طلاق کے ذریعہ علاحدگی کا راستہ انہیں نہیں ملتا تو آکر کہتے ہیں کہ قاضی صاحب ہمیں مسلمان کر دیجئے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیوں مسلمان کریں تو کہتے ہیں کہ ہمیں اسلام اچھا لگتا ہے۔ لیکن اندر سے دیکھئے تو اسلام اچھا نہیں لگتا بلکہ وہ بیوی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مذہب کو بدل دینے تک پہنچ گئے۔ فطرت کے خلاف جاؤ گے تو یہی ہوگا۔

اسی طرح دوسرے تمام امور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن ہم پورے انشراح قلب کے ساتھ، پورے عقل شعور کے ساتھ، پورے صحیح ادراک کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی ساری انسانیت کے لئے خیر ہے۔ کیوں ہمیں مجبور کرنا چاہتے ہو کہ دودھ اور شہد کے بھرے ہوئے گلاس چھوڑ کر تم ہمیں ناپاک پیشاب کے گلاس پلانا چاہتے ہو۔ ہم اس کے لئے تیار نہیں۔ عقل انسانی کے بنائے ہوئے یہ جمہور قوانین دراصل پیشاب کی طرح ناپاک ہیں جو ناپاک ہوا کرتا ہے اور وحیٔ الٰہی سے مرتب کردہ قانون دراصل دودھ اور شہد کا وہ گلاس ہے جو پاک اور صاف بھی ہے اور فطرت انسانی کے لئے موافق اور مفید بھی۔

پس ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے لئے وہی سسٹم، وہی نکاح صحیح ہے جو لے کر آئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے بھی ہم اپنے اس اعتقاد کے خلاف کسی بھی ایسی چیز کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم صاف سمجھتے ہیں کہ یونیفارم سیول کوڈ کا ہوّا ملک میں یک جہتی لانے کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمارے وجود کو مٹانے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ ہم با احساس و باضمیر اور حساس امت ہیں۔ ہم اپنے وجود کو مٹنے نہیں دیں گے۔ ہم ہر قیمت پر اپنے وجود، اپنی انفرادیت اور تشخص کی حفاظت کریں گے اور کسی قیمت پر یونیفارم سیول کوڈ کو جو ہے وہ اختیاری کا برقعہ اور نقاب پہن کر ہی کیوں نہ آئے قبول نہیں کریں گے۔ ہم انداز قدرت رانی شناس ہیں۔ تم جیسا بھی کپڑا پہن کر آؤ گے ہم تم کو تمہارے انداز قد سے پہچانتے ہیں یہ دراصل شریعت کو مسخ کرنے اور مٹانے اور مسلمانوں کے ذہنی تشخص کو مٹانے کی ایک عظیم جد و جہد ہے جس کا ہمیں بہر حال سامنا کرنا ہے۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت ہم اپنی مذہبی اور تہذیبی آزادی کو بھی اس ملک کی فلاح اور بقا کے لئے برقرار رکھنا ضروری

سمجھتے ہیں۔

یہ وہ حالات ہیں جن کی بنا پر ہمیں اپنے پورے شعور اور پورے احساس کے ساتھ اور صحیح فکر و ہمت کے ساتھ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے فیصلوں کا احترام کرتے ہوئے مکمل تعاون دینا چاہیئے اور پوری قربانی کے ساتھ ان کے ساتھ شریک ہونا چاہیئے۔

سب سے بڑی بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں جو شریعت ٹوٹتی ہے، ہم اپنے گھروں میں جو اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑتے ہیں وہ انتہائی غور طلب ہے۔ ذرا سوچنا چاہیئے کہ جس اللہ تعالیٰ نے مرد کو طلاق کا اختیار دیا اسی اللہ تعالیٰ نے مرد کو ایک سمجھدار مخلوق بنایا، قوّام بنایا، ذمہ دار بنایا، طلاق کب استعمال کی جائے کب نہیں کی جائے سوچ سمجھ کر کی جائے۔ یہ غیر متوازن رشتوں کو ختم کر کے نئے رشتے پیدا کرنے کا ذریعہ ہے یہ اپنے بیوی اور بچوں کو اچانک طلاق کا تیر مار کر زخمی کر دینے کے لئے نہیں ہے۔ ہماری یہ بے شعوری شریعت کے قوانین کی بدنامی کا ذریعہ بنتی ہے۔ شریعت نے نکاح کو سادہ رکھا مسجد میں نکاح پڑھا لو اور جا کر بیوی کو لے آؤ اور دوسرے دن چند احباب کو بلا کر جو میسر ہو، چاہے ایک پیالہ ستو ہی کیوں نہ ہو، ولیمہ کی سنت ادا کر دو۔ اس طریقے سے نکاح ہو جاتا ہے خواہ اخبار میں چھپے یا نہ چھپے، پچاس پچاس روپیئے کے دعوتی کارڈ تقسیم کریں یا نہ کریں، بریانی پکے یا نہ پکے۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہو گیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کا نکاح ہو گیا تھا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نکاح ہو گیا تھا، تمام سلف کا نکاح ہو گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم حیدرآباد اور بہار کے مسلمانوں کا نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک وہ لاکھوں روپیہ برباد نہ کر دیں جب تک اپنے کھیت نہ بیچ ڈالیں، جب تک اپنے مکانات فروخت نہ کر دیں، جب تک سودی مہاجنوں کے خونخوار پنجوں میں اپنے کو پھنسا نہ دیں۔ دوستو! یہ تو اسلامی طریقہ نہیں ہوا، یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں ہوا۔ اس کو تو آپ کو مٹانا ہو گا تاکہ لوگ آپ کو اسلامی طریقہ سے پہچانیں۔ اے لوگو! سارا قصہ تو پہچان کا ہے۔ شادی میں اگر گاجہ باجہ دیکھیں، Lighting دیکھیں، اگر ہنگامہ حشرات دیکھیں تو کہہ اٹھیں کہ یہ مسلمانوں کی برات نہیں ہے، یہ مسلمانوں کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔ یہ غلامان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی شادی کی تقریب نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے ہاں تقریب تو بڑی سادہ ہوتی ہے۔ مسجدوں میں بیٹھ گئے۔ نماز کے بعد آواز دے دی کہ لوگو فلاں کی بیٹی کا نکاح ہے اور امام صاحب کھڑے ہو کر چند قرآن کی آیتیں اور حدیث

پڑھیں۔ ایجاب وقبول کرایا۔ شام کو باپ نے بلا خود دولہا نے دلہن کو اپنے ساتھ گھر
لے لیا اور دوسرے دن شام کو جو میسر ہوا عزیزوں، دوستوں کو بلا کر ولیمہ کھلا دیا۔ یہ
شادی تو ہوتی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی۔ یہ جو کافروں والی شادیاں
ہو رہی ہیں، بڑے بڑے کارڈ چھپ رہے ہیں، گھروں میں بڑی بڑی دعوتیں ہو رہی ہیں،
مختلف رقص و سرود کی محفلیں جم رہی ہیں، جہاں گھوڑے جوڑے کے نام پر ہزار ہا روپے
لوگوں پر ... آپ کا ... بیان پر کیا کیا نہیں ہو رہا ہے۔

میرے عزیز دوستو اور بزرگو! جتنے لوگ آج یہاں بیٹھے ہیں خدا کی قسم اتنے
لوگ بھی عہد کر کے اٹھیں کہ ہم اپنے اور اپنے زیر اثر لوگوں میں ایسی بات نہ ہونے دیں گے۔ ہم
پہچان پیدا کریں گے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے امتی کے ہاں کی شادی ایسی نہیں ہوتی۔ یہ شادی دوسری امتوں کے ہاں کی ہو سکتی ہے۔
یہی ثقافت اور اتنی پہچان ہم پیدا کر دیں تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے بہت بڑے انقلابی کام کی بنیاد
ڈال دی۔ اتنا تو کر کے دیکھئے۔ اگر آپ کے پاس بیٹی ہے تو ڈرئیے مت۔ ایک بار اللہ تعالیٰ
پر اعتماد کر کے فیصلہ کر لیجئے کہ یا اللہ ہم تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف
اپنی بیٹی کا بیاہ نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انتظام ضرور فرما دیں گے ان شاء اللہ۔ ہاں تھوڑی
دیر آپ بیٹھے ضرور جاؤ گے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا ہے اور مہلت چاہو گے تو بیٹا بیاہ دیں گے، تب یہ عہد کریں
یہی لوگو! لینے کا پیمانہ کچھ اور، دینے کا پیمانہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عذاب تو
ناپ تول میں کمی بیشی کرنے والوں کے لئے ہے جب لیتے ہیں تو ناپ تول کر پورا پورا لیتے
ہیں بلکہ زیادہ لے لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں۔ تو بیٹی
کے بیاہ کے وقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یاد آئیں، مسجد یاد آئے
سنت کا طریقہ یاد آئے اور اپنے بیٹے کو بیاہتے وقت دنیا کی دولت لوٹنے کا خیال آئے
تو مطففین میں ہوں گے کہ جنہیں نہایت دردناک عذاب ہوگا۔ پس لوگو! آج توبہ
اور دعا اور ... کا فیصلہ کرو۔ شریعت محمدی کی حفاظت کے لئے اور اپنے
دین و اختیار کو باقی رکھنے کے لئے ہم کو جو بھی جنگ لڑنی پڑے، اپنے سماج کے
جنگ لڑنا پڑے یا باہر کے دشمنوں کی جنگ لڑنی پڑے ہم دونوں کے لئے اپنے
آپ کو تیار رکھیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری اور آپ کی مدد فرمائے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے

نظہر بولی

قسط دوم

مولانا محمد علی کے تعلیمی نظریات

قومی تحریکوں کے نتیجے میں قائم ہونے والی ان تعلیمی اداروں میں مناسب عمارتوں اور ضروری سامان کی قلت، سرمایہ کا فقدان، اور تربیت یافتہ کارکنوں اور اساتذہ کی کمیابی کا مسئلہ سامنے تھا۔ ان طالب علموں اور اساتذہ کو تعطیلات کے دوران اور کبھی کبھی کام کے دنوں میں بھی میں اور خصوصاً دیہی علاقوں کے لوگوں میں سیاسی پروپیگنڈہ کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی جاتی تھی مگر ان تمام دشواریوں کے باوجود قومی تعلیم کے اصولوں کی ترتیب، قومی ضرورتوں کے مطابق متوازی تعلیم نصاب کی تیاری اور جدید ہندوستانی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے استعمال کرنے کا کام مسلسل جاری رہا۔ مولانا محمد علی نے ہمدرد کے ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں قومی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

"جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خداپرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں۔"

انھوں نے اس مسئلہ پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے انگریزی اخبار کامریڈ میں لکھا

"یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ملت اسلامیہ کے لئے سب سے اہم ضرورت قومی تعلیم کی ہے۔ اس کی طرف ہندوستان کی تمام قوموں نے افسوسناک تغافل برتا ہے اور بنگلور میں ہونے والے جلسہ میں اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ پچاس سال قبل جب مسلمان سر سید احمد خان کے زیر اثر تھے تو تعلیم پر تسلط کی سخت نکتہ چینی کی گئی تھی اور پہلی بار تعلیم میں ترک موالات کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ اب ان کا فرض ہے کہ قومی تعلیم کی موجودہ صورت حال پر نظرثانی کریں۔

ایک بات بالکل واضح ہو چکی ہے۔ ہر چند کہ ہندوستان کی تمام قوموں کو اپنے نوجوانوں کی تعلیم کی وہ سمت اختیار کرنی چاہئے جو کہ ان کے لئے از بس ضروری ہے اور جس کو قومی تعلیم کہا جا سکتا ہے۔ یہ انفرادی قسم کی ہونا چاہیے جو کہ حکومت یا اس کے امدادی اداروں کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر قوم

ڈاکٹر نظہر دوزہ لیکچرر، جامعہ نگر، دہلی ۲۵

اپنے نوجوانوں کے لئے علاوہ سے تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیئے۔

مذہبی رواداری اور اخوت سے مختلف فرقوں میں باہمی یگانگت کا جذبہ استوار ہوسکتا ہے۔ تعلیم کا مقصد دلوں کو جوڑنا ہوتا ہے منافرت پیدا کرنا نہیں۔ مولانا محمد علی اس خصوصیت کو ملت اسلامیہ کا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے ... وہ لکھتے ہیں:

" اسلام نے دنیا کو مسلم و کافر دو طبقوں میں ضرور تسلیم کیا ہے لیکن اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ اپنی ملت کی محبت میں کوئی مسلمان اتنا سرشار ہوجائے کہ بنی آدم کے ساتھ انصاف کو یک قلم ترک کردے۔"

وہ سلسلۂ تحریر جاری رکھتے ہوئے اخوت و مساوات کے مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہیں اور رقم طراز ہیں:

" ایک مسلمان قوم پرور اور محب وطن اسی لئے کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جار کو تسلیم کیا ہے اور جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی ترجیح دی ہے وہ قومیت مشترک کے خلاف نہیں ہوسکتا اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی غلامی اسلام نے جائز نہیں رکھی خواہ وہ دنیوی امور میں غیر قوم کی غلامی ہو یا بادشاہوں کی غلامی پھر ہندوستان پھر شام یا مصر یا فلسطین میں ایک مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر غیر ملکیوں کی غلامی کے خلاف کیوں جنگ نہ کرے۔ بہرحالت میں غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی اسلام اور ایمان کے منافی ہے۔ حقیقتاً ایک مسلمان کے لئے حب الوطن من الایمان ہے ورنہ خاک پاک وطن مسلمان کے لئے استنجا کے ڈھیلے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی جو مثال محمد علی کے عصری حالات میں نظر آتی وہ حصول آزادی کے بعد تقریباً ناپید ہے۔ وہ اس اتحاد و یگانگت کے لئے قومی تعلیم کو ہی ذمہ دار ٹھیراتے ہیں۔

موجودہ اختلافات رنگ و نسل ذو وطن کی طرح عقائد کے اختلاف مٹنے والے ہیں بلکہ صحیح طریقہ پر تبلیغ و نشر اور تعلیم و تربیت سے مٹ سکتے ہیں اور سب انسان پھر بھائی بھائی ہوسکتے ہیں۔

تعلیم کے پیشہ پر کسی فرد یا کسی قوم کا اجارہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ شعبۂ حیات ہے جس میں فرد کو گفتار و کردار کی پوری آزادی ہونا چاہیئے۔ اگر تعلیم کو سمی بھر افراد اپنی خواہشات کا وسیلہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اصل میں وہ جمہور کے قاتل ہیں اور جمہور کا قتل انسانیت کے قتل کے مترادف ہوتا ہے۔ بقول اینی بسنٹ:

"تعلیم پر ہندوستانی کنٹرول سے مراد وہ تعلیم ہے جس پر کنٹرول ہندوستانیوں کا
جس کی تشکیل ہندوستانیوں نے کی ہو اور جس کا انتظام بھی ہندوستانی کرتے ہوں اس تعلیم
اپنے سامنے خدمت، حکومت اور اخلاق کے ہندوستانی آدرش رکھنے چاہئیں۔ اس میں ہندوستانی
روح سرایت ہونی چاہیے نہ کہ مخصوص مذاہب کی لفظی توجیہ۔ اس کی روح کشادہ، متحمل، روا
اور ہمہ گیر ہے اور تسلیم کرتی ہے کہ انسان خدا کے پاس مختلف راستوں سے پہونچے۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد کے پیچھے بھی مولانا محمد علی کا یہی نظریہ کارفرما تھا۔ انہوں نے اس ادارہ کے قیام اور بقا کے لئے خلافت کمیٹی کی طرف سے دس ہزار روپئے کی گرانقدر گرانٹ کی منظوری دی اور مختلف جگہوں پر جا جا کر اس کے لئے شبانہ روز چندہ اکٹھا کیا اور اس میں ۲ر اپریل سنہ ۲۱ء کو اپنی تقریر میں انہوں نے کہا:

"تم تعلیم چاہتے ہو، تم اعلیٰ تربیت کے خواستگار ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ سو کے تحت ہندوستان میں جاہل و ناتربیت یافتہ کا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ ہمیں تو اس سے بھی تعلیم کی ضرورت ہے جتنی کہ موجودہ گورنمنٹ کو اور مجھے اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ گورنمنٹ تعلیم کا ذوق کب سے پیدا ہو گیا ہے اور اس بات کو مسز بسنٹ بھی اسی وقت سے جا ہیں جب سے انہوں نے قومی کالجوں کی بنیاد ڈالی۔"

مولانا محمد علی اور اینی بسنٹ نے ہندوستانی عوام کو غیر ملکی نظام تعلیم کے خلاف نبرد ہونے کے لئے سعی پیہم کی اور ملک کے ہر گوشہ میں جا جا کر قومی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ علی انگریزی حکومت کی مٹھی میں تھا، یہاں مولانا محمد علی کو جو جدوجہد کرنا پڑی اس کا اندازہ کی ایک تقریر کے اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"میں نے علی گڑھ میں مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ ہمارے نوجوان جس وقت اسلام اور ملک کی آواز سنیں گے تو فوراً لبیک کہتے ہوئے اپنے اپنے کالجوں کو خیرباد کہہ دیں گے۔ میں علی گڑھ اور تقریریں کیں۔ مہاتما گاندھی اور شوکت علی نے بھی لڑکوں سے خطاب کیا۔ اس وقت ان کے چہروں کی درخشانی صاف اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ ہمارے نوجوان پر اعتماد ضرور نتائج رنگ لانے والا ہے۔ ہر لڑکا دعوت حق پر لبیک کہنے پر مستعد و آمادہ نظر آتا تھا۔ مگر افسوس مجھے زندگی میں ایک نیا سبق حاصل کرنا باقی تھا۔ مایوسی کا وقت وہ تھا جبکہ قول و فعل میں امتیاز کرنے کا وقت آپہونچا اور لڑکوں کا تمام جوش سرد ہونے لگا۔ یہی وہ سبق ہے جو مغربی تعلیم سکھاتی ہے کہ قول کچھ ہو اور فعل کچھ۔ اگر تعلیم یافتہ طبقہ موجودہ طرز تعلیم پر قانع ہے تو ہمیں اس کی پرواہ نہ

تعلیم کھو دیا وہ ملک کی ترقی کو روک نہیں سکتے اور اس لئے ہم اپنی تمام تر توجہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے عوام پر مبذول کئے ہوئے ہیں۔

مادری زبان میں تعلیم دینے کا مسئلہ عہد حاضر کا مسئلہ نہیں ہے۔ سودیشی تحریک کے بانیوں نے ہندوستان کے وسیع و عریض جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کی بوقلمونی کے پیش نظر بہت پہلے ہی اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم کے لئے مادری زبان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ تعلیم کے مذہبی پہلو کے بعد سب سے اہم پہلو ذریعۂ تعلیم کا ہوتا ہے۔ یہ کتنا مضحکہ خیز اور غلامانہ ذہنیت کا مظہر ہے کہ علم کی مختلف شاخوں میں ذریعۂ تعلیم کے لئے ایک غیر ملکی زبان کو اختیار کیا گیا۔ مولانا محمد علی نے ۲۷ اپریل ۱۹۲۱ء کو مدراس میں ایک تقریر کے دوران فرمایا تھا:

"ہمارے قومی تنزل کا یہ حال ہے کہ جس زبان کو ہم نے مشترکہ قرار دے رکھا ہے وہ ہماری آزادی کا طرۂ امتیاز نہیں (بلکہ) غلامی کا نشان تمیز ہے ... یہ اسکول نہیں جہاں تمہارے بچوں اور نوجوانوں کی ہمت و مردانگی میں زہر ملایا جاتا ہے۔ جہاں وہ غلاموں کے سانچے میں ڈھلتے ہیں اور "لیکون" کی گرفت میں پوری پوری طرح آجاتے ہیں۔ نہ صرف تمہارا جسم بلکہ یہ تعلیم تمہاری روح فنا کر رہی ہے۔"

ذریعۂ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کو اختیار کرنے پر مولانا محمد علی کو جو ذہنی اذیت اور روحانی کرب محسوس ہوتا تھا اس کا اظہار انھوں نے جا بجا اپنی تحریروں اور تقریروں میں مسلسل طور پر کیا ہے۔ ہمدرد کے ۱۹ جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں انھوں نے تحریر کیا:

"ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر کہ ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائیگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرق کے وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں پھنسے ہیں لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شمار ہے؟ کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھاتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا روسی زبان میں سکھاتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور ہماری بدبختی ملاحظہ کیجئے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ ہیں جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اچھی طرح نہیں جانتے جس طرح انگریز جانتے ہیں ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس جغرافیہ اور ریاضی انگریزی میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا محمد علی نے اپنے مرتبہ نصاب میں ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں بات پر خاص زور دیا

ہے وہ یہ کہ ذریعۂ تعلیم ہے۔ خود جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انھوں نے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا اور فرمایا کہ ہماری خواہش ہے کہ اکثر غیر زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے یا نامعقول اور غلامانہ طرز جس میں اجنبیت زبان کی وجہ سے طلبہ کے دماغ پر مسائل کا صحیح اور روشن نقش کبھی قائم نہیں ہوتا، قطعاً ترک کر دیا جائے۔ البتہ انھوں نے منزل ثانوی میں طلبہ کو اس امر کا اختیار دے دیا کہ وہ کوئی ایک مغربی زبان حاصل کریں اور امید ظاہر کی کہ دارین ثانوی میں تھوڑے عرصے کے بعد انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری مغربی زبانوں مثلاً فرانسیسی اور جرمن کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔

مغربی زبانوں کو منزل ثانوی میں اختیاری مضمون کی شکل میں حاصل کرنے کا مشورہ دیتے وقت مولانا محمد علی نے ایشیائی مشرقی زبانوں کے مطالعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ وہ کامریڈ ۲۳ جون ۱۹۲۶ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

پہلے تو علاقائی زبانوں کا علم اور پھر جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں ہندی کا اور جہاں اردو نہیں بولی جاتی ہے وہاں اردو کا مطالعہ ہونا چاہئے۔ یونیورسٹی سطح پر عربی و فارسی (زبان و ادب) کا ڈگری کی سطح تک بندوبست ہونا چاہئے۔

اردو زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی تجویز پیش کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

"ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ وجہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکے گی اور یہ کہ قوم جامعہ کو زیادہ سے زیادہ فنڈ فراہم کرے گی تاکہ جامعہ ہندوستان میں اور دوسری جگہ پر ایسے اساتذہ اور پروفیسروں کے دستے تیار کر سکے جو ان مضامین کو اردو کے ذریعہ پڑھانے کے اہل ہوں"

سائنس انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اہم رول ادا کرتی ہے کیونکہ اس کی بدولت انسان کو کائناتی نظام کی جزئیات کو سمجھنے اور تسخیر فطرت میں مدد ملتی ہے۔ یوں بھی تعلیم کا مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں حصہ لینے کے لائق بنانا ہے۔ ہندوستان کے مشہور سائنسداں سی وی رامن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ جون ۱۹۳۲ء میں سائنس کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

"میرا تو خیال ہے کہ تہذیب و تمدن کی خاطر سائنس کی سب سے بڑی، سب سے بہتر اور سب سے مستقل خدمت، تحکم و جبروت سے بغاوت، صداقت کی جستجو اور معقولیت کی حمایت رہی ہے اور آج یہاں ایک سائنسداں کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے میں آپ سے امر علم صداقت اور انسانی حریت کو ہمیشہ بلند رکھنے کی درخواست کرتا ہوں۔"

مولانا نے اپنے نصاب میں ادب اور تاریخ و فلسفہ کے ساتھ سائنس اور ٹیکنک کو اہم مضامین کے طور پر رائج کی تجویز کی اور کہا

"طلبہ نے مذہبی تعلیم حاصل کرلی، ذہنی اور دماغی نشو و نما بھی ہوگیا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش نظر رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی روزی خالص دماغی کام کے ذریعہ ہی کمانے پر مجبور نہ ہوں۔ کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کرسکیں جس میں جسمانی محنت سے روزی کما سکے اور جس میں بڑے سرمایہ کی حاجت نہ ہو مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی وغیرہ

مولانا محمد علی نے قوم کے فرزندوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کی غرض سے اپنے تعلیمی نصاب میں دستکاری کو لازمی مضمون کی حیثیت سے رائج کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی میں زیادہ دلچسپی لیں تو ان کی مجموعی اقتصادی حالت میں اصلاح ہوسکتی ہے اور نئی نسل کو عملی زندگی کے مقابلہ میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ انھوں نے علم ریاضی کی تعلیم کو بھی ریڑھ کی ہڈی سے تعبیر کیا اور اس کے مروجہ معیار کو ناکافی قرار دیا۔ ریاضی کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ اکثر بچوں کے دماغ پر ایسے پیچیدہ اور طولانی سوالات کے حل کرنے کا بار ڈال دیا جاتا ہے جن سے کہ عمر رسیدہ لوگوں کو بھی عملی زندگی میں شاذ و نادر ہی سابقہ پڑتا ہے

نقاشی کی ابتدائی تعلیم کو مدارس کے منزل اول میں شامل کیا گیا تاکہ بچے کے ہاتھ اور آنکھ کو تربیت ہو اور ان میں خوبصورتی و تناسب کا احساس ترقی پائے لیکن ثانوی سطح پر اس مضمون کو ایک اختیاری مضمون بنا دیا گیا۔

اسی طرح مولانا محمد علی نے اپنی تعلیمی نصاب میں صنعت و حرفت کی مجوزہ تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ اس سے گو تفریح و تفنن طبع کا سامان پیدا ہوتا ہے لیکن منزل اول میں چونکہ طلبا کی ایک بڑی تعداد زراعت پیشہ خاندان سے آئی ہوگی اس لئے تجویز پیش کی گئی کہ انھیں اس پیشہ سے متعلق علمی اور عملی دونوں طرح کی تعلیم دی جائے اور ساتھ ہی حفظان صحت کے ابتدائی اصولوں اور باغبانی وغیرہ کی ابتدائی تعلیم پر بھی زور دیا۔ چرخہ کتائی کو ملک کے سیاسی حالات اور تقاضوں کے پیش نظر لازمی قرار دیا

نجاری، لوہاری، معماری، رنگ سازی، پارچہ بافی، سیاہی، [illegible]، آہنگری، حجامی، جلد سازی، چرم سازی وغیرہ ایسے فنون کو بھی داخل نصاب کیا گیا۔ طالب علم کو پندرہ سال کے سن میں کسی نہ کسی ایک پیشہ کو سیکھنے پر مشغول کیا گیا تاکہ چند سال میں وقتی بے معاشی اور [illegible] سے نجات ہو۔ اس قسم کی دیگر چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کی تمنا ہی سے طلبہ کی فکر خلاصی ہوجائے تعلیم یافتہ طبقہ اپنی غلامانہ دست نگری [illegible] دستور عام پر محمول نہ کرسکے۔

علی گڑھ یونیورسٹی — ایک نیا موڑ

خدابخش ویڈیو کلکشن کے لیے وائس چانسلر سید ہاشم علی کا ایک تاریخی انٹرویو

آپ کو شاید معلوم ہو میں انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کا آدمی تھا۔ آندھرا پردیش گورنمنٹ م[illegible] پرنسپل سکریٹری کے طور پر کام کر رہا تھا کہ مجھے عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ آفر کیا۔ میں نے قبول کر لیا۔ وہاں میں ڈھائی سال رہا۔ جس وقت میں نے جائزہ لیا تھا تو بالکل افراتفری کی [illegible] تھی۔ لڑکوں کے گروہ کیمپس میں پھرا کرتے تھے۔ نہ کلاس کرنے کی گنجائش تھی اور نہ ا[illegible] اپنے کو پوری طرح محفوظ سمجھتے تھے۔ امتحانوں کا حال یہ تھا کہ لوگ کتابیں لے آتے اور نقلیں کر[illegible] اور عثمانیہ یونیورسٹی کے بارے میں یہ ہو گیا تھا کہ اخبارات میں اشتہارات اس طرح آتے تھے عثمانیہ کے گریجویٹ براہ کرم درخواست نہ دیں۔

اُستاد کی عظمت کی بازیافت

جائزہ لینے کے بعد مجھے اس صورت حال کو درست کر[illegible] دس مہینے لگے اور جب میں نے یونیورسٹی چھوڑی تو اس کے بار[illegible] میں کہہ سکتا ہوں کہ میں استاد کی وقعت کو دوبارہ واپس لے آیا تھا، اور امتحان کی پاکیزگی بھی اپنی جگہ و[illegible] آ چکی تھی، یونیورسٹی کو میں نے جیسا پایا تھا جب میں نے اسے چھوڑا تو دونوں میں پورا فرق ہو چکا تھا [illegible] برابر ہونے لگی تھیں اور تعلیم و تعلم کا ایک ماحول قائم ہو چکا تھا۔ لیکن میں اس تکلیف اٹھا چکا تھا کہ جب [illegible] کا آفر مجھے آیا تو میں نے 'چار ہفتہ' زبانی طور سے جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے انکار کیا۔ لیکن ج[illegible] یہاں کورٹ میں [illegible] سنانے کہ [illegible] وہ ولی میں [illegible] خوب سمجھ لیے [illegible] تو مجھ پر ہر طرف سے دباؤ پڑ[illegible] لگا، ایجوکیشن منسٹر نے مجھے بلا کر کہا [illegible] ۱۸ اپریل کو ان سے ملا اور انھوں نے مجھ سے کہا، [illegible] دن جائزہ [illegible] اس لئے کہ میرے پیشرو حامد صاحب کے جانے کے بعد سے [illegible]

خبرنامہ خدابخش لائبریری پٹنہ

ہونے لگی تھی اور میرے آنے تک وہ گیارہ دن کا وقفہ ہو چکا تھا۔ جس استاد کو [illegible] بھیجے گئے [illegible] جب اس طرح کہا گیا تو میں نے حیدرآباد سے ۲۰ اپریل کو یہاں آکر چارج لے لیا۔ مجھ کو میں نے [illegible] میں [illegible] کا بہت [illegible] دیکھ چکا تھا [illegible] ہوا کرتا کہ سب سے پہلے

طلباء سے رابطہ

لڑکوں سے رابطہ ضروری ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں چھ سات ہال ہیں اور ہر ہال میں ایک ایک ہزار کے قریب طلباء ہوتے ہیں۔ ہر ہال [illegible] طلباء [illegible] میں نے ان کے ساتھ [illegible] شام کو دو دو تین تین گھنٹے گزارے۔ بڑی تعداد میں تقریریں سنتا تھا اور خود بھی اپنی بات ان کے سامنے رکھ دیتا تھا [illegible] انڈر سٹینڈنگ ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا کوئی شاعر ہے تو اپنا کلام سنائے، کوئی گویا ہے تو گانا سنائے۔ اس طرح تیزی سے ایک غیر رسمی تعلق ہم میں قائم ہوتا چلا گیا۔ چودہ دن میں میں نے چودہ ہزار لڑکوں سے ملاقات کرلی۔ اور اس کے بعد سے آج تک لڑکوں سے میرے [illegible] انتہائی اچھے درجے کے تعلقات ہیں۔ جہاں بھی انہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے سیدھے میرے پاس آتے ہیں اور معمولی [illegible] یا میں بھی وہ مجھ سے کہہ دیتے ہیں۔ اگر [illegible] کوشش کرتا ہوں کہ ان کی تکلیفیں جلد سے جلد دور ہو جائیں۔ مثلاً یہاں جو ہوسٹل [illegible] ہیں [illegible] ان میں پنکھے ہیں

ہر کمرے میں پنکھا

لیکن جو پرانے ہوسٹل تھے ان میں کسی کمرے میں پنکھا نہیں تھا تو میں نے ایک دس ہزار [illegible] منظور کئے تاکہ ہر کمرے میں ایک پنکھا لگ جائے [illegible] پاس بعض کمرے ایسے [illegible] بڑے کمرے [illegible] ایسے [illegible] کمرے [illegible] ہر کمرے میں پنکھا موجود ہے

بہتر کینٹین

مجھے بتایا گیا کہ کھانے کے لئے یونیورسٹی کا کوئی کینٹین نہیں ہے [illegible] میں نے [illegible] کینٹین [illegible] کی کوشش کی ہے [illegible] دیکھیں گے [illegible] کینٹین [illegible] اس میں [illegible] آف [illegible] کھانا [illegible] کہ بہتر [illegible] کا کھانا [illegible] آف دی [illegible] ایسا اچھا ہے کہ یونیورسٹی کا طالب علم [illegible] نجات پا سکے [illegible] طلباء کا [illegible] پڑتا ہے [illegible]

ڈائننگ ہال کچھر

ڈائننگ ہال کچرا وہ آجکل کسی وجہ سے نہیں چل ممکن رہا ہے۔ لوگ ڈائننگ ہال میں شریک نہیں ہوتے۔ میں اسے کارآمد بنانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس سلسلے کی کچھ سہولتیں ابھی ہمیں میسر نہیں ہیں، جیسے بعض بڑے ہال تو بن گئے ہیں لیکن ڈائننگ ہال ان کے پاس چھوٹے ہیں۔

امن اور تعلیم

دوسرا کام یہ ہے کہ جب سکون ہو جائے اور کیمپس پر امن رہے تو ہم تعلیم ممکن ہے اور اس کے بعد آپ اکیڈیمک ایکسیلنس کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ تو پچھلے سال میری کوشش یہ رہی کہ لڑکوں سے انڈرسٹینڈنگ پیدا کروں تاکہ وہ جو غلط فہمی کے سبب اور دوسرے مسائل کے سبب باتیں ہیں، وہ دور ہو جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ عثمانیہ کے ساتھ اگر مقابلہ کریں تو علی گڑھ کے بچے بہت زیادہ اچھے، مہذب، خوش اخلاق اور پیار کے قابل بچے تھے۔

سیاست خارج بتعلیم داخل

میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جو امن بڑی مشکل سے دس سال کے بعد حاصل ہوا ہے اس کو اگر کوئی شخص خراب کرنے کی کوشش کرے گا میں سخت کارروائی کروں گا۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ آٹھ سال میں کانوکیشن ہوا۔ اب میں نے پرائم منسٹر کو لکھا ہے اور آغا خاں کو بھی لکھا ہے کہ اگر وہ کانوکیشن کے زمانے میں آسکیں تو یونیورسٹی ان کو ڈگری دے گی ورنہ وہ کسی وقت بھی آئیں تو انھیں خوش آمدید کہا جائے گا۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ آئیں گے۔ کانوکیشن فروری مارچ میں ہوگا۔ تو آپ دوسرے سال کو شروع کرنے کے بعد میری اپنی خواہش یہ ہے کہ اب ہم اکیڈیمک ایکسیلنس کے لئے کوشش کریں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو تعلیم ہوتی رہی ہے اس میں لڑکے جس کمپیٹیشن کی دنیا میں ہیں ان میں اس کے لئے وہ اپنے کو پوری طرح تیار نہیں کرتے۔ جب تک لڑکے سخت محنت نہ کریں، اور میں کہتا ہوں مسلمان لڑکے کسی طرح کسی اور سے پیچھے نہیں ہیں، اور صرف ان کو محنت کرنی ہے اور خلوص نیت سے اپنی تعلیم حاصل کرنی ہے، لیکن کچھ لڑکے ایسے بھی آتے ہیں کہ ایجی ٹیشن اور پولیٹیکل ٹریننگ کے لئے آتے ہیں، یہاں پر گڑبڑ کرتے ہیں اور بدقسمتی سے پولیٹیکل پارٹیاں ان تمام ایسے لڑکوں کو جن کو یہاں سے خارج کیا گیا یا جنہوں نے یہاں پر فساد کیا ایسے سب لڑکوں کو الیکشن میں ٹکٹ دیتی ہیں اس وجہ سے کہ امن کو خراب کرنے اور یونیورسٹی کے حالات کو بگاڑنے والوں کو انعامات اور اعزازات ملتے رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الیکشن میں یونیورسٹی میں سب سے اچھا لڑکا الیکٹ ہونے کے بجائے ایسے لڑکے آنے لگے جو یا تو کرمنل بیکنگ رکھتے تھے یا خود کرمنل تھے اس وجہ سے یہاں کا ماحول خراب ہوا۔

یونین میں بہترین طلباء آئیں گے

یونین کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں پیسہ انوالوڈ Involved ہے کیونکہ لوگ اس پیسہ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ میں نے برسوں کے بعد یونین کے اکاؤنٹ کی آڈٹ کرائی جو مدت دراز سے نہیں ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہاں حسابات کبھی نہیں ہوتے تھے اور جو پیسے یونین میں آتے تھے ان کو بری طرح سے خرچ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں نے یہ خیال کیا کہ ہمیں ایک ایسا ریفارم لانا چاہئے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا جو پریسیڈنٹ ہو وہ علی گڑھ کا بہترین لڑکا ہو، نہ کہ سب سے بڑا غنڈہ۔ میں یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں تو اس کے لئے میں نے آرڈر پاس کیا کہ ایسے لوگ جو کبھی بھی امتحان میں فیل ہوئے ہوں یا ایسے لوگ جو کالج چھوڑ کے جا چکے ہوں، پھر صرف صدارت کے لئے واپس آئے ہوں وہ نہ ہو سکیں اور یونیورسٹی کے جو بہترین لڑکے جونیئر لوگوں میں سے موجود ہیں جو ریگولر تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان میں سے بہترین لڑکا انتخاب کیا جائے۔ جونیئر کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ یہاں لڑکے دس دس بارہ بارہ سال بھی پڑھ رہے ہیں: یہ ڈگری لی، اس کے بعد وہ ڈگری، پھر کوئی اور ڈگری۔ تو اس طرح بہترین لڑکا الیکشن لڑ سکے گا۔ پچھلے سال جب میں دل کے آپریشن کے لئے امریکہ گیا تو اس سے پہلے یہ قانون جاری کر دیا تھا الیکشن آفیسر مقرر کر دیا تھا اور جب آپریشن کے بعد پہلا خط میں نے پرو وائس چانسلر کو لکھا ان سے پوچھا الیکشن ہو گیا یا نہیں، معلوم ہوا بدقسمتی سے کسی غلط فہمی کی بنا پر الیکشن نہیں ہو سکا اور مجھے افسوس ہے کہ پچھلے سال میں چاہتا تھا مگر میرے یہاں موجود نہ ہونے کے سبب الیکشن نہ ہو سکا۔ اس سال الیکشن ہوگا اور میری کوشش ہوگی کہ لڑکوں کو چیلنج کروں کہ ہندوستان کے عوام نے اپنے حکمرانوں کو ٹھکرایا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو واپس لاتے ہیں۔ تو جب ہندوستان کے ان پڑھ عوام کر سکتے ہیں تو میں لڑکوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ علی گڑھ کا ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکا کس طرح اپنا نمائندہ منتخب کرتا ہے اور مجھ سے اکثر لڑکوں نے کہا ہے کہ ہم آپ کا چیلنج قبول کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور اپنا بہترین نمائندہ منتخب کر کے دکھائیں گے۔ تو اب یہ احساس طلبہ کو ہو گیا ہے کہ تعلیم حاصل کر کے وہ کیا بن سکیں گے۔

آپ پولیس انسپکٹر نہیں بن سکیں، ایس۔ پی اور ڈی۔ ایم ضرور بن سکیں گے۔

ایک چیز میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں لڑکوں میں ایک قسم کی بیزاری سی ہے۔ پوچھا، آئی۔ اے۔ ایس میں بیٹھے؟ کہا، کون بیٹھتا! تو کیوں محنت کی ہے؟ کہا کون پڑھے!

ایم فل کا بڑا ذہین لڑکا تھا اور کسی پوسٹ میں گیا وہ یہاں کے ہوسٹل جرنل کے ایڈیٹر ہی کی طرح تھا وہ لڑکا اس جرنل کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا آپ آئی۔ اے۔ ایس میں کیوں نہیں بیٹھے؟ کیا سوچتے ہو اپنی زندگی کے بارے میں؟ اس نے کہا کبھی سوچا نہیں۔ پھر کہنے لگا کبھی نے پوچھا بھی نہیں۔

[...]س کے بعد آپ نے بڑی دلچسپ بات کہی۔ کہنے لگا صاحب دس سال سے یہاں ہوں لیکن کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ بیٹا پڑھو۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے بچوں میں ایک نا امیدی کا احساس ہے۔ شاید وہ جو پہلا سسٹم تھا اس سے وہ مایوس ہو چکے تھے کہ کوئی انصاف نہیں ہے۔ میں لڑکوں سے جب بھی ملتا ہوں ان کے بارے میں پوچھتا ہوں کہ آپ اپنے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ جو اعلیٰ عہدے ہیں ان کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور اعلیٰ عہدوں کے تحت جو امتحان ہوتے ہیں وہ فیئر ہوتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سب انسپکٹر پولیس نہ بن سکیں لیکن آپ آئی۔پی۔ایس بن سکیں گے، آئی۔اے۔ایس بن سکیں گے، بشرطیکہ آپ محنت کریں۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا ہے، ایک سال کے اندر لڑکوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ ہم کو اپنے لئے آگے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ کل یہاں ایک استاد آئے، وہ کہہ رہے تھے، اب بچوں کی آنکھوں میں چمک سی ہے، امید ہے، کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔

کوچنگ کے لئے بہتر سہولتیں

سوال: اس مسئلہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ مقابلہ کے امتحانوں میں شرکت کے لئے علی گڑھ کوچنگ سے فائدہ اٹھانے کے لئے باہر کے طلباء یہاں آئیں تو ان کے ٹھہرنے کی سہولتیں نہیں ہیں۔

میں خاموش نہیں رہا ہوں۔ میں نے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کو پچاس کروڑ کے ایک ہوسٹل کی اسکیم بھیجی ہے۔ اس کے ساتھ ڈائننگ ہال، لائبریری وغیرہ۔ یو جی سی کو بھی اسی کام کے لئے ایک اسکیم بھیج رہا ہوں کہ پچاس کمرے مزید وہ کر سکیں تو ہم کو یہ دونوں طرف سے اگر منظوری مل جائے تو صرف لڑکوں کے لئے ٹھہرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ اور یہ فضول لڑکوں کے لئے نہیں ہوگا۔ اس میں ایسے ہی لڑکوں کے لئے رہنے کی اجازت ہوگی جو ایک پہلے ٹیسٹ میں کامیاب ہو جائیں اور واقعی صحیح طور پڑھنا چاہیں، ورنہ تو ہر ایک اس ہوسٹل میں رہنے کے لئے کہے گا کہ میں آل انڈیا سروسز کے مقابلے میں بیٹھ رہا ہوں۔ تو پہلے ان کا ٹسٹ ہوگا، جو سلیکشن میں آئیں گے ان ہی کو ٹریننگ دی جائے گی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی جگہ ایسا نہیں ہوا ہے، یہ اس سلسلے کی پہلی کوشش ہوگی۔

سسٹم سے مایوسی نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہم کو سسٹم سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سسٹم میں کچھ لوگ برے ہوتے ہیں لیکن ہندوستان میں سیول سروسز میں میں بھی رہا ہوں، بہت سے لوگ شریف اچھے لوگ ہیں۔ چند لوگ ضرور نقصان پہنچانے کی سوچتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ نیک لوگوں کی تائید کریں، ان کی طاقت بڑھائیں اور کمزور لوگوں کو کمزور کریں، ان کو ایکسپوز کریں، بتائیں کہ یہ لوگ ہیں جو انصاف نہیں کرتے۔

کمیونلزم کیا ہے؟

ہمارے ملکوں میں بھی اور عام طور سے مسلمانوں میں سیکولرزم کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہے۔ میری اپنی ڈیفنیشن (تعریف) کمیونلزم کی یہ ہے کہ اپنی قوم کے لئے یا اپنے فرقہ، اپنی کاسٹ کے لئے ان کی ترقی کی کوشش کرنا کمیونلزم نہیں ہے بلکہ دوسرے کو گرانے کی کوشش کرنا کمیونلزم ہے۔ اپنے ڈیمانڈس (مطالبے) پیش کرنا کمیونلزم نہیں ہے بلکہ دوسرے کے ڈیمانڈس کو رد کرنا اس کی مخالفت کرنا کمیونلزم ہے اس میں ریجنلزم (علاقائیت) بھی شامل ہے کمیونلزم بھی شامل ہے، کاسٹ ازم بھی شامل ہے۔ وہ ہندوستانی جو کسی دوسرے ہندوستانی سے کسی فرق کی بناء پر اس سے ناانصافی کرے وہ کمیونلسٹ ہے۔

سیکولرزم کیا ہے؟

سیکولرزم یہ ہے کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہاں ہم مائنارٹی (اقلیت) میں ہیں اور جب ہم توقع کرتے ہیں کہ ہماری کتاب کی، ہمارے مذہب کی، ہمارے کردار کی، کلچر کی عزت کی جائے ــــ تو ہمیں عزت دوسروں کی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ تو نہیں کر سکتے کہ ہماری عزت کرو اور ہم خود دوسرے کی عزت نہ کریں۔ ایک دوسرے کی عزت، یہی اصل سیکولرزم ہے کہ دوسروں کو بھی قابل عزت سمجھا جائے، اور کسی کو کمتر نہ سمجھا جائے اور انصاف کیا جائے اور ہماری تو بنیادی تعلیمات میں یہ ہے کہ خبردار کسی قوم سے نفرت بھی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کر دے۔ اور یہ کہ انصاف کرو چاہے اس سے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ جب اتنی اونچی تعلیم کے بارے میں ہم بات کرتے ہیں تو ہمیں اس پر عمل بھی کرنا چاہئے۔ تو میں سمجھتا ہوں اگر ہمارے لڑکے محنت کریں تو وہ کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ خود میری زندگی یہی ہے، میں نے محنت کی عادت ڈالی اور میرے لئے دروازے کھلنے لگے۔ نہ میں نے عثمانیہ کی چانسلری مانگی تھی، نہ پھر یہاں کی۔ بس میں نے پہلے جو کام کیا تھا، اس کی قدر ہوئی۔ اگر نہیں کرتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے لڑکوں کو مایوس نہیں ہونا چاہئے، انہیں سخت محنت کرنی چاہئے، انہیں یہ جاننا چاہئے کہ معیار کو ایکسلنس (بہترین لیاقت) پیدا کرنی ہوتی ہے۔ کیونکہ جو کمپیٹیشن اس وقت ہوتا ہے وہ اتنا سخت ہے کہ اس میں بغیر ایکسلنس کے کام نہیں چلتا۔

اب آپ داخلوں کا ہی دیکھیں۔ مثلاً پہلے پولی ٹکنک میں عام طور سے سکنڈ کلاس لڑکے آتے تھے۔ اب اس میں داخلے کے لئے بھی سینکڑوں فرسٹ کلاس چلے آتے ہیں۔ آج ہی میں نے لسٹ آخری شکل دیکھی ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ۷۸٪ پر آخری پائنٹ آ کے رک جاتا ہے۔ تو جب تک ایکسلنس کی بات نہ ہو گی کچھ نہ ہو گا۔ جو لوگ ایجی ٹیشن کرتے رہتے ہیں، انہیں یہ سمجھنا چاہئے خدا محنت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے، کاہلوں کا ساتھ نہیں دیتا! بلکہ محنت اصل چیز ہے!!

اساتذہ کم از کم چھ گھنٹے رہنمائی کریں

سوال: تدریس اور ریسرچ کا معیار گر رہا ہے۔ اساتذہ کا کام ایک تو تدریس ہے، دوسرے ریسرچ۔ ان دونوں پہلوؤں کی طرف آپ کیا توجہ فرما رہے ہیں؟

میں نے پچھلے سال ایک حکم جاری کیا تھا کہ اساتذہ چھ گھنٹے تک شعبوں میں رہیں۔ یہ اس لئے کہ لڑکوں کی شکایت یہ تھی کہ انہیں اساتذہ سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ کلاس کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ میرے اس اقدام پر کچھ لوگوں کے اعتراضات ہوئے، میں نے ان کے جوابات دئیے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اچھے لوگ تو عام طور پر چھ گھنٹے سے بھی زیادہ شعبے میں رہتے ہیں، لیکن جو لوگ کام نہیں کرتے ان کے لئے میں نے چند اقدامات کئے ہیں: پہلے تو یہ کہ اس سال سے میں نے ہر فیکلٹی کے سارے پروفیسرز، ریڈرز، لکچررز سے ملاقاتیں کی ہیں، ان سب سے دو ڈھائی گھنٹے ملتا ہوں ان سے جوابات کرتا ہوں اس کے نوٹس لیتا ہوں، ان پر ایکشن لیتا ہوں۔ اور دوسرا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ جو سینئیر پروفیسرز ہیں وہ اگر صدر شعبہ یا ڈین ہیں، چونکہ یونیورسٹی میں فیکشن اور گروپ ہوتے ہیں، تو ان سے میری درخواست یہی ہوتی ہے کہ جب آپ کو کوئی عہدہ ملے تو اس کے بعد آپ اپنے کو اس فیکشن کا نہیں اس شعبے کا صدر سمجھیں تبھی، اور آپ سے انصاف ملے گا۔ دوسرے یہ کہ بڑا پروفیسر اگر وہ قابل ہے تو اس کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ جب وہ ہٹے تو دوسرا اہل آدمی اس کی جگہ لینے کے لئے موجود ہو، اس میں اس کی کامیابی ہے۔ تیسرے یہ کہ جو نوجوان اساتذہ ہیں ان کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کو کام نہیں کرنے دیا جاتا۔ تو میں شخصی طور پر ایسے لوگوں سے ملتا ہوں۔ وہ میرے پاس آتے ہیں۔ کل ہی ایک نوجوان استاد میرے پاس آئے۔ انھوں نے اپنے مسائل بتائے۔ میں اس شعبے کے چیرمن کو لکھ رہا ہوں کہ اس نوجوان کو آپ نے یہ سہولتیں جو نہیں دی ہیں فوراً دیدیجئے۔

اکیڈیمک مانیٹرنگ کمیشن

تو ایک تو یہ ہے کہ میں سب سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ پچھلے سال میں ۲۶ شعبوں کے اساتذہ سے جاکر خود ملا، بقیہ سے اس سال۔ شائد ہی کسی وائس چانسلر نے ایسا کیا ہو۔ میں ہر فیکلٹی ممبر سے مل رہا ہوں۔ پھر یہ کہ میں نے ایک خاکہ بنایا ہے لیکن ابھی آرڈر نہیں کیا ہے کہ ایک اکیڈیمک مانیٹرنگ کمیشن بناؤں، جس کا صدر میں ہوں گا، پرو وائس چانسلر رہیں گے اور بارہ سینئیر اساتذہ۔ ان میں سے کوئی دو تین کسی بھی ڈپارٹمنٹ کو، کسی بھی کالج کو چلے جائیں گے اور جیسے ہی وہ وہاں پہنچیں گے وہاں کا چیرمن/ڈین/پرنسپل ان کے ساتھ ہو جائے گا اب یہ جیسے دیکھیں گے کہ کلاس کیسی ہو رہی ہیں، نوٹس کیسے تیار ہو رہے ہیں، ریسرچ کا کیا

باقی صفحہ ۶۳ پر

قاضی جلیل احمد

طاقت

دورِ حاضر میں طاقت کا لفظ اتنے مختلف النوع اور گوناگوں مواقع کے اظہار کے لئے استعمال ہونے کے باوجود بظاہر اس کی صحیح پہچان کے لئے کسی بھی تعریف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندازِ قدرے ہر شخص اس حد تک کما حقہ طور پر واقف ہے کہ وہ چاہے کسی رنگ اور کسی لباس میں سامنے آئے اس کی پہچان میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ مثلاً بھاپ کی طاقت، بجلی کی طاقت، جسمانی طاقت، روحانی طاقت، حکومت کی طاقت، حق اور سچائی کی طاقت وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام طاقتوں میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے اپنی مرضی کو دوسرے پر مسلط کرنے کی اہلیت اور قابلیت۔ بھاپ اور بجلی کی طاقت سے کلیں اور کارخانے چلائے جاتے ہیں۔ کلوں اور کارخانوں کی خاصیت طبعی سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ بھاپ اور بجلی انھیں ان کی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنی جسمانی طاقت سے طاقتور لوگ اپنے سے کمزور لوگوں کو کوئی کام کرنے یا کسی کام کے کرنے سے باز رہنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہی حال کسی بھی اور طاقت کا ہے۔ یہاں تک کہ علم طبیعیات میں بھی طاقت کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً نیوٹن کا پہلا کلیہ یہ ہے کہ ہر شے حالتِ سکون میں رہتی ہے یا ہموار رفتار کے ساتھ حرکت کرتی رہتی ہے تا آنکہ طاقت کے ذریعے اس کے سکون کو حرکت یا اس کی حرکت کو سکون میں تبدیل کر دیا جائے۔ یعنی یہاں بھی طاقتور کی مرضی کو دوسرے پر مسلط کرنے کی قابلیت طاقت کی پہچان قرار پائی ہے لیکن اس مختصر سے مضمون میں ہم علم طبیعیات سے صرف نظر کر کے اپنے آپ کو صرف انسان ہی کی حد تک محدود رکھیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ انسان کو اپنی مرضی دوسرے پر مسلط کرنے کی طاقت کہاں سے حاصل ہوتی ہے اور انسان انھیں کن ذرائع

۶۔ کولسٹن روڈ۔ فاریسٹ گیٹ۔ لندن ای/۷ (انگلینڈ)

کی مدد سے اپنے استعمال میں لاتا ہے اور کیا طاقت کے مقابلے میں جوابی طاقت کا ظہور کسی قاعدہ کلیہ کے تحت عمل میں آتا ہے۔

طاقت کے سرچشمے تین ہیں۔ شخصیت، جائیداد جس میں منقولہ اور غیر منقولہ دونوں شامل ہیں اور تنظیم جس کو انگریزی میں ORGANISATION کہتے ہیں۔ عام طور پر طاقت کے یہ تینوں منبع اکثر [illegible] کے ساتھ مخلوط حالت ہی میں ملتے ہیں۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، قائدِ اعظم جناح اور حیدرآباد کی حد تک نواب بہادر یار جنگ انتہائی عظیم اور مقناطیسی شخصیتوں کے مالک تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس مقام اور مرتبہ کو نہیں پہنچ پاتا اگر انھیں ان کی متعلقہ تنظیموں کی مدد حاصل نہ ہوتی۔ پنڈت نہرو اور گاندھی نے کانگریس کو ایک ہندوستان گیر ادارہ میں تبدیل کیا۔ جناح نے مسلم لیگ جیسے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور سب جانتے ہیں کہ بہادر یار جنگ کی آمد سے پہلے مجلس اتحاد المسلمین ایک بے جان ادارہ تھا اور بہادر یار جنگ نے اس میں زندگی کی وہ لہر دوڑائی کہ ان کے بعد سے آنے والے گمنام اور بے جان لیڈر بھی اس ادارے کے سہارے حیدرآباد کے سیاسی افق پر ستاروں کی طرح چمکتے رہے۔ اس کے برخلاف جناح کی سحرکار شخصیت نے پاکستان بنایا لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جناح کو چونکہ اس ادارے نے الگ کر دیا جو حکومت پاکستان کہلاتا ہے اور جناح کو کوئٹہ کے قریب زیارت کی بلندیوں پر موت اور حیات کی گھڑیاں گننے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ یہی حال ہندوستان میں گاندھی جی کا ہوا۔

بہ الفاظ دیگر شخصیت، جائیداد اور تنظیم کی اس تکون میں جب دو عوامل اکٹھا ہو جاتے ہیں تو تیسرے کو ہار ماننی پڑتی ہے۔ شخصیت کے بغیر تنظیم اور جائیداد دونوں بے جان ہیں لیکن جب ایک سحرکار شخصیت کسی تنظیم میں جان ڈال دیتی ہے تو پھر جائیداد کی مدد سے وہی تنظیم اتنی طاقت حاصل کر لیتی ہے کہ ان سحرکار شخصیتوں کو بھی پرکاہ کی طرح نکال پھینکنے پر قادر ہو جاتی ہے۔

مطور بالا سے شخصیت اور تنظیم کی اہمیت پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔ ذیل میں طاقت کے حصول میں جائیداد کی اہمیت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل شخصیت کے بعد جائیداد جس میں روپیہ، پیسہ، زر و جواہر، زمین، جنگلات، معدنیات وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے دنیا میں طاقت کی سب سے قدیم اساس ہے

جب انسان نے وحشیوں کی زندگی سے تمدن کی طرف قدم بڑھایا تو بعض لوگوں کے پاس
ن کی ضرورت سے کچھ زیادہ اشیاء پس انداز ہونے لگیں جن کے ذریعے وہ لوگ دوسروں
کی احتیاج پوری کر کے ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینے کے قابل ہوئے اور اس طرح
نیا میں سرمایہ کی بنیاد پڑی۔ سرمائے کے بغیر اول تو کوئی تنظیم (ORGANIZATION) وجود
ں میں نہیں آسکتی اور اگر ہنگامی حالات میں ایسا ہونا ممکن بھی ہو جائے تو وہ زیادہ دیر
ے قائم نہیں رہ سکتی۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادیٔ ہند میں انگریزی راج کو ایک
بیت یافتہ منظم فوج کی مدد حاصل تھی اور جس کے پاس اعلیٰ قسم کا سامانِ جنگ اور رسد کی
فر مقدار موجود تھی وہاں بے چارے بوڑھے بہادر شاہ کا خزانہ خالی تھا اور فوج کے
س سامانِ رسد تو کجا اتنا گولہ بارود بھی نہ تھا کہ دشمن کے حملے کا موثر جواب دیا جا سکتا۔
یجہ ظاہر تھا انھی انگریزوں کے تربیت یافتہ سپاہی دیکھتے ہی دیکھتے ایک غیر منظم بھیڑ
رغول میں بدل گئے۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم برتر تنظیم، اعلیٰ درجہ کی ٹریننگ اور
الی جرأت اور بہادری کے باوجود جرمنی اور جاپان کی فوجوں کو اتحادیوں کے بے پایاں
اشی وسائل کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔

سطور بالا میں طاقت کے سرچشموں کا ذکر کیا گیا۔ اب ذیل میں طاقت کے
تعمال کے ذرائع پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے گی۔ طاقت کے استعمال کا سب سے
ہم اور موثر ذریعہ سزا اور تعزیر ہے۔ اسکولوں میں بید کشی سے لے کر فوجداری اور
زیرات کے قوانین اور ضوابط اور انھیں روبہ کار لانے کے لئے عدالتیں، پولیس اور
یح یہ سب وہ ذرائع ہیں جن سے سوسائٹی اپنی مرضی اُن افراد پر مسلط کرنے کی کوشش
تی ہے جو اس کی طاقت کو للکارنے کی جرأت کرتے ہیں۔ زمانہ حال میں اس کی سب سے
یاں مثال پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کا وہ دورِ حکومت ہے جنھوں نے اپنے مخالفین پر
سر بازار کوڑے برسا برسا کر انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کی۔ لیکن
یاء الحق کی یہ کوشش مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں کوئی منفرد حادثہ نہیں ہے بلکہ ان واقعات
سے یہاں کی تاریخ بھری پڑی ہے جس کے پس منظر میں بیک گراونڈ موسیقی کی طرح منادی
سنے والوں کے یہ الفاظ گونجتے رہتے ہیں:

"جو کوئی اس حکم کی تعمیل سے سرتابی کرے گا اس کا زن بچہ کولھو میں پیل دیا جائے گا۔"

سزا اور تعزیر کے بعد طاقت کے استعمال کا دوسرا ذریعہ جزا اور صلہ کا ہے یعنی

کسی شخص کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے اور کام لینے کے لئے تحفے تحائف، انعامات اور معاوضہ کی عطا اور بخشش۔ یہ تحائف اور انعام مادی بھی ہوتے ہیں اور غیر مادی۔ اول الذکر کی مثال جاگیرات، زمینات، زر و جواہر اور نقد وغیرہ۔ غیر مادی جزا اور صلہ کی مثال خطابات، القاب اور نعرہ ہائے تحسین و آفرین۔ انگریزی دور میں حکومت وفاداروں کو لارڈ اور سر کے علاوہ خان بہادر، رائے بہادر وغیرہ کے خطابات سے نوازا جاتا تھا۔ آج کے دور میں بھی طریقہ وہی رائج ہے۔ صرف الفاظ بدل گئے ہیں اور لارڈ اور سر کی جگہ بھارت رتن اور پدما بھوشن نے لے لی ہے لیکن یہ اعزاز اور خطاب ہمیشہ اور ہر دور میں صرف برسر اقتدار طاقت کے ہمنواؤں ہی کو عطا کئے گئے ہیں۔

لیکن سزا اور جزا کا معاملہ صرف حکومتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بقدر ظرف اس میں ہر وہ شخص شریک ہے جس کے پاس دینے کے لئے کچھ ہو۔ عہد وسطیٰ MIDDLE AGES میں سارے یوروپ اور حال حال تک ہندوستان میں بھی بیگار کا رواج تھا جہاں بلا معاوضہ یا بہت ہی قلیل معاوضہ پر زمیندار اور جاگیردار اپنی رعیت اور مزارعوں سے کام لیا کرتے تھے اور اس سے بھی برا حال امریکہ کے حبشی غلاموں کا تھا جن کی جانوروں کی طرح خرید و فروخت ہوا کرتی تھی اور جن پر ہر قسم کی سختی اور تشدد قانوناً جائز سمجھا جاتا تھا۔ یوروپ اور امریکہ میں صنعتی انقلاب کے بعد بیگار اور غلامی کا دور ختم ہوا اور اس کی جگہ ترجیحی ادائیوں نے لی۔ اس کے باوجود طاقت کا استعمال بالکل متروک نہیں ہوا بلکہ ایک عرصہ تک حکومت کے ایوانوں میں مزدوروں کے ہڑتال کرنے کے حق کے خلاف جد و جہد جاری رہی تو دوسری طرف اجرت یاب غنڈوں کی مدد سے ہڑتالوں کو توڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ آج انگلستان میں اُجرت یاب غنڈوں کی جگہ یہ کام حکومت کی پولیس انجام دیتی ہے اسی طرح سے ہڑتال کے زمانے میں یونین سے بغاوت کرکے کام پر آنے والے مزدوروں کی خوب حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

طاقت کے استعمال کا تیسرا اور نسبتاً مخفی ذریعہ CONDITIONING ہے۔ جس کے اظہار کے لئے کسی بہتر اصطلاح کی عدم موجودگی میں ہم نے تسلیم کے لفظ کا سہارا لیا ہے۔ یعنی سوسائٹی یا معاشرہ بعض باتوں کو تسلیم کر لیتا ہے جس کے خلاف عمل کرنا سوسائٹی میں ذلت اور رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً چوری کرنا برا سمجھا جاتا ہے اور کوئی شخص اپنی چوریوں کو بیان نہیں کرتا۔ اس کے باوجود رشوت ستانی قانوناً جرم ہونے

باوجود سوسائٹی میں بُری نظر سے نہیں دیکھی جاتی بلکہ اکثر رشوت کی آمدنی کی وجہ سے لوگوں کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو جاتا ہے اور شادی بیاہ کے رشتوں کے لئے اسکول ماسٹر پر آبکاری کے سب انسپکٹر اور تھانیدار کے گرداور کو ترجیح حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے رشوت ستانی اس ملک میں روز افزوں ترقی پر ہے۔

کنڈیشنگ کے بغیر انسانی معاشرے کا قیام، ساری فوج اور پولیس اور ترغیب وتحریص کے باوجود نا ممکن ہوتا۔ جس طرح ہمارے جسم میں معدے اور دیگر اعضائے رئیسہ کے افعال ہمارے دماغ کی مداخلت کے بغیر ہی نہایت ہموار رفتار کے ساتھ ساری عمر جاری رہتے ہیں تاوقتیکہ کسی بیماری کی وجہ سے ان کے قدرتی وظیفہ میں کوئی خلل نہ پڑ جائے اسی طرح اسی کنڈیشنگ کی بدولت فوج اور پولیس کی مداخلت اور نگرانی کے بغیر معاشرے کا نظام ہموار رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ چھوٹے بچے بڑوں کا کہنا مانتے ہیں، بڑے جب بوڑھے ہو جائیں تو بخوشی ان کی کفالت کا بار برداشت کرتے ہیں بلا حجت وحیل سرکار کو محاصل ادا کرتے ہیں اور حتی الامکان سوسائٹی کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ کنڈیشنگ دراصل اس تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے جو گہوارے سے شروع ہو کر گور پر ختم ہوتی ہے۔ بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہو جاتا ہے اسے مقررہ اوقات ہی میں غذا طلب کرنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے، ذرا بڑا ہوا تو بول و براز پر قابو پانا سکھایا جاتا ہے اور یوں یہ سلسلہ تقریباً ساری عمر ہی جاری رہتا ہے، جس میں ماں باپ کی فرماں برداری، بزرگوں کا ادب، نشست و برخاست اور گفتگو کے آداب، غرض تہذیب و رکلچر کے سارے ہی اجزا شامل ہوتے ہیں معاشرے کا سارا امن و سکون اسی تسلیم CONDITIONING پر قائم ہوتا ہے اور جب اس میں فرق پڑتا ہے تو معاشرہ کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ مثلاً حال حال تک امرد پرستی کو معاشرے میں بُری نظر سے دیکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے ایک مخصوص طبقے کے علاوہ سوسائٹی میں کسی شخص کو علی الاعلان کسی ایسی رغبت کے اظہار کی جرائت نہیں ہوتی تھی لیکن جب سے یورپ اور امریکہ میں لغیس کے اس حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے لوگ برملا اپنی لواطت پسندی کا اظہار کرنے لگے ہیں اور سوسائٹی اس سے تیزی سے متاثر ہو رہی ہے۔ اسی طرح کسی زمانے میں افیون گانجہ اور چرس کا استعمال مذموم اور باعث ذلت سمجھا جاتا تھا لیکن ان اشیاء کے استعمال کے خلاف ہماری سوسائٹی کی کنڈیشننگ ڈھیلی پڑی ان منشیات کا استعمال ساری دنیا میں

جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا ہے۔

اب آخر میں طاقت کی جدلیات سے متعلق بھی دو کلمے درج کئے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ ہر فرعونے را موسیٰ۔ ہر طاقت کے جواب میں قدرتی طور پر ایک جوابی طاقت ظہور میں آتی ہے۔ اسی کو طاقت کی جدلیات DIALECTIES کہتے ہیں۔ مثلاً جب جب ماں باپ یا استاد کی طرف سے بچوں پر سختی بڑھنے لگتی ہے تو بچوں میں سرکشی کے جذبات بیدار ہونے لگتے ہیں۔ ظالم حکمرانوں کے ظلم اور زیادتیاں جب بڑھ جاتی ہیں تو رعایا میں بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں یہی حال اداروں اور تنظیموں کا بھی ہے۔ جب کارخانہ داروں اور فیکٹری کے مالکوں کی مزدوروں پر سختی بڑھنے لگی تو مزدوروں نے ایک اپنی یونین بنا کر ان کے مقابلے کے لئے ایک جوابی طاقت کو جنم دیا لیکن جب اسی یونین کے بل بوتے پر مزدوروں کی طاقت اتنی بڑھی کہ انھوں نے من مانی مانگیں پیش کرنی شروع کردیں اور ہڑتالوں کے ذریعے لوگوں کی زندگی اجیرن کردی تو کارخانہ داروں نے حکومت کا سہارا لے کر یونین کی طاقت کو توڑنے کیلئے ایک اور جوابی طاقت کو جنم دیا۔ یعنی جس طرح طبیعی دنیا میں ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے اسی طرح معاشرتی دنیا میں بھی ہر طاقت کے مقابلے میں بھی ایک جوابی طاقت جنم لیتی ہے۔

اس جوابی طاقت کے سرچشمے اور استعمال کے ذرائع وہی ہیں جو طاقت کے باب میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں ایک تازہ مثال کے ذریعہ اس ادعا کو ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس صدی کے ساتویں دہے میں سابق شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے مجسمے ایران کے ہر چھوٹے اور بڑے شہر کے چوراہوں پر نصب تھے ہر گھر میں ان کی تصویر آویزاں تھی اور سارے ملک میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور ان کے اقتدار کو للکارنے والا ایران میں آزادی کی سانس نہیں لے سکتا تھا لیکن اسی ساتویں دہے کے ختم ہوتے ہوتے ایک اور طلسمی شخصیت نے شاہ کا طلسم باطل کردیا۔ یہ سحرانگیز شخصیت آیات اللہ خمینی کی تھی جن کی پشت پر ایران کی مذہبی لیڈرشپ تھی جس کے اپنے آزاد مالی وسائل تھے جن کو کام میں لا کر اس تنظیم نے ایرانی عوام کو شاہ کے مقابل لا کھڑا کیا اور ایرانیوں کے ایمانی جذبہ کو ابھار کر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا آیات اللہ خمینی کے بغیر ایرانی انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن خمینی کی کامیابی ممکن نہ تھی اگر ایران کی مذہبی لیڈرشپ کی تائید انھیں حاصل نہ ہوتی ___ عمل اور ردعمل، طاقت اور جوابی طاقت، انہی جدلیات پر دنیا کا نظام قائم ہے خواہ وہ طبیعی ہو یا سیاسی۔ طاقت کے جواب میں اگر جوابی طاقت کا

نوجوانوں کی قوت ترقی کے عمل کی الجھن

قریب ایک تہائی آبادی کی عمر ۱۹ سے ۳۵ برس تک ہونے کے سبب بھارت کو ایک نوجوان قوم کہا جا سکتا ہے۔ آبادی کا یہ حصہ قوم کا ایک نہایت متحرک اور پیداواری وسیلہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسی حصے کو نظرانداز کیا جائے یا مناسب ڈھنگ سے استعمال نہ کیا جائے تو سماج اور حکومت کے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔

آج نوجوانوں کا یہ طبقہ ایک اضطراب کے دور میں سے گزر رہا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی کل ۲۲ کروڑ ۱۰ لاکھ کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ دیہات میں رہتا ہے۔ ان پر دن رات مختلف قسم کے دباؤ پڑتے ہیں جن میں سماجی مجبوریاں، اقتصادی پسماندگی، ناخواندگی اور رجعت پسندی شامل ہیں۔ ان اثرات کا ان کی خودکفیل اور باوقار زندگی بسر کرنے کی خواہشات اور امیدوں سے براہ راست ٹکراؤ ہوتا ہے۔

بے روزگاروں کی روزافزوں باقی تعداد اور روزگار کے پیدا ہو رہے وسیلے ایک اور امر ہے جو صورت حال پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

ہمارے نوجوان لوگوں کو اپنی شخصیت کی تعمیر، اپنی ہنرمندی کا درجہ بلند کرنے اور انہیں سماجی طور پر مفید اور اقتصادی لحاظ سے پیداوار کے قابل بنانے کے لئے انہیں زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوان عورتوں سے متعلق یہ مشکل اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ جن کے لئے سماجی پروگرام مرتب کرنا اور ان پر عمل کرنا اور بھی ضروری ہے۔

انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں نوجوانوں کے امور اور کھیلوں کا محکمہ ایک ترقی پسند اور با اعتماد پود کی تعمیر کے کام میں لگا ہوا ہے۔ پیشہ ورانہ تربیت کے ذریعہ تعلیمی مواقع اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے ان لوگوں کو مناسب کاموں پر لگانے سے لے کر ثقافتی ترقی تک

اس اسکیم کے کئی ایک پہلو ہیں ۔

مسئلے میں اضافہ

بھارت کے رجسٹرار جنرل اور مردم شماری کے کمشنر نے آبادی کے [illegible] کی آبادی [illegible] 1986 میں 25 کروڑ 77 لاکھ 10 [illegible] موجودہ شرح سے 2000 تک بھارت میں نوجوانوں کی [illegible] کروڑ [illegible] جو دنیا کے نوجوانوں کی کل آبادی کے 26 فی صد کے برابر ہے ۔

نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو تعلیمی نظام کی زندگی کے امور سے لاتعلقی پر تشویش ہے جن کا انھیں سامنا ہے ۔

بھارت میں نوجوانوں کو اپنی زندگی کے مقاصد کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوتا جا رہا ہے تعلیمی سہولیات بڑھ رہی ہیں ۔ سماجی نقل و حرکت میں اضافہ ہو گیا ہے ۔ سفر کے مواقع اور اطلاعات کے وسائل تک رسائی وسیع ہو گئی ہے ۔ نوجوان لوگ اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور عمل میں تبدیلی کے محرک اور ترقی کے آلۂ کار بن گئے ہیں ۔

ایک ایسا مقام آپہنچا ہے جبکہ بعض فرسودہ تصورات اور خیالات کو پھر سے مرتب کرنا ہوگا جن سے سماج میں طاقت ، یکجہتی اور قوت حرکہ پیدا ہوگی ۔ نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم اور تکنیکی پیشہ ورانہ تربیت کو اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے ۔

چھٹے منصوبہ کی مدت میں 324 کروڑ 40 لاکھ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لئے کئی منصوبہ جاتی پروگراموں پر عمل شروع کیا گیا تھا ۔ 15 سے 35 برس کی عمر کے نوجوانوں کو ان کے مواقع سے زیادہ تر فائدہ پہنچا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ مارچ 1985 تک ایک کروڑ سے ایک کروڑ 40 لاکھ افراد بے روزگار ہوں گے جن میں سے اکثریت نوجوانوں کی ہوگی ۔

نوجوانوں کے لئے پالیسی

حکومت کی نوجوانوں کے لئے قومی پالیسی کے مسودے میں تعلیم و تربیت تک رسائی اور خاص طور پر جدید تکنالوجی صبر سے کام لینے ، استدلال میں اعتقاد ، نظم و ضبط ، خود اعتمادی ، جذبہ رحم ، کھیل کے جذبے ، سائنسی اعتقاد وسیع اور ہمارے ثقافتی ورثے کے علم پر زور دیا گیا ہے ۔

نوجوانوں کو سماجی برائیوں کا مقابلہ کرنے ، استحصال کا شکار نہ ہونے ، جسمانی کلچر اور اولوالعزمی کی تعلیم دی جائے گی اور صحت مندانہ سرگرمیوں کا بھی اہم کردار ہوگا ۔ نوجوانوں کی امن ، سیکولرزم ، عدم تشدد ، قومی یکجہتی اور ماحولیات کے تحفظ کے لئے بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی

اس کے لئے طریقہ کار محض پروگراموں کی منصوبہ بندی اور کچھ نشانے حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ پوری کوشش یہ رہے گی کہ نوجوانوں کے مسائل کا پتہ لگایا جائے اور جہاں تک ہو سکے انہیں حل کرنے میں مدد دی جائے جیسے کہ منشیات کی لت چھڑانے کے لئے کی جاتی ہے۔

کچھ دیر سے بعض نہایت خطرناک اشارات مل رہے ہیں جن میں لڑکیوں میں تمباکو اور شراب نوشی کا بڑھتا ہوا رجحان اور بہت چھوٹے بچوں کو منشیات کے کاروبار میں شامل کیا جا... ملک کے کل جرائم کا 60 فیصد حصہ نوجوان کرتے ہیں اور اس میں سے بھی 80 فی صد حصہ جرائم 16 سے 21 برس کی عمر کے لڑکے کرتے ہیں۔ یہ جرم اور منشیات کا چکر شہری گندی بستیوں اور بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں زیادہ زور پر ہے۔

ان تمام مہلک برائیوں سے نپٹنے کے لئے ایک جامع طریقہ کار مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس میں تربیت، علاج اور بحالی کے طریقے شامل ہیں۔

نیشنل سروس اسکیم

اس اسکیم میں رسمی تعلیم حاصل کرنے کے دوران نوجوانوں کی طرف سے عوام کی خدمت کا خیال شامل ہے جس کے لئے طلبا کا سماجی شعور بیدار کرنا اور انہیں اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے گرد و نواح میں تعمیری کام کرنے کے مواقع مہیا کرنا ضروری ہے اس طرح طلباء کو سماج کے حالات کو سمجھنے اور ان کا احساس کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔

چنانچہ اس اسکیم کے تحت جو پروگرام شروع کئے گئے ہیں۔ ان میں مقامی ضروریات اور ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوے ماحولیات کے تحفظ اور بہتری، سماجی خدمت، سیلابوں زلزلوں اور طوفانوں جیسے ہنگامی حالات، خواتین کے مرتبے کو بلند کرنے، کیڑوں کی روک تھام اور امداد باہمی انجمنوں کے فروغ وغیرہ کے کام شامل ہیں۔ تعلیمی اور ثقافتی پروگرام جس میں تعلیم بالغان اور قبل از اسکول کی تعلیم بھی شامل ہیں، پروگرام کا ایک اور حصہ ہیں۔

نیشنل سروس پروگرام کا مقصد عام طور پر ان لوگوں کی تعلیم جو پہلا ڈگری کورس مکمل کر چکے ہیں رضاکارانہ طور پر قومی تعمیر کے کام میں اور پورے دن کے کام میں شامل ہونے کا موقع مہیا کرنا ہے۔ قومی خدمت کے ان رضاکاروں کو نہرو یوک کیندروں اور رضاکار تنظیموں میں اجتماعی خدمتوں کے کارکنوں کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ پروگرام انھیں ایسے تخلیقی و تعمیری کام کرنے کا موقع مہیا کرتا ہے جو شرکت کرنے والوں کے رجحانات اور تعلیمی پس منظر کے لئے موزوں ہیں۔

اولوالعزمی اور نوجوانوں کے کلب

نوجوانوں میں جانفشانی و مہم میں ڈالنے، جماعت کے طور پر مل کر کام کرنے، ان میں بہت آزما صورت حالات کے مقابلے میں فوری اور موثر ردعمل کی حوصلہ افزا اور نظم وضبط وقوت برداشت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے مالی امداد منظور کی جاتی ہے۔ یہ مالی امداد اداروں، گروپوں، کشتی رانی، پیدل سفر، اعداد وشمار جمع کرنے کی غرض سے چھان بین، پہاڑوں میں حیوانات کے مطالعے اور تیراکی نیز نوجوانوں کی ایسے کام کرنے کے لئے تربیت کے لئے بھی دی جاتی ہے۔

رضاکار تنظیموں کو، نوجوان افراد کو شہری گندی بستیوں کی بہتری کے کاموں میں شامل کرنے میں بھی مدد دی جاتی ہے۔ رضاکار ادارے حکومت کی مدد سے جو دوسرے کام کرتے ہیں ان میں دیہی نوجوانوں کی کاروباری صلاحیت بہتر بنانے کے لئے پیشہ ورانہ تربیت جس سے وہ روزگار پیدا کر سکیں یا ان کے روزگار حاصل کرنے کے امکانات بہتر ہو سکیں یا ایسے نوجوانوں کے لئے جو سماجی تبدیلی لانے کا آلہ کار بن سکتے ہوں نوجوانوں کی قیادت کی تربیت کے پروگرام شروع کرنے بھی شامل ہیں۔

یوتھ کلبوں کی سرگرمیاں قومی طور پر مسلمہ قدروں، سماجی برائیوں کے خلاف آگاہی پیدا کرنے اور تندرستی کے کلچر کے فروغ کے لئے رضاکارانہ کوششوں کی تنظیم کے لئے بہت اہمیت کی حامل ہو سکتی ہیں۔ اس وقت بہت سے یوتھ کلب نچلی سطح پر کام کر رہے ہیں یہ اسکیم یوتھ کلبوں کی سرگرمیوں کو ایک مثبت رخ دینے کے لئے شروع کی گئی ہے۔

سکاؤٹنگ اور گائیڈنگ ایک بین الاقوامی تحریک ہے اور اس کا مقصد لڑکوں اور لڑکیوں کی اخلاقی تعمیر ہے جس سے وہ اچھے شہری بن سکیں۔ اس کے لئے ان میں وفادا حب الوطنی اور لاغرض خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ سکاؤٹنگ اور گائیڈنگ کی سرگرمیوں سے لڑکے اور لڑکیوں میں متوازن جسمانی و ذہنی ترقی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو بڑی تنظیم اس سرگرمی کو فروغ دے رہی ہے وہ ہے بھارت سکاوٹس اینڈ گائیڈز جسے نوجوانوں کے امور اور کھیلوں کا محکمہ مالی مدد دیتا ہے۔

نوجوانوں کے قومی ایوارڈ

نوجوانوں اور نوجوانوں کی تنظیموں کی طرف سے کئے گئے نمایاں کاموں کی قدرشناسی کے لئے جو قومی ترقی یا سماجی خدمت کے طور پر کئے گئے ہوں اور نوجوانوں میں اپنے عوام کے تئیں

بداری کی حوصلہ افزائی کے لئے اور اس طرح ایک اچھے شہری کے طور پر ان کی صلاحیت
ترجلانے کی غرض سے انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں نوجوانوں کے امور اور
کھیلوں کے محکمے نے نوجوانوں کے قومی ایوارڈ 12 نوجوانوں اور ایک ادارے کو پیش کئے

نہرو یووک کیندر بنیادی سطح پر ایسے دیہی نوجوانوں کی سرگرمیوں کے فروغ
ہ تال میل کے لئے جو طالب علم نہیں ہیں ایک نئی قسم کا کثیر المقصد ادارہ ہیں۔ یہ
گرام 1972 میں اس قسم کے نوجوانوں اور بالخصوص دیہات کے علاقوں کے لئے
وضع کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک میں 227 نہرو یووک کیندر کام کر رہے ہیں۔

نہرو یووک کیندر مقامی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق سرگرمیاں منظم کرتے
ہیں جن میں دیہات کے نوجوانوں کے لئے غیر رسمی تعلیمی پروگرام، سماجی خدمت کے
پروگراموں کا انعقاد مثلاً دیہی علاقوں میں تعمیری کاموں کے لئے کیمپ لگانا، ثقافتی و
تفریحی سرگرمیاں، کھیل کود کا فروغ، نوجوان رہنماؤں کے لئے تربیتی پروگرام اور پیشہ ورانہ
تربیت شامل ہیں۔

اگر مناسب ڈھنگ سے استعمال کی جائے تو نوجوانوں کی قوت سماجی، اقتصادی
ثقافتی تبدیلی کے لئے ایک زور دار آلہ کار بن سکتی ہے۔ یہ طاقت بھارت کے
دیں صدی کے سفر کے لئے ضروری ایندھن کا کام دے سکتی ہے۔ نوجوانوں کے
اور کھیلوں کے پروگرام اسی مقصد کو سامنے رکھ کر بنائے جاتے ہیں اور وہ ہمارے
انوں کی صحت مندانہ ترقی اور ابھی پھولنے پھلنے والی نسلوں کے لئے صحیح فضا
کر سکتے ہیں۔

ہ ص ۲۳

یہ ہیں مولانا محمد علی کے وہ تعلیمی نظریات و رجحانات جنہوں نے ملک کے تعلیمی ڈھانچے کو
نیت کے ساتھ متاثر کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل کے ذریعہ انھوں نے سرسید کے بعد
لیسا تعلیمی انقلاب کر دیا جس کے نتیجہ میں قومی اتحاد و یگانگت کی لہریں ہندوستانی نسلوں کی
رگ رگ میں دوڑنے لگیں اور انگریزوں کے ایوان حکومت میں پہلی بار یہ محسوس کیا گیا
کہ ہندوستانی عوام بیدار ہو گئے ہیں جن کو تعلیمی میدان میں زیادہ عرصہ تک مغلوب
رکھا جا سکتا۔

ڈاکٹر ع۔ ض۔ ابراہیم

جناب شیخ احمد احسائی علیہ الرحمہ کے علمی کارنامے

[وحدتِ وجود پر اعتقاد، توحید واقعی کے منافی]

عالم ربانی حکیم صمدانی حضرت شیخ احمد احسائی مرحوم بزرگ ترین علمائے شیعہ اثنا عشری میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت ماہ رجب سنہ ۱۱۶۶ھ میں بمقام قریہ مطیرفی ہوئی جو قصبہ احساء بلاد عرب کا ایک حصہ ہے۔ آپ کے پدر بزرگوار زین الدین بن ابراہیم بن صقر بن داغر تھے یہ سب حضرات مذہب امامیہ کے پابند تھے۔ ایام طفولیت ہی سے آثار علم در عب وجلالت آپ کی کیفیات سے ظاہر تھے۔ چنانچہ پانچ برس کے سن ہی میں آپ نے قرآن کریم کی تلاوت باقرأت مکمل کر لی تھی۔ خود شیخ بزرگوار نے اپنے زمانۂ طفلی کی کیفیات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بچپن میں اپنے ہم سن لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اگرچہ کہ جسمانی طور پر میں ان کے ساتھ ہوتا مگر ہر قابل فکر مسئلہ پر میری توجہ مرکوز ہو جاتی۔ اکثر تنہائی میں قدیم و ویران عمارتوں کو دیکھتا اور یہ سوچنے لگتا کہ کیا ہوئے ان عمارتوں میں بسنے والے اور ان عمارتوں کے بنانے والے کدھر گئے پھر جب ان لوگوں کے حالات کا اندازہ ہوتا تو میری آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز شیخ محمد بن شیخ محسن کی تلمیذ سے ہوا اس کے بعد آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ خود اپنے بیان کے مطابق شیخ مرحوم تحصیل علم کے دور میں ان پر ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری رہتی۔ اسی دور میں انھوں نے چند عجیب خواب دیکھے اور عالم رویا میں زیارت ائمہ اطہار علیہم السلام سے مشرف ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ سیر و سلوک اور اس دوران کربلائے معلیٰ و نجف اشرف میں آقا محمد باقر بہبہانی رحمۃ اللہ علیہ اور آقائی سید مہدی طباطبائی بحرالعلوم نوراللہ مرقدہٗ کی محافل درس میں حاضر رہے۔ حسب روایات آپ آقائی مہدی بحرالعلوم سے اجازت روایت کے خواہشمند ہوئے

اور اپنی تصانیف کے نمونے کے طور پر اپنا وہ رسالہ بحرالعلوم کی خدمت میں پیش کیا جو آپ نے علامہ حلی کے ایک رسالے کی شرح میں تحریر فرمایا تھا۔ اس کے مطالعے کے بعد بحرالعلوم نے فرمایا کہ آپ کی منقبت علمی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں آپ سے اجازۂ روایت حاصل کروں لیکن بالآخر شیخ کے اصرار پر اجازہ تحریر فرما دیا۔ شیخ مرحوم کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے ہم عصر علماء کاملین نے انھیں ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی تعظیم و تکریم کی۔ چنانچہ ان کی حیات کا ذکر کرتے ہوئے آقائی حاج ابوالقاسم خان کرمانی نے کتاب فہرست کتب مشائخ عظام میں تحریر کیا ہے کہ آقا حاجی کلباسی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جید عالم بزرگ بھی جب اصفہان میں شیخ مرحوم کی آمد کی اطلاع سن لیتے تو اپنے حوزۂ درس کو تعطیل دے کر شیخ کی محفل درس میں حاضر ہو جاتے اور انھیں کی اقتدا میں نماز بھی ادا فرماتے۔

ترک وطن کے ایک طویل عرصے بعد شیخ بزرگوار نے ایک بار پھر وطن کو مراجعت فرمائی اور یہیں ازدواج فرمایا۔ کچھ عرصے بعد سفر اختیار کیا اور مختصر مدت کے بعد بحرین، بصرہ اور پھر دورق نامی قریہ میں قیام فرمایا۔ سنہ ۱۱۷۶ میں کربلائے معلیٰ میں قتل و غارت گری کے واقعہ کے بعد بصرہ لوٹے مگر کچھ ہی عرصے بعد انتقال مکانی فرمایا اور مختلف عرصوں میں تنویہ، نشوہ صفادہ شط الکار اور سمادہ نامی مقامات میں قیام پذیر رہے۔ ان کے اس پیہم سفر اور غیر مستقل سکونت کے انداز سے ان کا یہ قول ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہجوم اور بھیڑ بھاڑ سے کنارہ کش رہنا چاہتے تھے اور بنیادی طور پر تنہائی پسند واقع ہوئے تھے۔ اور محفلوں سے دور رہ کر تحقیقی و تعمیری کام میں مصروف رہنا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۰ میں آپ دوبارہ زیارات سے مشرف ہوئے اور واپسی میں یزد کے راستے سے مشہد مقدس خراسان کے لئے روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں یزد کے لوگوں سے کئے ہوئے وعدے کی بنا پر مشہد مقدس سے یزد واپس ہوئے اور کچھ عرصہ یہاں قیام فرمایا۔ اسی طرح فتح علی شاہ والیٔ تہران کے اصرار پر تہران میں اور کرمانشاہ کے حاکم کی دعوت پر سنہ ۱۲۲۲ میں کرمانشاہ میں بھی قیام فرمایا۔ سنہ ۱۲۴۱ قمری میں مشہد مقدس اور اصفہان کے سفر کے بعد کرمانشاہ سے بعزم حج سفر کرتے ہوئے مدینہ سے دو منزل ہدیہ نامی قریہ میں آپ نے اس جہان فانی سے کوچ فرمایا اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی قبر جنت البقیع میں چار ائمہ اطہار کے مزارات مقدس سے قریب ہی واقع ہے۔ آپ کی اولاد (۱۷) فرزندوں اور (۱۱) دختروں پر مشتمل ہے۔

اپنی حیات میں آپ نے فقہ، اصول اور حکمت الٰہی کے موضوع پر جملہ ایک سو تیس[۱۳۲] کتابیں لکھیں جن میں سے بعض طبع بھی ہو چکی ہیں۔ ان میں مشہور ترین کتابیں شرح زیارت

جامع کبیرہ۔ شرح فوائد۔ شرح عرشیہ اور شرح مشاعر ہیں۔

شیخ بزرگوار کے اعلیٰ مراتب علمی اور ان کے زہد و تقویٰ کی تصدیق ان کے زمانۂ حیات میں اور ان کے بعد بھی دوست اور دشمن سبھی کرتے رہے ہیں سوائے چند ایک افراد کے جو اپنی کم علمی، حسد، دشمنی اور بعض اوقات اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی بناء پر ان کے بعض نظریات کو قبول نہ کرتے تھے لیکن مرحوم آقائی سید مہدی بحرالعلوم اور سید بزرگوار سید علی طباطبائی رح جیسے جید علماء نے ان کی قدر کی اور انھیں اجازۂ روایت عطا کیا اور شیخ محمد حسن مرحوم صاحب "جواہر الکلام" جیسے بزرگ عالم نے ان سے اجازہ حاصل کیا۔ مرحوم آقائی سید کاظم رشتی اعلیٰ اللہ مقامہ نے اپنی تصنیف "دلیل المتحیرین" میں شیخ مرحوم کی حاصل شدہ اجازات کا ذکر فرمایا ہے ان میں سے اہم ترین اجازات آقائی سید مہدی بحرالعلوم رح سید سند میرزا مہدی شہرستانی۔ آقائی شیخ جعفر اعلیٰ اللہ مقامہ اور سید بزرگ آقائی سید علی طباطبائی نور اللہ مرقدہٗ کے ہیں۔

ان بزرگوں کے عقائد بعض حضرات کے عقل و فہم کے بالکل برعکس ہرگز قطعی کچھ نئے نہیں ہیں نہ وہ کسی تازہ فرقے یا مذہب کے موجد و مؤسس ہیں۔ بلکہ ان کے چھوڑے ہوئے آثار اور ان کی تصانیف سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا اعتقاد یہی تھا کہ حقیقی صحیح اور واقعی علم وہ ہے جو قرآن۔ احادیث اور اخبار محمدؐ و آل محمدؐ سے حاصل کیا جائے۔ اور تمام عمر ان کی سعی و کوشش بس یہی رہی کہ تمام مسائل و مطالب کی اسناد کتاب خدا اور احادیث اہل بیت علیہم السلام سے ہی لی جائیں حتیٰ کہ ان کی استعمال کردہ اصطلاحات و لغات بھی قرآن و احادیث سے ماخوذ کردہ ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تمام مسائل میں قرآن اور آثار اہل بیت سے رجوع کرنا لازم ہے۔ اس اساس پر تو انھیں مکتب آل محمدؐ علیہم السلام کا احیاء کنندہ تسلیم کرنا چاہیے نہ کہ کسی نئے فرقے کا موجد۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہارون الرشید اور مامون کے دور میں یونانی فلسفے کی کتابوں کے جو ترجمے ہوئے ان کی بناء پر علمائے یونان کے استدلالات کی اساس پر علم الکلام کی توسیع ہوئی۔ اس طرح فلسفۂ یونانی اسلام میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ اسلامی عقائد کا استدلال یونانی فلسفیوں سے کیا جانے لگا جو ایک غلط راہ تھی۔ شیخ بزرگوار نے اس غلطی کی اصلاح اور فلسفۂ یونانی کے ابطال کا بیڑہ اٹھایا اور فلسفۂ آل محمد علیہم السلام کے ذریعہ اس کا ابطال کیا۔ اسی بناء جہاں ان کے معاصر علمائے عظام نے ان کی زہد کی اور ان کی خدمات کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا وہیں کچھ متعصب

اور کوتاہ نظر لوگ ان کے مخالف ہو گئے کیونکہ ایسے لوگوں کو اپنی ریاست علمی کے ہاتھ سے چلے جانے کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال پروردگار عالم کی تائید و نصرت سے ایسے لوگوں کے اکراہ کے باوجود ان بزرگوار کے علم و کمال کے اعتراف کی آوازیں اطراف جہان سے بلند ہونے لگیں۔ شیخ مرحوم کا مسلک تو مسلک آل محمد علیہم السلام ہی تھا اور حکمت الٰہی اور فلسفہ کے بارے میں جو کچھ انھوں نے کہا وہ قرآن اور احادیث اہل بیتؑ ہی سے ماخوذ ہے۔ مثلاً روح اور جسم کی توصیف کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اسی بنا پر معاد جسمانی کا اعتقاد راسخ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ جسد عنصری یا بازگشت کے معتقد نہیں تھے بلکہ فرماتے تھے کہ انسان کا جسم حقیقی جو حامل روح انسانی ہوتا ہے اسے ہی محشور کیا جائے گا۔ اسی قول کی بنا پر بعض لوگوں نے اس پر غور و فکر کئے بغیر ان کی مخالفت شروع کر دی حالانکہ ان کا یہ قول قرآن و احادیث سے ہی ماخوذ ہے۔ وہ وحدت وجود کے اعتقاد کو بھی توحید واقعی کے منافی سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ ملا صدرا اور سہروردی، ملا محسن فیض کی مخالفت فرماتے تھے کیونکہ یہ دونوں حضرات وحدت وجود یا وحدت موجود کے قائل تھے۔

مرحوم شیخ بزرگوار کے فلسفہ کی تشریح و توضیح جو حقیقت میں فلسفۂ قرآنی اور فلسفۂ آل محمد علیہم السلام ہی ہے ان کے بعد ان کے ممتاز شاگردوں اور ان کے سلسلے کے علماء نے فرمائی جیسے حاجی سید کاظم رشتی اعلی اللہ مقامہ اور ان کے بعد کے علماء جو شیخ احمد احسائی مرحوم کی پیروی کی بنا پر علمائے شیخیہ کہلاتے ہیں۔ اس مکتب کے علماء نے تا حال ایک ہزار سے زائد کتابیں مختلف علمی و نقلی موضوعات پر تصنیف کی ہیں۔ ان کا خصوصی موضوع حکمت الٰہیہ بھی ہے جو لوگ ان علماء کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان سے متعارف ہونے کے خواہشمند ہوں وہ ان طبع شدہ کتابوں مدرسۂ ابراہیمیہ کرمان ایران سے خط و کتابت کر کے منگوا سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نام "شیخیہ" سے مراد مذہب امامیہ اثنا عشریہ سے ہٹ کر کوئی شے نہیں ہے اور یہ نام انھیں محض اس لئے دیا گیا ہے کہ بعض مسائل میں وہ امتیازی نظریات رکھتے ہیں۔ جس طرح مذہب امامیہ میں "اصولی" اور "اخباری" کی اصطلاحیں رائج ہیں اسی طرح شیخی بھی ایک اصطلاح ہے اور بس۔ ورنہ حقیقت میں سب ایک راہ کے راہی اور آپس میں برادران ایمانی ہیں۔ والسلام۔

متین احمد ابدالی

خدابخش لائبریری کا شعبۂ رسائل

اپریل ۱۹۸۰ء تا مارچ ۱۹۸۶ء

۱۹۷۸-۷۹ میں جناب محمود عالم صاحب اسسٹنٹ لائبریرین نے شعبۂ اخبار و رسائل کی ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی تھی جس میں شعبہ کی کارکردگی اور رفتار ترقی میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اردو کے ایک نوجوان ادیب و شاعر نیاز الدین نیازی نے اس رپورٹ کی مدد سے ایک مضمون تیار کیا جو "ہماری زبان" کی ۲۲ مارچ ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔

۱۹۷۵ سے ۱۹۷۹ تک بالعموم اور ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۶ تک بالخصوص رسائل کے شعبہ نے جس تیزی سے ترقی کی اور اس کی کارکردگی میں اضافہ ہوا ہے اسے دیکھتے ہوئے ضروری ہو گیا کہ ۱۹۸۰ سے اب تک کی ایک جامع رپورٹ مرتب کر دی جائے اور شعبہ میں ہونے والی پیش رفت کا تفصیلی جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ لائبریری اور بیرون لائبریری رسائل کے شعبہ سے استفادہ کرنے والوں کو اس کی پیش رفت کا اندازہ ہو سکے۔

سب سے پہلے تو اعداد و شمار کی روشنی میں ایک جائزہ پیش ہے تاکہ تفصیل میں جانے سے پہلے ان اعداد و شمار کی روشنی میں ہر سال ہونے والی پیش رفت کا تجزیہ کیا جا سکے۔ ان اعداد و شمار سے ایک عام قاری ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۶ تک میں ہونے والی پیش رفت کا بخوبی اندازہ لگا لے گا۔ ۱۹۷۸-۷۹ء میں خدابخش لائبریری میں تحفہ، تبادلہ اور چندہ سے آنے والے اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی اخبار و رسائل کی مجموعی تعداد ۱۶۲ تھی، ۱۹۷۹-۸۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۷۴ ہو گئی، ۱۹۸۰-۸۱ء میں ۲۱۷، ۱۹۸۱-۸۲ء میں ۲۵۵، ۱۹۸۲-۸۳ء میں

انچارج شعبۂ رسائل۔ خدابخش لائبریری۔ پٹنہ

۸۴-۱۹۸۳ء میں ۳۰۲ ، ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۲۷ اور ۸۶-۱۹۸۵ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۴۴۳ تک جا پہنچی ہے۔ آنے والے سالوں میں مزید اضافے کا یقین ہے۔

شعبۂ رسائل تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ تو وہ ہے جس میں متعدد اخبار ورسائل چندہ بھیج کر منگائے جاتے ہیں یا مقامی طور پر ان کی خرید ہوتی ہے جن کی مجموعی تعداد ۷ ۹ ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اخبار ورسائل شامل ہیں جو لائبریری کو تحفتاً موصول ہوتے ہیں اور جن کی مجموعی تعداد ۱۴۳ ہے۔ تیسرا اور اہم حصہ مبادلہ کا ہے جس کے ذریعے ہمیں نئے رسالوں کے حصول میں بڑی مدد ملی۔ ۱۹۷۷ء میں خدابخش لائبریری نے سہ ماہی ادبی و تحقیقی مجلہ "خدابخش لائبریری جرنل" نکالنا شروع کیا۔ اس کی اشاعت کے بعد لائبریری نے ملک اور بیرون ملک بالخصوص پاکستان اور عرب ممالک کے علمی اداروں سے رابطہ قائم کیا اور تبادلے کی ایک اسکیم مرتب کی جس میں بہت نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا خاطر خواہ فائدہ یہ ہوا کہ چندہ اور تحفہ میں آنے والے رسائل کے مقابلے میں تبادلے میں موصول ہونے والے رسائل کی تعداد بڑھ گئی۔ اس وقت ملک و بیرون ملک شمول ہندوستان و پاکستان، بنگلہ دیش، کناڈا، امریکہ، لندن، مکہ، کویت، ریاض سعودی عربیہ اور ایران سے تبادلے میں آنے والے اخبار و رسائل کی تعداد ۱۰۲ ہو گئی ہے۔

مختلف ممالک سے تبادلے میں وصول ہونے والے اہم رسالوں کے نام قابل ذکر ہیں۔

افکار (کراچی)، اخبار اردو (اسلام آباد)، ادب لطیف (لاہور)، اوراق (لاہور)، ناران (کراچی)، فکر و نظر (اسلام آباد)، فنون (لاہور)، الحق (خٹک)، ہمدرد اسلامکس (کراچی)، اقبال ریویو (لاہور)، صحیفہ (لاہور)، الدراسۃ الاسلامیۃ اسلام آباد)، سیپ (کراچی)، تحقیق (لاہور)، تخلیق (لاہور)، اردو زبان (سرگودھا)، نہاج (لاہور)، المعارف (لاہور)، نیا دور (کراچی)، نگار (کراچی)، نقوش (لاہور)، ورنٹیل کالج میگزین (لاہور)، قومی زبان (کراچی)، سہ ماہی (اردو) کراچی، سب رس (کراچی) سلامک اسٹڈیز (اسلام آباد)، الفاظ (کراچی)۔

العربی (کویت)، مجلۃ الخلیج العربی (سعودی عربیہ)، اخبار التراث، العربی صفات ... جرنل فار سائنس اینڈ انجنیئرنگ (ظہران)، مسلم ورلڈ لیگ (مکہ)، مسلم آثار ... جدہ)، جرنل فار ہسٹری آف عربک سائنس سیریا، رسالۃ الخلیج (ریاض)، رابطۃ العالم اسلامی (مکہ)، مجلہ معہد المخطوطات العربیۃ کویت، مجلۃ کلیۃ الآداب (ریاض)، امرکز الوثائق

السانیخیتہ (بحرین)۔

تشبیر ودانش (ایران)، آئندہ (ایران)، آئینہ اردو (کناڈا)، انگلش آف انٹرنیشنل (لندن)، اینول آف اردو اسٹڈیز (شکاگو)۔

یہ تو تھا اخبار و رسائل کا جائزہ۔ آیئے اب ہم ایک نظر شعبہ کی اندرونی کارکردگی پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں تاکہ اس کی اندرونی کارکردگی اور پیش رفت کا بھی جائزہ لیا جا سکے۔

خدا بخش لائبریری میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے محفوظ ذخیروں کے علاوہ اخبار و رسائل کے بھی قدیم و جدید ذخیروں کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تک خدا بخش لائبریری میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی اخبار و رسائل کے 1367 عنوانات مجلد شکل میں محفوظ ہیں اور جن کے شماروں کی جملہ تعداد 10863 ہے۔ ۱۹۷۵ تک کے ان تمام ادبی اور تحقیقی رسالوں کے مضامین کا انڈکس کارڈ بھی تیار کر لیا گیا ہے جن کی مجموعی تعداد دو لاکھ ہے۔ اس سے ادب کے میدان میں کام کرنے والوں کو رسائل کی ورق گردانی نہیں کرنا پڑے گی بلکہ چند منٹوں میں مطلوبہ رسائل کے مضامین کا وہ انڈکس کارڈ کی مدد سے پتہ چلا سکتے ہیں۔

رسائل کے سلسلے میں شعبہ کی کارکردگی یہیں محدود ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہماری پیش رفت جاری ہے۔ ۱۹۷۵ کے بعد جناب محمود عالم صاحب اسسٹنٹ لائبریرین خدا بخش لائبریری نے ۷۷-۱۹۷۶ء کے اردو رسائل کے مضامین کا اشاریہ تیار کیا ہے جسے "کتاب نما" نے "اردو ادب ۷۷-۱۹۷۶ میں" کے عنوان سے اپریل ۸۷ء کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ کمی باقی رہ گئی تھی۔ صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ۱۹۷۵ کے اردو رسائل کا پنج سالہ اشاریہ مرتب کیا جائے چنانچہ اس پر کام شروع ہوا اور ۱۹۷۶ تا ۱۹۸۰ کے پنج سالہ رسائل کے اشاریہ کا کام مکمل کر لیا گیا ہے جو جلد ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ جائے گا۔ ۱۹۸۰ کے بعد بھی ۸۵-۱۹۸۱ کے پنج سالہ اشاریہ کے کام کا سلسلہ جاری ہے جو اس سال کے خاتمہ تک مکمل کر لیا جائے گا۔

۱۹۷۵ء سے قبل کے بیشتر رسائل ایسے بھی ہیں جن کا فائل مکمل نہیں ہے اس سلسلے میں ہماری کوشش ہے کہ ہم ان تمام رسالوں کا فائل مکمل کر سکیں۔ اس سلسلے میں مختلف اداروں سے رسالوں کی خریداری کا سلسلہ جاری ہے۔ جس سے ہمیں گیپ کی تکمیل میں مدد مل رہی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوامی سطح پر ہمیں لوگوں کا تعاون

باقی برصفحہ

حسینی جاوید

قلمی دوستی

محترمہ صبیحہ! تسلیمات

دوماہی "فلاں فلاں" میں قلمی دوستی کے کالم کے تحت آپ کی ایک خوبصورت تصویر
ساہے۔ اس کے علاوہ بہت سی اور معلومات بھی فراہم ہوئی ہیں۔ مثلاً تعلیم، مصروفیات، عمر
چپیاں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی کہ آپ کو خط لکھنا
چاہیئے، اصل بات یہ ہے کہ ہم دونوں کی پسند اور خیالات میں کافی یکسانیت پائی جاتی
۔ میں بھی آپ ہی کی طرح سنجیدہ ہوں اور چھچھورا پن مجھے قطعی پسند نہیں ہے۔ فلمیں بھی کم کم
دیکھتا ہوں۔ کیونکہ آج کی فلمیں دیکھنے سے بیک وقت دو چیزیں خراب ہوتی ہیں، ایک اخلاق
دسری آنکھیں۔ ہاں ایک اور حقیقت یہ بیان کردوں کہ میں بہت شرمیلا واقع ہوا ہوں،
وجہ ہے کہ کسی لڑکی کو خط لکھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ آپ اپنے بارے میں بتلائیں تو اطمینان ہوگا
جواب کا منتظر! فقط اشرف

محترم اشرف صاحب! آداب وتسلیم۔

آپ کا خط ملا، شکریہ! دوماہی "فلاں فلاں" میں جب سے تصویر، نام اور پتہ چھپا ہے
ں کا تانتا سا بندھ گیا ہے۔ یہ سارے خط لڑکوں ہی کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ سب کے سب یونیورسٹی
ے فارغ التحصیل معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مزے کی بات یہ ہے کہ ان سب نے آپ ہی کی
چدوا نح کیا ہے کہ وہ بالکل پہلی مرتبہ کسی لڑکی سے مخاطب ہیں۔ یہ جان کر واقعی بڑی

جاگیردار باؤنڈری، اسٹیشن روڈ، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹرا)

میرا قصور ہی ، سماج میں اتنا بڑا انقلاب کیسے آیا ؟ جانے دیجئے ، فی الحال اس
مسئلے میں الجھنا نہیں ہے ۔ کہیئے مزاج کیسے ہیں ؟ آپ تو بڑا اچھا خط لکھ لیتے ہو
آپ کے خط میں خلوص کا بحر بیکراں نظر آیا ۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ا
طرح اور لڑکیوں کے جواب دے رہی ہوں گی ۔ نہیں بالکل نہیں ، آپ پہلے شخص
آپ شرمیلے واقع ہوئے ہیں ، اور اسی کمزوری کے نتیجے میں کسی لڑکی نے ابھی تک خط و
نہیں ہو سکی ہے ، مجھے یہ پڑھ کر بڑا ترس آ گیا ۔ کیا آپ اپنی تازہ ترین تصویر بھیجنے کی ز
گوارا کریں گے ؟ باقی باتیں تصویر کے آنے اور عمر کا اندازہ لگانے کے بعد ہولیں گی
خدا حافظ — فقط — جمیلہ

محترمہ صبیحہ ! تسلیم

آپ کے خط کا جواب بہت عجلت میں اور بغیر کسی تاخیر کے دے رہا ہوں ۔ کسی لڑ
کو دیکھ کر میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی ، اس کا آپ اندازہ نہیں لگا پائیں گی ۔ سر سے پیر
خوشی اور مسرت کی جھرجھریاں محسوس کر رہا ہوں ۔ یوں لگ رہا ہے حلق میں کوئی چیز
اٹک رہی ہے ، شاید دل ہی ہو ۔ کمبخت خطرناک حد تک اچھل کود میں معروف ہے ۔
میں اپنی حقیقی کیفیت بیان کر کے آپ کو بور کرنا نہیں چاہتا ۔ محترمہ ! تصویر حاضر ہے ،
تازہ ترین ہے ۔ جس انداز سے میں اس میں کھڑا ہوں ، وہ میرا اپنا خاص اور میرا
اسٹائیل ہے ۔ گھر کے سبھی لوگ اس انداز کو دیکھ کر کسی مشہور فلمی ادا کار کا نام
ہیں ، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا ، آپ ہی بتلا سکتی ہیں کہ میرے گھر کے افرا
خیال کہاں تک درست ہے ۔ ہاں ، یہ ضرور لکھیں کہ کیا میں آپ کی دوستی کے قابل ہوں ،
فقط — اشرف

ڈیئر اشرف ! تسلیم ۔

بھئی واہ ! آپ اتنے اچھے ہو سکتے ہیں ، اندازہ نہیں لگا پائی تھی ۔ میرا خط ملنے
بعد آپ کی جو کیفیت ہوئی ہے ، میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں ۔ اس قدر خوش ہو کر خو
اپنے آپ کو ہلاک مت کیجئے ۔ ابھی ہم کو دنیا بہت دیکھنی ہے ۔ ڈھیر سارے خطوط لکھ
ہمت اور حوصلہ پیدا کیجئے ۔ کل ہم نے یہاں ایک پکچر دیکھی تھی ، بڑی اچھی لگی تھی ۔ اس م
موہن چوٹی نام کا ایک ادا کار بھی ہے ، جو آپ ہی کی طرح کا ہے ۔ آپ کے گھر کے ا
کا اندازہ صحیح ہے ۔ میں ان کی فراست اور تدبر کی داد دیتی ہوں ۔ تصویر سے آ

پہلے ہی سال رہ ڈال رہے تھے۔ اپنی حقیقی عمر کے بارے میں مزید بتائیں۔

باقی خیریت ہے۔ فقط ۔ صبیحہ

ڈیر صبیحہ! تسلیمات

آپ نے مجھے ڈیر لکھا اور جواباً میں آپ کو ڈیر لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ حوصلہ افزائی کے لئے مشکور ہوں۔ شاید آپ اسی طرح حوصلہ بڑھاتی رہیں گی تو شاید میں آپ کا سامنا کرنے کے لئے خود کو تیار کر پاؤں گا۔ ہاں — آپ نے میری عمر کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ ڈیر صبیحہ! — آپ کا شبہ درست نہیں ہے، میری امی کہتی ہیں کہ آرمسٹرانگ نے جب پہلی مرتبہ چاند پر قدم رکھا تھا تو میں اس وقت کوئی پندرہ برس کا چھوکرا تھا۔ چاند کا حوالہ اس لئے دے رہا ہوں کہ گھر میں سب لوگ مجھے چاند پاشاہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ بھی عجب اتفاق تھا کہ آرمسٹرانگ کی گاڑی جیسے ہی چاند کی زمین پر اتر پڑی تھی، عین اسی وقت میں یہاں کرۂ ارض میں اچانک بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ بس یہ واقعہ میری زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ بن گیا ہے۔ آپ بھی اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ بتلائیے نا۔

جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا

آپ کا اشرف

اچھے چاند پاشاہ جی! آداب و نیاز۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی پر سیاروں کا اثر غالب ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ جس لڑکی سے قلمی دوستی کی ہے، وہ بھی سورج کے عتاب کا شکار بن چکی ہے۔ یعنی جب میں اس دنیا میں وارد ہوئی تو اس وقت طویل سورج گہن چل رہا تھا۔ چنانچہ نتیجہ کے طور پر میرے ایک پیر میں معمولی سا فرق آگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے گھر والے بھی مجھے شمس النساء کہہ کر پکارتے ہیں۔ صبیحہ تو ایک قلمی نام ہے۔ بہر حال چاند پاشاہ اور شمس النساء دونوں اہم سیاروں سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ واقعی قسمت کی دین ہے۔ ہم ہی دین جو جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کی ... شمس النساء مجید

ہیلو متوقع بیوی شمس! جیتی رہو

تمہاری تحریر کا حیرت انگیز اور غیر متوقع تبدیلی کو عقلمندی یک کا نام دے کر اس ہی

مزید استحکام کا آئندہ منصوبہ بنایا۔ ہم دونوں جب مل جائیں گے تو کائنات کے کونے کونے میں عشق کی حکمرانی ہوگی اور ہماری فیض رساں جوڑی سے ذرہ ذرہ استفادہ کرے گا۔ تم نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا ہے، اب میں خوشی سے کانپ نہیں رہا ہوں، تمہارے حوصلہ افزا ردعمل کا ہی نتیجہ ہے کہ اپنے حواس کو یکجا رکھنے میں کامیاب ہو سکا ہوں، ورنہ اس طرح کی انتہائی خوشی کے موقع پر میرے پیر سیٹیاں بجاتے ہوتے اور میرا وجود کانپ گیا ہوتا بہرحال میں دل و جان سے حاضر ہوں، بس حکم کی دیر ہے، ڈیر شمسو! یہ بھی بتلاتی چلو کہ دن میں کتنی مرتبہ مجھے یاد کرتی ہو اور اس یاد کے دوران آہوں کا کیا تناسب ہے؟ جب سے تم سے دوستی ہوئی ہے، یہاں نیند رخصت ہو چلی ہے اور چین کا کوسوں پتہ نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ موجودہ دور کا عشق جوئے شیر لانے سے پھر بھی بہتر ہے۔ کیونکہ وہ مشقت طلب نہیں ہے۔ کہیں تم یہ نہ سمجھنا کہ میں محنت و مشقت سے گھبراتا ہوں۔ ابھی تم مجھے دیکھی ہی کہاں ہو! رونمائی کا کب ارادہ ہے؟ بھئی اب تو ہم بہت بے چین ہیں۔ خدارا عجلت کریں۔

تمہارا پرستار — چاند پاشاہ

شوہر مجوزہ جناب چاند پاشاہ! اچھے رہو۔

اپنی امکانی جوڑی کے عاشقانہ مستقبل کے بارے میں جن نیک خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ دنیا کے لئے ہم ایک مثال بن جائیں اور آنے والی نسلیں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور سوہنی مہیوال کو بھول جائیں اور صرف ہمیں ہی یاد رکھیں۔ یہ ایک اچھا راستہ منتخب کیا ہے ہم نے! مفکر، دانشور اور سائنسداں بن کر دنیا میں نام کمانا آسان نہیں رہا ہے۔ کم نوٹ دانشور نے ہنرمندی اور دانشوری کے سارے راستے بند کر رکھے ہیں۔ رہی سہی کسر ذات پات کی منافرت نے پوری کر دی ہے۔ بہرحال میں نہیں چاہتی کہ لکچر بگھار کر اچھے خاصے رومانی پرور ماحول میں تلخ حقائق کی تلخیاں گھول دوں۔ جس گاؤں کو ہمیں جانا نہیں ہے اس کا پتہ کیوں دریافت کریں۔ عشق و محبت کے کوچے میں اپنا مقدر بن جائیں تو کیوں نہ ہم ان کوچوں کی خاک چھاننے ہی کو اپنا حاصل بنا لیں! تم نے رونمائی کے بارے میں لکھا ہے، ڈیر چاند — آخر یہ کیا جلدی ہے۔ عاشقانِ سلف کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "انتظار" میں بڑا لطف ہے۔ لہٰذا صبر کے دامن کو تھامے رہو اور انتظار کا لطف اٹھاؤ!!

تمہاری شمسہ

نہیں، نہیں، نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا [illegible] کہ اب تو بہ ہے بلکہ میں تمہارے پاس دوڑا دوڑا چلا آؤں۔ ایک ہی بات کا [illegible] ہے۔ تمہارا عیب معلوم ہو جائے [illegible] کا کرب [illegible] بھی ہوشمند اپنے لئے اس انجام کو پسند نہیں کرے گا، ہم تو اس ماڈرن [illegible] ترقی پسند عشاق ہیں، سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھائیں گے۔ میرے پاس تمہارا پوسٹل اڈریس ہے، یہ بتلاؤ کہ اسٹیشن سے تمہارے گھر آنے کے لئے کون سا راستہ قریب تر رہے گا؟ یا پھر تم لینے کے لئے اسٹیشن پہنچ جاؤ گی؟ فوری مطلع کرو۔

تمہارا: چاند

دل پھینک شہزادے اشرف! آداب۔

حیرت ہے اپنی پرانی عادت سے تم ابھی تک دستبردار نہیں ہوئے ہو! میں سمجھا تھا کہ ایک اچھی ملازمت کے بعد تم مصروف ہو جاؤ گے اور اپنے دل کو سنبھال کر رکھو گے لیکن تم اپنی روش سے کبھی باز نہیں آؤ گے، مجھے معلوم تھا کہ تم "دوماہی" فلاں فلاں کا پابندی سے مطالعہ کرتے رہو گے۔ چنانچہ تمہیں آزمانے کی خاطر ہی میں نے جنوبی ہند کی ایک قدیم مگر اس وقت کی حسین فلمسٹار کی تصویر 'قلمی دوستی' کے کالم میں چھپوا دی تھی تم حسب عادت اس خوبصورت چہرہ کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے اور توقع کے مطابق خطوط کا لامتناہی سلسلہ قائم کر لیا۔ دیکھو ڈیر ---- قلمی دوستی کا کالم تم جیسے موقع پسند سڑک چھاپ فرہادوں کے لئے نہیں ہے، اس کی قدر کرنا سیکھو اور نیک نیتی و اخلاص کے ساتھ جو بہن بھائی دوستی کے رشتے استوار کرنے کے خواہشمند ہوں، ان کے لئے رکاوٹ نہ بنو! ہاں ---- میرا خط دیکھ کر تم یقیناً حیران ہوں گے۔ چار ماہ قبل جب تم سے آخری بار ملا تھا، اس کے فوری بعد مجھے بھی نوکری مل گئی تھی، اور اب میں اسی فلیٹ میں مقیم ہوں جہاں تمہاری خیالی محبوبہ شمس النساء عرف شبو رہتا ہے۔ [illegible] آج تو جسارت کے لئے معذرت خواہ ہوں! خط لکھتے رہو!! تمہارا دوست ---- جعفر جمال

شکاری

شیر کا حملہ

شیر بجز صورت ہائے ذیل کے حملہ نہیں کرتا

(۱) جبکہ وہ زخمی ہو چکا ہو (۲) جبکہ اس کو حملہ کا اندیشہ ہو۔

(۳) جبکہ غذا سے محروم ہونے کا اندیشہ ہو (شیر بھوکا ہو۔

(۴) بچہ کشی کے زمانہ میں۔ (۵) جبکہ وہ بچہ والی شیرنی ہو۔

جن لوگوں پر شیر یا تیندوے یا ببر کا حملہ ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ جو چیز ان کو یاد رہتی ہے وہ اس کی سانس کی خاص قسم کی چبھتی ہوئی بو ہے۔ سی پی کے فارسٹ افسر مسٹر لینڈ پر ۱۹۲۳ء میں شیر نے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ ان کا بیان ہے کہ سال ہا سال تک شیر کی سانس کا دائمی نقش ان کے دماغ میں رہا۔ شیر کے حملہ اور زخم پہنچانے کے دوران میں کس قسم کا احساس ہوتا ہے اس کو ایک شکاری مسٹر اسٹریکن نے لکھا ہے۔ اور بھی جن شکاریوں کو شیر یا ببر کے حملہ کا ذاتی تجربہ ہوا ہے ان کی تحریر کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

مسٹر اسٹریکن لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک شیرنی کو زخمی کیا اور خون کے نشانات پر اس کا پیچھا کیا۔ اپنی (۱۲) بور گن اور بندوق بھر کر جیسا ایسے مواقع پر ہمیشہ کیا کرتے تھے آگے چلے۔ پیچھے مقامی شکاری ٹیکا رائفل لئے ہوئے ساتھ تھا۔ اس کے پیچھے ایک صاحب "مسٹر ول" اور سب سے پیچھے "مسٹر لے" تھے۔ یہ ایک (۱۰ یا ۱۵ فٹ) کھلے ہوئے حصے کی طرف سے ابھی نکلے تھے کہ سیدھے ہاتھ کی طرف گھنی جھاڑی میں سے شیرنی نے چھوٹی یعنی کم لمبی مسلسل کی آوازیں دیں۔ یہ حملہ کرنے والے شیر کی عجیب اور ناقابل فراموش آواز ہوتی ہے۔ جھاڑی گھنی ہونے کی وجہ سے یہ کچھ دیکھ نہ سکتے تھے۔ اس خیال سے یہ اپنی جگہ کھڑے رہے کہ جسم پر آنے سے قبل یہ اس کو گرا دے سکیں گے۔ یہ دل ہلا دینے والی آوازیں جلد جلد قریب تر ہونے لگیں۔ ابھی تک بھی انھیں کچھ نظر نہیں آیا بجز اس کے کہ شیرنی کے ان کی طرف آنے کی وجہ سے جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔ شیرنی کے ارادے کے متعلق اب کوئی شبہ نہ تھا مگر

حملہ کو روکنے کا بھی کوئی موقع باقی نہ تھا۔ شیرنی سب سے پہلے ان کو اس وقت نظر آئی
ب وہ ان کے اوپر جست کر چکی تھی۔ ان کی بندوق پہلے سے کندھے کو لگی ہوئی تیار تھی انہوں
نے دونوں نالیاں چلا دیں جبکہ شیرنی ہوا میں معلق تھی۔ ان کی بندوق پہلے سے کندھے کو
لگی ہوئی تیار تھی۔ اس کے بعد میں شیرنی ان پر تھی جس کی ٹکر نے انہیں پیچھے دھکیل دیا
ان کی بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر چکر کھاتی ہوئی دور جا گری۔ یہ واقعہ کہ شیرنی سے ذرا
ہٹ کر گرے غالباً ان کی جان بچنے کا سبب ہوا کیونکہ ان کے جسم کے اوپر کا حصہ شیرنی
کے دست رس سے دور تھا۔ جبکہ شیرنی ان کے عجلت میں کئے ہوئے فائر کی وجہ سے پہلے
ہی پاس سے کر لوٹ کر ان پر گری مگر شیرنی کے سامنے کے پنجے اور دانت سلامت تھے۔ اور
اس نے ان کو اپنی طرف کھینچ کر بائیں پیر کو چبانا شروع کیا۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے
سنا تھا ایسے مواقع پر انسان کو اپنے سابقہ گناہ اور خطائیں یاد آتی ہیں گو کہ یہ بے ہوش نہیں ہوئے
مگر ان کا بیان ہے کہ ایسی کوئی چیز انہیں یاد نہیں آئی۔ جب شیرنی ان کے پاؤں کو چبا رہی تھی
تو انہیں درد معلوم ہو رہا تھا اور نہ زیادہ تکلیف ہی ہو رہی تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ تکلیف کا
احساس شیرنی کے پہنچائے ہوئے زخموں تک محدود تھا۔ ایک بندوق کی آواز چلی اور اس کے ساتھ ہی
ایک گرم سرخ لوہا ان کے پاؤں میں سے گزرتا ہوا معلوم ہوا جس کو شیرنی اب تک چبا رہی تھی۔
اس کے ساتھ ہی شیرنی مر کر گر گئی۔ مسٹر [illegible] کی بندوق کی گولی اس کے دماغ میں سے ہوتی ہوئی ان
کے پاؤں میں سوراخ کر کے نکل گئی۔ گو کہ شیرنی کے چبانے سے ان کے پاؤں کی ہڈیاں چور چور ہو گئی
تھیں۔ جب تک بندوق کی گولی نہیں گزری انہیں صرف ایک قسم کے صرف سن ہو جانے کا سا احساس
ہو رہا تھا۔ اور اگرچہ کہ نسبتاً یہ کم درجہ کی مضرت تھی مگر انہیں اس کا پورا احساس ہوا۔ شیرنی کے
کے دانت ہنوز ان کے پاؤں میں گڑے ہوئے تھے۔ اس کے جبڑے کھول کر علٰحدہ کئے گئے اور
[illegible] کے پنجے ان کے سیدھے پاؤں میں سے علٰحدہ کئے گئے۔ اس کے بعد یہ کھڑے ہو کر دیکھ سکے
[illegible] زخموں کی کیا نوعیت ہے۔ مگر انہیں فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ ان کے آئندہ حالات کچھ زیادہ درخشاں
نہ ہوں گے۔ سیدھا گھٹنے کے پاس سے کولھے تک گہرے زخم تھے [illegible] بھی آخر میں چبا دیا گیا
گو کہ انہیں اس کی مطلقاً خبر نہ ہوئی کہ ان کا ہاتھ بھی شیرنی کے منہ میں تھا۔ سینہ پر ایک پنجہ
[illegible] تھے [illegible] پنجہ سے [illegible] گر [illegible] گو کہ سر بچ گیا۔ [illegible]
[illegible] کے [illegible] زخم آئے تھے جبکہ شیرنی نے انہیں اپنی طرف گھسیٹا تھا [illegible]
[illegible] ہوتا تھا [illegible] ہاتھ سے علٰحدہ ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھی جنہوں نے یقینی موت

جھٹکا دے کر بچا لیا تھا۔ وہیں اٹھا کر [illegible] گرجستہ [illegible] کے جنگل کی [illegible]
ہاتھ انھوں نے خود جنگل طے کیا۔ مگر اس کے بعد ہر چند کوشش بھی ہوئی معلوم ہونے لگی جو خون
بہ جانے کا لازمی نتیجہ تھا۔ ان کا ایک ہاتھ اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ مگر مقامی ڈاکٹروں کی
کوششوں مضبوط قوی کی وجہ سے یہ صحتیاب ہو گئے۔

مسٹر ایچ کرن کے ہاتھی پر شیر کے حملہ کا واقعہ یوں لکھا ہے کہ ایک شیر کو جھاڑی میں
زخمی کیا تھا۔ دوسرے دن ہاتھی پر بیٹھ کر اس کی تلاش کے لئے نکلے۔ بہت کچھ تلاش کیا مگر
نہیں ملا۔ مہاوت سے انھوں نے کہا کہ واپس چلو۔ ایک گھاس کے جھنڈ میں سے اس نے ہاتھی
بڑھایا۔ غالباً ہاتھی کا پاؤں زخمی شیر سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی گرجدار آواز ہوئی کہ
ہاتھی کے منہ پر شیر نے پنجوں اور دانتوں سے حملہ کر دیا۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں
اس کی کوشش یہ تھی کہ سر کے اوپر چڑھ جائے۔ یہ ادھر اس فکر میں تھے کہ اچھا نشانہ
لگانے کا موقعہ ملے۔ ہاتھی خوف زدہ ہو گیا اور باوجود مہاوت کی کوششوں کے پلٹ کر بھاگا
مگر شیر بھی ہاتھی ہی پر جما رہا اور کسی نہ کسی طرح جدھر یہ بیٹھے تھے اس طرف ہٹ کر
ہاتھی کے اس یکایک پلٹنے سے یہ اپنی جگہ سے الٹ گئے اور ہاتھی کے گلے کی رسی پکڑ
اب صورت یہ تھی کہ یہ مثل گھڑیال کے لاٹ کے لٹک رہے ہیں۔ شیر ان کے کان میں
ڈکار رہا ہے۔ ہاتھی بری طرح چیخیں مارتا ہوا جھاڑی میں سے بھاگ رہا ہے اور مہاوت
پکار رہا ہے۔ یا اللہ بچانا۔ شیر کی گرم اور جھلستی ہوئی سانس ان کے منہ پر آ رہی تھی اور اس
کا پنجہ ان سے (۶) انچ کے فاصلہ پر تھا۔ باایں ہمہ شیر ان کے اوپر یا گدی پر نہ چڑھ سکا
تھا۔ (بعد میں یہ معلوم ہوا کہ رات کی گولی شیر کے پیٹ میں لگی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے
پچھلے پنجے پوری طرح استعمال نہ کر سکتا تھا) موصوف کہتے ہیں کہ الفاظ اس وقت کی دم گھونٹنے والی کیفیت
ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ جب یہ سب جنگل میں سے اس حالت میں سے دوڑے چلے جا رہے تھے کہ ہاتھی
مجنونانہ طریقہ پر چنگھاڑ رہا ہے، شیر دھاڑ رہا ہے اور منہ سے کف اڑ رہا ہے اور اس کا پنجہ ہر آن
ان سے قریب تر آتا جاتا ہے۔ اور یہ ہیں کہ ایک ہاتھی پر لٹک رہے ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے بندوق تھامے
ہوئے ہیں جو ہاتھی کی پیٹھ پر دھری تھی۔ ایک مافوق البشر کوشش کے ساتھ یہ ہاتھی کی پیٹھ پر آ
گئے اور گرتی ہوئی شاخوں کے طوفان بچنے کے لئے گدی سے چمٹ گئے اور ہاتھی بے تحاشہ جنگل میں سے
چلا جا رہا ہے۔ موصوف کہتے ہیں در اصل کیا واقعہ گزرا یہ پوری طرح یاد نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لمحات اس
درجہ دہشت خیز تھے کہ صحیح صورت حال سمجھنا مشکل تھا۔ بہرحال اس قدر یاد ہے کہ جنگل کا طرح [illegible]

درخت کے پاس سے گزرے۔ ایک دھکا لگا اور ہاتھی پر سے کسی چیز کے زور سے گھسیٹے جانے کی آواز آئی۔ اس کے بعد وہ ایک نالے میں دھنستے ہوئے اترے اور دوسری طرف کا کنارہ پار کر کے ایک کھلی ہوئی جگہ پر پہنچے جہاں مہاوت نے ہاتھی کو ٹھیرایا جو بدحواسی میں مڑ رہا تھا، کانپ رہا تھا اور اپنی سونڈ اچھال رہا تھا اور پاؤں زمین پر پٹک رہا تھا۔ مگر شیر غائب تھا۔ یقیناً اس کا دبدبہ و دہشت نے شیر کو چھڑوا دیا تھا۔ جیبن کی تلاش کے لئے ایک دوسرا ہاتھی منگوانا پڑا۔

لفٹنٹ کمانڈر کوب پر ببر نے حملہ کیا تھا۔ انہوں نے حملے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ انہوں نے زخمی ببر کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ زیادہ خون نہیں گر رہا تھا اور جیسے جیسے آگے بڑھے خون کم ہوتا گیا۔ آدھ گھنٹہ تلاش کرنے کے بعد انہیں خیال ہوا کہ وہ دلدل کے بڑے گھاس میں چھپ گیا ہے جو زیادہ محفوظ تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے ساتھ کے نوکروں سے کہا اس وقت ہم کو ببر نہیں ملے گا۔ اس وقت تقریباً (۲۵) گز کے فاصلے سے ایک گرج کے ساتھ ببر نے حملہ کیا۔ ان کے ہاتھ میں ۷ ایم ایم رائفل تھی۔ انہوں نے فائر کیا مگر بدقسمتی سے دوبارہ لوڈ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جس قدر جلد ہو سکا انہوں نے بندوق کی نال ببر کے منہ میں گھسائی۔ ببر نے سب سے پہلے بایاں گھٹنا اور پھر چبائی(?)۔ انہوں نے اپنا سیدھا پاؤں ببر کے منہ کی طرف بڑھایا اور اس نے فوراً اس کو چبانا شروع کیا۔ انہوں نے ببر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کی زبان پکڑی مگر وہ اتنی چکنی تھی کہ زیادہ دیر پکڑ نہ سکے۔ ان کے قدیم نوکر جمعو(?) میاں نے (۵) گز پر سے فائر کیا۔ ببر کے بھیجے میں گولی لگی اور وہ دوسری طرف الٹ کر گرا۔ اس وقت وہ نہایت خراب و خستہ حالت میں تھے۔ دونوں پاؤں بری طرح زخموں سے چور تھے اور سیدھا ہاتھ بھی زخمی تھا۔ سب مل کر اٹھا کر کیمپ میں لے گئے۔ باورچی کی غفلت سے صرف دو امپیل ان کے ساتھ تھی۔ ایوڈین کی شیشی Hypodermic Anti Tetanus Serum Syringe بیس (۲۰) میل پیچھے اصل کیمپ میں چھوڑ دئے گئے تھے۔ جس طرح بھی ہو سکا انہوں نے زخموں پر پٹی باندھی۔ شام میں اصل کیمپ پر لا کر زخموں میں آیوڈین ڈالا اور Anti Tetanus Serum کا انجکشن اپنے آپ کو دیا۔ اس کے بعد ایسی [illegible] (۳۰۰) میل کا سفر طے کرنے کے بعد دواخانہ پہنچے جہاں گھٹنے کے پاس سے بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا۔ سیدھا پاؤں بچ گیا۔ ۴½ مہینے دواخانے میں رہنا پڑا۔

موصوف لکھتے ہیں کہ جو لوگ اوہام کے قائل ہیں ان کے لئے یہ امر دلچسپ ہوگا کہ جس نے ان کی یہ گت بنائی وہ ان کا تیرھواں ببر تھا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شکار کی تلاش میں کیسے دور دراز جنگلوں میں جانا پڑتا ہے اور خطرہ و تکلیف کی حالت میں کس طرح ہمت و استقلال سے کام لینا پڑتا ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا

کیمیاوی کھاد کی تیاری پر زور

اناج کی پیداوار ایک اطمینان بخش سطح پر پہنچ جانے کے باوجود زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے حکومت کی کوششیں جاری ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا جو موجودہ صدی کے آخر تک 100 کروڑ ہو جائے گی تقاضہ ہے کہ اناج کی پیداوار میں بھاری اضافہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ تلہن اور دالوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ان سب کوششوں کے لئے کیمیاوی کھادوں کی مزید پیداوار لازمی ہے۔

کیمیاوی کھادوں میں بتدریج اضافہ کے باوجود پیداوار اور مانگ کے درمیان خلاء موجود ہے۔ کاشت کاری کے بہتر طریقوں کے بارے میں آگاہی اور آبپاشی کے پانی کی زیادہ بہم رسانی اس سمت میں ایک صحت مند رجحان ہے۔ کیمیاوی کھادوں کی مانگ ساتویں منصوبے کے نشانے سے بھی بڑھ جائے گی۔ گیس سے چلنے والے کیمیاوی کھاد کے جو کارخانے لگائے جا رہے ہیں اور موجودہ کارخانوں میں جو توسیع اور ترقی ہو رہی ہے اس سے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت بڑھ جائے گی۔

ساتویں منصوبے کے تحت 90-1989 تک نائٹروجن اور فاسفیٹ قسم کی کھادوں کی پیداواری صلاحیت بالترتیب 92.53 لاکھ ٹن اور 28.91 لاکھ ٹن کر دینے کی تجویز ہے۔ منصوبے میں اس امر پر بھی توجہ دی گئی ہے کہ اس پیداواری صلاحیت سے حاصل ہونے والی پیداوار 90-1989 اور اس سے آگے کیمیاوی کھادوں کی مانگ پوری کرنے کے لئے کافی نہیں ہوگی۔

کیمیاوی کھادوں کی کھپت گزشتہ تین برسوں میں 77.1 لاکھ ٹن سے بڑھ کر 87.37 لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔

ملک میں پوٹاش کا تجارتی لحاظ سے قابل عمل کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ چنانچہ پوٹاش کی ساری

جس کا سبب ضرورت در آمدات سے پورا کیا جاتا ہے۔ ملک میں کیمیاوی کھادوں کی تیاری آخر میں ان فاسفیٹ قسم کی کھادوں تک محدود ہے۔ ان کھادوں کا کچھ حصہ درآمد کیا جاتا ہے کیونکہ ان کھادوں کی مانگ اور ملکی پیداوار میں متواتر خلا چلا آرہا ہے۔

ساتویں منصوبے کے آخر یعنی 90-1989 تک نائٹروجن اور فاسفیٹ قسم کی کھاد مانگ کا تخمینہ بالترتیب 10 لاکھ ٹن اور 30 لاکھ ٹن ہے۔ مانگ میں اس اضافہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کیمیاوی کھادیں تیار کرنے کی اضافی صلاحیت کی تنصیب کا کام پہلے ہی شروع کیا جا چکا ہے۔

اس وقت جو کارخانے لگائے جا رہے ہیں ان کی تنصیب کے بعد کیمیاوی کھادوں کی ملک کی صلاحیت 95 لاکھ ٹن نائٹروجن اور 29 لاکھ ٹن فاسفیٹ ہو جانے کا امکان ہے۔ کیمیاوی کھادوں کی مانگ ساتویں منصوبے کے بعد بھی بڑھتی جائے گی اس لئے مانگ اور ملکی پیداوار کا درمیانی خلا اور بھی بڑھ جائے گا۔

لہٰذا کیمیاوی کھادوں کے نئے پراجیکٹوں کی تعداد، محل وقوع، جسامت، خام مال دستیابی وغیرہ کے بارے میں متعلقہ تکنیکی و اقتصادی حدود مدنظر رکھی جائیں گی، بارے میں بالتفصیل مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

گیس پر مبنی پلانٹ

بمبئی ہائی اور بیسن کی قدرتی گیس سے چلنے والے 10 کارخانوں میں سے تھل میں دو اور حضیرہ میں دو کارخانوں نے تجارتی پیمانے پر مال کی تیاری شروع بھی کر دی ہے۔ باقی چھ کارخانوں میں سے وجے پور (مدھیہ پردیش) اونلا (اتر پردیش) اور جگدیش پور (اتر پردیش) کے کارخانوں کی تعمیر کا کام آگے بڑھ چکا ہے۔ باقی تین کارخانے جو سوائی مادھوپور (راجستھان) ببرالا (اتر پردیش) اور شاہجہاں پور (اتر پردیش) میں لگائے جائیں گے۔ ان کی تعمیر کا کام ابتدائی مراحل پر ہے۔ حکومت گیس سے چلنے والے کیمیاوی کھاد کے زیر تعمیر کارخانوں پر عملدرآمد کی رفتار کا قریبی جائزہ لے رہی ہے۔

وجے پور، اونلا اور جگدیش پور کے کارخانوں کی تعمیر مقررہ پروگرام کے مطابق ہے اور توقع ہے کہ یہ کارخانے بالترتیب دسمبر 1987، اپریل 1988 اور 1988 میں کام شروع کر دیں گے۔ جبکہ سوائی مادھوپور، ببرالا اور شاہجہاں پور کے کارخانے 1989 میں مکمل ہو جانے کی امید ہے۔

گیس سے چلنے والے ان چھ کارخانوں کی سالانہ پیداواری صلاحیت 3 لاکھ 94 ہزار ٹن نائٹروجن جوکہ امدان کے ساتھ 1330 ٹن یومیہ امونیا اور اتنی ہی صلاحیت کا یوریا پلانٹ بھی لگایا جائے گا۔

صلاحیت کا استعمال

کیمیاوی کھاد کے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت کا استعمال 84-1983 میں 67.9 فی صد تھا جو 87-1986 میں بڑھ کر 83 فی صد ہو گیا۔ خصوصی اہمیت کی بات یہ ہے کہ نائٹروجن قسم کی کھاد تیار کرنے والے کارخانے پہلی بار مجموعی طور پر 80 فی صد پیداواری صلاحیت کو کام میں لا سکے ہیں جو کہ بین الاقوامی معیار سے بھی کارکردگی کی ایک اچھی سطح شمار کی جاتی ہے۔

صنعت کی مجموعی کارکردگی میں جو بہتری ہوئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ نئی قسم کے جو کارخانے لگائے گئے ہیں وہ جلد کام شروع کر سکتے ہیں، پیداوار کی اعلیٰ سطح برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ساز و سامان کی بہتر کارکردگی کے ذریعہ موجودہ کارخانوں کی کارکردگی میں بھی اصلاح کی گئی ہے۔ کیمیاوی کھادوں کی صنعت میں صلاحیت کے استعمال میں آئندہ چند برسوں میں اور بھی اضافہ ہو جانے کا امکان ہے جب کہ بہتر ٹیکنالوجی سے کام کرنے والے اور نئے ساز و سامان سے لیس نئے کارخانوں میں کام شروع ہو جائے گا۔

نئے کارخانے اور تجدید

فرٹیلائزرس کارپوریشن آف انڈیا کے سندری، گورکھپور تلچر اور رام گنڈم کے کارخانوں اور ہندوستان فرٹیلائزرز کے نامروپ، درگاپور اور برونی کے کارخانوں کو جدید سامان سے آراستہ کرنے کے لئے جامع اقدامات زیر غور ہیں۔ جہاں ان اقدامات سے ان کارخانوں کو اپنے بڑے بڑے میکانکی مسائل پر قابو پانے میں مدد ملے گی وہاں جہاں جہاں ضروری خیال کیا جا رہا ہے بوقت ضرورت کام آنے والے بجلی گھر بھی لگائے جا رہے ہیں جن سے ناکافی یا غیر مسلسل بجلی کی بہم رسانی کے مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔

امونیا سلفیٹ کا ایک کارخانہ بھی فرٹیلائزرز اینڈ کیمیکلز ٹراونکور لمیٹیڈ کے ادیوگ منڈل کارخانے کا جدید کاری کے سلسلے میں لگایا جا رہا ہے۔ جس سے ادیوگ منڈل کے کارخانے کو اپنی کاروباری اور مالی کارکردگی کی اصلاح میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ کوچین کے کارخانے میں بوقت ضرورت کار آمد بجلی گھر لگانے کی بھی تجویز ہے۔

باقی صفحہ ۶۴ پر

غزل

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

کبھی مسکراہٹ، کبھی اشکِ پیہم، کبھی جا کے اک نغمۂ روح پرور
اب اس طرح آنے لگا درد تیرا، مری زندگانی میں کروٹ بدل کر

خزانہ مسرت کا دل میں ہے پنہاں، یہ دولت نہ ڈھونڈا کیے عبث جویا
کہستاں کہستاں، بیاباں بیاباں، گلستاں گلستاں، سمندر سمندر

ہر اک شئے جہاں کی سپردِ فنا ہے، فقط اک محبت کو حاصل بقا ہے
ابھی زندہ ہے نام فرہاد و خسرو، نہ دارا ہے باقی نہ باقی سکندر

یہی ہے اگر نو بہاروں کا عالم، تو گلشن کی دنیا خزاں کس کو سمجھے
عجب اہلِ گلزار کی زندگی ہے، کہیں موجِ طوفاں کہیں موجِ صرصر

نہ دل میں محبت، نہ آنکھوں میں الفت، نہ چہروں پہ تاباں ضیائے مسرت
اب ان منزلوں تک بشر آ چکا ہے، تمدن کے خوش رنگ جادے پہ چل کر

یہ بغض و عداوت کے شعلوں کا عالم، زمانہ تو جل کر بھسم ہو چکا ہے
کوئی اب ذرا مجھ کو یہ تو بتائے ابھی آئے گا کیا کوئی روزِ محشر

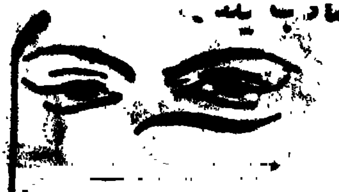
جو معلوم ہوتی ہمیں یہ حقیقت کہ دنیا بیاباں کو کہتی ہے گلشن
تو ہرگز نہ لفظوں کے دھوکے میں آتے، نہ آتے کبھی اپنے گھر سے نکل کر

ذرا ایک قطرے پہ نظریں جما لے، ذرا ایک قطرے کو دل میں بسا لے
ذرا ایک قطرے کی گہرائی پا لے، سمندر کے اے معرکہ زن شناور

قطعہ

نوائے فردا سے بے تاب ہو کر زمانہ نئی کروٹیں لے رہا ہے
سنبھل کر رہے اب ذرا تختِ شاہی، خبردار ہو جائیں اورنگ و افسر

نئی زندگانی ہے اب بحر و بر میں، نئی زندگانی ہے اب دشت و در میں
نئی زندگانی ہے کوہ و کمر میں، یہ جدت کے انداز اللہ اکبر



ڈاکٹر ندیم الرحمن خان شاہین

جب کبھی طے شدہ مقسوم قضا آتی ہے
کام آتی ہے دعا اور نہ دوا آتی ہے

کیا کسی اور کو یہ حسنِ سماعت ہے نصیب
مجھ کو صحراؤں سے سمندر کی صدا آتی ہے

گلبدن خود کو سمجھنے لگے سب ہی ان کو
گل پہ بیٹھے ہوئے بھنوروں کو حیا آتی ہے

اس میں مانوس مہک ہوتی ہے سوندھی سوندھی
تیرے کوچہ سے گزر کر جو ہوا آتی ہے

کس نے مظلوم کی آہوں سے کیا ہے کھلواڑ
عرش کو چیر کے یہ کس کی ندا آتی ہے

کتنے پھولوں کے گریبان کیے ہیں صد چاک
پھر بھی کس ناز سے گلشن میں صبا آتی ہے

یاد آتی ہیں کسی کی زلفیں وہ کالی کالی
جب کبھی جھوم کے ساون کی گھٹا آتی ہے

کون جنگل میں دبے پاؤں یہ چلتا ہے ندیم
خشک پتوں سے کھڑکنے کی صدا آتی ہے

بمعرفت ڈاکٹر شفا، بنگلہ ملا محل بازار، صدر، ناگپور 440001

ثریا صولت حسین ثریا

قلبِ حزیں بھرا سا ہے
طوفاں رکا رکا سا ہے

کس کو ملا ہے دردِ عشق
مجھ کو تو یہ ملا سا ہے

عہدِ خرد عذاب تھا
عہدِ جنوں جزا سا ہے

حسن فریب ہی سہی
گل تو کوئی کھلا سا ہے

دیمک زدہ کسی کا خط
لگتا مجھے نیا سا ہے

ارضِ وطن گلال سے
انساں کا خوں بہا سا ہے

گرد و غبارِ راہ میں
رہزن کہیں چھپا سا ہے

کعبہ ثریا دل میں ہے
تارِ نفس دعا سا ہے

۳۳ نزد ہائی کورٹ، سول لائنس، ناگپور ۴۴۰۰۰۱

غزل

اسد اللہ خان اسد

چال یہ کیسی چل گیا سورج — کچھ اندھیرے اگل گیا سورج
لوگ قدموں کو گن رہے ہیں ابھی — دور کتنا نکل گیا سورج
بول بالا ہے صرف طاقت کا — چاند تارے نگل گیا سورج
پھر سفر ہے یہ کیوں اندھیروں میں — کیا یہ سچ ہے نکل گیا سورج
ہے اک عبرت اسد عروج و زوال
کیسا ابھرا تھا ڈھل گیا سورج

ہیڈ ماسٹر، پردیسی پورہ، کھنڈوہ، نماڑ شرقی (ایم پی)

سلسلہ ص ۳۰

معیار ہے، ریسرچ کا ڈائرکشن صحیح ہے یا نہیں، اگر کلاسیں نہیں ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے، حاضر نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ تو یہ لوگ اس کو دیکھیں گے اور مجھے ڈائرکٹ رپورٹ کیا کریں گے۔ چونکہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے اکیلا ہر جگہ جا کر دیکھ سکوں، تو یہ اگر تین چار گروپ ہو جائیں اور یک گروپ کسی بھی جگہ پہنچ جائے تو اس کا بہت اثر ہوگا۔ میں نے تو اس کا نتیجہ عثمانیہ یونیورسٹی میں دیکھا ہے۔ اسی طرح کا اکیڈیمک مانیٹرنگ، جیسے وہاں انسپکشن کمیشن کا کیا ہے، دو مہینے کے اندر وہاں ایسے ایسے ٹیچر جنہوں نے مہینوں سے کلاسیں نہیں لی تھیں، وہ کلاسیں لینے لگے تھے اور میرے پاس لڑکوں کے بہت سے خط آئے کہ یہ صاحب بہت دنوں سے کلاس نہیں لیتے تھے اب کلاس لینے لگے۔ تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ جنہیں احساس فرض نہیں ہے، اور جو لوگ تنخواہ لینے کے باوجود کام نہیں کرتے ان کو تھوڑا سا خوف، تھوڑا سا خطرہ رہے گا۔

تو میں سمجھتا ہوں ان دو (Measures) اقدامات کے بعد کافی سدھار آئے گا۔

پھر میں خود ہر ضروری جگہ پر جایا کروں گا۔ پھر ہر ایک کا (Self assessment) ذاتی جائزے کا پروگرام بھی رہے گا کہ اب تک کیا کیا ہے۔ ایسے Cases میرے نوٹس میں آئے ہیں کہ تمام عمر گزر گئی ہے، ایک بھی ریسرچ نہیں بنایا، ایک اہم فل بھی نہیں بنایا، کوئی کتاب بھی نہیں لکھی، تو ایسے بھی لوگ ہیں۔

(باقی آئندہ)

حاصل ہو نیز جن لوگوں کے پاس قدیم رسالوں کے فائل محفوظ ہیں یا جن کے ذاتی ذ[illegible]
میں موجود ہوں وہ لائبریری کو تحفۃً یا قیمتاً عنایت کریں۔ کیونکہ لائبریری ہی وہ
ہے جہاں ہم کسی کتاب یا رسالے کو آئندہ آنے والی نسلوں تک محفوظ رکھ سکتے
ہیں کے سلسلہ میں ہم نے کوشش بھی کی ہے کہ اردو، انگریزی کے متعد[illegible]
مقامی اور [illegible] روز ناموں، ہفت روزہ، اور ماہناموں کو بھی مح[illegible]
کر لیا ہے تاکہ ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ اس ضمن میں ۱۹۷۵ سے اب
کے انڈین نیشن، ٹائمز آف انڈیا، انڈیا ٹوڈے، السٹریٹڈ ویکلی، ریڈرس
ڈائجسٹ، سنگم، صدائے عام، دعوت، الجمعیۃ، ترجمان، [illegible]
نقیب اور الرائد کی جلد سازی کروائی گئی ہے جس سے لوگ استفادہ کر رہے ہیں

سلسلہ [illegible]

اندرون ملک دستیاب معلومات میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں بھی کافی پیش ر[illegible]
ہوئی ہے۔ جن کے لئے سرکاری دائرہ کار کا ادارہ پراجیکٹس اینڈ ڈویلپمنٹ انڈ[illegible]
لمیٹڈ اور دیگر ادارے کام کر رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی منتقلی پر مبنی جو بڑے بڑے [illegible]
کارخانے لگائے جا رہے ہیں ان کی تعمیر میں ہندوستانی کمپنیاں اور ادارے کلیدی [illegible]
ادا کر رہے ہیں۔ بہت جلد یہ ادارے نائٹروجن پر مبنی کیمیاوی کھاد کے کارخانے
کے سلسلے میں مکمل مشورہ دے سکیں گے۔

بھارت نے کارخانوں کا ساز و سامان تیار کرنے کے لئے بھی وسیع اور متنوع [illegible]
حاصل کر لی ہیں اور کیمیاوی کھاد کے کارخانوں کا 70 فی صد ساز و سامان اب ملک
ہی میں تیار ہو رہا ہے۔

چند پسندیدہ اشعار

وہ پریم اور پیاس بھرے لگ رہے ہیں — ستر کروڑ لوگ ہوں آج ایک
اگر انسان کو انساں سے محبت ہو جائے — یہی دنیا جو جہنم ہے وہ جنت ہو
الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں — کہ ہر اک دست بوسی کیا قدم بوسی کے قابل [illegible]

[illegible]

جون ۱۹۸۷ء

شاداب

حیدرآباد

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

زرِ تعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپئے	150 روپئے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سالہ 90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات 1000 "	2500 "	450 "	500 "	2000 "

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب، 11-5-147، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

حرف اول

مشاداب کا یہ شمارہ جب آپ کے ہاتھ میں ہوگا آپ عید الفطر کی خوشیاں منا رہے ہونگے۔ ان خوشیوں میں شاداب آپ کا شریک ہے۔ مسلمانوں کے لئے عید کا یہ دن شادمانی اور مسرت کے جو سامان پیدا کرتا ہے اس کی کوئی مثال ہے نہ حد و حساب۔ یہ ماہ رمضان کی عبادتوں اور ریاضتوں کے بعد آتی ہے جس میں مسلمان آنے والے پورے سال کے لئے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں تیار اور مستعد کرتا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن شریف نازل ہوا۔ جو تمام بنی نوع انسان کے لئے اور ہر آنے والے وقت کے لئے ایک مشعل ہدایت ہے۔ مسلمان ماہ رمضان میں قرآن سے اپنے تعلق کو تازہ کرتا ہے، اسے پڑھتا ہے، بار بار پڑھتا ہے اور اپنے لئے راہ ہدایت کو اپنے سامنے کھول لیتا ہے اور اس تمام تیاری کی تکمیل کے بعد آج کے دن وہ عید کی خوشیاں مناتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی توفیق عطا فرمائی کہ وہ قرآن سے اپنا ناطہ تازہ کرے اور آنے والے سال میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے کے لئے پھر سے کمر بستہ ہو جائے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ تمام قارئین شاداب اور ہمارے دیگر بھائی اس نعمت عظمیٰ کے مستحق ہوں اور صحیح معنی میں عید کی خوشیاں انھیں نصیب ہوں۔

اردو ہندوستان کی ہند آریائی زبان ہے اور دستور کے آٹھویں شیڈول میں اس طرح دوسری زبانوں کے ساتھ اردو بھی ہندوستان کی ایک قومی زبان ہے۔ مگر اردو کا المیہ یہ ہے کہ جب ہندوستان کی لسانی تقسیم ہوئی تو ہندی، تلگو، بنگالی، مراٹھی اور تامل زبانوں کے لئے ایسی ریاستیں قائم تھیں یا بنائی گئیں جہاں یہ اکثریت کی زبان تھیں۔ لیکن اردو کے لئے کوئی ایسی ریاست نہ تھی جہاں کی یہ اکثریتی زبان ہو حالانکہ یہ زبان پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو جموں اور کشمیر کی سرکاری زبان بنا دیا گیا جہاں کی اکثریتی زبان کشمیری تھی اور باقی پورے ملک میں اس کے ساتھ مخالفانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ یہ ناروا سلوک آزادی سے پہلے ہی سے شروع ہو گیا تھا جبکہ ملک کی رابطہ کی زبان کے تعلق سے بحث شروع ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو رابطہ کی زبان کا درجہ دینا چاہتے تھے جبکہ فارسی رسم الخط میں اردو کے طرفداروں کی بھی کمی نہ تھی۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ اردو اور ہندی میں سوائے رسم الخط کے کوئی فرق نہیں ہے لہذا ہماری رابطہ کی

زبان دیوناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھی جائے اسے اردو یا ہندی کے بجائے "ہندوستانی" کہا جائے۔ اس مسئلہ پر بحث چلتی رہی اور ۱۹۵۰ء بالآخر ہندی ناگری رسم الخط کے ساتھ رابطہ کی زبان قرار دی گئی۔ دستور میں اس کا ذکر کیا گیا اور اس میں سنسکرت کے زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کرکے اسے ناقابل فہم بنا دیا گیا اور وہ آج تک قبول عام کا درجہ حاصل نہ کر سکی بلکہ جنوب میں اس کے خلاف مخالفت اور زیادہ ہو گئی۔ برخلاف اس کے اردو عوامی زبان بنتی گئی، اے۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق پورے ملک میں ۲ کروڑ ۸۶ لاکھ کی مادری زبان اردو ہے۔ نیز ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی مادری زبان کوئی اور ہے لیکن اردو ان کی ثانوی زبان ہے جسے وہ نہ صرف بولتے ہیں اور پڑھتے ہیں بلکہ اس زبان میں ادب کی تخلیق بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس زبان کا المیہ یہ ہے کہ پورے ملک میں کسی علاقہ کی اکثریتی زبان نہیں ہے۔ گو ایسے علاقے کئی ہیں جہاں یہ 40 فی صد سے بھی زائد آبادی کی زبان ہے۔ ہندی والوں کو یہ ڈر ہے کہ اردو کو اس کے جائز حقوق دئے گئے تو یہ پھلے پھولے گی اور رابطہ کی زبان کا مقام حاصل کرلے گی۔ ان کا یہ ڈر بے بنیاد ہے۔ اردو والوں کی ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اردو والوں کا مطالبہ ہے کہ اردو کے ساتھ انصاف کیا جائے، اردو میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ثانوی تعلیم میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کو دوسری زبان کی حیثیت سے سیکھنے کے مواقع فراہم ہوں۔ جہاں ۱۰ فیصد اردو بولنے والے ہوں وہاں اردو کی متوازی جماعتیں قائم کی جائیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جہاں دوسری زبان ذریعہ تعلیم ہو، اردو میں بھی جواب لکھنے کی سہولت دی جائے۔

نظم و نسق میں، عوامی اداروں میں، عدالتوں میں، ملازمتوں میں اردو کو جگہ دی جانی چاہئے۔ زبان عوامی تہذیب اور کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہوتا لیکن اردو کو مسلمانوں سے اور ہندی کو ہندوؤں سے وابستہ کر دیا گیا ہے جو نہایت نامناسب اور نقصان دہ ہے۔ اردو بلا لحاظ مذہب و ملت ہندوستانیوں کی زبان ہے۔

ضرورت ہے کہ اردو کو ایک عوامی ہندوستانی زبان کی حیثیت سے قبول کیا جائے اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ ایسا کرنا قومی یکجہتی کو بنائے رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے ناگزیر ہے۔

ooo

ادارہ شاداب حیدرآباد ۵ جون ۱۹۸۶ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ قسط دوم

مسلم پرسنل لا اور سیول کوڈ

اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس پر بھی مخالفانہ صف آرائی Opposed tooth and nail کا مظاہرہ کیا جس کی مثال شائد تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی اس شدت احساس اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود فرقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) ______ متاثر ہوتی تھی کو اس نظر سے دیکھا گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی ملک گیر مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ DIALOGUE اور پریس کانفرنس میں کہا ہے "انھوں نے اس بارے میں اصول " احساس تناسب " Sense of proportion " کو بھی بالائے طاق رکھ دیا"

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلوسوں کے ساتھ (جس میں نظم و نسق و احترام، قانون اور سنجیدگی، وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا) ارڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ و ہدایت سے جمہوریہ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا۔ انھوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کیں اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں ان کو اس مسئلہ کی نوعیت و اہمیت، مذہبی اور شرعی نقطۂ نظر اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات و تاثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب ان کے جلسوں اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہونچ چکی ہوگی) صبر و سکون و احترام کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور وہ اس بارے میں مطمئن ہو گئے ہیں کہ اسلام طبقۂ اناث (FEMALE SEX) بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ

ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور ان کو حق دیتا ہے، وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرأت اور خصائل دردمندی اور عزم و فیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ بل پارلیمنٹ میں لائے اور اس پر واضح اور دل توڑ وہپ (WHIP) جاری کیا اور وہ ٦ مئی ۱۹۸۶ء کو "تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل" کے عنوان سے [illegible] اکثریت کے ساتھ پاس ہوا، اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح (جو صحیح و غلط تائید و مخالفت اور خلوص و سیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہے) اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبہ شرافت کے ساتھ اعتراف اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا اور وزیر اعظم صاحب کے نام ملک کے گوشہ گوشہ سے شکریے کے تار آئے، بیرون ملک کے بھی بعض موقر تنظیموں اور علمی مجلسوں نے شکریہ و تحسین کے تار بھیجے، سعودی عرب، کویت، امارات اور برطانیہ کے عربی اخبارات و رسائل نے پہلی مرتبہ اس پر مسرت کا اظہار کیا اور حکومت ہند کی حقیقت پسندی کا اعتراف کیا۔

یہ واقعات کی منطق (LOGIC) اور حقیقت پسندی کا دانشمندانہ تقاضا تھا، اس موقع پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہیمر (E. BODEN HEIMER) نے فلسفۂ قانون اور اس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :-

> کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو، لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا تو اس قانون کو توڑنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابل برداشت سمجھتے ہیں۔ جو حکومت اس قسم کے نظام کو برقرار رکھنے پر مصر ہو اسے اس کو نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پرخطر ہوگا جیسا کہ جان ڈکنسن (JOHN, DICKENSON) نے کہا ہے کہ ہمیں کسی عام اور مشینی ضابطے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابل عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار، اندرونی رجحان کی خلاف ورزی کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی اور اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائے گا"۔

اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ میں اتحاد رائے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے تعاون کرنے کا تعلق ہے، ملک کی تمام مسلم سیاسی وغیر سیاسی جماعتوں و تنظیموں اور مذہبی مکاتیب خیال نے اس سے پورا اشتراک عمل اور تعاون کیا، اور ان کے قائدین نے اس مشترکہ ملی مسئلہ سے پوری دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا، اور ملک کے [illegible] شریک رہے۔ اس سلسلہ میں ناسپاسی ہوگی اگر ہم ان خاص شخصیتوں کا نام نہ لیں، جنہوں نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ سے باہر پوری طاقت اور لیاقت کے ساتھ مسئلہ کی وکالت اور مسلمانوں کے

جذبات کی ترجمانی کی، ان میں ارکان حکومت میں سے جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب اور ممبران پارلیمنٹ میں سے جناب محمود بنات والا صاحب خاص طور پر ملت کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ خواتین میں سے محترمہ نجمہ ہبت اللہ صاحبہ اور بیگم فخر النساء علی احمد صاحبہ اور بعض دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین نے اپنی دینی حمیت اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کا ثبوت دیا، اور اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ صرف مردوں کا طبقہ ہی اس جد و جہد میں شریک اور اسلام کے عائلی قانون سے مطمئن نہیں، بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی اسلامی قوانین سے مسرور و مطمئن اور اس کی برتری اور بہتری کی قائل ہیں۔

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں REFORMERS یا بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہونچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظام فکر دبستان SCHOOL OF THOUGHT اور خالص مطالعہ، غور و فکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر LINE OF DEMARCATION ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہونچے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث CONFUSION ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں۔ وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسے کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب و تمدن کے نظام اور سماجی تجربے و معاشی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے وہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حد فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفہ، سماجیات SOCIAL SCIENCE کا علم تہذیب و تمدن (CIVILIZATION) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذہن کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ تہذیب و ثقافت اور فکر و دانش کا ایک مستقل مدرسہ SCHOOL OF THOUGHT بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک "دین" ہے اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے، اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، اور یہ ان کی زبان اور ان کا فکر نہیں، اس کا بنیادی سرچشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لئے بدرجہ قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسا ہمارے آپ کے لئے اور سارے امتیوں کے لئے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (سورۃ النجم ۳۔۴) اور وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (جو) ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (سورۃ الشوریٰ۔ ۵۲) آپ نہیں جانتے تھے کہ لکھنا پڑھنا کیا ہوتا ہے، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو

وحی و نبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلا سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی و نبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عرب کا یہی حال تھا، اس میں نہ دیانت کا انکار ہے، اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے، اس بارے میں مذاہب میں خود اختلاف ہے، اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہر مسلمان خدا کا فرماں بردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے واقعی ہے، عملی ہے، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے، جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (سورۃ البقرۃ)

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی، عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کر لیں گے، تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات، اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتے اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود ؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قا

سلب کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہند کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جو کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہارِ خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے

حضرات! میں اجازت چاہتا ہوں کہ چند دن پیشتر (۲۲ نومبر ۱۹۸۱ء) کو وارانسی کی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس میں جو خطبہ پڑھا تھا اس کا اقتباس آپ کے سامنے پیش کروں کہ وہ اس مسئلہ (مسلم پرسنل لا) سے بھی بڑھ کر ہے، جو مسلمانوں کی نئی نسل کی دینی تعلیم کے مسئلہ سے، میں نے عرض کیا تھا کہ:-

"آپ ایسے ملک میں ہیں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، وہ جمہوری ملک ہے، اور وہاں قانون ساز قانون بناتی ہیں، جب یہ ملک جمہوری ہے تو پارلیمنٹ ہی قانون بنائے گی، اور جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ اکثریت کی رائے اور تائید سے قانون بنتا ہے، اس لئے ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ ایسے قوانین بنیں جو ہمارے بنیادی مسلمات، ہمارے جذبات اور ہماری ضرورتوں کے خلاف (بدنیتی سے کم اور ناواقفیت سے زیادہ) بنیں، یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہاں مذہبی، تہذیبی اور لسانی بنیادوں پر جارحانہ احیائیت NATIVE REVIVALISM اور کلیت پسندی TOTALATARIANISM کی تحریکیں بھی زور و شور سے چل رہی ہیں، اب آپ کا کام یہ ہے کہ اس سیکولر اور جمہوری ملک میں اپنے ملی تشخص کی حفاظت آئینی طور پر کریں، آپ ہندوستان کے وفادار، مفید، اور اس کے ضروری جزو ہونے کی حیثیت سے اپنی افادیت و اہمیت ثابت کریں اور مطالبہ کریں کہ کوئی قانون، شریعت، آسمانی کتاب، اور ہمارے عقائد کے خلاف نہیں بننا چاہئے آپ اس کے ساتھ یہ بھی ثابت کریں کہ خلافِ شریعت قانون بننے سے آپ کو اس سے زیادہ اذیت ہوتی ہے اور آپ کا وجود اس سے زیادہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے، جتنا کھانا روکنے سے، کوئی جمہوری حکومت، کسی اقلیت اور کسی فرقہ کی غذائی ضرورت نہیں روک سکتی، کوئی حکومت چاہے کتنی ہی طاقتور ہو، یہ قانون نہیں بنا سکتی کہ فلاں فرقہ کو غذا کی فراہمی بند کر دی جائے، یا بازار میں اس کو دوکان کھولنے کی اجازت نہ دی جائے، یا اس کے بچوں پر تعلیم یا تعلیم گاہ کے دروازے بند کر دیے جائیں، ایسا اگر ہونے لگے تو آپ قیامت برپا کر سکتے ہیں، آپ ثابت کریں کہ اس قانون اور اس نئے نظامِ تعلیم سے آپ کو ایسی گھٹن ہو رہی ہے، جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکال کر ہوتی ہے، آپ کے چہروں کے اتار چڑھاؤ، حرکات و سکنات سے معلوم ہو جائے کہ آپ کی توانائی اور کارکردگی پر اثر پڑ رہا ہے، اور یہ محسوس کر لیا جائے کہ یہ ایک مظلوم قوم کے افراد ہیں، اس نئے قانون سے ان کا دم گھٹ رہا ہے اور یہ ان کی آئندہ نسل کے قتل کے مترادف ہے، یہ کام آپ کو کے ساتھ عملی طور پر ایسی کیفیات کے ساتھ کرنا ہوگا کہ ہر شخص اسٹیشنوں، پارکوں، اور بسوں میں آپ کی محسوس کرے، اگر آدھا نہیں تو کم از کم اس کا چوتھائی حصہ ثابت کرنا ہوگا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک بہت

میں ایسا قانون نہیں چل سکتا، میں نے دنیا کے آئینوں اور دستور حکومت کا مطالعہ کیا ہے، اور جمہوریتوں کی تاریخ پڑھی ہے، اس لئے یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

برادران ملت! اب میں اس مجمع کو ایمانی و قرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی و قرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم و رواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ، مدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستے سے آئی؟ یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملی کو آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں بانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو یہ شکایت کرتے ہیں، وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے اور شکایت کرنا ہمارا حق ہے، وہ شکایت بجا ہے، ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخبار کے کالموں میں، وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو، اس کے بغیر نہیں چل سکتا، حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوان قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اس لئے ہم اپنی حکومت سے شکایت کریں گے اور سو بار کریں گے، اور اس کو اس پر فخر کرنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اسی میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لئے ہمارے اس ملک کا یہ افتخار، ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکان حکومت سے انتظامیہ (ADMINISTRATION) اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا

اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی عزت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے؟ اس کا احترام کرنے والوں کو یہاں سے یہ عہد کرکے جانا ہے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں، ملک میں سینکڑوں واقعات پیش آتے ہیں صرف دہلی میں ہر بارہ (12) گھنٹہ پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے، کیا اس کائنات کے خالق اور انسانوں کے مربی (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال)

اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے، انہیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستانی معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے، جہیز کے لئے آپ کے بڑے بڑے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کر دیں گے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے، اور عورتوں کی، بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے، جو شریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے، طلاق بائن اور مغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ ہونے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اگر اس کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں کیونکہ مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا

پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ کس طرح برباد ہو رہا ہے، وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اور اس میں ہزار دقتیں ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے، اور چند مہینوں سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور اس کے واجب الاحترام امیر کی ذاتی نگرانی میں مستند علماء اور ماہرین فقہ کے ذریعہ جدید زبان و اسلوب و ترتیب کے ساتھ عائلی قانون اور مسائل نکاح و طلاق و حقوق و فرائض کی تدوین کا کام شروع ہو گیا ہے، اور اس کا خاصا کام مرتب ہو کر ممتاز علماء و اہل نظر کی خدمت میں رائے و مشورہ کے لئے بھیجا جا چکا ہے، اس کی ترتیب کے بعد عدالتوں اور مجلس قانون ساز اور معترضین کو یہ کہنے کا حق بھی نہ ہوگا کہ ہمارے پاس ان تراجم کے علاوہ جو زیادہ تر غیر مسلم قانون دانوں اور مصنفین کی مرتب کی ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کا مستند و براہ راست کوئی مجموعہ قوانین نہیں ہے، اسی کے ساتھ اصلاح معاشرہ، اصلاح رسوم اور مسلمانوں کی عائلی زندگی کو شرعی احکام، قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبیؐ کی روشنی میں منظم و بہتر بنانے کی کوشش بھی جاری کی گئی ہے اور جا بجا دارالقضاء قائم کئے جا رہے ہیں، تاکہ مسلمان اپنے تنازعات و مسائل خاص شریعت کی روشنی میں حل کریں، اور امکانی حد تک مقدمات و اختلافات کا فیصلہ کرانے میں (بالخصوص ان کے ساتھ جن کا تعلق احکام شرعی سے ہے) خود کفیل ہو جائیں۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ و التفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث و آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر فرمایا۔ ●●●

دل کو تھامو تو اچھلتا ہے سمندر بن کر
درد کو روکو تو بڑھ جاتا ہے دریا کی طرح (ص۲۳)

تیری یادوں کا تصور مرے بے کل من میں
موسلا دھار برستی ہے گھٹا ساون میں (ص۵۱)

غم دنیا سے بھی بڑھ کر ہے ترا غم لیکن
تیرا غم تلخ نہیں ہے غم دنیا کی طرح (ص۳۱)

کلی پہ گردیدہ جیسے بھنورا، چمن میں آوارہ جیسے خوشبو
ہمارے اس شہر میں تو ہاشم، کچھ اس طرح سے بسر ہوئی ہے (ص۷۹)

باقی بر ص۵۸

قاضی و مفتی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

ہمارا ملّی تشخّص

یہ بڑا مبارک موقع ہے کہ آج تبلیغی جماعت کے ہفتہ واری اجتماع کا دن ہے۔ اس لیے کہ مجمع کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت تو ہوتی ہے جب مجمع خالی الذہن ملتا ہے تو اس میں پیاس جگانی پڑتی ہے بھوک لگانی پڑتی ہے۔ دوسری صورت یہ کہ اگر فکرمند لوگ ملتے ہیں تو طلب کے جذبے کے ساتھ ملتے ہیں۔ دو طرح کے لوگ ملتے ہیں ایک تو غافل لوگ ہیں کہ ان کو پیاس لگانے، بھوک لگانے، ان کو چونکانے وہ بیداری سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے دوسرے وہ جہاں پیاس پہلے سے ہو، بھوک پہلے سے ہو، جہاں طلب پہلے سے ہو وہاں بات زیادہ موثر اور مفید ہوتی ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب قرآن کریم کامل کتاب ہے جس میں کہیں تذبذب و شک کی کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کتاب رستہ دکھاتی ہے ہدایت ہے مگر متقیوں کے لئے۔ بعض مرتبہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ متقیوں کے لئے ہی کیوں ہدایت ہے۔ بلکہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری والے ہیں ان کو تو ہدایت کی ضرورت ہی نہیں۔ اصل تو ان لوگوں کے لئے ہدایت ہونی چاہئے جن میں تقویٰ نہیں ہے، پرہیزگاری نہیں ہے۔ لیکن میرے دوستو! وہاں پر تقویٰ کا مطلب فکرمندی ہے۔ اگر غور کروگے تو بات سمجھ میں آئے گی کہ ایسے بے فکرے کہ جن کو اس کی کوئی تلاش نہیں کہ راستے میں کہاں گڑھا ہے، کہاں کانٹے بچھ جائیں گے، کہاں پر دھکا کھا جائیں گے، کہاں پر ایکسیڈنٹ ہوگا، راستے پر لگے ہوئے سگنل کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی کہ Red light ہے یا Green light ہے وہ بے تحاشہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں، پاگلوں کی طرح چلتے ہیں، پئے ہوئے بدمست رہتے ہیں۔ ایک ہی سگنل لگا دو کبھی ایسے لوگوں کو ان سگنل سے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ہزار مرتبہ تم

Red light جلا دو کہ مت آنا، مت آنا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا، ٹریفک پولیس کے سپاہی کو کھڑا کر دو کہ وہ سیٹیاں دے دے کے روکے لیکن یہ بدبخت، یہ مجنون، یہ بے فکر یہ غافل، یہ بے نیاز، یہ بے پروا شخص اس کو کسی سگنل سے، کسی دھمکی سے، کسی تنبیہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور وہ اپنا ایکسیڈنٹ کرا ہی لیتا ہے لیکن جس میں فکر ہے وہ بچ کے چلتا ہے، راستہ دیکھ کے چلتا ہے، ٹکراؤ سے بچ کے چلتا ہے، صحیح راستے پر چلتا ہے، ایکسیڈنٹ سے بچتا ہے۔ وہ ہمہ دم راستے میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ایک ایک سگنل، ایک ایک علامت، ایک ایک اشارہ، ایک ایک نشان کو دیکھ کر چلتا ہے۔

لوگو! انسانوں کی تقسیم جیسے مادی دنیا میں ہے اسی طرح معنوی ہدایت کے لحاظ سے آدمی دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ قرآن ایک کو کہتا ہے "اما من استغنیٰ" اور دوسرے کو کہتا ہے "اما من اتقیٰ"۔ یہ من اتقیٰ کون لوگ ہیں؟ المتقین کون لوگ ہیں؟ وہ فکرمند لوگ جن کو یہ فکر پریشان کیے ہوئے ہے کہ صحیح راستے پر چلنا ہے کہیں گمراہی کا کوئی کانٹا میرے دامن سے الجھ نہ جائے، کہیں گمراہی کے کسی گڑھے میں نہ گر جاؤں، کہیں جہنم کی کھائی میں نہ گر جاؤں، کہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا کوئی خطرہ مول نہ لے لوں، کہیں احکام الٰہی سے ٹکرا کر میں اپنے وجود روحانی کو فنا نہ کر لوں۔

میرے بزرگو! قرآن کریم جیسی کتاب ہدایت بھی انھی لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، ہے تو سراپا ہدایت وہ، یہ چراغ تو سب کو روشنی دیتا ہے، یہ سگنل سب کو رستہ بتاتا ہے، یہ نشانات و سنگ میل سب کی ہدایت کے لئے لگائے گئے ہیں لیکن ہدایت کا فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو فکرمندی کے ساتھ زندگی کی سڑک پر اپنی گاڑی چلاتا ہے۔

اور وہ بے فکرا ہے، بے نیاز ہے، بے پروا ہے، مستغنی ہے اس کو کاہے کی فکر، وہ تو ٹکرا ہی جاتا ہے، ہزاروں سگنل، ہزاروں علامتیں، ہزاروں اشارے، ہزاروں نشانات اپنی جگہ پر ہیں وہ ٹکرا کر فنا ہو جاتا ہے۔

بزرگو! ایک قلب ابو بکر صدیقؓ کا بھی تھا، ایک دل عمر فاروقؓ کا بھی تھا، ایک دل بلال حبشیؓ کا بھی تھا۔ عمار ابن یاسرؓ کا بھی قلب مبارک تھا، عبد اللہ ابن مسعودؓ کا بھی دل تھا، ابوذر غفاریؓ کا بھی دل تھا، صہیب رومیؓ بھی تھے اور اس مجمع میں سلمان فارسیؓ بھی تھے جو نہ جانے کتنے مرحلے انھوں نے اس فکر میں گزارے کہ صحیح راستہ کہاں ہے۔ اس راہب کے گھر چلو، اس گرجا گھر میں چلو، اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو، ہر سچائی

اور ہدایت کے لئے بے چین دل سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا آخر انہیں کھجوروں کے جھرمٹ والے اس شہر میں ایک یہودی کی غلامی کے ساتھ لا کر انہیں پہنچا دیتا ہے جہاں آفتاب ہدایت کو طلوع ہونا اور جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور کامل ہونا تھا اور جہاں کتاب ہدایت کی تکمیل ہونی

دوستو! یہ وہ سب بے چین قلوب تھے، یہ وہ فکر مند دل تھے جو ہدایت کی تلاش میں دوڑ پھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی پیاس بجھائی، ان کی تڑپ کو دیکھا، ان کی طلب کو دیکھا اور ہدایت ملی۔ وہیں ابولہب بھی تھا، وہیں ابوجہل بھی تھا، وہیں عتبہ، ربیعہ اور شیبہ بھی تھا۔ چراغ ہدایت جلا، آفتاب ہدایت نکلا، کتاب ہدایت اتری، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نازل ہوئے، از اول تا آخر ہدایت ہی ہدایت، لیکن ابوجہل کے بے نیاز دل کو اور ابولہب کے بے فکر قلب کو بجائے فائدہ ہونے کے فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ان کے دل میں روگ پہلے سے تھا اور اس روگ میں اضافہ ہو گیا۔ جب بھی آیت اتری ان کا انکار، کفر بڑھتا اور دوسرا انکار ابھر آتا، ان کے کفر میں ترقی ہوتی۔ پس کتاب ہدایت کا قصور نہیں، آفتاب کے کرنوں کی کوئی کوتاہی نہیں، چراغ کی روشنی کا کوئی نقص نہیں۔ لینے والے کا نقص ہے۔ کس فکر کے ساتھ آئے ہو، کچھ لینے آئے ہو یا اعتراض کرنے آئے ہو، موازنہ کرنے آئے ہو؟ بے فکرے اور لاپرواہ ہو؟ مخاطب اپنے قلب کی حالت کے اعتبار سے قبول کرتا ہے بات اور فائدے کی۔

دراصل بات یہ چل گئی کہ آج ماشاء اللہ یہاں تبلیغی اجتماع ہوتا ہے ہر ہفتہ۔ آج جو مجمع یہاں پر ہے وہ طالبین کا ہے، وہ لوگ موجود ہیں جن کے دلوں میں طلب کی چنگاری موجود ہے، جن کے دلوں میں فکر کی بے چینی موجود ہے، جن کے دلوں میں کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا غم موجود ہے۔ لوگو! اس کام کا اور کوئی حاصل نہیں ہے۔ یہ جماعت کا جو کام ہے اس سے آپ کو کیا ملتا ہے؟ راز صرف یہ ہے کہ جہاں ہم جا رہے ہیں بلا یہاں سب کچھ نہیں ہے مرنے کے بعد بھی کچھ اور ہونا ہے۔ اس دن کی نجات کی فکر پیدا کرنا ہے۔ جب یہ فکر پیدا ہو جاتی ہے تب یہ آپ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، تلاش کرتے ہیں وہ سچائی کہاں ملے گی، وہ دل کہاں ملے گا؛ اخلاص کیسے پیدا ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ذکر میرے دل میں کیسے آئے گا، اعمال کی فضیلت کو جان کر اعمال کا شوق کیسے ہمارے دل میں ابھرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر جو سزائیں ہیں ان عذاب کو جان کر کیسے منکرات اور اللہ تعالیٰ کی روکی ہوئی چیزوں سے رکیں گے۔ یہ چنگاری بس کسی کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو [illegible]

بارآور ہوا، یہ درخت بارآور ہوا۔ اس محنت کا حاصل یہ ہے تمہارے دل میں وہ چنگاری جلا دینا، تمہارے دل میں وہ چبھن پیدا کرا دینا۔ ہر کام میں سوچ، جائز ہے، ناجائز ہے؟ اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے، اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے۔ میری اس سوچ پر، میری اس نیت پر، ایک کام میں کرنے جا رہا ہوں، نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ دل اندر سے پوچھتا ہے کیوں نماز پڑھنے جا رہا ہے؟ ساتھیوں کو راضی کرنے کے لئے، لوگوں میں اپنا نام پیدا کرنے کے لئے۔ ہر دل اس طرح چونکاتا ہے۔ جب انسان کا ضمیر بیدار ہوتا ہے تو اندر سے انسان کے اعمال کی نیت کو بھی صحیح کرتا ہے، اعمال کی صورت کو بھی صحیح کرتا ہے، اعمال کی حقیقت کو بھی صحیح کرتا ہے، پھر عمل اپنی ساری برکتیں دکھاتا ہے۔

دوستو! اس کام نے دنیا بھر میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام کو کھڑا کیا گیا۔ عام انسانوں کے بس کی یہ بات نہیں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پسندیدہ کام کو ہم کو اپنے فضل و رحمت کے ساتھ اگر ہماری ہدایت کے لئے کھڑا نہ کرتا۔ بہت اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ کیونکہ لوگو! غفلت کا زمانہ، مادیت کا دور، ہر چیز بازاروں میں انسانوں کی پھیلی ہوئی ہے۔ بازاروں کی زبردست کشش کے باوجود انسانوں کا بازاروں سے، بازار کے سمندروں سے منحرف ہو کر مسجدوں کے جزیروں میں آنا یہ کوئی آسان بات نہیں۔

جب ایک مرد فقیر ایک ویران سی مسجد میں جا کر بیٹھا تھا۔ نام محمد الیاس تھا۔ صورت شکل میں کوئی کشش، نہ کپڑے لتے میں کوئی کشش، نہ مکان و رہائش نہ کھانے میں کوئی کشش اور وہ بھی میواتیوں جیسے جاہل بدوؤں میں کام شروع کیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ یہی کائنات انسانی کے گوشے گوشے میں یہ کام پہنچ جائے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ چند برسوں کے اندر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب میں مساطہ کے ایئرپورٹ پر اترا۔ لینے کے لئے وہاں ایک صاحب آئے۔ عصر کی نماز کا وقت راستے میں ہوا۔ جہاں ہمیں جانا تھا منزل دور تھی۔ میں نے کہا بھئی ہمیں عصر کی نماز پڑھوائیے۔ تو انہوں نے کہا کہ رستے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے چلتے ہیں۔ میل ہا میل تک اجاڑ ویران علاقہ ہی نظر نہیں آتے تھے۔ وہاں ایک ویران علاقے میں ایک چھوٹے سے احاطے میں ایک چھوٹی سی مسجد ——— وقت آخر ہو رہا تھا۔ جلدی جلدی میں نے وضو کیا، عصر کی نماز پڑھی نماز پڑھ کر میں نے دیکھا دو چار اصحاب کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں گیا وہاں تو میں نے

جہاں تک ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیکھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا کر رہے ہیں، کیونکہ آج کل مسلکوں کے جھگڑے مسجدوں میں بھی آگئے۔ کونسی مسجد کس طرح کی ہے یہ مشکل محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی نہیں رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں رہیں، مسلکوں کی ہوگئی ہیں۔ مسلمانوں نے مسجدوں کے اتنے بٹوارے کئے ہیں بدقسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا گھر بھی اللہ تعالیٰ کا گھر نہیں رہا۔

میں نے دیکھا کہ دو چار لوگ بیٹھے ہوئے وہاں پر تبلیغی نصاب پڑھ رہے ہیں مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب۔ میری عقل حیران رہ گئی کہ ہزارہا میل دوری پر جہاں انسانی آبادی بھی نہیں ہے وہاں ایک ویرانے اور کھنڈر میں ایک چھوٹی سی مسجد میں پانچ آدمی یہاں بھی انہیں مل گئے جو بیٹھ کر فضائل کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ السلام علیکم کہا۔ معلوم ہوا کہ بنگلور سے آئی ہوئی جماعت ہے۔ میں نے کہا کہ بے شک حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عمل کی مقبولیت کی عظیم الشان دلیل ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس کام کو بلا اسباب کے کہ نہ اخبار اس کے ساتھ، نہ ریڈیو اس کے ساتھ، نہ ٹیلی ویژن اس کے ساتھ، نہ ایک پروگرام اس کے ساتھ، نہ بہت بڑے مقرر اس کے ساتھ بلکہ اللہ تعالیٰ کے چند فقیر بندے کہ جن میں کوئی اپنی جگہ ڈاکٹر یا انجنیئر ہوتا ہوگا لیکن جب وہ جماعت کے ساتھ نکلتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ بھی گاؤں کا رہنے والا دیہاتی ہے، اپنے اپنے سر پر اپنا اپنا سامان ڈھوتا ہوا بھوکا پیاسا گاؤں گاؤں میں جارہا ہے۔ اس طرح یہ پھیلا اور مادی اسباب کے لحاظ سے ایک سبب بھی موجود نہیں ہے کہ اس کام کی اشاعت ایک گاؤں سے بڑھ کر پورے صوبہ میں اور ملک یا ملک کے باہر ہو۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ جس کام کو کرانا چاہتا ہے تو بغیر وسائل کے کرواتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ پر یقین کا سب سے بڑا سبق ہے کہ مومن اس بات کو مان لے کہ اللہ تعالیٰ جس کام کو کرانا چاہے گا سارے اسباب مخالف ہوں وہ کرا کے رہتا ہے اور جس کام کو اللہ تعالیٰ کرانا نہیں چاہتا سارے اسباب موافق ہوں لیکن وہ کام نہیں نہیں ہوا کرتا ہے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ مادی سبب خدا نہیں ہے اور یہ کائنات خود بخود نہیں ہے۔ اس کائنات کا کوئی خالق ہے، کوئی مالک ہے کہ جب چاہتا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہی حی ہے۔ سب کے سب ہم زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں، ہماری حیات بھیک سے ہے، بھیک ہے۔ اور ہماری زندگی اس اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار سے صدقہ ہے، اصل حی وہی ہے جس کی حیات پر نہ کبھی فنا آئی، نہ کبھی فنا آئے گی، وہ قیوم ہے، اس کا قیوم ہے۔ اسکے

جلی ہے یہ کائنات کا ڈھانچہ کھڑا ہے، وہ کبھی غافل بھی نہیں ہوتا ہم سے، نہ کبھی اس کو اونگھ آتی ہے نہ کبھی اس کو نیند آتی ہے۔ اس کے اقتدار کی کرسی آسمان و زمین سب پر چھائی ہوئی ہے، بے شک وہ علی و عظیم ہے۔ یہی وہ یقین ہے جس کا اعلان آپ آیۃ الکرسی میں کرتے ہیں۔ یہی آیۃ الکرسی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر اعتبار و یقین کا ایک سبق ہے۔ تو دوستو! آپ حالات کا جائزہ لیں، اسباب کا جائزہ لیں تو آپ کو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ جس کام کو آگے نہیں جانا چاہئے تھا لیکن جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کام کو آگے بڑھایا اور مولانا کے اخلاص کی وجہ سے اس کام کی مقبولیت ہوئی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ چاہا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے اس گمراہی کے زمانے میں ہدایت کا کوئی کام لیا جانا چاہئے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کام کا القاء فرمایا ان بزرگوں کے دلوں میں اور ان کی جد و جہد اور محنت و قربانی صدقہ، ان کی خیرات ہم اور آپ آج بھی کھا رہے ہیں۔

بزرگو اور دوستو! یہ موقع بڑا مبارک ہے کہ مجھے آپ جیسے لوگ ملے جن سے مجھے بات کرنی ہے۔ اس وقت جو اہم بات مجھے آپ سے کہنی ہے وہ یہ کہ دوستو! اس ملک میں ہو یا دنیا کے کسی ملک میں ہو، اس زمانے میں ہو یا تاریخ کے کسی زمانے میں ہو ایک کوشش ہمیشہ ہوتی رہے گی، جس وقت اسلام آیا، جس وقت ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اس وقت بھی یہی کوشش تھی، درمیان میں بھی یہی کوشش رہی اور آج بھی یہی کوشش ہو رہی ہے وہ یہ کہ جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، ان کا اسلام پہچانا نہ جائے، ان کے اسلام کی شناخت نہ ہو، جیسا ایک قطرہ سمندر میں مل کر اپنا وجود فنا کر دیتا ہے، لوگوں کے قلوب پر یہ بوجھ پڑا ہوا ہے کہ یہ قطرہ فنا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اپنی پہچان، اپنی شناخت، اپنا تشخص الگ کیوں رکھتا ہے۔ یہ چیز ان لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ کی طرح جل رہی ہے۔ یہ میں اپنی زبان میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ قرآن کی زبان ہے حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ۔ اہل کفر کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ تم اپنی شناخت مٹا کر، اپنی پہچان مٹا کر اہل کفر کی ملت کے سپرد کر کے اپنا وجود مٹا دو یہی بات یہود و نصاریٰ چاہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ انفرادی حیثیت سے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے پر یقین رکھتے، اپنی نماز چپ چاپ پڑھتے اپنا روزہ رکھتے واللہ! اہل مکہ سے کوئی لڑائی نہ ہوتی۔

(باقی آئندہ)

علی گڈھ یونیورسٹی — ایک نیا موڑ (قسط دوم)

خدا بخش ویڈیو کلکشن کے لئے وائس چانسلر سید ہاشم علی کا ایک تاریخی انٹرویو

بد امنی اور ریسرچ

لیکن علی گڈھ میں اس وقت بھی انٹرنیشنل شہرت کے سائنٹسٹ ہیں، ہمارے یہاں فزکس میں، بایو کمسٹری میں، اناٹومی میں بین الاقوامی درجہ کے لوگ ہیں۔ تو یہ نہیں کہ ہمارے پاس لوگ نہیں ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب حالات اچھے نہ رہیں، یونیورسٹی میں دنگا فساد ہوتا رہے، اور جب یونیورسٹی میں آدمی کو ڈر لگا رہے کہ پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے، تو ظاہر ہے ایسے میں ریسرچ وغیرہ کے لئے کیا ماحول پیدا ہوگا۔

یونیورسٹی کا تقدس اکیڈیمک ماحول سے ہوتا ہے، غنڈہ گردی سے نہیں

عثمانیہ میں، میں جب سے وائس چانسلر رہا، اور وائس چانسلر پینل میٹنگ میں میں نے شرکت کی ایک نومیس کی حیثیت سے، مجھے یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن کا سابق میں کوئی تجربہ نہ تھا، تو میں نے کبھی یہ بات کہ یونیورسٹی کیمپس کا کوئی تقدس نہیں کہ پولس اس میں داخل نہ ہو، سراسر جھوٹ اس لئے ہے کہ یہ رول اس وقت کا تھا جب کہ یونیورسٹی کیمپس میں اکیڈیمک کام ہوتا تھا۔ لیکن جب یونیورسٹی کیمپس شہر بھر کے غنڈوں، یونیورسٹی بھر کے کرمنلوں (Criminals) اور ڈاکوؤں اور ڈکیتوں اور قاتلوں کا مرکز بن جائے تو پولس کو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی اجازت لے کے آنا ہی چاہئے، اور حکومت کا فرض ہے کہ یونیورسٹی کیمپس میں نظم و ضبط قائم رکھے تاکہ وائس چانسلر ایڈمنسٹریشن کا کام کر سکیں۔ اور وائس چانسلر تو کوئی تھانہ دار نہیں یا وہ ڈنڈا بجاتا پھرے، یہ حکومت کا کام ہے کہ یونیورسٹی میں امن و سکون کے حالات قائم رکھے۔ اس میں ذہن بالکل صاف ہے۔ میں نے آنے کے ساتھ ایک جھٹکے اٹھائے، جب میری لڑکوں میں بالکل اچھی انڈرسٹینڈنگ ہوگئی، میں نے پولس سے کہا آپ جائیں۔ لیکن میں کوئی رسک نہیں لوں گا یعنی جہاں مجھے خطرہ ہوگا یہاں کے سازشی یا یونیورسٹی دشمن لوگوں سے جب بھی مجھے خطرہ ہوکہ یہ امن و چین خراب کرنا چاہتے ہیں، میں فوراً پولس کو بلواؤں گا اور اس وقت تک رکھوں گا جب تک امن چین بحال نہ ہو جائے۔

چاہئے کہ یہ لوگ جو مجرمانہ ذہن کے، یا فتنہ فساد پیدا کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، یہ فتنہ گر صرف اس
پر خوش رہتے ہیں کہ یہاں پولیس نہیں آئے گی تو وہ جب چاہیں گے وائس چانسلر کا گھر جلا دیں گے
گھر جلا دیں گے، سب کچھ کریں گے۔ اور جب پولیس ہوتی ہے تو وہ اس طرح کا رویہ رکھتے ہیں جیسے کہ
نہیں رکھنا چاہئے۔ سوال: طلبا کا معیار اونچا کرکے مقابلہ میں لانے کے لئے، اساتذہ
ے دو جس کے لئے میں سرگرم | کو آگے بڑھانے کے لئے کیا اقدامات آپ نے کئے ہیں؟ مگر اپنے
زمانے میں ہم علی گڑھ میں محسوس کرتے تھے کہ کوئی ایسا Cause (بڑا مقصد) ہو جس کے حصول کے
لئے کوئی کچھ بھی کر سکتا تھا، مقصد ہے از آسمان بالا ترے، یہ بھی سمجھی جگہ ہے، مگر علی گڑھ میں دیکھئے
دل چلتا ہے تو کچھ (اورینٹیشن) Orientation ہو، یا نئی سوچ کے لئے نئے محاذ
ں، آرزو مندیوں کی تخلیق ہو، آئیڈیل کچھ بنائے جا سکیں جن کے لئے جیا جا سکے اور مرا بھی جا سکے۔

لڑکوں کا معیار اونچا کرنے کے لئے یہ ہے کہ لڑکوں کا جو اِن پُٹ Input ہوتا ہے وہ بھی اچھا ہو۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ میڈیاکرز کو بھرتی کریں اور ان سے ایکسی لنس کی امید رکھیں۔ میں نے تو دو تین کام اس سلسلے میں کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی ایکسی لنس کا معیار اونچا کرنے کے لئے ایک کام یہ ضروری ہے کہ اس کا آل انڈیا کیریکٹر بحال کیا جائے۔ اس وقت بہار اور یوپی کے لوگ زیادہ ہیں۔ آل انڈیا کیریکٹر بحال کرنے کے لئے میں نے سات سنٹر بنائے جہاں داخلے کی درخواستوں کے فارم رکھوائے اور اس سال اس طریقہ سے بڑی دور دور کی ریاستوں سے فرسٹ کلاس لڑکوں کی درخواستیں آئیں۔ پھر ہم نے یہ کیا کہ جو اچھے اسکول ہیں ان کے لڑکوں کو ترجیح دی جائے، مثلاً سنٹرل بورڈ آف ایجوکیشن کے لڑکے، کچھ ایسے کالج، کچھ ایسے علاقے کچھ ایسی ریاستیں ہیں کہ جہاں نقل کرنا عام ہے، تو ضروری نہیں ہے کہ وہاں کے فرسٹ کلاس واقعی لائق بھی ہوں۔ چنانچہ بغیر کسی ریاست کا نام لئے نمبروں کے لحاظ سے تو وہ آگے جاتے ہیں لیکن جہاں کمپٹیشن ہوتا ہے وہاں یہ لوگ نہیں آسکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ذاتی لیاقت نہیں۔

تو ایک تو تعلیم کا معیار اونچا کیا جائے، حاضری برابر لی جائے، ایک سو اسی ۱۸۰ دن کی تعلیم ہو، لیکن لڑکوں کا جو اِن پٹ ہو وہ بھی اچھا ہو، اعلیٰ درجہ کے لڑکے ہوں۔ اس میں دو تین مسئلے ہیں، لائق لڑکے غریب ہوتے ہیں، اور یہاں آنے میں جو خرچ ہے وہ برداشت نہیں کر پاتے۔ میں نے اس کے لئے ایک پروگرام بنایا ہے کہ یہاں ایک سسٹم ڈونر (Donor) کا ہو جو پہلے تھا، اس کے ذریعہ جو دس ہزار روپیہ دے گا وہ ڈونر ہو جائے گا۔ میں نے پروگرام بنایا ہے کہ دس ہزار وظیفے بنائے جائیں اس کا ایک فنڈ قائم کیا جائے 'سر سید میموریل ٹرسٹ' کے نام سے اور اس کے لئے میں

تمام اولڈ بوائز اسوسی ایشن سے ہندوستان و بیرون ہندوستان یہ درخواست کروں گا کہ یا تو دس ہزار روپئے دیں یا ایک ہزار ڈالر۔ اور دس ہزار کے معنی دس کروڑ کا فنڈ۔ اس سے ایک کروڑ یا اس سے زیادہ کا منافع آئے گا اس سے ہم دور دراز کی ریاستوں کے جو لڑکے ہیں ان کو اتنے پیسے دے سکیں گے کہ وہ آ جا سکیں اور یہاں پڑھ سکیں۔ اس کے علاوہ اس پیسے سے جو نئے ضروری کورس ہم شروع کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے پیسہ دفتر کو نہیں ملتا ہے وہ ہم شروع کر سکیں گے، یو جی سی سے منظوری آ جاتی ہے تو ہم اپنے خرچ سے یہ سب کر سکتے ہیں۔

تو یہ دس ہزار لوگ جب ہو جائیں گے تو یونیورسٹی کورٹ میں یہ ہو سکتا ہے کہ جب پیسے دینے والے لوگ موجود ہیں ہو سکتے ہیں، تو ایسے لوگ کیوں آئیں جو پیسے نہیں دے سکتے ہیں۔ اس وقت ہم اسٹیچوٹ میں بھی تبدیلی کر سکتے ہیں جو دس ہزار روپئے دے گا وہ کورٹ کا ممبر بن سکے گا، تاکہ جہاں لوگ صرف سیاست کے لئے آتے ہیں اس کے بجائے صرف پر خلوص لوگ آئیں، اور آپ کو تعجب ہوگا کہ اب تک بغیر اعلان کئے میں نے لوگوں سے صرف ذکر کیا ہے اور انہوں نے روپئے دے دئے۔ اب تک ڈیڑھ لاکھ روپئے اس فنڈ میں جمع ہو چکے ہیں بغیر اعلان کئے۔

تو طلبا کے ان پٹ کا اونچا معیار، تعلیم کا اونچا معیار، کالج برابر ایک سو اسی (۱۸۰) دن تک چلے، چھ گھنٹے تک استاد رہیں، کلاس برابر جاری رہیں، سو فیصد حاضری رہے اور پڑھانے اور نہ پڑھانے والوں کا جو فرق ہے اس کے بارے میں تھوڑی سی نگرانی رہے ——— تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ علی گڑھ اونچے سے اونچے معیار پر پورا نہ اترے۔ اس وقت بھی میں سمجھتا ہوں یہ ہندوستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں ہے۔ اس وقت کا جو ماحول ہے خدا اسے باقی رکھے۔ خدا ان دشمنوں کے عزائم کو ناکام کرے جو علی گڑھ میں رہتے ہیں لیکن علی گڑھ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔

انٹروڈکشن

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں یہاں کا کلچر سمٹتا جا رہا ہے۔ انٹروڈکشن کی رسم ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کیا اب ہو سکتا ہے کہ خوبصورتی کے ساتھ اسے برقرار رکھا جائے؟

مختلف یونیورسٹیوں میں ریگنگ کے سلسلے میں قتل تک ہو چکے تھے، لہٰذا میں نے ایسے مناسب نہیں جانا۔ پچھلے سال ایک کرسچین لڑکا تھا جس کی ان لوگوں نے اتنا زبردست ریگنگ کی کہ وہ ہارٹ کا کیس ہو گیا۔ وہ لڑکا بے ہوش ہو گیا تھا اسے میڈیکل کالج پہنچانی پڑی۔ تو انٹروڈکشن اگر خوبصورتی کے ساتھ ہوتا رہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ایک آدھ سال میں میں نے برداشت کیا ہے بعد کی جب اپنی موجودگی میں انٹروڈکشن ہو، اس کے لئے مجھے فضا بنانی پڑے گی۔

تو جس طرح میں پچھلے سال گیا تھا اب کے سال بھی بالوں میں جاؤں گا۔ لیکن اب کے میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ این سی سی کے کمانڈر کو ساتھ لے جاؤں گا۔ کوچنگ سنٹر کے ڈائرکٹر کو ساتھ لے جاؤں گا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو۔ تاکہ لڑکوں سے کہوں کہ تمہارے لئے اتنے دروازے کھلے ہیں۔ اتنے وسیع افق سامنے ہیں لیکن تم اس کے لئے تیاری نہیں کرتے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی علاقہ وار علی گڑھ اسکیم

پھر ایک بات، یونیورسٹی ایکٹ سیکشن ۵ (۲) کے تحت ایک کلاز ہے جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذمہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کا کام سونپا گیا ہے۔ ایکٹ کو بنے پانچ سال ہو گئے۔ اب تک حالات ایسے نہیں تھے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کرتے میں نے اُسے ٹیک اپ کیا ہے۔ میں نے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کے اب تک دو اجلاس ہو چکے ہیں کہ کیا کیا جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لئے۔ اب اس کی علاقائی میٹنگ کرنیا گے اس لئے کہ علی گڑھ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کو کیٹر نہیں کر سکتا، علی گڑھ میں بیٹھ کے پورے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے مختلف مسائل کا حل نہیں کیا جا سکتا۔ تو ہر علاقے میں ایک میٹنگ کرائی جائے گی۔ ہمارے یہاں سے ایک پروفیسر جائے گا۔ اقلیتی کمیشن کے چیرمین ہے، وہاں کے وائس چانسلر ہے، وہاں کے مقامی لیڈروں سے ملاقات کرے گا کہ وہاں کے لوگوں کے مسائل کیا ہیں اور اس کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگلے چند مہینوں میں ہم ایک گائیڈ لائن دے سکیں گے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم کے لئے اور ثقافت کی حفاظت کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے وغیرہ۔ ہم ایک پانچ سات باتیں ان کے سامنے رکھ سکیں گے یہ کام اب تک نہیں ہوا تھا۔ ہم نے کرنے کا قصہ کیا ہے۔

آپ سن کر خوش ہوں گے کہ یونیورسٹی کا ہمارا جو کیمپس ہے، اس میں اس وقت کوئی پینتیس ہزار آدمی ہوں گے، یہاں کے جو ملازمین ہیں ان کے سینکڑوں بچوں کی تعلیم نہیں ہوتی ہے انکی اسکولوں میں داخلے کے بعد بہت بچے نکل جاتے ہیں۔ اس کے لئے میں نے یہ اسکیم بنائی ہے کہ سب اسکولوں کے پرنسپلوں کو میں نے بلایا۔ سارے یونین کے لوگوں کو بلا کے میں نے بات کی کہ چپراسی اگر تنخواہ پیا ماہانہ اس سے اوپر پانچ روپئے، اس سے اوپر سات روپئے، اس سے اوپر دس روپیہ ماہانہ دیں تو میں بھی سو روپیہ ماہانہ دوں گا ـــــ اور اس سے جو تیس پینتیس ہزار روپئے ملیں گے تو چونکہ یونیورسٹی کو اس سلسلے میں کوئی گرانٹ نہیں مل سکتی بائز بجٹ کٹ چکا ہے ہمارا دس فی صد کٹ ہو چکا ہے تو اگر یہ روپیہ مہیا ہو جائیں تو میں ان کے سارے بچوں کے لئے سہولتیں فراہم کر دوں گا، یہ کبھی نہیں ہوا تھا اب ہو جائے گا۔

تو یونیورسٹی کے سربراہ کی حیثیت سے ہر کسی کو دور اندیشی سے کام کرنا ہوتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی

باقی برصفحہ ۲۵

لڑکیوں کی غیر رسمی تعلیم

6 سے 14 برس کی عمر کے بچوں میں جن کا نام کسی اسکول میں درج نہیں ہے، لڑکیوں کی تعداد 77.1 فی صد ہے۔ 1981 کی مردم شماری کے مطابق مردوں میں خواندگی صرف 46.7٪ فی صد ہے جبکہ خواتین میں 24.88 فی صد۔ دیہی علاقوں میں خواتین میں ناخواندگی سب سے زیادہ یعنی 13.2 فی صد ہے۔ راجستھان کے دیہی علاقوں میں 5 فی صد خواتین ہی خواندہ ہیں۔ ایک تخمینے کے مطابق 1990 تک 6 سے 11 سال کی عمر تک کے 3.20 کروڑ بچے اسکولوں میں داخل ہوں گے جبکہ رسمی تعلیم کے نظام میں 40 سے 50 لاکھ بچوں تک کو ہر سال داخل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس طرح ایک کروڑ سے زیادہ بچوں کو غیر رسمی تعلیمی مراکز میں ہی تعلیم دینی ہوگی۔ درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والے اور تعلیم شروع نہ کرنے والے دونوں ہی قسم کے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے یہی خاص حکمت عملی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی 1986 میں اولین ترجیح درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والے بچوں کے مسئلہ پر دی گئی ہے۔ اس مقصد کے لئے تفصیلی غور و فکر کے بعد سارے ملک میں نچلی سطح پر منصوبہ بندی جزوکی بنیاد پر حکمت عملی وضع کی جائے گی۔ اس کوشش میں غیر رسمی تعلیمی نظام سے رابطہ قائم رکھا جائے گا۔ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے گا کہ 1990 تک جو بچے 11 برس کی عمر تک پہنچتے ہیں وہ پانچ سال اسکول میں پڑھ چکے ہوں یا انھوں نے غیر رسمی نظام کے تحت اس کے مساوی تعلیم حاصل کرلی ہو۔

اسی طرح 1995 تک ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جائے گی ۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غیر رسمی تعلیم دوسرے درجہ کی تعلیم ہے اور یہ صرف سماج کے محروم طبقوں کے لئے ہوتی ہے ، لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے ۔ نئی تعلیمی پالیسی میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ غیر رسمی تعلیم کسی بھی طرح رسمی تعلیم سے کمتر نہیں ہے ۔

"آپریشن بلیک بورڈ" نئی تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ کشادہ کمرے ، تعلیمی ساز و سامان اور کھلونے ، نقشے ، چارٹ ، اور دیگر ساز و سامان جیسی ضروری سہولیات پرائمری اسکولوں میں مہیا کی جائیں ۔ اسکولوں کی بہتری کے پروگرام کے طور پر سارے ملک میں "آپریشن بلیک بورڈ" شروع کیا جا رہا ہے ۔ یہ ایک طرز فکر اور ایک رویہ ہے ۔ اس میں لڑکیوں کے لئے ٹوائلٹ کی سہولت بھی شامل ہے ۔ یہ کام کو صحیح جذبہ کے ساتھ صحیح وقت پر صحیح لوگوں کے ذریعہ کئے جانے کی علامت ہے

وزیر اعظم نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی کا سب سے زیادہ فائدہ نوجوانوں اور خواتین کو پہنچنا چاہئے اور اس کو خواتین کی حیثیت میں بنیادی تبدیلی لانے کے لئے محرک کے طور پر استعمال کیا جائے گا ۔ یہ ماننا پڑے گا کہ باوجود کوششوں کے مردوں اور عورتوں کے درمیان اب بھی عدم مساوات ہے ۔ نئی تعلیمی پالیسی میں ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ تعلیم کے ذریعہ ایسے سماج کی تشکیل کی جائے جہاں جنسی مساوات ہو اور درسی کتابوں میں جنسی تعصب نہ ہو اور تعلیم عام ہو ۔ لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں مفت درسی کتابیں فراہم کرنا اور حاضری کی بنیاد پر وظیفہ دینے جیسے نئے محرکات کی ضرورت ہے ۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ ایک لڑکی کو تعلیم دینا ایک خاندان کو تعلیم دینا ہے ۔ ایک خواندہ ماں اپنے گھر میں ناخواندگی ہرگز برداشت نہیں کر سکتی ۔ اسی طرح دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی خاص اہمیت ہے ۔

درمیان میں تعلیم چھوڑنے والی لڑکیوں کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ایک معینہ مدت کی مہم چلانے کی ضرورت ہے ۔ درمیان میں تعلیم چھوڑنے والوں کو دوبارہ تعلیم کی جانب راغب کرنے کا ایک ذریعہ "کھلے اسکول ہیں" ۔ ایسا ہی ایک اسکول نئی دہلی میں 1979 میں قائم کیا گیا ہے ۔ یہاں تعلیم کا غیر رسمی اور دور دراز سے پڑھانے کا طریقۂ کار اپنایا جاتا ہے ۔ اس طرح وہ لوگ جو برسر روزگار ہیں اپنے روزگار کو قائم رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور انھیں گھر بیٹھے تعلیم مل جاتی ہے ۔ کھلا اسکول کئی معنوں میں مراسلاتی کورس سے مختلف ہے ۔

(۱) اس میں طالب علموں کے لئے مضامین کے انتخاب کے اصول سخت نہیں ہیں ۔

(۲) کسی طالب علم کو سب مضامین ایک ساتھ نہیں پڑھنے پڑتے۔

(۳) طلباء کے لئے کورس مکمل کرنے کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔

ان لڑکیوں کے لئے جو نہ تو رسمی تعلیمی مراکز میں جا سکتی ہیں نہ ہی غیر رسمی تعلیمی مراکز میں، کھلے اسکول سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کے مساوی معیاری تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہتر مواقع فراہم کرتے ہیں۔ غیر رسمی طریقہ تعلیم کو تعلیم بالغان کے میدان میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کئی پراجیکٹ چل رہے ہیں۔

(۱) دیہی عملی خواندگی پراجیکٹ جو کہ ایک مرکزی پراجیکٹ ہے اور صد فی صد مرکزی امداد سے چل رہا ہے۔

(۲) ریاستی تعلیم بالغان پروگرام

(۳) رضاکارانہ تنظیموں کے ذریعہ تعلیم بالغان۔

(۴) شرمک ودیاپیٹھ (مزدوروں کے لئے اسکول) کے ذریعہ شہری اور صنعتی مزدوروں کو مسلسل غیر رسمی تعلیم۔

موجودہ تعلیم بالغان پروگرام میں خواتین کی تعلیم پر خصوصی زور دیا گیا ہے جو کہ ان کی سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے، ترقیاتی پروگراموں میں ان کی سرگرم شرکت کو یقینی بنانے اور خاندانی منصوبہ بندی کی کوششوں کو آگے بڑھانے نیز بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک اہم عنصر ہے۔ 1983-84 میں تعلیم بالغان پروگرام کے تحت 5042686 بالغوں کو تعلیم دی گئی ان میں 45.5 فی صد یعنی 2193201 خواتین تھیں۔

کھلی یونیورسٹی کا قیام، ڈگریوں کو نوکری سے علیحدہ کرنا، نوخواندہ افراد کے لئے پیشہ ورانہ غیر رسمی مراکز قائم کرنا، درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والوں اور خواتین سے متعلق امور حل کرنا، نوکری پیشہ بچوں کے لئے خصوصی پروگرام کا نفاذ، این ای ایف مراکز میں تدریسی ساز و سامان اور تکنیکی امداد میں بہتری، مقامی عوام کی شمولیت، غیر رسمی مراکز کے معیار میں بہتری کو یقینی بنانے کے لئے ان میں پڑھانے والوں کی تربیت تاکہ یہ رسمی تعلیمی مراکز کا مقابلہ کر سکیں اور غیر رسمی تعلیمی مراکز کو چلانے میں رضاکارانہ تنظیمیں اور پنچایت راج اداروں کی شمولیت وغیرہ امور غیر رسمی تعلیم کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔

جہاں تک ناخواندگی کے خاتمے کا تعلق ہے قومی تعلیمی پالیسی میں مندرجہ ذیل پروگرام شامل ہیں:
(۱) دیہی علاقوں میں مسلسل تعلیمی مراکز کا قیام، (۲) آجرین، ٹریڈ یونینوں اور حکومت

کے متعلقہ محکموں کے ذریعہ مزدوروں کو تعلیم دینا (3)، سیکنڈری سے آگے کی سطح کے تعلیمی ادارے قائم کرنا، (4) کتابوں اور لائبریریوں کو وسیع پیمانہ پر فروغ دینا (5) ریڈیو، ٹی وی اور فلموں کا تدریس کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنا، (6) پڑھنے والوں کی انجمنیں بنانا (7) خود سیکھنے والوں کی مدد کرنا، (8) ضرورت اور دلچسپی کی بنیاد پر پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام بنانا۔

پسماندہ ریاستیں

غیر رسمی تعلیم کی خاص توجہ 9 پسماندہ ریاستوں پر مرکوز کی گئی ہے۔ یہ ریاستیں ہیں آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال۔

ابتدائی عمر کے تمام بچے جن کا داخلہ کسی اسکول میں نہیں ہوا ہے ان میں سے 75 فی صد مذکورہ ریاستوں میں بستے ہیں۔ غیر رسمی تعلیمی مراکز قائم کرنے کے لئے مرکزی امداد دینے کی اسکیم 1979 میں شروع کی گئی تھی جس میں آدھی امداد مرکزی حکومت کی جانب سے دی گئی۔ یہ مراکز لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کی مخلوط تعلیم کے تھے۔ 84-1983 میں اس اسکیم کو مزید نرم کیا گیا۔ اس کے تحت لڑکیوں کے لئے مخصوص غیر رسمی تعلیمی مراکز قائم کرنے پر 90 فی صد امداد مرکز کی جانب سے دی جاتی ہے۔

آئین ہند کی دفعہ 45 کی رو سے ابتدائی تعلیم کو 1960 تک عام کرنے کا نشانہ طے کیا گیا تھا لیکن کیونکہ آبادی میں ترقی کی رفتار تعلیمی ترقی کے مقابلے میں کہیں زیادہ رہی ہے اس لئے اس مدت کو بڑھا کر 1995 کرنا پڑا۔ اس ضمن میں نئی تعلیمی پالیسی میں غیر رسمی تعلیم کے میدان میں رضاکارانہ تنظیموں کے رول کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ تعلیم کے کام میں لگے رضاکار اور عوامی ادارے اور ٹرسٹ جن کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے پرائمری اور اپر پرائمری تعلیمی اسکیم کے تحت مالی امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ رضاکار تنظیموں کو ریاستی سرکار کے توسط سے انسانی وسائل کی ترقی کی مرکزی وزارت کے محکمۂ تعلیم کو درخواست دینی ہوگی۔ پراجیکٹوں کی منظوری امدادی گرانٹ کمیٹی کرے گی۔ پرائمری اور اپر پرائمری سطح پر 25 بچوں پر مشتمل غیر رسمی تعلیمی مراکز میں خرچے کا نمونہ حسب ذیل ہے:

	پرائمری	اپر پرائمری
اساتذہ پر خرچہ	1260.00	1500.00
اتفاقی خرچہ بشمول بجلی	350.00	400.00
تدریسی ساز و سامان	75.00	100.00
	1935.00	2625.00

نئی تعلیمی پالیسی میں غیر رسمی تعلیم کے میدان میں رضاکار تنظیموں کے رول کو اہمیت دی گئی ہے ۔

نگران ہر 40 مراکز کے لئے ایک سپروائزر کا انتظام ہے جس کے لئے 180 روپئے منظور کئے جاتے ہیں۔ 86-1985 کے دوران راجستھان میں سب سے زیادہ یعنی 23 رضاکار تنظیموں کے لئے امداد منظور کی گئی جبکہ 85-1984 میں یہ تعداد 18 تھی۔ 86-1985 کے دوران 11 لاکھ روپئے کی رقم منظور کی گئی۔ جبکہ پچھلے برس یہ رقم 7.60 لاکھ روپئے تھی۔ راجستھان کے بعد مدھیہ پردیش اور پھر اتر پردیش کا نمبر آتا ہے ۔ 86-1985 میں جاری کردہ کل گرانٹ کی رقم 23.98 لاکھ روپئے تھی جبکہ پچھلے برس یہ رقم 16.67 لاکھ تھی۔ 86-1985 کے دوران کل ملاکر 37 رضاکار تنظیموں کو امداد دی گئی جبکہ اس سے پچھلے برس یہ تعداد 39 تھی۔ 85-1984 اور 86-1985 کے دوران آسام اور اڑیسہ میں کسی رضاکار تنظیم کو کوئی امداد نہیں دی گئی۔

ساتویں منصوبے میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ نو ریاستوں میں غیر رسمی تعلیم کی اسکیم کے لئے 26.29 کروڑ روپئے مختص کئے گئے ہیں اور 87-1986 کے بجٹ میں اس اسکیم کے لئے 27.30 روپئے رکھے گئے ہیں۔ کئی ریاستی سرکاروں مثلاً کرناٹک، تامل ناڈو اور کیرالا نے غیر رسمی تعلیم کے لئے اپنے الگ پروگرام مرتب کئے ہیں۔ نئے پروگرام کے مطابق عملی پروگرام کے تحت صرف غیر رسمی تعلیم کے لئے 400 کروڑ روپئے کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت مذکورہ اسکیم کے تحت 166000 مراکز کام کر رہے ہیں ان میں سے 21000 صرف لڑکیوں کے لئے ہیں دیگر ریاستوں تک اس اسکیم کی توسیع کرنے کی بھی تجویز ہے۔ تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ریاستوں میں بھی ایسے علاقے اور گروپ ہیں جن کے لئے اس اسکیم کی ضرورت ہے۔ پہاڑی علاقے، شہری جھگیاں، نوکری پیشہ بچے، قبائلی اکثریت والے علاقے، پہنچ سے باہر دور دراز علاقے، خانہ بدوش اور ہجرت کرنے والے مزدور وغیرہ اس زمرے میں آتے ہیں۔

عملی پروگرام کے تحت غیر رسمی تعلیم کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا گیا ہے جس میں دیگر امور کے علاوہ حسب ذیل امور شامل ہیں :-

(1) سیکھنے والے پر مرکوز طریقہ کار جس میں سکھانے والے کی حیثیت مددگار کی ہوتی ہے، (2) پڑھانے سے زیادہ سیکھنے پر زور، (3) بچوں کے ایک دوسرے سے سیکھنے کا اہتمام تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کر سکیں، (4) موثر طریقہ کار کا استعمال

کرکے سیکھنے کی رفتار کو یقینی بنانا، (5) سرگرمیوں کو اس طرح ترتیب دینا کہ سیکھنے والا اپنی اپنی مرضی کے مطابق اپنی ترقی کی رفتار بنا سکے، (6) مسرت بخش اضافی نصاب کی سرگرمیوں کا انعقاد، (7) سیکھنے میں شمولیت کا ماحول پیدا کرنا، (8) لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے مخصوص اقدامات۔

خواتین کی تحریک

لڑکیوں کے داخلے کی اہمیت اور غیر رسمی تعلیم میں خواتین کی تحریک کی شکل اختیار کرنے کے امکانات ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ان مراکز میں پڑھانے کا کام خواتین کو ہی سونپا جانا چاہیئے۔ پڑھانے والے کے لئے عمل پروگرام میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ان لوگوں کے لئے سال میں ایک ماہ تربیت ہونا چاہیئے۔ غیر رسمی تعلیم کو کھلے اسکولوں سے جوڑنا ہوگا۔ وظیفوں کی موجودہ اسکیمیں جو رسمی تعلیم تک محدود ہیں ان کو غیر رسمی تعلیم کے میدان میں بھی خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لاگو کرنا ہوگا۔ سارے ہندوستان میں جہاں بھی بارھویں درجہ تک لڑکیوں کی تعلیم مفت ہے وہاں مفت کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ غیر رسمی تعلیمی مراکز میں مفت یونیفارم اور مفت کھانا تقسیم کرنے کی سہولت بھی ہونی چاہیئے۔ تعلیمی پروگرام کو عوامی لائبریریوں اور جن شکشک نیلایموں میں جوڑنا چاہیئے۔ اگر ان تمام چیزوں پر مناسب طور پر محنت اور لگن سے لوگوں کے ذریعہ عمل درآمد کیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ 1995 تک 14 سال تک کے بچوں میں تعلیم کو عام کرنے کا منصوبہ ایک حقیقت بن جائے گا۔●●●

پنجاب کی سیاست میں مولانا آزاد کی حکمت :

مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی وزیر کی حیثیت سے پنجاب کی سیاست دیکھا کرتے تھے۔ ان کے رفقاء کو یہ شکایت ہوئی کہ مولانا ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ایجی ٹیشن سے نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جب یہ خبر مولانا کو ملی تو انھوں نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ اب پنجاب کے معاملے کوئی اور دیکھے — ایک ہی ہفتہ میں یہ حالت ہوگئی کہ یا تو حکومت ہتھیار ڈال دے، یا مارشل لا نافذ کرے۔ نہرو پنجاب کا فائل مولانا کو واپس کرنے آئے۔ فائل دیکھ کر مولانا نے مسکرا کر کہا، 'یہ فائل تو جلتا ہوا ہے' نہرو خاموش رہے۔ چلتے وقت پوچھا: مولانا آپ کیا کیجئے گا۔ مولانا کا جواب یہ تھا: بھائی میرے! اس فائل پر باسی پانی کا ایک چھینٹا ماروں گا، اور پھر میں جان آجائے گی۔ اگلی صبح تمام اخبارات نے جلی الفاظ میں یہ خبر شائع کی کہ ماسٹر تارا سنگھ نے ایجی ٹیشن واپس لے لیا۔ مولانا نے انھیں اپنے یہاں رات کی خاموشی میں بلوایا، انھیں قائل معقول کر دیا، فائل میں پھر سے تازگی جان آگئی ○○○

(محمد یونس قاضی)

محمد لطیف احمد

اردو کی جانب سے — اے سرزمینِ گوا — تجھ پر لاکھوں سلام

گوا کے لسانی تنازعہ کا حل منظرِ عام پر آگیا ہے۔ جو اردو والوں کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ۴ر فروری ۱۹۸۷ء کو گوا اسمبلی نے ایک بل پیش کیا جس کی رو سے تین زبانوں کے حقوق منظور کرلئے گئے ہیں۔ کونکنی (دیوناگری رسم الخط میں) مراٹھی اور گجراتی ان تینوں زبانوں کو سرکاری مقصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ بل اردو کے حق میں نیک فال ثابت ہوگا۔

زبردست آبادی والی ریاست یو پی میں جہاں کثیر تعداد میں اردو داں طبقہ رہتا بستا ہے۔ اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دئے جانے کے سلسلے میں عرصۂ دراز سے دوڑ دھوپ کی جارہی ہے۔ یہ ریاست اردو کا گھر ہے۔ حال ہی میں جناب ملک زادہ منظور احمد صاحب اور جناب مالک رام صاحب نے اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ایک کامیاب تحریک چلائی ہے۔ جس کے بہترین امید افزا نتائج نکل رہے ہیں۔

اترپردیش کی اسمبلی میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے ضمن میں ایک بل پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت اس بل کی مخالفت میں آنجہانی وزیر واسدیو سنگھ نے بڑا واویلا مچایا تھا۔ یہ مسئلہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ:

— "اردو کو ریاست یوپی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لئے پہلے دستور میں ترمیم ضروری ہے۔ دستور کے بموجب اردو کو ترقی دی جاسکتی ہے اور اسے سکھایا پڑھایا جاسکتا ہے۔ مگر دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ملک میں دو پرچم نہیں ہوسکتے اسی طرح دو سرکاری زبانیں بھی نہیں ہوسکتی ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں دو زبانیں بیک وقت سرکاری زبانیں ہوں۔ اردو سرکاری زبان بنانے کا نتیجہ قومی تفرقہ کا

سبب ہوگا ۔۔۔۔
ان کا یہ بیان اور دلائل کچے دھاگے ثابت ہوئے اور وقت کے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ہی ٹوٹ گئے۔ اب جب کہ ریاست گوا میں تین زبانیں تسلیم کرلی گئی ہیں تو اردو کے لئے دروازے کھل گئے ہیں۔

دنیا میں بے شمار ممالک ہیں جہاں ایک سے زائد سرکاری زبانیں رائج ہیں۔ لبنان میں عربی اور فرانسیسی دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ کنیڈا میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں ہیں۔ زمبابوے میں مواصلی اور انگریزی بہ حیثیت سرکاری زبان استعمال کی جاتی ہیں سوئٹزرلینڈ میں چار زبانیں سرکاری ہیں۔ ہندوستان میں ریاست بہار ایک ایسی ریاست ہے جہاں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ دو لسانی سرکاری زبان کی پالیسی دستور میں ترمیم کئے بغیر ہی رائج ہے۔

کوئی بھی زبان تفرقہ پیدا نہیں کرتی۔ تفرقہ تو سیاسی موقع پرستی، ذاتی مفاد پرستی اور ناعاقبت اندیشانہ حرکتوں سے جنم لیتا ہے۔ زبان کی خصوصیت اور اہمیت آگ کی مانند ہوتی ہے آگ سے کھانے پکانے، مکانوں کو گرم رکھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ شادی کا پوتر بندھن تو مقدس آگ کے اردگرد پھیرے لینے سے پکا ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد آخری کریاکرم آگ کے سہارے ہی انجام پاتا ہے۔ اور اسی آگ سے مکانوں اور دوکانوں کو خاکستر بھی کیا جاتا ہے۔ کسی زبان کے فائدہ مند اور نقصان دہ، سود مند اور نقصان رساں ہونے کا انحصار تو اس کے بولنے والوں پر ہوتا ہے۔ تفرقہ ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے، زبان میں نہیں۔

دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اگر آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ یہ خواہش کرے اور مطالبہ کرے کہ کوئی مخصوص زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کی جائے اور اگر صدر مطمئن ہوجائے تو ہدایت دے کہ ایسی زبان ریاست کے کچھ حصوں میں یا پورے صوبہ میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلی جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اتر پردیش ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو والوں کی سب سے زیادہ تعداد ۱۵۹۴۳ فی صد ہے اور لسانی اعتبار سے اردو زبان کا وہاں دوسرا مقام ہے۔

سن ۱۹۵۶ عیسوی میں فضل علی کمیشن کے مطابق ہندوستان کی ۱۶ لسانی ریاستوں کی جدید تنظیم عمل میں آئی۔ ہر لسانی ریاست میں اکثریتی طور پر بولی جانے والی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اور ہندی کو تمام ملک کے لئے رابطہ کی زبان تسلیم کرلیا گیا۔ جس کا نتیجہ

یہ نکلا کہ ہندوستان کی لسانی بنیادوں پر تقسیم جو ملک کی وحدت 'ایکتا' اور قومی یک جہتی کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ثابت ہوئی۔ جس نے علاقائی قومیت کو اولیت دی اور ہندوستان کی حب الوطنی کو شدید نقصان پہنچایا۔ ایک ہی ریاست میں رہنے والے مختلف زبان بولنے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ ہر ریاست میں دوسری لسانی اقلیتیں بھی رہتی ہیں۔ ان کو بھی سرکاری زبان کا سیکھنا ضروری ہو گیا کیونکہ یہ زبان سرکاری کاروبار کی زبان بن گئی ہے۔ اردو جاننے والے ملک کی ہر ریاست میں موجود ہیں اور ان کی تعداد پورے ملک میں ۱۱٫۳۵ فی صد ہے۔ اس کی اہمیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو تاج محل سے بھی زیادہ حسین و پرکشش ہے۔ قطب مینار سے بھی زیادہ بلند و برتر ہے۔ تخت طاؤس اور کوہ نور سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ یہ قومی اتحاد کی زبان ہے۔ اس نے ہماری ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس نے بھارت کی جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ یہ ہندآریائی زبان ہے۔ یہ زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی ورثہ ہے۔ ہماری شناخت ہے۔ یہ اردو ہی تھی جو گذشتہ تین سو برس سے عملاً پورے ہندوستان خاص کر شمالی ہند کی قومی زبان رہی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اردو کو دفتری زبان قرار دیا تھا۔ اردو کی ہمہ گیری اور مقبولیت دیکھتے ہوئے سن ۱۸۳۲ عیسوی میں اردو سرکاری اور عدالتی زبان قرار پائی تھی۔ سن ۱۸۸۴ عیسوی میں میر محبوب علی خاں نے اپنی سلطنت کی سرکاری و دفتری زبان اردو قرار دیا تھا۔ مہاراشٹرا کے گورنر شنکر دیال شرما کہتے ہیں کہ

"اس سے بڑی کوئی اور حماقت کی بات نہیں ہو سکتی کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہا جائے۔ ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی زبان کہنے کا حق حاصل ہے کیونکہ یہ ہندوستانی عوام کی زبان ہے۔ اور عوام کی زبان ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اردو بھی زندہ رہے گی۔ اس لئے نہیں کہ اس کی پشت پناہی کوئی چیف منسٹر کر رہا ہے بلکہ اس لئے کہ یہ خود ایک جاندار زبان ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی فلموں کی زبان ہے اور فلم والے بیوقوف نہیں ہوتے۔ یہ لوگ وہی کام کرتے ہیں جس میں ان کا فائدہ ہو۔ اردو اگر گھاٹے کا سودا ہوتی تو آج فلم کا وسیلۂ اظہار نہ ہوتی اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان فلموں کو سنسر سرٹیفکیٹ اردو کا ملتا ہے یا ہندی کا۔ ان کی زبان بہرحال اردو ہی ہوتی ہے اسی کو ہندوستان کے کروڑوں عوام دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔"

اردو میں قرآن مجید کی ترجمانی

مشہور مصنف عطاء اللہ پالوی صاحب نے اپنا ایک ترجمہ خدا بخش لائبریری کو پیش کیا ہے جو ان کے پچاس سالہ مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ پالوی صاحب اپنی ساری عمر علوم قرآنیہ پر توجہ دیتے رہے ہیں اور درجن بھر سے اوپر تصانیف کے مالک ہیں۔ ان کی کتاب "حلال و حرام" کے کئی ایڈیشن پاکستان کے مشہور پبلشر سیریز "میری لائبریری سیریز" میں شائع ہو کر برصغیر کے طول و عرض میں بک چکے ہیں۔ پچھلے دنوں پالوی صاحب نے خدا بخش خاں پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ انھیں پٹنہ و بہار اکادمی انعام سے بھی نوازا گیا ہے۔ پالوی صاحب سر سلطان کے قریبی حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور سر سلطان پر بھی ان کی ایک کتاب موجود ہے۔ پالوی صاحب کے ترجمۂ قرآن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری کے دل کو کھینچ لیتا ہے اور اسے ترغیب ہوتی ہے کہ وہ نیکی کی طرف کھنچتا چلا جائے۔

پالوی صاحب کی مانند ایک اور بڑے مصنف جو الہ آباد والے دائرۂ شاہ اجمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا شاہد فاخری کے اقربا میں سے ہیں اور علوم مشرقی اور مغربی کے فاضل ہیں، انھوں نے بھی ایک ترجمۂ قرآن شائع کیا ہے جس کی ایک کاپی خدا بخش میں آچکی ہے۔ اس ترجمہ میں بھی زبان و بیان کی دل آویزی کے ساتھ دین کا فہم موجود ہے اور اس میں بھی یہی خوبی ہے کہ پڑھنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو کے قرآن کو اپنی زندگی میں اساسی اصول بنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ان دو ترجموں سے اردو میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

پٹنہ کی سرزمین اچھی اور مبارک تحریکوں کو جنم دیتی رہی ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر احمد عبدالحی اور ان کے ساتھیوں کی توجہ سے قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی جو تحریک چلی ہے اس میں پالوی صاحب وغیرہ کے دلنشیں، دلکش، دل آویز اور دلچسپ ترجمے امید ہے بہت کارآمد ہوں گے۔ کیونکہ ان ترجموں میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ باوجود عبارت کی دل آویزی کے کسی طرح معنی چھپنے نہ پائے

مولانا ہادی نقشبندی

بالاپور کی تاریخی جھلکیاں

یہ بالاپور ہے —— جو مہاراشٹرا کے ضلع اکولہ میں چھبیس کلو میٹر، بمبئی کلکتہ نیشنل ہائی وے نمبر ۶ پر ہے۔ یہ ہمیشہ سے صوفی سنتوں کا مرکز، اپنی تاریخی عظمت و شوکت، قدیم تہذیب و ثقافت، بدھ مین سراہنہ، برہمن اور اسلامی تمدن و معاشرت کے گنگا جمنی امتزاج اور اپنی ہندو مسلم یک جہتی کے مثالی اتحاد و اشتراک کے باعث زیب تاریخ و شہرت کا مالک ہے۔ یہاں کا موگرا بھی اپنی اعلیٰ قسم و خوشبو اور ایک میں ایک سات پھولوں کی وجہ سے مشہور ہے جس کا ذکر آئین اکبری میں بھی آیا ہے جو خانقاہ نقشبندیہ عنایت اللہی کے [illegible] میں موجود ہے۔

۱۵۹۵ء کے معرکۂ احمد نگر میں چاند بی بی نے شہزادہ مراد سے صلح کر کے حسب معاہدہ برہان نظام شاہ بحری علاقہ برار سلطنت مغلیہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ بعد معاہدہ شہزادہ مراد، عبدالرحیم خانخاناں کو لئے بالاپور پہنچا۔ جس کی حسب بیان مورخین اس وقت ایک لاکھ سے زائد آبادی اور پانچ لاکھ روزآنہ داد و ستد تھی۔ شہزادہ مراد نے یہاں سے دس کلو میٹر دور شاہ پور کو اپنا مستقر بنایا اور بالاپور کو دکن کا پایہ تخت بنانا چاہتا تھا جو قدرت کو منظور نہ تھا۔

شاہ پور میں ایک بزرگ حضرت پنانی شاہؒ تھے جو اپنے نام کی نسبت سے پانی نہیں پیتے تھے۔ جس کا شہزادہ کو یقین نہ آیا۔ اس نے حضرت کی دعوت کی اور کھانے میں مرچ زیادہ کروا دی جس کی تکلیف سے حضرت جانبر نہ ہو سکے۔ وقت رحلت فرمایا "میرا آگا و تیرا پیچھا"۔ چنانچہ اسی وقت شاہی محلات میں آگ لگ گئی اور شہزادہ مرض سب میں گرفتار ۱۵۹۹ء میں راہی عدم ہوا۔ اولاً شاہ پور میں تدفین ہوئی، بعدہٗ تابوت دہلی لے جا کر مقبرہ ہمایوں میں سپرد خاک کیا گیا۔ شاہ پور کے شاہی محلات کے کھنڈرات آج بھی اس واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں، اس سے متصل من ندی کے کنارے حضرتؒ آسودۂ خواب مرجع خلائق ہیں۔

شہزادہ مراد کے وزیر کا دہلی تابوت لے جاتے ہوئے بالاپور میں انتقال ہوا، یہیں تدفین عمل میں آئی اور ایک شاندار مقبرہ کے ساتھ یہ علاقہ وزیر آباد کہلایا، مرور زمانہ نے مقبرہ کو باقی نہ رکھا، البتہ ایک گنبد

بالاپور - ضلع آکولہ - مہاراشٹرا

چبوترہ پر سنگ سیاہ کی خوبصورت قبر مع ملحقہ مسجد باقی ہے جو بعد جدید تعمیر مسجد چوک کہلائی۔

مجموعی اعتبار سے بالا پور جن و بہنس کے درمیان تین حصوں (۱) شہر (۲) پیٹھ اور (۳) کسار کھیڑہ پر منقسم ہے۔ شمال و مغرب میں جہاں ان دونوں کا اتصال ہوتا ہے ان کے سنگم سے مغرب میں کچھ دور پر "جواہر ٹیکری" ہے۔ اس کا آئین اکبری میں بھی ذکر آیا ہے۔ یہاں کبھی قیمتی پتھر و جواہرات مل جاتے تھے۔ اب بھی کسی کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ قیاس ہے کہ یہاں کبھی جواہر سازی کا کارخانہ رہا ہوگا۔ اسی سنگم سے جنوب و مشرق میں انہی ندیوں نے شہر کو ایک جزیرہ نما کی طرح گھیر رکھا ہے۔ جس میں دور شاہجہاں کے محلات کے کھنڈرات، قدیم پختہ حمام اور جامع مسجد ہے۔ جسے ۱۶۹۸ء میں امین قلی خاں نے بدور فرخ سیر بنوایا، یہیں صنعت دری کے کارخانہ ہیں جو اپنی اعلیٰ بنکری، مضبوطی و خوبصورت کاریگری کے لئے مشہور تھے مگر اب کمرشیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

شہر کے آخری جنوبی حصہ میں صلابت خانی قلعہ ہے جس کی تکمیل ۱۷۵۷ء میں نواب اسماعیل خاں نجابت نے کروائی۔ قلعہ کا اندرونی بلند حصار و خوبصورت برج اپنی صلابت و پختگی کے باعث حسب سابق موجود، تزک و احتشام کے ساتھ عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ کبھی یہاں دار الضرب بھی تھا اب اندرون قلعہ سرکاری دفاتر ہیں۔ اسی سے متصل جنوبی ٹیکری پر قدیم طرز کا بالا دیوی کا خوبصورت مندر ہے جس کے نام سے یہ موسوم ہے ویسے تاریخ نے اسے اسلام نگر، اعظم آباد اور مراد نگر کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔

بالا دیوی کے مندر سے جنوب میں انہی ندیوں کی ایک شاخ نے فرشی شاہراہ کے ذریعہ پیٹھ کو شہر سے علاحدہ کر دیا ہے جس کے مغرب میں بہنس ندی اور مشرق میں من ندی بہتی ہیں۔ پیٹھ کاروباری علاقہ و تجارتی مرکز ہے جہاں بینک، دواخانہ اور تعلیمی ادارہ ہیں۔ وزیر آباد سے قریب مومن پورہ کلاں ہے جہاں کبھی اعلیٰ قسم کی پگڑیاں بنی جاتی تھیں، اب دریاں بنتی ہیں۔ اسی سے متصل کاغذ پورہ ہے جو اپنی کاغذی صنعت کے لئے مشہور تھا، جس کا تیار کردہ کاغذ دستاویزات، سرکاری دفاتر اور مخطوطات میں استعمال ہوتا لیکن اب یہ صنعت ختم ہو چکی۔ اس کے نمونے خانقاہ نقشبندی عنایت اللہی کے کتب خانہ کے مخطوطات میں نظر آتے ہیں۔

کاغذی پورہ سے لگا ہوا جنوب میں گجراتی پورہ ہے۔ جس کی بیشتر آبادی سوتنتری جینیوں کی ہے جو سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں احمد آباد گجرات سے یہاں پہنچے جس کی وجہ یہ گجراتی اور ان کا محلہ گجراتی پورہ کہلایا۔ یہاں ان کے دو خوبصورت، شاندار مندر گرو پر سوناتھ جی اور گرو چنتامنی کے ہیں جن میں پانچسو سالہ پرانی مورتیاں ہیں، جن کے درشن کے لئے دور دور سے جینی یہاں آتے ہیں۔

پیٹھ سے مغرب میں شاہراہ کلکتہ بمبئی پر سمت کھام گاؤں بہنس ندی کا پل پار کرنے پر جنوب میں نو تعمیر شدہ مراٹھی داردو ہائی اسکول اور کچھ آگے بلندی پر شمالی جانب گورنمنٹ اردو جونیر ٹریننگ کالج

شجاع کامل

اندھیرے اُجالے

میں کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے اندھیرے میں دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ سڑکوں پر سناٹے کا راج ہے۔ آسمان پر بجلیاں کڑک رہی ہیں۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بڑھتی جارہی ہے۔ موسم بھیانک طوفان کا پتہ دے رہا ہے۔ میں اندھیرے میں کب سے کھڑا ہوں کچھ یاد نہیں۔ ذہن میں راہ گیر کا گایا ہوا گیت گونج رہا ہے۔

تجھ بن جوگن میری راتیں

جب بھی تمھاری یاد کا مجھ پر دورہ پڑتا ہے۔ میں گھنٹوں اس کمرے میں کھڑے رہ کر آسمان کو گھورتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ دن نکل آتا ہے۔ سورج کی زرد کرنیں مجھے صبح کا احساس دلاتی ہیں۔ مجھے ماضی سے حال میں کھینچ لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر میں حال کو قبول نہیں کرتا۔ وجہ سنوگی تو تم ہنس پڑوگی! اس کی وجہ صرف اور صرف تم ہو۔ نور جہاں!! اس کا مجھے بخوبی احساس ہے کہ میں جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں۔ اگر میں یہ خواب بھی نہ دیکھوں تو زندہ کس طرح رہوں گا۔ زندہ رہنے کو تو بہانہ چاہیئے۔ جب کبھی تمھاری یاد کا مجھ پر دورہ پڑتا ہے تو میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔ میں اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتا ہوں اور تم کو یاد کرنے لگتا ہوں۔۔۔! تم مجھے کیوں یاد آتی ہو بے وفا۔۔۔؟ آخر کیوں؟؟ تم نے دو بول ہمدردی کے نہیں کہے؟ کبھی پیار کی کوئی بات نہیں کی؟؟ یہ کیسی اندھی محبت ہے میری؟ اگر اسے محبت کہتے ہیں تو نور کبھی تم نے بھی کچھ کہہ دیا ہوتا۔۔۔! یہ میری کیسی محبت ہے؟ نہ کوئی غرض ہے نہ امنگ! آخر کس لئے اس بے نام جذبہ کو خونِ جگر پلا کر پال رہا ہوں۔۔۔! کسی دن میں خود بھسم ہو جاؤں گا اس آگ میں! اور آگ جب

مکان 2-53-8، مولانا آزاد روڈ، پربھنی 431401 مہاراشٹرا

"مولوی" اور "صوفی"

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا محاکمہ

خدابخش لائبریری میں محفوظ ایک تاریخ ساز کتاب "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں اس کے مشہور مصنف مولوی عبدالحق نے صوفی اور مولوی میں فرق دکھاتے ہوئے لکھا ہے:

"مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو۔ مولوی طیش سے کام لیتا ہے اور یہ مہر و محبت سے۔ وہ خودی اور خود بینی سے بڑا بنتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری سے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے عیوب کا متجسس رہتا ہے اور یہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ اپنے علم سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ اپنے عمل سے دوسروں کو لبھاتا ہے۔"

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اورینٹل کالج میگزین کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے:

"اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے اس کا بہتر فیصلہ شائد صوفی اور مولوی ہی کر سکیں گے ہم اس مقدس مناظرہ میں شامل ہونے کی جراءت نہیں کر سکتے۔"

○○○

"مولانا" اور "علامہ"

خدابخش لائبریری میں لفظیات پر ایک مباحثہ کے دوران اسلام آباد سے آمدہ "اخبار اردو" کے تازہ پرچے کا تذکرہ ہوا جس میں ایک (اور صرف ایک صاحب ہی) کے نام کے ساتھ علامہ لکھا پایا گیا ہے جن کا تمام تحقیقی فکری ہے۔ تو بات علامہ تحسین مظہری تک پہنچی اور اس پر بحث چھڑ گئی کہ علامہ کا لفظ شبلی کے ساتھ اور مولانا کا لفظ حالی کے ساتھ جوڑنے کے کیا اسباب تھے کچھ اسباب تو ظاہر ہیں (مریداں می پرانند) کچھ اور دیکھنے چاہئیں۔ پھر بات آگے چلی کہ قاضی عبدالودود کے بقول کلکتہ میں ڈائریکٹر تعلیمات پر جب تحسین مظہری نے زور دیا کہ لوگ مجھے علامہ کہتے ہیں اس لئے سرٹیفکٹ میں آپ بھی علامہ لکھئے تو ناظم تعلیمات نے اس جلسے میں بیٹھے ایک درجن لوگوں کا کسی نئے آنے والے سے تعارف کرایا تو سب کے ساتھ علامہ کا لفظ لگا دیا جو عربی مدارس کے فاضل ہیں۔ اور پوچھنے پر بتایا کہ وہ کسی کو مولانا نہیں لکھتے کیونکہ 'مولانا' اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے استعمال کیا ہے۔ اس لئے یہ لفظ کسی اور کے لئے استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی توہین بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اس لئے وہ مولانا کی جگہ علامہ استعمال کرنا اسلامی نقطۂ نگاہ سے صحیح سمجھتے ہیں۔

○○○

ہے۔ اسی سمت میں تھوڑے فاصلے سے عیدگاہ سے متصل اورنگ پورہ ہے جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں کبھی شہنشاہ اورنگ زیب ؒ کا کیمپ رہا ہے جس کی یہ یادگار ہے۔

چھتری سے مشرق میں شاہراہ بمبئی کلکتہ پر من ندی کے پل سے گزریں تو جنوب میں قدرے فاصلے پر ایک کٹ نظر آئے گا۔ جس سے متصل مغربی کنارے تین سو سالہ قدیم گنگا گیر جی کا زمین دوز مٹھ ہے جو بارہ دری کہلاتا ہے اس سے متصل جنوبی سمت میں کچھ فاصلے پر من ندی کے بلند مغربی کنارے راجہ جے سنگھ والئے اندور کی بنا کردہ بیس ستون، ۱۳ گنبدی اڑتیس فٹ بلند شاندار خوبصورت چھتری دعوت دید دیتی ہے۔

شاہراہ بمبئی کلکتہ پر من ندی کے مشرقی کنارے تحریک مجددی کے عبقری مجتہدین کی خانقاہ نقشبندیہ عنایت اللہیہ کا سلسلہ عمارات ہے جسے شیخ الاسلام حضرت سید شاہ عنایت اللہ قدس سرہٗ نے ۱۶۴۹ء میں قائم فرمایا۔ اس کا آغاز پل ندی سے متصل شمال جانب ایک پر شکوہ خوبصورت گنبد و بلند میناروں کے روضہ خورد حجۃ الاسلام حضرت شاہ ظہیر الدین علیہ الرحمۃ سے ہوتا ہے جسے ۱۷۳۷ء میں حضرت کے مترشد نواب شیر بیگ خاں نے تعمیر کروایا اور حسب بیان "تذکرۂ اولیائے دکن" اس پر لاکھوں روپے صرف ہوئے۔

روضہ شریف سے شمال جانب کچھ پرے ایک بلند دروازہ "باب الرحمت" ہے۔ اسی سے متصل مہمان خانہ اور بین الاقوامی شہرت کا کتب خانہ، عنایت منزل ہے، درویش خانہ، مسجد کلاں، روضہ بزرگ اور دیگر عمارات خانقاہ ہیں۔ خانقاہ سے متصل آبادی کسارکھیڑو کہلاتی ہے جو من ندی کے مشرقی کنارے ایک کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ پل من ندی سے آکولہ کی جانب روضہ شریف کے شمال میں دینا پائی جونیئر کالج ہے جس کے شمال و مشرق زراعتی علاقے ہیں۔ تقریباً ایک فرلانگ پر شہزادی خاص بی بی کا مقبرہ ہے جس کا باغ و گنبد تو نذر حوادث ہو گیا اب صرف سنگ سیاہ کی بلند چوکھنڈی میں سنگ موسیٰ کی ایک خوبصورت قبر موجب عبرت ہے۔ دینا بائی ودیالہ سے آکولہ کی جانب چلیں تو دو کلومیٹر پر بھیکنڈ ندی کے پل سے قدرے فاصلے پر جنوب مغربی کنارے پارسیوں کا قدیم قبرستان Tower of Silence کا پختہ سنگی برج ہے جسے پستن جی تعلقدار Collector آکولہ و بالاپور کے نائب ہیزجی نے اپنے مستقر بالاپور میں ۱۸۴۱ء میں تعمیر کروایا تھا۔

ooo

سلسلہ ص ۲۳

کا جو معاملہ ہے یہ پورے ہندوستان کی نظر اس پر لگی ہوئی ہے۔ مسلمان اس سے کچھ متوقع رہتے ہیں کیونکہ لوگ اس بارے میں ہمیشہ غلط افواہیں اڑاتے رہتے ہیں تو جو آدمی یہاں پر رہتا ہے اس کے لئے بڑی مشکل ہوتی ہے کہ ط

کہاں کدھر کی چوٹ بچائیں کدھر کی چوٹ!

راکھ بنے گی تب ــــ !!

"لیکن اس کا تم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ محبت اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے! دل کی گہرائیوں میں اٹھتا طوفان جیون کے سارے سکھ کیوں چھین لیتا ہے ــــ؟

زمزم ٹھنڈے پانی کا ایسا شراب ہو جسے دیکھ کر محبت کی پیاس اور بڑھ سکتی ہے! مجھ نہیں سکتی پھر ایسے شراب کا بھی کیا بھروسہ جو میرے لئے نہ ہو ــــ! آسمان کی چادر پر چمکتا ہوا ستارہ بھی بکھرا ہوا سا کو روشن کر سکتا ہے؟ صرف اجالے کی چند کرنیں دے کر بھٹکے ہوئے مسافروں کو منزل کی طوالت کا احساس دلا سکتا ہے ــــ!

میرے دل کی ہر دھڑکن میں تم بسی ہو! میری ہر سانس تمہاری خوشبو سے مہک رہی ہے میری نگاہوں میں آج بھی وہ لمحہ جاوداں قید ہے جب میں نے تمہیں اپنے کالج میں دیکھا۔ پھر تم میرے روم روم میں بس گئیں۔ میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا بلکہ انجانے میں بہت کچھ دیا ہے۔ ذرا ذہن پر زور دو کہ کس کی Canvassing نے تم کو کالج کا جنرل سکریٹری بنا دیا۔ کس نے تم کو کالج کے اوباش اسٹوڈنٹس سے دور رکھا جبکہ ہر لڑکی ان کے ظلم و ستم کا شکار بنے بغیر کالج میں نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم کو اس کا احساس نہ ہو! کبھی دل کہتا 'میں بزدل نہیں ہوں۔ میں تو ر سے کہوں گا۔ دماغ کہتا 'کیا کہو گے! محبت تو وہ جذبہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا مقدس گلقد سیپ جیسا لگتا ہے اس کا حسن اس وقت نکھرتا ہے جب تک یہ دل کی گہرائیوں میں موتا ہے ــــ اس راز کو دل میں چھپا لو، کوئی جان نہ لے، کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ تم ایک حسین اور دولت مند لڑکی پر مرمٹے ہو۔ خوبصورتی تو فنا ہو جانے والی چیز ہے ــــ اپنی غریبی کے ساتھ ایسا حسین دل پیدا کرو جو شعلے کی طرح جلے اور لکڑی کی طرح دھواں دے! یہ دنیا کی ریت سے ایک الگ ریت ہوگی۔

میرا دوست! میرے اس جذبہ کا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے "تو کس کی محبت میں پاگل ہو رہا ہے ــــ؟ وہ جو تیرے اس جذبہ کو پہچان ہی نہیں سکتی۔" تب میں اس سے لڑ پڑتا ہوں۔ میں ہر اس شخص سے لڑ جاتا جو تم کو کچھ کہے ــــ! کالج کے تمام لڑکے میرے اس جذبہ کو جان گئے تھے کہ میرے سامنے تم کو کچھ برا کہنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے ــــ"

"اندھیرے اجالے کے اس کھیل میں اندھیرے میرے دامن سے لپٹ گئے اور اجالوں نے تم کو گھیر لیا۔ میں! زندگی کی اس شاہراہ پر اکیلا رہ گیا ہوں۔ میرے کان تمہاری آہٹ پر لگے ہیں۔ میری آخری سانس تک کو تمہارا انتظار ہے۔ "چلی آؤ نور! کہ میری سونی زندگی کو تمہاری ضرورت ہے۔" صبح کی روشنی میرے کمرے میں اتر آئی ہے۔ فضا خوشبو سے معمور ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کانٹے پھولوں کی طرح اُگ آئے ہیں جن کی نوکوں پر میرے خون کی سرخی ہو۔ پھولوں کی خوشبو در مہک میں زہر گھل گیا ہو جسے سونگھ کر انسان دیوانگی کی سرحد کو چھولے

مصنف : امین مالوف
مترجم : قاضی جلیل احمد

صلیب کے سائے میں (قسط ۹)

کیا تریپولی بھی دوسرا انطاکیہ بننے والا ہے . تریپولی میں طویل محاصرے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سامان رسد جمع ہونے لگا ۔ لوگ اب حملے کے انتظار میں گھڑیاں گننے لگے . ہر بخیر و عافیت گزرنے والی گھڑی غنیمت معلوم ہونے لگی .

فروری کے بعد مارچ اور اپریل کے مہینے بھی خیریت کے ساتھ گزر گئے ۔ شہر کے مزرعوں اور باغوں پر بہار چھا گئی ۔ حالات ابھی امید افزا تھے . فرنگی ہنوز ارکہ فتح نہ کر سکے تھے ۔ اور اس پر اہل تریپولی کے علاوہ ارکہ کے محاصرین اور محصورین دونوں کو حیرت تھی ۔ اس کی شہر پناہیں معرتی اور انطاکیہ کی فصیلوں سے زیادہ مضبوط نہ تھیں پھر اس دیری کی کیا وجہ تھی ! اس کی وجہ یہ تھی کہ انطاکیہ اور معرتی کے واقعات سے سبق لے کر اہل ارکہ نے اپنے دفاع میں کوئی رخنہ کو جھول آنے نہ دیا تھا کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ شکست کے معنی قطعی اور بے رحمانہ موت تھے ۔ انھوں نے فصیلوں کی دن رات طلایہ گردی کی اور دشمن کی شہر میں داخل ہونے کی ہر کوشش کو ابتدا ہی میں کچل کر رکھ دیا ۔ محاصرین بالآخر اس لا یعنی جنگ سے تھک گئے اور ۳ ماہ کی لا حاصل کوشش کے بعد انھوں نے محاصرہ اٹھا لیا اور جنوب کی طرف روانہ ہو گئے ۔

تریپولی کے قریب پہنچ کر ان کی رفتار خطرناک حد تک دھیمی پڑ گئی ۔ جیسے مال غنیمت کی لالچ ان کے قدم روک رہی ہو ۔ جلال الملک نے ان کے ارادوں سے باخبر ہونے کے باوجود انھیں ان کے سفر میں کامیابی کی نیک تمنائیں روانہ کیں ۔ صرف نیک تمنائیں ہی نہیں بلکہ سونا ، چاندی ، جواہرات ، باربرداری کے جانور اور رسد کا سامان بھی ۔ اور ساتھ ہی ساحلی راہ سے جنوب کا راستہ دکھانے والے رہبر بھی ۔ اسی طرح بہت سے میرونائٹ عیسائیوں نے بھی فرنگیوں سے اشتراک عمل

۶ - کولسٹن روڈ - فارسٹ گیٹ - لندن ای ۷ (یو نکے)

کی پیش کش کی۔ اور اس طرح بنو عمار کے علاقوں پر مزید کوئی مخالفت کئے بغیر فرنگی فوجیں نہر الکلب تک پہنچ گئیں اور اس نہر کو پار کر کے وہ مصر کی فاطمی خلافت کی حدود میں داخل ہو گئیں۔ مصر کے خلاف گویا یہ عمل اعلان جنگ تھا۔

اپریل ۱۰۹۷ء میں جب قیصر روم الیکس کومی نیس نے مصر کے حاکم مطلق وزیر الافضل کو مطلع کیا کہ ایک بڑی فرنگی فوج ایشیائے کوچک میں مصر کو آزادی کی غرض سے قسطنطنیہ میں وارد ہوا ہے۔ تو اسے پریشانی کی بجائے خوشی ہوئی۔ الافضل نے قیصر روم کو بیش قیمت تحائف ارسال کئے۔ پینتیس سال کی عمر کا یہ آزاد کردہ غلام الافضل ستر لاکھ مصریوں کا حاکم مطلق تھا۔ فرنگیوں کی آمد پر اظہار اطمینان کی بعض عرب مورخین کے نزدیک یہ وجہ تھی کہ

"جب حاکم مصر نے دیکھا کہ سلجوقیوں کے حدود سلطنت تیزی سے ایشیائے کوچک اور شام میں پھیلتے جا رہے ہیں تو اس نے سوچا کہ اگر شام اور اناطولیہ پر فرنگیوں کا قبضہ ہو جائے تو وہ اس کے اور سلجوقیوں کے بیچ حد فاصل کا کام دیں گے۔ باقی واللہ اعلم بالصواب۔ ابن الاثیر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت عالم اسلام میں شیعہ، سنی اختلاف گہرے ہو چکے تھے۔ سنی لوگ بغداد کی خلافت کو اپنا مرکز سمجھتے تھے تو شیعہ مصر کی فاطمی خلافت کے زیر اثر تھے۔ اور صلاح الدین جیسا دانشور مدبر بھی شیعیت کے خلاف جدوجہد کو اتنا ہی اہم سمجھتا تھا جتنا فرنگیوں کے خلاف جہاد کو۔ مذہبی مخالفین کو اسلام پر آنے والی ہر آفت کے لئے مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا اور کوئی ذہن خالی نہ جاتا کہ ایسی الزام تراشی نہ ہوتی اور فرنگیوں کی اس یلغار کو انہی کی سازش قرار دیا جاتا تھا اور گو یہاں بھی فاطمیوں کی فرنگیوں سے سازش محض الزام تراشی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ فرنگیوں کی ایشیائے کوچک میں آمد مصری حکام کے لئے باعث خوشی تھی۔ ایک مصری سفارت نے قیمتی تحفے تحائف کے ساتھ فرنگیوں سے ملاقات کی اور ان کی کامیابی کے لئے اپنی دلی تمناؤں کا اظہار کیا اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

وزیر الافضل نے نکائیہ کی تسخیر پر قیصر روم الیکس کو نامہ تہنیت و تبریک روانہ کیا اور انطاکیہ کے محاصرے سے پہلے ان سے معاہدہ دوستی کا پیش کش کیا۔ قاہرہ کے اس آرمینی نژاد کو سلجوقی ترکوں سے نہ کوئی ہمدردی تھی اور نہ دلچسپی اور اسی میں اس کا اور مصر کا دونوں کا مفاد مشترک تھا۔ کیونکہ گیارھویں صدی کے نصف آخر سے سلجوقیوں کی طاقت بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ان کے حدود سلطنت قسطنطنیہ اور مصر دونوں کے حدود سلطنت

کے اندر وسیع ہوتے جا رہے تھے۔ قیصر روم کے ہاتھ سے ایشیائے کوچک اور انطاکیہ کے علاقے نکل گئے تو مصر نے دمشق اور یروشلم کو سلجوقیوں کے ہاتھ گنوایا۔ یہ علاقے گذشتہ ایک صدی سے مصر کے قبضے میں تھے اور اسی وجہ قیصر روم اور الافضل کے بیچ گہری دوستی کی بنیاد پڑی۔ دونوں میں باقاعدہ اطلاعات اور مشاورت کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ فرنگیوں کی آمد سے پہلے الافضل قیصر الیکس دونوں کو اس بات سے بڑی طمانیت حاصل ہوئی تھی کہ سلجوقی علاقوں میں انتشار اور بدامنی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ شام اور ایشیائے کوچک دونوں ہی مقامات میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں۔ کیا ترکوں سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا تھا؟ کیا روم اور مصر دونوں اپنے کھوئے ہوئے علاقے سلجوقیوں سے حاصل کر سکیں گے؟ الافضل قیصر روم کے اشتراک سے سلجوقی علاقوں کی بازیابی کے لئے کارروائی کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔

انطاکیہ کے محاصرین کے پاس جو وفد اس نے روانہ کیا اس میں عدم جارحیت کا کوئی نقطہ نہ تھا کیوں کہ وفد کی روانگی میں خود عدم جارحیت کا مفہوم پوشیدہ تھا۔ اس نے فرنگ کو جو پیش کش کی وہ تقسیم ملک کی تھی۔ شمالی شام فرنگیوں کے لئے اور جنوبی شام بہ شمول یروشلم دمشق تا بہ حد بیروت مصر کے لئے۔ الافضل نے احتیاطاً یہ شرائط اس وقت پیش کئے جبکہ انطاکیہ میں لڑائی کی ابھی ابتدا تھی اور فرنگیوں کو ابھی اپنی طاقت کا احساس نہیں ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ فرنگی اس پیش کش کو بخوشی قبول کر لیں گے۔

لیکن اسے جو جواب موصول ہوا وہ محض ٹال مٹول کا تھا۔ انھوں نے زیادہ تر مختلف باتوں سے متعلق مزید صراحتیں طلب کی تھیں۔ خصوصاً یروشلم کے مستقبل کے متعلق اور گو وہ لوگ مصری سفارت کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور انطاکیہ کے مقتولین کے ۳۰۰ سر بھی انھیں دکھائے لیکن انھوں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ یہ بات الافضل کے سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا اس کی پیش کش حقیقت پسندانہ نہ تھی؟ کیا روم اور اس کے یہ نئے ساتھی واقعی یروشلم پر قبضہ کرنا چاہتے تھے؟ جیسا کہ ان کے سفارت کاروں کا اندازہ تھا؟ کیا الیکس نے اس سے جھوٹ کہا تھا؟

قاہرہ کے مرد آہن کے لئے فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ جب ۱۰۹۸ء میں پہلے انطاکیہ کی فتح اور اس کے تین ہفتہ بعد قربوقا کی ذلت آمیز شکست کی اطلاع ملی تو الافضل نے فوری قدم اٹھانے کا سوچا جس سے دوست اور دشمن دونوں حیران رہ گئے۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ ماہ جولائی میں الافضل ایک فوج کثیر کے ساتھ یروشلم کی طرف روانہ ہوا اور اس کا محاصرہ کر لیا جہاں امیر سکمان اور امیر ایلغازی رہا کرتے تھے۔ الافضل نے شہر پر حملہ کیا اور اطراف شہر منجنیقیں لگا دیں۔ یہ دو ترک امیر حال ہی میں شمالی

سے یہاں آئے تھے اور یروشلم کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ انہی دنوں انھوں نے قربونا کی بدبختانہ مہم میں بھی حصہ لیا تھا۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد یروشلم فتح ہوگیا۔ الافضل نے دونوں ترک امیروں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور انھیں رہا کر دیا۔

کچھ عرصہ تک حالات سے ایسا لگتا تھا کہ الافضل کا یہ اقدام بہت مناسب تھا اور فرنگیوں نے تسخیر یروشلم کا ارادہ فسخ کر دیا کیونکہ یروشلم اب مصر کے قبضے میں تھا۔ فاطمی دربار کے شاعروں نے الافضل کی شان میں قصیدوں کے ڈھیر لگا دئے جس نے یروشلم کو سنی کافروں کے پنجے سے آزاد کیا تھا۔ لیکن ۱۱۰۰ء میں فرنگیوں کے جنوب کی سمت بڑھنے کی اطلاع پاکر الافضل متشوش ہوگیا۔

اس نے اپنے ایک قابل اعتماد آدمی کو مشورے کے لئے قسطنطنیہ روانہ کیا۔ ایلکس نے اسے جواب دیا کہ فرنگیوں پر اس کا ذرا سا بھی کنٹرول نہیں ہے اور وہ وہی کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اب اس علاقے میں اپنی ہی ریاستیں قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے انطاکیہ کا قبضہ قیصر روم کو واپس کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے اور وہ ہر قیمت پر یروشلم پر قبضہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ پوپ نے انھیں اسی غرض سے ارض مشرق کو روانہ کیا ہے کہ وہ مولد مسیح کا قبضہ حاصل کریں۔ قیصر نے اسے اپنی مصر سے دوستی اور فرنگیوں سے بیزاری کا یقین دلایا۔

قیصر کے اس اظہار دوستی و مودت کے باوجود الافضل کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک پھندے میں پھنس گیا ہے۔ خود بھی ایک مسیحی گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یروشلم سے فرنگیوں کے تعلق کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ یہ لوگ یروشلم پر قبضہ کئے بنا نہیں چھوڑیں گے۔ ایسے حالات میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ترکوں کو ان سر پھرے فرنگیوں سے سر پھٹول کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور خواہ مخواہ اپنی گردن اس جھگڑے میں نہ پھنسائے۔

فرنگیوں سے مقابلے کے لائق کوئی بڑی فوج کا جمع کرنا اتنا آسان نہ تھا اس لئے الافضل نے اپنے دوست ایلکس سے خواہش کی کہ کسی بھی بہانے سے فرنگیوں کی جنوب کی سمت بڑھنے کی رفتار کو دھیمی کر دے۔ چنانچہ ماہ اپریل ۱۱۰۱ء میں ارکہ کے محاصرے کے دوران ایلکس نے فرنگیوں کو لکھ بھیجا کہ وہ جنوب کی سمت اپنا سفر ملتوی کر دیں تاکہ وہ خود بھی اپنی فوج لے کر ان کے ساتھ شریک جنگ ہو۔ ادھر الافضل نے بھی فرنگیوں کو صلح کی نئی پیشکش روانہ کی۔ اس مرتبہ اس نے شہر مقدس کے متعلق یہ صراحت کی کہ ہر مذہب کو اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کا اختیار ہوگا اور ہر شخص جب چاہے القدس کی زیارت کے لئے یروشلم کا سفر اختیار کرنے

کا کام ہوگا بشرطیکہ وہ ہتھیار ڈال دے۔ فرنگیوں کی طرف سے افضل کو جو جواب ملا وہ بڑا سخت تھا۔ ہم سب پورے ہتھیار بند ہو کر اور نیزے ہوا میں بلند کر کے یروشلم میں داخل ہوں گے۔

یہ گویا فرنگیوں کی طرف سے اعلان جنگ تھا اور اپنے اعلان کا عملی ثبوت دینے کے لئے ۱۹؍مئی ۱۰۹۹ء کو انہوں نے نہر الکلب کو پار کر لیا اور یوں مصری عملداری میں قدم رکھ دیا۔ مصری عملداری میں سب سے پہلا شہر جو فرنگیوں کے راستے میں پڑا وہ بیروت تھا جو نہر الکلب سے صرف چار گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ اہالیان بیروت نے فرنگیوں کی خدمت میں اپنی سفارت روانہ کی اور سونا چاندی اور رسدات کی سربراہی کا وعدہ کیا بدلہ میں وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی کھڑی فصلوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر فرنگی یروشلم فتح کرنے میں کامیاب ہوں تو وہ بھی ان کی سیادت تسلیم کریں گے۔ اس کے برخلاف صیدا کے باشندوں نے فرنگیوں کی اطاعت گوارہ نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے قلعہ سے نکل کر فرنگیوں پر کئی چھاپے بھی مارے۔ اس کے بدلے میں فرنگیوں نے ان کے مزرعے اور باغات تباہ کر دئیے۔ لیکن اس کے آگے ٹائر اور عکرہ کے شہریوں نے بیروت کی تقلید کرتے ہوئے فرنگیوں سے مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔ سرزمین فلسطین میں فرنگیوں کی کوئی مقاومت نہیں ہوئی۔ تا آنکہ ۷؍جون ۱۰۹۹ء کو فرنگی فوجیں یروشلم کے قریب پہنچ گئیں اور دوپہر تک انہوں نے شہر پناہ کے باہر اپنے ڈیرے ڈال دئیے۔

یروشلم میں مصری فوج کے کمانڈر افتخار الدولہ کو فرنگیوں کی آمد سے کوئی خاص پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ مینار داؤد کے اوپر سے اس نے فرنگی فوج کا جائزہ لیا۔ گذشتہ چند مہینوں میں اس نے شہر کی دفاع کے انتظامات مکمل کر لئے اور ایک طویل محاصرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑی تعداد میں رسد جمع کی گئی۔ شہر پناہ کا وہ حصہ جو الافضل کے ترکوں پر حملے کے دوران منہدم ہو گیا تھا اسے دوبارہ درست کیا گیا اور باغی سیان کی مثال پر عمل کرتے ہوئے ان عیسائیوں کو شہر سے باہر کر دیا گیا جن سے دشمن کے ساتھ ساز باز کرنے کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح شہر کے اطراف کے سارے کنویں اور دوسرے ذرائع آب کو زہر آلودہ کر کے محاصرین کے راستے میں دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور پھر وہ اطمینان کے ساتھ الافضل کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

افتخار کو یقین تھا کہ جنگ میں اس کا پلہ بھاری رہے گا کیونکہ حالات اس کے مساعد تھے۔ اس کا گھوڑ سوار عرب رسالہ اور سوڈانی تیر انداز فصیلوں کے پیچھے قلعہ کی دفاع کے لئے متعین تھے۔ ادھر گو فرنگیوں کی بیماری ماند ہوئی تھی لیکن یروشلم کی دیواروں کے قریب پہنچ کر گویا وہ اپنے فرائض بھول سے گئے تھے۔ نہ انہوں نے متحرک منجنیقیں تیار کرنی شروع کی تھیں اور نہ دیگر

آلاتِ شکن کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور نہ انہوں نے خندقیں کھود کر مورچہ ماجموں سے حفاظت کی پیش بندی کی تھی۔ اس کے برخلاف برہنہ سرپا دریوں کی معیت میں مذہبی گیت گانے اور مذہبی نعرے لگاتے۔ انہوں نے پہلے تو شہر کی دیواروں کے گرد چکر لگایا اور پھر بغیر کسی سیڑھی کی مدد کے شہر پناہ کی دیوار پر چڑھنے کی مجنونانہ حرکتیں شروع کر دیں۔ الافضل نے افتخار سے کہہ رکھا تھا کہ فرنگی لوگ مذہبی بنیادوں پر مذہب کی وجہ سے اس شہر پر قبضہ چاہتے ہیں۔ لیکن ایسی اندھی عقیدت اس کی فہم سے پرے تھی۔ وہ خود ایک پابند شرع مسلمان تھا لیکن فلسطین میں اس کی یہ جنگ مصر کے مفاد کی حفاظت یا زیادہ سے زیادہ اپنی ترقی کے لئے تھی۔ اسلام کی دفاع کیلئے نہیں۔

اسے معلوم تھا کہ یہ شہر اور شہروں سے مختلف ہے۔ افتخار اسے ہمیشہ ایلیا کے نام سے پکارتا تھا اور عام طور پر یہی نام مشہور تھا۔ لیکن مسلمان علماء نے اس کا نام القدس رکھا تھا اور اسی سے وہ بیت المقدس بھی کہلاتا تھا۔ مسلمانوں میں مکہ اور مدینہ کے بعد تقدس میں اس کا تیسرا درجہ تھا اس لئے کہ اسی شہر سے ایک مبارک رات کو خدا نے اپنے نبیؐ کو عیسیٰؑ اور موسیٰؑ سے ملاقات کے لئے آسمانوں پر بلایا تھا۔ اور اسی دن سے ہر مسلمان بیت المقدس کو خدا کے پیغام کے تسلسل کا مظہر سمجھتا تھا۔ یعنی وہ پیغام جو موسیٰؑ سے شروع ہوا عیسیٰؑ سے ہوتا محمدؐ پر ختم ہوا۔ اور اسی وجہ سے مسلمان مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔

لیکن شہر میں اس روحانی فراوانی کے باوصف افتخار الدولہ کی نظریں اُن مادی وسائل کی کھوج میں رہیں جن کی موجودگی کے بعد ہی شہر کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں تک جنگ اور محاصرے کا تعلق ہے سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں اور کوئی قلعہ محض دعاؤں اور نعروں سے منہدم نہیں ہوتا۔ اس لئے دو ہفتوں کے بعد جب فرنگیوں نے پہلی بار لکڑی کے دو عظیم الجثہ اور بلند مینار تعمیر کرنے شروع کئے تب افتخار کو شہر کی سلامتی کی فکر لاحق ہوئی۔ یہ واقعی بہت بڑے مینار تھے جن میں بیک وقت سینکڑوں لڑنے والے سپاہی سوار ہو سکتے تھے●

باقی آئندہ

لیتے ہیں ثمر، شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

ذوق

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کوئی ہے مردِ غریب ابتیہ نوا
مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

اقبال



شیر کا پیدل شکار

شیر کو پیدل مارنا ہر شکاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ٹریننگ کچے سے کچے شخص کو بھی پکا کر دیتی ہے۔ مگر عام طور پر پیدل شکار کے لیے عمدہ نشانہ، ہلکی تیز بندوق، اچھا دل اور شیر کی عادات و اطوار سے واقفیت اور جنگل کا کافی تجربہ چاہیئے۔ ورنہ عموماً ایسے شکاری بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ محفوظ مچان میں بیٹھ کر بھی بندوق نہیں چلا سکتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بڑا لطف آیا۔ تقریباً (۲۵) برس کا ذکر ہے میں اور مولوی محمود حسین خان صاحب مرحوم (انجنیر برقی) شکار کو روانہ ہوئے۔ موٹر میں نرمل سے ہوتے ہوئے محبوب گھاٹ اور اچھوڑہ پر سے گزر کر اوٹنور پہنچے۔ ڈیروں میں قیام کیا گیا۔ گرما کا زمانہ تھا۔ ڈیروں سے باہر کھلی ہوا میں سوئے۔ پلنگ کے بازو ہی درخت پر سے کوئی چیز پٹ سے گری۔ میں نے ٹارچ ڈال کر جو دیکھا تو بہت بڑا سرخ بچھو تھا۔ اس دن سے تجربہ ہوا کہ کسی درخت کے نیچے بالخصوص رات کے کبھی نہیں سونا چاہیئے۔ یہ ایک آم کا درخت تھا جس پر معلوم ہوا کہ سینکڑوں بچھو تھے غنیمت یہ تھا کہ پلنگ درخت سے ذرا ہٹا ہوا تھا۔ ہمارا یہ ٹرپ اوسط درجہ کا کامیاب رہا۔ پورا ایک مہینہ اوٹنور کے وسط جنگل میں گزرا۔ ایک شیر، دو باگھین، ایک بڑا بچہ اور دو سانبر، ایک گھوڑ مار ملا۔ شیر اس جنگل میں یہ کہنا چاہیئے کہ لا تعداد تھے مگر اس قدر جو بچے کہ خدا کی پناہ۔ نہ معلوم کیا بات تھی روزانہ چار چار گارے ہوتے تھے۔ مگر جب

گارے پہ بیٹھو نہ آتے۔ ہانکے کروائے گئے، دو تین مرتبہ شیر ہانکہ توڑ کر مچانوں کے قریب آنے سے پہلے ہی نکل گیا۔ ایک مرتبہ نکلا ہی نہیں۔ ایک مرتبہ سامنے آیا اور مار کھایا مگر گارے پر بیٹھنا ہمیشہ ناکام رہا۔ ہم لوگوں کو جنگل میں ٹھیرے (۱۵) دن گزرے تھے کہ سر جہانگیر جا اور محمود حسین خاں صاحب کے ایک دوسرے دوست ہماری دعوت پر وہاں پہنچے۔ ایک دن دو مختلف مقامات سے گارے کی اطلاع آئی۔ ایک مچان میں میں اور سر جہانگیر بیٹھے دوسری میں محمود حسین خاں صاحب اور ان کے دوست۔ محمود حسین خاں نے مچان میں بیٹھنے کا طریقہ یہ رکھا کہ آڑے پلنگ پر بیٹھنے کی بجائے کھڑے پلنگ پر بازو بازو بیٹھ گئے تھے تاکہ دونوں صاحبین بآسانی پاؤں لمبے کر سکیں۔ یہ لوگ (۴) بجے سے ہی مچان میں بیٹھ گئے۔ محمود حسین خاں صاحب کے پاس (۳۵۵) میگنی کیلبر تھی اور ان کے ساتھ زائد بندوقیں (۱۶) بور تھی۔ ان کے دوست کے پاس (۵۰۰) ایکسپریس اور (۱۲) بور پیراڈاکس مزید۔ اس طرح مچان میں (۴) بندوقیں تھیں۔ یہ دونوں بااطمینان بیٹھے ہوئے تھے کہ (۵) بجے کے قریب یعنی بالکل دن میں کچھ آہٹ مچان کے پیچھے ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ان کے دوست کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد انھوں نے دیکھا کہ دوست کو پسینہ آ رہا ہے اور چہرہ کا رنگ اڑتا چلا جا رہا ہے۔ زبان سے ایک کہتے ہیں نہ دو۔ محمود حسین خاں صاحب نے آہستہ سے دریافت کیا کیا بات ہے تو ہاتھ کے اشارے سے بتاتے کہ کوئی چیز ہلتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ان کا اشارہ دم کی طرف تھا۔ اشارے ہی سے بتائے کہ موٹا جانور ہے۔ انھوں نے کہا مارتے کیوں نہیں مگر وہ صاحب ہیں کہ خاموش اور حواس باختہ۔ بندوق اٹھانے کا ہوش نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب سابق میں (۱۰-۱۲) بور بچے مار چکے تھے بہرحال یہ بدکیفیتی آدھے گھنٹہ تک باقی رہی۔ پلنگ میں جس ترکیب سے بیٹھے تھے اس کی وجہ محمود حسین خاں صاحب نہ ہل سکتے تھے نہ دوسری طرف دیکھ سکتے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اب ان کے دوست کے چہرے کی فضا کچھ صاف ہو رہی ہے۔ کچھ سکون واطمینان ظاہر ہو رہا ہے۔ پسینہ سوکھ چکا ہے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ منہ سے اب بھی کچھ کہتے نہیں ہاتھ سے بتاتے ہیں کہ چلا گیا۔ بقول شخصے "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"۔

سبحان اللہ! شکاری جو دور دوسرے درخت پر بیٹھے ہوئے تھے سب دیکھ رہے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک نہایت زبردست شیر (۵) بجے ہی سے آکر مچان کے تقریباً نیچے ذرا بازو بیٹھ گیا تھا اور اپنے گارے کو دیکھ رہا تھا۔ مارنا چاہتے تو آدھے منٹ کا کام بھی نہ تھا اور لطف یہ کہ آدھے گھنٹہ

تک بلا حس وحرکت بیٹھا رہا۔ غالباً بیزار ہو کر چلا گیا ہوگا۔ (۵۰۰) اکسپریس اور پیراڈاکس سب ضرور کھا۔ بیچارے محمود حسین خان صاحب کا بھی شکار خراب ہوا۔ دوسرے دن صبح جو یہ حضرات آئے ہیں تو اب تک حواس بجا نہ تھے۔ بوکھلائے ہوئے اور گم نظر آتے تھے اور فکر یہ تھی کہ جلد از جلد موٹر سے واپس ہو جائیں۔ محمود حسین خان صاحب نے خوب بنایا۔ بہرحال دوپہر تک وہ صاحب واپس ہو گئے۔

ایک اور صاحب کا دلچسپ قصہ ایسے لوگوں کی زبانی سننے میں آیا جو ان کے ساتھ مچان میں بیٹھے تھے۔ یہ کھمم کا واقعہ ہے۔ ان صاحب کو شیر کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ مگر شیر اب تک مارا نہ تھا۔ ایک جگہ سے گارے کی اطلاع آئی۔ ایک زبردست مچان (۴۰) فٹ سے زیادہ بلندی پر تیار کیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ چڑھیں کس طرح سے اور بیٹھے کون کون۔ سیڑھی کے ذریعہ چڑھنا بھی ان صاحب کے لئے دشوار تھا۔ بڑی مشکل سے آدمیوں نے مدد دے کر سیڑھی پر سے چڑھایا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے کہا کہ اب تم لوگ بھی جو آئے ہو نیچے کیوں اترتے ہو۔ یہیں بیٹھو چنانچہ اس طرح چار چپراسی ایک مقامی شکاری اور خود چھ آدمی اس مچان میں بیٹھے پھر بھی حضرت کو اطمینان نہ ہوا۔ دیکھا کہ بلندی کے لحاظ سے زیادہ ہے کہیں گر نہ جاؤں چپراسیوں سے کہا کہ رسی سے اچھی طرح مجھے باندھ دو۔ چپراسیوں نے تعمیل کی اور آڑی ترچھی رسیاں کمر، سینہ اور بغلوں میں سے ڈال کر درخت سے باندھ دیا کہ اگر ہیبت سے گرنا بھی چاہیں تو نہ گر سکیں اس شان سے آپ تشریف رکھے۔ مغرب ہو گئی۔ کچھ دیر نہ گزری کہ سپ سپ کی آواز آئی۔ اور شیر آگیا۔ اطمینان سے آکر اپنے مارے ہوئے گارے کو کھانے لگا۔ چپراسیوں نے کہا کہ اسے اچھا موقع ہے۔ صاحب سر ہلاتے "ابھی نہیں، ابھی نہیں" پھر شکاری نے ٹہوکے ٹھوسنیاں دیں اور اشارہ کیا "مارو، مارو" مگر کہاں کا مارنا، جسم میں رعشہ اور منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ شیر اس دوران میں بہت کچھ حصہ کھا گیا اور غالباً مچان میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہوگی۔ باقی چھوڑ کر چل دیا۔ صبح کو اسی وقت سے حضرت کو اتارا گیا جس طرح چڑھایا گیا تھا۔ غالباً پھر شیر کے شکار کا نام نہ لیا ہوگا۔

ایک دفعہ ایک اور واقعہ دلچسپ رہا۔ ایک صاحب جو میرے ملاقاتی تھے مگر شکار میں کبھی ساتھ نہ ہوا تھا۔ میرے پاس کھمم آئے اور کہا کہ مجھے شکار کا بہت شوق ہے شیر کی اجازت بھی لایا ہوں۔ آپ اس جنگل سے واقف ہیں۔ چلئے۔ ان کے اصرار پر جانا تیار ہو گیا۔ موٹر سے ہم لوگ شام کو قریب (۴) بجے نکلے۔ چلند اباولی پہنچے

تقریباً مغرب ہو رہی تھی۔ باڈگی سے (۴) میل اس طرف بنکور ایک موضع ہے۔ وہاں مخبر سے اور شکاریوں کو طلب کیا۔ میں نے کہا کم از کم گارے آج بندھوا دینا چاہیئے تاکہ کل کا دن بیکار نہ جا سکے۔ ورنہ آج کا تو نہ اور کل کا پورا دن ضائع ہو جائے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس وقت گارے جنگل میں کون لے جا کر باندھے گا اور پھر وہ مقام بھی ایسا مخدوش جہاں ہمیشہ شیر پھرا کرتا تھا۔ شکاریوں نے اس وقت جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ چلو ہم بھی بندوقیں لئے ساتھ چلتے ہیں۔ (۶-۷) آدمی گاروں کے ساتھ چلو۔ اس پر شکاری تو راضی ہو گئے مگر اصل شکاری صاحب راضی نہ ہوتے تھے۔ کہتے تھے بھئی اب رات ہو گئی ہے۔ کل دیکھیں گے۔ میں نے کہا نہیں حضرت اب جب آئے ہو تو کام پورا کرو۔ وقت ضائع کرنے سے فائدہ نہیں۔ طوعاً و کرہاً راضی ہو گئے۔ ہم چھ سات آدمی، دو گارے اور قندیلیں لے کر روانہ ہوئے۔ پون گھنٹہ میں جنگل کے موڑ پر پہنچے۔ اب بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ دو قندیلیں تھیں۔ میری بندوق پر ٹارچ بھی لگی ہوئی تھی مزید ایک ٹارچ میرے چپراسی کے پاس تھی۔ بہر حال غول بیابانی کی صورت میں ہم چلندرا باؤلی کو پار کر کے آدھا میل اور آگے اندرون جنگل چلے گئے۔ ایک نالہ کے موڑ پر جہاں دو راستے ملتے تھے ایک گارے کو باندھ دیا پھر واپسی میں چلندرا باؤلی پر دوسرا گارا باندھا۔ سڑک تک آ کر بجائے بنکور کے کلوراپا راؤ صاحب دیسمکھ کے مکان پر سکارلسرو پہنچے۔ ان کا شاندار بنگلہ وسط جنگل میں بنا ہوا ہے۔ وسیع کمپونڈ کی دیواریں ٹائگر پروف ۱۲ فٹ سے زیادہ اونچی بنائی گئی تھیں۔ کھانا کھا کر سونے تک (۱۲) بج گئے۔ صبح کو اٹھے معلوم ہوا چلندرا باؤلی پر گارا ہوا ہے اور دوسرے مقام پر گارا نہیں ہوا۔ البتہ دو بوزچوں نے لمباڈوں کے تانڈے سے آگے ایک گائے کی پارٹی ماری ہے اور آدھا حصہ باقی ہے۔ جب صبح آدمی ادھر سے گزرے تو انھوں نے بوزچوں کو گارے پر سے جاتے دیکھا۔ اس طرح دو جگہ گارے موجود تھے۔ ان صاحب کے پاس (۳۰۳) بندوق فوجی بور کی مگر (۵۰۰) ونچسٹر کی وضع پر بنی ہوئی تھی مگر برقی ٹارچ ان کے ساتھ نہ تھی۔ اندھیرے میں بغیر ٹارچ کے ہی مارنے کی خواہش کر رہے تھے۔ میں نے اپنے چپراسی کی (۳) سل کی ٹارچ ان کو دی میں سمجھ گیا کہ ان سے شکار ہونا ممکن نہیں ہے۔ شکاریوں نے کہا کہ چلندرا باؤلی کا گارا شیر کا ہے۔ یہ سن کر حضرت کچھ گھبرا سے گئے اور کہنے لگے بھائی آپ ہی شیر کے لئے بیٹھو میں بوزچوں کے لئے بیٹھ جاتا ہوں میں نے کہا میں خود ہی اس خیال میں تھا کیونکہ آپ کی بندوق اور ٹارچ کچھ موزوں قسم کی نہیں ہے۔

بہرحال میاں نے اپنے سامنے مچان بندھوائی اور (۴) بجے شام سے بیٹھ گیا۔ یہ دراصل وہی [illegible] ..کارا تھا جس کا ذکر میں نے لورنیجے کے باب میں کیا ہے۔ اب ادھر ان حضرت کی سنئیے۔ ایک ہوشیار شکاری ان کے ساتھ بٹھایا گیا۔ (۹) بجے کے قریب لورنیچ کارے پر پہنچ گئے اور کھانا شروع کیا۔ شکاری نے کہا کہ مارئیے۔ حضرت بولے کہ نہ لائٹ ڈالتے ہیں نہ مارتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ لورنیجے نہیں ہیں۔ کولا دولا کچھ ہوگا۔ شکاری اصرار کرتا کہ صاحب مجھے صاف نظر آرہے ہیں۔ دو ..رنیچے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ ترس ہوگا۔ اس کے بعد آپ کچھ خرّانٹے سے لینے لگے یعنی سو گئے۔ شکاری نے شانہ ہلایا۔ مگر جیسے جیسے یہ شانہ ہلاتا آپ اور زور سے خرّانٹے لیتے جاتے۔ بہرحال لورنیجے باقی ماندہ دونوں رانیں کھا گئے اور چلتے بنے۔ جب ان کے ہڈیاں چبانے کی آواز کم ہوگئی اور شکاری افسوس کرنے لگا کہ لورنیچے کس کر کے چلے گئے اب آپ اٹھے اور کہنے لگے، کہاں ہیں، کہاں ہیں میں مارتا ہوں۔ صبح کو روشنی ہونے کے وقت ان کی مچان میں سے بندوق چلنے کی آواز آئی۔ میں سمجھا شاید لورنیجے دیر میں آئے۔ اب فائر ہوا ہے۔ دن نکل چکنے کے بعد مچان سے اتر کر ادھر پہنچا۔ آپ نے شکاری کو انعام دے کر دور بڑھا دیا تھا کہ رات کا قصہ کسی سے نہ کہنا۔ مگر مجھے آتا ہوا دیکھ کر وہ پھر چلا آیا۔ ادھر سے حضرت کہتے چلے آرہے ہیں "کیا [illegible] تھی نیل گائے کے برابر جنگلی سور تھا۔ ایسا بڑا سور آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ مچان کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میں جو مارا الٹ کر گرا، پھر بھاگ گیا۔ میں نے جاکر دیکھا خون کا نام و نشان نہیں۔ شکاری نے درخت کے تنہ میں سے کھود کر گولی بھی نکال کر دے دی۔ مطلب ان ..موں کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ اس قسم کے شکاری کبھی پیدل شیر کے شکار کا قصد نہ فرمائیں۔ ..ف یہ کہ انہی صاحب نے ایک دفعہ اپنے پیدل شیر مارنے کا بھی قصہ مجھے سنایا کہ کس طرح پنڈی میں ..تر کر انھوں نے شیر کو مار گرایا۔ ایک اور صاحب تھے جنھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ باوجود ان ..ے ابا جان منع کرنے کے انھوں نے کس طرح مقابل سے شیر مارا وہ اس طرح کہ ایک ہاتھ میں بندوق لی ..دوسرے ہاتھ میں ایک لمبا بانس لیا۔ معلوم ہوا کہ شیر گڑھے میں جھاڑی میں بیٹھا ہے۔ یہ وہاں پہنچے ..بائیں ہاتھ کے بمبو سے شیر کی پیٹھ میں "ٹونچا" دیا۔ ٹونچے کے ساتھ ہی شیر ان پر پلٹا تھا ..سیدھے ہاتھ سے بندوق اٹھا کر انھوں نے جو مارا تو مر کر ڈھیر ہوگیا۔ انہی صاحب کا ایک مرتبہ ..کار میں ساتھ ہوا۔ صرف بر [illegible] کا معاملہ تھا۔ مچان ایک ہی بندھوائی گئی تھی۔ یہ میں اور ایک ..ب مچان پر بیٹھنے روانہ ہوئے۔ راستہ میں جہاں موٹر ٹھیرائی گئی وہاں سڑک ختم ہوگئی تھی۔ ..یہیں بیٹھ گئے کہ چونکہ میں کئی دفعہ شیر اور لورنیجے مار چکا ہوں اب تم لوگ ذرا کے [illegible]

میں یہیں بیٹھا رہتا ہوں اور ایک دفعہ ہانکے میں شیر نکلا اور ان صاحب کی مچان کے سامنے بہت دیر کھڑا رہا۔ ساتھ کے شکاری فیر کا انتظار کرتے رہے۔ یہ حضرت خاموش رہے جب بعد میں سوال کیا گیا تو مختلف باتیں بنائیں۔ آخر میاں جب کچھ بن نہ پڑا تو یہ بولے کہ یہاں Surety کس کو تھی یعنی یقین کس کو تھا کہ شیر گرے گا۔

بہر حال نوجوان شکاریوں کو چاہئے کہ جھوٹ بولنے اور گپیں مارنے اور شکار میں بہادری کی جھوٹی بھتکیاں ہانکنے سے ہمیشہ پرہیز کریں۔ جھوٹ کا کھل جانا لازمی ہے اور پھر رہی سہی وقعت بھی جاتی رہتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مارنے والے برابر پیدل شیر مارتے تھے۔ ہمارے ملک کے نوجوان شکاری میرے دوست مولوی ثناء اللہ خان صاحب مرحوم پیدل شیر مارنے والوں کی ممتاز مثال تھے۔ جنہوں نے بیسیوں شیر تنہا گوی پر جاکر مقابل سے مارے۔ بعض پرانے شکاریوں کا یہ کہنا ہے کہ مار نیچے ہی سے اچھا لگتا ہے کیونکہ جانور کا پورا اگلا حصہ نظر آتا ہے اور مچان پر سے ویسا نظر نہیں آسکتا۔ چنانچہ احمد خان صاحب پٹھان ساکن پاٹن پیدل یا زمینی ماٹ سے ہی شیر مارتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں بھی ان کے ساتھ اس قسم کے شکار میں شریک تھا۔ میرے نانا صاحب نے کئی شیر مقابل سے مارے اور وہ بھی اس زمانے کی بھرمار بندوق سے۔ مگر ان کی بندوق بھی خاص بنی ہوئی تھی۔ اس قدر وزن دار اور بڑی کہ معمولی آدمی اس کو ہاتھ پر سنبھال نہیں سکتا۔ گولی اس میں ایک یا ڈیڑھ چھٹانک کی آتی ہے۔ بارود بھی اسی مناسبت سے ڈالی جاتی ہے۔ وہ یہ فرماتے تھے کہ شیر اس کی ایک گولی کھانے کے بعد سانس بھی نہ لیتا تھا ماموں جان کے پاس یہ بندوق بطور یادگار کے اب تک محفوظ ہے۔ (مسلسل)

توکل کا صحیح مفہوم

کچھ لوگ محنت و مشقت اور کام کاج سے بچنے کے لئے اس حدیث کا سہارا لیتے ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر تم خدا پر بھروسہ کرو، تو پرندوں کی طرح وہ تمہیں روزی عطا کرے گا، تم پرندوں کو دیکھتے ہو کہ صبح خالی پیٹ گھونسلوں سے نکلتے ہیں لیکن شام کو آسودہ ہو کر واپس آتے ہیں"۔

ان لوگوں کی دانست میں حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا پر توکل کیا جائے تو روزی خود بخود مل جاتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہی حدیث ان کے مفروضے کو غلط ثابت کرتی ہے اور حصول رزق کے لئے جد و جہد کرنے کی صاف طور پر دعوت دیتی ہے۔ اس لئے کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ پرندوں کا شکم سیر واپس آنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب رزق کی تلاش میں وہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دنیا بھر الٹی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔ گویا پرندوں کی دوڑ دھوپ ان کے لئے حصول رزق کا سبب ہے۔

(یوسف القرضاوی)

میر ہاشم ایک نظر

نام کتاب	:	دردِ نارسا (مجموعۂ کلام)
شاعر	:	میر ہاشم
سرورق	:	شکیل شہانے
ناشر	:	محمد محتشم علی ۵/۹۷ سنہری نگر ملک نگر لاتور ۴۳۱۰۰۱ اورنگ آباد
قیمت	:	۲۵ روپیے
تبصرہ	:	ایڈیٹر شاداب

میں نوا سنج ہوں اک سازِ شکستہ لے کر
لٹ رہا ہے مرا سرمایۂ جاں کس سے کہوں
دل دکھاؤں کسے، فریاد سناؤں کس کو
کون ہے محرمِ مجروح دلاں کس سے کہوں
ملک الموت وہی اور مسیحا بھی وہی
چارہ گر کس کو کروں، دردِ نہاں کس سے کہوں
رفعتِ فکر و نظر ایک بلا ہے، مجھ کو
بحرِ ظلمات میں تنکے کا سہارا بھی نہیں (بے خواب ص۲۱)

ناموافق حالات سے نکلنا تو اس بحرِ ظلمات میں جہاں تنکے کا سہارا بھی نہیں، میر ہاشم "رفعتِ فکر و نظر" کو بھی ایک بلا سمجھتے ہیں۔ لیکن اسی "رفعتِ فکر و نظر" کے سہارے ایک شکستہ ساز لے کر "نوا سنج" ہیں۔

اختر حسن نے "دردِ نارسا" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "میر ہاشم کم سخن، نرم گفتار، پرسکون اور خواب آلودہ۔ ان کے سانولے سلونے چہرے پر ان کی روشن اور ذہین آنکھیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ہو نہ ہو یہ شخص فنکار ضرور ہے، ایک خواب دیکھنے والا فنکار۔ ایک روشن لگاہ شاعر۔"

میر ہاشم ایک خواب دیکھنے والا فنکار اور ایک روشن نگاہ شاعر ہیں لیکن انھوں نے حقیقت بیں نگاہوں سے دنیا دیکھی ہے۔ ان کے حساس دل نے اثرات قبول کئے ہیں، اور ان تاثرات کو انھوں نے اپنے نرم خو اور سبک رفتار اسلوب سے اثر آگیں انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کے شعر میں جذبہ کی تندی و تیزی بھی ہے اور احساس کی ہنگامہ پروری بھی، لیکن طرزِ ادا خوش آہنگ ہے اور نرم خوئی، وضعداری، وقار اور شگفتگی لئے ہوئے کہتے ہیں:

نہ تار تار گریباں، نہ چاک دامن ہے
ہمارے عشق کو دیوانہ پن نہیں آتا غزل ص۱۲

"رہ دار و رسن" کو "شوق کی منزل" اور "تلاطم آشنا موج" کو "ساحل" سمجھنے والا شاعر کہتا ہے:

رہِ دار و رسن کو شوق کی منزل سمجھتے ہیں
تلاطم آشنا، ہر موج کو ساحل سمجھتے ہیں
خدارا! کوئی درسِ مصلحت بینی نہ دے ہم کو
ہم اپنے حال سے واقف ہیں مستقبل سمجھتے ہیں قطعہ ص۲۴

میر ہاشم تقریباً ایک ربع صدی سے شاعری کر رہے ہیں اور ایک انفرادی اسلوب کے مالک ہیں، ان کی شاعری ان کے اپنے انداز سے پہچانی جاتی ہے جو نہ قدیم طرزِ ادا ہے نہ ترقی پسند انداز۔ پابندِ بحر و وزن غزلوں کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کی ہیئت کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور کسی خاص نظریئے یا دبستان سے متعلق ہوئے بغیر انھوں نے اپنے احساسات و تاثرات کو اثر انگیز پیرایہ میں خوش آہنگ اور جمالیاتی رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور اثر پذیر ہوتی ہے، حقیقت پسندی ان کے اشعار کی نمایاں خصوصیت ہے

زندگی ہم نے تو خوابوں میں بسر کی ہاشم
سب کے سب خواب تو تعبیر دکھانے سے رہے مقطع غزل ص۱۰

میر ہاشم نہ ماضی کی لن ترانیوں میں گم ہیں، نہ مستقبل کے خوابوں میں پریشاں، بلکہ حال کے مسائل سے دست و گریباں ہیں۔

کل کا کیا ذکر، ہیں کل اور مسائل ہم کو
آج کی بات کرو آج ہے حاصل ہم کو مطلع غزل ص۱۱

اور آج کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار۔

آج بھی معرکۂ دشت بلا برپا ہے
اپنے کاندھوں پہ صلیب اپنی اٹھائے رکھئے (عرض ص ۱۳)

یہ اپنی آنکھ سے دیکھتے، اپنے ذہن سے سوچتے اور اپنے لب سے اپنے تاثرات کا اپنے رنگ میں اظہار کرتے ہیں، دیکھئے:

یہ آنکھیں،
میری آنکھیں ہیں۔
میں اپنی ہی نظر سے دیکھتا ہوں ساری دنیا کو۔
یہ میرے ہاتھ ہیں،
جو کار زار زندگی میں ساتھ ہیں میرے
یہ میرے لب ہیں،
ہر اک مصلحت سے ناشناسا ہیں۔
یہ میرا ذہن اپنا ہے،
کسی تقلید سے انکار ہے اس کو۔
ہر اک شے سے یہاں تک میری اپنی ہے،
مگر —
یہ دل!
سوائے میرے،
سب کا ہے۔ (اجنبی ص ۲۵)

اقبال کے نزدیک شاعر رنگیں بیاں دیدۂ بینائے قوم ہے، جو جسم کے کسی عضو کے مبتلائے درد ہونے پر روتا ہے۔ میر ہاشم کے نزدیک یہ شاعر دل ہے جو انسانیت کے لئے تڑپ اٹھتا ہے یہ دل جو سوائے شاعر کے سب کا ہے اور سب کے لئے دھڑکتا ہے۔ کہتے ہیں:

قدم میرے شعور آدم کا ہے آسمانوں پر
کمند شوق کی زد پر مہ و مریخ و زہرہ ہیں
یہ عہد نو مبارک ابن آدم کو
مگر یہ میری دھرتی آج بھی شعلہ بداماں ہے۔

ع اے تقدیر تو دیکھو
میرے حصہ میں آیا ہے قصیدہ ابن آدم کا
مگر نوحہ بنا ہے انسانیت کی نوحہ خوانی بھی　　(یہ عہد نو! ص۲۹)

ان کی غمخوار اور حقیقت بیں نگاہیں دیکھتی ہیں :

در بہ در ٹھوکریں کھاتا ہوا بے کس انسان
دل شکستہ لب خاموش سے فریاد کناں
جب کہیں بھی رہ امید نہیں پاتا ہے
اپنے معبود کی دہلیز پہ جھک جاتا ہے
دل بے تاب کو تسکین تو ہو جاتی ہے
چشم بے خواب ذرا دیر تو سو جاتی ہے　　(بے خواب ص۳۱)

میر ہاشم کی نظموں میں جذبات کی رو کچھ تیز ہی ہے۔ زبان و بیان میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ وہ اپنے تجربات و تاثرات کو بڑے کامیاب جمالیاتی آہنگ کے ساتھ اپنے خاص اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ ایک نعتیہ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

وہ تو سب کچھ تھا مگر
اس نے اصرار کیا
وہ بھی انسان ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں
مصلح قوم بھی تھا اور بغاوت کا نقیب
انقلاب ایسا کہ دنیا ہی بدل دی اس نے
وہ سپاہی بھی تھا، سالار بھی تھا
حکمراں ایسا کہ محکوم تھے عاشق اس کے
وہی دلگیر بھی، دلدار بھی تھا
کسی حالت میں بھی بے دل نہیں ہونے والا
عرش پہ رکھ کے قدم، فرش پہ سونے والا　　(شیرازۂ عمر رواں ص۸)

ان کے مرثیوں میں بھی جذبات کی یہی شدت پائی جاتی ہے، اور پھر کس سادگی اور راستی کے ساتھ۔ جواہر لال نہرو کی وفات پر کہتے ہیں

بات ایسی کوئی انہونی نہیں ہے پھر بھی
دل یہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہو سکتی۔

رات خوابوں میں کٹی
رات آنکھوں میں کٹی
اعصاب دل کے نکلنے پہ ہے حیرت دل کو
وقت کیوں کر نہ تھما
کیسے یہ سورج نکلا
ایسی دنیا میں
کہ جس دنیا میں
تیری آواز کا جادو بھی نہیں
تو بھی نہیں (تیرے بغیر ص ۵۷)

مخدوم کی وفات ان کے لئے ایک بھیانک خواب ہے۔ کہتے ہیں :

"بساطِ رقص" ویراں ہے
ارادہ، عزم اور جہد و عمل سب مضمحل سے ہیں
وفا ماتم کناں ہے
نغمہ و آہنگ روٹھے ہیں
محبت چیختی ہے
دلبری آنسو بہاتی ہے
ہجوم غمگساراں ہے
کفن سرکا تو اک خنجر ہوا پیوست سینے میں
غلط ہے
جھوٹ ہے
یہ ہو نہیں سکتا
کوئی اس خواب بد سے مجھ کو چونکا دے
کہ بیداری میں دیکھوں پھر وہی ہنستا ہوا چہرہ (بھیانک خواب ص ۶۲)

اریب کی یاد میں کیفیت ملاحظہ ہو :

وہ آنسوؤں میں، ہنسی میں، دلوں میں، محفل میں
اریب مر گیا ہاشم یہ جھوٹ کس نے کہا (یہ جھوٹ کس نے کہا ص ۹۴)

انقلاب کا ذہن کی یادیں ان کے تاثرات دیکھئے ۔

اس چمن زار کی نازک سی کلی
جس کا گہوارہ تھے باد و باراں
رونقِ فصلِ گل و جانِ نسیم سحری
سنگ داہن کے مقابل تنہا
اس کی خوشبو کی مہک دور تلک پہنچی تھی
ہر نظر ڈھونڈ رہی ہے اس کو ۔ (وہ ایک آبلہ پا ص۸۰)

فیض احمد فیض کی رحلت پر نوحہ کناں ہیں :

یہی حرف و لفظ کلیم تھے ، یہی حرف و لفظ قسیم ہیں
وہ ادا، وہ طرز فغاں گئی ، وہ فروغ حسنِ بیاں گیا
کبھی بزم میں کبھی بے وطن ، سر دار بھی وہی بانکپن
وہ متاعِ لوح و قلم گئی ، وہ وقار تیغ و سناں گیا ۔ (وہ متاع لوح و قلم گئی ص۱۰۲)

آزاد نظموں اور مرثیوں کے ساتھ ہی میر ہاشم کی غزل بھی دامنِ دل اپنی طرف کھینچتی ہے
ما و محبت کے جذبات شدتِ خلوص و صداقت کے ساتھ موجزن ہیں اور بقول میر ہاشم

یہ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مینائے غزل
اس کو دیس کی خوشبو ہے ہمارے فن میں (ص۱۶)

رنگ تغزل ایسا کہ ایک سماں آنکھوں کے سامنے بندھ جائے ، تشبیہ و استعارات سونے سہاگے کا کام کرتے ہیں ۔

بات کیا راز رہے گی کہ مرے نام کے ساتھ
تیرے چہرے سے مہکتی ہے حیا کی خوشبو (ص۹۵)

بند ہونٹوں پہ تبسم کی یہ ہلکی سی لکیر
جیسے اک غنچۂ گل رنگ چٹکتا ہے ابھی
چشم مخمور ہے احساس حیا سے بوجھل
میکدے میں کوئی پیمانہ چھلکتا ہے ابھی (ص۹۳)

ہے کس ادا سے خراماں ! وہ حسنِ بے پروا
لگی ہے چوٹ کسے مڑ کے دیکھتا بھی نہیں (ص۹۰)

حرفِ آخر

جناب ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم۔ اپریل ۸۶ء کا شاداب کا شمارہ موصول ہوا۔ ڈاکٹر مسز وسیم درّدانہ باسط صاحبہ کا مضمون نظر سے گزرا، بہت دُکھ ہوا۔ محترمہ نے الزام لگایا ہے کہ میں نے ان کی کتاب سے مضمون اخذ کر کے مواد کا الٹ پھیر اور جملوں کو توڑ مروڑ کر اپنے نام سے شائع کروا لیا۔

اولین فرصت میں اپنا Rough work دیکھا۔ جس میں تمام حوالے نمبرات کے ساتھ درج تھیں حاشیہ میں لکھا گیا تھا۔ اصل مضمون میں نمبرات لکھنا چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ نمبرات میں بعد میں حوالے بالترتیب ہوں۔ مضمون مکمل کرنے کے بعد ہی نمبرات اور حوالے لکھنا مناسب تھا۔ مضمون کے خاتمہ پر حاشیہ آرائی کرنا بھول گیا جس کی وجہ سے حوالے نہ دے سکا۔

...اپریل کو محترمہ سے ملاقات کی۔ انھیں اصل تحریر دکھائی۔ پورا مضمون بتایا۔ نمبرات اور حوالے ... ہے۔ مضمون کی نوعیت، مقصدِ تحریر اور اپنی محنت و کاوش کا ذکر کیا۔ محترمہ نے ان باتوں کا اعتراف کیا۔ اس طرح محترمہ کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

بحقیقت مجھے مرحوم سید امجد حسین خطیب کو بہ حیثیت برار کے مایۂ ناز مورخ پیش کرنا تھا۔ ... میں مجھے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، ایلچ پور کی اہمیت، برار میں مسلمانوں ... کی آمد، مرحوم کے آباء و اجداد کا ذکر، تاریخ امجدی، دورِ خاتمہ، ان ہی نکات ... کو پیش کرنا مقصود تھا۔ اسی لئے میں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش ... اس کے لئے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ آپ کے عزیزوں میں جناب سید ذوالفقار حسین صاحب اور جناب پروفیسر سید ابرار حسین خطیب صاحب، ان دونوں حضرات سے ۱۲ دسمبر ... (ایلچ پور) مل چکا ہوں۔ اسی طرح موصوف کا سلسلۂ نسب معلوم کرنے کے لئے قاضی سید ... صاحب (ایلچ پور کے بزرگ) سے بھی مل چکا ہوں۔ ان حضرات نے میری رہنمائی کی۔ اس لئے ... ان کی تحریر سے مناسبت رکھتی ہے اسی وجہ سے محترمہ سمجھ بیٹھیں کہ میں نے ان کی تحریر

کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔

میں نے جن کتب سے استفادہ کیا ہے اور ان کے نام تحریر کرنا بھول گیا تھا ان کے نام ذیل میں دئے جاتے ہیں:-

۱) تاریخ امجدی : سید امجد حسین خطیب
۲) لوح الصدیہ : محمد سید عظمت حسین خطیب
۳) امراؤتی گزیٹیر
۴) ایلچپور کے چند قدیم اردو شعرا : از ڈاکٹر سیدہ وسیم درانہ باسط
۵) تذکرۂ رحمانی : محمد مہتاب خاں
۶) تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ ۱۹۲۱ء
۷) تاریخ فرشتہ
۸) تذکرہ مشاہیر برار Pre-Mughal Berar-by Dr. M.Y. Quddusi
۹) دکن میں اردو ۔ نصیر الدین ہاشمی
۱۱) ودربھ میں اردو ۔ فروری ۸۲ء
۱۲) شاداب ۔ ستمبر ۸۵ء
۱۳) ودربھ نامہ ۔ مارچ ۸۶ء

امید ہے قارئین شاداب بھی اب مجھے سرقہ کا مرتکب نہ سمجھیں گے۔ ○○○

(عبدالعزیز عرفان)

سلسلہ صفحہ ۱۲

رنگینیٔ حیات بھی ہے، تیرا غم بھی ہے
میں ہنس رہا ہوں اور مری آنکھ نم بھی ہے

آنسو جو تیرے نام سے آنکھوں میں آ گیا
ہے آبروئے عشق بھی، توہینِ غم بھی ہے

ہاشم عجب تضاد مجسم ہے دوستو
ہے پیکرِ نشاط بھی، تصویرِ غم بھی ہے

غرض میر ہاشم کا "[illegible]" ایک ترنم کش ہے جو قاری کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے

یاد آتی ہے تری نیم نگاہی اکثر
خار جو ٹوٹ گیا دل میں کھٹکتا ہے ابھی

"[illegible]" کا انتساب "تمہارے نام"۔ جیسا انوکھا ہے، ویسے ہی یہ مجموعۂ کلام انوکھا ہے اور دل نشیں، سرور انگیز ہے اور غم آگیں۔ یقین ہے یہ قبولِ عام کی سند پا کر سب کے دلوں پر راج کرے گا۔ ●●●

نوائے وقت

انور کھام گانوی

راہِ رضائے رب میں نکلتے ہوئے بڑھو
ضبط و سکون و نظم سے چلتے ہوئے بڑھو

فضلِ خدا سے پھولتے پھلتے ہوئے بڑھو
رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں میں پلتے ہوئے بڑھو

ہر خار زارِ غم کو مسلتے ہوئے بڑھو
پندارِ کفر و شرک کچلتے ہوئے بڑھو

کب تک پرائی آگ میں جلتے رہوگے تم
پروانو! اپنی آگ میں جلتے ہوئے بڑھو

سوز و گدازِ عشق سے گرما کے خونِ دل
عزم و یقیں کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے بڑھو

دشوار رہگزار سہی، لاکھ لغزشیں
گرتے، خود اٹھتے، آپ سنبھلتے ہوئے بڑھو

رخ موڑنا ہے وقت کے دھارے کا ہی اگر
رخ اپنی زندگی کا بدلتے ہوئے بڑھو

کرنی ہے تم کو فکرِ علاجِ غمِ حیات
انسانیت کے غم میں پگھلتے ہوئے بڑھو

طاغوت پھر نہ ابھرے تھپیڑا کچھ ایسا دو
سیلاب گوں لئے اچھلتے ہوئے بڑھو

باطل اگر ہو مدِ مقابل تو پل پڑو
سیماب کی طرح سے مچلتے ہوئے بڑھو

پھیلے ہوئے ہیں راہ میں دامِ فریب پھر
ہر موڑ، ہر قدم پہ سنبھلتے ہوئے بڑھو

کب کی سحر ہو چکی ہے مگر تم نہیں اٹھے
سوئے بہت اب آنکھوں کو ملتے ہوئے بڑھو

انور ہوائے نفس سے کرتے ہوئے جہاد
ہر پیچ سے ہوس کے نکلتے ہوئے بڑھو

جلال پورہ، کھام گاؤں 444303، مہاراشٹرا

غزل

انور پربھنوی

نفرت کا تحفظ کرتے ہیں ہر چہار دوستو!
اکثر وطن کے شاعر و فن کار دوستو

تعریفِ زلفِ یار نہ قد کی ہے گفتگو
تفسیرِ زیست ہیں مرے اشعار دوستو

ہم فسادی تو نہیں پیغمبرِ امن
بدنام یوں ہی ہو گئے اشرار دوستو

نیا مشعلِ حیات مری قوم کے لئے
میرا طریقِ نو، مرے افکار دوستو

ہر لفظ، ہر سطر ہے لہو سے لکھی ہوئی
ہرگز نہ دیکھو آج کا اخبار دوستو

یہ بھی تو دے سکے نہ ثبوتِ وفا کبھی
اکثر ہیں جو کہتے ہیں وفادار دوستو

ہے خوں سے لال زمینِ وطن مگر
پھر بھی منا رہے ہیں وہ تہوار دوستو

معرفت اسد آرمان، بروڈ بیس، چنتور، پربھنی، مہاراشٹرا اسٹیٹ

ایک نظم، چند قطعات

از شاغل ادیب

سُفید خون

میں بھی ہوں
آدمی اک عجب دوستو
ہو کے سنسار سے
اک ذرا سا جُدا
رو رہا ہوں
سمندر لہو کا سدا

خون ہی خون سے
تربتر
گھر مرا ہو گیا
ہاں مگر خوں بھرے
اس مرے گھر سے سنسار کو
کیا غرض
خون ہے تو ہے
سفید
اس کا کب کا ہوا۔

قطعاتِ اُردو

اُردو دراصل ہے زباں اپنی
اُردو اپنی ہے قومی تہذیب
عہدِ آئندہ کا اس کی کریں
اردو اپنا ہے ورثہ ــ قومی

بولی اُردو نہیں ہے پردیسی
ہے جنم بھومی اس کی بھارت ہی
اصل اس کی اگر سمجھنی ہے
شاعری دیکھیے خسرو کی

درسِ قرآں کے اس نے سمجھائے
گائے گیتا کے پاٹھ بھی اس نے
آشتی کا پیام ہے اُردو
اس نے جینا سکھایا مل جل کے

شورسینی کی ہے رسیلی ــ صدا
سُر ہے میٹھا یہ برج بھاشا کا
نغمگی پوچھتے ہو اس کی کیا
ہے کھڑی بولی کا یہ راگ نیا

اب تعارف کی اس کو کیا حاجت
اُردو کی ہر جگہ ہے اب شہرت
روس و امریکہ گائیں گن اس کے
ہے جہاں بھر میں اس کی اب عظمت

معتمد عمومی، نیرنگ ادب، مشیر آباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸

عید کا دن

مومن خان شوقؔ

بہارِ بے خزاں ہے عید کا دن
گلوں کا کارواں ہے عید کا دن
مسرت رقص فرما ہر طرف ہے
نشاطِ جاوداں ہے عید کا دن

روزِ روشن بہارِ صبحِ عید
روزہ داروں کو رحمتوں کی نوید
چاند کو ہم نے یوں بھی دیکھا ہے
چاند کی دید، اپنے یار کی دید

اشرف ولا ۲۲۳۷-۳-۱۱، ملے پلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

غزل

ثریا صولت حسین ثریاؔ

آنکھیں جو آنسوؤں کی شدت لئے ہوئے ہیں
گویا کہ موتیوں کی دولت لئے ہوئے ہیں
پھولوں میں رنگ و بو کی مستی بھری ہوئی ہے
خاروں کی سوزشیں بھی لذت لئے ہوئے ہیں
مانا کہ فصلِ گل ہے خوشیاں منائیں کیوں کر
دورِ خزاں سے گزرے عبرت لئے ہوئے ہیں
ہم اُن کو یاد آئیں، نیندیں چرائیں اُن کی
بس مدتوں سے ایسی حسرت لئے ہوئے ہیں
مانا کہ بادلوں کی فطرت میں ہے برسنا
پھر بھی کئی زمینیں حدت لئے ہوئے ہیں
یادیں حسین شہر کا ماضی جسے کہیں ہم
دامن میں کل جہاں کی نعمت لئے ہوئے ہیں
منزل نہ تھا ثریاؔ دنیائے آب و گل کی
نیسر کا جہاں سے رخصت لئے ہوئے ہیں

[illegible]

اسدؔ کھنڈوی

فخرِ اردو زباں ہے غزل
دولتِ جاوداں ہے غزل
گو ہے صدیوں سے محوِ سفر
آج بھی تو جواں ہے غزل
ہے پرے حدِ ادراک سے
فکر کا آسماں ہے غزل
غالبؔ و میرؔ کا فکر و فن
جس میں ہے وہ بیاں ہے غزل
پوچھ حافظ سے اتنا اسدؔ
کیسے جادو بیاں ہے غزل

[illegible]

غزل

عطا عابدی

کب یہ کہا ہے میں نے تجھ سے مجھ کو اپنا مت کہنا
میں ہوں تیرا اپنا لیکن اپنے جیسا مت کہنا

سر کو ہتھیلی پر رکھے اک نسل تمہارے پیچھے ہے
دار پہ جانے والے انساں خود کو تنہا مت کہنا

اے میری تنہائی تجھ کو اس کی یاد دل کا صدقہ
جو کچھ میرے دل میں آکر تو نے دیکھا مت کہنا

جس کی زباں پر یارو ہر دم اپنی ہی تعریفیں ہیں
جو بھی چاہو کہہ لو اس کو لیکن اچھا مت کہنا

اس نے تیرا حال بگاڑا، اس نے یوں پامال کیا
اے دل وہ ہے تیرا دشمن اس کو اپنا مت کہنا

فن کو آنگن کے سانچے میں ڈھلتے جانا اے رقاص
آنگن ٹیڑھا بھی ہو تو تم اس کو ٹیڑھا مت کہنا

صبح کا بھولا بھٹکا مسافر گھر کو اپنے وقت شام
آ جائے گر واپس تو پھر اس کو بھولا مت کہنا

جس کے ہاتھوں سارا گلستاں عرصہ سے ہے لہولہان
ایسے قاتل شخص کو لوگو آنکھ کا تارا مت کہنا

ہمت عالی ہو تو اس کو تیر کے بھی جا سکتی ہے
راہِ سفر میں حائل ہے اک آگ کا دریا مت کہنا

عطا عابدی موضع و پوسٹ برہولیا، وایا کیوٹی سمری، ضلع دربھنگہ ۸۴۷۱۰۶ (بہار)

طوبیت المال

مئی ١٩٦٦ء تا فبروری ١٩٨٧ء

٩ کروڑ سے زائد ٹرن اوور کی کارکردگی، ایک نظر میں !

ارکان کو ان کی اشیاء کی کفالت پر سات کروڑ چوبیس لاکھ روپیہ سے زائد کے قرضوں کی اجرائی ۔
چار لاکھ سے زائد اشیاء ادائی قرض کے بعد بلا شکایت واپس کی گئیں ۔
قرضوں کی اجرائی کے باعث ارکان چار کروڑ روپیہ سے زائد کے نقصان اور سود جیسے گناہ سے محفوظ رہے۔
(١٣٠٨٣) نادار لڑکیوں کی شادیوں میں انیس لاکھ ستر ہزار روپیے سے زائد کی امداد جاری ہوئی
(١٣٨٤) مستحقین کی تین لاکھ ترتالیس ہزار روپیوں سے مدد کی گئی ۔
١٠٧٨٠ دواخانہ عثمانیہ کی لاوارث اور غیر مستطیع اموات پر ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیے سے زائد کے اخراجات ۔
چار لاکھ تیرہ ہزار سے زائد روپیوں سے مساجد کا تعاون کیا گیا ۔
دو لاکھ انیس ہزار سے زائد دینی مدارس کی مدد کی گئی ۔
پچیس لاکھ ٦٣ ہزار سے زائد کی رقم قرض مشروط ارکان کو بلا کسی شکایت واپس کی گئی ۔
اہل خیر حضرات نے ایک کروڑ نو لاکھ سے زائد رقم طوبیت المال کو قرض کے طور پر دی۔
اور ان کے مطالبہ پر بیت المال نے صرف دس منٹ میں ایک کروڑ پچیس ہزار روپیے واپس کئے۔
طوبیت المال کی بلڈنگ کی تعمیر میں اٹھارہ لاکھ بیاسی ہزار روپیہ سے زائد رقم خرچ کی گئی ۔
مختلف فسادات میں ایک لاکھ اکتالیس ہزار روپیہ سے زائد کی رقم بطور ریلیف جاری کی گئی۔

"طوبیت المال" ہر ماہ اوسطاً (٨٠) لڑکیوں کی شادیوں (١٢) اموات (٥٤) مستحق افراد (٣) مساجد اور (٥) مدارس پر ٥٠ ہزار روپیہ کی امدادیں جاری کر رہا ہے۔ ارکان کو کم از کم ٥ لاکھ روپیے قرض جاری کرتا ہے اور یہ صرف (اللہ) کا فضل اور (٦٧٠٠) ارکان کے تعاون کا نتیجہ ہے۔

اگر آپ رکن نہیں ہیں اور طوبیت المال کی کارکردگی پسند آرہی ہے تو اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سنت کا تعاون کرنے کے جذبہ قرض مشروط کی رکنیت حاصل کر کے سو شہیدوں کا ثواب حاصل کیجئے۔

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ

اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں

طوبیت المال زکوٰۃ سے

وصول ہونے والی رقم غیر سید نادار لڑکیوں کی شادی اور مستحقین کی امداد پر خرچ کرتا ہے۔ اگر آپ ان مقاصد کی تکمیل ضروری سمجھتے ہیں اور بیت المال کی تقسیم امداد سے ہر طرح مطمئن اور مسرور ہیں تو اپنی زکوٰۃ کی رقم "طوبیت المال" میں جمع کیجئے۔!

گذشتہ ماہ رمضان میں میری اپیل "اگر اس سال طوبیت المال کو دو لاکھ پچاس ہزار روپئے زکوٰۃ وصول ہوگی تو بیت المال نادار لڑکیوں کی شادی میں (۲۵۰) روپئے جو امداد دے رہا ہے اسے پانچ سو روپئے کر دے گا اور یہ خواہش بھی تھی کہ آپ جو زکوٰۃ نکالتے ہیں اس کے چار مساوی حصے کیجئے قرآن پاک کے حکم کی روشنی میں سب سے پہلے دو حصے اپنے عزیز و اقارب مستحقین زکوٰۃ کو دیجئے۔ ایک حصہ طوبیت المال کو دیجئے اور ایک حصہ جس ادارہ، جماعت، مدرسہ یا جس کام سے آپ مطمئن ہیں اور خوش ہیں انھیں دیجئے" کے جواب میں (۴۴۲) اصحاب نے دس روپیہ سے لے کر (۱۳,۶۸۶) روپئے تک دو لاکھ بیاسی ہزار روپئے کی زکوٰۃ بیت المال میں جمع [illegible]

بیت المال ۱۳/ جولائی ۱۹۸۶ء کو ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب صدر مجلس طوبیت المال کی صدارت میں جناب سید محمد شاہ صاحب سابق صدر نشین آندھرا پردیش قانون ساز کونسل جناب اقبال علاء الدین ایڈوکیٹ مہمان خصوصی اور ایسے اصحاب خیر جو ایک ہزار سے زائد رقم زکوٰۃ بیت المال میں جمع کئے تھے پر مشتمل ایک پریس کانفرنس منعقد کیا جس میں بیت المال سے اجرائی امداد شادی و مستحقین کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی گئی اور حاضرین سے مشورے طلب کئے گئے۔ تمام حاضرین اور رپورٹرس بیت المال کے طریقہ کار سے مطمئن رہے۔ اسی مجلس میں (۳۱) نادار لڑکیوں کی (۵۰۰) روپئے امداد کردی گئی اور (۵) مستحقین کی منظورہ امداد جملہ ۷ ہزار روپئے معزز مہمانوں کے ہاتھ تقسیم کرائے گئے۔ میرے اندازے کے مطابق شہر حیدرآباد میں ۴۰ ہزار افراد ایسے ہیں جو نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اگر ان میں (۵۰۰۰) افراد میری اپیل "چوتھائی" کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زکوٰۃ بیت المال میں جمع کریں گے تو انشاء اللہ بیت المال اپنے زیر نگرانی شادیوں کا انتظام کروائے گا اس کام سے غربا میں غیر شرعی رسومات اور اسراف کا انسداد ہوگا تو دوسری طرف ایسی لڑکیاں جن کی عمریں ۲۵، ۳۰ سال ہو چکی ہیں سرمایہ نہ ہونے کی وجہ ان کی شادیوں کے اسباب نہیں ہو رہے ہیں ان کے والدین کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو سکون میسر آئیگا اور انکے ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعائیں تمام معاونین کو دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں سے سرفراز کریں گی اور اجتماعی اجر کے یقیناً آپ مستحق رہیں گے۔ آپ زکوٰۃ عطیہ [illegible] کی رقم دفتر طوبیت المال [illegible] روزانہ صبح ۹ تا ۲ بجے دن یا انکے [illegible] عاملین کو باضابطہ رسید دے [illegible] پر عاملین آپکے مکان آکر وصول کا کام انجام دیں گے۔ الداعی الی الخیر میر [illegible] علی پاشا معتمد طوبیت المال

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد ۱۳ — جولائی ۱۹۸۶ء — شمارہ ۷

ایڈیٹر پبلشر
محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

زرِ تعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
سالہ 90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
حیات 1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب، 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل پریس چار کمان میں چھپا کر دفتر شاداب سے شائع کیا

آندھرا پردیش میں برسراقتدار تیلگو دیشم پارٹی کے ہیڈکوارٹر تیلگو وجیم موقوعہ گنڈی پیٹھ حیدرآباد میں جاری سالانہ کانفرنس "مہا ناڈو" میں دوسرے دن کی منظورہ قراردادوں سے اخبار نویسوں کو واقف کراتے ہوئے صدر پارٹی جناب این۔ ٹی۔ راما راؤ نے بتاریخ ۲۸ مئی ۸۶ء بتایا کہ ان کی پارٹی ریاست میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے تمام اقدامات کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تیلگو دیشم کے تین سالہ دور حکومت میں حیدرآباد یا سکندرآباد یا دیگر علاقوں میں کوئی فرقہ وارانہ کشیدگی نہیں دیکھی گئی۔
موصوف نے بتایا کہ ایک منظورہ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ وقف جائیدادیں جو مرکزی مقامات پر واقع ہیں ان پر کمرشیل کامپلکس تعمیر کرنا چاہئے تاکہ اردو کے فروغ کے لئے مزید آمدنی حاصل کیا جاسکے۔
جناب این۔ ٹی۔ آر کے اظہار کے مطابق تیلگو دیشم پارٹی نے تجویز پیش کی ہے کہ وقف جائیدادوں کی آمدنی اردو زبان کے فروغ اور مسلم طبقہ کے لئے نئے اسکول اور جونیر کالجس کے قیام کے لئے استعمال کی جانی چاہیے۔

صدر تیلگو دیشم پارٹی و چیف منسٹر آندھرا پردیش جناب این۔ ٹی۔ آر کا یہ اعلان نہایت خوش آئند ہے کہ ان کی پارٹی ریاست میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے تمام اقدامات کر رہی ہے وہیں یہ سفارش بڑی تشویشناک ہے کہ مسلم وقف کی آمدنی اردو کے فروغ کے لئے خرچ کی جائے۔ ہر مسلم وقف کی آمدنی صرف اس کام کے لئے خرچ کی جاسکتی ہے جس کے لئے وقف نامہ میں صراحت کی گئی ہو۔ ایسے مسلم وقف ضرور ہیں جن کی آمدنی اشاعت تعلیم کے لئے مختص ہو، ایسے اوقاف پر کمرشیل کامپلکس تعمیر کئے جاکر اضافہ شدہ آمدنی تعلیم پر خرچ کی جاسکتی ہے اور کی جارہی ہے۔ ایسی تعلیم کا انتظام اردو میں ہو تو ضمناً اردو کو بھی فروغ حاصل ہوگا لیکن ایسے کوئی اوقاف موجود نہیں ہیں جو صرف فروغ اردو کے لئے مختص ہوں۔ اس کے علاوہ ٹی۔ ڈی۔ پی کی اس سفارش سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور اس کے فروغ کے لئے مسلمانوں کو اپنے اوقاف کی آمدنی سے انتظام کرنا چاہئے۔
حقیقت یہ ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ ایک ہندوستانی اور قومی زبان ہے چنانچہ مسٹر سی۔ ایچ۔ راجیشور راؤ قائد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ریاستی قانون ساز اسمبلی نے ٹی ڈی پی سے فوری مطالبہ کیا کہ وہ اپنی "غلط فہمی" کو دور کرے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اس کے فروغ کی ذمہ داری صرف مسلمانوں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو قومی زبان ہے اور اس کا

[illegible] مجلس اتحاد کی ذمہ داری [illegible] کانگریس (آئی) اسمبلی پارٹی، ڈاکٹر سید عبدالمنان [illegible] تلگو دیشم پارٹی کو توجہ دلائی کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ ہمارے ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت اسے سمجھتی اور بولتی ہے اور بطور رابطہ استعمال کرتی ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور اس کے فروغ کے لیے مسلم اوقاف کی آمدنی خرچ نہیں کی جاسکتی بلکہ حکومت کا فرض ہے کہ اپنی آمدنی سے اردو کے فروغ کے لیے خرچ کرے۔ جس طرح ہندو اوقاف سے یہ کام نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تلگو یا ہندی کی ترقی کی ذمہ داری قبول کریں، اسی طرح اردو تعلیم کو مسلم اوقاف کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

خوشی کی بات ہے کہ تلگو دیشم کے وہ اراکین جو اردو کے مسائل سے واقف ہیں اور اردو کی خدمت میں بھی لگے ہوئے ہیں، حرکت میں آئے اور اس سہ روزہ مہاناڈو کے اختتامی اجلاس منعقدہ ۲۸ مئی میں جناب بشیر الدین بابو خاں رکن اسمبلی تلگو دیشم نے ایک قرارداد پیش کی جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ اس مہاناڈو کی حکومت سے خواہش ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جائیں۔ اس میٹنگ کا یہ احساس ہے کہ ریاست کی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو فروغ دینے کے لئے قانون سرکاری زبان کی دفعہ ۷ میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے اور جی او ۲۷۴ کی مزید بامقصد طور پر عمل آوری کی جانی چاہئے۔ پرانے شہر میں اردو اقامتی اسکول کے قیام پر اس مہاناڈو کی جانب سے حکومت کو مبارکباد دی جاتی ہے اور حکومت سے خواہش کی جاتی ہے کہ اس طرح کے اقامتی اسکول ریاست کے تینوں علاقوں میں قائم کئے جائیں۔ نیز یہ مہاناڈو حکومت سے اس امر کی بھی خواہش کرتی ہے کہ ہندو انڈومنٹس ایکٹ کے خطوط پر قانون ریاستی وقف ۱۹۵۴ء میں ترمیم کی جائے تاکہ موقوفہ جائیدادوں کا تحفظ ہو نیز ان کو ترقی دی جائے۔ زمینات پر غیر مجاز قبضوں کے انسداد سے متعلق لینڈ گراب ایکٹ کے دائرہ اختیار میں موقوفہ جائیدادوں کو لانے کے سلسلے میں بھی یہ میٹنگ حکومت کو مبارکباد دیتی ہے۔ حکومت سے اس امر کی خواہش کی جاتی ہے کہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن، اردو اکیڈیمی، وقف بورڈ اور ایسے ہی دیگر اقلیتی اداروں کی مالی امداد میں اضافہ کیا جائے۔ اردو تقریباً ۵ فیصد ہندوستانیوں کی زبان ہے، اردو زبان ان کی تہذیب کی بنیاد ہے جو اس کو بولتے ہیں، اردو زبان کا فروغ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کو پڑھایا اور سکھایا جائے۔

تلگو دیشم پارٹی کی اس تیسرے دن کی قرارداد میں ان تشویش ناک امور کا ذکر نہیں ہے

جنوبی طرف مسٹر پارٹی نے دوسرے دن کے تصفیہ کا بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا ۔ جناب خلیل الرحمٰن سکریٹری اردو اکیڈمی نے واضح طور پر بتایا کہ اوقافی آمدنی کے ذریعہ اردو کو ترقی دینے کی کوئی قرارداد مہاناڈو میں منظور نہیں کی گئی اگر بھارت صدر پارٹی کی جانب سے یہ چال نہ چلا جاتا تو اچھا تھا ۔ تاہم [illegible] کی منظورہ قرارداد [illegible] مہاناڈو نے اردو زبان کی ترقی اور [illegible] کے لئے جو قرارداد منظور کی ہے اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے کہ اوقاف [illegible] اردو کی ترقی و ترویج کے لئے مستقل کیا جائے [illegible]

اکیڈیمی یہ قرارداد ملک کی سیاسی جماعتوں کی تاریخ میں ایک نیا اور سنہرا باب ہے اور ضرورت ہے کہ ایسی قراردادوں کا خیر مقدم کرکے ایسی فضا بنائی جائے جس میں اردو مسائل کے حل میں آسانی ہو ۔ جناب اکبر بیگ صدر نشین اقلیتی کمیشن نے بھی مہاناڈو کے تصفیہ کی وضاحت کرتے ہوئے ان اقدامات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا جو اردو کی ترقی کے لئے حکومت کی جانب سے روبہ عمل لائے جاتے ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ مہاناڈو کے دوسرے دن کے تصفیے پر لب کشائی کرتے ہوئے صدر ٹی ڈی پی نے جو بیانات دیے اور ان پر اردو والوں کے جس ردعمل کا اظہار ہوا، اس کا نتیجہ تیسرے دن کی قرارداد کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ ضرورت ہے کہ اردو والے اسی طرح بیدار اور مستعد رہیں اور وقت پر حقیقی صورت حال حکومت کو بھی بتاتے رہیں تاکہ پارٹی کے اس تصفیہ کو حکومت روبہ عمل لائے اور نہ صرف احکام جاری کرے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ ان احکام پر عمل بھی کیا جاتا ہے ۔

*

دہلی میں کل ہند اردو نیوز ایجنسی

جناب بشیر احمد عادل صدر اردو کمپیوٹر کی اطلاع کے مطابق ۱۲ جون ۱۹۸۷ء سے دہلی میں ایک کل ہند اردو نیوز ایجنسی کام کر رہی ہے ۔ یہ ایجنسی عصری ٹکنالوجی کی مدد سے مشینوں کے ذریعہ ان اخبارات کو اردو خبریں فراہم کرے گی جن کے دفاتر میں ٹیلکس کی سہولت موجود ہے دوسرے الفاظ میں اردو خبریں ٹیلی پرنٹر کے ذریعے [illegible] کی شکل میں ارسال کی جائیں گی [illegible] ایک قدم آگے [illegible] ہے جو اردو کمپیوٹر کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے

اس ایجنسی کا دفتر ۱۲۴ ، راجندر [illegible] نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے ۔

قاضی مفتی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

ہمارا ملی تشخص

قسط دوم
سلسلہ گزشتہ

لڑائی وہاں سے شروع ہوئی جب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دینی شروع کی، جب حکم کیا گیا کہ انذر عشیرتک الاقربین اپنے رشتہ داروں کو بھی آپ خوف دلائیے، ڈرائیے اور جب آقا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کیا گیا کہ اعلانیہ کہیے اپنی بات جس کا آپ کو حکم کیا گیا ہے۔ یہاں سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ ابولہب کا پہلا طمانچہ جو چہرہ انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ثبت ہوا یا عقبہ ابن ابو معیط کا ناپاک تھوک (لعاب دہن) ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر پھینکا گیا —— وہ محمدؐ جو محبوب تھے پورے مکہ کے، پوری برادری کے، پورے خاندان کے ان کے چہرے پر طمانچے لگے، گالوں پر طمانچے لگے اور چہرے پر تھوک پھینکا گیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ایک خدائے واحد پر یقین رکھتے تھے بلکہ وہ ایک اللہ کی دعوت بھی دیتے تھے۔ لوگوں کو یہ بھی دعوت دیتے تھے کہ تم بھی زندگی میں ایک اللہ تعالیٰ کے ماننے والے بنو۔

ورنہ وہاں بہت سے موحد تو پیدا ہو چکے تھے اور ان کو کسی نے کبھی نہیں ٹوکا۔ لیکن جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف موحد ہی نہیں تھے داعیٔ توحید بھی تھے۔ صرف آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ آخرت پر یقین کی دنیا کو بھی دعوت دیتے تھے۔ اپنی زندگی کو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلانے کے قائل نہیں تھے بلکہ لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگیوں کو چلانے کی دعوت دیتے تھے۔ یہیں سے ایک ممتاز و مشخص امت وجود میں آئی۔ وہ امت جو اللہ تعالیٰ کو ایک مان کر، آخرت کی جواب دہی پر یقین رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے آخری رسول کے ذریعے آنے والے احکام کے مطابق اپنی زندگی گزارے اور دوسروں کو بھی خیر کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر۔ یہاں سے بات چھڑی، ایسی امت جو

نائب امیر شریعت پٹنہ، بہار

امت دعوت ہو، لوگوں کو بلائے اور اپنی تمام زندگی کے اعمال کو اپنے خود اعتقاد کے مطابق گزارے جس اعتقاد میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، کتاب کی صداقت اور قیامت کا یقین ہو، ایسی امت کو دنیا گوارا کرنا نہیں چاہتی۔ یہ لوگ چاہتے تھے جن کی بابت قرآن کہتا ہے لو یردونکم عن دینکم ان استطاعوا۔ اے رسولؐ یہ یہودی اور نصرانی اس وقت تک آپؐ سے راضی نہیں رہ سکتے جب تک آپ ان کی ملت کی پیروی نہ کرنے لگیں۔ جب آپ ان کی ملت کی پیروی کریں گے وہ خوش ہو جائیں گے تو یہودی ہوں یا عیسائی کفار ہوں یا مشرکین، ان کی دلی خواہش صرف ایک ہے کہ تم اپنی ملی خصوصیات کو چھوڑ کر ان کی تہذیبی، ملی، عملی اور اعتقادی خصوصیات کو قبول کر لو۔ یہ ہے دراصل جنگ جو بہت شروع سے چلی آ رہی ہے۔ اس لئے میں اگر یہ کہوں کہ اعمال صالحہ جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کہا ہے اس نیک عمل کو کرنا، جسے اللہ تعالیٰ نے بُرا کہا ہے اس سے بچنا تو ہر مسلمان کو چاہئے ہی لیکن اہل کفر و شرک کے طور طریقے کی مخالفت کرنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم میں سے ایک ہوگا۔ آج کے دور میں پالش کی جاتی ہے گفتگو پر۔ لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن و سنت کے مطالعہ کی روشنی میں صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ مطلوب ہے اختلاف۔ "کفر و شرک کی روش اور اہل اسلام کی روش کو کبھی یکساں نہیں ہونا چاہئے"۔ یہیں سے آپ کے تشخص کی بنیاد پڑتی ہے۔ پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ قرآن بیسیوں جگہ کہتا ہے لاتکونوا، لاتکونوا، لاتکونوا۔ فلاں کی طرح مت ہو جانا، فلاں کی طرح مت ہو جانا، فلاں کی طرح مت ہو جانا لاتکونوا کالذین تفرقوا من بعد ما جاءتھم العلم تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جن کے پاس علم آیا پھر بھی وہ فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقہ بندی خصوصیات کفر ہے اور اتحاد و اتفاق خصوصیات ایمان ہے۔ الا الذین فرقوا دینھم جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کر لئے اور جماعت جماعت بن گئے۔ لاتکونوا منھم اے رسولؐ آپ ان میں سے نہ ہوں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اہل کفر و شرک میں اگر کوئی بات کفر کی، شرک کی یا گناہ کی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی تو پیروی کرنا آپ کو ہے ہی نہیں لیکن جائز و مباح بات بھی اگر کفر و شرک کی پہچان بن چکی ہے تو مسلمان کو اس جائز سے بھی الگ رہنا چاہئے۔ یہ بات آپ کو بڑی سخت معلوم ہوگی لیکن ہے صحیح بات۔ اگر کوئی جائز و مباح عمل کی حیثیت کسی فرقہ کا فرد کا شعار اور اس کی پہچان بن گئی ہے تو مومن کو حکم ہے کہ اس سے دور رہے۔ اہل کفر اور اہل ایمان کے درمیان تمیز ہونی چاہئے، واضح خط ہونا چاہئے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دسویں محرم عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ آپ کو معلوم ہوا کہ یہ روزہ یہودی بھی رکھتے ہیں اس لیے کہ اسی دن موسیٰ کو غرق نیل سے نجات ملی فرعون سے نجات ملی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے بھائی موسیٰؑ پر بھی یہود سے زیادہ ہمارا حق ہے لیکن آگے فرمایا کہ دسویں کو روزہ ہم رکھیں گے ہی لیکن اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو میں نو تاریخ کو بھی روزہ رکھوں گا۔ یعنی یہودی صرف دس کو رکھتے ہیں اور میں نو اور دس دونوں کو رکھوں گا۔ جنازے میں تشریف لے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہے، لوگ بیٹھتے نہیں تھے جب تک جنازہ دفن نہ ہو لیکن جب معلوم ہوا کہ یہودی بھی کھڑے رہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بیٹھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ ہر دو ملتوں میں شناخت اور پہچان کی واضح لکیر ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کو کسی بھی سوسائٹی میں، کسی بھی معاشرے میں دوسری تہذیبوں کے ساتھ کسی قیمت پر مدغم یا ضم نہیں ہونا چاہیے۔

داڑھی رکھنے کا مسئلہ بتاؤں (لیکن جہاں کسی مولوی صاحب نے داڑھی پر تقریر کی آپ بگڑ جاتے ہیں مولوی پر کہ ان کو داڑھی کے سوا کچھ کہنا نہیں آتا) ارے میرے عزیزو! واللہ داڑھی کچھ اہم نہیں ہے، کوئی چیز نہیں ہے داڑھی، لیکن ایک تو اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے محبت ہے تو اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت جیسی تھی ہم بھی ویسی ہی صورت بنائیں گے۔ ایک تو مسئلہ محبت کا ہے اور دوسرا فقہ کا۔ لیکن میں فتویٰ نہیں دے رہا ہوں، میں تو یہ بتا رہا ہوں کہ اپنے آقا، اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت آپ کیوں نہ بنائیں؟ دوسری بات، ایک حدیث سناؤں، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل عجم مونچھیں بڑھاتے ہیں داڑھیاں کترواتے ہیں، ہم اہل اسلام داڑھیاں بڑھائیں گے اور مونچھیں کتروائیں گے۔ آپ کی غیروں سے شناخت کیسے ہو؟

آپ داڑھیوں کے مسئلہ پر مولویوں کو برا کہتے کہتے کہیں اس شخص کی طرح مت بن جانا جو اپنے حقیقی بھائی کو گالی دینے کھڑا ہوا ماں کی۔ وہ بیوقوف سمجھ رہا ہے کہ میں تو بھائی کو گالی دے رہا ہوں۔ حقیقت میں وہ بھائی کو نہیں بلکہ اپنے کو گالی دے رہا ہے کیونکہ اپنی ماں کو گالی دے رہا ہے اور دونوں کی ماں تو ایک ہے۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مولوی صاحب کو برا کہتے کہتے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ سلام کیا کریں۔

آقا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اہل کفر مونچھیں بڑھاتے ہیں داڑھیاں کترواتے ہیں تو

تیغ کو حکم کیا گیا کہ مونچھ کتروانا اور داڑھیوں کو بڑھانا، یہ کیا ہے؟ وہ دستور ہے فرق اور امتیاز ہے، ایک امت کی شناخت باقی رہنا چاہیے۔ آج سکھ بھی داڑھی رکھے ہیں رہتے لیکن ایک مسلمان کو دیکھئے کہ داڑھی کا مقدمہ ہائی کورٹ میں آجاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ عام طور پر مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کی عادت نہیں رہا۔ دنیا آپ کی کتابوں سے آپ کی شناخت کو نہیں معلوم کریگی، دنیا آپ کی صورتوں سے آپ کی شناخت کو معلوم کرے گی۔ آپ حوالہ دیں گے بخاری شریف کا، لیکن مدراس ہائی کورٹ کا جج بخاری شریف سے استفادہ نہیں کرتا۔ وہ تو دیکھتا ہے کہ لاکھوں مسلمان ہیں جو اپنے چہروں پر یہ شناخت نہیں رکھتے پھر کیوں انکار ہے آپ کو، آپ کے عمل سے آپ کی شناخت کو دنیا آپ کو پہچانے گی۔

بہرحال دوستو! میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آج بھی جو اس ملک میں ایک فتنہ ابھر رہا ہے یعنی ہمارے بزعم خود کہلانے والے دوست، ہمدرد، بہی خواہ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں الگ الگ مذہبوں اور تہذیبوں کی جو شناخت ہے وہ مٹ جائے اور پھر مٹنے کی صورت یہ کہ مسلمانوں کے جملہ معاشرتی قوانین کو مٹا کر اور قرآن وسنت سے ان کی بنیاد کو مٹا کر پارلیمنٹ اپنی عقل سے جو قانون بنادے اس قانون پر مسلمانوں کو بھی چلنا چاہئے۔ مقصد کیا ہے؟ مقصد اس کے پیچھے صرف ایک ہے کہ مسلمانوں نے جس دن اپنا [illegible] مٹا دیا، اپنی شناخت مٹادی، اپنی معاشرت بدل ڈالی، اپنی تہذیب بدل ڈالی اپنے جینے کا طور طریقہ بدل ڈالا ان کو سکون مل جائے گا۔ السلام علیکم کہتے ہیں، اچھا نہیں لگتا، گڈ مارننگ کہنے میں اچھا لگتا ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن یہ شناخت ہے ہماری۔

مدینہ منورہ جب پہلی بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے جبکہ مدینہ ایک مخلوط آبادی کا شہر تھا جہاں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی تھے اہل عرب کفار بھی تھے اور اس مخلوط معاشرے میں پہلی اسلامی امت بن رہی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا "افشوا السلام" سلام کو پھیلانا۔ فرمایا جو بازار میں بیٹھے بازار کا حق ادا کرے آنے جانے والوں کو سلام کرے، اس کا جواب دے وغیرہ تو سلام ہماری پہچان ٹھہری، کوئی بات پسند آئی ہو کر سبحان اللہ کہنا۔ اب تالیاں بجانے کی بجائے سبحان اللہ کہنا، الحمد للہ کہنا برکت اللہ کہنا، یہ تمام باتیں [illegible] پہچان کراتی تھیں اور ایک اللہ [illegible] کرتی ہیں۔ [illegible]! آج پھر تم [illegible] کے ذریعہ اس ملک

میں اسلامی شریعت کو مٹانے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں مسلمانوں کو پوری بیدار مغزی کے ساتھ
مستعدی کے ساتھ، اتحاد کے ساتھ، پوری یک جہتی اور قوت کے ساتھ [illegible] پر اترنا
پڑے گا۔ ایک مورچہ اپنے اندر کا ہے کہ ہم مسلمان سماج کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کی بنیاد پر
بنائے رکھیں گے اور کسی قیمت پر بھی اس معاشرے کے اندر ڈھانچے کو اللہ تعالیٰ کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام سے ہٹنے نہیں دیں گے۔ دوسری طرف باہری کا خطرہ ہے
کہ ہر معاملہ جو باہر کی شریعت کو مٹانے کے لئے کیا جائے گا ہم قربانی دے کر اس کا مقابلہ کریں گے
امتیں قربانیوں سے فنا نہیں ہوتیں، قربانیوں سے امتوں کا نمو بڑھتا ہے، کسی پودے
کی ڈالیاں اور شاخیں اگر کاٹ دی جاتی ہیں تو پودا فنا نہیں ہوتا، پودے میں اور نمو
پیدا ہوتا ہے، اور شاخیں نکلتی ہیں، اور پتے نکلتے ہیں، اور پھول نکلتے ہیں۔ قربانیوں
سے پودوں میں نئی جان آتی ہے، ہاں جڑ اکھیڑ دی جائے تو خطرہ ہے۔ تو اگر امت کو
اپنی جڑوں کو مضبوط رکھنا ہے تو شاخوں کی قربانیاں تو دینی ہی پڑیں گی، عزم اور ہمت
کے ساتھ اس سرزمین پر جینا ہے اور استحکام کے ساتھ اپنی شریعت پر چلنا ہے اور شریعت
پر وارد ہونے والے ہر خطرے کا مقابلہ کرنا ہے اور اس جذبہ کے ساتھ آپ دنیا میں جینے
کا فیصلہ کریں گے تو ان شاء اللہ آپ کے وجود کو کوئی ختم نہیں کر سکے گا لیکن آپ نے اگر اپنے
اندر کی دینی زندگی کو نکال دیا اور باہر سے آنے والے حملوں کا مقابلہ نہیں کیا تو بخارا
اور تاشقند کی طرح آپ کی نسل امام بخاریؒ، مولانا رومؒ، امام ترمذیؒ، علامہ برہان الدین،
امام شمس الدینؒ کے پوتے اور پڑپوتے فلانوف وفلانوف ہو کر آپ کے سامنے آئیں گے
اسلام اور کلمہ نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں رہے گی۔ پس اپنے کو اپنے دین کے
ساتھ مضبوطی کے ساتھ رشتہ قائم رکھو اور فکرمندی کی زندگی گزارو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور
آپ کو توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

سلسلہ صفحہ (۶۴)

کے لئے مختصر تربیتی کورس۔

۴۔ ورکشاپ، سیمینار اور سمپوزیم کا انعقاد۔

فارم خدمات اگرو بزنس کلینک اور قومی زرعی تحقیقاتی نظام کی عکاسی پیش کرتے
ہیں۔ فصل، میوہ جات، ترکاریاں، پھولوں کے باغات کے لئے معروف کلینک سے
اکیڈمی میں استفادہ کرنے کے خواہشمند افراد کو جیتا جاگتا شاہد کروایا جاتا ہے
زرعی تحقیق و علم میں معروف کلینک کے لئے درکار تمام ضروریات جیسے تجربہ گاہ، کمپیوٹر، [illegible]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

پیامِ انسانیت

خدا کا معاملہ نسل انسانی کے ساتھ اور نسل انسانی کا معاملہ انسانی نسل کے ساتھ بالکل یکساں ہے۔ خدا انسانی نسل سے مایوس نہیں، اس کی مہربانیاں، اس کی نعمتیں اس کائنات پر مسلسل برس رہی ہیں۔ کائنات کی ہر چیز نسل انسانی سے پرامید ہے۔

لیکن ہمارا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ بتاتا ہے کہ ہم انسان سے مایوس ہیں۔ کسی مفکر نے کہا ہے کہ جو بچہ اس دنیا میں آتا ہے وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ خدا نسل انسانی سے مایوس نہیں۔ اگر مایوس ہوتا تو اس نسل میں اضافہ نہ ہوتا، اسے اپنی قسمت اور اپنی صلاحیت دکھانے اس دنیا میں نہ بھیجتا۔ لیکن انسان انسان کا گلا کاٹتا ہے، انسان انسان سے نفرت کرتا ہے، انسان انسان کا استحصال کرتا ہے، جونک کی طرح خون پیتا ہے، اسے گاہک سمجھ کر فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے رویہ سے اس کا اعلان کرتا ہے کہ انسانیت کی صلاحیت، جوہر اور مستقبل سے وہ مایوس ہے۔ خدا اور انسان کے یہ مظاہرے برابر جاری ہیں۔ بارش کا ایک ایک قطرہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ دنیا کا پیدا کرنے والا اپنی پیاسی مخلوق سے، اپنی ظالم مخلوق سے بھی مایوس نہیں ہے۔ زمین روئیدگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی پیداوار اس بات کا اعلان ہے کہ خدا اس زمین کے بسنے والوں سے مایوس نہیں۔ سورج چمکتا ہے وہاں کوئی اسٹرائک نہیں، چاند برابر نکلتا ہے اور اپنی چاندنی کی چادر پھیلاتا ہے، آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ یہ سب اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے ابھی مایوس نہیں ہوا لیکن ہمارا اپنا رویہ اس کا مکمل ثبوت پیش کرتا ہے کہ ہم انسان سے مایوس ہیں، ہم اپنے کردار و عمل سے اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم اس انسان کو جو خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے کوئی وقعت نہیں دیتے

سب سے حسین دلآویز تخلیق انسان کی ہے | خدا کی قدرت اور حسن تخلیق کے مظاہرے ہر چیز میں ہیں۔ پھول، کلی، قطرہ، گھاس کا تنکا، مٹی کا ذرہ، درخت کے پتے جس چیز کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک دنیا ہے۔ ان سب سے حسین و دلآویز تخلیق انسان کی ہے، ساری چیزیں پوری کائنات اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ یہ سب اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ انسان خدا کا محبوب مقبول ہے، اشرف المخلوقات ہے، دنیا کی بارات کا دولہا ہے۔ لیکن ہمارا اور آپ کا طرز عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان میں کوئی خوبی نہیں ہے، ہم اپنے طرز عمل سے خدا کی عدالت میں اپنے خلاف مقدمہ دائر کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا سے اٹھا لیا جائے گویا ہم فرشتوں کی اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جس کی تردید خدا نے کی تھی جب تخلیق انسان کے وقت اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا تھا: إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔ تو فرشتوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا: أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (کیا آپ ایسے کو خلیفہ بنا رہے ہیں جو زمین پر بگاڑ پیدا کرے گا اور خون بہائے گا) جب خدا نے علم اشیاء کے بارے میں آدم علیہ السلام سے سوال کیا تو اس نے ٹھیک جواب دیا، فرشتے جواب میں ناکام رہے، خدا نے انسان کو جتایا تھا ہم اس کو ہرا رہے ہیں۔

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں: خدا نے فرمایا تھا کہ تم کو معلوم نہیں کہ اس میں کیسے کیسے گن ہیں، اس سے علم کا دریا ابلتا ہے، سمندروں میں وہ وسعت و گہرائی نہ ہوگی جو اس میں ہے، اس کی آنکھوں کی محبت کی چمک ہے وہ پیش کرنے سے تم قاصر ہو۔ اس کے دل میں نرمی ہے، محبت ہے، گداز ہے، اس درد کی چوٹ لگتی ہے جس سے تم محروم ہو۔ علامہ اقبالؒ نے بڑی جرأت سے کہا تھا ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی　　تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو　　ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

کسی پر خنجر چلے، کسی کے دل میں کانٹا چبھے تو اس کی کسک اسے اپنے دل میں محسوس ہوتی ہے۔ اس کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے وہ رحم کا سرمایہ ہے، وہ محبت کا سرمایہ ہے، وہ ایک آنسو جو انسان کی آنکھوں سے کسی بیوہ کے سر کو ننگا، کسی غریب کے چولہے کو ٹھنڈا دیکھ کر، کسی مریض کو کراہتا سن کر ٹپک پڑتا ہے۔ آنسو کا وہ قطرہ جو سمندر میں ڈالا جائے تو اسے پاک کر دے گا، جو جنگل میں ڈال دیا جائے تو سب کو جلا کر زمرد سے بدل دے، فرشتے سب کچھ پیش کر سکتے ہیں مگر

تو کیا عقل و نیا پیش کر سکتے جس کی قیمت آپ نے بھی نہیں پہچانی جو ایک انسان دوسرے انسان کے لئے بہاتا ہے ۔ ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

فرشتے اور انسان کی بیداری میں فرق

فرشتے اپنے مالک کو دیکھ دیکھ کر اور اس کی ذات و صفات کو پہچان کر بیدار نہیں ہو سکتے ، لیکن وہ انسان جس انسان کی مصیبت و درد کی وجہ سے بیدار ہو سکتا ۔ اس کے جاگنے کو فرشتوں کی بیداری نہیں پہنچ سکتی ۔ انسان کے پاس سب سے انمول چیز یہ ہے کہ وہ دوسرے کے درد سے متاثر ہوتا ہے اس کے اندر محبت کا مادہ ہے اس کو حرکت دینے والی کوئی چیز مل جائے تو وہ حرکت میں آجاتا ہے ، پھر نہ مذہب دیکھتا ہے ، نہ ذات پات کو ، انسان انسان کا دل رکھتا ہے اس کے درد کو محسوس کرتا ہے جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اور وہ کھینچنے پر مجبور ہے اسی طرح انسان کے دل کا مقناطیس انسان کے دل کو کھینچتا ہے ۔

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اگر انسان سے یہ دولت چھن جائے تو دیوالیہ ہو جائے گا ، اگر کوئی ملک اس سے محروم ہو جائے ، اگر امریکہ کی دولت ، روس کا نظام ، عرب ممالک کے پٹرول کے چشمے ہوں ، مینہ برستا ہو ، سونے اور چاندی کی گنگا اور جمنا بہتی ہو لیکن اس ملک میں محبت کا چشمہ خشک ہو جائے تو وہ کنگال ہے ۔ اس ملک پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل نہ ہوں گی ۔ ابھی انسان کا دل تڑپنے اور سلگنے اور چوٹ کھانے کے قابل ہے ، جو دل اس قابل نہیں ایسے دل کو دل نہیں کہتے بلکہ پتھر کی سل کہتے ہیں ۔ جو خدا کی بارگاہ میں کوڑیوں کے قابل نہیں چاہے وہ مسلمان کا دل ہو یا ہندو سکھ عیسائی کا دل ہو ، دل تو اس لئے ہے کہ تڑپے ، لرزے ، روئے اس میں زمین سے زیادہ شادابی ، آبشار سے زیادہ سیرابی ، کائنات سے زیادہ وسعت اور بادلوں سے زیادہ برسنے کی صلاحیت ہے

وہ دل انسان کا دل نہیں جس پر کبھی درد کی چوٹ نہ لگے

وہ آنکھ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے جس میں نمی نہ ہو ، وہ دل انسان کا دل نہیں چیتے کا دل ہے جس پر کبھی درد کی چوٹ نہ لگے ، جو انسانیت کے غم میں رونا تڑپنا نہ جانے ، وہ پیشانی جس پر کبھی ندامت کا پسینہ نہ آئے ، وہ پیشانی نہیں بلکہ کوئی چٹان ہے ، جو ہاتھ انسانیت کی خدمت کے لئے نہیں بڑھتا وہ مفلوج ہے وہ ہاتھ جو انسان کی گردن کاٹنے کے لئے بڑھتا ہے اس سے شیر کا ہاتھ بہتر تھا ، اگر انسان کا ہونا تھا تو اس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی بجائے ایک پتھر رکھ دیا جاتا ، اگر انسان

کا کام صرف تخریب کے منصوبے بنانا تھا تو اس کے اندر انسان کا دماغ نہ رکھا جاتا بلکہ شیطان کسی راکشس کا دماغ رکھ دیا گیا ہوتا۔

یہ دل کی زندگی تھی کہ جنگ بدر کے موقع پر جو لوگ قیدی بنائے گئے ان کی مشکیں کسی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قیدیوں کی تکلیف کے احساس سے رات بھر نہ سو سکے۔ اگر کوئی بچہ رو تو آپ نماز مختصر کر دیتے کہ کہیں اس کی ماں بے چین نہ ہو۔ جو دل کسی کا دل دکھائے کسی کو تکلیف پہنچائے تو وہ دل کس شمار کے قابل ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند! خدا کا سارا معاملہ اس کی مخلوق کے ساتھ بتاتا ہے کہ خدا انسان کس سے مایوس نہیں۔ آپ کا واٹر ورکس پانی روک سکتا ہے، آپ کا پاور ہاؤس بجلی روک سکتا ہے تو کیا خدا اپنی نعمتیں نہیں روک سکتا؟ — خدا اس دنیا کو پانی بھی دے رہا ہے اور روٹی بھی دے رہا ہے اور سب کو حکم ہے کہ وہ انسان کی خدمت کریں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

پورا کارخانہ انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ لیکن ہم اپنے اخلاق سے کیا ثابت کر رہے ہیں کیا ہم ثابت کر رہے ہیں کہ ہم انسان کو کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں، کوئی اونچی چیز سمجھتے ہیں؟ اپنے برابر سمجھتے ہیں؟ اپنے جسم کا ٹکڑا سمجھتے ہیں؟ یہ طرز عمل انسانی آبادی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ باہر سے کوئی خطرہ نہیں، وہ زمانہ بیت گیا جب قومیں دوسری قوموں پر چڑھائی کرتی تھیں خطرہ اندرونی ہے، وہ ہے انسان دشمنی اور انسانیت کی پامالی کا خطرہ، انسانیت کی خیر خواہی سے آنکھیں بند کر لینا، اس خطرہ سے ملک کو بھی اور قوم کو بھی بچانے کی ضرورت ہے۔

بارات ہے نوشہ نہیں: ایک کہانی یاد آ گئی۔ ایک بارات بڑی دھوم دھام سے جا رہی تھی بینڈ باجہ بھی تھا روشنی اور مشعل بھی، بارات دیکھنے والوں کی بھیڑ تھی۔ ایک شخص بہت غور سے بارات دیکھ رہا تھا کچھ دیر کے بعد اس نے کہا کہ نوشہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کیا فضول بکتے ہو، بارات نہیں دیکھ رہے ہو تماشہ نہیں دیکھتے ہو، فضول سوالات کرتے ہو، مگر وہ [illegible] حقیقت پسند تھا۔ اس نے کہا بارات تو بہت عمدہ ہے لیکن نوشہ نظر نہیں آتا اس پر سب کو خیال ہوا کہ دیکھنا چاہیے نوشہ واقعی نظر نہیں آ رہا ہے۔ اب جو تحقیقات شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب گھوڑے پر تھے گھوڑے نے راستے کے کسی گڑھے میں انہیں گرا دیا ہے اور بارات اپنے شور و ہنگامہ میں بے نوشہ آگے بڑھتی رہی۔ یہ بارات کی دھوم دھام اور شور و ہنگامہ تھا نوشہ کا کسی کو ہوش بھی نہیں رہا۔

انسانیت کی بارات کے نوشہ کہلانے والے حقیقی انسان کتنے ہیں! مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مشرق

ہے مغرب تک انسانیت کی بربادیاں جدید تہذیب و تمدن کے ساتھ نکل رہا ہے جس کے مناظر ہم نے اس ملک میں بھی دیکھے ہیں اور یورپ و امریکہ میں بھی۔ کہیں بے نوشہ کی بارات نہ ہو۔ انسانیت کی اس بارات کا نوشہ انسان ہے، انسانیت کے اس نوشہ کی بارات پر آنسو بہانے والا اس کی فکر کرنے والا کوئی نہیں۔ ایسے شہر میں کتنے آدمی ہیں جو انسانیت کی بارات کے نوشہ کہلانے والے حقیقی انسان ہوں؟ ایسا انسان کہاں ہے جس کی نظر خالص انسانیت پر ہو، جسے کھو کر پانے کا مزہ آئے جسے ہار کر جیتنے کا مزہ آئے؟

سب اپنی جیب، اپنا گھر بھرنے کی فکر میں ہیں اور اپنی پارٹی کو نفع پہنچانے میں کوشاں ہیں۔ اور بہت ترقی کی تو قوم کو فائدہ پہنچانے کی سوچنے لگے۔ نیشن بھی ایک کنبہ ہے۔ کنبہ چھوٹا بڑا ہوتا ہے نیشنلزم بھی ایک قسم کی کنبہ پروری ہے۔ نیشنلزم (قوم پرستی) کو شاید میں کسی وقت ضروری سمجھوں۔

میرا تعلق اس جماعت اور اس گروہ سے ہے جس نے آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور ملک و قوم کی آزادی کے لئے اس وقت جد و جہد شروع کی جب آزادی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن سمجھتا ہوں کہ نیشنلزم بھی ایک تنگ خیالی ہے۔ انسانیت اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

اس شاخ کی فکر کیجئے جس پر آشیانہ ہے

تمام قومیں انسانیت کی شاخیں ہیں، اصل پیڑ انسانیت ہے۔ اس انسانیت کو تباہی اور ہلاکت سے بچانے کے لئے آج کتنے افراد اور کتنی پارٹیاں آدمیت کے نام سے سرگرم اور انسانیت کو بچانے کے کام میں معروف ہیں؟ تہذیب و تمدن، سیاست و حکومت، ادب و فلسفہ اور علم و فن کے آشیانے انسانیت کی شاخ پر قائم ہیں۔ اگر انسانیت کی شاخ باقی ہے تو آپ جیسا چاہیں ویسا نشیمن بنالیں۔ لیکن شاخ ہی نہ رہی تو نشیمن کا ٹھکانا کہاں ہے؟ آج انسانیت کی شاخ پر کتنے تیشے چلائے جارہے ہیں، آگ لگائی جارہی ہے، ہر شخص اس کوشش میں معروف ہے کہ آدمیت کی شاخ پر بڑے سے بڑا تیشہ چلائے۔

آج ہمارے ملک میں نفسا نفسی کا قیامت خیز منظر ہے

آج ہمارے ملک میں انسان کو انسان سے محبت اور ہمدردی نہیں رہی، پہلو میں دل نہیں جو انسانیت کے سوز میں جلتے ہوں، اس کا درد محسوس کرتے ہوں۔ نفسا نفسی کا قیامت خیز منظر ہے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کی نفسا نفسی کا جو نقشہ کھینچا ہے یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ۔ یہی منظر آج پوری سوسائٹی میں نظر آرہا ہے۔

انسان کی حقیقت سے ناآشنا

ہمارے ملک میں جب [illegible] کے حادثات

جوتے ہیں تو ہمارے سماج کی اخلاقی پستی عیاں ہو جاتی ہے۔ لوگ حادثہ کا شکار ہونے والے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے بجائے ان کی کلائی کی گھڑیاں اور جیبوں سے پرس نکالتے ہیں۔ یہ خطرہ و سگنل ہے، وہ الارم ہے جس پر پوری سوسائٹی کو چونکنا چاہئے۔

فرقہ وارانہ فسادات، ہندو مسلم مسئلہ نہیں بلکہ انسانیت کی بے حرمتی کی علامت ہیں۔ اصل غرض انسانیت کی بے وقعتی ہے۔ ہم نے بعض اوقات درخت اور جانور کو انسان سے زیادہ وقعت دی ہے۔ ہم نے اکثر اوقات انسان کے مقابلہ میں پیسے کو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ پیسہ انسانی ہاتھ کا میل ہے۔ ہم نے پیسہ کو انسان کے دل، اس کی روح، اس کی آتما سے زیادہ اہمیت دی ہے، حالانکہ انسان کا درجہ خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں افضل اور اشرف رکھا ہے۔ اس کے بلند مقام کی اس سے بڑھ کر اور دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی بھوک پیاس بیماری کو اپنا مسئلہ بتلایا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، کسی پیاسے کو پانی پلانا اور کسی بیمار کی تیمار داری کرنا گویا میرے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے انسان کے مقابلہ میں دنیا کے تمام براعظم رکھ دیجئے تو انسان کا پلڑا بھاری ہوگا۔ تمام براعظم انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ انسان ان کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔

جس انسان کو راتوں کو جاگ کر خون جگر پلا پلا کر پالا گیا ہے جس سے اس کے ماں باپ نے سارے خاندان نے امیدیں قائم کی تھیں جو خدا کی امانت لے کر دنیا میں آیا ہے، جو دنیا کی اصل روح ہے اس کو مارا جاتا ہے، یہ قاتل وہ لوگ ہیں جن کے سامنے انسان کی حقیقت، انسان کی تاریخ، ماں باپ کا پیار نہیں ہے۔ اس انسان کو بنانے کے لئے۔ تعلیم گاہوں دانشوروں استادوں اور مربیوں نے جو محنت کی ہے، جتن کئے ہیں وہ ان کے سامنے نہیں۔ اگر یہ حقائق سامنے ہوتے تو دنیا میں کوئی نہ ملتا جو اس کو مارنے کے لئے خم ٹھونکتا۔ سکندر و دارا، چنگیز و ہلاکو ہٹلر و مسولینی جنھوں نے انسانیت کی کھیتی کو آگ لگائی۔ یہ سب انسان کی حقیقت سے ناآشنا تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انسان کے خلاف بگاڑ پیدا کرنے والوں پر خدا کو کتنا غصہ ہے۔

نحیف آواز نے انقلاب برپا کر دیا

اگر آپ کے دل میں انسانیت کے احترام کا جذبہ انسانیت کی محبت کا سرچشمہ ہے تو اسے حرکت میں آنا چاہئے۔ وہ لوگ جو اس ملک میں ہم سے زیادہ اثر رکھتے ہیں انہیں اپنی کرسیوں کو چھوڑ کر چاہے وہ وزارت عظمیٰ کی کرسی ہو، یونیورسٹیاں اور عافیت کدوں کو چھوڑ کر اس ملک کو بچانے کے لئے میدان میں آنا چاہئے۔ یہ ملک نہ بچا تو نہ یونیورسٹیاں، حکومت

رہے گی، ان کی بقا کہاں رہے گی اور ان کو پناہ کہاں ملے گی؟

ملک نہ رہے، انسانیت دم توڑ دے تو اقوام متحدہ U.N.O. میں کیا جا کر فریاد کریں گے؟ ہونا شروع ہے، قوم میں قومیت کا احساس اور سیاسی شعور ہونا شروع ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں بڑی بڑی کرسیوں سے اور اونچے اونچے عہدوں سے اتر کر لوگ آتے اور انسانیت کو بچاتے۔ لیکن جب ہم نے دیکھا کہ کوئی نہیں آ رہا ہے تو ہم نے سوچا کہ ہم ہی چل پڑیں۔ تاریخ، قوموں کی تاریخ اور سماجی اور مذہبی اصلاحات کی تاریخ میں بعض مرتبہ کوئی ایک بلند ہوتی اور اس کے بعد وہ سب کے دل کی آواز بن گئی اور اس نے سماج میں انقلاب برپا کیا، اسی امید پر ہم آئے ہیں کہ ہم جگائیں، جاگنے کے بعد سب کچھ ہو سکتا ہے اور جگانے کے ضعیف آواز بلکہ پتوں کے گرنے کی آواز بھی کافی ہوتی ہے۔

وقت کا سب سے بڑا کام انسانیت کا احترام

اس وقت کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہب کے دائرے انسانیت کا احترام پیدا کرنے والے اور انسانیت کو زندہ کرنے کی کوشش کریں، انسان انسان کی ملے، اس کے بعد پھر مطالعہ غور و فکر اور توفیق الٰہی سے اپنے لئے پسندیدہ طریقۂ زندگی منتخب کرے باہمی اعتماد و محبت کی فضا پیدا کیجئے انسان کو گلے لگائیے تب آگے بات ہوگی۔

انسان ہے کیا؟ اس کے اندر کیا صفات ہیں؟ انسان کا انسان پر کیا حق ہے؟ انسان کی قیمت کیا ہے؟ انسان کو کس نے پیدا کیا؟ کس لئے پیدا کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ پر انسانی سماج کے ایک ایک فرد کو غور کرنا چاہئے۔ اس ملک میں اتحاد و محبت اور باہمی اعتماد کا ماحول پیدا کرنا چاہئے۔ اس طرح ظلم کے واقعات نہیں ہونے چاہئیں۔ میں ایک انسان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہمارے اور ظلم کے نتیجہ میں آسمانی آفتیں آتی ہیں۔ خدا یہ دکھاتا کرانے کا سامان ہمارے پاس کسی قسم سے زیادہ ہے ہم نے آندھرا کے طوفان و سیلاب میں اس کا دیکھا ہے۔ یہ واقعہ سبق دینے کے لئے ہوا ہے۔ جب بھی اس طرح کا کوئی واقعہ ہوتا ہے ڈر جاتا ہوں کہ قدرت کا تازیانہ انسانوں کی طرف نہ بڑھے۔ میں اس سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا۔ جہاں بھی ظلم کے واقعات ہوں گے خدا اپنی قدرت دکھائے گا۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں ○○○

[illegible] ۲۹

ہے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو شیطان کے فتنوں سے محفوظ رکھے [illegible] آمین ○○○

محمد مجتبیٰ صدیقی

بین مذہبی ازدواج

ایک مشترک سیول کوڈ کے اجراء کے ملک میں آزادی کے بعد سے اکثر آواز اٹھائی جاری ہے ظاہر ہے کہ ایسا کوڈ قوانین شریعت کا پابند نہیں ہوگا۔ اس طرح کا ایک قانون یعنی اسپشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء میں بن چکا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس قانون کے تحت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا ہے تو نکاح کے تمام ارکان و شرائط جو شریعت نے عائد کر رکھے ہیں نظر انداز ہو جاتے ہیں اور مہر، طلاق، وراثت، اولاد وغیرہ کے مسائل پر قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔ تبنیت جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، کے متعلق بھی ایک ایسے قانون کا اجراء زیر غور ہے۔ گو اسپشل میرج ایکٹ کا نفاذ لازمی طور پر مسلمانوں پر نہیں ہوتا اور متبنا لیا تبنیت کے مجوزہ قانون میں کوئی ایسی قرارداد ہوگی لیکن حق اختیار حاصل ہونے سے مسلمانوں کے لیے ان احکام شریعت سے جن پر موجود سو سال سے عمل ہو رہا ہے، انحراف کا راستہ کھل جائے گا۔

اسپشل میرج ایکٹ کو مسلمانوں نے ابھی اتنا نہیں اپنایا ہے کہ اس کے پس پشت جو خطرہ ہے وہ کھل کر سامنے آجائے لیکن کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ ایک وبا کی صورت اختیار کرلے۔ مسلمانوں کے ایسے خاندان جو خاندان کے باہر کم رشتہ مناکحت استوار کرنا معیوب سمجھتے تھے (گو یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں تھی) اب اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ عواقب کا لحاظ کئے بغیر ان کے نونہال ایکٹ میں دی ہوئی رخصت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خاندان کے افراد ان کو روک تھام تو درکنار، خود ان کی اس خوشی میں شریک ہو رہے ہیں اور مذہبی غیرت و حمیت یا خاندانی عصبیت کوئی بھی ان کا راستہ نہیں روکتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ شریعت کی رو سے مسلمان مرد کا غیر مسلمان عورت

آئی - اے - ایس (ریٹائرڈ) - حسن نگر

ہے اور مسلمان ہو ۔ یہ نکاح صرف مسلمان مرد سے جائز ہے ۔ کتاب اللہ میں مشرک سے نکاح کی ممانعت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے :

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۔ ایک مومن لونڈی مشرک کرنے والی سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو ۔ اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۔ ایک مومن غلام شرک کرنے والے سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو ۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے .....) (۲-۲۲۱)

اس آیت میں مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں کے لئے مشرک سے نکاح کی صریحاً ممانعت ہے بلکہ میرے خیال میں یہ اشارہ کہ "یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں" ایک طرح سے وعید بھی ہے ۔ اس ممانعت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے ۔ ازدواجی رشتہ ایک ایسا گہرا قلبی تعلق ہے جو اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب اس کے ساتھ روحانی تعلق بھی شامل ہو ۔ اگر دونوں فریقوں یا ان میں سے کسی ایک کو مذہب سے کچھ بھی لگاؤ ہے تو ایسے اہم مسئلہ میں اختلاف ہونا دونوں کی زندگیوں کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں ہو سکتا ہے جتنا کہ پیدائش، نسل، زبان یا دنیاوی حیثیت کا فرق ۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ دونوں فریقوں کا اعتقادی نظریہ ایک ہونا چاہیئے ۔ اگر دو شخص ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، تو دنیا کے اہم ترین مسائل میں ان کے خیالات میں ایک حد تک ہم آہنگی ضروری ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات دونوں میں آئندہ چل کر دشواریاں پیش آئیں گی ۔

مسلمان مرد کو عورت کے مقابلے میں ایک رخصت بھی دی گئی ہے ۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :

"آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں ۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے اور تمہارا کھانا ان کے لئے اور محصنات (پاکدامن) بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ میں ہوں یا ان قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ..." (۵-۵)

یہ سوال طلب ہے کہ کن قوموں کا شمار اہل کتاب میں ہے ۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر بحیثیت اہل کتاب قرآن کریم میں ہے اور عام طور سے یہی لوگ اہل کتاب مانے جاتے ہیں ۔ لیکن کتاب اللہ میں کئی مقامات پر یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے رسول بھیجے ہیں :

"ہر امت کے لئے ایک رسول ہے ....." (۱۰-۴۷)

"ہر امت میں ہم نے ایک رسول بھیج دیا ہے ....." (۱۶-۳۶)

بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ اسی کی متقضی ہوئی کہ اس کا پیغام قبلے قائم صرف جزیرۃ العرب ہی کے لئے مخصوص ہو کر نہ رہ جائیں، بلکہ دنیا کی اور قومیں بھی اس سے فیض یاب ہوں۔ البتہ ان رسولوں کو کتابیں بھی دی گئی تھیں یا نہیں اس کا حوالہ نہیں ملتا لیکن اغلب ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا دستور جزیرۃ العرب کے لئے تھا، ویسا ہی کرۂ ارض کے دوسرے خطوں کے لئے رہا ہو۔ اور کتابیں بھی دی گئی ہوں، مگر وہ غالباً ضائع ہو گئیں۔ انجیل مقدس ہی کو لیجئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے نورا ہی بعد وہ ضائع ہو گئی اور اس کی جگہ ان کے حواریوں کی تصنیف کردہ کتابوں نے لے لی جن کو انجیل کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کا خیال ہے کہ یہ ملک بھی اس برکت سے محروم نہیں رہا ہے۔ علامہ اقبال نے رگ وید کی ایک مشہور دعا "گائتری" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ تو بہتوں نے "بانگ درا" میں پڑھا ہوگا۔ مگر علامہ نے اس پر جو شذرہ لکھا ہے اس کے ساتھ اگر نظم پڑھی جائے تو اس کا مطلب دوبالا ہو جاتا ہے۔ شذرہ چونکہ بانگ درا کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتا اس لئے ہم اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتے ہیں :

"ذیل کے اشعار 'رگ وید' کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو 'گائتری' کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظم عالم کے حیرت ناک مظاہرہ کے مشاہدہ سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا .... یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے ..... حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے الستہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے ..... اصل سنسکرت میں لفظ 'سوتر' استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ 'آفتاب' رکھا ہے لیکن اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے : "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ : "اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا....."

شذرہ کا اتنا ٹکڑا لکھنے کے بعد طوالت کے خوف کو نظر انداز کر کے نظم بھی ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں

آفتاب

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو ۔۔۔ شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا — ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے — ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے — دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے — چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو — یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں — تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا تری، نہ کوئی انتہا تری — آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

آپ دیکھیں گے کہ نظم کے ہر شعر سے وحدانیت پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں کوئی شائبہ شرک کا نہیں ہے۔

شذرہ کے آخر میں علامہ تحریر فرماتے ہیں "پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔" بے شک نظم کے پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ علامہ کا خیال صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہندو مذہب کے اعمال اس سے بہت مختلف ہو گئے ہیں۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو رخصت مرد کو کتابیہ سے نکاح کرنے کی دی گئی ہے، وہ عورت کے لئے ممنوع کیوں ہے۔ میرے خیال میں اس میں ایک حکمت مضمر ہے۔ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کی زمانۂ حال میں بڑی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور خالص نظری اعتبار سے برابری کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور میدانِ عمل میں مرد کا تفوق بدستور قائم ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"...... عورت کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے....." (۲:۲۲۸)

کوئی بھی ادارہ ہو، اس کو کامیابی سے چلانے کے لئے کسی ایک شخص کی سربراہی ضروری تسلیم کی گئی ہے۔ اگر ہر شخص کو برابر کا درجہ دے دیا جائے تو جھگڑے پیدا ہوں گے، اتفاق باقی نہ رہے گا اور نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی طرح انسانی معیشت کو کامیابی سے چلانے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اکائی جو قائم کی گئی ہے، وہ خاندان ہے، اور اس کا بھی ایک سربراہ ہونا چاہئے۔ مرد ہی سربراہ ہے ظاہر ہے خاندان میں جس کو تفوق حاصل ہوگا اس کے مذہب کو بالادستی بھی حاصل ہوگی [illegible] [illegible]

کا اس لئے کہ شرعاً شوہر مقدم ہے اور جیسے مسلمان شوہر کے لئے کتابیہ بیوی پر ... ضروری ہے۔ ملکی قانون اب یہ ہے کہ اولاد کا بھی مذہب وہی ہوگا جو شوہر کا ہے۔ اسلامی شریعت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ جس ماحول میں کفر و شرک کا دور دورہ ہو اس میں ایک مسلمان عورت نکاح کر کے مجبوری کی زندگی بسر کرے اور اس کی اولاد دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی مسلمان ان واضح احکام کے ہوتے ہوئے ان کی خلاف ورزی کرے تو کیا صورت ہوگی؟ شیعہ فقہ میں تو ایسے نکاح باطل مانے جاتے ہیں۔ یعنی سرے سے ان کا انعقاد ہی نہیں ہوتا۔ اور یہی حکم مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ میں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مرد اور عورت دونوں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حنفی فقہ میں ایسے نکاح باطل نہیں بلکہ فاسد سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور اس نکاح فاسد سے اگر اولاد ہوگی تو اس کا نسب باپ سے ثابت مانا جاتا ہے لیکن صاحبین (امام یوسف و امام محمد) کو اس سے اختلاف ہے اور وہ دوسری فقہوں کی طرح ایسے نکاح کو باطل کہتے ہیں۔ غالباً امام ابو حنیفہؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شریعت کی سخت ممانعت کے باوجود بھی اگر ایسے نکاح وقوع پذیر ہو گئے ہیں تو ان کو باطل قرار دینے میں یہی ہے کہ سماج میں ایک انتشار پیدا ہوگا، بلکہ والدین کے گناہ کی سزا ان کی بے گناہ اولاد کو بھگتنا پڑے گی۔

لیکن اس رعایت کے باوجود فقہ حنفی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ فاسد نکاح قائم رہے۔ بلکہ قاضی کے لئے تاکید ہے کہ فریقین کو اپنے سامنے طلب کرے اور جس فرد سے نکاح ناجائز ہوا اس کو اسلام لانے کی ترغیب دے۔ اگر وہ قبول نہ کرے تو فریقین میں علاحدگی کرا دے۔

یہاں تک تو اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی۔ اب اس کے سماجی پہلو کو دیکھئے، ابھی کل کی بات ہے کہ مسلمان اس شخص سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے میں احتراز کرتا تھا جس سے نکاح شرعاً ممنوع ہو۔ ایک مثال محمد علی جناح کی لے لیجئے۔ ان کو بھی مذہب کی پاسداری اس درجہ منظور تھی کہ انھوں نے ایک پارسی خاتون سے نکاح کیا ان کے اسلام لانے کے بعد۔ گو اس وقت اسپیشل میرج ایکٹ نافذ نہیں ہوا تھا مگر ایک اور قانون موجود تھا جس کے تحت ایسے نکاح ہو سکتے تھے، مگر جناح نے مذہب ترک کرنا منظور نہیں کیا۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں یا تو مذہب سے برگشتہ ہو جاتے ہیں یا مذہب برائے نام قائم رہ کر اس کے احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے ہمارے متوسط طبقہ پر اکثریت کے مقابلے میں ایک ذہنی مرعوبیت [illegible]

[illegible] تعلیمات [illegible] سے [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] ہے جس کا [illegible]

[illegible] [illegible] کے لئے [illegible]

مذہب پہ قائم رہنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ دو مختلف ہو تو ان میں اپنی مشترک ترجیحات

[illegible] سے اثر [illegible] ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے ایسے نکاح اول اول [illegible]

[illegible] یہ ہوگا کہ کچھ عرصہ کے لئے محض تسکین حاصل کرنے کا ایک شغل تو سمجھا جاتا ہے [illegible]

نئی دنیا میں پہنچ کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے تو تلخ نتائج

شروع ہوتے ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنے ایک مضمون میں جو انہوں نے اس موضوع پر [illegible]

"قومی آواز" میں کچھ دن ہوئے لکھا تھا، اس مسئلہ کا جائزہ صرف سماجی نقطہ نظر سے لیا ہے۔ انہوں نے

واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے نکاح عام طور سے کامیاب نہیں ہوتے۔ تعجب کی بات ہے کہ

[illegible] کی شریعت سختی سے مخالفت کرتی ہے اور جس کا عملی تجربہ سماجی نقطہ نظر سے بھی ناکام ثابت

ہو چکا ہو ہم اس کو اپناتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو ہم قرآن کریم کو خدا کا کلام مانتے ہیں لیکن دوسری

طرف ہم اس کے احکام سے صرف [illegible] خلاف ورزی کرنے [illegible]

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شریعت سے ہماری [illegible] کے سبب [illegible]

واقفیت ہے جس کا سبب [illegible] ماں کی گود ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ لڑکیاں

[illegible] کے احکام سے روشناس کرائی جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دینی تعلیم ضروری ہے

کہ اردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ ہمارا سارا مذہبی لٹریچر اسی میں ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مذہبی تعلیم جس طرح ہم لڑکیوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ویسے ہی لڑکوں

کے لئے بھی ضروری ہے۔ مذہبی لٹریچر کو ہندی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ امر ضرور قابل ستائش

مگر اس میں اتنا وقت لگ جائے گا کہ [illegible] نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہو چکی ہوگی [illegible]

ہر مسلمان کو اتنا جاننا پڑے گا کہ کتاب اللہ کو اس کی اصل زبان میں پڑھ سکے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

واقعہ ہے کہ ہندو شاستروں کے حصانت نقل کرتے کے تھے انھوں نے سنسکرت پڑھی اور حاصل کیا اور اس کے بعد شاستروں کی مروجہ تفاسیر کے علاوہ ان کے اندر کی روشنی پیدا حاصل بحث کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلباء کو دینیات کی اعلیٰ تعلیم ہے۔ (آج ڈی ایک ڈگری یا تک دی جاتی ہے بیک اس کے بدلے کا شمار دین کے فضلا میں کیا جانا چاہئے، مگر تعجب ہے کہ ان اونچے درجوں کے طلباء کے لئے عربی جاننا بھی نہیں ہے۔ نہیں نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی عربی جاننے کی قید نہیں ہے۔ دین کی ادھوری تعلیم سے دینی ذوق تو خیر کیا پیدا ہوگا البتہ اس سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کہیں دین کے خلاف طلبہ میں استہزا کے جذبات نہ پیدا ہو جائیں

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے علماء اور دوسرے دیندار حضرات کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائگی کی طرف خاص توجہ کرنا چاہئے۔ سختی سے نہیں نرمی سے، سمجھا کر چور کو چور کہئے تو گو آپ ایک حقیقت بیان کرتے ہیں مگر چور اپنی اس تعریف سے کبھی خوش نہ ہوگا اور نہ چوری سے توبہ کرے گا۔

معاشرے کی بہت سی برائیاں محض اس لئے فروغ پاتی ہیں کہ ان سے کوئی منع کرنے والا نہیں ہوتا، اگر کوئی منع بھی کرتا ہے تو وہ دوزخ کے عذاب کی دھمکی دے کر۔ دوزخ کا عذاب حق ہے، مگر ایسے ناصح کو "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ" کا ارشاد ربانی نہیں بھولنا چاہئے۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ایسے ملکی قوانین کے خلاف جن کی زد براہ راست یا ضمنی طور پر قوانین شریعت پر پڑتی ہو، ہم کو مسلم معاشرے کو باخبر کرنا چاہئے۔ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کو لیجئے ہمارے لئے کوئی امر اس آواز کے اٹھانے سے مانع نہیں ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی آزادی سے محروم کر دئیے جائیں۔ اس کے لئے اگر دستور میں ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرائی جائے۔ (روداد انجمن [illegible])

سلسلہ ۵

جلسہ کی صدارت شری ادون سولے نے کی۔ انھوں نے شکار کا اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے جینوں کی اس حکمت عمل کی تعریف کی اور جانوروں سے ان کی قربت اور محبت کو اس مذہب کے کیمپ کی ایک بڑی علامت قرار دیا۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے فاضل مقالہ نگار کا تعارف حاضرین سے کراتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر محمد اشرف سائنس داں ہوتے ہوئے بھی تاریخ ہند اور سماجی علوم سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ سائنس کے چند موضوعات پر انھوں نے کام کیا ہے۔ اناس کے سلسلہ میں ان کی تحقیق بہت اہم ہے جس میں انھوں نے اس کے خالص ہندوستانی ہونے پر تاریخی کتب سے دلائل دئے ہیں۔ ●●●

محمد آصف اقبال شیخ

یکساں سول کوڈ
کمیونسٹ ذہن
کی اختراع ہے!!

ہندوستانی دستور Constitution کی بنیاد کیا متعین کی جائے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو سوچنے پر مجبور کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ حکمراں طبقہ اسے Secular (لادینی) گردانتا ہے۔ لیکن یہی لادینی دستور مذہب سے متاثر ہوتا دکھائی دیتا ہے — تو کبھی علمبرداران دستور کی اپنی اہم ہستیاں ہندوؤں کی مذہبی کتابیں لیکر گیتا اور رامائن پر ہاتھ رکھ کر حلف لیتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں (جو مذہبی کتابوں کے ساتھ تمسخر ہے)

لیکن پھر بھی دستور کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوگی — تاہم اسلام کی نظر میں ہندوستانی دستور کی بنیاد لادینیت پر ہے۔ ہندوستانی دستور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کی دفعات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

جمہوریت مختلف مذاہب کے حوالے ہیں۔ انہیں یہ بنیاد کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہندوستان کے دستور کا مسودہ مغرب کی طاغوتی جھولی سے بطور بھیک لیا گیا ہے۔

دستور کے اندر کمیونزم کا عکس بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے —

آج کل بھارت میں Common Civil Code کا چرچہ عروج پر ہے —

برسر اقتدار طبقہ اپنے ووٹروں کو خوش کرنے کے لئے ہندوستان کی اقلیتوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً "جبراً" تھوپنے کی کوشش کر رہا ہے جو کسی بھی قیمت مسلمانوں کو منظور نہیں ہے۔

جامود 443408 ضلع بلڈانہ مہاراشٹرا

جیسا یہ دیکھا ہے کہ Common Civil Code آخر ہے کس بلا کا نام۔ ہندوستان
دستور Constitution کی Directive principles کی دفعہ 44
میں یہ کہا گیا ہے کہ:

[illegible] shall endeavour to secure for citizens a Uniform Civil Code throughout the Territory of India

"ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں سیول کوڈ ہو"
مندرجہ بالا دفعہ کیمونسٹ دانشور "لینن" کے ذہن کی پیداوار ہے۔ لینن اپنی کتاب
"قومی مسئلہ کا تنقیدی جائزہ" صفحہ نمبر ۳۳ پر رقمطراز ہے کہ:

"آئین کی ترتیب و تشکیل میں ایک بنیادی قانون شامل کرلیا جائے
جو کسی قوم کو حاصل تمام امتیازی حقوق کو منسوخ قرار دے گا"

جس وقت ہندوستانی آئین کو ترتیب دیا جارہا تھا اس وقت ملک کے دانشوروں نے
ان کے فاسد و جاہلانہ نظریے کو دفعہ ۴۴ کے نام سے دستور میں شامل کرلیا۔
دستور ساز اسمبلی میں جس وقت دفعہ 44 پر غور ہورہا تھا اس وقت مسلم ممبر پارلیمنٹ
Muslim Member of Parliament نے اس میں متعدد ترمیمات پیش کی تھیں۔ چنانچہ
Mohd. Ismail Saheb (Madras) نے حسب ذیل ترمیم پیش کی تھی:

provided that any group, section or community of people shall not be obliged to give up its own personal law in case it has such a law.

(Directive principles in the Indian Constitution by K.C. Markanden P.193)

"جمہور کے کسی گروہ، حصہ یا جماعت کو اس بات کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا
کہ وہ اپنے پرسنل لا کو چھوڑ دے اگر وہ ایسا کوئی قانون رکھتا ہو"
دوسری ترمیم جناب نذیر احمد صاحب نے ان الفاظ میں پیش کی تھی:

provided that the personal law of any

community which has been guaranteed by the State shall not be changed except with the previous approval of the community ascertained in such manner as the Union legislature may determine by law. (do page 193)

لیکن مسلم ممبران پارلیمنٹ کی پیش کردہ تمام ترمیمات کو ڈاکٹر امبیڈکر نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ "دفعہ 44 مسلمانوں پر لاگو نہیں کی جائے گی ـــ مزید یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ ـــ

"وہ حکومت پاگل ہوگی جو دفعہ 44 نافذ کرکے مسلمانوں کی بغاوت کا خطرہ مول لے گی"
امبیڈکر کی اس یقین دہانی پر مسلمان خوش ہو گئے ـــ لیکن امبیڈکر کی یہ یقین دہانی ایک فریب ودھوکہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھی ـــ کیونکہ جس وقت آئین کی ترتیب وتشکیل ہو رہی تھی اس وقت یہ کسی بھی طرح ممکن نہ تھا کہ دفعہ 44 کو منسوخ کیا جائے یا اس دفعہ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے ـــ لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ زبانی وعدہ کرکے معاملہ کو ٹال دیا جائے ـــ یہ فرقہ پرستوں کی سازش کا ایک تیر تھا جو مسلمانوں کے سینے میں اس وقت لگا جب دستور کی تشکیل ہو رہی تھی ـــ جس کا خمیازہ ملت اسلامیہ ہند آج تک بھگت رہی ہے۔

یکساں سول کوڈ کیا ہے؟ یکساں سول کوڈ کی واضح تعریف Definition ہندو کوڈ ہے۔ اس کی تائید پروفیسر ڈنکن جو لندن یونیورسٹی میں اورینٹل لا کے پروفیسر رہ چکے ہیں اس خیال سے ہوتی ہے جس کا اظہار انہوں نے انڈین سول کوڈ کے موضوع پر کیا ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں کہ:

The civil code promised in article 44 of the Constitution is like the 'Hindu Code' of which we have spoken before a misnomer but a convenient one.

(Religion and the state in India by J. Duncan p. 546)

اگر خدانخواستہ یکساں سول کوڈ نافذ ہوجائے تو اس ملک ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی حیثیت ختم ہوجائے گی — پرسنل لا کے ختم ہونے پر مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہوجائے گی بلکہ (جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب) صدر مسلم پرسنل لا بورڈ کے الفاظ میں کہ پرسنل لا کے ختم ہونے کے بعد مسلمان آدھے رہ جائیں گے ...... اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے امید قوی ہے کہ مسلمان اپنے پرسنل لا کو کسی بھی صورت ختم نہیں ہونے دیں گے خواہ اس کے لئے کیسا ہی سخت اقدام کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ پرسنل لا تو مسلمانوں کی موت وحیات کا مسئلہ ہے — میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک عالم دین — تحریک آزادی ہند کے مایۂ ناز ہیرو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے الفاظ نقل کروں — مولانا فرماتے ہیں کہ :

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی —
تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس —
کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں — اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، —
اسلام کے علوم وفنون، اور اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض —
ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں —
اپنی ایک ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔"

(مندرجہ بالا اقتباس مولانا کی اس صدارتی تقریر کا ہے جو بر موقع انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا)

یکساں سول کوڈ کے مسلط ہوجانے پر مسلمانانِ ہند کو لامحالہ ہندوازم کی اطاعت کرنی پڑے گی (جو خدا کے قانون سے بغاوت کے مترادف ہے) اور وہ تمام مراعات جنہیں اسلام نے مسلمانوں کو دی ہیں ختم ہوجائیں گی — ہندو کوڈ کے اندر صرف ایک بیوی کی اجازت ہے۔ دوسری بیوی کرنے کی صورت میں انڈین پینل کوڈ کی رو سے سات سال کی سزا تجویز کی گئی ہے۔

Any marriage between two Hindus solemnized after commencement of this Act is void, if at the date of such marriage either party had a husband or wife living, and provisions of section 494 and 495 of the Indian Penal Code shall apply accordingly.

(Section 17)

جبکہ اسلام اس کوڈ کے برعکس عدل وانصاف کی شرط لگاکر چار بیویاں کرنے تک اجازت دیتا ہے۔

پھر ہندو ازم میں یہ بات بھی ہے کہ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں تاحیات تا نکاح ثانی نان ونفقہ (Maintenance) دینا شوہر پر قانونا لازم ہوگا جبکہ اسلام طلاق کے بعد صرف ایام عدت تک نان نفقہ دینے کی بات کرتا ہے

یکساں سیول کوڈ اتحاد ملک کے لیے خطرہ ہے :

حکمراں طبقہ کی جانب سے یہ افواہ پھیلائی جارہی ہے کہ یکساں سیول کوڈ ملک میں یکجہتی کے لیے سنگ میل ثابت ہوگا۔ اس کی تائید جسٹس بھاگوتی۔ وی چندراچوڑ کے اظہار سے ہوتی ہے جو انہوں نے بمبئی میں کسی موقع پر کیا تھا وہ کہتے ہیں کہ :

One law of marriage for all would be an importa[nt] step towards national integration.

(Indian Express 21.1.87

" تمام لوگوں کے لیے شادی کا ایک قانون قومی یکجہتی کی طرف اہم قدم ہوگا "

لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ یکساں سیول کوڈ ملک میں اتحاد کی فضا پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے برعکس یکساں سیول کوڈ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں سنگ میل ثابت ہو سکتا ہے ــــ یکساں سیول کوڈ کا نعرہ وہی لگا سکتے ہیں جو ملک کے ازلی دشمن ہیں ــــ لہذا ہم ملک کے امن کو کسی صورت میں تباہ نہیں ہونے دیں گے ، انشاء اللہ ــ ہم حکمراں طبقہ کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی متعصبانہ ومنافقانہ اور جاہلانہ روش سے باز آجائیں ورنہ ان کی موجودہ حالت ملت اسلامیہ ہند کو اس کے خلاف جدوجہد کرنے پر مجبور کردیں گی ــــ اور پھر حالات قابو سے باہر ہونے پر ساری ذمہ داری حکمراں جماعت پر ہوگی ــــ لہذا اگر برسر اقتدار گروہ کو واقعی ملک کا اتحاد عزیز ہے تو وہ یکساں سیول کوڈ کا ہوّا اپنے ذہن سے نکال دیں اور اسلامیہ عدلیہ نظام از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کریں تاکہ ملک میں امن وشانتی کی فضا برقرار رہ سکے۔

ملت اسلامیہ کا اقدام کیا ہو؟

اب جبکہ حکومت ، عدلیہ ، انتظامیہ اور ملک کی فرقہ وارانہ جماعتوں کی ملی بھگت آئے دن مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھلواڑ کر رہی ہے ایسے نازک ترین حالات میں ملت اسلامیہ کو چاہیے کہ جزوی اختلافات کی ہلکی سی لکیر مٹا کر اتحاد کا ثبوت پیش کریں اور اپنے دین وایمان کی بقاء وتحفظ کے لیے اپنی جان ومال کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں

ڈاکٹر محمد حسن

اردو ادب کی تاریخ کی سماجیاتی تشکیل

پروفیسر محمد حسن، شعبہ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے خدا بخش لائبریری میں توسیعی خطبات دیتے ہوئے فرمایا کہ عہد وسطیٰ کے شمالی ہندوستان کی تہذیب اور خصوصاً اردو کی تاریخ کو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے شروع کرنے والے مورخین خطرناک حد تک ادھوری اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ "مسلمان" کے لفظ سے کسی گروہ یا جماعت کا مذہب تو ضرور ظاہر ہوتا ہے مگر ان کی تہذیب یا زبان کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ کیونکہ مسلمان افغان بھی تھے ایرانی بھی، عرب بھی اور ترک بھی اور ان سب کی زبانیں بھی الگ الگ تھیں اور ہیں، تہذیبیں بھی جداگانہ تھیں اور ہیں۔ دوسری غلط فہمی جو کچھ نادانستہ پھیلی اور کچھ دانستہ پھیلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد فوجی حملہ آوروں کی ہی شکل میں ہوئی۔ کیرالا میں مسلمان عرب تاجروں کی آمد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو تازہ ترین تحقیقات کے مطابق اب یہ مان لینے کے شواہد ہیں کہ محمود غزنوی کے حملوں سے بہت پہلے خود شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی آبادیاں موجود تھیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے پروفیسر محمد مجیب کے کنور محمد اشرف کے یادگاری خطبہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے اپنے اس لکچر میں ایسی کئی آبادیوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمان فاتحین کی آمد سے پہلے یہاں موجود تھیں۔ ڈاکٹر حسن نے مزید فرمایا کہ تاریخ بلگرام میں محمود غزنوی سے قبل اس قصبے میں قاضی القضاۃ کے تقرر کئے جانے اور جاگیر دینے کا فرمان موجود ہے اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی مرتبہ کتاب "تاریخ محمودی" میں محمود غزنوی سے قبل کی مسلم آبادی کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وسطی اور مغربی ایشیا کے تاجروں کی اس آمد و رفت

نے ہندوستان کی مختلف تہذیبی اکائیوں، لسانی وحدتوں اور علاقائی منطقوں کو متاثر کیا اور ہندوستان کے مختلف علاقے، برادریاں اور زبانیں اس کلچر کے نئے رنگ سے آشنا ہوئیں جو اس زمانے میں عالمی مانا جاتا تھا اور مہذب دنیا میں جس کی بے حد مقبولیت تھی۔ اور ان تاجروں کی آمد و رفت کا اثر تھا کہ ہندوستانی قصبوں اور حرفت کے ٹھکانوں نے تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی اور تمام بڑے شہر ایک ہی زبان اور ایک ادبی روایت کے مراکز تھے جو قومی سطح پر برتری و مرکزیت ہی کا نشان نہیں تھے بلکہ قومی اور بین الاقوامی کلچر کے ملاپ کا اشاریہ بھی تھے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے مسلمانوں کی آمد سے پہلے ادبی روایت کا جائزہ پیش کرتے ہوئے مختصراً ابتدائی دور، رزمیہ دور، اور بھگتی کال اور صوفیانہ شاعری کے دور کا ذکر بھی کیا۔

موصوف نے خاص اس نقطۂ نظر سے تاریخ کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ گرونانک نے نعت پر کام شروع کیا اور کبیر جولاہے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل حرفہ کے یہ طبقے اس بین الاقوامی کلچر کا تصوراتی اعتبار سے بھی ایک حصہ بنتے جا رہے تھے جو علاقوں اور برادریوں سے اوپر اٹھ کر ایک نئی آگہی کی تشکیل کر رہا تھا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے بھگتی اندولن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اکبر کے دور سے پہلے ہی ملک گیر پیمانہ پر ابھرنے والے مدنی مراکز میں جو بین الاقوامی جدیدیت اور روشن خیالی کے گہوارے بن رہے تھے ایک ایسی نظریاتی بنیاد کی تلاش جاری تھی جو مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف عقیدے رکھنے والے مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان اختلاف کے باوجود اتفاق اور ہم آہنگی کی صورت نکال سکے۔ بھگتی اور تصوف نے ایسی صورت نکالی کہ پوجا اور عبادت کی ظاہری رسوم اہم نہ رہے و نجات اور ایمان کی اساس ظاہر کے بجائے باطن قرار پایا۔ دل کی لگن اور من کی موج کا حال خدا اور بندے کے سوا کسی کو کیا معلوم۔ اور یہ دل کی لگن توفیق الٰہی پر منحصر ٹھہری تو پھر کون کس میں کیا دیکھتا ہے اور کس کے پردے میں (وہ دیوتا ہو یا محبوب یا محبوبۂ مجازی) کس کی پوجا کرتا ہے۔ یہ معاملہ اہل ظاہر کے طے کرنے یا حد شرعی جاری کرنے یا فتاوی صادر کرنے کا نہیں صرف خدا یا بھگوان کے اپنے طور پر تصفیہ کا ہے۔

اس طرح عشق محترم ٹھہرا بلکہ کلید ایمان قرار پایا اور محبوب سے ایسا لگاؤ کہ اس میں ایثار اور قربانی بلکہ ہوس سوزی، خود فراموشی اور جاں نثاری کے پہلو نکلیں عین مذہب بن گیا عشق کی روش پہلے سے موجود تھی بلکہ بین الاقوامی سطح پر نظامی لیلیٰ مجنوں کے چرچے [illegible] اور مولانا روم عشق مجازی کے کئی حصوں میں بھی سماوی جھلکیاں دیکھ چکے تھے

ہیں، فریدالدین عطار نے توبت پرستی میں صاف اور واضح طور پر خدا پرستی کا جلوہ دیکھا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے بھگتی اندولن پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نظریاتی اور فکری وحدت کو فراہم کرنے والا فلسفہ بھگتی اور تصوف جس کے پیچھے وحدت الوجود اور ادویت واد کا مشترکہ اقدار کا تانا بانا موجود تھا جو اکبر کے دور کے بعد ہندوستان کی قومی یک جہتی کی بنیاد فراہم کرسکتا ہے۔ اکبر نے جس یگانگت اور قومی سطح پر وحدت اور مذہبی مرکزیت کا خواب انتظامی ضروریات اور فکری تقاضوں کے مطابق کیا تھا اس کی تصورات کی سطح پر تعبیر بھگتی اور تصوف کا ہی نظام تھا گو اکبر اور اس کے فکر کے علمبردار ابوالفضل، فیضی اور عرفی روشن خیالی اور آزاد خیالی میں اس سے بھی آگے جانا چاہتے تھے۔

موصوف نے تاریخ کی روشنی میں مختلف تہذیبوں کی آویزش سے پیدا ہونے والے اثرات و نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس صورت حال سے مختلف ادبی روایات طریقوں پر متاثر کیا۔ ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے شاعروں کے کلام میں ہندوستانی اثرات نے 'سبک ہندی' کو جنم دیا۔ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں خصوصاً برج بھاشا میں فارسی اثرات نے شعری اور فکری تہ داری کی وہ صورتیں پیدا کردیں جنھیں ابتدائی عہد کی کاریگری اور نفاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تیسرے ریختہ یا اردو شاعری کا رواج ہوا اور اس شاعری نے ملک کی سیکولر دلی تہذیب کی روایت کو اپنا کر اسے بین الاقوامی کلچر کا حصہ بنا دیا اور چوتھے گجرات کی گوجری اور دکن میں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ میں دکنی اردو کی نظم اور نثر نے ہندوستان اور ایران کے لسانی ذخیروں کو اس نئی مدنی مرکزیت کا ساں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر محمد حسن نے ہندوستانی تاریخ کی مختلف ادوار میں بدلتی ہوئی سماجی قدروں اور تمدنی و تہذیبی نیرنگیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اردو ادب پر ان کے اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش فرمایا۔ اپنے لکچر کے آخر میں انھوں نے مشرق اوسط کے معروف محقق قاضی عبدالودود کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فیض احمد فیض کے یہ اشعار سنائے:

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو ہمت کفر ملے، جرأت تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

پھر موصوف نے فرمایا کہ پہلے شعر کا تعلق تحقیق سے ہے اور دوسرے کا توفیق سے جس میں جو حصہ مجھے ارزانی ہوا ہے اس کا اشاریہ یہ خطبات ہیں جو اردو کے عظیم محقق قاضی عبدالودود کی یاد کی نذر ہیں۔

○○○

پریس انفارمیشن بیورو - گورنمنٹ آف انڈیا - حیدرآباد

نئی تعلیمی پالیسی کی عمل آوری

نئی تعلیمی پالیسی کی مطابقت میں ثانوی سطح پر تعلیم کو ہنرمندی سے مربوط کرنے پر غور کے لیے ۲۶ اپریل ۱۹۸۶ء کو تمام ریاستوں اور مرکزی زیر انتظام علاقوں کے وزرائے تعلیم کا اجلاس دلی میں منعقد ہوا۔ وزیر فروغ انسانی وسائل شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔ اس سے ایک دن قبل ۲۵ اپریل کو ریاستی معتمدین تعلیمات و ناظم تعلیمات نے ابتدائی تعلیم کو عام کرنے اساتذہ کے تربیتی پروگرام اور ووکیشنل (ہنرمندی) پروگرام کی عمل آوری پر تبادلہ خیال کیا۔ معتمدین کی سطح کے اجلاس میں ان پروگراموں کی عمل آوری پر مالی انتظامات پر بھی غور ہوا۔ ان پروگراموں کی عمل آوری جن میں نئے مدارس کے قیام کے لیے نقشہ بنانا آپریشن بلاک بورڈ، غیر رسمی تعلیم، ابتدائی تعلیم کو عام کرنے خورد منصوبہ بندی پر غور کیا گیا۔

معتمدین نے آنے والے گرمائی تعطیلات میں ۵ لاکھ اساتذہ کو تربیت دینے کے پروگرام کو قطعیت دی۔

تعلیم کو ہنرمندی سے مربوط کرنا تعلیم کے مختلف سطحوں پر ووکیشنل ٹریننگ اور ماہرانہ تربیت کو ساتویں منصوبے میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سفارشات کے لیے ڈاکٹر کلند الوسوامی کی قیادت میں ماہرین کے ایک گروپ نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے موازنے میں اس پروگرام کی عمل آوری کے لیے ۸ء۹۸ کروڑ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔

آپریشن بلاک بورڈ اس اسکیم کا مقصد تحتانوی مدارس میں اقل ترین بنیادی سہولتیں اور تدریسی ساز و سامان فراہم کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس سال موازنہ میں ۸ء۹۸ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسکیم کے تحت تحتانوی مدارس میں کم از کم دو پکے کمروں پر مشتمل عمارت

کھیل کود کا سامان، کھلونے، بلاک بورڈ، نقشے، جدول اور تدریسی سامان کی فراہمی شامل ہے

غیر رسمی تعلیم

اس اسکیم کا منشا تعلیمی طور پر پسماندہ نو ریاستوں آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اترپردیش اور مغربی بنگال میں رسمی تعلیم سے محروم بچوں کو متبادل تعلیم فراہم کرنا ہے۔ مرکز نصف، نصف کی بنیاد پر ریاستوں کی مدد کر رہا ہے۔

نوادیا ودیالیہ

ان مدارس کے قیام کا مقصد ذہین، خاص کر دیہی طلباء کو عصری و معیاری تعلیم فراہم کرنا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران ملک بھر میں ایسے ۸۱ مدارس کھولے گئے جبکہ نشانہ ۶۰ تا ۸۰ کا رکھا گیا تھا۔ ساتویں منصوبے کے دوران ملک بھر کے ہر ایک ضلع میں مرکز کی مکمل امداد سے ایسے اقامتی مدارس کے قیام کی تجویز ہے۔ جاریہ سال کے دوران ۱۲۰ تا ۱۵۰ نئے نوادیا ودیالیہ کے قیام کی تجویز ہے۔ تاحال ۱۳۱ کو منظوری دے دی گئی ہے۔ اس سال موازنہ میں اس مقصد کے لئے ۶۹ کروڑ روپئے رکھے گئے ہیں جبکہ سال گذشتہ اس پر ۲۰ کروڑ روپیہ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

نئے مرکزی مدارس

سال ۸۷-۸۶ء کے دوران ۷۹ نئے سنٹرل اسکولس کھولے گئے جن کے منجملہ ۳۲ دفاعی شعبہ کے لئے ۳۴ شہری شعبہ اور ۱۳ پراجکٹ شعبہ کے لئے ہیں۔ اس وقت ملک بھر میں ۶۱۹ مرکزی مدارس ہیں اور ۴ لاکھ ۲۲ ہزار سے زائد طلباء تدریس حاصل کرتے ہیں۔ ان میں ۱۸ ہزار ۵۷۷ اساتذہ برسر خدمت ہیں۔

کھلے اسکول

مرکزی بورڈ برائے ثانوی تعلیم نے درمیان میں تعلیم ترک کرنے والوں کم حیثیت افراد، برسر خدمت بالغ افراد اور سماج کے دیگر افراد کے لئے ثانوی درجہ کے امتحانات کے لئے کھلے مدارس کا پیش کش کیا ہے۔ اس سال بجٹ میں اسی مد میں ۷۰ لاکھ روپئے مختص ہیں۔

کمپیوٹر خواندگی پروگرام

محکمۂ تعلیم، محکمۂ الکٹرانکس کے تعاون سے اس سال ۲ ہزار ثانوی مدارس میں کمپیوٹر خواندگی پروگرام شروع کرنے کی تجویز رکھتا ہے۔ جاریہ سال بجٹ میں اس مقصد کے لئے ۶ کروڑ روپئے رکھے گئے ہیں۔

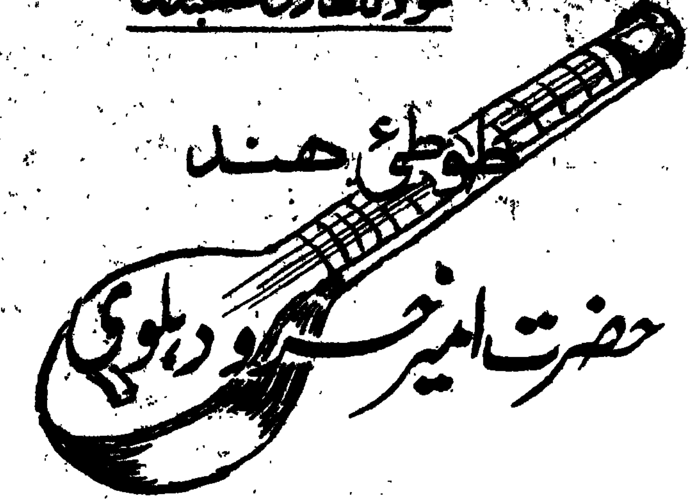
ooo

سلسلہ صفحہ ۱۰

ٹیلی ویژن سرکٹ اس اکاڈیمی میں موجود ہیں۔ بین الاقوامی تنظیموں فیڈریشن برائے زرعی ادارے، اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام اور یونیسکو کی مدد سے زرعی تعلیم و تحقیق کے انتظام کا یہ عصری مرکز حال ہی میں قائم کیا گیا ہے۔

ooo

مولانا ہادی نقشبندی



طوطئ ہند
حضرت امیر خسرو دہلوی

صوفی اور **تصوف** کی اصطلاحیں عام طور پر مسلمان صوفیوں کے لئے ستعمال کی جاتی ہیں لیکن تصوف کا وسیع تر مفہوم جس مسلک، ذہنی رجحان اور انداز فکر امل ہے وہ صرف مسلمانوں سے مخصوص نہیں۔ مختلف مذاہب و اقوام اور ممالک میں ایسے رجحانات میلانات کے واضح آثار پائے جاتے ہیں جنہیں تصوف کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے اور ان ب کا لب لباب یہی ہے کہ صوفی معرفت و محبت سے لبریز ہوتا ہے۔ اس کا علم و عمل، گریانی سکوت، محبت و عرفان کا آئینہ دار ہے۔ جو پروفیسر نکلسن کے تجزیے کے مطابق درست معلوم ہوتی ہے کہ "تمام صوفیانہ تجربات بالآخر ایک نقطہ پر آ کر مل جاتے ہیں"۔ لیکن یہ نقطہ صوفی کے مذہب ل و مزاج کی مناسبت سے مختلف شکلیں اختیار کرلیتا ہے اور اس نقطہ تک پہنچنے کے لئے جو راہیں ختیار کی جاسکتی ہیں، وہ بجائے خود اتنی متنوع اور مختلف ہیں کہ اس مختصر صحبت میں ان کا احاطہ ممکن نہیں

فارسی ادب کا سب سے بڑا و نمایاں عنصر تصوف و طریقت ہے جو فارسی شاعری کی جان ہے یہ ہندوستان میں غزنویوں کے دم قدم سے آئی، انہی کے اثر سے تمام اسلامی دور میں یہاں درباری زبان فارسی رہی۔ جب غوریوں کا عروج ہوا اور سلطان معزالدین محمد غوری نے ۱۱۹۰ء میں دہلی و اجمیر پر قبضہ کرلیا تو اسلامی تہذیب و تمدن اور فارسی شعر و ادب کا سب سے ا مرکز دہلی بن گیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں وسط اور مغربی ایشیا کے اسلامی [illegible]

سجادہ نشین خانقاہ نقشبندیہ ۔ بالاپور ۔ مہاراشٹرا

"فتنۂ مغول" کی آندھی اٹھی جس سے بچنے کے لئے سینکڑوں اہلِ عالم، شاعر و ادیب جوق در جوق ہندوستان میں آکر پناہ گزیں ہوئے، ہندوستان میں اب شعر و سخن کی زمین تیار تھی۔ صرف کسی صاحبِ کمال کا انتظار رہتا۔ وہ کمی حضرت امیر خسرو نے پوری کر دی۔

ہندوستان کا سب سے عظیم صوفی شاعر ابوالحسن ۱۲۵۳ء میں قنوج کے قریب قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوا، سات یا نو سال کی عمر تھی والد ماجد امیر سیف الدین محمود شمسی کے سایۂ عاطفت سے جو ترکستان سے آئے تھے محروم ہو گئے۔ جن کی سرپرستی ان کے نانا عماد الملک نے جو دربارِ دہلی کے بلند امیر کبیر تھے کی زیرِ کفالت، تعلیم و تربیت ہندوستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب میں ہوئی۔ اس لئے یہاں کے اوضاع و اطوار سے خوب واقف ہو گئے انتہائی ذہین و ذکی تھے۔ مروجہ علوم و فنون کی تحصیل میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ فہم و ادراک اور حافظہ یہ سب خداداد بچپن سے ملا تھا۔ ان کی رنگا رنگ طبیعت، ہمہ جہت شخصی انفرادیت جو بیک وقت صوفی، ادیب، شاعر، مصنف، سپاہی اور مصاحب سبھی کچھ تھے۔ وہیں فقیر و بادشاہ، خانقاہ و دربار، مجلسِ حال و قال سے میدانِ جنگ و جدال تک یہ تھے۔۔

طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو دہلوی۔

حضرت امیر خسرو بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے۔ ان کے والد نے یہ ذوق و شوق دیکھا اور طبیعت کو طریقۂ صوفیت کی طرف مبذول پایا تو حضرت نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی کی خدمت میں لے چلے۔ جب دروازہ میں داخل ہوئے تو حضرت خسرو نے والد ماجد سے عرض کیا کہ پیر کو پسند کرنا میرا کام ہے نہ کہ آپ کا، غرض ان کے والد وہیں انھیں چھوڑ گئے حضرت خسرو نے دروازہ میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک رباعی موزوں کی اور خیال کیا کہ اگر پیر روشن ضمیر ہے تو اس کا جواب ضرور دے گا اور جواب معقول ہوا تو میں مرید ہو جاؤں گا ورنہ واپس چلا جاؤں گا ؎

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

حضرت محبوبِ الٰہی کو کشف سے تمام حالت معلوم ہو گئی اور ایک خادم کو بلا کر کہا کہ ایک لڑکا دروازہ پر بیٹھا ہے اس کے پاس جا کر یہ رباعی پڑھ دو ؎

بیاید اندروں مردِ حقیقت
کہ با ما یک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں
ازاں راہے کہ آمد باز گردد

جب حضرت خسرو نے یہ رباعی سنی تو پھڑک اٹھے، فوراً اندر داخل ہوئے اور

حضرت کے قدموں میں سر رکھا اور مرید ہو گئے۔

اگرچہ آپ کی تمام عمر بادشاہوں کے درباروں، امراء و رؤسا کی صحبتوں میں گزری دنیا کی محبت دل میں نہ تھی۔ آپ دن میں درباروں یا رؤسا کے یہاں رہتے اور رات حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں گزارتے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ قاعدہ تھا کہ عشاء کی نماز سویرے سے پڑھ کر خوابگاہ میں تشریف لے جاتے، اس وقت سوائے حضرت خسروؒ کے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب آپ رات حاضر ہوتے تو حضرت محبوب الٰہیؒ فرمایا کرتے "کہو ترک کیا کیا خبریں ہیں" آپ دن بھر کے تمام واقعات سنایا کرتے پھر ارشاد ہوتا "اپنا تازہ کلام سناؤ" اسی اثناء میں آپ کی آنکھ لگ جاتی اور حضرت خسروؒ بھی آپ کے قدموں میں سر رکھ کر سو جاتے۔

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے جس کے رشیوں، منیوں اور مفکروں کا رجحان ہمیشہ سے صوفیانہ خیالات اور عقائد کی جانب مبذول اور زندگی کے آخری مقصد کو جاننے کے لئے دین دھرم و روحانیت کی طرف مائل رہا ہے۔ ویدانت کا نظریہ تصوف بھی بقا کی بجائے فنا کی تعلیم دے کر خدا کی ذات کے متعلق "نیستی نیستی" رہ گیا۔ اس قسم کے نظریہ حیات سے غیر دلچسپی کی تیز اٹھ جاتی ہے۔ جس سے جدوجہد کی قوتیں بھی مفلوج ہو جاتی ہیں۔ لیکن کبیر و نانک جیسے بھگتوں نے انسانوں کو اس سے بیدار کرتے ہوئے بتایا کہ ایشور، اللہ ہر جگہ اور سب کے اندر موجود ہے۔ حضرت امیر خسروؒ کا شمار بھی ایسے ہی وسیع المشرب صوفیا میں ہوتا ہے جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اقتضاء اسی کو سمجھ کر ہر مذہب و ملت کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ کا ذہن بھی سختی سے پابند شریعت ہونے کے باوجود اسی رنگ تصوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک پختہ کار مسلمان ہو کر عشق و محبت میں بت پرستی کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ اختلاف شدید کے باوجود خود کہتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست | ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند | آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

جذبات انسانی میں عشق و محبت کا جذبہ جس قدر شدید و قوی ہے شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اس جذبہ کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ انسان دنیا و مافیہا حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی بھول کر ایک ہی یاد کا ہو رہتا ہے، یہی محبت ہے جو اکثر صوفیاء کی رائے میں تصوف کی ساتھی ایک خودرو پودے کی طرح ہے جو مناسب زمین پاکر پھولتا پھلتا ہے۔ اسلام میں بھی کسی خارجی یا داخلی اثر کے بغیر یہ تحریک خود پیدا ہوئی اور موافق حالات میں ترقی پاکر تیز

تصوف سامی مذہب کے خلاف آریائی دماغ کا ردعمل ہے جو صوفیانہ سیمی عقائد وافکار کا رہین منت ہے اور یہ تمام اعتقادات فلسفہ یونان کی بازگشت ہیں جو ہمیشہ نا بحث رہے ہیں جس کی ہدف بنی میں حضرت امیر خسروؒ نے تصوف میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کو دامن تھاما اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سے

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

حضرت خسروؒ اپنے پیر طریقت کا بے حد احترام کرتے تھے اور پروانہ وار فدا تھے حضرت محبوب الٰہی بھی اپنے تمام مسترشدین اور ارادت مندوں میں سب سے زیادہ انھیں چاہتے اور انھی پر توجہ مبذول فرماتے۔ امیر خسروؒ حضرت کے عاشق صادق تھے۔ ان کا تمام کلام جو کئی لاکھ ابیات پر مشتمل ہے حضرت ہی کی صوفیانہ تعلیمات کے دل بیانہ بیان پر مبنی ہے جو اپنی سادگی و پرکاری، شگفتگی و روانی، پند و مواعظ کی برجستگی اور شیریں بیانی سے دل گداز جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جس کی تاثیر دلوں کو گرما دیتی ہے۔ چونکہ وہ خود ایک صاحب دل تھے، ان کے دل سے جو بات نکلتی سراپا تاثیر بن جاتی اور ہر ایک کو تڑپا دیتی۔ "تزک جہانگیری" اور "داغستانی" میں ایک چشم دید معتبر روایت موجود ہے کہ جہانگیر نے صوفیاء کو مجلس سماع کی دعوت دی، قوال نے حضرت خسروؒ کا یہ شعر گانا شروع کیا

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

اس مجلس میں مولانا علی احمد مہرکن جو نشانی تخلص کرتے تھے اس وقت وجد میں آئے جہانگیر نے اس شعر کا مطلب پوچھا، مولانا اسی طرح رقص کرتے ہوئے جہانگیر کے سامنے گئے اور فرمایا کہ ہنود اپنے کسی تہوار میں جوق در جوق دریا کے کنارے جمع ہو رہے تھے اور غسل میں مشغول تھے۔ حضرت محبوب الٰہی بھی اس وقت سیر کرتے ہوئے اس طرف سے گزرے، ان لوگوں کے مذہبی جوش کو دیکھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے امیر خسروؒ کی طرف جو ہمرکاب تھے، اشارہ کر کے فرمایا

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اتفاقاً حضرت شیخ المشائخ کے سر مبارک پر ٹوپی کج تھی۔ حضرت خسروؒ نے فوراً دوسرا مصرعہ

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

یہ کہہ کر شعر پورا کر دیا۔ اس روایت کو ختم کر کے مولانا علی احمد اپنے سر پہ ہاتھ لے جانا چاہتے تھے کہ اپنی ٹوپی کو ٹیڑھی کر کے بادشاہ کو دکھلائیں کہ حضرت شیخ المشائخ کی ٹوپی جس طرح تھی لیکن ہاتھ اٹھاتے ہی وجد کا عالم طاری ہو گیا اور ایک نعرہ کے ساتھ جان بحق ہو

کبریٰ انصاری



غیاث الدین بلبن

تاریخ ہند میں "خاندان غلاماں" کی حکومت کئی لحاظ سے نمایاں اور اہم ہے۔ سب سے پہلی اور اہم خصوصیت تو یہ ہے کہ سلطان محمد غوری نے کئی غلاموں کو خریدا، انھیں تربیت دی اور بڑی بڑی خدمتوں پر مامور کیا، ہندوستان کے مختلف حصوں پر ان جنگجو اور قابل و تجربہ کار غلاموں کو اپنا گورنر مقرر کیا، ناصر الدین قباچہ ملتان میں، بہاء الدین طغرل بیانہ و گوالیار میں، قطب الدین ایبک کہرام میں۔ قطب الدین ایبک نے دہلی فتح کرکے اسے صدر مقام بنایا۔ سلطان محمد غوری کی زندگی میں وہ غزنی کا تابعدار رہا۔ سلطان کے انتقال کے بعد وسیع سلطنت غوری کئی حصوں میں تقسیم ہوئی تو سلطان محمود غوری نے قطب الدین کو خطاب سلطانی اور چتر شاہی عطا کیا، ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں قطب الدین لاہور میں تخت نشین ہوا۔ اور ۶۰۷ھ م ۱۲۱۰ء میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گرا اور وہیں جاں بحق ہوا۔ سلطان کا فرزند آرام بن قطب الدین تخت نشین ہوا۔ مگر ناکارہ ثابت ہوا، ایک سال کے اندر ہی سلطنت کے اجزاء بکھرنے لگے۔ امرائے سلطنت نے مجبوراً التمش کو جو سلطان قطب الدین کا غلام اور داماد تھا اور بدایوں کا حاکم تھا، وہاں سے دہلی بلایا جس نے شاہ دہلی بن کر سلطنت کے وقار کو قائم اور زیادہ کیا۔ سلطان التمش کے گیارہ بیٹے تھے۔ کچھ اس کی زندگی میں فوت ہوئے باقی دیندار باپ کے مرنے کے بعد عیاش اور بد اطوار ہو گئے۔ لوگوں نے سلطان کی دختر، رضیہ بیگم کو سلطان بنا دیا، اس نے انتظام مملکت خوب چلایا مگر امرائے سلطنت کو ایک عورت کی محکومی گوارا نہ ہوئی بغاوت ہوئی، مقابلے ہوئے، سلطانہ رضیہ ماری گئی۔ معز الدین بہرام اور علاء الدین مسعود بادشاہ بنے اور ان کے بعد التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا ناصر الدین محمود ۶۴۴ھ م

کدم ناور، اشوک نگر، حیدرآباد

سنہ ۱۲۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ غیاث الدین بلبن جو التمش کا غلام اور داماد تھا وزیراعظم مقرر کیا گیا اور تمام کاروبار سلطنت اسی پر چھوڑ دیئے گئے۔ بلبن نے اپنی لیاقت سے انتظام سلطنت میں فرق نہ آنے دیا۔ مگر سلطان شمس الدین التمش کے چالیس ترک غلام جنھیں "بندگان چہل گانی" کہا جاتا تھا، نہایت سرکش ہو گئے تھے اور شاہ دہلی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بلبن جو انہی میں سے ایک تھا، مضبوط حکومت کے قیام کی خاطر سنہ ۶۶۲ھ میں غیاث الدین کے لقب سے تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوا۔ سرکش امیروں کو جس طرح ہو سکا سیدھا کیا یا اپنے راستہ سے علٰحدہ کیا، خزانہ کی طرف توجہ دی، فوج کی تنظیم جدید کرتے ہوئے اضافہ بھی کیا اور ملک کی آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کئی کام کئے۔ اس مختصر سے مضمون میں غیاث الدین بلبن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔

غیاث الدین بلبن نے اپنے عہد میں کوئی عظیم الشان فتح حاصل کی اور نہ کوئی جدید علاقہ سلطنت دہلی میں شریک کیا گیا۔ لیکن جس قدر ملک سلطنت میں شامل تھا اس میں امن و امان قائم کیا، اور ڈاکہ زنی، لوٹ مار کا نام و نشان بھی نہ چھوڑا، ملک کی ترقی اور رعایا کی خوشحالی کے لئے ایسے قوانین و ضوابط جاری کئے جن سے عام رعایا امن و چین اور خوشی و خرمی سے اپنی زندگی بسر کر سکتی تھی۔ جو امراء اور سرداران علاقہ التمش کے بعد اور اس کے نالائق ورثاء کے عہد میں سرکش ہو کر قوت حاصل کر چکے تھے اور امور سلطنت میں دخیل ہوتے تھے انھیں اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے راہ راست پر لا کر اپنے قابو میں لایا یا انھیں اپنی تدبیروں سے تباہ و برباد کر دیا۔ سلطانی شان و شوکت اور رعب داب کے لئے منتخب جوانوں کا ایک مخصوص دستہ اپنی اردلی میں رکھتا، عام فوج بھی نہایت عمدہ آلات سے آراستہ ہوتی۔ قوانین و ضوابط کو سختی سے نافذ کیا جاتا نتیجہ میں بغاوت و سرکشی کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ انتظام مملکت کے لئے ہر صیغہ کے وزیر و سکریٹری مقرر تھے۔ متعلقہ امراء انہی وزراء کو حالات بتاتے اور مناسب احکام حاصل کرتے۔ بادشاہ رعب شاہی قائم کرنے اور اپنے وقار اور متانت کے اظہار کے لئے اپنے دربار میں تمسخر کرتا نہ کسی حاضر دربار کو تمسخر کی اجازت تھی بادشاہ مسخروں اور بھانڈوں، گویوں، کم مایہ، سفلہ طبع اور عام امراء سے ہمکلام بھی نہ ہوتا، ایک رئیس مخر یا ورنی بازار کے چودھری نے سلطان سے ہمکلام ہونے کی کئی تدبیریں کیں لیکن سلطان کے سکریٹری کی ہمکلامی سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

بلبن کا یہ عمل غرور و نخوت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ سلطنت کے رعب داب کو قائم کرنے کے لئے تھا اور اس وجہ سے بھی کہ فخر ماوٹی اوروں کی نگاہ میں اپنا رسوخ بڑھانے اور ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لئے بادشاہ سے بات کرنا چاہتا تھا اور بلبن نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو۔

اس انتظامی اصول کے باوجود ہر شخص دادخواہی کے لئے بلبن کے دربار میں بلا روک ٹوک جا سکتا تھا۔ حتی کہ عورتیں بھی انصاف حاصل کرنے کے لئے اس کے حضور میں پہنچ سکتی تھیں۔ ملک تقبالق بداؤں کا صوبہ دار اور چار ہزار سوار کا جاگیردار تھا، نشہ کی حالت میں ایک فراش کو اتنے درے لگوائے کہ وہ فوت ہو گیا اور زبردست اور با اختیار عہدہ دار کے خلاف فراش کی بیوہ نے بلبن سے انصاف کی درخواست کی، بلبن نے بعد تحقیقات جاگیردار مذکور کو درے لگوائے اور اسی صدمے سے وہ مر گیا۔

اس کے عدل و انصاف کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہیبت خاں گورنر اودھ نے ایک شخص کا خون ناحق کیا، اس کی بیوہ نے بلبن سے نالش کی، بلبن نے بعد تفتیش ہیبت خاں کو بیوہ کے حوالے کر دیا کہ پہلے ہمارا غلام تھا اب تمہارا ہے، مجرم نے ایک بڑی رقم بیوہ کو دی اور کسی سفارش سے اس سے چھٹکارہ حاصل کیا۔

التمش کے "بندگان چہل گانی" میں بہت سے بلبن سے زیادہ ممتاز اور مقتدر تھے یہ امراء اپنا اقتدار و رسوخ بڑھانے کے لئے عام جشن مناتے اور دیگر امراء و شرفاء کو ضیافت پر مدعو کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرتے، اتحاد و اتفاق بڑھا کر اپنے اقتدار و قوت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے۔ بلبن بھی اپنے ایام خانی میں اس حربہ کو استعمال کرتے اور دوسروں کی ضیافتوں کی طرح اس کے پاس بھی شراب موجود ہوتی، قمار بازی کا اہتمام ہوتا اور وقت اور موقعہ کے لحاظ سے ایسی ہی دیگر غیر شرعی باتوں سے پرہیز نہ کرتا، یہ سب سیاسی ضروریات کے تحت ہوتا، مگر جب یہ بادشاہ بن گیا تو ان تمام غیر شرعی امور کو یک لخت موقوف کر دیا۔

بلبن ایک باشعور، سمجھدار اور ہوشیار حکمراں تھا، سلطنت کے امور کو وہ ہمیشہ قابل اور تجربہ کار لوگوں کے سپرد کرتا۔ نااہلوں کا اس کے دربار میں کوئی گزر نہ تھا۔ بلکہ جب تک لوگوں کی قابلیت، تقویٰ، پرہیزگاری کا اعتبار نہ ہو جاتا، عمال و عہدہ داروں کا تقرر ہی نہ کیا جاتا، تقرر کے بعد بھی کوئی ملازم صفات مذکورہ سے خالی پایا جاتا، اسے

معزول کر دیا جاتا۔

بلبن پابند صوم و صلوٰۃ تھا اور جماعت کا بھی اہتمام کرتا تھا، حدیث شریف "تارک الجماعۃ ملعون" کے پیش نظر تارک جماعت کو لعین سمجھتا تھا۔ نوافل تہجد تک ادا کرتا تھا، قرآن مجید کی تلاوت کرتا، جہاں مجلس وعظ دیکھتا سواری سے اتر کر وعظ سنتا اور اثر پذیر ہو کر رقت سے روتا، نماز جنازہ میں شامل ہوتا، ورثائے میت کی تعزیت کرتا، انعام دیتا اور وظیفہ بھی بحال رکھتا، یاد مرگ کے لئے زیارت قبور کرتا اور کبھی بے وضو نہ رہتا۔

بلبن پابند شرع ہونے کے ساتھ انتظام مملکت میں سختی برتتا تھا اور ظلم و جبر کے توڑنے میں شدت کا روادار تھا، ملک کا امن و چین اور رعایا کی خوشحالی اسے دل سے عزیز تھی، مشہور مورخ ضیا برنی اور دیگر مورخین نے لکھا کہ ایسا امن و امان قائم ہوا کہ قفل و کلید کی ضرورت نہ رہی، چور ڈاکو ایسے مفقود ہوئے کہ مسافرین ہاتھ میں سونا چھالتے چلے جاتے۔ ملک زراعت تجارت، صنعت و حرفت، انصاف و دادگستری سے ایسا آباد ہوا کہ ہندوستان کے چند بادشاہوں کے سوا کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

تاریخ فیروز شاہی میں درج ہے کہ بعض امراء نے لالچ یا خوشامد سے ایک دن عرض کیا کہ کئی ہندو راجگان اب تک مطیع نہیں ہوئے اگر حضور توجہ فرمائیں تو ملکی و مالی فوائد حاصل ہوں گے" مآل اندیش و مدبر بلبن نے جواب دیا" میں بخوبی جانتا ہوں کہ راجگان ہندوستان کو شکست دینے اور مطیع کرنے کے لئے ۶ یا ۷ ہزار تربیت یافتہ فوج کافی ہے لیکن بعد فتح اگر واپس چلا آتا ہے تو مردم آزاری اور جابرانہ تاخت و تاراج کے سوا کچھ اور فائدہ نہیں، نیز اگر میں جدید فتوحات کے درپے رہوں تو میری غریب رعایا کا کون محافظ ہوگا۔ تازہ فتوحات سے بہتر یہ ہے کہ موجودہ ملک کو دشمن کے ہاتھ سے بچایا جائے، رعیت کی بہبودی اور امن و امان کے وسائل کو وسیع پیمانے پر مہیا کیا جائے اور ظالم حکام سے مظلوم کو نجات دلائی جائے، ہر ملک کی ترقی مال و دولت رعایا کی آسودگی اطمینان قلبی اور تسلی خاطر پر ہے جس کا مدار نیک نیت سلطان کے عدل و انصاف اور اعلیٰ درجہ کے نظم و نسق پر موقوف ہے، تاکہ صرف بیرونی حملہ آوروں سے ہی رعایا کو نجات نہ مل سکے بلکہ اندرونی مفسد، چور، ڈاکو، رشوت خور اور ظالم، رعیت کو ستا نہ سکیں۔ میرے نزدیک تازہ فتوحات کے مقابلے میں مقبوضہ ملک کا بہتر انتظام ضروری ہے۔"

بیدار مغز، عادل و رعایا پرور سلطان کی یہ تقریر سن کر تمام درباری دنگ رہ گئے۔

بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد سلطان، علم دوست، سرپرست علوم و فنون اور خادم علماء و صوفیاء تھا۔ حضرت امیر خسرو کو شہزادہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا اور وہی اس کی علمی و ادبی مجالس کے روح رواں تھے۔ بلبن شہزادے کو بہت عزیز رکھتا اور بقول ضیاء برنی بلبن نے مندرجہ ذیل نصیحتیں شہزادہ کو خود بطور وصیت لکھوائیں۔

۱۔ جب تخت نشین ہو تو جہانداری کو آسان و خفیف نہ جانو، بُرے اعمال اور رذیل عادات سے بادشاہی عزت و وقار کو بٹہ نہ لگاؤ۔

۲۔ اغراض نفسانی سے پرہیز کرو، ہر کام خدا کی رضا مندی اور اطاعت کے لئے کرو۔

۳۔ شاہی خزانوں کو رفاہ عامہ اور ترقی علوم و فنون، حصول رضائے الٰہی اور مطابق شریعت رسالت پناہی خرچ کرنا۔

۴۔ عہدہ داران و ملازمان شاہی کے حالات و حرکات سے ہمیشہ باخبر رہنا، ان کے محاسن اخلاق و فضائل کے لحاظ سے انہیں ترقی و انعام و اکرام دینا اور رعایا کو ستانے والے اور جبر و تشدد کرنے والے ظالموں کو معزول و معتوب کرنا۔

۵۔ قاضی و حکام متدین، متقی و خدا ترس مقرر کرنا تاکہ ملک میں عدل و انصاف، خدا ترسی و دینداری کا رواج ہو۔

۶۔ نیک اندیش صلحاء و علماء، زہاد و عباد کی امداد و دستگیری و خاطر داری میں کوتاہی نہ کرنا اہل حرفہ و صنعت و لائق اشخاص کی تربیت کرنا تاکہ ملک کی ترقی و رعایا کی خوشحالی زیادہ ہو۔

۷۔ عاقلوں کی مشورت بغیر کسی کام کا عزم نہ کرو، مجلس شوریٰ کے پابند رہو، جو کام ماتحت کر سکتے ہوں وہ کام خود نہ کرو۔

یہ نصیحتیں بلبن کے تجربہ کا نچوڑ ہیں۔ بلبن نے اپنے طویل عہد حکومت میں ان پر عمل کیا اور اپنے ولیعہد کو بطور دستور العمل لکھوا دیا جو ملک کے بہتر انتظام اور ترقی کی ضامن تھیں اور ملک کا امن و امان، رعایا کی خوش حالی، عدل و انصاف کا رواج اور علمی ترقی یہ سب کچھ ان پر عمل کرنے میں مضمر تھا۔

نظر اُن کی نظر اپنی، پسند اُن کی پسند اپنی
نظر اپنی، پسند اپنی، نہیں ہوتی محبت میں

پریس انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا

حکیم اجمل خاں

بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے دہے میں کچھ انقلابی اور کچھ سیاسی و نیم سیاسی تنظیمیں برطانوی سامراج کے خلاف سرگرم تھیں۔ ان میں انڈین نیشنل کانگریس، تحریک خلافت مسلم لیگ، سوراج پارٹی، ہندو مہا سبھا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے اس پس منظر میں حکیم اجمل خاں میدان میں آئے۔ ایک طرف وہ انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تاحیات ممبر رہے تو دوسری طرف وہ تحریک خلافت کے روح رواں تھے۔

خلافت تحریک ہندو مسلم اتحاد کا ایک موثر ذریعہ بن گئی تھی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور حکیم محمد اجمل خاں خلافت کمیٹی کے صف اول کے قائدین میں سے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے تمام بڑے رہنما مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو سی۔ آر۔ داس، پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد اس تحریک کے حامی تھے۔ اس تحریک نے ہندوستان بھر میں انگریزوں کے خلاف ایک عوامی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

اس زمانہ میں کانگریس اور مسلم لیگ دو مدمقابل سیاسی جماعتیں نہ تھیں۔ ان دونوں جماعتوں کے کئی اجلاس ایک ہی موقع پر ایک ہی شہر میں ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کے اور حکیم اجمل خاں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ حکیم صاحب نے اپنے خطبہ میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ عیدالاضحیٰ پر گائے کی قربانی نہ کریں۔ آپ نے یاد دلایا کہ گائے کی قربانی ایسی چیز نہیں کہ وہ مذہباً ناگزیر ہو۔ اسلامی ممالک میں کروڑوں مسلمان گائے کی قربانی نہیں کرتے

منجھا ایسا کرنا لازم ہے۔ اجلاس میں مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کر کے حکیم صاحب خیال کی تائید کی۔ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کو جس سے بڑا حوصلہ ملا۔ مہاتما گاندھی ـ انڈیا میں اس تجویز کی تعریف کی۔

ستمبر 1920ء میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں مہاتما گاندھی نے ترک موالات ون) کی تجویز پیش کی۔ اس کی تائید کرنے والوں میں حکیم اجمل خاں تھے۔ مسلم لیگ، علماء اور خلافت کمیٹی نے بھی اس کی حمایت کی۔ جلد ہی یہ تحریک ملک بھر میں پھیل گئی۔ حب نے سرکاری خطاب حاذق الملک واپس کر دیا۔ لیکن ایک ہی ماہ بعد کانپور میں علماء کے اجلاس نے انھیں قوم کی طرف سے مسیح الملک کا خطاب دیا۔ 1921ء میں ب نے احمد آباد میں کانگریس اور خلافت کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کی۔ کانگریس کے خطبۂ صدارت وں نے پیشین گوئی کی "ہمارا ملک اس وقت درد و کرب کی حالت میں پیچ و تاب ہے۔ مگر یہ پیشین گوئی کرنے کے لئے کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں کہ یہ اس نوجوان ہند کی پیدائش ہے جو ہمارے قدیم ملک کی روایات کو اجاگر کر دے گا اور اقوام عالم میں بلند مقام کرے گا"۔ کانگریس کے اس اجلاس میں حکیم صاحب کی صدارت میں انفرادی سیول نافرمانی یرہ کی تجویز منظور کی گئی۔

اپنے دور کی دوسری سیاسی، نیم سیاسی اور انقلابی تنظیموں سے بھی حکیم صاحب کا خاص رابطہ یسی ہی تنظیموں میں ایک نظارت المعارف تھی۔ یہ ادارہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح ایت پر 1914ء میں مولانا عبید اللہ سندھی نے قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ شیخ الہند کی خفیہ بی تحریک کے لئے ایک طرح کا رابطہ دفتر تھا۔ حکیم اجمل خاں اس کے سرپرستوں میں تھے ست علماء ہند سے بھی حکیم اجمل خاں قریبی طور پر وابستہ تھے۔ اس کے خصوصی اجلاس بلس علماء کی عاملہ کی میٹنگوں میں شرکت کرتے تھے۔

یمی خدمات

حکیم اجمل خاں گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ تعلیم کا میدان بھی ان کی خدمات سے خالی نہ رہا۔ وہ جدید علوم کے مخالف نہ تھے لیکن لوم کے غلط اثرات اور مغرب پرستی کے خلاف تھے۔ لارڈ میکالے نے ہندوستان میں ا نظام رائج کیا تھا اس کا مقصد ایسے لوگوں کا ایک طبقہ پیدا کرنا تھا جو جسم کے لحاظ ہندوستانی ہو لیکن جس کے سوچنے کا ڈھنگ انگریزی ہو۔ حکمراں طبقہ کی اغراض کی کے لئے رائج کردہ اس نظام تعلیم سے انحراف کے طور پر علی گڑھ میں اکتوبر 1920ء میں

یک قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ وجود میں آئی۔ حکیم اجمل خاں شروع ہی سے اس کے سرپرست رہے ہیں۔ دسمبر 1921ء میں اس کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا تھا۔

"ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا ایک بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلباء کے لئے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلباء بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں کیونکہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی افہام و تفہیم پر منحصر ہے۔"

جامعہ ملیہ، قومی نظریہ تعلیم کی پہلی مثال ہے جس میں ملک کے تقاضوں اور اس ملک کے عوام کی امنگوں کا بھی لحاظ رکھا گیا۔ حکیم اجمل خاں نے مختلف مواقع پر اپنے تعلیمی نظریات کا اظہار کیا۔ وہ ایک طرف قدیم نظام تعلیم کی کوتاہیوں سے آگاہ تھے۔ اور دوسری طرف جدید علوم و فنون کو قومی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مذہبی اور مشرقی علوم میں ان کا رجحان ندوۃ العلماء کی طرف تھا۔ جہاں جدید و قدیم علوم کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی گئی۔ حکیم صاحب 1910ء سے 1925ء تک ندوہ کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔

طبی کارنامے

حکیم اجمل خاں خاندانی طبیب تھے۔ وہ اگر چاہتے تو محض اپنی شہرت کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ اٹھاتے۔ لیکن انھوں نے آغاز ہی سے اس پیشہ کو انسانی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھا۔ انھوں نے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے علاج سے بھی بھاری رقوم حاصل کیں اور یہی رقوم بڑی دریا دلی سے قومی اور رفاہی کاموں پر خرچ کیں۔ وہ غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے بلکہ اپنی جیب سے مریضوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

یہ درست ہے کہ طبی تاریخ میں حکیم صاحب کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ حکیم صاحب کی کوششوں سے 1916ء میں نواب اسعد علی نے امپیریل کونسل میں طب قدیم کی حمایت میں ایک ریزولیوشن پیش کیا جس کے ذریعہ یونانی اور آیورویدک طریقۂ علاج کو قانونی حیثیت حاصل ہوئی دیسی طب کو مدون کرنے، اس کی تعلیم کو سائنسی تجربات سے مالامال کرنے اور طبی تعلیم کو فروغ دینے میں حکیم صاحب نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ ان کو وراثت میں مدرسۂ طبیہ

اصطلاحات کیں۔ اردو زبان میں ڈاکٹری کی تعلیم [illegible] جدید بنانے کی غرض سے کئی
تانومی (تشریح الابدان) اور میٹیریا میڈیکا (علم الادویہ) اور علم الامراض سے متعلق
انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا۔ حکیم صاحب کا سب سے بڑا طبی کارنامہ طبیہ کالج کا
۲۹ مارچ 1916ء کو قرول باغ میں لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھوں طبیہ کالج کا سنگ بنیاد
طبیہ کالج کی عمارت کا افتتاح 1921ء میں مہاتما گاندھی نے کیا۔ حکیم صاحب
اپنا ذاتی اور خاندانی سرمایہ سب کچھ طبیہ کالج کے لئے وقف کر دیا۔

ہندوستانی دواخانہ حکیم صاحب کی دوسری بڑی یادگار ہے۔ 1903ء میں اس
ان کے خاندان نے رکھی۔ لیکن بعد میں جب حکیم صاحب اس کے سرپرست قرار پائے
نے اسے ایک بڑے پیمانہ کا ادارہ بنا دیا جہاں دوا سازی جدید اصولوں پر ہوتی تھی
آپ نے فن طب میں کئی تصنیفات چھوڑی ہیں جن میں "حاذق" خاص طور پر قابل ذکر
یہ طبی تصنیف دراصل طب یونانی کا خلاصہ اور خاندان شریفی کا مکمل دستور العلاج ہے
جب علم کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کی فرسودہ مشرقی روایت کے خلاف تھے۔ اس لئے
اس میں بڑی فراخ دلی سے طبی نسخوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

حکیم اجمل خاں کو شعر و شاعری سے خاص مناسبت تھی۔ شیدا تخلص تھا۔ اردو فارسی کلام
کا ایک مختصر مجموعہ یادگار چھوڑا ہے۔

ش | حکیم صاحب نے دلی کے ایک رئیس، عالی رتبہ اور طبیبوں کے مشہور تاریخی خاندان میں
1863ء میں جنم لیا۔ ان کے والد حکیم غلام محمود خاں اعظم جو اپنے دور کے مشہور
تھے، غدر 1857ء کی آزمائش سے گزر چکے تھے۔

حکیم اجمل خاں کے آباو اجداد بابر کے عہد میں ہندوستان آئے۔ تزک بابری میں اس
کا ذکر ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی تاریخ میں اس خاندان کا تذکرہ کیا ہے
مغل بادشاہوں کے عہد میں اس خاندان کے مختلف افراد اونچے عہدوں پر فائز رہے
اس خاندان کے ایک فرد حکیم اشرف خاں تھے جن کے نام سے یہ خاندان، خاندان
اشرفی کے نام سے منسوب ہوا۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں انہیں پانی پت اور فراسنہ کے
میں 25 ہزار روپئے کی جاگیر ملی تھی۔ انہیں اشرف الحکماء کے خطاب سے بھی
نوازا گیا تھا۔ حکیم اجمل خاں، حکیم شریف خاں ہی کے پرپوتے تھے۔

تربیت | حکیم اجمل خاں کی تعلیم و تربیت روایتی ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ قرآن حکیم

حفظ کیا۔ اور عربی ادب پڑھا۔ منطق اور فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ طب کی کتابیں اپنے بھائیوں سے پڑھیں اور طب کی عملی تربیت اپنے والد حکیم محمود خاں اور بڑے بھائی حکیم واصل خاں سے حاصل کی۔ خوش نویسی کی بھی مشق کی۔ اس زمانے میں انگریزی پڑھنا ان کے خاندان میں معیوب سمجھا جاتا تھا اس لئے باقاعدہ انگریزی نہ پڑھ سکے لیکن اپنے ذاتی شوق سے انگریزی میں کافی قابلیت پیدا کرلی۔ جوانی میں ورزش اور کشتی کا بھی شوق تھا۔

حکیم صاحب کی عربی دانی کے متعلق شفاء الملک حکیم رشید احمد خاں لکھتے ہیں :

" عربی علم و ادب اور معانی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ محض عربی داں ہی نہیں بلکہ عربی کے ایک قادر الکلام اور فصیح و بلیغ ادیب تھے ۔ وہ ہر عرب اور ہر ایک متبحر عالم و ادیب سے عربی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے"۔

وفات دسمبر 1927ء میں حکیم اجمل خاں رام پور گئے تھے، اس زمانے میں حکیم صاحب کی صحت کافی گری ہوئی تھی۔ 28 اور 29 دسمبر کی درمیانی رات کو دل کا دورہ پڑا اور حکیم صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی عمر 64 برس تھی۔ انھوں نے تقریباً 40 برس تک ملک و قوم کی خدمت انجام دی اور ہماری تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ پنڈت نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے" کانگریس کے صدر کی حیثیت سے وہ اس کے ایک بڑے مدبر تھے لیکن وہ کچھ اس سے زیادہ بھی تھے۔ انھیں کانگریس کی قیادت میں ایک منفرد مرتبہ حاصل تھا"۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے بارے میں لکھا ہے :

" وہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے ہر ہر جزو میں وہ تناسب اور ہمواری تھی جو اگر کسی ایک جزو میں حاصل ہو جائے تو آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے۔ جس تمدن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے کسی ایک شعبہ کا بھی کمال اگر اس کی ذات میں موجود ہو تو وہ اپنی جماعت کے لئے باعث فخر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی ذات تھی جس میں ہندی اسلامی تمدن کے ہر شعبہ کا کامل نمونہ موجود تھا۔ یہی نہیں کہ جدید تمدن کے اچھے اثرات موجود نہ ہوں، قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی اور دور جدید کی بیداریاں اس ایک ذات میں آکر مل گئی تھی۔ ایک اجمل خاں کی ذات تھی جس کی جڑیں اسلامی تمدن کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر نئے باغوں کے پھول بھی شرما جاتے تھے۔ ہر شعبہ تمدن میں، طب ہو کہ علم سیاست، معاشرت و مذہب ہو یا فنون لطیفہ، وہ سب میں مستند تھا اور مجتہد بھی۔ "

مغل حکمرانوں نے شکار کو فوج کی تربیت رعایا کی خبرگیری اور انتظامیہ کی اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا

دابخش لائبریری میں ڈاکٹر جاوید اشرف شعبۂ حیاتیات جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے
ہندستان میں شکار کی سیاسی و سماجی اہمیت پر لکچر دیتے ہوئے فرمایا کہ مغل حکمرانوں نے
فوج کی تربیت، رعایا کی خبرگیری اور انتظامیہ پر نظر رکھنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ انھوں نے
بری، تزک جہانگیری، رقعات عالمگیری اور متعدد تاریخی کتابوں کے حوالے سے بتایا
مراں شکار کے ذریعہ اپنی فوج کی عملی تربیت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے انشائے ابوالفضل
ہم باب دستور العمل اکبری کا اقتباس پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکبر نے جہاں شکار سے الگ
ہے کہا تھا وہاں فوج کی تربیت کے لئے شکار کی اجازت بھی دے دی تھی۔ انھوں نے
ماخذوں کے اول ماخذ کی روشنی میں پوری تفصیل بتائی کہ کس طرح اکبر کے زمانہ سے لے کر اورنگ
کے بعد تک کے عہد میں شکار کو فوجی تربیت، رعایا کی خبرگیری اور نظم و نسق کی بہتری کے لئے ایک
کے طور پر اختیار کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر اشرف نے مورخین کے اس الزام کی تردید کی کہ مغل حکمراں شکار
ح اوقات اور محض تفریح کے لئے کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ حکمراں جب شکار کے لئے نکلتے تھے تو
ج، درباری امراء اور حکومت کے شعبے ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ بالعموم یہ ان مقامات کی
کھیلنے کے لئے مع لشکر جاتے تھے جن علاقوں میں بغاوت اور سرکشی سر اٹھاتی تھی اور فوج کے
م سفر کرنے کا مطلب ہوتا تھا کہ رسل و رسائل، انتظامیہ اور حکومت کے تمام شعبے کی کارکردگی کا
زہ لیا جا سکے۔ شکار کھیلنے کے بہانے سے یہ اپنی رعایا سے براہ راست ملاقات کرتے جاگیرداروں
کی صلاحیت سے واقف اور رعایا رکھی کہ عہدیداروں کی شکایات سے آگاہی حاصل کرتے
ڈاکٹر جاوید اشرف نے بتایا کہ اگر وہ شکار کھیلنے محض تفریح کے لئے جاتے تو پوری فوج اور دربار

کے ساتھ کھیلے جاتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بادشاہ اپنے شہزادوں کی تربیت بھی شکار کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے ایک رقعات میں لکھا ہے کہ شکار کھیلنا بیکار لوگوں کا کام ہے، لیکن یہ اس شکار سے متعلق ہے جو محض تفریح کے لئے کھیلا جاتا ہے۔ جہاں تک سیاسی، فوجی اور معاشرتی مقصد کے تحت شکار کھیلنے کا معاملہ ہے، اورنگ زیب نے اپنے ایک شہزادے کو لکھا کہ میں شکار پر جا رہا ہوں تم بھی اپنی فوج کے ساتھ وہاں پہنچو تاکہ میں دیکھ سکوں کہ تم نے اپنی فوج کی تربیت کس طرح کی ہے۔ اورنگ زیب نے شکار کھیلنے کے لئے گجرات کا انتخاب کیا جہاں بغاوت کے سر اٹھانے کی اطلاع ملی تھی۔ شکار کھیلنے جاتے وہ پورے ملک کا دورہ کرتے تھے اور متعلقہ جاگیردار اور منصب داروں کی کارکردگی اور ملک کی معاشی و سیاسی حالت سے عملی واقفیت حاصل کرتے تھے۔ شکار کے سفر میں پڑاؤ ڈالتے ان علاقوں کی رعایا کی شکایات سنتے اور انھیں رفع کرنے کے لئے باضابطہ دربار لگاتے تھے۔

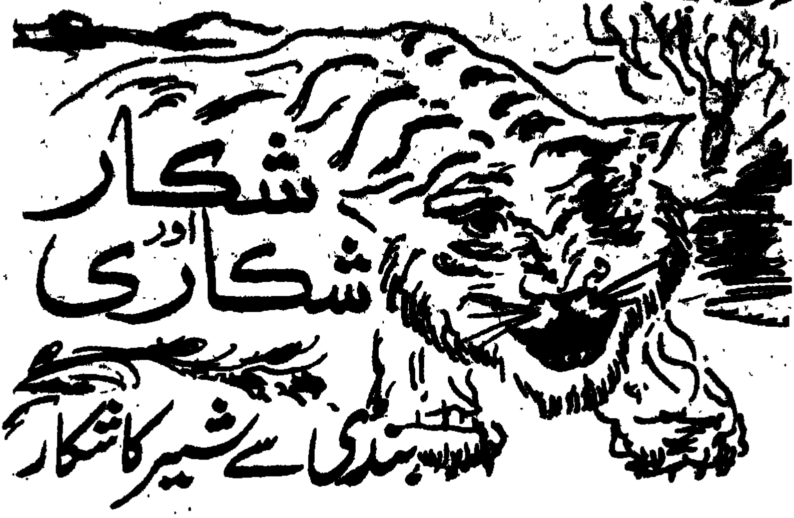
ڈاکٹر اشرف نے ان مورخین کی تردید کی جو مغل حکمرانوں کو لہو و لعب کا دلدادہ بتانے کے لئے بطور ثبوت ان کی شکار سے دلچسپی لینا بتاتے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ مغل بادشاہوں کے یہاں شکار کھیلنے کا ایک ضابطہ تھا جس سے سب واقف ہوتے تھے اور جو ہندوستان کی روایات کی روشنی میں بنایا گیا تھا۔ جہانگیر نامہ کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے جانوروں اور پودوں سے جہانگیر کی محبت کے کئی واقعات بیان کئے۔ ڈاکٹر اشرف نے بتایا کہ ایک بار جہانگیر نے دوران شکار ایک علاقے کے تمام جانوروں کو زندہ پکڑنے کا حکم صادر کیا اور جب سارے جانور پکڑ کر جمع کرلئے گئے تو ان کے کان میں بالی پہنا کر انھیں آزاد کر دیا۔ جانوروں کو زندہ پکڑنے اور پھر انھیں آزاد کر دینے کی اصل وجہ فوج کی تربیت کرنا تھی۔

ڈاکٹر اشرف نے بتایا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ شکاریات کے اہم مقاصد سے خوب واقف تھی اس لئے اس نے نواب واجد علی شاہ کو فوج کے ساتھ شکار کھیلنے کی ممانعت کر دی تھی لیکن تنہا اور چند درباریوں کے ساتھ تفریحاً شکار کھیلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

ڈاکٹر اشرف نے لکچر کے دوران خدا بخش کے نادر مخطوطہ "تاریخ خاندان تیموریہ" سے دو اہم پینٹنگ کے رنگین سلائیڈ دکھائے کہ کس طرح پوری وادی کا محاصرہ کر کے جانوروں کو گرفتار کیا جاتا تھا۔ اس کی نوعیت اس معرکہ آرائی کی سی ہوتی تھی جس میں چاروں طرف سے فوج دشمن کا محاصرہ کرتی۔

ڈاکٹر اشرف کے لکچر کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے استاد سری رام شرما اور اس شعبہ کے ایم۔ اے کے طلبہ نے کئی سوالات کئے جن کا واضح جواب دیا گیا۔

باقی صفحہ [illegible]



شکار اور شکاری

بنڈی سے شیر کا شکار

بنڈی سے شیر کا شکار بعض دفعہ بڑا پر لطف ہوتا ہے ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ بیل
...تہ اور مضبوط اور چلانے والا جنگل کے راستوں سے واقف اور ہوشیار ہو۔ بنڈی بھی مضبوط بنی
...ہو جو ٹیلوں، ٹیکروں، نالوں، پتھروں اور نشیب و فراز پر اچھی طرح چل سکے۔ بنڈی کا اریں لوہے
...نا چاہئے۔ ورنہ لکڑی کا اریں بعض دفعہ دھوکہ دے جاتا ہے۔ بیلوں کو ناتھیاں بھی ہونی چاہئیں
...یں چلانے والے کے علاوہ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو شکاری بیٹھیں ورنہ پھرتی سے ادھر
...مڑنا اور بندوق گھمانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ عادل آباد میں کچھ شکاری دوست میرے
پہونچے۔ عادل آباد سے قریب موالہ کے علاقہ میں دو مویشی خوار شیر کافی نقصان پہونچا رہے
۔ سردی کا زمانہ اور نومبر کا مہینہ تھا۔ سانبھر، چیتل کے خیال سے دو صاحب ایک بنڈی میں اور ایک صاحب
بنڈی میں ۲ بجے رات سے روانہ ہوئے۔ یہ بنڈیاں موالہ کے تالاب کے عقبی جنگل میں مگر مختلف سمتوں
...جنگل میں اور ایک دوست گھر پر ہی تھے ½ ۸ بجے کے قریب ایک بنڈی واپس آئی جس میں ایک صاحب
تھے۔ یہ بنڈی عادل آباد کا مقامی شکاری سید پادشاہ چلا رہا تھا جو میرے دوست ثناء اللہ خاں مرحوم
...بہ شکاری کے ساتھ شیر کے پیدل شکار میں ہمیشہ رہا کرتا تھا۔ صاحب موصوف نے آکر بیان کیا کہ ان کو ½ ۷ بجے
...شیر ایک مقام پر نظر آئے اور ہمارے مکان سے صرف ۳ میل کے فاصلے پر۔ جب ان کی بنڈی
...کچھ راستہ پر چل رہی تھی بازو کی جھاڑیوں میں سے پہلے ایک زبردست شیر نے منہ نکالا۔
سید پادشاہ نے بنڈی ... اور ان سے کہا کہ ماریئے۔ (۵۰۰) اکسپریس ان کے ہاتھ میں تھی۔ موصوف نے
کہا کہ اس طرح بنڈی سے یا پیدل انہوں نے شیر کبھی نہیں مارا اس لئے مناسب نہیں کہ فائر کیا جا

اس کے بعد سید پاشاہ نے ہنڈی آگے بڑھائی۔ جونہی ہنڈی بائیں ہاتھ کی طرف ایک گلی میں سے گزر رہی تھی دو شیر بیٹھے ہوئے ان کو نظر آئے۔ یہ سب بیت الشان سے ہنڈی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سید پاشاہ نے پھر ہنڈی شیروں سے ۵ گز پہ روک لی اور کہا کہ پیچھے والے شیر پر فائر کیجئے۔ سامنے والے خود بھاگ جائیں گے۔ موصوف نے دغا لیا [illegible] ان حالات میں فائر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہنڈی اور آگے چلی اور اس کے بعد [illegible] کی طرف سے پھر ایک شیر نے منہ نکالا۔ اس کے بعد یہ لوگ سیدھے کیمپ کو واپس ہوگئے اور ہم کو اطلاع کیا۔ اتنے میں دوسری ہنڈی جس میں دو صاحب گئے تھے واپس آ گئی۔ اب ایک کونسل آف وار منعقد کی گئی کہ کس طرح ان شیروں کو قابو میں لایا جائے۔ سید بادشاہ نے کہا کہ جس جنگل میں یہ شیر ہیں ایسا ہے کہ وہاں سے شام ہونے تک شیر باہر نہیں جائیں گے۔ اور اب بھی ہم جائیں تو شیر مل سکتے ہیں۔ چنانچہ فوراً انہیں دو ہنڈیوں میں ہم لوگ روانہ ہوئے۔ ایک ہنڈی کو جس کو سید بادشاہ کا بیٹا چلا رہا تھا دو صاحب جو شیر دیکھ کر آئے تھے اور میں بیٹھے۔ میرے پاس (۴۰۰/۴۵۰) اور ان کے پاس (۵۰۰) اکسپریس بندوق تھی۔ دوسری ہنڈی میں جس کو سید بادشاہ چلا رہا تھا تین صاحبین بیٹھے ایک صاحب کے پاس (۳۳۳) جیفری اور ایک صاحب کے پاس (۴۰۴) میگزین بندوق تھی ایک (۳۰) اسپرنگفیلڈ بھی اسپیر اسی ہنڈی میں تھی۔ اتفاق سے یہ ہنڈی بہت بڑی اور محفوظ اور تین طرف سے تختوں سے گھری ہوئی تھی۔ بڑی تیزی کے ساتھ ہم لوگ کوئی ایک گھنٹہ میں اس جنگل میں پہنچ گئے۔

سید بادشاہ اور اس کا لڑکا بڑی ہوشیاری سے کارے کاٹتے ہوئے اس مقام کی طرف لے چلے جہاں شیر نظر آئے تھے۔ درختوں پر متعدد گدھوں کی موجودگی اس مقام کی دور سے نشاندہی کر رہی تھی جہاں شیروں نے جانور مارا تھا۔ ہر مرتبہ دائرہ چھوٹا کرتے ہوئے ہنڈیاں بالآخر اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں ایک بیل کی ٹانگ اور کچھ ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ لمحے بڑے سنسنی خیز تھے۔ ہر قدم پر توقع تھی کہ اب شیر نظر آئیں گے۔ ہر شکاری بندوق تیار لئے فائرنگ پوزیشن اختیار کئے ہوئے تھا۔ مگر کافی چکر کاٹنے اور تلاش کے باوجود شیر نظر نہیں آئے۔ ہنڈیوں سے اتر کر ہم نے اس مقام کا معائنہ کیا۔ بیل کی اگلی ٹانگ کے نصف حصہ کے سوا اور کوئی گوشت کا حصہ بچا ہوا نہ تھا۔ (۸-۸، ۱۰،۱۰) قدم کے فاصلے پر کچھ ہڈیاں وغیرہ پڑی ہوئی تھیں جس سے پایا جاتا تھا کہ کوئی شیر جانور کی تکا بوٹی کر کے کھا گیا شیروں کے نہ ملنے کا کافی ملال رہا۔ رائے یہ قرار پائی کہ ایک گارا اس مقام پر باندھ دیا جائے۔ اور دوسرے دن سورج نکلنے سے قبل ہنڈیوں پر یہاں پہنچنا چاہئے۔ چنانچہ ایک گارا منگوا کر اسی مقام پر باندھ دیا گیا جہاں ہڈیاں اور ٹانگ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم واپس آ گئے۔ ۲ بجے رات سے

ٹیاں اس مقام سے آدھے میل کے فاصلے پر بھیج دی گئیں کہ وہاں پہنچ کر ٹھیرے رہیں۔
صبح ہم جیپ میں روانہ ہوئے اور ہنڈیوں تک پہنچ کر اس میں سوار ہو گئے۔ شکاریوں کی ترتیب
ا جو پہلے دن تھی۔ اور چلانے والے بھی وہی تھے۔ بڑی احتیاط سے پیرکا وے کاٹتے ہوئے ہماری
ں اس مقام پر پہنچیں جہاں گارا باندھا گیا تھا۔ سورج اب نکلنے ہی والا تھا اور کافی حد تک روشنی
ں۔ ایک مرتبہ پھر مایوسی ہوئی جب گارا صحیح وسالم کھڑا ہوا پایا گیا اور شیروں کا پتہ نہیں۔
بادشاہ کو پھر بھی یقین تھا کہ شیر کہیں دور نہیں جا سکتے۔ وہ ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔ چنانچہ ہر بھی
سے گھاس کے کنج میں ہنڈیاں بڑھائی گئیں۔ جنگل کے بیچ میں یہ کچھ حصہ میدانی تھا جس میں ۳
۴ فٹ اونچی گھاس تھی تقریباً پون گھنٹہ اس گھاس میں تلاشی رہی۔ بالآخر اس کنج کے باہر
ہی تھے کہ چھوٹی جھاڑی میں سے ایک شیر بالکل ہماری طرف کسی قدر سیدھے ہاتھ سے آتا
ا آیا۔ ہماری ہنڈی پیچھے تھی اتفاق سے میری نظر شیر پر پہلے پڑی جو ۴۵ گز پر ہوگا۔
ہ والی ہنڈی شیر سے ۳۰ گز پر ہوگی میں نے ہنڈی والوں کو آہستہ سے اشارا کیا اور خود
ب نے بھی دیکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہنڈیاں رکیں اور (۴۷۰) کا فائر ہوا۔ پہلے فائر پر
یر گر گیا اس کے ساتھ ہی ۳۳۳ کا ایک فائر اور ۴۰۴ کا ایک فائر ہوا۔ شیر ٹھنڈا ہو چکا
زلی نشان کے پیچھے گردن پر لگی تھی۔ یہ اوسط درجہ کا شیر تھا۔ اب بڑے شیر کی تلاش شروع
۔ جس کے متعلق لوگوں نے کہا تھا کہ غیر معمولی سائز کا شیر ہے۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ سب
یر اسی علاقہ میں موجود ہیں۔ یہ ایک نر ایک مادہ اور ۳ اس کے کافی بڑے بچے تھے جو پورے
یر بن چکے تھے۔ پھر ہنڈیاں بڑی احتیاط کے ساتھ چلائی جانے لگیں۔ سیدھے ہاتھ کی جانب
تقریباً (۴۰) گز پر سے ایک شیر نے منہ نکالا۔ ہنڈی والے سے میں نے کہا کہ شیر کے رخ پر
کیں چلے تاکہ جسم کا بھی کچھ حصہ نظر آ سکے۔ ہنڈیاں کچھ ہی آگے بڑھنے پائی تھیں کہ بائیں ہاتھ کی
ف سے ۴۰ گز پر سے ایک اور شیر نے منہ نکالا۔ اس کے سینے کا بھی کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔
یاں روک گئیں اور فوراً ہی سینہ پر فائر کیا گیا۔ شیر نے ایک زبردست ہاؤں کی آواز دی،
ہوا میں ایک قلا بازی کھائی اور اس کے بعد تیزی سے جھاڑی میں بھاگتا ہوا نظر آیا۔ دوسرے
یہ کسی شکاری کو موقع نہیں ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیر جو بغل پر بالمقابل معلوم ہو رہا
جھاڑ کا اور گھاس میں ترکس کھڑا ہوا تھا۔ گولی جو بیچ سینے میں لگی تھی دل کی طرف داخل
نے کی بجائے بائیں مونڈھے کے جوڑ کو توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اب اس زخمی شیر کی تلاش
احتیاط کی طالب تھی۔ اولاً ہم نے پیسے درختوں پر ہنڈی والوں کو چڑھا کر چاروں طرف

نظر دوڑائی گئی۔ ہم کچھ آگے بڑھے اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر شیر نظر نہیں آیا۔ درمیان میں ایک نالہ تھا۔ خیال ہوا کہ شیر نالہ میں گرا ہو۔ واپس چکر کاٹ کر نالہ کی دوسری طرف سے وہاں پہنچے مگر پھر بھی شیر نظر نہ آیا۔ البتہ تقریباً ۱۰۰ گز پرے سے ایک جھاڑی اور گھاس میں ایک اور شیر نظر آیا۔ ممکن تھا کہ یہ زخمی شیر ہی ہو یا حقیقتاً دوسرا ہو۔ کیونکہ وہاں کئی شیر تھے فاصلہ بھی زیادہ تھا اور ایک زخمی شیر کو ختم کئے بغیر مزید ایک کو زخمی کرنے کا امکان نامناسب تھا۔ لہٰذا اس پر فائر نہیں کیا گیا۔ مزید کچھ چکر کاٹے گئے مگر زخمی شیر نظر نہیں آیا۔ رائے یہ ہوئی کہ بھینسوں کا منڈا منگوانا چاہیے چنانچہ منڈا منگوایا گیا جس میں ۲۵ - ۳۰ بھینسیں تھیں۔ اولاً سب ہنڈیوں میں ہی بھینسوں کے پیچھے روانہ ہوئے مگر بھینسیں جس جس طرف سے چلی جا رہی تھیں ہنڈی کا ادھر سے جانا مشکل ہو گیا چنانچہ سب لوگ ہنڈیوں سے اتر گئے اور بھینسوں کے پیچھے پیچھے چلے۔ کوئی (۱۰۰) گز چلے ہوں گے کہ شیر نے آواز دی اور بھینسوں نے فوں فوں کرنا شروع کیا۔ بھینسیں دُم اٹھائی ہوئی اور زمین پر پاؤں مارتی ہوئی آگے بڑھتی رہیں۔ شیر نے پھر آواز دی مگر نظر نہیں آیا۔ یہ آہستہ آہستہ چلتا اور غراتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک مقام ایسا آیا جہاں مختلف پتھر، نالا اور کنکرے تھے۔ بھینسیں ایک طرف نکل گئیں اور اب جو نظر پڑی تو کوئی ۱۵ - ۱۸ گز پر ایک جھاڑ کے کھوکھلے حصہ کی آڑ میں شیر دبا ہوا بیٹھا ہے۔ شیر نے ایک گرجدار آواز دی اور پلٹا۔ بس اس کے ساتھ ہی سب کے فائر ایک دم ہوئے اور شیر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ بڑا شیر پھر بھی نظر نہ آیا۔ بہرحال شکار دلچسپ رہا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بیل مطلق نہ جھجکے۔ بجز اس کے کہ آنکھیں پلٹا کر شیر کی طرف غور سے دیکھتے رہے۔ اور کان کھڑے کرتے رہے اور کوئی اضطراری حرکت بیلوں نے نہ کی۔ جب مرضی روکے اور بڑھائے جاتے رہے یقیناً یہ بیل بہت شائستہ تھے ورنہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بیل بری طرح ہنڈی لے کر بھاگتا ہے۔

ایک دفعہ میں اور مسٹر سری کرشن سنہا کلکٹر اوٹور کے جنگل میں ہنڈی میں روانہ ہوئے۔ صبح ہی ایک بڑا چیتل اور پھر ایک بہت بڑا جنگلی سور دستن پلی کے جنگل میں مار کھایا۔ یہ جانور دوسری ہنڈیوں میں ڈلوائے گئے۔ ہم اور آگے بڑھے۔ ایک طرف سے کچھ درندہ کی بو معلوم ہوئی شکاریوں نے کہا یہ شیر کا مقام ہے۔ نظر کچھ نہیں آیا۔ ہنڈی کا ایک سیاہ بیل جو طاقتور جیسا تھا ہنڈی کو لے کر بے تحاشہ بھاگا اور بالآخر ہنڈی سے علحدہ ہو گیا۔ ہم لوگ گرتے گرتے بچے۔ بڑی مشکل سے پکڑا گیا۔ ڈاک بنگلہ پہنچنے کے بعد بھی بیل مرے ہوئے سور اور چیتل کو دیکھ کر یا نہ معلوم کس وجہ سے پھر بری طرح بپھر کر بھاگا۔ بہرحال ہنڈی پر جنگل میں جانے سے پہلے موزوں بیلوں کا

نہایت ضروری ہے۔ بعض دفعہ جنگل ایسا گھنا ہوتا ہے کہ پگڈنڈی بھی اس میں نہیں گھستی
یک مرتبہ نارلہ پور کے جنگل میں اس اطلاع پر کہ شیر فلاں مقام پر موجود ہے۔ ممتاز علی
ے۔ اور کاظم علی خان صاحب گئے۔ وہاں بعد میں پگڈنڈی میں شیر کی تلاش میں صبح ۷ بجے روانہ
استہ بہت خراب تھا مگر بیل اچھے تھے اور برابر لئے چل رہے تھے۔ شیر کے کھوج کا پتہ بھی
ہو رہا تھا۔ بالکل تازہ ماگھ اور شیر کے تازہ پیشاب کا ڈھیرہ اس کی قریب میں موجودگی
ت دے رہے تھے۔ دو مرتبہ شیر نے قریب سے آواز بھی دی مگر نظر نہیں آیا۔ وہ آگے آگے
ا اور ہم پیچھے پیچھے تھے۔ کچھ فاصلے تک وہ پگڈنڈیوں کے راستہ پر ہی چلتا رہا مگر بالآخر ایک
جھاڑی میں مڑ گیا۔ ہم نے اس کے ماگھ دیکھ کر جہاں پگڈنڈی ختم ہوئی اور جہاں جہاں طرف نظر
مگر شیر نظر نہ آیا۔ جھاڑی اس قدر گھنی تھی کہ پگڈنڈی کا راستہ چھوڑ کر اندر مڑنا بلکہ پیدل جانا
ر تھا۔ کچھ اور آگے جاکر پلٹ آئے۔ واپسی میں کاظم علی خان صاحب نے ملگ کے جنگل
یں ایک جنگلی مرغی شکار کی۔ ممتاز علی صاحب نے اس کے پیٹ کی آنتیں وغیرہ اسپرٹ
کر کے جراثیم کے تجربہ کے لئے علی گڑھ کی لیبوریٹری کو روانہ کیں اور کھال اور سر اسلف
ین انگن کو روانہ کیا۔

ی دفعہ موٹر میں جنگل میں سے گزرتے وقت شیر سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ ملگ کے
ا ایک مرتبہ دو شیر مویشی خوار مشتہر کئے گئے۔ مسٹر وی۔ پی۔ نائر ڈی ایف او نے تجویز
ن شیروں کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں، نائر اور مسٹر جال نوریا ورنگل سے
یپ میں روانہ ہوئے۔ جاتے وقت تو کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی جیسا کہ ورنگل میں عموماً
ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ہم لوگ معمولی خاکی قمیص پہنے ہوئے تھے اور کوٹ وغیرہ کوئی گرم
پہنا تھا تا ماڑوائی تک جاکر واپس آنے تک آدھی رات گزر چکی تھی اور کافی سردی
ی۔ دستیاں کانوں پر لپیٹنے کی نوبت آئی۔ نائر نے دو بڑے چپتل مارے تھے جن سے
ر جب تک کوئی بڑا جانور یعنی سانبھر یا شیر نظر نہ آئے ایک (۴۰۰/۴۵۰) نہیں چلا سکیں گا۔
نتظار بہت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ ہم ملگ اور جیوانی کے درمیان جنگال پل پر لمبا صوائی کی
ڈی کے پاس تقریباً ۴ بجے رات کو پہنچے۔ اس ڈوڈی میں مختلف لوگوں نے تقریباً (۲۰-۳)
رات میں رکھے جاتے ہیں اور معلوم ہوا تھا کہ مویشی خوار شیر اس ڈوڈی کے قریب دو چار
لیشا کی تاک میں گھومتا رہتا ہے۔ ہم احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بڑھ رہے
آگے بڑھا چلا رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ کی طرف میں بیٹھا ہوا تھا اور [illegible]

تھے۔ بائیں ہاتھ کی طرف کی جھاڑیوں میں سے ایک شیر (۷۰) گز کے فاصلہ پر نکلا اور پہلے تو سڑک کی طرف کا رخ کیا اور پھر پلٹ کر اس طرف جانے لگا جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس طرح اس کی دم ہماری طرف ہوگئی۔ ہم اس کے پیچھے (۵۰-۴۰) گز کے فاصلہ پر جیپ آہستہ کر کے چلنے لگے۔ میں نے ناصر سے کہا جونہی شیر کسی ایک سمت کو پہلے گاڑی روک لیں تاکہ نشانہ اچھا لیا جا سکے۔ اتنے میں شیر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ کر سڑک پر آڑا ہوگیا اور تیز قدم سیدھے ہاتھ کی طرف جھاڑی کا رخ کیا۔ ناصر نے گاڑی روکی اور میں نے فوراً بھال کا نشانہ لے کر ۶ انچ آگے بڑھا کر فائر کیا۔ فائر کے ساتھ ہی شیر نے زور کی آواز دی اور ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور نیچے گرا۔ گرنے میں اس کا منہ ہماری طرف ہوگیا اور وہ جیپ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ اتنے میں بائیں نال میں نے گردن پر چلائی اور پھر شیر گر کر آڑا ہوگیا۔ بندوق پھر لوڈ کر کے ہم تیار رہے اور چند منٹ انتظار کیا۔ جیپ سے اتر کر چند پتھر اس پر پھینکے مگر شیر نہ ہلا۔ مر چکا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کو جیپ میں ڈالا گیا اس کے سیدھے ہاتھ کا ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ صبح چھیلنے پر معلوم ہوا کہ ناخن کی جگہ پر ڈیڑھ انچ گہرا زخم پڑا ہوا تھا۔ جس میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔ غالباً یہی وجہ اس کی مویشی خوری کی تھی۔

سلسلہ صفحہ ۳۸

حضرت امیر خسروؒ دین و دنیا کا سنگم تھے۔ آپ کی ذات گوناگوں خصوصیات، متنوع کمالات اور محیرالعقول کارناموں سے بھری ہوئی تھی جس میں مختلف تہذیب و تمدن سمو دیئے گئے تھے۔ نیز وہ صاحب دل، دردمند اور حب الوطن من الایمان کی مکمل تصویر اور ہندوستانیت سے لبریز تھے۔ ایک طرف درباری زندگی سے آپ کا ایسا گہرا تعلق تھا جہاں ہمیشہ عزت و احترام اور شان و شوکت سے رہے۔ دوسری طرف صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے۔ آپ پر روحانیت و فقر کا ایسا غلبہ تھا جیسے دنیا میں کوئی تعلق ہی نہیں ہے آٹھ سال کی عمر میں حصول بیعت کے باوجود ۱۲۰۲ء میں ان کی مزید تجدید پر پیر و مرشد نے سلسلہ نظامیہ کی چار گوشہ ٹوپی سے سرفراز فرمایا جس نے دوآتشہ کا کام کیا اور دل پر درد جو نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جان پرسوز کا حامل تھا۔ ان تمام اوصاف اور اصناف سخن پر محیط اور وسعت قلب کے ساتھ شاعری میں نظامیہ صوفیت کا ترجمان بن گیا۔ (ڈاکٹر محمد مظفر) ...

محمد مرتضیٰ علی خاں ناغرؔ

سراغ رسانی اور تفتیش

مافات بلدہ کے بنگلوں میں چوری کرنے والا چور

۱۹۴۰ء میں شہر یعنے بلدہ حیدرآباد دکن کے اطراف میں حدود اضلاع پولیس میں معززین کے ...یں سرقہ کی وارداتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور تقریباً اس کا سلسلہ ایک سال تک ...ہا ۔ باوجود کوشش کے پولیس اطراف بلدہ و خفیہ پولیس اضلاع سارقین کا پتہ نہ چلا سکی ۔ ...ن صاحب اس وقت صدر المہام کوتوالی تھے ۔ اور اکثر مستغیثین ذی اثر سرکاری عہدہ دار یا ...کندر آباد و حیدرآباد کے بہت با اثر کاروباری اشخاص تھے ۔ اس لئے یہ وارداتیں پولیس اضلاع ایک درد سر بن گئی تھیں ۔ اس وقت ریاست حیدرآباد کی صدارت عظمیٰ یعنی چیف منسٹری پر ...حیدری فائز تھے ۔ ان کے صاحبزادے محمود حیدری کے جو ریلوے کے عہدہ دار تھے چوری ہوئی ۔ ...دری صاحب کی بیوی کی انگوٹھی ان کے گھر سے چرالی گئی ۔ اب سارق کی گرفتاری کے لئے پولیس معروف ہوگئی ۔ خفیہ پولیس اضلاع کے مولوی مومن خاں صاحب کو ان مقدمات کی تفتیش کے لئے ...ص مقرر کیا گیا ۔ کرافٹن صاحب نے نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ کو امداد دینے بطور خاص ...یا ۔ مومن خاں صاحب جو والد صاحب قبلہ کے گہرے دوست تھے، سٹی پولیس سی آئی ڈی کے ...ہ تمام مسلے کر آگئے اور تمام وارداتوں کا ایک تختہ مرتب ہوا ۔

اس تختے سے دو تین باتیں عیاں تھیں کہ سارق یا سارقین ایک نصف دائرہ میں شہر حیدرآباد کے ...یب سعید آباد سے لے کر بیگم پیٹ سے ہوتے ہوئے فرسٹ لانسرز تک مصروف کار تھے اور دوسری تھی کہ وہ معززین اور صرف معززین کے بنگلوں میں چوری کرتے تھے ۔

اور تیسری ایک اور اہم بات یہ تھی کہ ہر واردات میں وہ کوئی نہ کوئی بچکانی قسم کی حرکات ضرور ...تے تھے ۔ مثلاً سراج جنگ بہادر کے بنگلہ میں سارق بچوں کے کھیلنے کے ایک کافور کے بڑے گڈے ...ی اٹھا لے گیا ۔ اور فرش خراب کر گیا تھا ۔ نواب جیون یار جنگ بہادر کے بنگلہ میں نہ معلوم ...طرح وہ ایک صوفہ کی گدی کے اوپر کے حصہ کو جلا گیا تھا ۔ (ملزم کی گرفتاری کے بعد معلوم ہوا کہ

وہ ایک جلتی ہوئی سگریٹ عمداً صوفہ کی تہ میں چھوڑ گیا تھا۔ محض مذاقاً) امین جنگ بہادر کے یہاں کا مفلر اوپل میں چھوڑ گیا۔ محبوب علی صاحب کی کنجیاں محمود عالم صاحب کے گھر میں ڈال گیا۔ اور گوپی کشن کی کنجی سید محمد تقی صاحب کے یہاں پھینک گیا تھا۔ اس تختہ کی بناء پر اہلیانِ پولیس نے اپنی توجہ زیادہ تر دونوں شہروں کے نصف شمالی جانب کے حصہ کی طرف منعطف کر رکھی تھی۔ لیکن کوئی خاص نتیجہ نہ نکل سکا۔ ان وارداتوں کے شروع ہونے سے پہلے تارناکہ کے پاس مولوی وحید الرحمٰن صاحب پروفیسر صدر شعبۂ طبیعیات جامعہ عثمانیہ کے یہاں ماہ مارچ یا اپریل میں زیورات کا سرقہ ہوا تھا (اس مقدمے کے واقعات بھی آگے ملیں گے) اور سرقہ کے تیسرے ہی دن خفیہ پولیس بلدہ نے سارق عبدالسلام کو مع مکمل مال کے گرفتار کر لیا تھا۔ یہ مال حدودِ واقعہ عبدالسلام کو پولیس اطراف بلدہ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جہاں سے وہ حراستِ جائزہ سے فرار ہو کر روپوش ہو گیا تھا۔ عام طور پر اُسی پر ان وارداتوں کی نسبت شبہ کیا جا رہا تھا۔ وہ ضلع کریم نگر کا سزا یاب سارق تھا اور بلدہ میں آ کر سب سے پہلے وحید الرحمٰن صاحب کے گھر ہی میں اس نے واردات کی تھی۔ عبدالسلام کی تلاش جاری تھی۔ والد صاحب قبلہ نے اپنا خیال کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ عبدالسلام کا ریکارڈ بلدہ میں کافی نہیں اور اس ایک جگہ کے سوائے اس نے دوسری جگہ کہیں چوری نہیں کی ہے۔ ممکن ہے ان وارداتوں کا مرتکب ہوا بھی ہو۔ اور نہ بھی ہوا ہو۔ بنگلوں میں واردات کرنے والا بلدہ میں ٹاٹ پیٹ کی پلٹن کا ملازم تھا۔ اور اس کی یہ بھی عادت تھی کہ کوئی نہ کوئی بچکانی حرکت ضرور کرتا۔ وہ سمت یاقوت پورہ سے عرصہ سے روپوش اور فرار تھا۔ انہوں نے اپنے ماتحتین کو حکم دے رکھا تھا کہ اس کی بھی تلاش کریں۔ بہرحال ادھر اضلاع پولیس سے اشتراک جاری تھا۔ عبدالسلام کی تلاش بھی جاری تھی۔ اور دوسری طرف محمد شریف کی نسبت بھی ہدایات تھیں۔ کیونکہ وہ ایسے بنگلوں ہی میں چوری کرتا تھا جن میں وہ آسانی سے داخل ہو سکتا تھا۔ وہ نل کے پائپ سے چڑھ کر روشن دان میں آسانی سے داخل ہو جاتا اور رسی باندھ کر اُتر جایا کرتا تھا۔ اور نقد، زیور، فونٹن، گھڑی کی قسم کی چیزیں چراتا، کپڑوں کو ہاتھ نہ لگاتا۔ ان چوریوں میں یہ باتیں بھی پائی گئی تھیں۔ اور سابق میں وہ ایک گنجفہ کے پتہ پر کچھ لکھ گیا۔ اور ایک جگہ دیوار پر فونٹن سے سیاہی چھڑک گیا تھا۔

اتفاق سے خفیہ پولیس بلدہ کے امین مولوی شیخ داؤد صاحب ادائی شہادت کے لئے سکندرآباد کی عدالت میں گئے۔ شیخ داؤد صاحب کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ (لیکن میں ان کو ماہر انکشاف کے نام سے یاد کرتا ہوں) وہ کسی کا بیان لینے بیٹھتے تو اکثر مجھے لکھنے کے لئے بٹھا لیتے تھے۔ اور پھر خود چلا کرتا کیا،

کا بیان وہ پانچ چھ روز سے کم میں ختم نہیں کیا کرتے تھے ۔ جب وہ عدالت سے شام کو رہے تھے اور سکندرآباد رانی گنج میں بس اسٹانڈ پر کھڑے تھے تو ایک جانی پہچانی صورت م کیا ۔ اور کہا '

یکار ' میں نے یہاں سیکل کی دکان سکندرآباد میں کھالی ہے ۔ ایک بلدہ کا سر ایاب میری دکان سیکل لے کر گیا اور صبح میں کرایہ میں سَو روپے کا نوٹ کلدار دیا (حیدرآباد اسٹیٹ کے ن اور برٹش انڈیا کے سکہ کو کلدار کہا جاتا تھا) میں نے وہ نوٹ اُسے واپس کر دیا ۔ وہ نہ خود آیا نہ میری سیکل لا کر دیا "

ن دادے صاحب نے کہا " بھائی سکندرآباد کے علاقے میں کیا کر سکتے ہیں ۔ اگر وہ نوٹ لے تو تم اُسے کسی طرح بلدہ کے حدود (CITY LIMITS) میں لا لینا ۔ تب میں تمہاری کچھ مدد " ۔ اور اس شخص سے نوٹ لانے والے کا حلیہ دریافت کر لیا ۔

ہوں نے خفیہ پولیس کے دفتر واپس آکر والد صاحب سے یہ قصہ سنایا ۔ والد صاحب قبلہ ان خفا ہوئے کہ انہوں نے سخت غلطی کی ۔ حلیہ بنگلہ میں چوری کرنے والے شخص سے ملتا جلتا ہے ، " کیا تمہاری جان نکل رہی تھی ۔ وہاں بیٹھ ہوٹل میں کھا لیتے ۔ اس کی سیکل کی بیٹھے جاتے اور وہ بدمعاش آتا تو اپنے ساتھ لے کر آجاتے ۔ اب سکندرآباد پولیس کو معلوم وہ اپنا شکار تمہیں کیوں دینے لگی " اور حسب معمول شام میں افضل گنج جا کر کنگ اینڈ بیٹھ گئے ' ۔

ن دادے صاحب کو خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ افسوس کرتے بیٹھے ہی تھے کہ آباد پولیس سے ٹیلی فون آیا کہ ایک سیکل والے نے ایک شخص کو صد روپیہ نوٹ کے بڑی ہے (POLICE STATION HOUSE) لاکر پیش کیا ہے کہ بلدہ پولیس کو اس کی ضرورت واقعی بلدہ میں اس کی ضرورت ہے ۔ اگر ہے تو جرم کا نمبر کیا ہے ؟ اور کس دفعہ کے تحت ملزم کو گرفتار کر کے عارضی تحویل (TEMPORARY EXTRADITION) میں بلدہ دیں ۔

ن دادے صاحب نے جو غلطی کی تھی انہوں نے اس کی تلافی کر دی اور برجستہ انہوں نے اپنے میں اسکیم بنا ڈالی اور شاہ ان کے سب انسپکٹر صاحب سے بات کرانے کو کہا اور اس طرح بلدہ کے سپکٹر نے انگریزی پولیس کے سب انسپکٹر سے گفتگو کی ۔ باہم وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے کیونکہ ن باہم کام چلتا ہی رہتا تھا ۔

شیخ دادے صاحب : (ٹاؤن کے سب انسپکٹر سے) ارے یار وکیا بولوں ۔ میں تو معیبت میں پھنس گیا ۔ کچھ بول نہیں سکتا ۔ ہمارے صاحب (فضل رسول خان صاحب) تو بہت خفا ہیں ۔

سکندرآباد پولیس سب انسپکٹر : کیوں دادے بھائی کیا بات ہے ؟

دادے صاحب : ارے یار کیا بولوں ۔ تم اس آدمی کا نام تو بتاؤ جس کو سیکل والا لایا ہے "۔

سب انسپکٹر : وہ محمد شریف ہے "۔

دادے صاحب : ارے شریف ہے ۔ اب کیا بولوں صاحب خفا ہیں ۔ بدنامی کی بات ہے ۔ میرے سے غلطی ہوگئی کہ میں جلدی میں واپس آگیا ۔

سب انسپکٹر : آخر کیا بات ہے بولو تو صحیح "۔

دادے صاحب : ارے بات کیا ہوتی ۔ صاحب (فضل رسول خان صاحب) گھر میں اس شریف کو انجانے میں نوکر رکھ لئے ۔ وہ سالا صاحب کی جیب ہی سے سو روپے نکال کر اسی روز بھاگ گیا ۔ اب جرم نمبر پر کیسا لیتے ۔ کتنی بڑی بدنامی کی بات ہوتی ہے کہ فضل رسول خان صاحب کی جیب سے ہی چوری ، جرم نمبر وغیرہ پر کچھ نہیں لئے "۔

سب انسپکٹر : ایسا ہے "۔

دادے صاحب : ہاں بھائی ۔ بات یہ ہے کہ میرے کو صاحب بولے تھے کہ سکندرآباد جاکر اس کے عزیز سے پوچھوں ۔ میں عدالت کو آیا ہوا تھا ۔ وہ سالے سیکل والے کو بول کر آیا تھا کہ شریف آئے تو یہاں لے آئے ۔ وہ تمہارے پاس لے کر مرا "۔

سب انسپکٹر : تو پھر کیا بولتے ہیں ؟

دادے صاحب : بھائی اب جرم تو نمبر پر لئے نہیں ۔ صاحب کے سو روپے گئے تو جانے دو ــــ گالیاں میں سن لیا ہوں ۔ اب تم آوارہ گرد کا پرچہ (VAGABAND SLIP) لگا کر بھیج دینے ہو تو بھیج دو ۔ صاحب کا نوٹ صاحب کو دے دیں گے ۔ اور اس کو غیر حاضری میں چالان کروا دیں گا اور نہیں بھیج سکتے تو نہ بھیجو ۔ اب نہ جرم نمبر پہ ہے نہ جرم نمبر پہ لیں گے ــــ اب تحویلی کارروائی کے چکروں میں کون پڑتا بھائی ۔ اور سو کے نوٹ کی اب شناخت (IDENTIFY EVIDENCE) بھی کیا بتا سکتے ہیں ۔ جانے دو اس کو چھوڑ دو ۔

سب انسپکٹر : اچھا ، میں ابھی چیف صاحب (C.I) سے پوچھ لیتا ہوں ۔

شیخ دادے صاحب مرحوم والد سے جاکر کہے کہ اس طرح سکندرآباد والوں سے چال چلا ہوں شاید ملزم آجائے ۔ والد صاحب نے کہا " ہاتھ سے چڑیا کو اڑا دینے سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ ہاتھ پہ

... تو تم بھی تو آوارہ گرد ہے ؟ ... اگر تمہاری بات صحیح نکلی تو پھر مجھے مطلع کرنا!
ے صاحب واپس پہنچے اور کیا دیکھتے ہیں کہ سکندر آباد پولیس محمد شریف کو آوارہ گردی
کے ساتھ لے کر خفیہ کے دفتر میں موجود ہے ۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ ملزم کو رسید
... آباد کے ... کو ... والد صاحب کو ... اطلاع دی گئی ۔
... واپس آ گئے ۔
صاحب قبلہ ... والے صاحب کو کہا کہ " ڈائری میں اندراج کر کے ملزم کو سمت یاقوت پورہ
دو ... [illegible] ...
آ گیا ۔ ملزم مذکور سے کوئی ۱۱ بجے رات ننانوے روپے کے نوٹ کے وجود ، اس کی ایک عرصہ
غیر حاضری اور موجودہ سکونت کی نسبت استفسارات کی بھرمار شروع ہو گئی ۔ ملزم کا کہنا تھا کہ وہ
... لالہ گوڑہ ملازم ہے اور ایمان داری سے امن و سکون کی زندگی گزار رہا ہے ۔ اور یہ کہ
مکان جو سکندر آباد اسٹیشن کے قریب ریلوے کوارٹرس میں ہے بتانے اور وہاں محلہ والوں
نیک چلنی کی تصدیق کروانے تیار ہے ـــــ والد صاحب قبلہ اس سے وعدہ کیا کہ وہ مکان
وہ دیکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ واقعی وہ اس کا مکان ہے اور وہ نیک چلن ہے تو بس اسے
... رہ پولیس کے سپرد غیر حاضری کی کارروائی کے لئے کر دیا جائے گا ۔ اور کوئی کارروائی اس کے خلاف
سکندر آباد پولیس سے جس طرح ملزم لیا گیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ مکرر پولیس کی حدود میں
ت سے جا کر مکان وغیرہ کو دیکھنے میں احتیاط کی جائے ۔ چنانچہ خفیہ طور پر راتوں رات چند خانگی
... شریف سے کنجی اس کے کمرہ کی لے کر روانہ کیا گیا ۔ جنہوں نے سکندر آباد جا کر مکان دیکھا ۔ چند
... چیزوں کو خفیہ طور پر وہاں سے حاصل کیا گیا اور راتوں رات مستغیثین متذکرہ صدر میں
وہ بتائی گئیں ، اور انہوں نے ان کو مسروقہ شناخت کر لیا ۔ یاقوت پورہ کی نگرانی سے غیر حاضری
کی کارروائی کے بعد محمد شریف کی گرفتاری عمل میں آتی ہے اور وہ (۲۷) مقدمات کے ارتکاب
... ہے ۔ اور چھوٹا موٹا سامان اس کے قبضہ و نشاندہی سے برآمد ہو جاتا ہے ۔ لیکن چاندی سونے اور
جیسی قیمتی چیزوں کی برآمدگی کا سوال پیچیدہ بن جاتا ہے ۔ ملزم بتاتا ہے کہ اس نے قیمتی سامان
... آباد میں ایک چاندی سونے کی دکان پر نہایت ہی کم قیمت میں فروخت کر دیا ۔ اور اس کا بھی
لیا جاتا ہے کہ کومٹی (بقال یا بنیا) مذکور محمد شریف سے مخالفت کر کے مسروقہ مال کو لینے کا
... گیا ہے ۔ اور پولیس مقامی بھی اس سے واقف ہے ۔ اب مال کی برآمدگی خاص طور پر قیمتی مال
کی ایک مسئلہ بن گئی جیسے ہر واردات کے چھوٹے موٹے مال کا کچھ نہ کچھ پتہ تو چل ہی چکا تھا ـــــ

(باقی آئندہ) ...

روزنامہ سیاست حیدرآباد
پریس انفارمیشن بیورو - گورنمنٹ آف انڈیا - حیدرآباد

[illegible]

[illegible]

وزیراعظم کے ۱۵ نکاتی پروگرام جو قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اقلیتوں کی مکمل شمولیت کا مدعی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان نکات پر زیادہ مرکوز ہے۔

۱) فرقہ وارانہ فسادات کا انسداد اور اس پر قابو پانا، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینا۔

۲) مرکزی خدمات، اور ریاستی پولیس جمعیت، قومیائے بنک، سرکاری شعبہ کے اداروں اور ملوثہ وغیرہ میں تقررات پر اقلیتوں کو خصوصی توجہ دینا، نیز اس مقصد کی نمائندگی کے لئے تقرراتی کمیٹی کی تشکیل۔

۳) تعلیم سے بے بہرہ اقلیتوں کے گروپوں کی تعلیمی ترقیات سے نمٹنے کے اقدامات۔

۴) ترقیاتی پروگرام بشمول ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت اقلیتوں کو موثر حصہ و فائدے کی طمانیت۔

۵) اقلیتوں کی شکایات کو دور کرنے کے عاجلانہ اقدامات اور اقلیتوں کے مسائل کو مستقل بنیادوں پر نمٹنے کے کام کو تیز کرنا۔

وزارت فلاح و بہبود کا اقلیتی سیل اس ۱۵ نکاتی پروگرام کی ریاستی حکومتوں اور متعلقہ مرکزی وزارتوں کی جانب سے عمل آوری پر سہ ماہی رپورٹ حاصل کرتا ہے اور اپنی مکمل سہ ماہی رپورٹ وزیراعظم کے دفتر کو روانہ کرتا ہے۔ اقلیتی سیل کے عہدہ دار اس پروگرام کی عاجلانہ عمل آوری کے لئے ریاستوں کا دورہ بھی کرتے ہیں اور اس پروگرام کی عمل آوری میں نقائص کو ریاستی حکومتوں اور مرکزی وزارت کے علم میں لاتے ہوئے موزوں اور درست اقدامات کے لئے صلاح دیتے ہیں۔

ریاستی پولیس جمعیت میں تقررات: چند ریاستوں نے یہ اطلاع دی ہے کہ انہوں نے

لیس جمعیت میں تقررات کے لئے نمائندوں پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی ہے لیکن چند
نے ایسا نہیں کیا ہے۔ کسی بھی ریاست نے ان کمیٹیوں میں موزوں اقلیتی عہدہ
عدم دستیابی کی صورت میں غیر سرکاری ارکان کو نامزد نہیں کیا ہے۔ بیشتر
نے پولیس میں اقلیتوں کی بھرتی کی مؤثر طمانیت کا جائزہ لینے نگران طریقہ کار
نہیں کیا ہے۔

پولیس میں بھرتی: پانچ مرکزی پولیس جمعیتوں، سنٹرل ریزرو پولیس فورس،
سلامتی افواج، سنٹرل انڈسٹریل سیکوریٹی فورس، آسام رائفلز اور انڈو
سرحدی پولیس میں گروپ سی اور ڈی کی بھرتی کے لئے تقرراتی کمیٹیوں میں نمائندگی دی
. بھرتی کے تجزیے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان پولیس جمعیتوں میں مسلمانوں کو
نے کا عمل ہنوز خاطر خواہ نہیں ہے۔ اس صورت حال کو بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔

ے بینک، عوامی شعبہ جات اور ریلویز وغیرہ میں تقررات: قومیائے بنک عوامی
ے زیر انتظام اداروں اور ریلویز وغیرہ میں گروپ سی اور ڈی کے درجوں پر
کے لئے کمیٹیوں میں نمائندوں کو شامل کرنے کی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ ان اداروں
ت کے تجزیہ سے معلومات ہوتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کے تقررات کا موقف بہت ہی
قلیتوں کو قبل از تقرر تربیت کے لئے محکمہ بینکنگ نے اقدامات اٹھائے ہیں۔ تعلیمی طور
ہ اقلیتوں کے ۴۰ منتخبہ اضلاع میں اہلکارانہ درجہ کے لئے قبل از تقررات تربیت کے
کئے جارہے ہیں۔ عوامی زیر انتظام شعبوں اور ریلویز وغیرہ میں صورت حال کو بہتر بنانے
ل جارہا ہے۔

منٹ ایکسچینجس کو ہدایات: ڈائرکٹر جنرل امپلائمنٹ و ٹریننگ، نئی دہلی نے
حکومت کو ایک تفصیلی ہدایات جاری کرتے ہوئے اس بات کی طمانیت حاصل کرنے
امپلائمنٹ ایکسچینجس میں نام رجسٹر کروانے اور تقررات کے اداروں کو نام روانہ
ں اقلیتوں کے ساتھ کوئی امتیاز نہ برتا جائے اور اقلیتوں کے اکثریتی علاقوں
قلیتی تعلیمی اداروں میں خصوصی رجسٹریشن مہم منعقد کرنے ریاستی حکومتوں
کیا ہے کہ وہ ان ہدایات کی مؤثر عمل آوری کی نگرانی کے انتظامات کا
ما۔ چند ایک ریاستوں نے ریاستی سطح پر اپنے نگرانی سیل قائم کردئے

ooo

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا

عصری ٹکنالوجی کی سمت

نیشنل اکیڈمی برائے اگریکلچرل ریسرچ مینجمنٹ "فارم" حیدرآباد

نیشنل اکیڈمی برائے اگریکلچرل ریسرچ مینجمنٹ (فارم) ایک نیا ادارہ ہے جسے مرکزی اسٹاف کالج کی حیثیت حاصل ہے۔ انڈین کونسل برائے زرعی تحقیق حکومت ہند نے ۱۹۷۶ء میں اس کا آغاز کیا تھا۔ "فارم" کے قیام کا اصل مقصد زرعی تحقیق، تعلیم و ترقی سے وابستہ تمام افراد کو سائنسی انتظام کے اصول و فلسفے سے واقف کرانا ہے۔ اپنے قیام کے ساتھ ہی اس نے زرعی تحقیق، انتظام کے لئے انڈین کونسل برائے زرعی تحقیق اور زرعی جامعات کے تحقیقی سائنسدانوں کے لئے منصوبے وضع کرنے تربیتی پروگرام منعقد کرنے، سمینار اور دیگر زرعی شعبوں کے تحقیقاتی کاموں کے ذریعہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہا ہے۔ فارم۔ اپنے تجربات کے ساتھ کسانوں کو درپیش مسائل کا سائنسی طریقہ پر حل ڈھونڈ نکالنے کے قابل ہوگا۔ یہ اکیڈمی چھ فعال یونٹس و مرکزی خدمات کے ایک گروپ پر مشتمل ہے جس میں قابل ذکر زرعی تحقیقی نظام و تکنیک تکنیکی نظام اور پالیسیوں کی تفصیل، فروغ انسانی وسائل، اطلاعات و دستاویزات، مرکزی خدمات، پیداوار و طباعت، نظم و نسق و محاسب ہیں۔ اس زرعی اکیڈمی کی سرگرمیوں نیز اور پروگرام کو مجموعی طور پر تین حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نوجوان سائنسدانوں کے لئے تربیتی اور اورینٹیشن کورس کا قیام، جہاں پر پانچ ماہ تربیت دی جاتی ہے۔ زرعی عمل تربیت بھی ان سرگرمیوں کا جز ہیں۔

۲۔ سینیر سائنسدانوں اور ارکان فیکلٹی، پراجکٹ قائد، پراجکٹ ز... کا

باقی صفحہ

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

مینجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

جلد ۴ شمارہ ۸ اگسٹ ۱۹۸۷ء قیمت: ۵ روپے

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

ــــ شرحِ تعاون ــــ

ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سال 90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات 1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 "ریڈ ہلز" حیدرآباد - 4

ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول

حکومت ہند کی جدید قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ملک میں نوودیا ودیالیہ قائم کئے جارہے ہیں۔ آندھراپردیش میں سال گذشتہ چار مدارس قائم کئے گئے تھے اب مزید (۱۲) اضلاع میں نئے مدارس قائم کئے جارہے ہیں، اس طرح پورے (۱۶) اضلاع میں ان اسکول کی جماعت ششم میں داخلہ کے لئے انٹرنس ٹسٹ کا اعلان یکم جولائی ۸۷ء کے اخبارات میں کیا گیا، ۵ار جولائی درخواستوں کے حصول کی آخری تاریخ مقرر کی گئی اور ۲۳ر اگست ۸۷ء کو انٹرنس ٹسٹ کا اعلان کیا گیا جو ریجنل زبان اور مادری زبان میں پانچویں جماعت کامیاب طلبا وطالبات کے لئے انکی زبانوں میں منعقد ہوگا، آندھرا پردیش میں ریجنل زبان تیلگو ہے اور مادری زبان ہمارے بچوں کے لئے اردو ہے۔ افسوس ہے کہ یہ اعلان اردو اخبارات میں نہیں کیا گیا، محفلِ علم وفن کی کوشش سے اخبارات میں اس کی تشہیر بھی کی گئی اور تعلیمی اداروں اور بہی خواہوں کو بھی متوجہ کیا گیا کہ جب تک اردو والے کافی تعداد میں ان اسکولوں کے داخلہ کے لئے نہ دیں گے اور ان درخواستگذاروں کو انٹرنس ٹسٹ مورخہ ۲۳ر۸ر۸۷ء کے لئے کوچ نہ کیا جائے گا خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ لہٰذا اردو والوں سے ہماری اپیل ہے کہ اردو میڈیم سے پنجم کامیاب طلبا کی زیادہ سے زیادہ درخواستیں داخل کروائی جائیں اور ساتھ ہی انھیں ۲۳ر۸ر۸۷ء کے انٹرنس ٹسٹ کے لئے تیاری میں مدد دی جائے۔ تاکہ یہ داخلہ پاسکیں۔

حکومت ہند نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جماعت ششم میں داخلہ تو ریجنل اور مادری زبان میں ٹسٹ کی بنیاد پر ہوگا، اور وسطانی جماعتوں کا ذریعہ تعلیم بھی یہی زبانیں ہونگی لیکن ان جماعتوں میں ہندی کو بطور خاص پڑھایا اور ثانوی جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم ہندی کو بنادیا جائے گا۔ اس بارے میں غیر ہندی علاقوں کی کوشش ہے کہ ریجنل زبانوں ہی میں ثانوی تعلیم کو بھی جاری رکھا جائے۔ اردو والوں کا مطالبہ ہے کہ اردو کے طلبا کی موجودگی کی صورت میں اردو میڈیم اسکول بھی قائم کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اردو میڈیم والے زیادہ سے زیادہ طلبا وطالبات کو شریک کروائیں تاکہ ان کی کافی تعداد کی موجودگی میں یہ مطالبہ منوایا جاسکے کہ ان طلبا کی حد تک ان کی

ثانوی تعلیم بھی اردو میڈیم ہی میں جاری رکھی جائے۔ مرکزی حکومت نے متعدد اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اردو علاقوں میں اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں گے۔ اب اردو والوں کا کام ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے تعلیم دلوائیں۔ نوو دیا ودیالیوں میں شریک کروائیں تاکہ بعد کی تعلیم بھی اردو میڈیم میں جاری رکھنے کی بات منوائی جا سکے۔

"اردو کے زندہ مشاہیر کے مسودے"

خدا بخش لائبریری قدیم مخطوطات کے ساتھ اردو کے زندہ مشاہیر کے مسودات بھی جمع کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں خطوط اور اخبارات کے ذریعہ درخواست کی جا چکی ہے، اس درخواست کو ڈائرکٹر، خدا بخش لائبریری نے پھر دہرایا ہے کہ اگر مصنفین اور شعرا اپنے طبع شدہ کتابوں کے مسودات لائبریری کو تحفتاً عنایت کر سکیں تو لائبریری انھیں محفوظ کرنے میں خوشی محسوس کرے گی۔ یہ مسودات یعنی طبع شدہ تحریروں کے چھپے یا دوسرے ذرائع جو ادبا اور شعرا لائبریری کو عنایت کریں گے شکر گزاری کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔ اس سے ان مشاہیر پر ریسرچ میں یہ کاغذات کام آئیں گے اور ان کی دولت ضائع نہیں ہو گی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

پیامِ انسانیت، پونے میں پبلک ڈائیلاگ

غیر مسلم دانشوروں کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک گفتگو!

قرآن کریم کے دعوتی اسالیب پر جن لوگوں کی گہری نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں انسانی ذہن و فکر کے تمام طبقات، معیار اور حالاتِ زمانہ کی رعایت رکھی گئی ہے اور دینی حقائق دل و دماغ میں اتارنے کے لئے متنوع اسالیب اختیار کئے گئے ہیں کہ انسان کو قائل و مطمئن کرنے کے بعد ہی مائل کیا جا سکتا ہے، دینی دعوت کی پوری تاریخ اس کی شہادت پیش کرتی ہے کہ ہر زمانہ کے مزاج و مذاق اور تقاضوں کے مطابق دعوت کے اسالیب میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تصنیفات اور ان کی دعوتی جدوجہد کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلم حکومتوں اور عوام کے درمیان تصادم کے اس دور میں دینی دعوت کا بہتر اسلوب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو کرسیوں تک پہنچانے کے بجائے اصحابِ اقتدار کے دلوں تک ایمان کی دعوت پہنچائی جائے اور ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریتی ملک اور جمہوری دور میں غیر مسلم دانشوروں، اصحابِ اقتدار اور عوام کے حلقوں کے ساتھ سیاسی محاذ آرائی کے بجائے افہام و تفہیم اور تبادلۂ خیال DIALOGUE کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ خصوصاً فرقہ پرستی کی مسموم فضا کو اسی طرح ختم کرکے معتدل حالات ملک میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یہی جذبہ تھا جس نے مولانا کو پیامِ انسانیت کے پلیٹ فارم سے ہندوستانی عوام کے مخلوط اجتماعات سے خطاب پر آمادہ کیا اور ملک کے طول و عرض کے دورے پر مجبور کیا۔ پھر مولانا نے محسوس کیا کہ اب غیر مسلم دانشوروں سے بھی موجودہ ملکی مسائل و مشکلات کے

کے بارے میں تبادلۂ خیال کی اشد ضرورت ہے قرآن کی دعوت پر نئی دہلی میں گذشتہ
سال مئی میں دانشوروں اور صحافیوں کی ایک منتخب تعداد جمع ہوئی تھی اور مولانا
نے مسلمانوں کے مسائل و جذبات سے انھیں باخبر کیا تھا اور خود ان کے احساسات و
جذبات اور نقطۂ ہائے نظر سے واقفیت حاصل کی تھی۔

اس ڈائیلاگ کی کامیابی کے بعد ناگپور میں ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر
کی صدارت میں دوسرا جلسہ تبادلۂ خیال کے مقصد سے ماہِ اکتوبر میں منعقد ہوا، جو
پہلے سے کہیں زیادہ کامیاب ہوا۔ غیر مسلم حضرات کی بڑی تعداد جلسہ میں شریک تھی
خصوصاً آر ایس ایس کے اہم ذمہ داروں نے اس جلسہ سے خصوصی دلچسپی لی تھی۔ اس
جلسہ میں حیدرآباد، اورنگ آباد، بمبئی، لکھنؤ اور پونے کے احباب بھی شریک تھے۔
ناگپور میں پونہ کے انیس چشتی صاحب کے آئندہ ڈائیلاگ کے اجتماع کے لئے
پونہ کا وعدہ مولانا مدظلہٗ سے لے لیا اور اس وقت سے کام بھی شروع کر دیا۔
انیس صاحب پونہ کے ایک کالج میں پڑھاتے ہیں اسی کے ساتھ اردو خطاطی سے
اس حد تک دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہ اردو کتابت کو کمپیوٹرائز کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

انیس صاحب نے اس ڈائیلاگ کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کے لئے
غیر معمولی جد و جہد کی۔ انھوں نے پہلے مرحلے میں اپنے شاگردوں کی مدد سے اپنے ہاتھ
سے ڈیڑھ ہزار خطوط لکھ کر پیام انسانیت کے تعارفی ورقہ کے ساتھ پونہ شہر کے
تمام بڑے اداروں، سرکاری و غیر سرکاری افسران، کارپوریٹرز، ممبران اسمبلی، وزراء
اور سماجی و تعلیمی کارکنوں کو روانہ کیا۔ اس خط پر انیس چشتی کے علاوہ حسب ذیل
حضرات کے دستخط تھے۔

ایس اسحاق۔ تیج پال سنگھ بیدی۔ آدل تاوڑے، خالد سات، بھیشو پانی
کلکرنی۔ انور ستگتانی۔ ایس ایم خان۔ عزیز شیخ۔ بھاسکر میناولے۔ لقمان قاضی۔

اس خط کے جوابات حوصلہ افزا آئے اس کی روشنی میں ۲۷۳ افراد کو دوبارہ
ڈائیلاگ کی اہمیت و افادیت اور موضوع کے بارے میں مطلع کیا گیا۔ نیز انھیں جوابی
ان لینڈ روانہ کیا گیا، پھر ذاتی ملاقاتیں ان حضرات سے کر کے ۱۰۰ کا انتخاب کیا گیا۔ پریس،
پولیس اور سیاستدانوں سے رابطہ رکھا گیا۔ پریس نے پیام انسانیت کے مقاصد کے بارے

میں مقالے اور خبریں ہندی مرہٹی اور انگریزی میں شائع کئے۔ ریڈیو اور ٹی وی نے اہتمام کے ساتھ اس ڈائیلاگ اور اس کے داعی مولانا سید ابوالحسن علی کے بارے میں خبریں تفصیل سے دیں۔ مرہٹی اخبار "کیسری" ہندی اخبار "نیا گرن" انگریزی روزنامہ "مہاراشٹرا ہیرالڈ" نے اس مہم میں نمایاں حصہ لیا۔ غیر مسلم پریس اور شخصیات خصوصاً آریہ سماج کے سابق صدر اور لائنز کلب کے سکریٹری مسٹر ادجول تاوڑے نے اس ڈائیلاگ کو کامیاب بنانے میں حیرت انگیز عملی حصہ لیا۔

پونہ سے باہر جن شخصیتوں کو اس ڈائیلاگ میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی ان میں مولانا عبدالکریم پاریکھ، سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی تھے۔ ڈاکٹر صاحب غیر ملکی دورے کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ باقی حضرات وقت پر تشریف لے آئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ جے پور میں ایک ادبی سیمینار میں شرکت کرکے براہ بمبئی پونہ ۱۰؍ فروری کو پہنچ گئے۔

۱۲؍ فروری کو بعد نماز مغرب ٹھیک ساڑھے سات بجے مرہٹہ چیمبرس آف کامرس پونہ کے ہال میں مہاراشٹرا ہیرالڈ کے ایڈیٹر مسٹر ایس ڈی واگھ کی صدارت میں ڈائیلاگ کا اجتماع شروع ہوگیا۔ مسٹر ادجول تاوڑے نے جلسہ کو کنڈکٹ کیا۔ انھوں نے حاضرین جلسہ، صدر اور پیام انسانیت کے داعی کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس ڈائیلاگ کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور اس ملک کے لئے پیام انسانیت کی تحریک کو فال نیک قرار دیا۔ انھوں نے انیس چشتی کو پہلے دعوت دی جنھوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی اور تحریک پیام انسانیت کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا۔ اس کے بعد سید حامد صاحب نے مولانا مدظلہٗ کا تعارف کراتے ہوئے ان کے خاندان، وراثت اور ماحول اور نشو و نما کا ذکر کیا اور مولانا کی علمی و دعوتی جد و جہد کو واضح کرتے ہوئے اس دور میں اخلاقی قدروں کی اہمیت، ہندوستان میں اس کے انحطاط کی علامتوں کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اس اخلاقی انحطاط کو دور کرنے کی کوشش تیز ہو رہی ہے۔ سید حامد صاحب نے اس کے بعد ڈائیلاگ کی اہمیت و افادیت اور مختلف قوموں، مذاہب اور خیال رکھنے والوں کے درمیان تبادلہ خیال کی کوشش پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ

پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے یہ کوشش عرصہ سے جاری ہے جس کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔

انھوں نے مولانا مدظلہ کی اس کوشش کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا اگر چاہتے تو آرام کے ساتھ کسی گوشہ میں اپنا علمی و تصنیفی کام کر سکتے تھے مگر حالات نے ان کو مجبور کر دیا کہ غیر مسلم دانشوروں اور سماجی کام کرنے والوں کے ساتھ مل بیٹھ کر تبادلۂ خیال کیا جائے اور بے تعلق ہو کر محدود سیاسی مقاصد اور مفادات سے الگ ہو کر شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کو دور کیا جائے تاکہ ملک کے تمام طبقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا ہو اور معتدل حالات اور فضا ہموار ہو۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی جد و جہد ہوتی رہے۔ اور ایسے مراکز ملک کے کونے کونے میں قائم ہوتے رہیں۔

سید حامد صاحب کی تقریر کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دعوت دی گئی۔ انھوں نے اپنے خیالات کو پہلے سے قلمبند کر لیا تھا اس کا ترجمہ مرہٹی اور انگریزی میں حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مولانا نے اپنا خطبہ پڑھنے سے پہلے حاضرین سے بھرے ہوئے ہال پر نظر ڈالی تو ان کا دل شکر و مسرت کے جذبات سے لبریز ہو گیا فرمایا کہ اگر کوئی ایسی مشین ایجاد ہو گئی ہوتی جس سے دل کو دکھایا جا سکتا تو میں آپ کو اپنا دل نکال کر دکھاتا لیکن اس کے باوجود بھی دل کے اندر موجزن شکر و مسرت کے جذبات کو دکھانا ممکن نہ ہوتا۔ ہم صرف الفاظ کے ذریعے ہی اپنے احساسات و جذبات آپ تک پہنچا سکتے ہیں۔

مولانا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

"میں سیدھی سیدھی بات آپ سے کہتا ہوں۔ ذرا سوچیے "اس وقت آپ لوگ اطمینان سے میری بات سن رہے ہیں، مذہب کی بات ہو، عقل کی بات ہو، سمجھ کی بات ہو، انصاف کی بات ہو، سب نارمل حالات میں کہی اور سنی جاتی ہے۔ اگر حالات معتدل نہ ہوں، فضا بالکل بگڑی ہوئی ہو، میدان میں جلسہ ہو رہا ہو، بجلی کوندنے لگے، اب گری، تب گری، بادل گرج رہے ہوں، معلوم ہوتا ہے پہاڑ ٹوٹ جائے گا۔ اگر دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مقرر بھی اسٹیج پر آئے اور کہے کہ میں تمہیں بڑی حکمت کی باتیں سنانے والا ہوں کوئی سننے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔

"یہ انسان کی فطرت ہے انسان کی طبیعت کو جب سکون ہوتا ہے کوئی ڈر نہیں ہوتا

جو کوئی غلط نہیں ہوتا، وہ بہت زیادہ بیمار نہیں ہوتا، وہ بہت زیادہ مجبور نہیں ہوتا [illegible] [illegible] ہے اور دانا بھی ہے اور کوئی اندر کی پریشانی ہو یا باہر کی پریشانی تو پھر سر کاٹ کر رکھ دیجیے انسان کستا نہیں۔

ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اس ملک ہندوستان میں ہی نہیں، ساری دنیا میں معتدل و پرسکون حالات ہوں تاکہ کام کرنے والوں کو کام کا موقع ملے، پڑھانے والوں کو پڑھانے کا موقع ملے، لٹریری لوگوں کو لٹریچر کی خدمت کا موقع ملے، جو شاعر ہیں انہیں شاعری کا موقع ملے، جو آرٹسٹ ہیں ان کو آرٹ میں اپنا کمال دکھانے کا موقع ملے جو دانشور ہیں، اسکالرز ہیں ان کو تحقیق کرنے کا موقع ملے۔ ریسرچ اور لٹریچر کے جو بڑے بڑے شاہکار دنیا میں تیار ہوئے یہ سب نارمل حالات میں ہوئے، کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو، اس سے کچھ لکھا جائے گا؟ بولا جائے گا؟ آپ ہزار منطق اس پر صرف کر دیجئے اس کو قائل کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کہیں کہ پیٹ میں درد ہے تو کیا بات ہے؟ آپ تو شعر سنیئے! مگر کیا اس سے سنا جائے گا اور وہ لطف لے گا؟

حضرات! اللہ نے اس ملک کو سب کچھ دیا ہے مگر پھر کس چیز کی کمی ہے کہ وقت پر کام نہیں ہوتا، بغیر رشوت دیئے ہوئے کام نہیں ہوتا، خدا نے زندگی میں کوئی کمی نہیں رکھی اس کو ہر طرح مکمل کر کے اس نے دیا۔ اس دنیا کو ایسا بنا دیا کہ اگر آدمی چاہے تو اس کو زندگی کا حقیقی مزہ آنے لگے، جنت کا مزہ چاہے آئے یا نہ آئے جینے کا مزہ ضرور آجائے، پریم ہو، محبت ہو، وقت پر کام ہو، پاؤں پھیلا کر آنکھ بند کر کے بے فکر نیند سوئے، نہ چور کا کھٹکا نہ ڈاکو کا دھڑکا، نہ کسی لٹیرے کا غم، کسی چیز کی فکر نہ ہو، سونا اچھالتے ہوئے چلے جائیے کوئی پوچھنے والا نہ ہو، کوئی نظر اٹھا کر دیکھنے والا نہ ہو۔ آپ سوچیے کس چیز کی کمی ہے ......؟ سائنس اور ٹکنالوجی نے اتنی ترقی کی کہ [illegible]، [illegible]، بیماری پر کنٹرول کر لیا گیا، فاصلے ختم کر دیئے گئے۔ مگر بات یہ ہے کہ چیزیں بنیں اور مشینیں ایجاد ہوئیں مگر آدمی نہیں بنا، ان مشینوں سے کام لینے والا جو آدمی تھا، وہ نہیں ......"

مولانا نے آگے چل کر فرمایا کہ:

"آج دنیا کی ساری خرابی یہ ہے کہ آدمی اپنا کام نکالنا اور اپنا الو سیدھا کرنا

چاہتا ہے چاہے کسی کی جان جائے چاہے کسی کے بچے مر جائیں اپنا اُلّو سیدھا ہو۔ سارا فساد اس وقت اسی وجہ سے ہے۔ آج انسان آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتا ہے۔ آدمیوں کو مارنے والوں سے پوچھتا ہوں ذرا بتاؤ تم نے اپنی زندگی میں کتنے بچھو مارے ہیں؟ ایک بچھو نہیں مارا ہوگا، ایک سانپ نہیں مارا ہوگا۔ ایک بھیڑیئے کا شکار نہیں کیا ہوگا تو کیا آدمی ہی رہ گیا ہے مارنے کے لئے؟ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے ہو، کیا آدمی سانپ بچھو سے بھی گیا گذرا ہو گیا؟

کتنے چوہے مارے یہی بتا دیجئے، چوہے کھیتی اور غلے کا بڑا نقصان کرتے ہیں آپ نے کتنے چوہے مارے جو بڑے تیس مار خاں اور رستم بنے ہوئے ہیں اور جن کے ہاتھ انسانوں کے خون سے سُرخ ہو رہے ہیں انھوں نے کتنے موذی جانور مارے ہیں، ایک نہیں مارا ہوگا۔

کسی کے باغ میں جاکر ایک پھول مسل کر دیکھئے، معلوم ہو جائے گا، باغ کا مالک ایک پھول خراب کرنے اور ایک گلاب کا پودا نکالنے کا روادار نہیں تو کیا اس دنیا کا پیدا کرنے والا اپنے چمنستان میں یہ پسند کرے گا کہ وہ بنائے اور ہم بگاڑیں۔ اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ پھول یہ گلدستے، اس کے بنائے ہوئے یہ شیش محل اور تاج محل جس پر ہزاروں تاج محل قربان ہوں، یہ تاج محل کس کا بنایا ہوا ہے انسان کا، انسان کس کا بنایا ہوا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا۔ پھر اس تاج محل کی کیا حقیقت ہے انسان کے سامنے۔ اللہ میاں تاج محل بنائیں ہم توڑ دیں۔ صاف سُن لیجئے۔ فسادات کرکے آدمیوں کو مار کے، رشوت لے کر، کام چوری کرکے ملک رہے گا؟ نہیں۔ چاہے اس کی پشت پر امریکہ ہو یا چاہے روس ہو۔ اپنا گھر ہم بگاڑ دیں گے تو کوئی دوسرا سنبھال نہیں سکتا۔ اپنا گھر اپنے ہاتھ سے بنتا ہے۔ اپنے گھر کو سنبھالئے۔"

(تقریر جاری ہے۔ باقی اگلے ماہ)

- شاداب کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر اپنی زبان کا حق ادا کیجئے۔
- اُردو پرچوں کو خرید کر پڑھیئے اور انھیں ضروریاتِ زندگی میں شمار کرتے ہوئے گھر کے بجٹ میں رقم متعین فرمائیے۔ (ادارہ)



مسعود احمد شیروانی

واشنگٹن میں منعقدہ "یوم سرسید"

ایک یادگار مشاعرہ کی روئیداد

[ہم نے سال گذشتہ ماہ جولائی ۱۹۸۶ء سے نومبر ۱۹۸۶ء تک یورپ اور امریکہ کی سیاحت کی۔ روم، وینس، زیورچ، فرینک فرٹ (مغربی جرمنی)، کولون، امسٹرڈم (ہالینڈ) برسیلز (بلجیم)، پیرس، لندن، نیویارک، واشنگٹن، شکاگو، ڈیٹرائٹ اور کیلیفورنیا جیسے عظیم الشان شہروں کی سیر کی۔ یورپ اور امریکہ کی معاشرت، رہن سہن کے طریقوں کا خود مشاہدہ کیا۔ روم کے ذرہ ذرہ میں تاریخ پوشیدہ ہے جہاں آفاق ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیر نے روم کی تاریخ سے متاثر ہوکر اپنے بیشتر ڈرامے اسی شہر کے پس منظر میں تحریر کئے جو زندہ جاوید ہوگئے ہیں اسی شہر میں اسقف اعظم پوپ کی رہائش گاہ Veticar بھی دیکھی۔ وہ مقام بھی دیکھا جہاں کرسمس اور سال نو کے موقع پر پوپ اپنے معتقدین سے مخاطب ہوتے ہیں۔ عجوبہ روزگار Leaning Tower of Pisa دیکھا، پیرس میں Effel Tower دیکھا امسٹرڈم میں ہیرے تراشنے کے کارخانے دیکھے جہاں ہیروں کی صنعت کا چہار صد سالہ جشن منایا جا رہا تھا لندن کے تاریخی مقامات اور عجائب خانے دیکھے۔ مشہور ناول نگار Agatha Chrishi کا ڈرامہ The Mouse Trap مارٹن تھیٹر میں دیکھا جو ۳۴ سال سے مسلسل دکھایا جا رہا ہے۔ Madam Tussaud کا محیرالعقول عجائب خانہ دیکھا۔ نیویارک میں Liberty کا مجسمہ، یو۔این۔او کی عمارات، واشنگٹن میں علاوہ دیگر مقامات کے White House کے وہ کمرے دیکھے جو سیاحوں کے لئے کھولے جاتے ہیں۔ شکاگو میں دنیا کی بلند ترین عمارت Sears Tower دیکھی جہاں ایک ٹیلیویژن

منزل تک پہنچنے کے لئے صرف ایک منٹ لگتا ہے۔ ڈیٹرائٹ موٹرکار کی صنعت کے لئے مشہور ہے۔ Huntington Beach [illegible] Vista Ford [illegible] ہندوستانی دیکھی اور امریکہ کی سائنسی ترقی دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔ یہ [illegible] کچھ دیکھا۔ مشاہدے کئے لیکن مسرت اور شادمانی ۲۸ نومبر ۱۹۸۶ء کو واشنگٹن میں منعقدہ یوم سرسید کے سلسلے میں مشاعرہ میں شرکت سے ہوئی وہ دنیا کی سیاحت کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ سیر و تفریح اس عظیم الشان مشاعرہ کے مقابلے میں بے اثر محسوس ہوتی ہے جس کی یاد عرصہ دراز تک دل میں موجزن رہے گی۔ میں جنابہ قدسیہ خانم صاحبہ اور ان کی دختر نیک اختر جنابہ تنویر عارف سعید کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اس مشاعرہ میں شرکت کے لئے میرے لئے خصوصی دعوت نامہ کا انتظام کیا۔

(قارئین کی دلچسپی کے لئے اس مشاعرہ کی روئیداد پیش کی جاتی ہے)

" اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ ان کی پرورش کرو۔ ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو۔ مجھ کو تم کچھ ہی کہو۔ میری بات سنو یا نہ سنو، مگر یاد رکھو کہ اگر تم نے ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دی تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت کو دیکھو گے تو بے چین ہو گے، رو دو گے اور کچھ نہ کر سکو گے۔ تم مر جاؤ گے تو اپنی اولاد کو خراب دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ابھی وقت ہے۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ مگر یاد رکھو میں پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ اگر چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ تم اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو مگر تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو کافر، ملحد، نیچری، میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا، میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم ان پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

یہ اس تقریر کا اقتباس ہے جو مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خان نے ۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء کو بمقام لدھیانہ (پنجاب) ایک منعقدہ جلسہ میں کی۔ جب انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، مسلمانان برصغیر کی بدحالی، پستی اور بے بسی کا اندازہ کیا تو بقول خود ان کے ان کا دل بھر آیا۔ سر سید اس حالت زار کا خیال کرتے راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے تھے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے گڑگڑا کر

بارگاہِ الٰہی میں دعائیں مانگتے تھے۔ سرسید احمد خاں کے رفیقِ خاص نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ "میں علی گڑھ میں سرسید کا مہمان تھا۔ ایک رات کو تقریباً ۳ بجے میں نے سرسید کا جواب کمرے گریہ و زاری کی آوازیں سنیں۔ میں ان آوازوں سے بیدار ہو گیا۔ میں گھبرا کر ان کے پاس گیا۔ میرا خیال تھا کہ سرسید کے کسی قریبی عزیز کی وفات کا کوئی تار آیا ہے۔ میں نے سرسید سے دریافت کیا خیریت تو ہے۔ انھوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم تار کی خبر کا پوچھتے ہو، اس سے بری خبر کیا ہوگی اور برا وقت کیا ہوگا؟ ساری قوم تباہی اور مصائب میں مبتلا ہے اور کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا سوائے رونے اور اللہ کریم سے ان کے لئے دعا کرنے کے، اس کے سوا کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ وہی رحم فرمائے گا۔"

مردِ مومن، مجاہد، اور عاشقِ رسول جو صحیح معنی میں مسلمانانِ برصغیر کی نشاۃِ ثانیہ کی خاطر جد و جہد میں مصروف تھے، اس مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے اپنی زندگی اور جان کی بازی لگا دی اور انتہائی بے خوفی سے میدان میں ڈٹے رہے۔ اس مردِ مجاہد کی یاد تازہ کرنے کے لیے امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں یکم اپریل ۱۹۸۷ء کو ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں شرکت کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہوا۔

مشاعرہ کا انتظام واشنگٹن میں واقع نارتھ ووڈ ہائی اسکول کے وسیع ہال میں کیا گیا تھا۔ ہال کو رنگین قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فارغ التحصیل احباب، سرسید کے معتقدین اور علی گڑھ تحریک سے دلچسپی لینے والے مرد اور خواتین پرکشش لباس زیبِ تن کئے جوق در جوق ہال میں داخل ہو رہے تھے اور اپنی اپنی مختص کردہ نشستوں پر وضعداری اور تمکنت سے بیٹھ رہے تھے۔ بہت سے حضرات سیاہ شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنے ہوئے تھے (یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یونیفارم ہے)۔ شب کو ٹھیک ۸ بجے تالیوں کی گونج میں مشہور ہندوستانی اداکارہ شبانہ اعظمی اپنے شوہر جاوید اختر اور دیور سلیمان اختر، ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور ڈاکٹر بشیر بدر اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی واشنگٹن، شکاگو، نیویارک، کیلیفورنیا، کینیڈا اور سعودی عرب سے آئے ہوئے شعرا بھی جلوہ افروز ہوئے اور اسٹیج پر تشریف فرما ہوئے۔

مشاعرہ کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ سورۂ فاتحہ سید ہاشم صاحب نے تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد صدر

جناب احمد عبداللہ نے تقریر کی جس میں سرسید نے ناساعد حالات میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور زبوں حالی کو ختم کرنے کی جو کوششیں کیں ان پر روشنی ڈالی۔

اس کے بعد جناب احمد اللہ نے محترمہ شبانہ اعظمی سے درخواست کی کہ وہ بہ حیثیت مہمان خصوصی تقریر فرمائیں۔ شبانہ اعظمی نے منتظمین جلسہ کا شکریہ ادا کیا کہ ان کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ گو کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انھوں نے تعلیم حاصل نہیں کی لیکن ان کے اس یونیورسٹی سے کئی رشتے ہیں۔ پہلا رشتہ تو یہ ہے کہ جاوید اختر ان کے شوہر ہیں جو مسلمان اختر ان کے دیور، مشہور شاعر جاں نثار اختر، ان کی اہلیہ صفیہ اختر اور اسرار الحق مجاز لکھنوی ان کی سسرال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سسرالی تعلق سے قطع نظر بھی مسلم یونیورسٹی سے ان کو تعلق خاطر رہا ہے۔ شبانہ اعظمی نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی سے محبت اور اردو زبان سے محبت ان کے نزدیک ایک ہی بات ہے۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر اس جملہ پر ختم کی "سسرال میں بہو زیادہ نہیں بولتی" یہ سن کر سامعین نے تالیاں بجائیں۔

اس کے بعد واشنگٹن کی بذلہ سنج شخصیت جناب وراثت کشمیری نے مشاعرہ کی کارروائی کا آغاز کیا۔ مختصر تمہید کے بعد سب سے پہلے محترمہ رشیدہ صبا سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنی نظم سنائیں۔ ان کی یہ نظم بے حد پسند کی گئی۔

اُن کے آنے کی جب خبر آئے | بات بے بات آنکھ بھر آئے
وہ بھی میرے لئے پریشاں ہیں | کاش آئے تو یہ خبر آئے
ہم تو وہ ہیں کہ جان بھی دے دیں | اعتبار آپ کو مگر آئے
وہ ہیں بیگانگی کے پردے میں | میری بیگانگی نظر آئے
کس کی سانسیں ہوئی یہ دستک ہے | جس کو آنا ہے بے خطر آئے

آخری شعر کو بار بار سن کر سامعین نے مشاعرہ کو خراج تحسین پیش کیا۔

اس کے بعد حمید دلسی نے ایک نظم پڑھی۔ ایک شعر کو حاضرین نے بے حد پسند کیا ؎

ساحر ہوا ہے حسن بڑی آب و تاب سے | نکلا ہے کوئی چاند سا چہرہ نقاب سے

وراثت کشمیری نے افتخار سحر صاحب کو دعوت سخن دی جن کے یہ شعر بے حد پسند کئے گئے۔

ان کو چھونے کو دل مچلتا ہے | ان کا چہرہ گلاب جیسا ہے
آج رونا بہت ضروری تھا | اب ذرا دل کا بوجھ ہلکا ہے

حاضرین احمد امین جب مائک پر تشریف لائے تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج گیا۔ وہ امریکہ میں منعقدہ مشاعروں میں بے حد مقبول ہیں۔ انہوں نے یہ شعر پڑھ کر داد و تحسین حاصل کی۔

صبح ہے زخمی سایہ ہے زخمی وہ بھی ساون بھادوں میں
شام تک رستے ہیں کتنے تارے آنکھوں کی سوغاتوں میں

احمد جعفری صاحب کا مزاحیہ کلام سن کر حاضرین نے قہقہے لگا کر داد دی۔

اس کے بعد باری تھی برصغیر کے منفرد شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کی۔ ابھی ودانت کشمیری نے نا کا نام ہی لیا تھا کہ تالیوں کی نہ ختم ہونے والی گونج سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اپنا کلام سنانے سے پہلے حاضرین سے استدعا کی اگر کلام پسند کیا جائے تو وہ داد دینے میں پس و پیش کریں۔ اس سلسلے میں وہ انصاف کے طالب ہیں۔ اس نظم کے ہر شعر پر پُرشور تالیاں بجیں داد و تحسین دی گئی، واہ واہ کے نعرے لگائے گئے۔ حکیم مومن خان مومن کے اس شعر کی زمین میں بشیر بدر نے اپنا کلام سنایا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

×

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی — یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
گفتگو ان سے روز ہوتی ہے — مدتوں سامنا نہیں ہوتا
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں — کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
رات کا انتظار کون کرے — آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

یہ ممکن نہیں تھا اس نظم کے اختتام کے بعد بشیر بدر صاحب سے کلام سنانے کی مزید فرمائش نہ کی جاتی چنانچہ سامعین کے اصرار پر وہ یوں غزل سرا ہوئے اور حاضرین گوش برآواز

ہر لفظ ہو آئینہ، تجھے آئینے میں اتار دوں — تو اس طرف نہ نگاہ کر میں غزل کی پلکیں سنوار دوں
تمام دن کا تھکا ہوا تو تمام شب کا جگا ہوا — ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر ترے ساتھ شام گزار دوں
کبھی یوں بھی آ مری آنکھوں میں کہ مری نظر کو خبر نہ ہو — مجھے ایک بار نواز دے پھر اس کے بعد سحر نہ ہو
بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے — تجھے بھولنے کی دعا کروں تو مری دعا میں اثر نہ ہو
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر بھی رہا کرو — وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

انہی کے بعد تالیوں کی گونج میں اعلان کیا گیا کہ اب اس شاعر کو دعوت سخن دی جا رہی ہے

جو ۴۷ سال کے بعد پہلی مرتبہ مشاعرے میں شرکت کے لئے بطور خاص بمبئی سے تشریف لائے ہیں۔ فلمی دنیا کے کہانی نویس، مکالمہ نویس جن کا نام زبان زد خاص و عام ہے یعنی ڈاکٹر راہی معصوم رضا۔ انہوں نے اپنی مشہور نظم "علی گڑھ" سنائی جس میں ۱۹۴۵ء کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ہنگامی سرگرمیوں اور حالات کا خاکہ کھینچا گیا ہے باوجود نظم کی طوالت کے حاضرین نے نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے یہ نظم سنی اور داد تحسین دی۔

جناب وراثت کشمیری نے اپنے منفرد انداز میں محترمہ رشیدہ حیات صاحبہ کو دعوت سخن دی۔ ان کے یہ اشعار بے حد پسند کئے گئے ؎

میرے گھر میں کوئی سایۂ دیوار نہ ہوگا ہوگا
غم کہ کیوں ہے کوئی غم خوار نہ ہوگا ہوگا
ساری دنیا میں تری سنگدلی کا چرچا
گر علاج غم دل بیمار نہ ہوگا ہوگا

ان کے بعد جناب عزیز الحسن صاحب مائک پر تشریف لائے اور یہ حسرتناک رباعی پڑھ کر گویا ماحول میں سنجیدگی کی فضا پیدا کر دی۔ اس رباعی کو سن کر شاعر کی غریب الوطنی کا سرسید احمد خاں سے اعتقاد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اپنی وابستگی کا اظہار برملا ہوتا تھا۔ سامعین یہ رباعی سن کر جھوم جھوم گئے ؎

وادیٔ علم و ہنر، فکر و سخن چھوڑ آئے
ہم کو سید نے دیا تھا وہ وطن چھوڑ آئے
پر جہاں پر بھی گئے اس کی مہک ساتھ رہی
مدتیں گزریں علی گڑھ کا وطن چھوڑ آئے

رباعی ختم ہوئی اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ تالیاں دیر تک بجتی رہیں۔ اس کے بعد وراثت کشمیری نے سعودی عرب سے آئی ہوئی مہمان شاعرہ شبنم عابد علی سے درخواست کی کہ وہ اپنے کلام سے سامعین کو نوازیں۔ ان کے یہ اشعار بے حد پسند کئے گئے ؎

فاصلہ درمیان رہنے دو
آگ میں اور بہتے پانی میں
ہجر کی رات کٹی درد کے سائے نہ گئے
وہ مرے شہر میں اک بار بھی آئے نہ گئے
عشق کی تان پہ گونجے تھے ہزاروں نغمے
حسن کے ساز پہ دو چار بھی گائے نہ گئے

جناب وراثت کشمیری اپنی بذلہ سنجی سے مشاعرہ کی کارروائی بڑی خوبی اور دلکشی سے چلا رہے تھے۔ سعودی عرب سے آئے ہوئے مہمان شاعر نقوش نقوی کی غزل کے یہ اشعار سن کر حاضرین نے خوب داد دی ؎

ہم منزل جنوں سے کہاں تک نکل گئے
کیا سوچ کر یہ اہل خرد ہم سے جل گئے
ان کی نظر نے ہم کو سہارا دیا بہت
ہم خوش نصیب ہیں کہ گرے اور سنبھل گئے

اس کے بعد وراثت صاحب نے اشتیاق حسین جعفری سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ ان کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا۔

اس دہلیز پہ جب گلدستہ رکھنا
تم بھی میرے نام کا سوکھا پتہ رکھنا

غلام حیدر (ڈاکٹر) پیش کئے ہوئے مہمان شاعر ڈاکٹر ضیا کی نظم کے اس شعر کو سامعین نے خوب داد دی اور تالیاں بجا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔

بجھا دو چراغ چمن کے دیوں کو
نئی شمع محفل میں ہم آ رہے ہیں

رات کافی گزر چکی تھی لیکن حاضرین اور شرکاء مشاعرہ نے شمہ برابر بھی اکتاہٹ یا تھکاوٹ کا اظہار نہیں کیا وہ وقفے کے بغیر شعرا کا کلام سننے پر مصر تھے۔ تاہم ۱۵ منٹ کے وقفے کے بعد وراثت کشمیری نے مشاعرہ کے دوسرے دور کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ تالیوں کی گونج میں ڈاکٹر صاحب نے یہ غزل اور اشعار اپنے منفرد انداز میں سنائے۔

سوچا تجھے، چاہا تجھے، دیکھا تجھے، پوجا تجھے
میری خطا، میری وفا، میری سزا کچھ بھی نہیں

جس پر ہماری آنکھ نے موتی لٹائے رات بھر
بھیجا وہی کاغذ اسے، ہم نے لکھا کچھ بھی نہیں

اک شام کی دہلیز پر بیٹھے رہے وہ دیر تک
آنکھوں سے کیں باتیں بہت، ہم نے کہا کچھ بھی نہیں

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک بار وہ آسمان کا نظام دیں مرے ہاتھ میں

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

بشیر بدر صاحب کی غزل سرائی ختم ہوئی، حاضرین واہ واہ کے نعرے لگا رہے تھے بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ تالیاں بہت دیر تک بجتی رہیں۔ شاعر مسکرا رہا تھا بہت خوش تھا وطن سے ہزاروں میل دور یوم سرسید کے مبارک موقع پر اس سے انصاف کیا گیا اس کے کلام کو پسند کیا گیا۔

جناب وراثت کشمیری نے حامد اللہ انصاری صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے کلام سے حاضرین کو نوازیں۔ حامد اللہ صاحب نے اپنا کلام سنانے سے قبل سرسید کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہماری تہذیب کا زیور ہے۔

ہماری تاریخ ہے، تقدیر ہے۔ اس کی سرحد کسی ایک ملک کی سرحد نہیں ہے۔ اس مادرِ درسگاہ کی علمی اور تہذیبی سرحدیں عالمی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ تالیوں کے شور میں حامد اللہ صاحب یوں غزل سرا ہوئے۔

یہ کیا چمن ہے کہ جس چمن میں ہزار پھولوں میں خار ہوں میں
یہ کیا ستم ہے کہ شہرِ گل میں اک مشتِ غبار ہوں میں
وفا کی راہوں میں مٹ چکا ہوں، میں اُن کے ہاتھوں میں لٹ چکا ہوں
مگر مجھے تم خزاں نہ سمجھو کہ آنے والی بہار ہوں میں

اس کے بعد بمبئی سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب سلیمان اختر سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا تازہ کلام سنائیں۔ ان کے یہ اشعار پسند کیے گئے ؎

لہر کا سر سے گزرنا بھی نہ دیکھا جائے — اور پانی کا اترنا بھی نہ دیکھا جائے
اس کو برداشت نہ تھی ایک خوشی بھی میری — جس سے اب میرا بکھرنا بھی نہ دیکھا جائے
جا بسوں اپنے وطن میں اسے منظور نہیں — میرا پردیس میں مرنا بھی نہ دیکھا جائے

جناب صداقت کشمیری نے جاوید اختر کو دعوتِ سخن دی۔ انھوں نے اپنی طویل نظم "میں اور میری آوارگی" سنا کر سامعین سے داد حاصل کی۔

شب کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے اس کے باوجود حاضرین کا اصرار تھا کہ مشاعرہ جاری رہے لیکن منتظمین سے معاہدہ کے پیشِ نظر جناب عقیل الرحمٰن صاحب کے شکریہ ادا کرنے کے بعد مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

راقم الحروف نے اسٹیج پر پہنچ کر ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، شبانہ اعظمی، جاوید اختر اور سلیمان اختر سے بطورِ خاص ملاقات کی اور مختصراً شیروانی خاندان کے ان بزرگوں کا ذکر کیا جو سر سید احمد خاں کے تحریک کار اور مخلص جاں نثاروں میں شمار کیے جاتے تھے اور جنھوں نے علی گڑھ تحریک کی تائید کی۔ ان بزرگوں میں راقم الحروف کے دادا حاجی محمد اسمٰعیل خاں شیروانی، حاجی موسیٰ خاں شیروانی جن کو سر سید نے ۱۸ سال کی عمر میں ایم اے او کالج کا ٹرسٹی مقرر کیا تھا۔ راقم الحروف کی والدہ ماجدہ کے ماموں سر محمد مزمل اللہ خاں شیروانی جو ایک دور میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، نواب صدر یار جنگ بہادر اور ان کے صاحبزادے جناب حاجی عبیدالرحمٰن خاں شیروانی جو تا اندازاً ۴۰ سال تک مسلم یونیورسٹی کے خازن رہے اور آج کل پرو چانسلر ہیں۔ اور

سریندر دویدی

ہماری معیشت کا مستقبل

ساتواں پنچسالہ منصوبہ ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور مالی پالیسیوں کو ایک نیا رخ دینے بڑے اقدامات کے ساتھ شروع ہوا۔ ملکی معیشت میں اب کئی موافق رجحانات دکھائی دے رہے ہیں۔ اور معیشت کی رفتار ترقی کو بتدریج بڑھایا جا رہا ہے۔ بنیادی سہولیات کا شعبہ اچھی کام کر رہا ہے، قیمتوں کی صورت حال قابو میں ہے۔ محاصل سے حاصل ہونے والی آمدنی بل ذکر اضافہ ہو رہا ہے اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیروں کی سطح بھی اطمینان بخش ہے۔

ساتویں پنچسالہ منصوبے کے پہلے دو برسوں میں ملک 1984-85 کی قیمتوں کی بناء پر فی صد مرکزی نشانوں کے لئے سرمایہ مہیا کرنے میں کامیاب رہا ہے جو کہ ایک بہتر کامیابی ہے ہماری معیشت میں موافق رجحانات کے باوجود دو ایسے شعبے بھی ہیں جو باعث تشویش ہیں ادائیگیوں کا توازن اور حکومتی اخراجات میں تیزی سے اضافہ۔ موجودہ منصوبے کے تین برسوں میں مرکزی مالی امداد کی کل رقم 13200 کروڑ روپئے ہو جانے کا امکان ہے یہ پورے پچھلے منصوبے میں صرف 10788 کروڑ روپئے تھی۔ ان بڑے بڑے امور سبب ہی آئندہ برس کے بجٹ میں 5 ہزار کروڑ روپئے کے خسارے کا امکان ہے اور خسارہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا لیکن ملک کی معیشت اسے برداشت کر سکتی ہے۔

1979-80 میں ملک کو 2427 کروڑ روپئے کا خسارہ ہوا تھا جو مجموعی ملکی پیداوار کے 2.28 فی صد اور مجموعی سرکاری اخراجات کے 13.1 فی صد کے برابر تھا 1985-86 کے بجٹ میں 4490 کروڑ روپئے کا خسارہ ملک کی مجموعی پیداوار فی صد اور حکومت کے کل اخراجات کے 3.3 فی صد کے برابر تھا۔ امید کی جاتی ہے جس طرح سے گذشتہ برس کا خسارہ برداشت کر لیا گیا تھا اسی طرح ملکی معیشت آئندہ کے خسارے کو بھی برداشت کر لے گی اور اس سے افراط زر میں اضافہ نہیں ہوگا

محاصل سے آمدنی میں قابل رشک ریکارڈ کے باوجود مرکزی سرکار کے بجٹ میں

متاثر ہماری دباؤ پڑ رہا ہے کیونکہ اخراجات اور خاص طور پر غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مرکزی سرکار کے غیر منصوبہ جاتی اخراجات 60 ہزار کروڑ روپیے کی مجموعی آمدنی کے 90 فیصد حصے کے برابر ہیں جس کا مطلب ہے کہ آئندہ برس 88 ہزار کروڑ روپیے غیر منصوبہ جاتی اخراجات پر لگا دیا جائے گا۔ یہ بھاری غیر منصوبہ جاتی خرچ ملک کی منصوبہ جاتی ترقی کو بہت نقصان پہنچا رہا ہے۔ غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں اگلے برس قرضوں پر 10510 کروڑ روپیے کی سود کی ادائیگی شامل ہے جو رواں سال کی نسبت 1400 کروڑ روپیے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی ملازموں کی تنخواہوں کے کمیشن نے مزید 1500 کروڑ روپیے کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ ملک گرد سلامتی کے بگڑتے ہوئے ماحول اور ہمارے ہمسایہ ملک میں جدید ترین ہتھیاروں کی آمد نے بھی ملک کو اپنے بیش قیمت مالی وسیلے دفاع پر خرچ کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ ان تمام واقعات کے سبب ملک کا دفاعی بجٹ بڑھ کر 12 ہزار کروڑ روپیے ہو جانے کا امکان ہے جو رواں سال کے بجٹ سے بقدر 3200 کروڑ روپیے زیادہ ہے۔ حکومت کے روز افزوں اخراجات کی جانب فوری توجہ اور دلیرانہ فیصلوں کی ضرورت ہے۔

حکومت نے ہماری ترقی پذیر معیشت میں خطرات کے ان اشاروں کی جانب توجہ دی ہے اور کچھ اصلاحی قدم اٹھائے گئے ہیں۔ حکومت نے اس برس سے صفر بنیادی بجٹ کا سلسلہ شروع کیا ہے جسے وقت پا کر اور مضبوط کیا جائے گا۔ عام اخراجات میں پانچ فی صد کی کٹوتی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے آئندہ کچھ برسوں میں اپنے اخراجات رواں سال کے اخراجات کی حد تک برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری دائرہ کار کے اداروں کے خسارے کو کم کرنے کے لئے اقدام بھی اٹھائے گئے ہیں۔

بنیادی سہولیات کے شعبے کی رکاوٹیں اکثر بھارتی معیشت کے لئے اکثر تکلیف کا باعث رہی ہیں لیکن رواں سال میں اس شعبے کی کارکردگی بہتر ہوئی ہے۔ اپریل تا ستمبر 1986 کے مہینوں میں بجلی کی تیاری میں گذشتہ برس کی اسی مدت کے مقابلے میں 10 فی صد اضافہ ہوا ہے خام تیل کی پیداوار میں 8 فی صد اور کوئلے کی پیداوار 1985-86 کی اس مدت کے مقابلے میں 7.7 فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ چیز غور کرنے کے قابل ہے کہ پچھلے منصوبے میں بھارتی معیشت میں 5 فی صد سالانہ ترقی ہوتی رہی ہے اور 1985-86 میں بھی شرح کا تخمینہ 5 فی صد کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ چھ برس میں بھارتی معیشت لگاتار 5 فی صد سالانہ سے ترقی کرتی

ہے جبکہ اس سے پہلے طویل المدت ترقی کی شرح 3.3 فی صد تھی۔ ملک کے بعض حصوں میں
برفتوں کی بارشیں نہ ہونے کے باوجود زرعی پیداوار میں اس برس کچھ اضافہ ہوا ہے
اور قومی آمدنی میں بھی تحت منصوبہ اضافہ متوقع ہے۔

اگرچہ مرکزی بجٹ پر ہمیشہ دباؤ رہا ہے لیکن منصوبہ جاتی سرمایہ کاری کی رفتار برقرار رکھی
ہے اور حکومت کو افراط زر پر قابو پانے میں کامیابی ہوئی ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں
افراط زر کا تناسب جس کا اندازہ قیمتوں کے عدد اشاریہ سے لگایا جاتا ہے 6 فی صد سالانہ
ہے۔ جبکہ کچھ دوسرے ملکوں میں اسی مدت میں افراط زر کی شرح 30 فی صد سالانہ سے
زیادہ رہی ہے۔ یہ ملک کی ترقی پذیر معیشت کی ایک کامیابی ہے۔

سال رواں میں تھوک قیمتوں کے اشاریہ میں اضافے کے سلسلے میں حکومت پر نکتہ چینی کی جاتی
ہے۔ رواں مالی سال میں تھوک قیمتوں میں اضافے کا سبب گھی اور خوردنی تیلوں کو قرار دیا
گیا ہے۔ خوردنی تیلوں اور تلہن کی قیمتوں میں اضافہ حکومت کی طرف سے ملک کے تلہن کے
کاشتکاروں کو قیمتوں میں ترغیب عمل دینے اور خوردنی تیلوں کی درآمد پر انحصار کم کرنے کی پالیسی
کا نتیجہ تھا۔ اس حکمت عملی نے اچھا کام کیا ہے اور اس برس خوردنی تیلوں کی درآمد مالیت پچھلے
سال 1984-85 کے مقابلے میں 50% کم رہنے کا امکان ہے۔ حکومت ملک میں تلہن کی پیداوار
بڑھانے کے لئے کسانوں کو منافع بخش قیمتوں کی ادائگی کا یقینی اہتمام کرنا چاہتی ہے۔

چینی کی متواتر درآمد بھی باعث تشویش ہے۔ ہم ملک میں چینی کی پیداوار میں اضافے
اور ترغیب عمل سے چینی کی درآمد کم کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر گنے کی قیمت
بڑھا کر 18 روپئے کوئنٹل کر دی گئی ہے۔ گزشتہ دو برسوں میں گنے کی قیمت بڑھنے
کے سبب ملک کی چینی کی پیداوار میں اضافے کا رجحان نظر آ رہا ہے۔ رواں مالی سال
چینی کی درآمد میں 75 فی صد کی کمی کی گئی ہے۔ حکومت کو توقع ہے کہ آئندہ کچھ برسوں
میں ترغیب عمل کی قیمتوں کی پالیسی سے چینی کی درآمد کی ضرورت نہیں رہے گی۔

تجارتی خسارہ ایک اور مشکل شعبہ ہے جس سے ادائیگیوں کے توازن کا مسئلہ پیدا ہوا ہے
1985 کے برس میں بھاری درآمدات اور کم برآمدات کے سبب سب سے زیادہ تجارتی خسارہ
ہوا ہے۔ ایک برس کے عرصے میں حکومت نے برآمدات کی رفتار تیز کرنے اور درآمد کردہ اشیاء
کی متبادل اشیاء ملک میں تیار کرنے کے سلسلے میں کئی قدم اٹھائے ہیں۔

سال رواں کے پہلے چھ ماہ میں درآمدات میں کمی کا رجحان آیا ہے اور برآمدات

میں بھی کچھ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتویں منصوبے کے آخر تک کیمیاوی کھادوں کی درآمد میں بھی بھاری کمی ہو جانے کا امکان ہے کیونکہ موجودہ منصوبے میں کیمیاوی کھاد کے متعدد کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔ کھاد کارخانے دو برس کے اندر اندر کام شروع کر دیں گے۔ ملک میں کیمیاوی کھادوں کی تیاری سے اس چیز کی درآمد کافی کم ہو جائے گی۔

اگلے پانچ برسوں میں حکومت کی طرف سے منصوبہ جاتی کاموں پر لگائے جانے والے سرمائے کا تخمینہ 24000 کروڑ روپئے کا ہے۔ یہ رقم محاصل سے متوقع آمدنی سے فراہم کی جا سکتی ہے مرکزی ادارہ شمار کے اداروں کے اندرونی اور خارجی آمدنی کے وسائل کا اندازہ (10700) کروڑ روپئے کا ہے۔ اگلے برس سرکاری ادارے کا زر رواں مالی سال کی نسبت قریب 2000 کروڑ روپئے زیادہ مہیا کرے گا۔ حالانکہ یہ مشکل کام ہے لیکن اگر یہ نشانہ حاصل ہو گیا تو ایک یا دو برس میں یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

اگرچہ ملکی معیشت کی حالت کے بارے میں ماہرین اقتصادیات اور دانشوروں میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ ملک کی ترقی پذیر معیشت افراط زر پر قابو پانے اور فی کس آمدنی میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ غیر ملکی زر مبادلہ کی صورت حال کو تسلی بخش سطح پر برقرار رکھا جا رہا ہے اور صنعتی اور زرعی پیداوار بڑھ رہی ہے یہ سب امور ہماری معیشت کی داخلی قوت کے مظہر ہیں اور مستقبل کے لئے امید افزا ہیں۔ ●●

۷ والد محترم پروفیسر ہارون خاں شیروانی جو عرصہ دراز تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے (سر سید کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ان کے رفیق دیرینہ حاجی محمد اسمٰعیل خاں شیروانی کی کوٹھی "دارالامن" علی گڑھ میں گویا کہ پائے یار پر ہوا۔)

راقم الحروف نے شبانہ اعظمی، جاوید اختر اور سلمان اختر کو بتایا کہ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۹ء علی گڑھ یونیورسٹی میں دوران تعلیم مشہور انقلابی شاعر اسرارالحق مجاز لکھنوی اکثر "شرف منزل" تشریف لاتے تھے جو راقم الحروف کا آبائی مکان تھا۔ علی گڑھ میں منعقدہ مشاعروں میں مجاز کے کلام کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ یہ سن کر جاوید اختر بہت خوش ہوئے اور جب راقم الحروف نے ان کے آٹوگراف اور ایک شعر لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا کہ "حضور! مجھے تو آپ کے آٹوگراف لینے چاہئیں۔ آپ تو مجاز کے ہم عصر تھے۔" میرے اصرار پر جاوید اختر نے مجاز لکھنوی کا یہ شعر لکھ کر دستخط کر دئیے

باقی بر صفحہ ۲۸

پروفیسر غوث ساجد

… ہوا ہے …

…بدنامی سے چلا آنے والا یہ نظریہ یقیناً کسی قبولیت پسند انسان کا ہی ہو گا کہ زندگی …ا کچھ نہیں، بلکہ ایک خارزار ہے۔ اگر اس نظریہ سے اتفاق کر لیا جائے تو پھر …زندگی میں کون سی کشش اور کون سی دلکشی باقی رہ جاتی ہے۔ نہ جرات نہ جولانی۔ نہ …جانے کی ہمت، نہ عزم اور ارادے کی کوئی اہمیت۔ ایسی حالت میں نہ کوئی دلنشین …ار رہ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی رنگینی ہمیں اپنی جانب راغب کر سکتی ہے۔ اپنے روزمرہ …بار میں بھی ہم اپنی توجہ اور دلچسپی کو برتنے کا رنگ نہیں لا سکتے۔ اگر ایسا ہو تو ہماری اپنی زندگی کے …روز سوائے بیزارگی، یاسیت اور وحشت سامانی کے، ہمیں اور کچھ بھی تو مہیا نہیں کر سکتے …میں زندگی، خالق دو عالم کا دیا ہوا بیش بہا تحفہ بھی تصور نہیں کی جا سکتی بلکہ ایک سزا …تسلسل کہلائی جا سکتی ہے۔ بقول شاعر ؎

…ہے کہ گھلتی ہے ہمیں کیا معلوم ہم جیئے جاتے ہیں، اک مرگِ مسلسل کی طرح

…ں کے تعلق سے یہ یقین دراصل خدائے برتر کی مصلحت اور منشا کے عین خلاف ہے …بھی گمراہی کی جانب دھکیلتا ہے۔ جس سے ہماری بندگی کے داغدار اور مشکوک ہونے کا …پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اگر بندگی ہی ایسی ہو جائے تو پھر ہمارا یہ وجود، اس سطح زمین پر …لیسندیدہ اور بے مقصد بوجھ نہیں تو اور کیا ہو جائے گا۔

…پر جانبدارانہ طور پر اگر غور کیا جائے تو انسان کی زندگی، ایک آخرش ہی ہے جس …

شعبۂ انگریزی، پرتشٹھان کالج، پیٹھن، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹرا

میں کامیابیاں، ناکامیاں، مسرتیں اور محرومیاں، ہار اور جیت، سب کچھ لگے رہتے ہیں۔ کبھی راحت تو کبھی تکلیف، کبھی شربو کر دینے والی تیز دھوپ تو کبھی ٹھٹھرا دینے والی سردی، کبھی آسانیاں تو کبھی مشکلات۔ کبھی فیل بے زنجیر کی طرح دوڑتے والے بادل آسمان میں چنگھاڑتے رہتے ہیں تو کبھی سایہ دار درختوں کو بے لباس کر دینے والے ظالم موسم خزاں کا بھی دور دورہ رہتا ہے۔ لیکن وقت کو بدلتے ہوئے کچھ دیر نہیں لگتی کچھ ہی مہینوں بعد خوشبو اور ہنستی مسکراتی کلیوں کو گدگداکر، شاداب پھولوں میں تبدیل کر دینے والا موسم بہار بھی اپنا جلوۂ حسن دکھاتا ہے۔ ایسے حالات اور ایسے مناظر کی تبدیلی خود قدرت اس منشا سے کرتی ہے کہ انسان کو غور و فکر کرنے کا درس ملے۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تبدیلی نظام زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ بچپن سے لڑکپن، پھر شباب اور ضعیفی ان ہی حالات اور مناظر کی تبدیلی کا اظہار کرتے ہیں۔ جن سے عملی طور پر ہماری زندگی ہو گزرتی ہے۔ اگر یہ تبدیلیاں واقع نہ ہوں تو ہمارے علم و تجربات میں اضافہ کہاں سے ہو سکے گا۔ نہ احساس کو بلوغیت ہی نصیب ہو سکے گی اور نہ ہی ذہن میں کوئی پختگی آ سکے گی۔ اور پھر ہر دن عید کا دن بھی تو نہیں ہوتا کہ حلوے مانڈے اور مرغن غذائیں کھائی جائیں۔ اگر خدانخواستہ صرف ایک ہی ہفتہ کی مدت تک ہر روز عید منائی جائے تو ہم اپنے ہی مرغوب ذائقوں سے بیزار آ کر صدائے احتجاج بلند کرنے والوں کی صف میں شامل رہیں گے۔ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ اگر ایک سے دوسری مرتبہ، وہی بریانی، وہی نان قلیہ، یا وہی کھانے دسترخوان پر چنے جائیں تو یقیناً آپ ہم اپنی ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ یا پھر اگر ہم تلون مزاج ہوں تو بھوک ہڑتال کو بھی ترجیح دے سکتے ہیں۔ بعض ایسا ہی کچھ ملا جلا حال، ہماری خوشیوں اور غموں کا بھی ہے۔ جن کی ہر وقت واقع ہونے والی تبدیلیوں سے ہم چاق و چوبند رہتے ہیں۔ ان ہی کے تانوں بانوں سے ہماری زندگی کا لباس تیار ہوتا ہے۔ صرف آرام و آسائش، تن آسانی اور بے فکری ہمیں بیزارگی کے دامن میں ڈھکیل دیتی ہے۔ دنیا میں شائد ہی کوئی انسان ایسا ہوگا جس کے حصے میں ہمیشہ محرومیاں، ناکامیاں اور ناامیدیاں ہی دھرنا دے بیٹھی ہوں گی۔ پھر انسانی زندگی میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ اپنی خوشیوں اور آسائشوں کو تو دل و جان سے چاہتا ہے لیکن چند غموں کے حائل ہونے پر شکوہ و شکایات اور آہ و فریاد کے دفتر کھول دیتا ہے اور قنوطیت پسند بن کے منشاء قدرت کی مخالفت پر تل پڑتا ہے۔ اپنا حوصلہ اور تحمل کھو بیٹھتا ہے۔ ان سب کا سبب یہ نظر آتا ہوتا ہے کہ اس کی نفسیات میں جرات مندانہ جذبات نہیں ہوتے اور اس کی فطرت

ت و برداشت کا نقصان ہوتا ہے۔ دشواریاں، مشکلات اور مصیبتیں انسان کی زندگی محض اسی لئے آتی ہیں کہ وہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور خود میں ایک قوت برداشت بہت پیدا کرے۔ ہر گزرنا کے مصائب و مشکلات کو ہنستے ہوئے جھیلتے ہوئے عمل کرنا یا اور اچھی توقعات پر اطمینان رکھنے والے جذبہ کو ہم رجائیت پسندی کہتے ہیں جو قنوطیت کے بالکل مخالف جذبہ ہے۔

آپ نے یہ سادہ، لیکن معقول شعر اپنی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں ضرور سنا ہوگا۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں تو ہم میں یقیناً زندہ دلی ہونی چاہئے۔ جرأت مندانہ چاہئے، جو ہمیں رنجیدہ کرنے والے حالات، تفکرات اور درپیش مشکل امتحانوں میں بھی ہمارے چہروں پر تبسم کی تازگی بکھیرے رکھے اور ہمیں وہ حوصلہ عطا کرے جس سے اپنے مسائل اور پریشانیوں کو حل کرنے کے خود ہی اہل بن جائیں۔ اگر ایسا ہو تو ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ رنج و الم رفو چکر ہو کر راحتوں میں بدل جائیں گے۔ مایوسیاں جھلملاتی امیدیں بن کر ہمارے روبرو رقصاں ہوں گی۔ حضرت غالب نے بڑی صاف دلی سے ایسی ہی تاکید فرمائی ہے:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

محنت و مشقت سے منہ موڑنا، مشکلوں اور مصیبتوں سے جان چرانا، دراصل زندہ دلانہ زندگی کے عین مخالف ہے اور قدرے ہمارے وجود کی بھی توہین۔ صرف آرام طلبی، سکون پسندی اور آسانی ہمیں کاہل و ناکارہ بناتے ہوئے ہوس پرستی کی بنا ڈالتی ہیں جس کی وجہ سے ہماری ترقی، جد و جہد، تجسس اور جانفشانی کے جذبات پر پالا پڑ جاتا ہے۔ اس موقع و محل پر بھی حضرت غالب ہماری رہنمائی فرماتے ہیں:

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا؟

لفظ مرنا یہاں دو معنی ہے۔ ایک تو وہ مرنا ہے جس کی وجہ سے دنیوی رشتہ داریاں، مسائل، رنجشیں اور الجھنیں سب ہی ختم ہو جاتی ہیں اور دوسرا مرنا وہ ہوتا ہے جو ہمیں زندہ رہتے ہوئے بھی انتہائی پسند ہوتا ہے۔ جیسے دولت و شہرت کے لئے مرنا، کسی کی چاہت اور خوبیوں کے لئے مرنا، کسی کے دیدار اور قربت کے لئے مرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس مرنے میں [illegible] مل سکتا ہے اور باوجود کوشش کے بھی انسان اسے حاصل [illegible]

ڈوبے مرنے کے خوف سے غالب لرزتے ہیں ؎

[illegible] کیا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

غالب کا یہ بیان کہ ان کی ہمت، دشواریوں کو پسند کرتی تھی اور خوف و خطر میں مبتلا رہنے کو لذت سمجھتی تھی، بڑے حوصلہ اور نفسیاتی طاقت کی شہادت ہے۔ پہلے اہل حضرت غالب جان دینے کو مشکل کام سمجھتے تھے لیکن جب خم ٹھونک کر، وہ اس کے لئے تیار ہو ہی گئے تو انہیں تجربہ ہوگیا کہ جان دینا جیسا کام بھی آسان نکلا۔ ہمارا تو سرے سے عالم ہی نرالا ہے۔ ہم تو صرف دشواریوں کے نام سے ہی خوف کھا کر لرز اٹھتے ہیں۔ تو بھلا انہیں چاہ کر اپنا جان جوکھم میں کون ڈالے۔ دراصل اس معاملے میں صرف ہماری کم ہمتی کے عیب و قصور ظاہر نہیں ہوتے بلکہ ہمارے اعتبار کی کمزوری بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اگر ہمارا جذبہ اس قدر ناتوانی کا شکار ہو تو پھر ہمارے دل کی ہر دھڑکن گھبراہٹ کا پیغام نہ لائے گی تو کیا قوس و قزح کی رنگینیاں لائے گی۔ حضرت غالب بھی ہماری طرح ایک انسان تھے لیکن ہم سے بہت بالاتر۔ نہایت نڈر اور جرأت مند۔ کم سے کم عشق کے میدان میں تو واقعی وہ انتہائی بے باک اور بے خوف و خطر عاشق تھے۔ فرماتے ہیں ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

اگر عشق میں اس قدر سختی ہو تو ہم تو سرے سے توبہ ہی کر لیں اور ہو سکتا ہے کہ راہ فرار اختیار کرنے کی خاطر جلاوطنی کو بھی ترجیح دے دیں۔ دراصل ہم حوصلہ و ہمت، جانثاری و جاں نثاری، خود سپردگی اور قربانی جیسی اعلیٰ خصوصیات سے بالکل عاری ہوتے ہیں اور عشق جیسے جذبات میں تو ان تمام کی لمحہ بہ لمحہ ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ادھر اعتراضات کرنے والوں کی اطراف و اکناف میں کمی نہیں ہوتی اور ادھر رقیب و دشمن معمول کے مطابق طرح طرح کی تہمتیں اور بہتان تراش کر دل و دماغ کے سکون کو بری طرح متاثر و مجروح کر ڈالتے ہیں۔ پھر بھی حضرت غالب نے والہانہ عشق میں نہ کوئی کمی ہی ہونے دی اور نہ ہی وہ اپنے شدید مخالفین اور حریفوں سے خوفزدہ ہوئے۔ فرماتے ہیں ؎

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

کیا یہ جذبہ صبر و برداشت کی حد نہیں۔ اس پر بھی انھوں نے ذرہ برابر ناامیدیت کا اثر قبول نہیں کیا اور خیالی زندہ دلی جیسی کی ایک ارمانوں [illegible] کر گئے

ستمگر کو تم بھی بد دعا دیں اور شہیدان کے متعلق تکلیف دہی کا کوئی مقصد اثر کیا ہے جیسے ستم ان پر ڈھائے اور توڑے جاتے وہ ستمگر کو اپنے قریب تر اور عزیز تر پاتے ہے

ہو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

ستم اور جور و جفا کو اپنے لئے الطاف و کرم سمجھنا واقعی کمال آدمیت اور کمال ہمت ہماری کوئی ذرا سی بھی توہین کرے یا ہمیں ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کرے تو ہم بے ہو کر انتقام لینے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھا لیتے ہیں۔ ستم برداشت کرنے کی بات تو کجا ہے۔ لیکن حضرت غالب انتقام لینے اور غم و غصہ کرنے کو انسان کی کمزوری گردانتے تھے ان کا کمال بلند پایہ تھا۔

جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالتے گئے — بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

ایک قدم اور آگے۔ ذلت تو پہلے پہل انفرادی اور محدود ہوتی ہے لیکن رسوائی تو اجتماعی ہوتی ہے۔ اپنی رسوائی برداشت کرنا اور رسوائی کی خاطر ترتیب دیئے ہوئے میں خود بھی شرکت کرنا، نہ کوئی معمولی بات ہے اور نہ ہی مذاق۔ بلکہ حضرت غالب کی ہمت، حوصلہ اور زندہ دلی کی ایک اعلیٰ اور معیاری مثال ہے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

یہ غالب کی کامرانی اور ان کے تماشہ گر مخالفین کی شکست ہے۔ صرف اپنی شرکت سے اپنے حریفوں کو نادم اور شرمسار کرنا، جرأت رندانہ کی سند ہے جس کا کوئی ماوس فطرت انسان کبھی اہل نہیں ہو سکتا۔ عشق صادق، اکثر مختلف قسم کی قربانیوں کا متلاشی رہتا ہے۔ اپنے عشق کی سرخروئی کے لئے غالب نے باشعورانہ قربانی کے لئے اپنے آپ کو بخوشی تیار رکھا جو دنیا کی کسی اور شئے کی نہیں بلکہ بیش بہا جان کی تھی۔ آپ سوچئے، معمولی سے معمولی انسان بھی اپنی جان کی کس قدر قدر کرتا ہے، لیکن غالب تھے کہ اپنی جان بھی بڑی مسرت کے ساتھ دینے کے لئے تیار۔ زندہ دلی کی ایسی مثال شاذ ہی کہیں اور مل سکے۔ فرماتے ہیں ؎

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے — جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

میں چاہتا ہوں کہ وہ قابل صد تعریف ہیں۔ لیکن ان کا معشوق اتنا بے رحم اور سنگدل تھا کہ غالب سے قطع تعلق کا کبھی گمان بھی نہیں کیا۔ درحقیقت غالب جیسا چاہنے والا

میں الجھتے شاعر شاعرانہ کرنا اور ہو سکے۔ انہیں دلی خوشی ہوتی جب وہ اوروں کے لئے تسکین جیتے اور چاہتے کہ وہ مصیبت کے ماروں کی حسب المقدور خدمت کر سکیں۔ فرماتے ہیں
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب! ــــــ اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

اپنے عشق کی راہوں میں غالب ہمیشہ سرگرداں رہے اس قدر کہ ان کے پیروں میں آبلے سا آبلے رونما ہو گئے۔ اور اندر ہی اندر کی کسک سے انہیں تکلیف لاحق ہو گئی۔ حالانکہ غالب عملی زندگی میں، مجنوں و فرہاد کی طرح دشت گردی کے عادی نہیں تھے۔ لیکن شاعرانہ تخیل اور کیفیت میں یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ غالب آرام و سکون سے گھبراتے تھے۔ آئے دن کی ان گنت پریشانیوں اور مصیبتوں نے انہیں اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ وہ دقتوں دشواریوں کو پسند کرتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کا سلسلہ جاری ہی رہے تاکہ وہ عالم جمود سے محفوظ رہیں۔ اور ان کی زندہ دلی و حرارت مندی آئے دن نکھرتی ہی رہے۔ اپنے احساسات کا اظہار غالب کچھ یوں کرتے ہیں ــ

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ــــــ جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

سلسلہ صفحہ ۲۲

ان کا کرم ہے ان کی محبت ــــــ کیا میرے نغمے کیا میرے جلوے

تازگی اور یادگار مشاعرہ ختم ہو چکا تھا۔ مدعو حضرات اپنی رہائش گاہوں پر واپس جانے لگے۔ ہر ایک کے چہرے پہ تازگی تھی۔ تھکن شمہ برابر بھی نہیں تھی۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں پر جو احسان عظیم کیا تھا اس کے چرچے ہو رہے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کی موجودہ حالت پر مجھ سے استفسارات کئے گئے۔ اس مشاعرے میں مسلمان شرکاء کے دوش بہ دوش غیر مسلم حضرات نے بھی شرکت کی۔

اسرار الحق مجاز لکھنوی نے تقریباً نصف صدی قبل اپنی مشہور نظم "ترانۂ علی گڑھ" میں جو پیش قیاسی کی تھی وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ اسی نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں ــ

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا ــــــ ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہ گراں پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا ــــــ ہر شہر طرب پر گرجے گا، ہر قصر طرب پر کڑکے گا

یہ ابر ہمیشہ برسا ہے
یہ ابر ہمیشہ برسے گا

٭٭٭٭

عبدالعزیز عرفان ایم۔ اے، بی۔ ایڈ



قلعہ گاویل گڑھ' کا شمار صوبہ برار کے مشہور و مستحکم قلعہ جات میں سرفہرست ہے رہنمائی کا مصنف اسے ہندوستان کا مشہور و مستحکم پہاڑی قلعہ کہتا ہے کیونکہ کوہ پڑا پر آسمان سے باتیں کرتا ہوا گاویل گڑھ کا مضبوط و مستحکم قلعہ اپنی آن بان کے دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے برار کے ایک مایۂ ناز مورخ شاعر نے کہا ہے ؎

بہ رفعت گزشتہ ز چرخ بلند   بہ نیمہ ابدش پیک اندیشہ بند

امراوتی گزٹیر اس کے متعلق یوں روشنی ڈالتا ہے ؎

'Gawilgodh is a fortress of almost matchless str

یہی وجہ ہے کہ قلعہ ناقابل تسخیر تھا۔ اس قلعہ کو فتح کرنا آسان کام نہ تھا۔ زمانہ یں دکن سے یا دکن کے صوبہ داروں یا راجاؤں کے درمیان آئے دن جنگیں ہوا کرتی ۔ ایلچپور کوئی ایسا مخصوص مقام نہ تھا کہ دشمنوں کے حملوں کو روک سکتا تھا۔ اس دشاہ وقت عمادالملک نے گاویل گڑھ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ قلعہ ست پڑہ کی تنگ ں میں تعمیر کیا گیا ہے۔ تنگ گھاٹیوں سے راستہ جاتا ہے۔ یہاں سے فوج لے کر ر قلعہ پر چڑھائی کرنا مشکل تھا۔ دوسرے یہ علاقہ دہلی اور دکن کے درمیان ایک بی کی حیثیت رکھتا تھا۔ بادشاہ وقت یہاں قیام کرتے اور اپنی یادیں چھوڑ جاتے تھے۔

قلعہ گاویل گڑھ سطح سمندر سے بقول ڈاکٹر محمد یسین قدوسی ۳۵۹۵ فٹ بلند ہے

جس کو مورخین ۲۶۶۶ فٹ بلند [illegible] ذکر کر [illegible] قلعہ ۴ میل کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

برار کے مایۂ ناز مورخ سید احمد حسین خطیب ایلچپوری اپنی کتاب "تاریخ امجدی" میں قلعہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"وجہ تسمیہ آنکہ این اسم گاویل ہست کہ اکثر قدیم تا حال قوم گوالیان و شبانان چہ در جبال و چہ در صحراہا برائے حفاظت گاو و شاں و گاوان خود بنا نہادہ در زمان حصاری کی ترتیب دادہ سکونت می داشتند علی ہذا القیاس گوالیان چند جمع شدہ حصاری ساختہ موسوم بہ گاویل گڑھ کردہ بودند۔"

بادشاہ علاء الدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر حملہ کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام کا پرچم فتح و نصرت دکن کی پہاڑیوں پر پوری آب و تاب کے ساتھ لہرانے لگا۔ اس کے بعد ۱۳۴۷ء سے دکن کی خود مختار بہمنی سلطنت کا آغاز ہوتا ہے۔

مشہور مورخ فرشتہ قلعہ کی تعمیر کے متعلق رقمطراز ہے:

"۱۴۲۵ء میں بہمنی خاندان کے بادشاہ احمد شاہ بہمنی اول نے ایلچپور میں قیام کیا قلعہ گاویل کو احداث کیا اور قلعہ نرنالہ کی مرمت کرکے مراجعت کی۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول)

سید احمد حسین خطیب تاریخ امجدی میں یوں رقمطراز ہیں:

"چنانکہ احمد شاہ بہمنی ہم در حین قیام بلدہ ایلچپور احداث قلعہ گاویل و مرمت نرنالہ کردہ بود در سنہ ۸۹۲ھ"

اکثر و بیشتر مورخین احمد شاہ ولی کو قلعہ کا بانی سمجھتے ہیں۔ اکولہ گزیٹیر۔ امراوتی گزیٹیر۔ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، اسی بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی مادہ تاریخ (Chronogram) کے مطابق قلعہ کی تعمیر ۱۴۲۵ء بمطابق ۸۲۹ھ میں کی گئی تھی۔ وہ میجر ہیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی کتاب "پریما منگل برار" میں لکھتے ہیں:

"According to chronogram the fort was completed in 829/A.H./1425 A.D. Major T.W. Haig has wrongly dated it 892 A.H."

بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ احمد شاہ بہمنی نے قلعہ گاویل گڑھ کی تعمیر کی تھی۔

"بیرکی آمد و عمارت نو ساخت" کی ضرب المثل کے مطابق قلعہ کی تعمیر اسی میں عہد بہ عہد
مرمتیں اور اضافے ہوتے رہے۔ "مراۃ الاسرار" کے بیان کے مطابق سلطان محمود شاہ
دوم کے زمانے میں صوبہ دار مطلق العنان ہو گئے اور عماد الملک جو صوبہ برار کا گورنر تھا
اور گاویل کا قلعہ دار بھی رہ چکا تھا، ۱۴۹۰ء میں خود مختار ہو گیا اور ۱۵۰۴ء میں قضا کی
چنانچہ ڈاکٹر سیدہ وسیم درودانہ لکھتی ہیں ؎ "فتح اللہ عماد الملک نے ایلچپور کی
عیدگاہ تعمیر کروائی۔ قلعہ گاویل اور قلعہ نرنالہ کو ایک نیا روپ دیا، اس نئے روپ
میں جامع مسجد، دہلی دروازہ اور فتح دروازہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فتح اللہ نے
یہ کام ۱۴۸۸ء میں انجام دیا۔ فتح دروازہ کے کتبہ کے مطابق ۱۴۸۸ء میں تعمیر کا کام ہوا
اس کا کتبہ بہت ہی شکستہ ہے۔ دہلی دروازہ پر راجگان بیجاپور کے قومی نشان
گنڈ ابھرنڈا کی تصویر ہے۔ جس میں دو سری عقاب چونچ میں ہاتھی کو پکڑے بنایا گیا ہے
اس کے علاوہ بادشاہ نے جامع مسجد کو بھی ایک نیا روپ دیا۔ فتح دروازہ کے
کتبہ میں جامع مسجد کا بھی ذکر ہے۔ جس میں "بابیت سرور" مادہ تاریخ ۱۴۸۸ء
مطابق ۸۹۳ھ نکلتا ہے۔ جامع مسجد کو پہاڑی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر
محمد یسین قدوسی اسے احمد شاہ نے تعمیر کیا تھا۔ اس کی ساخت سالم بہتر کی ہے۔ اس کا
داخل دروازہ بھی بہت ہی عالیشان اور بڑا ہی دلاویز ہے۔ ایسی خوبصورت اور
شاندار مسجد صوبہ برار میں شاذ و نادر ہی ملے گی۔ یہ سات خوبصورت کمان دار درول
اور ۲۱ چھوٹے گنبدوں والی مسجد شکستہ حالت میں ہے۔ گنبدوں کے اندرونی حصوں
میں عربی کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ جامع مسجد کے سامنے ایک قبر ہے جسے فتح اللہ عماد الملک
کی قبر کہا جاتا ہے جس کا ۸۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔ قلعہ کی جنوب مغربی سمت
میں ایک برج ہے جو برج بہرام کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا فارسی کتبہ یوں ہے ؎

بہ گاویل ساختہ بہرام برجی — کہ مثل آں ندیدہ چشم ایام
رسانید رفعت آں را بجائے — کہ کیواں در تماشش کرد آرام
چو کردم فکر تاریخش برآمد — بہ تاریخ تمام آں برج بہرام

[illegible] ۱۰۰۷ھ)

(Ephigraphia - Indo - Moslemica - 1907-08)

"بہرام خان" مرتضیٰ نظام شاہ احمد نگری کی طرف سے گاویل کا قلعہ دار تھا [illegible]

پیدہ شہنشاہ بادشاہ اکبر اعظم اجمیر سے برار کی طرف توجہ کریں گے۔ چنانچہ نظاموں نے حفاظت کے لئے قلعہ کو مستحکم بنایا۔ ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی اپنی کتاب میں اظہار فرماتے ہیں۔

"In 1577, it was feared that Akbar, who wanted to sub-due the Deccani kingdoms would attack Berar as the political situations in Deccan favoured his design. This barking fear compelled the the Nizam Shahis to strengthen the fort with a view to defending the Country against the Mughal."

بہرحال برج بہرام کے علاوہ نظام شاہی عہد کی یادگار چھوٹی مسجد بھی ہے۔ اس میں بھی فارسی زبان میں کتبہ ملتا ہے جو شکستہ ہے۔

علاوہ ازیں یہاں توپیں، تالاب اور برج قابل دید ہیں۔ آٹھ تالاب اور دس توپوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک بڑی توپ ہے۔ یہ توپ جامع مسجد کے سامنے تقریباً ..ہم گز کے فاصلے پر ہے۔

سلاطین برار کے بعد اس قلعہ پر خاندان مغلیہ، مرہٹے اور انگریز قابض ہوئے۔ بادشاہ وقت اپنے دور حکومت میں اپنی مرضی کے مطابق درستی و اضافہ کرتے رہے اور ہر دور میں قلعہ گاویل کو مستحکم اور فوجی قلعہ سمجھا جاتا رہا۔ غرض قلعہ گاویل مسلمانوں کی تعمیر کا نہایت ہی اعلیٰ، بیش بہا اور بے مثال نمونہ ہے۔ اس کا سہرا خاندان بہمنی کے سر ہے۔ لیکن آج یہاں سے یہی آواز آتی ہے ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ . آثار پدید است صنادید عجم را

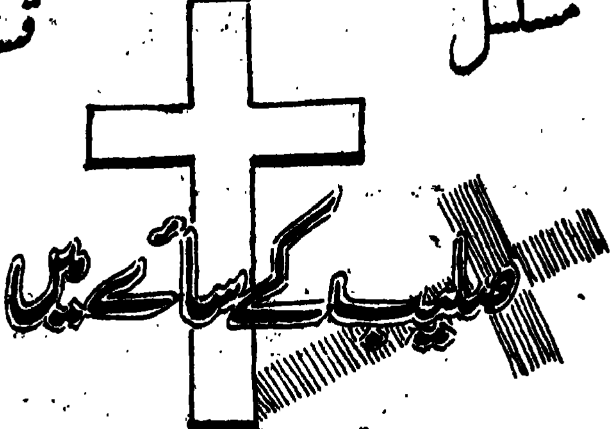
سلسلہ صفحہ (۶۰)

اس اسکول کے حکام اس کے عیوب کو دیکھ کر اس سے کار کردگی کی بہت ہی کم توقع رکھتے تھے اور ابتداء میں اس کے ساتھ نازیبا سلوک روا رکھتے تھے۔ اس کی بہتر کارکردگی اور علم کے ساتھ لگن نے انہیں اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہتی ہے "وہ خدا کے فضل سے اس قابل بن سکی کہ اپنا مفوضہ کام بنا کسی شور کا وٹ ادا کر سکے"۔ اس کی خوبیوں نے مجید امان بالا کی بھی تصدیق حاصل کر لی جن کی مسلاح پر اس نے ۱۹۷۷ء میں بینک میں پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کر لی۔ اب وہ دلی انشا پیہ کے محکمہ تعلیم میں برسر خدمت ہے۔ اس کی خو ہوا [illegible] صلاحیت [illegible] کو اس کے [illegible] دلا—

امین مالوف / ترجمہ: قاضی جلیل احمد

مسلسل قسط ۱۰

صلیب کے سائے میں



افتخار نے شہر کی دفاع کے تعلق سے تفصیلی احکام جاری کر رکھے تھے جیسے ہی مینار اپنی جگہ سے حرکت میں آئیں ان سے تیروں کی بارش شروع کی جائے اور جب وہ بہت قریب پہنچ جائیں ان پر روغن نفت کی بارش برسائی جائے تاکہ مینار اور ان کے سوار دونوں جل کر بھسم ہو جائیں یہ روغن نفت جس کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے اس زمانے کے لحاظ سے ایک طرح نیپام تھا۔ اس کی آگ آسانی سے بجھائی نہیں جا سکتی تھی۔ ان دو مہلک ہتیاروں کی مدد سے افتخار الدولہ کے سپاہیوں نے لڑائی کے دوسرے ہفتے میں دشمن کے کئی حملے پسپا کر دئے۔ حالانکہ دشمن نے روغن نفت سے تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے لکڑی کے میناروں پر نئے ذبح کئے ہوئے جانوروں کی کچی کھال منڈھ دی تھی۔ اسی دوران میں الافضل کے پہنچنے کی اطلاعیں قلعے میں گرم تھیں۔ محاصرہ کرنے والوں کو بھی فکر لاحق ہو گئی کہ اگر واقعی الافضل آ پہنچے تو اس دوہری مار کی تاب لانا ان کے لئے مشکل ہوگا۔ اس لئے انھوں نے اپنی کوششوں کو دوگنا تیز کر دیا۔ تسخیر شہر کے تعلق سے ابن الاثیر یوں لکھتا ہے"

"ان دو چوبی میناروں کے منجملہ ایک تو جانب جنوب فاران کی پہاڑیوں کی طرف تھا اور دوسرا شمال کی جانب۔ مسلمانوں نے کسی طرح سے شمالی سمت والے مینار کو تباہ کر دیا اور جو سپاہی اس مینار میں مقیم تھے ان کو ختم کر دیا۔ لیکن ابھی وہ اس مہم سے مشکل فارغ ہونے تھے کہ ایک ہرکارہ مدد کی درخواست لئے آ پہنچا کیوں کہ مخالف سمت سے غنیم شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دشمن شمال ہی کی جانب سے داخل ہوا تھا۔ یہ جمعہ کا دن تھا شعبان کی آخری تاریخ ہجری کے ۴۹۲ھ والے سال۔

اس ہیبتناک دن (جولائی ۱۰۹۹ء) افتخار ہیکل سلیمانی میں تھا جس کی بنیادوں میں کہتے ہیں کہ سیسہ بھرا ہوا ہے۔ یہ سنگی ہشت پہل قلعہ نما عمارت اس شہر کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہے اور افتخار چاہتا تو اس میں محصور ہو کر جنگ کو چند دن اور طول دے سکتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ لڑائی ہار چکا ہے۔ فرنگی شہر کی یہودی بستی میں داخل ہو چکے تھے اور ہر طرف تباہی اور بربادی کا نظارہ تھا۔ سڑکیں اور گلیاں لاشوں سے پٹی پڑی تھیں اور جنگ اب مسجد اقصیٰ کے آس پاس ہو رہی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں اس کے ہر طرف سے گھر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ لڑتا رہا۔ اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ دوپہر کے قریب قلب شہر میں لڑائی تقریباً ختم ہو چکی تھی اور فاطمیوں کا سفید پرچم اب صرف ٹاور آف ڈیوڈ پر لہرا رہا تھا۔

دفعتاً فرنگیوں نے لڑائی بند کی اور ان کا ایک ایلچی کوئی پیغام لے کر ٹاور آف ڈیوڈ کی طرف بڑھا۔ یہ ایلچی سینٹ جائلس کی طرف سے تھا جس نے یہ پیش کش کی تھی کہ اگر افتخار ٹاور آف ڈیوڈ کا قبضہ اس کے حوالے کر دے تو اس کو اور ساری مصری فوج کو قلعہ سے زندہ باہر جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ گو فرنگی بارہا عہد شکنی کر چکے تھے اور اس کا کوئی بھروسہ نہیں رہا تھا کہ سینٹ جائلس اپنے عہد پر قائم رہے گا۔ لیکن سینٹ جائلس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک معمر اور قابل تعظیم شخصیت ہے اور فرنگیوں میں کسی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے تو تنہا وہی شخص ہے اس وقت جبکہ اس کے دوسرے ساتھی شہر میں تباہیوں اور بربادیوں کی دھوم مچائے ہوئے تھے سینٹ جائلس نے ہنوز حوالی شہر سے آگے قدم نہیں بڑھایا تھا۔ لہٰذا افتخار نے اسے اطلاع دی کہ قلعہ داود اس کے حوالے کرنے آمادہ ہے بشرطیکہ وہ اپنی عزت کی قسم کھا کر اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جان کی سلامتی کا یقین دلائے۔

فرنگیوں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے اور افتخار الدولہ اور اس کے ساتھیوں کو رات کی تاریکی میں عقلان کی سمت روانہ ہونے کی اجازت دے دی۔
لیکن باشندگان شہر کے انجام کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتا ہے " فرنگیوں نے مسلمانان شہر کو تلوار کی دھار اور نیزوں کی نوک پر رکھ لیا۔ ایک ہفتہ تک مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ ہی میں ستر ہزار آدمی شہید کئے "۔

ابن قلانسی جو کبھی ایسے اعداد و شمار تحریر نہیں کرتا جس کی اس نے تصدیق نہ کر لی ہو لکھتا ہے " بہت سے لوگ مارے گئے۔ شہر کے یہودی اپنی عبادت گاہ میں جمع تھے کہ فرنگیوں نے اس صومعہ کو آگ لگا کر سب کو زندہ جلا دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اولیاء اللہ کی

ہوں اور مرقد ابراہیم علیہ السلام کو بھی مسمار کر دیا۔"

آثار قدیمہ میں سے مسجد عمرؓ تباہ کر دی گئی۔ یہ مسجد حضرت عمر ابن الخطابؓ خلیفہ ثانی کی میں تعمیر کی گئی تھی۔ ۶۳۸ء میں یروشلم انہی کے ہاتھ پر فتح ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ بہ حیثیت شہر میں داخل ہوئے اور عیسائیوں کے بطریارک کے ساتھ شہر کا معائنہ کرنے لگے۔ میں جب وہ عیسائیوں کے مقامات مقدسہ کا معائنہ کرتے ہوئے کلیسائے قیامہ (Holy Sepulch) تک پہنچے تھے کہ ظہر کی نماز کا وقت آن پہنچا۔ پادری نے حضرت عمرؓ سے خواہش کی کہ اسی کلیسا میں نماز ادا کر لیں۔ لیکن انہوں نے شکریہ کے ساتھ اس پیشکش کو رد کر دیا۔ کلیسا کے باہر آ کر نماز ادا کی اور پھر اسقف اعظم سے مخاطب ہو کر کہا مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نماز ادا کرتا تو بعد آنے والے اس گرجا کو مسجد بنا لیتے۔ چنانچہ اس گرجے کے سامنے والی زمین پر حضرت عمرؓ نے نماز ادا کی اور ان کے بعد اسی زمین پر مسجد عمر تعمیر ہوئی۔ لیکن فرنگی اردوں میں عمرؓ کی عالی حوصلگی کہاں سے آتی۔ عمرؓ نے اس شہر کو امان دی تھی، فرنگیوں نے یہاں قتل و خون کی ہولی کھیلی۔

خود بہت سے عیسائی بھی اس تباہی سے نہ بچ سکے۔ فرنگیوں نے پہلا کام تسخیر شہر کے بعد یہ کیا کہ Holy Sepulcher سے سارے مشرقی عیسائیوں کو نکال باہر کیا۔ جیسے یونانی، آرمنی، قبطی، شامی وغیرہ۔ ان تمام عیسائی فرقوں کو ماننے والے پادری متحدہ طور پر اس کی خدمت کیا کرتے تھے اور صدیوں سے یہ عمل چلا آ رہا تھا۔ اس تعصب کو دیکھ کر فرنگی لوگ رہ گئے۔ اور اس کا بدلہ انہوں نے اس طرح لیا کہ اس صلیب کی نشاندہی سے انکار کر دیا جس پر عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تھا۔ لیکن فرنگیوں نے ان سب کو قید و بند میں مبتلا کر دیا اور اتنی اذیتیں دیں کہ بالآخر انہیں اس مقدس صلیب کی نشاندہی کرنی پڑی۔

اس دوران میں الافضل آہستہ آہستہ منزل بہ منزل سینائی کا ریگستان طے کرتا رہا اور جب وہ فلسطین پہنچا تو تسخیر یروشلم کے سانحے پر ۲۰ دن گزر چکے تھے۔ اب وہ پس و پیش میں تھا کہ القدس پر براہ راست حملہ کرے یا نہ کرے۔ اور اگرچہ اس کی رکاب میں اس وقت ۳۰ ہزار سپاہی تھے پھر بھی وہ اپنی طاقت کو ناکافی سمجھتا تھا۔ کیونکہ ایک تو اس کے پاس محاصرے کے آلات نہ تھے دوسرے وہ پہلے ہی ترکوں کی بہادری اور ثابت قدمی سے وہ خائف تھا۔ اس لئے اس نے مستعلی فخار الدولہ کی سپاہ کے ساتھ ہی پڑاؤ ڈالنا مناسب سمجھا اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک سفارت یروشلم کو روانہ کی۔ یروشلم میں مصری سفارت کو ایک عظیم الجثہ مرغ بالوں والے ناشتہ

کے سامنے پیش کیا گیا اور انھیں بتایا گیا کہ آج کل یروشلم کا والی یہی شخص ہے جس کا نام گاڈ فری آف بولون ہے۔ الافضل کے سفیروں نے اسے اپنے آقا کا یہ پیغام پہنچایا کہ فرنگیوں نے یروشلم پر قبضہ کر کے بڑی زیادتی کی ہے پھر بھی الافضل ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے تیار ہے بشرطیکہ فرنگی فلسطین کا تخلیہ کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس کے جواب میں فرنگیوں نے اپنی پوری طاقت کو مجتمع کیا اور عسقلان کی سمت صبا رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے۔

ان کی پیش قدمی اتنی تیز تھی کہ مصری سفارت ابھی اپنی رپورٹ بھی پیش کرنے نہ پائی تھی کہ فرنگی ان کے سر پر پہنچ گئے۔ پہلے ہی حملہ میں مصری فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ اور وہ لوگ بھاگ کر عسقلان کی بندرگاہ پر جمع ہونے لگے۔ ابن قلانسی لکھتا ہے، الافضل خود بھی پسپا ہوگیا اور یوں تیغ فرنگی مسلمانوں پر غالب آئی۔ کسی کو فرنگی تلوار سے امان نہ ملی نہ پیادوں کو نہ رضاکاروں کو اور نہ اہل شہر کو۔ دس ہزار آدمی لقمۂ اجل ہوئے اور مسلم کیمپ تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا۔

گو الہراوی کا ڈیلیگیشن مصری فوجوں کی تباہی کے کافی عرصے بعد بغداد پہنچا پھر بھی اسے ابھی اس تازہ شکست کی اطلاع نہ تھی۔ وہ صرف یروشلم انطاکیہ ایڈیسہ کی تباہی اور خلیج ارسلان دانشمند کی شکست ہی کے متعلق جانتے تھے اور انھیں پتہ تھا کہ شمال سے جنوب تک سارے شام میں وہ بلا روک ٹوک تباہی مچا رہے ہیں اور اسی کا حال اپنے ابنائے دین و ملت کو بتا کر وہ خلافت بغداد کو کوئی عملی قدم اٹھانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔

۱۹ اگست ۱۰۹۹ء بروز جمعہ الہراوی اپنے ساتھیوں کو لے کر جامع مسجد بغداد میں داخل ہوا تھا اور اس وقت جب لوگ چاروں طرف سے جوق در جوق ادائی نماز جمعہ کے لئے مسجد میں داخل ہونے لگے تو الہراوی نے اپنے ساتھیوں سمیت مسجد میں کھانا شروع کیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا جس میں مسلمان روزہ نہ بھی ہوں تو عموماً منظر عام پر خورد و نوش سے احتراز کرتے ہیں اس لئے قاضی ہراوی کا یہ عمل بہت سوں کے لئے اشتعال کا باعث بن گیا اور کوتوالی کے لوگ انھیں گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ اتنے میں قاضی مذکور اپنی جگہ سے اٹھا اور مشتعل مجمع کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ اس مقدس مہینے کی بے حرمتی پر آپ کا اظہار غیض و غضب لائق تحسین ہے لیکن میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی حمیت دینی اور غیرت ملی اس واقعہ پر غیض و غضب میں کیوں نہیں آتی جب ہزاروں کی تعداد میں آپ کے مسلمان بھائی کافروں کی تلوار کا شکار بن رہے ہیں اور اسلام کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کی جارہی ہے اور یہاں مجمع

ش و خروش نفوذ اکرنے کے بعد اس نے شام کے ان شہروں کی داستان بیان کی جہاں نگیوں کا قبضہ ہوا تھا۔ خصوصاً یروشلم کے سقوط کی خونچکاں داستان چشم دید گواہوں کی زبانی سن کر اہل بغداد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ مہاجرین و بھی روئے اور انھوں نے اہل شہر کو بھی رلایا۔

جامع مسجد سے نکل کر انھوں نے امراء کے محلات اور بالآخر خلیفہ مستظہر باللہ کے دیوان عام تک بھی پہنچا اور وہاں بھی اپنی قوت تقریر سے سب کو سیل اشک بہانے پر مجبور کر دیا۔ جب خلیفہ سے کہا جاتا کہ اس کے عہد میں رعیت خوش و خرم ہے تو اسے بڑی خوشی ہوتی۔ ایسے زمانے میں جب ظلم و تعدی ارباب اقتدار کی لازمی صفت بن گئی تھی مستظہر باللہ سے کسی شخص کو کبھی کوئی ضرر نہ پہنچا تھا۔ وہ فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اور خود بھی تہذیب و شائستگی کا پیکر۔ اسے فن تعمیر سے خصوصاً ت دلچسپی تھی اور اس نے اپنی ذاتی نگرانی میں اپنا محل بنوایا جو بغداد کے مشرقی حصہ میں واقع تھا۔ اسے شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔

لیکن بدقسمتی سے اس پیکر تہذیب و اخلاق کے قبضے میں کوئی طاقت نہیں تھی حالانکہ وہ دن رات سلطنت کے رسمی فرائض کی انجام دہی میں مشغول نظر آتا تھا اور اس عہد کے وقائع نگار اپنی نگارشات اسی کے نام سے آغاز کرتے تھے۔ لہٰذا یروشلم کے مہاجرین کی مایوسی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب انھیں یہ پتہ چلا کہ خلیفہ تو دراصل ایک کٹھ پتلی سے بھی گیا گزرا ہے اور اس کی حکومت اس کے محل کی چار دیواری میں محدود تھی۔

تاہم وہ ایک درخشاں عہد کا نام لیوا تھا۔ پیغمبر اسلام کے انتقال کے بعد دو سو سال تک خلفائے اسلام مسلمانوں کے دینی اور دنیوی دونوں امور میں ان کے ہادی اور سردار اور ایک عظیم سلطنت کے حکمراں تھے۔ اپنے عروج کے زمانے میں ان کی سلطنت کی حدود سندھ کے ساحل سے لے کر پیرینیز کی پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور عباسی دور میں جس کا نام لیوا مستظہر باللہ خود بھی تھا۔ بغداد عروس البلاد دنیا ہوا تھا۔ نویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب بغداد کے تخت خلافت پر ہارون الرشید متمکن تھا عباسی سلطنت روئے زمین کی سب سے متمول، سب سے متمدن اور سب سے زیادہ طاقتور حکومت تھی۔ بغداد میں دنیا کا سب سے بڑا شفا خانہ تھا۔ جہاں مریضوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ جہاں ایک ہزار طبیب کام کرتے تھے۔ جس کے رسل و رسائل کا ایک منظم محکمہ تھا۔ جس کے قلمرو میں متعدد بینک تھے جن کی شاخیں ملک چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بغداد میں آب رسانی اور صفائی کا بہترین انتظام تھا۔ ایک کاغذ سازی کا کارخانہ تھا۔ اس وقت جب بلاد شام کے فرنگی فاتحین لکھائی کے لئے پارچہ جات کا استعمال کرتے تھے۔ عربوں نے گھاس کی پتلیوں سے کاغذ بنانے کا طریقہ معلوم کر لیا تھا۔

لیکن اس وقت جب العراوی نے خلیفہ مستظہر باللہ کے دربار میں الغیاث کا نعرہ بلند کیا عباسی عہد کا یہ شان و شوکت داستان پارینہ بن کر رہ گئی تھی۔ خلیفہ صرف نام کے خلیفہ رہ گئے۔ ہارون الرشید کا ۸۰۹ء میں انتقال ہوا اور اس کے بعد چند صدیوں کے اندر اصل طاقت خلفاء کے ہاتھ سے چھن گئی۔ بغداد پر تباہی آئی اور سلطنت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ اور صرف عہد رفتہ کی عظمت، شان اور شکوہ کی یاد باقی رہ گئی جس کو اہل عرب نے آج تک سینہ سے لگائے رکھا۔ عباسی خلافت اس کے بعد بھی چار سو سال چلتی رہی لیکن اصلی اقتدار پھر کبھی پلٹ کر ان کے ہاتھوں میں نہیں آ سکا۔ عباسی خلفا اپنے ترکی اور ایرانی امیروں کے ہاتھ محض یرغمال بن کر رہ گئے۔ اپنی محلسراؤں کی چہار دیواری میں محصور ہو کر یہ خلفا عیش و عشرت کے عادی ہو گئے اور ان کے روزمرہ کے مشاغل موسیقی، شاعری اور حرم سرا کی کنیزوں تک محدود ہو چکے تھے۔

امیر المومنین جو کبھی عرب اقتدار کے مظہر ہوا کرتے تھے اب ان کے زوال و نکبت کی علامت بن گئے اور المستظہر انہی میں ایک تھا جن سے العراوی اور اس کے ساتھیوں نے امداد و اعانت کی آس لگائی تھی۔ اگر وہ چاہتا بھی تو القدس کی مدد کرنا اس کے بس میں نہ تھا کیونکہ اس کی ساری فوج اس کے محل کے پہرہ داروں پر مشتمل تھی۔ یہ نہیں کہ بغداد میں سپاہیوں کی کمی تھی۔ ہزاروں سپاہی بغداد کی سڑکوں پر نشے میں دھت مارے مارے پھرتے تھے جن سے بچنے کے لئے شہریوں نے اپنے رہائشی علاقوں میں لکڑی اور لوہے کے پشتے تعمیر کر رکھے تھے۔

فوجی وردی میں ملبوس غول بیابانی کا یہ جھنڈ خلیفہ مستظہر باللہ کے کسی حکم کا اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا حاکم ایک ترکی امیر تھا جو قطعاً عربی نہیں جانتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرق وسطیٰ کے سارے شہر بشمول بغداد سلجوقی اقتدار کے تحت آ گئے تھے اور بغداد کا سلجوقی سلطان برکیاروق تمام سلجوقی سرداروں کا صدر سمجھا جاتا تھا۔ یہ برکیاروق قلیج ارسلان کا عمزاد برادر تھا۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ سلجوقی سلطنت کا ہر علاقہ اپنی جگہ آزاد اور خود مختار تھا اور سلجوقی خاندان کے لوگ اپسی خانہ جنگیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔

ستمبر ۱۱۰۱ء میں جب العراوی بغداد سے رخصت ہوا تو وہ سلطان برکیاروق سے ملاقات بھی نہ کر سکا تھا کیونکہ سلطان مذکور اپنے بھائی محمد کے خلاف ایران میں معروف پیکار تھا اور یہ جنگ برکیاروق کے خلاف جاری تھی کیونکہ اسی سال اکتوبر میں سلطان محمد نے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اس سے خانہ جنگی کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ ۱۱۰۲ء میں برکیاروق دوبارہ بغداد میں فاتحانہ داخل ہوا اور سلطان محمد وہاں سے عجلت میں فرار ہو گیا۔ لیکن اسی سال موسم بہار میں برکیاروق کو پھر بغداد کا

باقی بر صفحہ (۴۶)

ڈاکٹر سلامت اللہ



بچوں اور لڑکوں کے لئے محروم کا مجموعۂ کلام

ہمارے دیس میں تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ تعلیم کی مختلف منزلوں کے لئے موزوں لٹریچر اور درسی کتابوں کی بڑی کمی ہے۔ یہ کمی ابتدائی تعلیم کی منزل پر شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی زبان میں تقریباً سبھی مضامین پر اچھی کتابیں ہمارے ہاں مل جاتی ہیں۔ مگر وہ ہمارے طلباء کے کچھ زیادہ کام کی نہیں ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر تو شاید ہمارے کالجوں کے طالب علم انگریزی کتابوں سے کچھ تھوڑا بہت فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن ابتدائی اور ثانوی مدرسوں اور طلباء کے لئے انگریزی کتابیں بالکل بے کار ہیں۔ مادری زبان کے سوا دوسرے مضامین میں اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی اور دوسری زبانوں کی اچھی کتابیں ترجمے اور تالیف کے ذریعہ ہندوستان کی زبانوں میں منتقل ہو جائیں۔ مگر مادری زبان کی تعلیم کے لئے یہ طریقہ بوجوہ نہیں اپنایا جا سکتا۔ چنانچہ ملک کی ہر ایک زبان کی تعلیم کے لئے خود اپنا اپنا لٹریچر تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اردو میں بھی اس مسئلے پر کچھ عرصہ سے قدرے توجہ دی جانے لگی ہے۔

یوں تو اردو کے تقریباً سبھی چوٹی کے ادیبوں کی کوئی نہ کوئی تخلیق ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر ایسی بہت کم چیزیں ہیں جن پر صحیح معنوں میں بچوں کے لٹریچر کا اطلاق ہو سکے۔ نظیر اکبر آبادی، حالی اور اقبال کا شمار اردو کے ممتاز ترین شعراء

میں ہوتا ہے۔ ان کی چند نظمیں واقعی ایسی ہیں جو مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کے ذہنی معیار اور دلچسپی کے مطابق ہیں۔ نثر میں ڈاکٹر نذیر احمد اور سر سید احمد خاں کی نگارشات یقیناً بچوں اور نوجوانوں کے ادب میں ایک اعلیٰ مقام کی مستحق ہیں۔ لیکن اس قسم کا لٹریچر بہت محدود اور ناکافی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بچوں کے ادب کے میدان میں ابھی اردو کا دامن بہت تنگ ہے۔

اس صورت حال کا جائزہ لیجئے تو کئی ایک چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں بہت عرصے تک اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے کس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھا جاتا رہا کہ وہ ادب جو عام طور سے ہمیں ملتا ہے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے لئے بھی موزوں ہے اور اسے مناسب طریقے سے ان کے ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ گویا اس خیال کے بموجب تعلیم میں موضوع یا مواد کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ طریقۂ تعلیم کی۔ اور اگر مناسب طریقۂ تعلیم ڈھونڈ نکالا جائے تو ہمارا تمام ادبی سرمایہ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے نصاب میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں سیکھنے اور علم حاصل کرنے کے ایک بنیادی اصول کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ جو چیز سکھائی جائے وہ سیکھنے والے کی ذہنی پختگی کے مطابق ہونی چاہیے۔ علم نفسیات کی رو سے دیکھیے تو ذہنی نشو و نما ایک تدریجی عمل ہے۔ بچپن سے بلوغیت تک ذہن برابر ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وہ باتیں جو بچوں کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں انہیں بالغ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ ان میں بھی بعض اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر آسان زبان میں کوئی بات بیان کردی جائے تو اسے بچے ضرور سمجھ لیں گے۔ مگر یہ بات پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ خاص عمر کے بچے کسی چیز کو ٹھیک طرح سمجھ سکتے ہیں یا نہیں، اس کا انحصار صرف زبان کے آسان یا مشکل ہونے پر نہیں بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ وہ چیز معنوی لحاظ سے ان بچوں کے لئے قابل فہم ہے یا ان کی فہم سے بالاتر۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے ہاں کوئی ایسی تحقیق نہیں ہوئی ہے جس کی بنا پر ہم یقینی طور پر کہا جا سکے کہ کس عمر کے بچوں کے لئے کون سے الفاظ قابل فہم ہوتے ہیں۔ مغربی زبانوں میں تحقیق کی بنیاد پر ایسی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں جن سے بچوں کے لئے لکھنے والے استفادہ کر سکتے ہیں کہ کسی خاص عمر کے بچوں کے ادب میں کون سے

استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اس طرح بچوں کی درسی کتابوں کا جو سلسلہ تیار کیا جاتا ہے وہ بچوں کے لئے موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اردو کے نامور ادیبوں میں سے ایسے بہت کم ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے لئے بچوں کے ادب کو قابل اعتنا سمجھا ہو۔ اکثر ادیب بچوں کے لئے لکھنا شایان شان نہیں سمجھتے۔ بعض کا خیال ہے کہ بچوں کی شاعری محض تک بندی ہے۔ شاعری کے ادبی محاسن سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ چنانچہ جیسے تھوڑی بہت بھی ردیف و قافیہ کی شدبد ہو، وہ بہ زعم خود بچوں کا "شاعر" ہونے کا اعلان کرسکتا ہے۔ دراصل بچوں کی شاعری کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ بچوں کی شاعری بھی بڑوں کی شاعری کی طرح شعری خوبیوں سے آراستہ ہونی چاہیئے۔ اس میں بھی آمد کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے بھی تشبیہ و استعارہ اور دوسری صنائع سخن کی چاشنی درکار درکار ہے۔ وہ بھی شاعر کی قوت متخیلہ کی محتاج ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ بچوں کی شاعری اس پائے کی ہونی چاہیئے کہ اس کا صحیح ادراک بچوں کو ہوسکے، اور اسے سراہنے کے لئے جس قسم کی صلاحیت کی ضرورت ہے وہ بچوں میں نشو و نما پا چکی ہو۔

اگرچہ اردو میں بچوں کے لٹریچر کی تیاری سے متعلق اب تک کوئی منظم اور موثر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے، پھر بھی ہمارے بعض ادیبوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور تجربے کی بناء پر بالخصوص بچوں کے لئے نظم اور نثر دونوں میں کچھ اچھی چیزیں لکھی ہیں اور وہ بچوں کی درسی اور امدادی کتابوں میں داخل کی گئی ہیں۔ اس میدان میں جو شعوری کوششیں ہوئی ہیں ان میں مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ترتیب دی ہوئی درسی کتابوں کا سلسلہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایک بڑی مدت تک اردو کے نصاب تعلیم میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں ان ہی کا بول بالا رہا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کے علاوہ جن حضرات نے بچوں کے ادب میں شہرت حاصل کی ہے ان میں ہمارے بزرگ شاعر تلوک چند محروم بھی ہیں۔ ان کی نظمیں بچوں کی درسی اور امدادی کتابوں میں ایک مدت سے شامل کی جاتی رہی ہیں۔ ابھی حال میں محروم کی کچھ ایسی ہی نظموں کا مجموعہ "بہار طفلی" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا ہے۔ اب ان کی بچوں کی نظموں کا دوسرا مجموعہ چھاپا جا رہا ہے جس کے متعلق یہ سطور پیش کی جارہی ہیں۔

محروم کا شمار اردو کے ان چند شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے معلمی کو بطور پیشہ اپنایا

اور اس کی آبرو کو اپنی پرخلوص محنت اور تخلیقی صلاحیت سے بڑھایا۔ معلم کی حیثیت مخدوم کو بچوں کی نفسیات اور ضروریات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ جو نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں ان میں مخدوم کے اس تجربے کی جھلک دکھائی دیتی۔ نظموں کو پڑھتے تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے سامنے بچوں کی ایک جماعت ہے اور سے مخاطب ہیں۔

مخدوم کی نظموں میں بچوں کی اخلاقی تربیت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ یوں تو براہ راست پند و نصائح کو کچھ زیادہ مؤثر نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کہ جو چیزیں بار بار دہرائی جاتی ہیں ان کا دل و دماغ پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے کی نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے ان کی زبان ستھری اور سلیس ہے۔ انداز سیدھا سادہ ہے۔ مصرعوں میں روانی ہے۔ موضوع صاف ہے۔ اس میں کوئی پیچ ان نظموں کو بچے ترنم کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی لے اور دھن آ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی دی ہوئی ہے جس میں تمام نظموں کے مشکل محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ بچے اس کی مدد سے خود نظم سمجھ سکتے ہیں۔ کسی شخص کی مدد کی ضرورت نہیں۔

اس مجموعے میں چند نظمیں مظاہر فطرت سے متعلق ہیں جن سے شاعر کے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کیسی گہری نظر سے ان چیزوں کو دیکھا ہے سے کیا اثر قبول کیا ہے۔ ان نظموں میں جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ان سے بچوں کی قوت متخیلہ فروغ پائے گی۔

غرض مخدوم کی یہ نظمیں بچوں کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کے لئے ایک سرمایہ ہیں۔ امید ہے کہ اس لحاظ سے یہ نظموں کا مجموعہ اردو کی دنیا میں قدر و تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

قبضہ چھوڑنا پڑا۔ لیکن ایک سال بعد یعنی اپریل ۱۱۰۱ء میں برکیاروق کا پھر سے بغداد اور ایک بار پھر خطبہ میں اس کا نام لیا جانے لگا۔ اور اس طرح چند سالوں میں بغداد کا برکیاروق کے ہاتھ سے نکلا۔ یعنی اوسطاً ہر ۱۰۰ دن میں ایک شخص شہر کا حاکم بن گیا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے سلاطین کا آپس میں کسی بات پر اتحاد خیال اور اتفاق رائے کی وجہ سے فرنگیوں کو اشام میں اپنا قبضہ مستحکم کرنے کا موقع مل گیا۔

ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی

ایک جائزہ

انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے اور فلاطون کے نزدیک یہ ایک شریف اور مہذب جانور ہے۔ چونکہ یہ شریف اور مہذب ہے اس لئے سوسائٹی بنا کر رہنے کا جذبہ اس میں دوسرے جانداروں سے سب سے زیادہ ہے۔ سماج میں "سوسائٹی" کے تصور کے ساتھ ہی روابط کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ انسان اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا دور دراز آبادیوں میں پھیلتا ہوا چلا گیا۔ اور اس طرح آبادی کے پھیلاؤ کی وجہ سے روابط میں دوریاں پیدا ہوئیں۔ لیکن انسان کے مہذب اور تہذیب یافتہ ہونے کا تقاضہ یہ تھا کہ اپنے شناساؤں، دوست احباب اور رشتہ داروں کی خبر گیری رکھے۔ اور انہیں اپنے روز و شب سے مطلع کرتا رہے۔ یہی خبر گیری رکھنے کا جذبہ خطوط کی ایجاد کا سبب بنا ہوگا۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی خط کی ایجاد کا سبب کلیتاً زندگی کا پھیلاؤ بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :

"۔۔۔ انسان نے جب ہوش سنبھالا ہوگا تو اظہار مافی الضمیر کے لئے اس نے قدرتی آوازوں کو نقل کرنا ۔۔۔۔ اور بولنا سیکھا ہوگا۔ زندگی میں پھیلاؤ اور تمدن میں وسعت آئی۔ حاضر کے لئے زبان اظہار خیالات و جذبات کا وسیلہ تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ غائب تک ابلاغ کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ ضرورت خط یا تحریر کی ایجاد کا سبب ہوئی۔" (مکتوبات ص۱)

یہاں ضیاء احمد بدایونی کی "خط" سے مراد لکھائی یا فنِ تحریر ہے۔ لیکن لکھائی کے فن

ہی ایجاد کی بھی ضرورت ضیا صاحب کے نظریہ کے مطابق جسمانی دوری تھی۔ خط
پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے لفظی معنی پر غور کر
جو خط کے معنی میں مستعمل ہیں: خط، نامہ، رقعہ، مکتوب، مراسلہ

خط: [illegible]ان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ایک ایسی لکیر کے ہیں۔ جس میں عرض
ہو [illegible] ہو۔ اردو میں Letter کے لئے استعمال کر لیا گیا۔

رقعہ: اس کے [illegible] چیتھڑا، ٹکڑا کے ہیں۔ چھوٹے قسم کے پرچہ کے لئے استعم
ہے [illegible] عربی لفظ ہے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر 'پیام' کے لئے
تحریر [illegible] جاتی ہے اس کے لئے بھی مستعمل ہے۔

نامہ: فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی Letter یا چٹھی کے ہیں اور عا
کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

مراسلہ: ایسے خط کو کہتے ہیں جس میں عام طور پر کوئی ایسی بات لکھی ہو جو
کی بات کا جواب ہو یا کوئی ایسی ضروری بات جس کا جواب مکتوب الیہ کی طر
آنا چاہئے۔ آج کل کی اصطلاح میں اس اخباری خط کے لئے بھی استعمال ہوتا
کسی خاص موضوع پر اظہار رائے کے طور پر اخبار میں کسی شخص کی جانب سے ش

مکتوب: یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور مفعولی صورت میں ہے۔ لفظی معنی
لکھا گیا۔ عربی اور فارسی میں یکساں طور پر خط کے معنی میں استعمال ہو
جہاں تک لفظ خط کا تعلق ہے۔ جیسا کہ اوپر کی سطور میں بیان کیا گیا ہے کہ
معنی لکیر کے ہیں۔ اردو میں Letter کے معنی میں، خواص و اواسط اور
یکساں طور پر رائج اور جائز قرار دے لیا ہے۔ لیکن عربی میں Letter
'خط' کا لفظ استعمال نہیں ہوتا بلکہ کتاب کا لفظ مستعمل ہے۔

اذھب بکتابی ا فا القہ الیھم ۝ میرا یہ خط لے جاؤ
یاالملاء انی القی الی کتاب کریم ۝ اے میرے درباریو ایک معزز
خطوط کی نگہداشت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے لکھا
"خطوط کی نگہداشت جو کثرت اور وسعت مسلمانوں کے دور میں ہوئی وہ ا
نہ تھی۔ مسلمانوں نے خود پہلے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط کو محفوظ کیا
مکاتیب کی حفاظت کا کام اسلام سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کا

"نیا عہد نامہ" ہے۔ نئے عہد نامہ میں پولوس رسول کا خط رومیوں، کرنتھیوں تیمتھیس، فلیمون اور عبرانیوں وغیرہ کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کا خط نئے عہد نامہ میں شامل ہے۔

خطوط سے پیغام رسانی، اخبار اور اطلاعات کے کام بھی لئے جاتے رہے۔ خطوط نے کہیں کہیں سرکاری احکامات جاری کرنے کا کام بھی انجام دیا۔ یہ احکامات فرمان اور حکم ناموں کی شکل میں تاریخی کتب میں ملتے ہیں۔

یونانیوں اور عربوں کے علاوہ سلجوقیوں اور ساسانیوں نے بھی اپنے خطوط اور مراسلت کی حفاظت کا کام کیا۔ ایرانیوں کی مادری زبان فارسی ہے۔ لیکن حکومت کی زبان ایک زمانے تک عربی رہی۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ انشا کا محکمہ قائم کیا جائے اور اس میں دونوں زبانوں کے ماہرین رکھے جائیں۔ جو موقع محل اور ضرورت کے وقت مضمون بنا کر فرمان لکھ سکیں۔ اس ضرورت نے اس فن کو بہت ترقی دی۔ حکمرانوں کو جب ایسے محکمہ اشاعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جہاں اہل قلم موجود ہوں اور عربی اور فارسی کے ماہر بھی ہوں تو اس مانگ نے شئے مطلوبہ کو پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اور ایک مخصوص فن پیدا ہوا۔ حکومت نے دفتر انشا کے کاتبین کو ہر ممکنہ سہولت، اعزاز و احترام بھی بخشا اور اکثر کاتبین کی حیثیت سیاسی مشیروں کی بھی رہی ہے۔ اس اعزاز و احترام اور انشا کے اس فن کی پیدائش نے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو بھی جاری کیا۔ اور اعلیٰ اور قابل منشیوں کی ایک ایک سطر کو جمع کیا جانے لگا۔ ان تحریروں کی اہمیت علمی ہونے کے علاوہ تاریخی اور سیاسی بھی رہی۔ اس لئے سرکاری اور غیر سرکاری مراسلت کی حفاظت ہونے لگی اور یہ فن بھی ترقی کرنے لگا۔

اردو نے جہاں ہندوستان کی مختلف پراکرتوں کو جوڑنے اور آپس میں ملانے کا کام کیا وہاں اس زبان نے فارسی اور عربی کے اثرات بھی قبول کئے۔ چنانچہ رقعات کی طرز تحریر بھی فارسی زبان کی رنگینی سے متاثر رہی اور فارسی بھی محمد شاہی۔ صنائع بدائع بندش الفاظ کے نگینے تجربے ہوے۔ ابوالفضل کو فارسی زبان کے مجتہد فن کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اور بالخصوص آئینہ اکبری میں جو اسلوب اس نے استعمال کیا اس کا موجد اور خاتم بھی ہے۔ رقعات میں اس نے قدیم طرز سے کنارہ کشی نہیں کی۔ دفاتر کے رقعات میں الفاظ کی فراوانی اور معنی اور اختصار کی کمی کھٹکتی ہے۔ رقعات عالمگیری کی حیثیت گلستان کی سی ہے۔ اس طرح ایک خاص وقت تک اردو کے خطوط میں فارسی کی

آمیز شعر و رنگینی بیانی ایک فن سمجھی گیا۔ وقت کے ساتھ اقدار بدلیں اور اس کا
دیگر اصناف کے ساتھ خطوط پر بھی پڑا۔ عبداللطیف اعظمی کے قول کے مطابق :

"۱۸۲۲ء میں اردو کا پہلا خط لکھا گیا اور کتابی صورت ۱۸۶۵ء میں نامۂ غالب
۱۸۶۶ء میں خطوط کا پہلا مجموعہ انشار اردو (مرتبہ مولوی ضیار الدین) ..." شائع ہو
خط کی تعریف کرتے ہوئے آل احمد سرور نے تحریر کیا ہے : مشاہیر کے خطوط ص
"اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہے
جس میں بے تکلفی، سادگی، بے ساختگی، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثر کی جھلک
چنانچہ وہ خط جس میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشا پردازی کی شان، تکلف کا اظہار
خطابت کا جوش دکھایا جائے، خط نہیں ... ہے۔" تنقیدی اشارہ ص ۱۳

خورشید الاسلام کے قول کے مطابق :

"..... خط حسنِ اتفاق کا نام ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں....
آپ خطوں میں رو سکتے ہیں، قہقہہ لگا سکتے ہیں..... آپ کو وعظ کہنے کی اجازت نہیں۔"
مکمہ بالا اصول کو مدِنظر رکھ کر جب ہم خطوط کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں خطوط
مختلف اقسام نظر آتی ہیں۔ خطوط کی تعریف بیان کرتے ہوئے اجمل خاں نے تحریر کیا۔
"علم الانشار Epitography یا خطوط نویسی کی قسمیں ہیں۔ پہلی ق
کو مکتوب یا رسائل کہتے ہیں۔ ان سے مراد وہ تحریریں ہیں جو سوچ سمجھ کر کسی علمی یا معا
مضمون کو ہر خاص و عام کے سامنے لاتی ہیں۔ ایسی تحریر در حقیقت ایک خطبہ یا تقریر ہوتی
جو مجمع عام میں دی جا سکے۔ انشار کی دوسری قسم وہ خطوط ہیں جو نجی ضرورتوں یا کارو
کے سلسلے میں لکھے جاتے ہیں۔ انہیں رقعات کہتے ہیں۔ ان کی زبان بول چال کی ز
ہوتی ہے۔ ان میں ادبی صفتیں پیدا نہیں کی جا سکتیں۔" ملفوظات آزاد ص ۱۴۱

لیکن اس کے علاوہ ایک قسم خطوط کی اور بھی ہے جو صرف اپنی انا کی تسکین کے
تحریر کئے گئے ہیں۔ جن میں "غبار خاطر" کا نام سرفہرست ہے۔ "غبار خاطر" کے
میں ملک زادہ منظور احمد نے تحریر کیا ہے :

"آپ صدیق مکرم کی جگہ میرا ... اپنا یا مسز جناح کا نام لکھ دیں نفسِ مضمون
میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایک باتیں کرنے والا اور ایک باتیں سننے وا
چاہئیے ہے ..... سادگی کا تنہا ہونا معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے ان پر خط کا

اطلاق نہیں ہوتا۔ مکتوب نگار کے شعور میں ہر وقت یہ خیال کار فرما ہے کہ وہ صرف مکتوب الیہ سے مخاطب ہیں۔" غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ ص

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا اظہار خیال بالکل درست ہے۔ 'غبارِ خاطر' جیل میں تحریر کئے گئے اور ان خطوط کو ارباب جیل نے پوسٹ نہیں کیا بلکہ بعد میں ایک ساتھ مکتوب الیہ کو خطوط پہنچائے گئے بعض ادبی موضوعات ایسے ہوتے ہیں کہ مصنفین جہان بین کے سلسلے میں اپنے قلم کار دوستوں کو معلومات کے لئے خطوط لکھتے ہیں۔ چونکہ مسئلہ تحقیق کا ہوتا ہے اس لئے ایسے خطوط کے جواب کتب یا مخطوطات کو سامنے رکھ کر، حوالوں کے ساتھ تحریر کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ عمل راقم السطور بارہا امتیاز علی خاں عرشی کو بھی کرتے دیکھا ہے۔ ایسے خطوط میں زبان کی سادگی اور موضوع بحث، نفسِ مضمون کی بنیاد ہوتی ہے۔ چونکہ شناساؤں کو ایسے خطوط تحریر کئے جاتے ہیں اس لئے ان جملے ذات سے متعلق بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنی لکھنے پڑھنے کی مصروفیت، علالت، عزیز و اقارب وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لیکن خط لکھتے وقت تحریر کرنے والا جانتا ہے کہ میرا یہ خط محفوظ ہوگا۔ اس کی بنیاد پر مکتوب الیہ اپنے مقالہ میں مواد کو پیش کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس خط کا اقتباس مضمون میں شامل کیا جائے۔ اس لئے مکتوب نگار کی ذات کے وہ پہلو اور بے ساختگی نہیں ملتی جو خطوط کی جان ہوا کرتی ہے۔ اس طرح کے خطوط کا شمار ان علمی خطوط میں ہوتا ہے جو غور و فکر کے بعد تحریر کئے جاتے ہیں۔ وہ تحریریں جن کے بارے میں یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اسے کوئی دوسرا پڑھے اور یہ تحریر اس ذات تک ہی محدود رہے گی۔ جیسے لکھا جا رہا ہے۔ اس میں چہرے سے نقاب اٹھی ہی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوط میں دلی کیفیات اور جذبات کا اظہار رہتا ہے جنہیں مکتوب نگار کسی اور کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتا۔

بقول عبدالحق :

"لیکن جب اپنے کسی بے تکلف دوست کو خط لکھا جاتا ہے تو کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر شئے سے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف لکھ دیتا ہے۔" مکتوبات عبدالحق ص

خطوط کی حیثیت دوسری تصانیف سے مختلف ہوتی ہے۔ دیگر تحریریں مضامین، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ قارئین کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جبکہ خطوط میں نجی زندگی کے پہلو، عادات و نظریات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے خطوط کی سوانحی اعتبار سے بہت اہمیت ہے۔

دائرے خیال کے

عفت یاسمین

اس نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر دیکھنے لگی۔ وسیع میدان میں کچھ سرکاری
کے ساتھ ساتھ اس کے اسکول کی چھوٹی سی سفید عمارت نظر آرہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا
تھا جہاں کی آبادی کافی مختصر تھی۔

وہ اتوار کی ایک شام تھی۔ فضا میں ہلکی سی خنکی آچلی تھی شاید کہیں بارش
تھی۔ اسے یہاں آئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا ایسے موسم
گھر کے لان میں ایزی چیئر ڈالے گم سم بیٹھی سوچا کرتی جانے کیا کیا۔ ؟

وہ بچپن ہی سے تنہائی پسند تھی۔ جہاں گھر کے تمام افراد بیٹھے ہنسی مذاق
کرتے وہ الگ تھلگ خاموش سی بیٹھی رہتی۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس
بڑی دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ سب آپس میں پکچروں کی، کالج کی، شاپنگ اور
کے جدید فیشن کی باتیں کرتے۔ وہ بیگانہ سی بیٹھی رہتی۔ جو ملا پہن لینا، جیسا ملے
اور خوابوں کی دنیا میں کھویا رہنا اسے پسند تھا۔ بڑے بھائی اور بہنیں اس کا
اڑاتے۔

"ارے بھئی نیلو تو فلاسفر بنے گی یا پھر ارے تم نے کہا تھا گوتم بدھ کو د
ہے۔ ابھی ابھی "نروان" حاصل ہونے والا ہے۔ قہقہے ابھرتے۔ پاپا اس کی
کرتے۔ ہاں ہاں! دیکھ لینا، میری بیٹی فلاسفر یا پھر شاعر بنے گی۔"

ابتدا میں بہن بھائیوں نے اس کو بھی اپنی کمپنی میں شامل کرنا چاہا لیکن

میں تبدیلی دیکھ کر رفتہ رفتہ انھوں نے اس کی طرف توجہ دینا کم کر دیا۔ یا تو وہ اس گھر میں موجود رہا نہ ہو۔ نتیجتاً وہ اور تنہا اور الگ تھلگ ہوتی گئی اور اس کی سنجیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

امّی اس کی حالت پر کڑھتیں۔ "نیلو! یہ کیا طریقہ ہے؟ تمہیں چاہیے سب کے ساتھ ہنسی مذاق اور سیر و تفریح میں حصہ لو۔ لیکن وہ کیسے خود کو بدل دیتی۔ اسے تو قدرت نے ایسی ہی فطرت سے نوازا تھا۔ اس کی عمر کی لڑکیوں کے جو شوق تھے ان سے یکسر مختلف۔ اسکول اور کالج میں بھی اس کے دوست بس برائے نام ہی رہے۔ البتہ کالج کے زمانے میں ایک لڑکی روبینہ باوجود اس کے اکل کھرے پن کے اس سے قریب آگئی تھی۔ وہ بھی کچھ اس سے خلوص سا محسوس کرتی۔ روبینہ اکثر ناصحانہ انداز میں سمجھاتی۔ "نیلو! خوابوں کی دنیا سے باہر نکل آؤ۔ خوابوں کے رہنے والے عملی زندگی میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔" لیکن وہ خود کو نہ بدل سکتی تھی۔ کوئی انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا۔

وقت کتنی جلد گزر جاتا ہے، اس نے سوچا۔ ایک دن پاپا نے چپکے سے آنکھیں موندلیں۔ کچھ دن کے لئے زندگی کی ہماہمی جیسے تھم سی گئی۔ لیکن پھر وہی لیل و نہار۔ زندگی پھر اسی رفتار سے رواں دواں ہوگئی۔ کہیں بھی تو کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

بڑے بھیا اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔ چھوٹے بھیا نے خلیج کے کسی ملک میں اپنا آب و دانہ تلاش کر لیا۔ دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ اپنی اپنی سسرال چلی گئیں۔ بھرا پُرا گھر جیسے خالی ہوگیا۔ ایک بے نام سی اداسی پورے گھر پر چھا گئی۔ امّی دور کے رشتے کی ایک بیوہ پھوپی اور چند قدیم نوکر، بس گھر کی کل کائنات یہی رہ گئی تھی۔

اس نے بھی بی۔اے، بی۔ایڈ کر لیا اور نوکری کے لئے درخواست دی۔ اس پرآشوب دور میں نوکری پانا جوئے شیر لانے سے کس طرح کم نہیں ہے۔ لیکن قسمت نے یاوری کی اور اس کا تقرر اس قصبہ میں ہوگیا۔

امّی نے مخالفت کی۔ اکیلی اس اجاڑ قصبے میں کیسے رہوگی۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور اپنا سامان تیار کرنے لگی۔ امّی جانتی تھیں وہ سدا کی ہٹی ہے چنانچہ انھوں نے رحمت بوا کی لڑکی کو اس کے ساتھ کر دیا۔ اس نے بھی مخالفت نہیں کی۔ تقریباً ایک سال سے وہ اس قصبے میں بچوں کو پڑھا رہی ہے۔ بچے بھی اس سے کافی مانوس ہو چکے

ہیں۔ ان کی مائیں بھی فرصت کے اوقات میں اس کے پاس آ بیٹھتی ہیں اور اپنے مسائل
کہہ کے مشورے طلب کرتی ہیں۔ وہ حیران ہوتی ہے۔ وہ سب عمر اور تجربہ میں اس سے
پھر بھی اس سے مشورے طلب کرتی ہیں۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق انہیں مشورے دیتی۔
اسے حیرت آمیز خوشی ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اس کے مشوروں سے خوش بلکہ مطمئن بھی ہیں
اسی طرح گزر رہے ہیں۔ جانے وقت کا دھارا اسے کہاں بہا لے جائے۔

کیا وہ خود بھی زندگی کے اس ڈھب سے خوش ہے۔ اس نے اپنا تجزیہ کیا۔ انسان
خوشی و ناخوشی کیا۔ انسان کا اپنا کوئی ارادہ پورا نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک ان دیکھا انجانا
انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق نچاتا رہتا ہے، ایک کھلونے کی مانند۔

اس نے کب سوچا تھا کہ اس کی زندگی کا یہ طور ہوگا۔ اب وہ کبھی کبھی یہ سوچتی
کیا یہ سب اس کی مرضی کے مطابق ہے؟ نہ ہو، تب بھی بے بس انسان کیا کر سکتا۔
اسے مختلف قول یاد آتے۔ انسان چاہے تو کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے، اس
کمندیں ڈال سکتا ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔

انسان ایک حقیر ذرہ جو اپنی حقیقت بھی نہ جان سکا۔ خواہی نہ خواہی ایک کٹھ
کی مانند انجانے ہاتھوں کے اشاروں پر ناچتا جا رہا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے
جاری ہے۔ اور جب تک دنیا باقی ہے جاری رہے گا۔ لاکھ انسان تاویل
کائنات کو تسخیر کرنے کی لیکن ہوتا وہی ہے جو ان دیکھی قوت چاہتی ہے۔

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی اُلّو درخت پر پکار رہا تھا۔ یا ٹرک کچے،
سے دھول اڑاتی گزر جاتی۔ کسان اور مویشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ گھروں
ٹمٹا رہے تھے۔ رحمت بوا کی لڑکی رفیقہ نے بھی لاکر لالٹین کمرے میں لا رکھی۔
بڑھ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے اور ایک طویل سانس لی۔
کی بڑھی ہوئی لَو کو مدھم کر کے پلنگ پر آ لیٹی۔ غیر محسوس طریقے پر اس کی آ
بھیگ رہی تھیں۔

حکومت کو تجویز پیش کرنے پر مجبور کیا جہاں ۸-۱۹۷۷ء میں اسے یہ ایوارڈ
کمار یا پریم لتا موہندرا اس لگن، محنت اور قوت ارادی نے مکمل معذور
نہ صرف اُسے خود مکتفی بنایا بلکہ دوسرے معذوروں اور ضرورت مندوں
راستہ بتایا۔
اس کی بے مثال صلاحیتیں ہر ایک معذور کے لئے مشعل امید ہیں۔

کلیم خیام

صلیب

ایک زمانہ تھا جب ارشاد حسین کا طوطی بولتا تھا۔ شاندار حویلی جس کے اطراف میں انواع واقسام کے گل و بوٹے اپنی بہار دکھایا کرتے تھے سواری کے لئے شیورلین کار جس کو دیکھ کر کسی نئی نویلی دلہن کا گمان ہوتا تھا۔ گھر میں نوکروں کی فوج جن کی وردیاں بحری، بری اور ہوائی فوج کے سپاہیوں جیسی تھیں۔ عید، محرم اور شب برات پر دعوتوں کا ایسا انتظام ہوتا کہ لوگوں کی زبانوں پر برسوں ان لذیذ کھانوں کا ذائقہ رہتا۔ قرب وجوار کے عزیز ہمہ وقت حویلی میں جمع ہو کر ان کی دولت سے فیضیاب ہوا کرتے۔ ارشاد حسین کا نوابی ٹھاٹ باٹ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ طوائفوں کے مجرے، دعوتوں اور شراب و کباب کی رنگین محفلوں کے ساتھ ہی ساتھ شباب کی خرمستیوں نے قارون کے خزانے کو خالی کر دیا لیکن شاہانہ مزاج بدلنے میں کافی وقت لگا آنکھ اس وقت کھلی جب قرض خواہوں نے حویلی تک نیلام کرا لی۔ گھر کے برتن اور بیگم کے زیورات دلالوں کی تحویل میں پہلے ہی جا چکے تھے بمشکل تمام ایک کرایے کے مکان میں دو بچے اور ایک بیگم کے ساتھ اٹھ آئے۔ اسباب کے نام پر کچھ کپڑے اور ایک لکڑی کا صندوق ہی ساتھ آیا۔ بیگم ارشاد حسین جنھوں نے کبھی مشکل سے سوئی دھاگے کو ہاتھ لگایا تھا اب رات دن کپڑے سیتیں اور دونوں بچوں اور ارشاد حسین کا پیٹ بھرنے کا انتظام کرتیں۔ نواب صاحب نے تو تمام عمر لوگوں پر حکم ہی چلایا تھا اور زبان بلا تیغ تھی حکم کی تعمیل نہ ہونے پر ہمیشہ نوکروں کو ڈانٹ پھٹکار کر اور کبھی غصے میں لہولہان کر دینا ادنی سے ادنی کام نوکروں سے کرایا تھا۔ لاکھوں روپیے عیاشی اور شان و شوکت کو برقرار رکھنے میں خرچ کرنے والا بھلا چند ٹکوں کی نوکری کیا کرتا؟

دن جیسے تیسے کٹ ہی رہے تھے کہ تشکیدہ کی بند شہ نے ایک اور مصیبت کھڑی کر دی۔

چار آدمیوں کا گزر بھی مشکل سے ہو رہا تھا۔ اس پر زچگی اور پھر بچی کا خرچ! ابھی بچی کی پیدائش کے دو ماہ بعد ایک دن اس کی بڑی بہن جمیلہ کو ہلکا سا بخار آیا۔ گھریلو دواؤں سے کچھ افاقہ ہوا مگر کچھ دنوں بعد سرسامی کیفیت طاری ہوئی اور آناً فاناً ہی آٹھ سال کی ننھی سی بچی نے دم توڑ دیا۔ کفن دفن کے لئے بیگم جن عورتوں کے کپڑے سیتی تھیں ان سے کچھ پیشگی لئے اور بدقت جوں توں لخت جگر کو خاک کے سپرد کر دیا۔

ارشاد دن رات سڑکیں ناپتے پھرتے کہ شاید ان کے لائق کوئی کام حاصل ہو جائے جہاں اچھے اچھے نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگوں کو آسانی سے کام نہ ملتا ہو وہاں ایک ادھیڑ عمر کے نواب کو کہاں ملتا۔ ایک روز کام کی تلاش میں بڑے بازار میں ارشاد کو ان کے نوابی کے زمانے کا ایک کوٹھا شریک مل گیا جس سے شمشاد کے کوٹھے پر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ دونوں ایک زلف کے اسیر تھے۔ باتوں باتوں میں نواب نے اپنے خیالات بیان کر دیے سب کچھ سن کر بہزاد نے کہا: "بھئی یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے سب دن ایک طرح کے تو ہوتے نہیں اور پھر اس عمر میں آپ نوکری کونسی کریں گے۔ محنت مزدوری کرنے یا بوجھ ڈھونے سے تو رہے ہاں ایک ذریعہ ہے۔ آج کل اس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ اچھے اچھے نامی گرامی خاندانوں کی عورتیں گھریلو کام کاج کے سلسلے میں بیرونی ممالک کا سفر اختیار کر کے ڈھیروں پیسے کما رہی ہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے تم بھی بھابی کو کویت یا سعودیہ بھیج دو پھر تمہارے پرانے دن پلٹ آئیں گے۔" ——— ابھی بہزاد نہ جانے کیا کچھ کہتا کہ ارشاد نے بڑھ کر اس کا گریبان تھام لیا اور تھرتھراتے ہوئے کہنے لگے۔

"یعنی ہماری بیگم عربوں کی خادمہ بن جائے۔ میاں جیتے جی اپنی عزت و ناموس کو نیلام کر دیں ہم بھوکوں مر جائیں گے مگر ایسا کبھی بھول کر بھی نہیں کریں گے"۔

"نواب صاحب! زمانہ بدل چکا ہے۔ لوگ چاند کو روند چکے ہیں اور آپ ابھی تک عزت و ناموس، خاندان و آبرو کا آبگینہ لئے ہوئے زندگی کی آسائشوں کا قطرہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں عیش و آرام سے رہنا ہے تو عزت و ناموس کی پرواہ چھوڑ دیجئے۔ وہ زمانے بیت گئے جب و ناموس کے لٹ جانے کے خوف سے ہی لوگ اپنی جانیں دے دیتے تھے۔ آج کل برائی بھلائی، سچ جھوٹ اور حرام و حلال کی تمیز کرنے بیٹھے تو ایک طوفانی ریلا آئے گا اور آپ کا اپنا وجود ہی عزت و ناموس سمیت بہا لے جائے گا۔ خیر جیسی آپ کی مرضی۔ ایک دوست ہونے کے ناطے میں نے ایک نیک مشورہ دینا اپنا فرض سمجھا، اگر آپ بیگم کو باہر بھیجنا چاہیں

تو یہ کاغذ دیکھئے اس پر فون نمبر بھی ہے مجھے اطلاع دے دینا میں سب بندوبست کر دوں گا۔ استاد بہزاد کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ لیتے ہوئے نہ جانے کیا کیا سوچتے رہے۔ گھر جاکر اس کا ذکر بیگم سے کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ مگر چہرہ دیکھتے ہی شوہر کے اندرونی کرب کا پلک جھپکتے ہی اندازہ کر لیتی ہے۔ خاص طور سے ہندوستانی عورت۔ خواہ امیر کی بیوی ہو چاہے ادنیٰ فقیر کی، شوہر کے اترے ہوئے چہرے کو اپنے جسم کا آخری قطرہ خون بہا کر شاداب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بیگم ارشاد نے زندگی کے کئی حسین سال ان کے ساتھ گزارے تھے۔ خوش حالی کے دنوں میں تو وہ شوہر کا دکھ درد کچھ گھڑیوں پر چھوڑ دیتی تھیں۔ لیکن جب سے وہ بہار آگیں لمحے گزر گئے تھے ایک ہوشیار مالک کی طرح شوہر کی تمام تر ذمہ داریاں خود سنبھال لی تھیں۔ آج ان کی پریشانی دیکھ کر دیگر دنوں سے زیادہ فکر مند ہو گئیں۔ حیلے بہانے سے پریشانی کا سبب جاننے کی کوشش شروع کر دی۔ ارشاد نے نہ چاہتے ہوئے بھی بہزاد سے ملاقات اور گفتگو دہراتے ہوئے کہا "بیگم تم ہی بتاؤ کیا میں ایسی ذلت برداشت کر سکوں گا۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں تاکہ زندگی کے بکھیڑے ہی مٹ جائیں۔

کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بھی۔ مریں آپ کے دشمن۔ آپ کی آن پر آنچ آئے میں نصیبوں جلی اگر اپنی جان دے کر بھی آپ کو خوشی دے سکوں تو یہ میرے لئے کم سعادت ہے۔ مشورہ تو اس نے واقعی بڑا اچھا دیا ہے۔ خانہ داری سے تو عورت کسی حال میں چھٹکارا نہ پائی۔ رہی نوکری کی بات تو آج کل نوجوان لڑکیاں بھی تو آفسوں میں نوکری کر کے اپنے کنبے کی کفالت کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تو آبرو باختہ ہوتی نہیں۔ یوں بھی عورت جب تک خود نہ چاہے گھاگھ سے گھاگھ مرد بھی اس کی طرف آنکھ تک اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ آبرو پر ہاتھ ڈالنا تو دور کی بات ہے۔ کم از کم موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات ہمارے لئے مفید کارآمد ہے۔ اگر آپ میری مانیں تو کل ہی جاکر اپنے دوست سے ضروری معلومات کر کے مجھے بھیجنے کی تیاری کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو واقعی ہمارے دن پھرنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

بیگم ارشاد نے بڑے ہی مدبرانہ انداز میں ارشاد سے اپنی بات منوائی۔

عورت کو جاہل اور کند ذہن کہنے والے لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ تمام انجینئر ڈاکٹر، فلاسفر اور سائنس دانوں کے علاوہ دیوتاؤں اور پیغمبروں تک کو عورت ہی ماں بن کر رموزِ حیات سے آشنا کرتی ہے۔ یہی عورت ہر کامیاب ترین شخص کے پس پشت ماں، بہن، بیوی یا بیٹی بن کر رنج و غم کو اپنی دھیمی مسکراہٹ سے بدل کر مسرتوں کے گلاب بکھیرتی

میں برابر کی شریک رہتی ہے

بیگم ارشاد کے گزرتے جاتے ہی رونق جیسا پیار بھرنے ارشاد حسین نے مستقل کمانا لے لگی۔ بعد میں پیسے کی فراوانی ہوتے ہی ارشاد کی صحت بھی نکھر آئی۔ بڑے لڑکے کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ شکیلہ بھی گھر پر پڑھنے لگی۔ ایک روز نعیم اسکول سے گھر لوٹا تو اسے قے ہونے لگی۔ پے در پے کئی الٹیاں ہوئیں۔ ارشاد گھبرا گئے۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا "آپ نے آنے میں دیر کر دی۔ اسے ہیضہ ہو گیا ہے۔ دوا اور انجکشن دے رہا ہوں۔ لیکن زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ دعا کیجئے قسمت رہی تو بچ جائے گا۔" لیکن قسمت تو آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ پہنچتے پہنچتے نعیم نے آخری ہچکی لی اور ایک زوردار قے کے ساتھ پرسکون نیند۔ ارشاد کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ شکیلہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ گھر میں کہرام برپا۔ بیگم ارشاد کو ٹرنک کال کیا گیا۔ لیکن موسم کی خرابی کے باعث لائن نہ مل سکی۔ مجبوراً بیٹی نے رو دھو کر صبر کی چادر اوڑھ لی۔ نعیم کی موت نے ارشاد کو ادھ مرا کر ڈالا۔ اب بات بے بات وہ شکیلہ کو جھڑک کر رکھ دیتے۔ سات آٹھ سال کی بچی کچھ تڑپتے ہوئے سہم جاتی۔ چھ سال اسی طرح گزر گئے

ایک رات ارشاد برآمدے میں فکر میں ڈوبے ہوئے کرسی پر دراز تھے اسی میں نیند آ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو کرسی سے اٹھنا چاہا۔ لیکن داہنے ہاتھ میں جنبش نہ تھی۔ پاؤں اٹھانا چاہا تو پاؤں بھی بے جان۔ شکیلہ کو آواز دینا چاہی تو زبان اینٹھ کر رہ گئی۔ بڑی دیر تک اپنی بے چارگی پر آنسو بہاتے رہے۔ آخر کسی طرح سے شکیلہ برآمدے میں آئی اور انھیں روتا ہوا دیکھ کر حال دریافت کیا وہ اوں آں کر کے رہ گئے۔ باپ کی یہ حالت دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔ ڈاکٹر کو بلا کر لائی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہارے والد پر فالج کا اثر ہے۔ مگر گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس عمر میں اکثر لوگوں کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ دوا دے رہا ہوں اسے وقت سے پلاتے رہنا اور انجکشن بازار سے منگوا لو۔ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ بعد میں پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ دوا کے ساتھ ہی ساتھ غذا اور شکیلہ کی دن رات کی دیکھ بھال سے ارشاد بہت جلد رو بہ صحت ہو گئے لیکن چلنا پھرنا موقوف ہو گیا۔ ہاں تھوڑی بہت لکنت کے ساتھ گفتگو کرنے لگے۔ ارشاد کی حالت کی خبر سنتے ہی فوری طور پر بیگم ارشاد دہلی لوٹ آئیں۔ یہاں آ

جتنی کی موت کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ انھوں نے گھر کی تباہی کا ذمہ دار شکیلہ ہی کو سمجھا۔ پیدائش کے وقت گھر سے بے گھر ہونا، خوشحالی کا رخصت ہونا چھوٹے لڑکے کی موت اور شوہر پر فالج گرنے کو بھی اس کی نحوست گردانا۔ کچھ دن بعد وہ میکے لوٹ گئیں۔

ارشاد کی دیکھ بھال کے ساتھ ہی شکیلہ اپنی تعلیم کی طرف توجہ دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے نویں جماعت میں کامیابی حاصل کر لی۔ ایس۔ ایس۔ سی میں پہنچتے ہی اس کے دور کے رشتے کی خالہ نے اسے اپنے لڑکے جمیل کے لئے مانگ لیا۔ ایس۔ ایس۔ سی امتحان کے نتیجے کے بعد دونوں کی شادی ٹھیرائی گئی۔

ایک دن اسکول کی ایک سہیلی کے بھائی کی شادی تھی۔ شکیلہ شام سے شادی میں شرکت کے لئے تیاری کر رہی تھی۔ بادل رہ رہ کر آسمان پر چھاتے چلے جا رہے تھے۔ بارش کے آثار دیکھ کر شکیلہ نے اپنا ارادہ ملتوی کرنا چاہا لیکن سہیلی بڑی عزیز تھی اور اس نے بہت زور دے کر شرکت کے لئے مدعو کیا تھا۔ نہ جانے پر تعلقات بگڑ سکتے تھے۔ اسی خیال کے تحت شکیلہ باپ سے اجازت لے کر روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ خوب سج دھج کر آئینہ میں اپنا سراپا دیکھ کر شکیلہ خود ہی شرما گئی۔ سہیلی کے گھر پہنچی تو مہمانوں سے پورا گھر بھر چکا تھا۔ نوری بڑی بے چینی سے شکیلہ کی راہ تک رہی تھی۔ سب سہیلیوں نے اس کی سج دھج دیکھ کر اسے چھیڑنا شروع کر دیا "بھئی ایک دلہن تو نعیم بھیا بیاہ کر لا رہے ہیں اور ایک خود چل کر آ گئی"۔ اس بات کو سن کر سب نے قہقہہ لگایا اور بے چاری شکیلہ شرما کے رہ گئی۔ انہی خوش گپیوں میں وقت پر لگا کر اڑتا گیا۔ نکاح کے بعد دعوت طعام میں کافی رات گزر گئی۔ شکیلہ نے رخصت چاہی لیکن طوفانی بارش کے باعث نوری نے وہیں رک جانے کو کہا۔ شکیلہ نے باپ کی تنہائی اور ناراضگی کے خوف سے نہ رکنا چاہا لیکن اس شدید طوفانی بارش میں کسی سواری کا ملنا بھی محال تھا۔ مجبوراً وہ رات اسے وہیں بسر کرنی پڑی۔

صبح نوری نے اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ شکیلہ کو کار میں بٹھا کر رخصت کیا۔ سہمی سہمی شکیلہ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گھر کے دروازے پر کار کے رکنے کی آواز سن کر اڑوس پڑوس کی کئی عورتوں نے جھانک کر دیکھا اور ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کہنے لگیں "ارے بجو کی لڑکی دیکھ رہی ہو؟ اللہ جانے کہاں رہی تھی۔ اپاہج باپ کو سمجھ کر اب جوان بیٹی نے کیا گل کھلائے ... چھپا کر ... بھی کیا۔ اکیلے جوانی کے دن تو کاٹنے مشکل ہیں ...

بھی باپ کے سر سے شادی کا فکر بھی گیا" دوسری عورت نے کہا۔ تیسری نے کچھ کہا۔ شکیلہ سنی ان سنی کرکے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ بارش پھر ہونے لگی۔ شکیلہ گھر میں داخل ہوئی۔ بھیگ کر شرابور ہوگئی، بارش کے ریلوں اور طعنوں کے نشتروں سے بچ کر گھر میں آگئی لیکن ایک اور طوفان اسے اپنی زد میں لینے کو تیار کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی ارشاد حسین نے کہا "رات بھر کہاں تھی۔ سہیلی کے بھائی کی شادی کا بہانہ کرکے خود اپنی ہی شادی رچا بیٹھی۔ ارے یہی سب کچھ کرنا تھا تو مجھ [illegible] کو زہر دے دیا ہوتا تاکہ میں تیری صورت تو نہ دیکھتا۔ ہائے میں اب تیری ماں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ محلے والے تو پہلے ہی تیرے تعلق سے طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اب تو اور جینا دوبھر کردے گی۔ کیوں نہ گئی بے حیا کیا منہ لے کر آئی ہے میرے پاس" اور اتنا کہتے ہی انھوں نے اسے پیٹ کر رکھ دیا۔ شکیلہ نے لاکھ چاہا کہ وہ تمام روداد بتائے اور اپنی مجبوری بیان کرے لیکن ارشاد نے اسے کہنے کا موقع دیئے بغیر پیٹ کر رکھ دیا اور کمرے میں چلے گئے۔

شکیلہ بہت دیر کے بعد گھسٹتے ہوئے اٹھی اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باپ کے کمرے میں جاکر نیند کی گولیوں کی شیشی اٹھا لائی اور تمام گولیاں نگل لیں اس کے بعد بے گناہی کو ظاہر کرنے کے لئے والد کے نام ایک خط لکھا۔

پیارے ابو! میں تو نا سمجھ بچے کی طرح معصوم اور پاک ہوں۔ موسم کی خرابی کے باعث سہیلی نے آنے سے منع کردیا تھا۔ میرے انکار کے باوجود کوئی سواری ایسی بارش میں نہیں آسکتی تھی ...... پڑوسیوں نے تو خیر جو کچھ کہا ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ مگر ابو آپ تو مجھ سے، میرے کردار سے اور میری ذات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ نے بھی مجھے آبرو باختہ سمجھ لیا۔ اب میرا جینا اور مرنا ایک جیسا ہے۔ آپ کو بدنامی کا داغ نہیں اٹھانے دوں گی۔ بس جارہی ہوں ...... وہاں جہاں سے واپس نہیں آنا ہے نہ تو گناہ کرنے کے لئے اور نہ ہی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے۔ تو میری خطائیں بخش دیجئے گا۔

آپ کی بدنصیب بیٹی ۔ شکیلہ

تیسرے دن شکیلہ نے ڈاکٹروں کی تمام کوششوں کو بے کار کرتے ہوئے دم

عزیز اور دشمن برابر ہیں دونوں — نہ یہ کام آئے، نہ وہ کام آیا

گاؤکشی کے خاتمہ کے لئے سوامی شردھانند کی تجویز

خدا بخش لائبریری میں جو نادر مواد جمع ہے اس میں گجرات کی قدیم ریاست منگرول کا ایک اہم رسالہ "زبان" بھی ہے جو ۱۹۲۶ء میں نکلتا تھا۔ رسالہ "زبان" میں جہاں اور بہت سا اہم مواد ہے، مثلاً بیکس رام پوری، شوکت تھانوی اور اقبال علی عرشی کی شاعری کے وہ نمونے جنہیں لوگ بھول چکے، وہاں سوامی شردھانند کی ایک اہم تجویز بھی ہے جس میں بتایا ہے کہ گاؤکشی کس طرح آسانی سے بند ہو سکتی ہے۔ سوامی جی نے لکھا ہے:

"گاؤکشی کے متعلق ہندوؤں کا طرزِ عمل مجھے ہرگز پسند نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں سال بھر میں تیس ہزار سے زیادہ گایوں کی قربانی نہیں کی جاتی۔ ایک مسلمان مذہباً یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک گائے کی قربانی سات مسلمانوں کو بہشت میں لے جائے گی۔ مگر تقریباً دس لاکھ گائیں اور بیل ہر سال فوجی چھاؤنیوں میں برطانی افواج کے لئے ذبح کی جاتی ہیں تقریباً ۱۵ لاکھ ہندوستان کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے اور چالیس لاکھ کے قریب بیف (دکھانے کا گوشت) امریکہ کی تجارت کے لئے ذبح ہوتا ہے۔ پھر ان سب گاؤکشیوں پر ایک ہندو کو کیوں اذیت نہیں پہنچتی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مسلمان قربانی کے جانوروں کی ایسی نمائش کرتے ہیں جو طیش انگیز ہوتی ہے اس لئے ہندو مشتعل ہو جاتے ہیں لیکن جس وقت گائیں اور بیل کھلے راستوں پر سے مذبح میں ہنکالے جاتے ہیں پھر ان ہزارہا گایوں کی نمائش سے وہ کیوں برانگیختہ نہیں ہوتے؟ مسلمان (ہندوؤں کے خیال میں) اپنی نادانی سے سمجھتے ہیں کہ وہ ایک نیک مذہبی کام کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے ناداں ہندو ان کے کسی فعل نادانی پر کیسا برانگیختہ ہونے کا کونسا موقع ہے؟ ہندوؤں کو اپنے بھائیوں کے لئے مذاہب عالم کی [illegible] سمجھانا چاہیے کہ انسانی جذبات اور نفسانی خواہشات کی قربانی، دیگر [illegible] کی قربانی صرف خدا کے نزدیک مقبول ہو سکتی ہے اور نفرت کے [illegible]

جیسا ان کہتا تو صحت اور مسرت کے بجائے پیش آنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ [illegible] اختیار کی گئی تو نہ صرف ہندوؤں کو جو شکایت ہے وہ دور ہو جائے گی بلکہ مسلمانوں کے دل سے نکل جائے گی [illegible] کہ [illegible] گائے کی قربانی کی بجائے [illegible] چاہتے ہیں [illegible] ہے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ [illegible] ایک گائے جو بیس روپے کو خریدی جا سکے سات آدمیوں کی طرف سے قربانی کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے میری ایک تجویز ہے کہ تمام ہندو قطعاً گوشت کھانا چھوڑ دیں تب بکرے وغیرہ ارزاں ہو جائیں گے اور مسلمان اپنے مذہبی فرائض کو گائے کے وجود سے (جو ان کے نزدیک متبرک ہے) محروم نہ رکھ سکیں گے۔"

سوامی جی کے بیان میں بے جا اختصار کے ساتھ جو یہ بات آگئی ہے کہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ گائے کی قربانی سات مسلمانوں کو بہشت میں لے جائے گی صحیح نہیں ہے۔ صحیح صرف اتنا ہے کہ قربانی مذہبی رسوم کا حصہ ہے مگر گائے پر مذہب نے کہیں زور نہیں دیا نہ اس پر کہ بہشت کو جانے کا بس یہی راستہ ہے۔ البتہ یہ ضرور ٹھیک ہے کہ جہاں ایک بکرے کی قربانی صرف ایک فرد کی طرف سے دی جا سکتی ہے بیل یا گائے کی قربانی میں سات افراد شریک ہو سکتے ہیں، یہ امر مالی اعتبار سے پچھڑے ہوئے مسلمانوں کے لئے آسانی کا باعث ہے۔ اگر سوامی جی کی تجویز کے مطابق ہندو گوشت کھانا چھوڑ دیتے تو یہ کئی اعتبار سے بہتر ہوتا لیکن یہ ٹھوس حقیقت سب کے سامنے [illegible] کی طرح موجود و عیاں ہے کہ بکرے اور گائے کی قیمت بالترتیب دس اور بیس روپے کے سوامی جی والے زمانے سے لے کر آج کے دور میں جب کہ یہ قیمت پانچ سو اور ایک ہزار روپیوں تک پہنچ گئی تو سوامی جی کے سمجھانے کے احترام میں گوشت خوری ترک کرنا یا کم کرنا تو درکنار ہندوؤں کی اکثریت بشمول سبزی خور طبقوں کے گوشت خور قوموں کو بہت پیچھے دھکیل گئی ہے اسکے اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے (سائنسی اور طبی تحقیقات کے ذریعہ) کہ انسانی خوراک گوشت کا شامل ہونا صحت و طاقت کے لئے بے حد ضروری ہے اور یہ ایک قدرتی خوراک ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ہاں بکرے اور گائے کی قربانی کے [illegible] بہت بڑا روحانی اور سائنٹفک اسلامی فلسفہ ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے اور یہ ایک جداگانہ پس منظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے

ایک معذور لڑکی پریم لتا جو پاؤں سے لکھتی ہے

۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء کو لدھیانہ کے ایک گھر میں ایک ایسی لڑکی پیدا ہوئی جو صرف
سانس سے مشابہت رکھتی تھی۔ معذور بازو، ہاتھ اور کمزور دائیں پاؤں کے علاوہ اس میں
[illegible] عیب تھے۔ اس کے والدین کی ستم ظریفی یہ کہ اس خاندان کی پہلی اولاد تھی۔
مس پریم لتا مہندرا کی پیدائش کا یہ نظارہ تھا جس نے اپنی معذوری سے نہ صرف
[illegible] لیا بلکہ خود مکتفی ہوتے ہوئے اپنے فرائض کی اتنی لگن کے ساتھ تکمیل کی کہ اس کے
افسرانِ اعلیٰ بے حد متاثر ہوگئے اور قوم نے اس کی جرات پر ۱۹۸۲ء کا قومی ایوارڈ برائے
معذورین اسے عطا کیا۔
اپنے بچپن کے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے پریم لتا کہتی ہیں کہ ان کی اس حالت پر خاص کر
ان کی ماں ہمیشہ آنسو بہاتی رہتی تھیں۔ وہ اکثر یہ سوچا کرتی تھیں کہ کون اس نحیف کمزور
جسم کے شریر بچے ایک فراک تک بھی پہنا سکتا۔
طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پریم لتا اکثر نمونیہ سے بیمار رہا کرتی تھی۔ اس کی ماں کی کوشش
[illegible] سالم رکھنے تک مرکوز تھیں، لیکن اس کے نتائج اور بھی سامنے آتے رہے اور بدقسمتی
کی طرح وہ تاخیر سے ہی سہی رینگنے اور چلنے لگی۔
اور یہی وقت پریم لتا کی زندگی کا نیا موڑ ثابت ہوئی اور وہ اپنے پاؤں کے سہارے کام کرنے
قابل ہو سکی۔ وہ میری جماعت ہے وہ مسلسل کام کرتی چلی آرہی ہے۔ جب اس نے کہا "میں
بے صاف دھو سکتی ہوں، ہر قسم برتن اور یہی ضروریات پوری متعلق اپنے پاؤں سے کرتی
ساتھ پیروں سے کپڑے اس عمدگی سے استری کرتی ہوں کہ ہم [illegible]
[illegible]

کے لئے بھیجنا شروع کیا جہاں اس کے جسم کا نچلا حصہ اپنے کندھوں پر اسکول لے جاتی تھی زندہ جسم اٹھانے چلنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے اسے مضبوطی بھی حاصل کرنے کو اس کی ماں یہ سمجھتی تھی کہ اس کا لڑکا اب بھی کھیل سکتا ہے... پیروں سے چلنے پر اکتفا کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ نادر پر اس کے باپ نے اس خاندان کو دلی منتقل کیا جہاں اسے ایسے لڑکوں کا اسکول برائے معذورین میں داخل کروایا گیا جہاں سے اس نے اعلیٰ ثانوی کا امتحان پاس کیا۔

گھر پر اپنے ہاتھ سے ہل چلاتے تھے لیکن وہ ان کے ساتھ برابر کھیلتی تھی۔ وہ لکھتی ہے میری کی ان حرکات کے باوجود پریشانی میں بھی اور ان کی برابر رہبری کرتی رہی" اس نے مزید کہا: "میں حقیقت میں مندرو ندگی شکر گزار ہوں جس نے ان حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے مجھ میں قوت ارادی عطا کی ہے۔"

یہ اس کا اصلی امتحان مدرسہ کی تعلیم کے دوران رہا لیکن اب کالج کی تعلیم کا وقت آگیا تھا جس کے لئے دور مقام کو جانا پڑتا تھا۔ اپنے رشتہ داروں کی مزاحمت کے باوجود اس نے اندرا پرستھا کالج دلی میں داخلہ لیا اور اندرا پوری میں واقع اپنے گھر سے کالج کو یونیورسٹی کی مخصوص بس میں اپنے طور پر جایا کرتی تھی۔ زندگی سے اس کی اس جد و جہد نے اسے ۱۹۶۵ء میں گریجویٹ بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے مزید تین سالوں کے دوران ویمنس پالی ٹکنک دلی سے ۱۹۶۸ء میں لائبریری سائنس کا صداقت نامہ حاصل کیا۔ اس کا یہ سفر ابھی یہیں ختم نہیں ہوا۔ اس کی تعلیمی دلچسپی تعلیم سے مزید بڑھنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن روزگار کی تلاش اس کے لئے ایک اور قصہ معاملہ سے کم نہیں تھا۔ فکر نہ ہوئے روزگار کی تلاش ایک مشکل امر ہے۔ وہ جہاں بھی انٹرویو کے لئے جاتی، انتخاب کرنے والے صرف اس کے جسم کو دیکھ کر اسے مسترد کر دیتے تھے۔ ایسے دور بے روزگار رہنا، جو ایک عام انسان کے لئے دل برداشتہ ہونے کا فی ہے لیکن پریم لتا تھکنے نہ گھر کی چھوٹی موٹی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس نے ٹیوشن دینا شروع کیا اور ساتھ ہی ذہن اپنے مستقبل منصوبے پر برقرار رکھا۔ اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا جبکہ ایک موقع پر اس نے سوامی نارائن آنند سے ملاقات کی۔ انھوں نے اسے روحانی زندگی قیمتی دولت عبادت کی طرف راغب کیا۔ اس نے بھی عبادت کرنا شروع کر دیا جس سے اسے ذہنی آسودگی ملی تب اسے ڈائرکٹوریٹ ٹکنیکل ٹریننگ انٹرویو کے لئے طلب کیا گیا جہاں لائبریرین کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔ اور اس نے ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء سے اپنی کرسی

غزل

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشاء

اک چھوٹے سے دل کے اندر درد کے محشر کتنے ہیں
جھیل کے جیسی دو آنکھوں میں غم کے سمندر کتنے ہیں

اگتے سورج کی کرنوں کو گرم سفر تو ہونے دو
چشم زدن میں گھل جائیں گے موم کے پیکر کتنے ہیں

بیساکھی کے جھوٹے سہارے ختم جو ہو جائیں تو پھر
ہم دیکھیں گے لوگ ہمارے قد کے برابر کتنے ہیں

آتی جاتی سانس کی قسطیں دیتے رہتے ہیں پھر بھی
کیا بتلائیں قرض ہستی باقی ہم پر کتنے ہیں

داغ حسرت ہی کے دیپک جن میں جلتے رہتے ہیں
بستی بستی، قریہ قریہ ایسے بھی گھر کتنے ہیں

ٹھنڈی چھاؤں میں رہنے والو تم کو کچھ احساس بھی ہے
دھوپ میں جلنے بھننے والے کرب کے خوگر کتنے ہیں

یاروں کی اس بھیڑ میں منشاء ہم کو کچھ معلوم تو ہو
کتنے ہیں ہمدرد ہمارے، راہ کے پتھر کتنے ہیں

۱۱ - اسٹار کی ٹاؤن - ناگپور

پروفیسر احتشام اختر

بے گھر نہ جب ہوا تھا میں کنج اماں میں تھا
کنگال ہی سہی مگر اپنے مکاں میں تھا

پیاری ہے مجھ کو ماں کی طرح یہ زمین بھی
اس سے ملا ہے پیار وہی جو کہ ماں میں تھا

سنتے ہی بات یاروں کو بس آگ لگ گئی
پوشیدہ ایک شعلہ سا میرے بیاں میں تھا

اڑنا یہ ڈال ڈال پہ اچھا تو ہے مگر
پرواز کا مزہ تو میاں آسماں میں تھا

مقصود ہے کہنے کا انداز وہ نہیں
جادو کا سا اثر تو تمہاری زباں میں تھا

اچھا ہوا کہ اس نے نہ پھینکا مری طرف
ورنہ نظر کا تیر بھی اس کی کماں میں تھا

اختر وہ بس گیا تھا مرے دل میں آن کر
جس کو میں ڈھونڈتا تھا وہ میرے مکاں میں تھا

غزل

رؤف رحیم ایم-اے

کیوں نہ بڑھ جائے مرے دل کی لگن برسات میں
شعلہ بن جاتا ہے وہ بھیگا بدن برسات میں

جب دھنک صورت کسی کی یاد لہرانے لگی
بن کا آنچل سا نظر آیا گگن برسات میں

کاش میرے اس دلِ ویراں پہ بھی آتے بہار
باغ بن جاتے ہیں جب کوہ و دمن برسات میں

دیکھ! اس موسم میں ہے پینے پلانے کا مزہ
تو نہیں پیتا نہ پی، ساقی تو بن برسات میں

چھت کا یہ عالم کہ سونا بیٹھنا ممکن نہیں
اور آ جائے جو کوئی دفعتاً برسات میں

ہے یہ بارش ان کی در پردہ دعاؤں کا اثر
لڑ رہے ہیں یوں بھی شیخ و برہمن برسات میں

دن سلونے ہو گئے، راتیں سہانی ہو گئیں
رشکِ جنت ہو گیا میرا دکن برسات میں

یوں بھی فرقت کا زمانہ جان لیوا ہے مگر
اور بڑھ جاتے ہیں کچھ رنج و محن برسات میں

آتشِ گل نے لگا دی آگ ساون میں رحیم
وائے محرومی کہ جل اٹھا چمن برسات میں

مکان ۲۰-۵-۵۲۵، شکر گنج، حیدرآباد 500265

اسد اللہ خان اسد

غم میں ڈوبی ہوئی آواز کیسے پیش کروں
دل کا ٹوٹا ہوا یہ ساز کیسے پیش کروں

میرے رنگین سے جذبات جو ہیں شکلِ غزل
اپنے فن کا میں یہ اعجاز کیسے پیش کروں

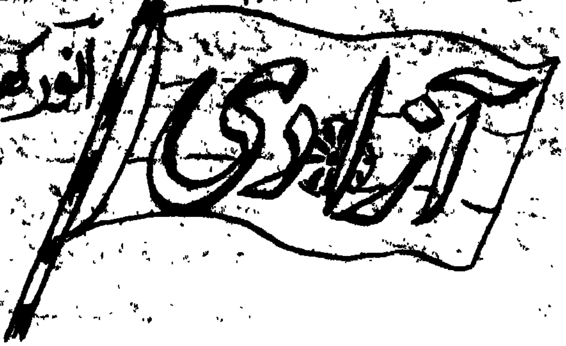
کون محفل میں ترا آج بھرم رکھے گا
اے تخیل تری پرواز کیسے پیش کروں

ظلم سہنا مری عادت ہے وفا کا خوگر
اس طرح جینے کا انداز کیسے پیش کروں

میری آنکھوں کے یہ ٹوٹے ہوئے تارے ہیں اسد
کون ہے یاں مرا دمساز کیسے پیش کروں

دیس

پردیسی پوہ۔ کمسونی



انور کمال گاٹوی

شور تھا مہر بصد ناز نمایاں ہوگا
آسماں صبح کے جلوے سے درخشاں ہوگا
غولِ منحوس گھٹاؤں کا گریزاں ہوگا
ناامیدی کا دھندلکا بھی پرافشاں ہوگا
ٹوٹ جائے گا طلسمِ شبِ تیرہ آخر
ظلمتِ یاس کا شیرازہ پریشاں ہوگا
نور کا غسل فضاؤں کو دیا جائے گا
عرش سے فرش تک انوار کا طوفاں ہوگا
کفر ٹوٹے گا غلامی کا تھا شہرہ ہر سو
جلوہ آزادیٔ کامل کا نمایاں ہوگا
منتشر ہوگا فرنگی کا نظامِ باطل
جبرِ محکومی سے آزاد ہر انساں ہوگا
اب نہ مزدور کا حق چھین سکے گا کوئی
شاد و آباد ہر اک خانۂ دہقاں ہوگا
باغباں روح نئی پھونکیں ہر بوٹے میں
موسمِ گل کا ہر اک شاخ پہ احساں ہوگا
نغمۂ عیش سے گونجے گی فضائے گلشن
پھولنے پھلنے کا ہر نخل کو ارماں ہوگا

جلال پورہ ۔ کھام گاؤں 444303 مہاراشٹرا

جب چمن سے آزاد پرندے جو ہونگے — دستِ گلچیں سے بچے غنچۂ خنداں ہوگا
اب نہ پامالِ خزاں ہوں گے چمن کے بوٹے — اب نہ شیرازۂ جمعیّتِ دل پریشاں ہوگا
موج کو ہوگی تمنا کہ سمندر بن جائے — موج بنے گا ہر اک قطرہ تو درماں ہوگا
ہوں گے پستی میں بھی انداز بلندی پیدا — ذرۂ خاک بھی خورشید بداماں ہوگا
آشیاں کو نہ کبھی برق کا کھٹکا ہوگا — اب سفینے کا نہ دشمن کوئی طوفاں ہوگا
کارواں راہِ طلب سے نہ کبھی بھٹکے گا — راہزن راہیٔ درماندہ کا نگراں ہوگا
پھر دکھائے گی مسیحا نفسی اپنا اثر — دردِ دیرینۂ انساں کا درماں ہوگا

تھی خبر کس کو یہ امید نہ بر آئے گی
لے کے دامن بھی اندھیروں کو سحر آئے گی

تھا کسے علم نہاں نغمہ میں شیون ہوگا — اتنا تاریک نہ مستقبلِ گلشن ہوگا
بات یہ وہم و گماں میں بھی نہ آسکتی تھی — فصلِ گل آتے ہی برباد نشیمن ہوگا
چھائیں گے مطلعِ گلشن پہ تباہی کے سحاب — باغ برگ و ثمر و غنچہ کا مدفن ہوگا
اوس بربادیٔ گلشن کا کرے گی ماتم — نفسِ برق و شرر درپئے خرمن ہوگا
خونِ بلبل سے بجھائے گی خزاں پیاس اپنی — باغباں سبزۂ نوخیز کا دشمن ہوگا
گل جگر چاک، کلی مردہ، پریشاں نکہت — مسکنِ موسمِ گل، سوز کا مخزن ہوگا
ہوں گے مجبورِ فغاں سارے چمن کے طائر — صحنِ گلشن میں بپا محشرِ شیون ہوگا
بال کٹ جائیں گے، چھن جائے گی تابِ پرواز — قیدِ صیاد سے کچھ کم نہ نشیمن ہوگا
کعبہ و دیر میں آویزشِ پیہم ہوگی — شیخ کے درپئے آزار برہمن ہوگا
دل بدل جائیں گے نیت میں فتور آئے گا — ہمدمِ دیرینہ بھی جان کا دشمن ہوگا
ہونٹ بھی اپنے ہی اور دانت بھی اپنے ہوں گے — اپنا ہی دستِ جنوں اپنا ہی دامن ہوگا
آڑ میں پردۂ جمہور کے شاہی ہوگی !! — رہبرِ قافلہ کے بھیس میں رہزن ہوگا
تبصرہ کوئی نہ تنقید سنی جائے گی — فکر جذبات پہ پابندی کا قدغن ہوگا
بے گنہ اردو زباں موت کے گھاٹ اترے گی — ہمنوا ناحق پہ کوئی نوحہ نہ شیون ہوگا
قلبِ بے تاب کو دی جائے گی پیہم تسکیں — وعدے کرنا بھی، مکر جانا بھی فیشن ہوگا

دیکھنا یہ ہے کہ کب شب کی سحر ہوتی ہے
شکلِ آزادی ہم آغوشِ نظر ہوتی ہے

ماہنامہ

شاداب

مینیجنگ ایڈیٹر
عبدالجبار محمد نعیم الدین احسن

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مجلس مشاورت

عائشہ بیگم زیبا	یوسف ناظم	ڈاکٹر محمد یوسف الدین
...رضی الدین احمد	منیر احمد صدیقی	محمد منظور احمد منظور
...مجا فاروقی	ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا	پروفیسر میر تراب علی

زر تعاون

...ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
5 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
9...	270 ،،	65 ،،	36 ،،	225 ،،
10...	2500 ،،	450 ،،	300 ،،	2000 ،،

قیمت ۵ روپئے

جلد ۲ : شمارہ ۹
ستمبر ۱۹۸...

...: ماہنامہ شاداب' 147-5-11، ...، حیدرآباد ـ 4

...پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے ... پریس ... میں چھپوا کر دفتر شاداب ... سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول

مرکزی حکومت کی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ہر ضلع میں نودیا ودیالیہ کھولے جا رہے ہیں، جو اقامتی اسکول ہیں اور ان میں جماعت ششم میں داخلہ کے لئے ایک داخلی انٹرنس لیا جارہا ہے جو مادری اور علاقائی دونوں زبانوں میں ہوگا۔

اردو والوں کے لئے مادری زبان اردو اور آندھرا پردیش کی حد تک علاقائی زبان تیلگو ہے۔ دیگر اسٹیٹوں کے لئے علاقائی زبان ان کی اپنی زبانیں ہیں، یہ تعلیم ان زبانوں میں دی جائے گی اور جماعت ہشتم سے ذریعہ تعلیم ہندی کر دیا جائے گا۔

اردو والوں کا مطالبہ ہے کہ جہاں اردو میڈیم کے طلباء موجود ہوں وہاں اس میڈیم کی جماعتیں چلائی جائیں اور جہاں متوازی جماعتوں کی صورت پیدا نہ ہو وہاں بحیثیت زبان خصوصی پڑھائی جائے۔

اسی طرح ہماری اسٹیٹ میں رزیڈنشیل اسکولوں کا ایک جال سا بچھا دیا گیا ہے، جہاں نہایت عمدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز ہماری حکومت کے سر اولیت کا سہرا ہے جس نے اردو میڈیم ریذیڈنشیل اسکول حیدرآباد میں قائم کیا۔ ہم اردو والوں کی مانگ کو دہراتے ہیں کہ آندھرا، تلنگانہ اور رائلسیما تینوں علاقوں میں ایسے اردو میڈیم اسکول قائم کئے جائیں اور جہاں علحدہ اسکول ممکن نہ ہوں، تیلگو میڈیم اسکولوں میں متوازی اردو جماعتیں قائم کی جائیں اور ایسا بھی ممکن نہ ہو تو تیلگو میڈیم میں اردو کو لازمی بحیثیت خصوصی زبان پڑھائی جائے۔

اردو والوں پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ سنٹرل اور اسٹیٹ اسکولوں میں اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کرائیں تاکہ حکومت کی جانب سے اوپر بتائی ہوئی آسانیاں فراہم کی جائیں۔ ضرورت ہے کہ نودیا ودیالیہ (مرکزی) اور ریذیڈنشیل اسکول (اسٹیٹ) میں داخلہ کے انٹرنس ٹسٹ سے کافی پہلے سروے کرکے ذہین طلباء و طالبات کو چن لیا جائے اور محنت کی جائے اور انٹرنس ٹسٹ کے لئے انھیں تیار کیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو ان اسکولوں میں داخلہ کے لئے قبل از قبل تیار کرلیں اور اپنی ذہانت کا صحیح استعمال کر کے اپنے آپ کو درخشاں مستقبل سے ہمکنار کریں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

دوسری قسط

پیامِ انسانیت پونے میں ایک ڈائیلاگ

غیر مسلم دانشوروں کے ساتھ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک گفتگو!

مولانا نے اس ملک کے تمام باشندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر فرد کی قسمت دوسرے فرد سے وابستہ ہے، اگر کسی ایک فرد یا ایک فرقہ کو پھر اگھونپا جائے، اس کا گھر جلا دیا جائے اور یہ کہہ کر اطمینان کر لیا جائے کہ ہمارے علاقہ میں نہیں ہوا، اس لئے ہم سے کوئی مطلب نہیں۔ مولانا نے اسی رجحان پر تنقید کرتے ہوئے اس ملک کو (حدیث نبویؐ کے الفاظ میں) ایسی کشتی سے تشبیہ دی جس میں اپر کلاس اور لوئر کلاس ہیں، اگر اپر کلاس والے لوئر کلاس والوں کو کشتی میں سوراخ کرنے سے منع نہیں کریں گے تو دونوں ہی ڈوبیں گے، مولانا نے فرمایا:۔

ہم کو آپ کو سب کو بہرحال اس ملک میں زندگی گزارنی ہے، ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اگر ہم نے خود غرضی سے کام لیا اور اپنے گھر میں میٹھے میٹھے پانی کا انتظام سوچ لیا تو پھر خیریت نہیں۔ وہ میٹھا پانی کیا ہے؟ یہ کہ ہماری غرض پوری ہو جائے، ہمارا کام نکل جائے، پھر دوسرے سے مطلب نہیں، یہ کشتی میں سوراخ کرنے ہی کے مترادف ہے۔

آج ہمارے ملک کی کشتی میں کتنے سوراخ کئے جا رہے ہیں، ہر شخص اپنے محدود غرض کو دیکھتا ہے، اس نے دوسروں سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور اس حقیقت کو بھلا دیا ہے کہ اس کا معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ آج ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کا روگ یہی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ہو رہا ہے کہ مختلف طبقے، مختلف برادریاں ہندوستانی سماج کے مختلف حصے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں..... خدا کے پیغمبروں نے اس دنیا کو امن کا سبق دیا تھا، دنیا کی قوموں اور قوموں کے افراد کو وحدت انسانی کی لڑی میں پرو دیا تھا، اگر آپ وسیع النظری اور ایمانداری کے ساتھ سراغ لگائیں گے اور کڑی سے کڑی ملائیں گے تو معلوم

ہوگا کہ دنیا میں اب بھی انسانیت کا جو بچا کھچا سرمایہ ہے، محبت و اخوت کی دنیا میں جو چاشنی ہے، امن و امان اور خوفِ خدا کا انسانی زندگی پر جو پرتو ہے، انسانی جان و مال اور عزت و ناموس کی نگاہوں میں جو اہمیت اور قیمت رہ گئی ہے، وہ خدا کے پیغمبروں، پیغمبران کے پیغام اور احکام کو زندہ رکھنے والے اہلِ دل کی محنتوں کا نتیجہ اور کوشش کا ثمرہ ہے۔

مولانا نے ہندوستان کے بزرگوں اور اولیاء اللہ کے اس زمین پر غیر معمولی اثرات، شکستہ دلوں اور انسانیت سے مایوس جاں بلب انسانوں کی دلجوئی، دلنوازی اور چارہ سازی کا مؤثر الفاظ میں تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ حضرات اپنی محبت سے گھائل نہیں کہ یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہے، گھائل تو کرتا تیر کمان والے، وہ قائل اور دل سے مائل کر لیتے تھے، پھر لوگ [illegible] اپنے والدین، خاندانی سرپرستوں اور خونی رشتوں پر ترجیح دینے لگتے تھے، لیکن محبت کی فتح ان سب فتوحات سے نرالی ہے ایسی نرالی کہ اس کو فتح کہتے ہوئے بھی محبت سے معذرت کرنی پڑتی ہے اور اس میں اس کی کم حق تلفی یا ناشناسی کی بو آتی ہے۔ اس لئے کہ محبت نے اکثر کھو کر پایا ہے اور ہار کر جیتا ہے، اس کو کسی ہم جنس کی طرف، کسی اشرف المخلوقات انسان کی طرف، کسی صاحبِ ضمیر ہستی کی طرف شکست کی نسبت کرنے سے بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے اور اپنی انسانیت دوستی، اپنے لطیف جذبات اور اپنے نازک احساسات سے شرم آنے لگتی ہے، بادشاہوں اور فاتحینِ عالم اور مادی طاقت رکھنے والوں کا اس اصول پر عقیدہ اور عمل تھا کہ "نہ رہے بانس نہ باجے بانسری" اور اہلِ محبت اس اصول پر کہ بانس بھی رہے اور بانسری بھی، صرف اس کا نغمہ بدل جائے" اس سے پہلے نفرت اور عداوت کے گیت نکلتے تھے اور اب محبت و شکر و اعتراف کے گیت نکلنے لگیں،

بادشاہوں اور طاقتوروں کا اصول یہ تھا کہ دشمن کو فنا کر دیا جائے، اہلِ محبت کا اصول تھا کہ دشمن کو دوست نہیں بلکہ عاشق بنا لیا جائے، اس اصول کا کرشمہ یہ تھا کہ خون کے پیاسے ہو کر آتے تھے وہ ان کا کلمہ پڑھنے اور ان کا دم بھرنے لگتے تھے اور ساری عمر ان کی چوکھٹ پر گزار دیتے تھے۔

مولانا نے عروج و زوال کے اصول اور فلسفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی قوم کا اخلاقی زوال پہلے شروع ہوتا ہے سیاسی زوال بعد میں آتا ہے...... اس اصول کی روشنی میں مولانا نے ملک کے اداروں، سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں، دانش گاہوں کے سربراہوں، ملک کے ارباب حل و عقد اور دانشمندوں کو بعض حقیقت پسندی اور وسیع النظری سے ملک کا جائزہ لینے کی دعوت دی

یہ آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں کہ اخلاق درست کرو، انسانیت کا سبق پڑھو، ملک کو بچاؤ، یہ کہنے والے بہت سے ہیں کہ ہماری پارٹی میں آؤ، فلاں کی قیادت تسلیم کرو، اس کا شکوہ نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے، سب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ صحیح غلط ہوتا ہے ہمارے جھنڈے کے نیچے اور ہمارے زیر اقتدار ہو، آج گاندھی جی کے برے اونچی سطح کا کوئی آدمی موجود نہیں جو ملک کی نبض کی اور خطرہ کی علامت ہے، کوئی خدا لگتی، سچی بات کہنے والا، دکھتی رگ پکڑنے والا، بیماری کی جگہ پر انگلی رکھنے والا، اپنے فرقہ اپنی جماعت پر بے باک تنقید کرنے والا، اس کو غلطی پر ٹوکنے والا موجود نہیں، جو کھڑا ہوتا ہے دوسرے فرقہ یا جماعت یا طبقہ کو مشورہ دینے لگتا ہے اور اسی کی غلطیاں گنانے لگتا ہے، اپنے طبقے کے بارے میں ہوشیار اور ذلاق وکیل، دوسرے کے طبقہ کے بارے میں تھانہ دار اور عدالتی فوجدار نظر آتا ہے، یہ چیز ایک ایسے ملک کے لئے جہاں سب کو آزادی، عزت و اطمینان کی زندگی گزارنی ہے اور سب کو یہیں رہنا اور نبھا کرنا ہے سخت خطرناک ہے۔

مولانا نے تہذیب و تمدن، سیاست و حکومت، ادب و فلسفہ اور علم و فن کو ایسے آشیانے سے تعبیر کیا جو انسانیت کی شاخ پر قائم ہے، اگر انسانیت کی شاخ باقی ہے تو آپ جب چاہیں ویسا نشیمن بنا لیں، لیکن شاخ ہی نہ رہی تو نشیمن کا بقا کہاں؟ آج انسانیت کی شاخ پر کتنے تیشے چلائے جا رہے ہیں، آگ لگائی جا رہی ہے، ہر شخص اس کوشش میں معروف ہے کہ آدمیت کی شاخ پر بڑے سے بڑا تیشہ چلائے۔"

مولانا نے ہر انسان کے اندر خوابیدہ صلاحیتوں اور انسانیت کے جذبۂ احترام اور محبت کے ساز کو چھیڑتے ہوئے دعوت دی کہ اگر آپ کے دلوں میں انسانیت کے احترام کا جذبہ، انسانیت کی محبت کا سوز ہے تو اسے حرکت میں آنا چاہئے، وہ لوگ جو اس ملک میں ہم سے زیادہ اثر رکھتے ہیں انہیں اپنی کرسیوں کو چھوڑ کر، یونیورسٹیوں اور عافیت کدوں کو چھوڑ کر اس ملک کو بچانے کے لئے میدان میں آنا چاہئے، یہ ملک نہ بچا تو یونیورسٹیاں، حکومت، جمہوریت کہاں رہے گی، ان کی بقا کہاں رہے گی، اور ان کو پناہ کہاں ملے گی، ملک نہ رہے، انسانیت دم توڑ دے تو کیا اقوام متحدہ میں جا کر نمائندگی کریں گے۔ انسان ہونا شرط ہے، قوم میں قومیت کا احساس اور سیاسی شعور ہونا شرط ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ہمارا ملک سویا ہے، مرا نہیں، سویا ہوا جگایا جا سکتا ہے، لیکن مرا ہوا جلایا نہیں جا سکتا۔

ہم سوئے ہیں مرے نہیں، ہم کئی بار سوئے، کئی بار جاگے، یہ انسانیت کئی بار سوئی

روزنامہ شہاب حیدرآباد ۔ ستمبر ۱۹۸۵ء

کی مدد چاک اور ملک آزاد ہو جانے کے بعد سب نے کا تحفظ کر دیں ۔ مجھے امید ہے کہ جب انگلش جب جاگے گا تو اس سے پہلے جو مرکزیت ہو گی وہ سب کی سلامتی لے گا ۔ یہ حقیقت فساد کو سوا چار انسان سمجھا ہے ۔ ان کو انگریز نے یہ سمجھا کہ ان کے اندر کا انسان سو گیا ہے اور ان کے باہر کا حیوان جاگ گیا ہے اور چاہیے یہ کہ ان کے باہر کا حیوان سو جائے اور اندر کا انسان جاگ جائے ۔

مولانا نے آخر میں فرمایا :-

ہندوستان کی تقدیر اور تاریخ یہ رہی ہے کہ (اور نہ تقدیر کو بدلا جا سکتا ہے اور نہ تاریخ کو مٹایا جا سکتا ہے) اس ملک میں مختلف مذاہب تہذیبیں، زبان اور معاشرتی و عائلی نظام رہیں ، اس ملک نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں اس حقیقت کے نہ صرف اعتراف بلکہ احترام اس خصوصیت کے نہ صرف باقی رہنے کی اجازت ، بلکہ اس کے تحفظ و ترقی اور اس کے ساتھ بقائے باہم اور مشترک ملی و قومی مفادات میں سرگرم اشتراک و تعاون کا ثبوت دیا ہے ، اس لئے لامذہبی اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ پوری غیر جانبداری اور ذہن و ضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) سب سے سہل العمل ، بے خطر اور قابل قبول نظام ہو سکتا ہے ۔

ضروری ہے کہ مختلف النوع عناصر اور اقلیتیں اس طرف سے مطمئن ہو کر اپنی صلاحیتوں اپنی توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) مذاہب و عقائد ، اپنے تمدنوں ، تہذیبوں اور اپنے معاشرتی و عائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت و دفاع میں صرف کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر و ترقی ، اس کی سالمیت و حفاظت ، اس کے استحکام ، انسانیت کے احترام ، خوشگوار تعلقات کے قیام اور خوش حال و پرسکون زندگی کا ماحول پیدا کرنے پر مرکوز کر دیں اور ان میں سے کوئی چیز غیر ضروری مقصد اور غیر ضروری کشمکش اور جد و جہد میں ضائع نہ ہو ۔

ایک گھنٹہ کا یہ مقالہ جس خلوص اور جوش و جذبہ سے پڑھا گیا اس کا اثر تمام سامعین پر نمایاں تھا ، درمیان درمیان میں زور سے تالیاں بجا کر پسندیدگی کا اظہار کیا جاتا رہا ۔

اس اہم مقالہ کے بعد مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ کو گفتگو کی دعوت دی گئی لیکن انہوں نے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ سمجھی ، اس کے بعد صدر جلسہ مہاراشٹرا کے [illegible] مسٹر ایس ڈی واگھ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا ۔

آج کا دن پونہ کی زندگی میں ایک سنہرا دن ہے ، مجھے مولانا کی بات سے [illegible] مسرت ہوئی ، مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے محسوس کریں گے ، مولانا جیسی عالمی شخصیت [illegible]

"پیام انسانیت" کی تحریک شروع کر رکھی ہے، یہ بڑی اچھی بات ہے، واقعہ یہ ہے
کہ موجودہ حالات میں انسانیت اور شانتی کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہ تھی۔
جس دیش نے ہمیشہ دنیا کو امن و شانتی کا پیغام دیا، آج اسی کو اس [illegible]
ہے، یہ افسوسناک بات ہے، ہم ہر روز قتل و غارت گری اور جبر کے سبب جلا
کے واقعات پڑھتے ہیں، لیکن کیا ہم نے کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا ہماری تعلیم میں
کچھ؟ حالات سنگین ضرور ہیں لیکن ان سے مایوسی اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں، اگر انسا
یہ پیام دیہاتوں دیہاتوں میں پہنچایا جائے تو اس کے حوصلہ افزا نتائج نکلیں گے۔ مولانا صاحب
جیسے انسانوں کی ہمارے سماج کو بہت ضرورت ہے، مسٹر واگھ کی تقریر کے بعد جو
ڈنر کے لئے اٹھ گئے، کھانے کے دوران مولانا کے پاس بڑی تعداد میں لوگ اپنے تاثرات
ظاہر کرتے آتے رہے، آریہ سماج کے سابق صدر اور لائنز کلب کے سکریٹری نے
کہا میں نے آج اپنی زندگی میں دنیا کے سب سے بڑے انسان کو پایا ہے، مرہٹی روزنامہ
کے چیف ایڈیٹر مسٹر چندر کانت گھوڑپڑے، آر ایس ایس کے چیف شری شاستری،
جین منڈل کے صدر کنگ مل کنود، مہاراشٹر ایجوکیشن بورڈ کے صدر جی ایس،
مارواڑی سماج کے صدر مسٹر راٹھی، سکھ گوردوارا پربندھک کمیٹی کے صدر گیان سنگھ،
گیان سنگھ راجپال، تیج پال سنگھ بیدی، جنتا پارٹی پونہ کے صدر ام دھا اکول کر،
سب سے بڑے ہندو یتیم خانے کے صدر پی ایل ٹکلکرنی، آر ایس ایس کے مرکزی تعلیمی ادارہ
پربودھنی کے چیف ڈاکٹر ٹامرکر، بین الاقوامی کالج (اس میں چالیس ملکوں کے طلبہ پڑھ
کے صدر مسٹر ستیل گپتا (SYMIOSIS COLLEGE) آر ایس ایس پونہ کے
مسٹر وسنت گاڈگل، سیاست دانوں میں ہنومنت راؤ، اولاس پوار ایم ایل سی اور رنگ
اور بھارتی ودیا پیٹھ کے صدر چنگ راؤ قدم کے علاوہ دونوں [illegible] فرقوں کے سب
بڑے ذمہ دار نمایاں شرکاء میں تھے، ان حضرات نے مولانا سے اپنے تاثرات
ہوئے کہا کہ آپ نے بہت مفید اور کام کی بات کہی، ایسے ڈائیلاگ برابر ہونے چاہئیں
دوسرے دن پونہ کے سات [illegible] تک مولانا کی تقریر کے اقتباسات شائع کئے اور جلسہ کی خبر
اس کے علاوہ مہاراشٹرا ہیرالڈ، کیسری، سکال، ہندی، انگریزی اور مرہٹی اخبارات نے مولانا
کے جلسہ کی [illegible] اور مولانا کے متعلق اہم حصے شائع کئے۔ پونہ میں مولانا کا قیام تین دن
[illegible]

سید حبیب اللہ قادری (رشید پاشاہ)

قومی یک جہتی اور عصر جدید کے تقاضے

میں اپنے اس مضمون کا آغاز تبرکاً بیان توحید سے کر رہا ہوں، اس لئے کہ اتحاد و یک جہتی کو توحید سے نسبت ہے۔ اصحاب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ اعتبار غیریت و جہتی پر احکام کا دار و مدار ہے جو تعین کا مرتبہ ہے اور مقام وحدت و ہویت ایک اونچا مقام ہے جسے مرتبہ ذات اور لاہوت بھی کہتے ہیں۔ یہاں اشارات منقطع ہیں اور اضافات ساقط "اَلتَّوْحِیْدُ اِسْقَاطُ الْاِضَافَات"۔ احکام کے مقام میں جو ناسوت سے متعلق ہے، باپ بیٹے، ماں بہن اور بہو بیٹی کا فرق و امتیاز لازمی ہے، درمیانی مقام ملکوت کا ہے جو مرتبہ اسماء ہے اور جبروت مرتبہ صفات ہے ؎

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد — گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

اس طرح احکام اور توحید کے مقامات جدا جدا ہوئے۔ توحید کے مرتبہ کی باتیں، احکام کے مرتبہ میں نہیں کی جاتیں اور احکام کے مرتبہ کی باتیں توحید کے مرتبہ میں نہیں کی جاتیں۔ تعینات کے درجہ میں ذاتی تشخص و امتیاز اور وحدت و انفرادیت ہر فرد میں پائی جاتی ہے۔ ہر ایک اپنی شکل و صورت میں الگ ہے اور کوئی کسی سے نہیں ملتا۔ "ومن آیٰتہ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم" (اور اس کی آیات و نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ سورہ روم ۳۰-آیت ۲۲)۔ اصل توحید یہ ہے کہ حق تعالیٰ نہ صرف اپنی ذات و صفات اور اسماء و افعال میں واحد و یکتا ہے بلکہ جس کسی کو اس نے پیدا کیا ہے وہ بھی اپنی شکل و صورت میں منفرد و یکتا ہے۔ رنگ روپ اور اخلاق و عادات کی کچھ یہی کیفیت

ہے کہ ہر ایک اپنی شان میں منفرد و جداگانہ ہے ؎

فی کل شیء لہ شاھد یدل علی انہ واحد (ہر موجود میں اس کا وہ گواہ پایا جاتا ہے جو بتلاتا ہے کہ وہ واحد و یکتا ہے) افراد و اشخاص کے ایسے اختلاف مذاہب و ملل کا اختلاف بھی فطری ہے۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ ... وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا ... اختلاف کرتے رہیں گے۔ سورہ ہود ۱۱- آیت ۱۱۸) ہر امت کا قبلہ بھی جداگانہ قرار دیا وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (اور ہر ایک کے لئے ایک جہت و سمت مقرر ہے جدھر وہ وقت عبادت منہ کیا کرتے ہیں سورہ بقرہ ۲- آیت ۱۴۸) جب اختلاف مذاہب و ملل لازوال کی جہت متعین کردی گئی تو پھر یکجہتی کا معنی کیا ہوگا، غور طلب ہو جاتا ہے۔ "

کا نعرہ سنجیدہ طبقہ میں آج کل عام ہے۔ یہ یکجہتی سیاسیات و اقتصادیات کی حد تک رہے گی۔ مذہبی تشخص اور معاشرہ سے اس سے کوئی علاقہ نہ رہے گا۔ یکجہتی سے ایسا اتحاد مراد نہیں جس میں وحدت و امتیاز باقی نہ رہ سکے اور اپنے وجود کو ختم کر کے دوسرا ہو جانا پڑے ؎

ہم ہما جب نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل   کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

سمجھدار ہندو مسلم، سکھ عیسائی اور دیگر تمام برادران وطن دل سے چاہتے ہیں کہ قومی یکجہتی کے تحت ملک سے شر و فساد دور ہو، جھگڑے پیدا نہ ہوں عداوت مٹ جائے اور امن و امان قائم و برقرار رہے۔ پوری دنیا میں ہمارے ملک ہندوستان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے رہنے بسنے والے مختلف عقائد کے حامل ہیں اور مذاہب سے وابستہ، گویا یہاں کثرت میں وحدت رہتا ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے دین دھرم پر قائم رہ کر چین و سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد اب ایسی ہر کوشش یقیناً ناکام ہوگی کہ ان سب کو بہ جبر و تشدد کسی ایک کے تحت یکساں کر دیا جائے۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (دین میں کوئی زبردستی نہیں) دستور ہند میں بھی ہر ایک کو مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں یکساں سیول کوڈ پر جبر و تشدد سے کام لینا اور سیکولرازم کا دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔ سورہ ۱۰۹- آیت ۶) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ رواداری اور مذہبی ہم آہنگی کے ایسے ہی اصولوں کی

قائم ہو سکتا ہے۔ اس سے بحث کہ مذہبی تشخص اور معاشرہ کے فرق کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ ہر وہ مسلمان جو اپنے اندر حرارتِ ایمانی رکھتا ہو، یکساں سیول کوڈ کو خواہ وہ لازمی ہو یا اختیاری برداشت نہ کر سکے گا۔

ہمارا احساس ہے کہ مسلمانوں کے سوا دیگر مذاہب کے پیرو بھی ایسی یکسانیت کو پسند نہیں کریں گے بعض افراد جو یہاں ہندو راشٹر قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ حکومت و عوام سب کے لئے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے خاص حالات کے تحت نہ یہاں حکومتِ الٰہیہ قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہندو راشٹر۔ یہ دونوں تصورات فساد و خونریزی کا باعث بن رہے ہیں۔ ایسے ہی کچھ اور بے تعلق غیر مسلم اشخاص نے مسلمان مطلقہ کی بیجا ہمدردی میں نفقہ کے تعلق سے پرسنل لا میں مداخلت شروع کر دی اور ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ ہمارے ہر دلعزیز مدبر وزیر اعظم نے بڑی دور اندیشی سے اس پیچیدہ مسئلہ کو جو سپریم کورٹ سے فیصل ہو چکا تھا، پارلیمنٹ میں لا کر اتفاق کے ساتھ حل کر دیا۔ اب بھی وہ انتہا پسند ہیں جو بابری مسجد پر قبضہ جما لئے، انہی کے دباؤ میں آ کر عدالتیں بھی انصاف سے عاجز آ گئیں ورنہ جس مسجد میں سینکڑوں برس سے بانگ و صلوٰۃ ہوا کرتی تھی، یکایک اس کے مورتیاں کہاں سے آ گئیں۔ عدالت نے آنکھ موند کر کس طرح قبضہ دلا دیا کہ اب مسجد کو نمازیوں سے خالی کر کے اس میں پوجا پاٹ شروع کرا دی گئی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے۔ اب دھوم دھام کے ساتھ یکم فروری کو سالگرہ بھی منائی گئی جس میں ایک کانگریسی لیڈر کو بھی گولی ماردی گئی جو ہندو تھا۔ آخر ظلم و زیادتی کی کوئی حد بھی ہے۔ ایسے ہی منچلے افراد یکساں سیول کوڈ نافذ کرانے پر بھی تل گئے ہیں۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ ان کی طرف سے برابر ہوتی رہتی ہے اور بلا وجہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے۔ ان ناسازگار حالات کے باوجود اپنے وطنِ مالوف کو نہ مسلمان چھوڑ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے دین و ایمان کو۔ وہ اپنی پوری زندگی حکومت کی وفاداری میں یکجہتی کے جذبہ کے تحت یہیں پر گزارنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے بزرگوں نے چمنستانِ ہند کو اپنے خون سے سینچا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان کے دین و مذہب کی طرف سے یہ پابندی عائد ہے کہ وہ اپنے باہمی نزاعات کا احکامِ شریعت کی روشنی میں شارع علیہ السلام کے فیصلہ کے مطابق تصفیہ کرائیں خود یہ ان کے ایمان ہیں۔ فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ کر دیں اس

سے منکر نہ ہوں اور خوشی سے اس کو مان نہ لیں تب تک یہ مومن نہیں ہوں گے۔ سورۃ
آیت ۶۵)۔ اب اگر صاحب پرسنل لا کی بجائے یکساں سول کوڈ کو لایا جائے تو سوال
ایمان کا چھننا ہو جاتا ہے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکے گا۔ نتیجتاً ہندوستان کے ۱۲ کروڑ سے ز
مسلمان خاموش نہ رہ سکیں گے۔

آخر میں عرض ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگ جتنی مخالفت کریں کم ہے، ان کو چھوڑیے ہمارے بعض دانشور دعویداران اسلام یکجہتی کا غلط مفہوم لے کر نئے نئے فتنے اٹھا رہے ہیں۔ وحدت ادیان اور عالمگیر مذہب کی تحریک کے سلسلہ میں یہ یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ نجات کے صرف مبداء و معاد پر ایمان لانا کافی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی شخص اگر اللہ پر اور یوم آخر صرف دو باتوں پر یقین رکھتا ہو تو اس کے لئے نجات حاصل ہو جائے گی خواہ اس کا تعلق کسی بھی دین و مذہب سے کیوں نہ ہو۔ گویا ادعائے اسلام کے باوجود کہنا یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر ہر قوم و ملت کا آدمی نجات پا سکتا ہے بشرطیکہ مبداء و معاد پر ایمان ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عامہ دی گئی ہے۔ صحیح بخاری ج ا ص ۴۸ میں یہ حدیث وارد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پانچ خصوصیات گناتے ہوئے جو کسی پیشرو کو عطا نہیں کی گئی تھیں فرمایا کہ نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ میں بھی اس دعوت عامہ کے اعلان کا بصراحت و تاکید حکم دیا گیا۔

عالمگیر مذہب کی تحریک والوں نے استدلال اس آیت شریفہ سے کیا ہے: ان الذین آمنوا والذین ھادوا (جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور روز آخر پر ایمان لائیں گے اور عمل نیک کریں گے خواہ وہ مومن ہوں یا یہودی یا ستارہ پرست یا عیسائی، ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ سورۂ مائدہ ۵ آیت ۶۹) مولانا ابوالکلام آزاد کے "ترجمان القرآن" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ خود مولانا سے ان کی زندگی میں جب رجوع کیا گیا انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا میرا منشاء ہرگز ایسا نہ تھا۔ بہرصورت شان نزول کی روشنی میں دیگر تاویلات کے پیش نظر آیت کو ایسے معنی پر محمول کیا جائے گا جو دوسری آیات کے معنی سے نہ ٹکرائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں جن میں کبھی تضاد نہیں آ سکتا۔

قومی یکجہتی کے سلسلے میں بعض دیگر دانشوروں نے نیا فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ ایمان کے تحت آتا ہے کہ تمام ادیان برابر ہیں۔ کوئی رسول دوسرے رسولوں سے افضل نہیں۔ قرآن کریم میں بصراحت یہ بھی مذکور ہے کہ تمام رسول برابر نہیں، ان کے درمیان فضیلت

ہے تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض ۔ یہ پیغمبر (جو وقتاً فوقتاً ہم بھیجتے رہے) ہیں ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے (سورہ ۲ ۔ آیت ۲۵۳) کسی کے ذہن میں آیت کریمہ لا نفرق بین احد من رسله (رسول اور تمام مومنین کہتے ہیں کہ اس کے پیغمبروں کے درمیان ہم فرق نہیں کرتے ۔ سورہ بقرہ ۲ ۔ آیت ۲۸۵) کے مضمون سے بعض دانشور شکوک وشبہات میں پڑ گئے ۔ قرآن فہمی کے لئے الفاظ قرآنی اور سیاق وسباق پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے ۔ اس آیت کی ابتدا آمن الرسول سے ہوتی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ لا نفرق میں تفریق سے مراد تفریق بالایمان ہے (کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں) یقیناً یہ کفر ہے ۔ کم وبیش سوا لاکھ انبیاء پر مسلمان اجمالی طور سے ایمان رکھتے ہیں اور کتاب وسنت میں جن انبیاء کے نام لئے گئے ہیں ان پر تو بہ صراحت وتفصیل ایمان لاتے ہیں ۔ آیت مذکور میں تفریق بالایمان کا ذکر ہے کہ بعض رسولوں پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں ۔ اس میں تفریق بالفضیلۃ کا کوئی ذکر نہیں کہ بعض کو بعض سے افضل نہ کہیں ۔ تیسری آیت وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل میں بھی سیاق وسباق اور شان نزول کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ۔ اس آیت کے بعد کے جملے میں صراحت موجود ہے کہ یہ ارتداد ووفات کے سلسلے میں ہے نہ کہ فضیلت وبرتری کے سلسلے میں ۔ چنانچہ آیت کا تتمہ یہ ہے : افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم (اور اگر انتقال فرما جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے) مطلب یہ تھا کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح آپ بھی اگر وفات پا جائیں تو تم کو دین پر ثابت قدم رہ کر آپ کے مشن کو آگے بڑھانا ہے نہ یہ کہ دین سے پلٹ جاؤ اور مرتد ہو جاؤ ۔ دین محمدی کی فضیلت بھی قرآن سے ثابت ہے کنتم خیر امة اخرجت للناس (یعنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں ، تم ان سب سے بہتر ہو (سورہ آل عمران ۳ ۔ آیت ۱۱۰) اس طرح امت مرحومہ افضل الامم ہوئی ۔ خیر الامم کے پیغمبر بھی یقیناً خیر الانام اور خیر الوریٰ ہوئے ۔ جبکہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء بھی ہیں جب روز میثاق بنی آدم سے ربوبیت کا اقرار لیا گیا تھا الست بربکم قالوا بلی ۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی بطور خاص یہ اقرار لیا گیا تھا کہ تم سب ان پر ایمان لانا ، اس طرح انبیاء علیہم السلام حضور کے مقابلہ میں بمنزلہ امت محمدی کے ہو گئے ۔ واذ اخذ الله میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمة ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن به ولتنصرنه (اور جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب وحکمت عطا کروں پھر تمہارے پاس ایسا پیغمبر آ جائے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی (سورہ آل عمران ۳ ۔ آیت ۸۱) [illegible]

(باقی صفحہ [illegible])

جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ لے کر آپ کے پاس آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنے لگے۔ حضور کا چہرہ اقدس متغیر ہو گیا۔ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو متوجہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب سے پناہ مانگی۔ حضور نے قسم کھائی اور فرمایا "اس ذات کی قسم جس کی قدرت میں محمد کی جان ہے اگر موسیٰ زندہ ہوتے اور میری نبوت پاتے تو ضرور وہ میری اتباع کرتے (ولو کان حیاً وادرك نبوتی لاتبعنی) موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں لیکن ان کے لئے بھی بجز اتباع نبوی کے کوئی چارہ نہ تھا۔ احادیث میں آیا ہے کہ شب اسریٰ مسجد اقصیٰ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت کی۔ اس سے بھی آپ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امام وہی ہوتا ہے جو قوم میں افضل ہوتا ہے۔

المختصر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضعاً کہا تھا کہ انبیاء پر مجھے فضیلت نہ دو یا پھر احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ کہیں اس سے کسی نبی کی توہین یا تنقیص نہ ہو جائے (جو موجب کفر ہے) یا ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانہ کا ارشاد ہو جبکہ آپ کو اپنی افضلیت کا علم ابھی نہ ہوا تھا۔ علماء نے اس کے متعدد جوابات دئیے ہیں۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

"سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی ہر چیز کو برداشت کر لیتا ہے۔ مجھے سب سے بڑی شکایت ہے وہ یہ کہ یہاں کا جو ادبی حلقہ ہے، وہ مجھے موثر کہنے اور پہچاننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب بات پائیں گے آپ کہ وہ اساتذہ بھی جن کے لڑکے میرے پاس تحقیق کرتے ہیں اور پورا مواد حاصل کرتے ہیں، وہ بھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں "ارے بھئی مکینک صاحب، ان کو کیا پتہ۔ بس کتابیں جمع کر لی ہیں تھوڑی۔" یہ رویہ بڑا ...

(حالی صاحب)

یہ تھا عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ جس ... نے کیا ایک بات کہی کہ یہ ادارہ ہے مگر اسے ایک فرد کے اضطراب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اپنی تنہائی اور سوز دروں سے ایک ادبی گھروندا تعمیر کیا ہے۔

کاش اس داستان کا انجام بخیر ہو اور ہم کہہ سکیں کہ عبدالصمد خاں کے کتب خانے نے باقی زندگی ہنسی خوشی گزار دی۔

کچھ کچھ ہو دل کو اک دھڑکا سا ہے۔ (ماخوذ)

ڈاکٹر سید احمد معین الدین جلیبی

اسلام انسانیت کا ایک مکمل دستورِ حیات

(پروفیسر ڈاکٹر سید احمد معین الدین جلیبی جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز سپوت اور ممتاز ماہر اسلامی قانون ہیں جو گذشتہ (۳۰) سال سے مختلف بین الاقوامی جامعات سعودی عرب، سوڈان، نائجیریا، سنگاپور اور ہندوستانی جامعات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بہ حیثیت پروفیسر اسلامی قانون نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد اب حیدرآباد میں قیام پذیر ہیں، ڈاکٹر صاحب کئی اردو و انگریزی کتابوں اور تحقیقاتی مقالات کے مصنف ہیں جن میں قابل ذکر "صراط مستقیم" "اسلام کا نظام قانون نیز لکچرس آن مسلم لا" اور "اسلامک آیڈیالوجی" قابل ذکر ہیں ___ پروفیسر موصوف نے ایک مختصر لیکن جامع اور موثر مضمون میں عام فہم انداز میں بتایا ہے کہ اسلام ایک مکمل طریق حیات اور نفع بخش دستور العمل ہے، یہ دلنشین تحریر ہدیۂ قارئین شاداب ہے ___ ایڈیٹر)

آج کا انسانی معاشرہ رنگ و نسل کی امتیازی پالیسی، باہمی منافرت، گروہی تنازعات، سامراجیت، قنوطیت، ظلم و استبداد و استحصال، افلاس و جہالت اور مرض و الم کا شکار ہے۔ ان ہجوم مسائل کے باوجود عالمی سطح پر سارے انسانوں کی یہ خواہش ہے کہ ایک سکون پرور، شیریں، خوشگوار اور با مقصد زندگی بسر کریں۔ اس لئے آج کا انسان ایک ایسے فلسفۂ حیات اور موثر لائحہ عمل کا متلاشی ہے جو جامع اور مکمل نظام حیات کا آئینہ دار بھی ہو اور عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور نت نئے مسائل اور بحران کا حل بھی اپنے پاس رکھتا ہو۔ یہ ایک

اصل حقیقت یہ ہے کہ آج کی انفرادی اور اجتماعی زندگی [illegible]
[illegible] ، ناآسودگی اور [illegible] انسان کی ہدایت
اور فلاح ، اسلام (جس کے لغوی معنی اطاعت و امن کے ہیں) کے فلسفۂ حیات ا
قطعی و ابدی قوانین میں مضمر ہے۔ کیونکہ اسلام ایک انسانی مذہب ہے اور انسانی
دین فطرت ہے۔ انسان فطرتاً عبداللہ یعنی خدائے واحد کا بندہ پیدا ہوا ہے۔
ایک مکمل اور جامع نظام حیات اور جامع دستور العمل ہے جس میں [illegible]
مسائل کا حل موجود ہے۔ اسی لئے یہی وہ واحد فلسفۂ حیات ہے جو ہر دور میں
کے لئے مینارۂ نور اور چراغ فکر و عمل بن کر اقوام عالم کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔
تمام انسانی مسائل کو حل کر دیا ہے۔ اور روئے زمین کے ہر حصے تک اپنے احکام و قو
انین کا قابل عمل ہونا ثابت کر دیا ہے۔ اسی لئے اسلام کے پُر از حکمت و دانش اور
ہونے والے فیاض اور فعال چشمے سے ہر دور اور ہر زمانہ کی ضروریات اور احتیاجات
ہیں۔ اس طرح اسلام دنیا کے سارے اصلاحی و فلاحی پروگرام اور ہر فکری و تعمیر
پر بھاری ہے جس کی نظیر و مثال پیش کرنے سے تاریخ عالم کا ہر نظام قاصر

① اسلام - انسان کا دستور حیات

خالق انسان اور رب کائنات کے نزدیک ساری انسانیت کے لئے واحد مستند
دستور حیات "الاسلام" ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ان الدین عند ا
بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک (مقبول) دین اسلام ہے (۳/۱۹)۔ یہی صراط مستقیم
اور باعث فلاح دارین ہے (۶/۱۲)۔ جو انسان اسلام کو اپنا نصب العین مانتے ہیں از
میں مسلم یا مسلمان (۲۲/۷۸ - ۳۹/۱۲) یعنی اطاعت گزار یا فرمانبردار کہلاتا ہے۔ نیز
و کردار میں اسلام کا نمائندہ ہوتا ہے ([illegible])۔ ایسے اہل ایمان اور اہل تقویٰ
و آخرت میں کامیاب اور بامراد ہیں ([illegible])۔ اس کے برخلاف جو بھی راہ اور طور طریقہ
ہے لہٰذا خالق انسان کے ہاں غیر مقبول اور غیر مستند بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:
کوئی اور دین (طریقہ حیات) تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا
کیونکہ یہ ہمہ گیر تباہی کا راستہ ہے جو باعث ہلاکت و ضلالت ہے ([illegible]) اور
انسان ہر لحاظ سے نامراد و ناکام اور خسارے و نقصان میں ہیں ([illegible])۔

② مطالعۂ اسلام

۱ [illegible] انسان سے سیدھا سادا مطالبہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں، دین و دنیا میں توافق و توازن اور اعتدال کے ساتھ ([illegible]) کتاب و سنت یعنی قرآن و حدیث ([illegible]) کی روشنی یا مشعل ہدایت کے ماحول میں مذہب اسلام کی اطاعت کرے ([illegible] - [illegible]) تاکہ وہ فلاح دارین کا مستحق بن سکے ([illegible])۔ یاد رہے کہ فلسفۂ قرآن جو ایک آفاقی پیغام انسانیت ہے ([illegible]) کے بموجب دین و دنیا کی کامیابی کا سرچشمہ ایمان اور عمل صالح ([illegible]، [illegible]) ہی سے طلوع ہو سکتا ہے جس سے ساری ناکامیاں اور مایوسیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ ایمان اور عمل صالح قرآن کی اساسی تعلیمات کا جوہری خلاصہ اور اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور ماحصل ہے جس میں فلاح دارین مضمر ہے۔ اگر انسان میں یہ دونوں یعنی ایمان اور عمل صالح مفقود ہوں تو پھر کوئی اور خیر و بھلائی باقی نہیں رہتی ([illegible]) اور وہ ہر لحاظ سے سراسر خسارے اور نقصان میں رہتا ہے ([illegible])۔ قرآن حکیم نے علاج خوف و حزن کے لئے ایمان و عمل صالح کا نسخۂ کیمیا ہی تجویز کیا ہے ([illegible])۔ نیز فلسفۂ اسلام کے بموجب انسانی شعور و دانش کی معراج یہ ہے کہ انسان اپنے خالق و رب اور مالک و محسن کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسانیت، انسان دوستی اور خدمت خلق کو (۲/۱۲، [illegible]، ۱۷/۲۳) اپنا شعار بنا کر اور فرض مان کر خدا ترسی اور فرض شناسی کا ثبوت دے۔

(۴) اسلام نے عالم انسانیت کو کیا دیا؟

اسلام، ساری نوع انسانی کے لئے ایک انمول تحفہ اور فقید المثال دین ہے کیونکہ اس نے عالم انسانیت کو کتاب و سنت یعنی قرآن و حدیث کے ذریعہ ایک جامع اور مکمل نظام حیات عطا کیا ۱۔ علم، اخلاق، حکمت علمیہ و عملیہ اور تہذیب نو سے آشنا کیا (۹۶/۵) ۳۔ دین و دنیا (مادیت و روحانیت) میں توافق و توازن و اعتدال کا نقطۂ نگاہ دیا ([illegible]) ۴۔ بیداری ضمیر، اتحاد باہمی اور تنازع للبقاء کے بجائے تعاون للبقاء (Co-operation for existence) کے اصول سے واقف کرایا ([illegible]) ۵۔ رنگ و نسل، زبان و قوم اور نسب و امارت کے امتیازات مٹا کر محبت و ایثار، مساوات و اخوت ([illegible]) اور عدل و احسان ([illegible]) کا نظام عطا کیا نیز علم و عمل اور تقویٰ کو مدار عظمت اور معیار فضیلت ٹھہرایا ([illegible]) ۶۔ وحدت انسانی، اکرام آدمیت اور انسانی حقوق و فطری حریت سے سرفراز کیا ([illegible]) ۷۔ زکوٰۃ و صدقات، سماجی عدل اور احسان کی بنیاد پر معاشی نظام دیا ([illegible]) ۸۔ حقیقی جمہوریت، حاکم و محکوم کی یکساں مسئولیت اور سیکولرزم ([illegible] فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی رواداری، قتل و فساد کی ممانعت اور تعصب وغیرہ) کا درس [illegible] ریاست (فلاحی ریاست)، قانون بین الاقوام اور امن عالم کے اصولوں سے [illegible]

(۲۲/۱۳) ۱۰۔ فکر و فن، تسخیر کائنات اور سائنسی علوم سے روشناس کرایا (۱۲۴/۱۳)

یہ چند مثالیں توضیح مدعا کے لئے نمونتاً پیش ہیں۔ احاطہ ہرگز مقصود نہیں۔

(۴) اسلام کی حقانیت کے تعلق سے عالمی مفکرین

اسلام کے متذکرہ بالا محاسن اور منفرد خصوصیات کے تعلق سے چند عالمی مفکرین کی آراء پیش ہیں۔ ۱۔ جارج برناڈ شا کہتا ہے کہ "اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر آج دنیا میں حضرت محمدؐ جیسا حکمراں پیدا ہو جائے تو دنیا کے تمام مسائل حل ہو جائیں اور دنیا کو امن و اطمینان میسر ہو" (جینوئن اسلام سنگاپور جلد ۱ ۱۹۳۶ء)۔ ۲۔ مشہور مفکر ایڈمنڈ برک کے مطابق "بادشاہوں کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا قانون یعنی شریعت اسلامی انتہائی ضروری ہے اور آج غریب اور بے سہارا انسانوں کو اس کی بے حد ضرورت ہے"۔ (۳) جوزف جے۔ [illegible] کہتا ہے کہ "حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لایا ہوا مذہب اسلام مطلق العنان روس کے لئے اتنا ہی موزوں ہے جتنا جمہوریت پسند امریکہ کے لئے وہ مناسب و مفید ہے"۔ ۴۔ نپولین نے اپنی ایک عظیم خواہش کا اظہار اس طرح کیا: "میری توقع ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میں صاحبان علم و دانش کو متحد کر کے ایک ایسا دور قائم کروں گا جو یک رنگ و ہم آہنگ ہو اور قرآن اس کی بنیاد ہو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ قرآن ہی کے اصول سچے ہیں اور انسان کو سکون کے ساتھ منزل مقصود تک لے جا سکتے ہیں"۔ (بونا پارٹ اور اسلام از شیلز، پیرس صفحہ ۱۰۵)۔ ۵۔ شہرۂ آفاق مستشرق پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر گب اسلام کے محاسن کا یوں اظہار خیال کرتا ہے "اسلام ایسا زندۂ جاوید مذہب اور سرچشمۂ حیات ہے جس نے کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ اور ضمیر پر گہرے اور اثر انگیز نقوش مرتسم کئے۔ ایک ایماندارانہ، شریفانہ اور خدا ترس زندگی بسر کرنے کا سلیقہ و ڈھنگ سکھاتا ہے" (ٹرینڈس ان اسلام، شکاگو ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۲۳)۔ ۶۔ مفکر گوئٹے سوال کرتا ہے کہ "اگر یہی اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلام میں داخل نہیں ہیں؟" تھامس کارلائل جواباً کہتا ہے کہ "ہاں جو با اخلاق و با کردار زندگی گزار رہے ہیں۔ وہی اسلامی زندگی سے عبارت ہے" (کارلائل، ہیروز، ہیرو ورشپ اینڈ دی ہیروئک ان ہسٹری)۔ ۷۔ گاندھی جی نے اسلام کی سچائی کی یوں وضاحت کی ہے "میرا یہ یقین کامل ہے کہ اسلام بزور شمشیر نہیں بلکہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سادگی و انکساری، ایفائے عہد، دوستوں اور

بلکہ حسن سلوک، مخلوق سے بے خوفی اور خالق پر توکل اور اپنے مشن پر اعتماد کی وجہ سے وہ مقبولِ عوام ہوا ہے۔" (ینگ انڈیا ۱۶ ستمبر ۱۹۲۴ء)

⑤ اسلام کا آفاقی فلسفۂ حیات

اسلام، فکر و عمل، محبت و انسانیت، اخوت و مساوات، عدل و احسان اور بے گیر ذمہ داری اور شعور و آگاہی کا عالمگیر پیغام ہے جس کا مقصد ایک خدا ترس، فرض شناس ہمہ گیر شخصیت کی تخلیق و تعمیر اور ایک منصفانہ، معتدل اور مثالی معاشرے کی تشکیل نو و ترویج ہے جو روحانی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی میدانوں میں کتاب و سنت اور اسلامی تعلیمات کی عکاسی کرتا ہے تاکہ انسان اس جہان آب و گل میں ایک پاکیزہ، پرامن اور بامقصد زندگی بسر کر سکے اور آخرت میں فلاح دارین کا مستحق بن سکے۔

آج کی مضطرب و بے چین انسانیت جس چیز کے لئے تڑپ رہی ہے وہ خود انسانی ضمیر کی آواز و اقدار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس ضمیر کی آواز کی "بازیافت" کیسے ہو؟ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہم انسانیت اور انسانیت دوستی کو اپنائیں، ساری انسانی برادری کو ایک جانیں اور مانیں اور خدمت خلق کو اپنا شعار بنائیں۔ حیرت و استعجاب تو اس بات کا ہے کہ ہم کیوں ایسا نہیں سوچتے اور کرتے، جب کہ ہم ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، ایک ہی خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ایک ہی سطح زمین پر بستے ہیں، ایک ہی فضا میں سانس لیتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی چشمۂ آب سے اپنے آپ کو سیراب کرتے ہیں اور ایک ہی سورج سے دھوپ اور توانائی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ہم سے سارے انسانوں کی زندگیاں ایک دوسرے سے یقیناً مربوط، مستحکم اور متحد ہیں۔ ایک ہی اکائی کی طرح ——— !

⑥ محسن انسانیت، انسانیت کے لئے ایک مینارۂ نور

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم، انسانیت کے لئے ایک عنوان حیات اور مینارۂ نور ہیں چنانچہ آپؐ نے اپنی پرخلوص مساعی، بے لوث جدوجہد، اور حکمت عمل سے پوری انسانیت کے لئے ایک جامع اسلامی انقلاب برپا فرمایا جو نفع رسانی، نتائج کی خوبی اور وسعت نظری کے اعتبار سے آپؐ کا معجزانہ اور بے مثل کارنامہ ہے۔ آپؐ نے ہدایت الٰہی کے مطابق انسانی معاشرہ کی جو تعمیر نو کی تھی اس میں بلا لحاظ رنگ و نسل و زبان ہر قوم اور ملک و ملت کے لئے رہنمائی کا اپنا اپنا سامان موجود ہے اور اس میں ہدایت و فلاح کا ہر جامع عنوان پایا جاتا ہے جو ایک

خاکہ بنتا ہے بہتر انسانی سماج اور صالح نظامِ حیات کا۔ یہ ان عناصر کی معقولیت اور معنویت ہی تھی جس نے آبادیوں سے کہ دلوں پہلے کا ذرہ بھی سے کھلا جانے ہونے والے عربوں کو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کو کے طور پر سامنے رکھنا چاہئے"

مذکورہ بالا عالمی اہم اور سنگین مسائل کے حل کے لئے بنیادی ضرورت اس بات کی ہے ایک طرف اپنی اصلی حیثیت، اپنے خالق اور اصل مقصدِ حیات کو سمجھے اور اپنے خالق و محسن کی زندگی کے ہر شعبہ میں اطاعت کرے (...) دوسری طرف انسانیت انسانی خلق کو اپنا شعار بنائے (...) اور پوری نوعِ انسانی کو ایک کنبہ اور خدا کے بندوں سمجھ کر زندگی گزارے۔ وہ دنیا کے جملہ ذرائع و وسائل کو اس خاندان کی مشترکہ سمجھ کر برتنے پر آمادہ ہو۔ چنانچہ نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم نے لحاظِ انسانیت و سلوک، رواداری، باہمی میل ملاپ و تعاون اور لاتعصبیت کا جو عظیم الشان اور درس دیا وہ تمام انسانوں کے لئے چراغِ ہدایت، موجبِ خیرِ کثیر اور باعثِ منفعت نیز جیسے وحدتِ انسانی، مساواتِ انسانی، احسان و سلوک، حسنِ خلق اور عصرِ حاضر اصطلاح میں سیکولرزم یعنی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی رواداری، قتل و فساد اور لاتعصبیت کا ماخذ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرمایا رسول انسانیت صلی اللہ علیہ

(۱) تمام مخلوق خدا، اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور خدا کے نزدیک محبوب وہ ہے مخلوق کو زیادہ محبوب رکھتا ہے (مشکوٰۃ ص ۴۲۳)

(۲) سنت اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے طریقوں کی توقیر کرو اور عیال اللہ یعنی اللہ (مخلوق) کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ (بیہقی۔ فتح الباری جلد ۳)

(۳) اے رب! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان اور تمام کائنات ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ تمام بنی نوعِ انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں (مسند احمد، سنن ابو

(۴) انسانوں میں بہتر وہ ہے جو انسانوں کو منفعت پہنچائے ــــ

(۵) اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا (بخاری

(۶) رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ترمذی)

(۷) فتح مکہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقریر

میں فرمایا "شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو! تمام انسان دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عزت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا تھا"
(بیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی)۔

⑧ حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں آپؐ نے ایک اثر انگیز تقریر کی اور فرمایا "لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے، کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بتاؤ میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا۔ ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا، اچھا تو جو موجود ہے وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں" (بیہقی)

⑨ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔ (بزار)

⑩ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے عزت والا (مکرم) وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ (ابن جریر)

⑪ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے قلوب اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔ (مسلم، ابن ماجہ)

⑫ وہ شخص ہماری جماعت میں داخل نہیں ہے ۱۔ جو لوگوں کو تعصب پر آمادہ کرے ۲۔ جو تعصب کی وجہ سے لڑے۔ ۳۔ اور جس کی موت تعصب کی وجہ سے واقع ہوئی ہو۔ (ابوداؤد)

مزید برآں، اسلام میں حقوق الانسان تو کجا، حقوق الحیوان کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی الرحمتؐ نے فرمایا: "ہر حساس جانور جس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اس کو کھلانے پلانے میں بھی ثواب ہے (بخاری و مسلم)۔ نیز محسنِ انسانیت کے تربیت یافتہ حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ دوم نے اپنے دور خلافت میں ایک موقع پر یوں فرمایا تھا "اگر دریا فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مجھ سے اس کا جواب طلب کرے گا"۔

غرضیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشکٰن بالاحکیمانہ و مدبرانہ ارشا عالیہ ایک طرح سے وہ عظیم الشان اور عدیم المثال اسلامی منشور انسانیت ہے جو ن نسلوں [illegible]، زمانوں، مرتبوں اور قرنوں کے حدود سے بالاتر، عالم انسانہ سارے ادوار کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محسنؐ انسانیت جس الٰہی کے علمبردار تھے وہ سارے انسانوں کے لئے ایک آفاقی فلسفۂ حیات تھا۔ اس کا کو نہ تھا سوائے صبغۃ اللہ (اللہ تعالیٰ کے رنگ) کے ($\frac{۲}{۱۳۸}$) ۔ اور جو بین الاقوا بین الاقوامی تعلقات پر تاحال اثرانگیز ہے۔ رسولؐ انسانیت نے یہ منشور پیش فرما کر د انسان کو انسانیت سے آشنا کیا۔ بندے پر خدائی کا رنگ چڑھایا ($\frac{۲}{۱۳۸}$) اور اس کو ایک مثالی اسلامی معاشرے کا معزز رکن اور عالمی اسلامی ریاست کا باعزت شہری بنا دیا۔

(۸) اسلام - درخشاں مستقبل کا ضامن

اسلام، خوابیدہ و شکست خوردہ انسانیت کو ایک زندہ و تابندہ اور روشن و د مستقبل کی امید و آرزو کا چراغ رجائیت جلانا سکھاتا ہے۔ عالمی ناسازگار حالات ا مسائل کے دور دورہ میں ہمیں مایوس و ناامید اور شکستہ دل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں رجعت پسندی، قنوطیت اور دقیانوسیت کا عنصر مطلقاً و قطعاً نہیں پایا جاتا جیسا کہ "نیم دانشوروں" اور "نادانوں" کی خام خیالی اور بوکھلاہٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصو فرض شناسی، رجائیت اور ہمہ گیر ترقی (جو دائرۂ اسلام سے متجاوز نہ ہو)، اسلامی تعلیمات ماخوذ ہے۔ ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عزم مصمم، عمل پیہم، جہاد (جد و جہد) یقین کامل ($\frac{۳}{۱۵۹}$) کے ذریعہ کاروان حیات کے سفر میں رواں دواں ہونا ہے تاکہ ہم اس ہوئے تاریخ انسانیت کے جامع و نافع انقلاب کے قریب تر ہو سکیں۔ انسانیت ابھی مر ہے وہ صرف سوئی ہوئی ہے۔ اسے جگانے کے لئے اسلام کی شمع حکمت و ہدایت اور و عمل کی ضرورت ہے کیونکہ فانوس اسلام کی روشنی ہی سے انسانیت کے تاریک منور ہو سکتے ہیں ——

آج اردو ہند میں ہمیشہ سے زیادہ مقبول ہے، اس کا ثبوت فلمی گیتوں، غزل شاعروں سے مل سکتا ہے، لیکن حکومت کی تمام مساعی کے باوجود اردو کا فروغ [illegible] ہے کہ اردو بولنے والے اپنے بچوں کو اسکولوں میں یا گھروں پر اردو پڑھانے [illegible] مضبوط ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں اردو کی مقبولیت اور اس کا

رضا علی عابدی

وہ ٹکینگ صاحب

پرانی داستانوں میں ہم نے ایسے قصے بارہا پڑھے ہیں جن میں لوگ اندھیرے غاروں اور سرنگوں میں چلتے گئے، چلتے گئے ــــ اور اچانک ایک چمکتے، جگمگاتے محل میں جا نکلے جس کے طاقوں میں ہیروں کے، نیلم، پکھراج اور زمرد کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بھی یہ ہیرے اور موتی فرش پر یوں گرنے لگتے تھے جیسے بہت بڑے غبارے پر بارش کی موٹی موٹی بوندوں کے ساتھ چھوٹے بڑے اولے بھی گرا کرتے تھے۔

کچھ ایسا ہی ایک طلسم ہم نے دکن کی سطح مرتفع پر آباد گنبدوں، میناروں، فصیلوں، محرابوں، باغوں اور فواروں کے شہر حیدرآباد میں بھی دیکھا۔

باغ عامہ کے سامنے ایک گلی میں آنکل کر ہم ایک ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ بالٹیوں کو بھرنے والی ٹونٹیوں سے ٹکراتے اور ربڑ کے پائپ کو پھلانگتے، رسیدہ اور پر پیچ سیڑھیوں پر چڑھتے، نیچی چھتوں سے سر ٹکرا جانے کے خوف سے جھکے جھکے اس آدمی کی آدھی کچی عمارت کی چھت پر پہنچے اور وہاں بعد میں تعمیر کئے گئے نسبتاً نئے اور کشادہ کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بچھاؤن پر اور طاقوں میں کتابیں ہی کتابیں جن میں رسالوں، دستاویزوں، قلمی نسخوں، بھاری بھرکم مجلدوں اور دوسری مطبوعات کے وہاں ڈھیر لگے ہوئے ہیں، اور ان کو چن چن کر سجانے والا ایک شخص سہما بیٹھا ہے کہ کہیں ہوا کا کوئی ذرا سا جھونکا انہیں اڑا نہ لے جائے۔

یہ اسی سہمے ہوئے شخص کی داستان ہے۔

محمد عبدالصمد خان پیشے کے اعتبار سے موٹر میکانک تھے مگر ذوق کے اعتبار

سے کتابوں کے شیدائی تھے۔ جنھیں ہیر سوداں کی طرح ... کرتے تھے اور یہی و
نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر کتابیں جمع کیا کرتے تھے۔ آخر یہ ہوا کہ ایک
زمانے کی ... کاریاں ... یہ کتب اور پرانے زمانے کی بعض کتابیں آ گئے
عبدالصمد خان ... اپنا سوز گیا رتیج بند کیا اور اپنے کتب خانے کو ریسرچ ...
کرنے، تحقیق اور مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے عام لوگوں کے لیے کھول
صرف دس بارہ برسوں میں وہ سات ہزار کتابیں، تیس ہزار رسالے یا
نسخے، دو سو خطوط، دو ڈھائی تین سو تذکرے، پچاس لغات اور ان گنت کتا...
کر چکے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج سینکڑوں ... اور اساتذہ، محقق اور مدیر
کتب خانے سے فیض اٹھا رہے ہیں، مگر یہ داستان کچھ اتنی خوشگوار بھی نہیں۔ میں
کے کتب خانے میں پہنچا اور اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو وہ مجھے ساتھ لے
چلتے جاتے تھے اور کتابوں کی باتیں کرتے جاتے تھے۔ کہنے لگے:

" یہ دیکھیے خواتین کے رسالے ہیں جن کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب
اس کے بعد یہ اردو میں طنز و مزاح کی کتابیں ہیں، ان کی تعداد تقریباً ڈھائی
ہے۔ اس سے آگے ڈرامے کی اور فن ڈرامہ کی کتابیں ہیں اور یہ نیچے قدیم
ہیں۔ ان کا بھی اتنا بڑا ذخیرہ شاید ہی کسی کے پاس ہو۔
اس طرف مذہبی کتابیں ہیں، ادھر تاریخ ہے اور یہ شعرا کے تذکرے ہیں
بھی اتنی بڑی تعداد شاید ہی کہیں ملے۔ ان کی کل تعداد پونے تین سو
یہ مختلف رسالے ہیں۔ ان کو جہاں جگہ ملی ہے وہیں رکھ دیئے گئے ہیں۔
اور یہ پوری الماری سیرت، سوانح اور خود نوشت سوانح کے لیے مخصوص
اس طرف قدیم غزل گو شعرا کا کلام ہے اور ان کا انتخاب ہے۔ اور ادھر
مثنویاں، منظوم داستانیں وغیرہ ہیں۔ اس کے بعد یہ انیسویں صدی کی کتابیں
ان میں زیادہ تر مخطوطے ہیں۔ مثلاً یہ چراغ علی صاحب کے انشائیے
ہیں۔ اسی طرح یہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کا کلام ہے جو کشن پرشاد
کے پاس جاتا تھا اخباروں میں شائع کرنے کے لیے۔ یہ اس کا پورا فائل
یہ کشن پرشاد کا کلام ہے جن کی ... جنگ اور ... تھے
ہے۔ اسی طرح الماری میں بھی ... ہیں ... مخطوطے

[illegible] دیکھیں [illegible]
یہ [illegible] میرے پاس مکمل سیٹ ہے۔ یعنی ۱۹۱۲ء سے لے کر [illegible] کی
[illegible] آباد کا مجلہ اردو ہے جو بعد میں پاکستان سے بھی شائع ہوتا
رہا ہے۔ [illegible] تک مکمل فائل یہاں موجود ہیں۔
یہ غالبیات پر متعلقہ کتابیں ہیں۔ ادھر اقبال پر شائع ہونے والی کتابیں ہیں۔
رسالوں نے جو غالب نمبر شائع کیے ہیں ان کی تعداد ۱۲۵ سے ہے۔ اقبال نمبر بھی
اتنی کے قریب ہیں۔ یہ فارسی گوشہ ہے۔ مصنفین کی [illegible] شدہ کتابوں کا سامان بہت
بہت دلچسپ تقریریں بھی لکھے ہیں۔ یہ تنقید و تحقیق اور حوالے کی کتابوں کا پورا
گوشہ ہے۔ اور [illegible] ہیں۔ یہ مختلف اردو اور تعلیمی انجمنوں کی رپورٹیں ہیں جیسے
یہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ۱۸۸۶ء سے لے کر ۱۹۰۶ء تک کی مکمل رپورٹیں ہیں۔ اسی طرح
علی گڑھ تحریک کی رپورٹیں اور مطبوعات یہاں جمع ہیں۔
ادھر سفرنامے ہیں۔ یہ کیٹلاگ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے
بھی کتب خانوں کے تاجرانِ کتب کے کیٹلاگ ہیں۔ میرے پاس جو فہرستِ کتب ہے
وہ ۱۸۸۲ء کی ہے۔
اور دیکھئے قلمی نسخے ہیں۔ وہ اوپر سب اردو کے ہیں۔ نیچے فارسی کے ہیں اور
سب سے نیچے عربی مسودے ہیں۔
ادھر یہ تینوں الماریاں رسائل کی ہیں۔ اور یہ وہ کمرا ہے جو میں صاف نہ کر سکا۔
رسائل کی تعداد بہت ہے۔ ہم نے ابھی تک ۲۲ ہزار کی فہرست بنائی ہے۔ انیسویں صدی
کے جتنے بھی اہم رسالے تھے ان کی ایک آدھ کاپی تو آپ کو یہاں ضرور مل جائے گی
ان میں سے بعض تو گمنام ہیں۔
[illegible] کے تہذیب الاخلاق کے پچاس سال کے فائل میرے پاس ہیں۔ مولانا آزاد
کے الہلال اور البلاغ کا مکمل فائل ہے۔ زمانہ کے مکمل سیٹ ہیں جو اب کسی کے پاس
نہیں [illegible] مکمل ہیں۔
میں نے [illegible] صاحب سے پوچھا کہ اپنی یہ لائبریری قائم کرنے کا خیال کیسے آیا؟
[illegible] رسائل کا [illegible] کہنے لگے
[illegible]

ہوسکتی ہیں۔ مجھے اس علم کا شوق تھا میں خریدتا تھا وہ کتابیں اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ اور اس کے بعد بھی برابر میں کتابیں جمع کرتا رہا۔ دو سال پیشتر کرنل سے ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب کے آنے کے بعد یہ خیال ہوا کہ ہم اس کو ایک ریسرچ سنٹر میں تبدیل کریں تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اب افسوسناک بات یہ ہے کہ میں خود اس سے تنگ آگیا ہوں۔ میں شاید بہت جلد اس کو بند کردوں"۔

ان کی یہ بات سن کر میں چونک پڑا اور پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

کہنے لگے: "بھئی یہ تو میرے لئے بالکل ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ مخطوطات اور قلمی نسخے ہیں۔ ان کو اگر میں محفوظ کرنے کی کوشش کروں تو میرے تیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ میرے بجٹ کا مسئلہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ کتابیں طرح خریدتا ہوں کہ میں اگر کھانا کھانے جا رہا ہوں اور راستے میں کوئی کتاب ہو تو سوچتا ہوں کہ چلو بھئی آج رات کا کھانا نہ سہی، کل ناشتہ ہی کرلیں گے مگر کتاب خرید لیتا ہوں۔ مگر اس طرح کتابیں تو میں نے بہت جمع کرلی ہیں لیکن ان کی اور حفاظت سے رکھنا میرے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔"

اس پر میں نے کہا کہ یہ تو بہت بڑا ذخیرہ ہے، اس کے پیچھے بڑی محنت ہے اشتیاق ہے جن کے بغیر کتب خانہ نہیں بنتا۔ اس کے بعد آپ اتنی آسانی سے اسے کیسے سے جدا کر سکتے ہیں؟

اس پر صمد صاحب کہنے لگے۔ "صاحب اب تو مشکل یہ ہے کہ یہاں کوئی دلچسپی اس ریسرچ سنٹر کی کمیٹی میں آپ جو نام دیکھیں گے وہ بہت بڑے بڑے لوگوں کے لیکن مجھے افسوس ہے کہ دو سال کے عرصے میں کسی نے بھی آکر یہ نہیں پوچھا کہ ادارہ کیسے چل رہا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ فوٹو کاپی کا ہے۔ صفحات کے عکس جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تعلیمی اداروں سے اور پاکستان سے مواد کے خطوط آتے ہیں اور خدا کے فضل سے ہم نے ابھی تک شخص کو حسب خواہش مواد

میں نے پوچھا۔ "بالکل راہِ خدا میں؟"

ہنس کر کہنے لگے: "راہِ خدا کہئے یا ذوق کی تسکین کہئے۔ لیکن اب تھک گیا اور آخر یہ سارا بھید انہوں نے خود ہی کھول دیا۔ بولے:

مہدی عباس حسینی

اردو اور جمہوریت

ہندوستان میں صرف دو زبانیں ایسی ہیں جنھیں کسی ریاست کی اکثریتی زبان نہیں کہا
سکتا لیکن جو اس کے باوجود ملک کے ہر گوشے میں پڑھی، لکھی، بولی اور سمجھی جاتی ہیں، یعنی
انگریزی اور اردو۔

اردو کی ہمہ گیر اپیل کے متعدد اسباب ہیں، لیکن بنیادی سبب اس کی اصل نسل ہے۔
ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور پیار محبت سے وجود میں آئی ہے۔ تانا بانا ہندوستانی
کھڑی بولی کا ہے، لیکن نقش و نگار اور بیل بوٹوں کے لئے فارسی، عربی، ترکی بلکہ پرتگیزی
انگریزی تک کے دھاگے استعمال کئے گئے ہیں۔ رسم الخط فارسی نستعلیق ہے جسے
کل نہ فارسی استعمال کرتی ہے نہ عربی۔

اردو کی مضبوطی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں سے الفاظ لینے میں کبھی کوئی
محسوس نہیں کی۔ کچھ لوگ غالباً اس بدیسی عنصر سے بھڑک کر ساری زبان کو بدیسی بتلانے
تے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اردو کی اصل نسل سے ناواقف ہیں بلکہ انھیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ
ان سب سے زیادہ اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے والے آج بھی ہندوستان ہی
پائے جاتے ہیں۔

1971 کی مردم شماری میں ہندوستان میں چھ کروڑ 86 لاکھ شہریوں نے اپنی
ری زبان اردو بتائی تھی، جبکہ اسی سال کی مردم شماری میں پاکستان میں صرف 32 لاکھ
9 ہزار 454 لوگوں نے اپنی مادری زبان اردو بتائی۔

آج بھی ہندوستان میں پاکستان کی بہ نسبت اردو کے زیادہ رسالے اور اخبارات
نکلتے ہیں اور اردو کی زیادہ کتابیں چھپتی ہیں۔

دالشن کی کتابوں میں اردو اخبار بھی ہندوستان سے کہیں زیادہ ہیں
ہندوستانیوں میں پاکستان کی نسبت زیادہ ہوتی اور سکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام

ہندوستان کا آئین: ہندوستان میں اردو کی بقا کا سب سے بڑا ملک کے سیکولر آئین کو جاتا ہے۔ دستور ہند کی آٹھویں شیڈول پر طور پر درج ہے کہ گو کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی اور انگریزی ہو گی لیکن ملک کی زبانوں [illegible] میں سے ایک اردو ہے۔ [illegible] ریاستوں کی تشکیل علاقائی زبانوں کی بنیاد پر [illegible] نے اردو اور دوسری اقلیتی زبانوں کے تحفظ کے لئے تجویز کیا کہ ایک کمشنر برائے اقلیت مقرر کیا جائے جو یہ دیکھتا رہے کہ کسی زبان کے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہے اور سال کے آخر میں ایک رپورٹ صدر جمہوریہ کو پیش کرے جس میں زیادتیوں کا ذکر اور ان کے مداوا کی تجاویز درج ہوں۔ چنانچہ یہ کمشنر اب بھی

سہ لسانی فارمولا: اقلیتی زبانوں کے تحفظ کی دوسری صورت فارمولا تھا۔ مرکزی سرکار نے تجویز کیا اور بیشتر ریاستی سرکاروں نے یہ مان بھی لیا تو پرائمری درجوں میں ہر طالب علم کو اس کی مادری زبان میں تعلیم ملنا چاہئے زبان وہ مانی جائے گی جو بچے کے ماں باپ بتائیں گے۔ پھر ثانوی سطح پر تین زبانیں پڑھائی جائیں، علاقائی زبان، انگریزی اور علاقائی زبان کے علاوہ جدید ہندوستانی زبان، اس تیسری زبان میں اردو یا کسی اور مادری زبان کی شکل ہوتی ہے۔ البتہ مادری زبان کے لئے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ ایک کلاس میں کم دس طالب علم یا سارے اسکول میں چالیس طالب علم اسے پڑھنا چاہیں اسی کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی تعلیمی ادارہ از خود چاہے تو کی تعلیم کے لئے دس فی کلاس اور چالیس فی اسکول کی تعداد پوری نہ ہونے انتظام کر سکتا ہے۔ اس کا براہ راست اردو کو پہنچتا ہے یہی نہیں بلکہ جہاں اردو پڑھنے والے طالب علموں کی اکثریت ہو وہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بھی بنایا جا ہندوستان میں اردو کے خاص علاقے آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش جموں و کشمیر، ہماچل، مہاراشٹرا، کرناٹک اور مغربی بنگال ہیں۔ [illegible]

ہے کہ صرف دہلی کی ایک بڑی تعداد چھپ رہی ہے جن میں بھی پائی جاتی ہے جو
معلوم ہوتا ہے کثیر الاشاعت اخبار "ہند سماچار" جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔

وزارت تعلیم: اردو کے فروغ میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

ترقی اردو بورڈ: ترقی اردو بورڈ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی ایک ماتحت ایجنسی ہے۔ یہ 1969 میں قائم کیا گیا۔ اس کے دفتر کا نام ترقی اردو بیورو ہے۔ بیورو اردو میں علم و ادب، سماجی سائنس اور سائنس کی کتابیں شائع کرتا ہے۔ یہ اب تک 560 کتابیں شائع کر چکا ہے، این سی ای آر ٹی (نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ یعنی تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل) کے لئے 132 کتابیں، آندھرا پردیش سرکار کے لئے 19 کتابیں (کالج اور یونیورسٹی سطح کی)، آئی سی ایچ آر (انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ یعنی تاریخی تحقیق کی بھارتی کونسل) کے لئے 47 کتابیں، قانون کمیشن کے لئے دستور ہند کی اشاعت ثانی اور آٹھ موضوعات پر اصطلاحات شائع کر چکا ہے۔ 12 جلدوں کا اردو انسائیکلو پیڈیا تیار ہو چکا ہے، انگریزی اردو لغت تیار ہو رہا ہے۔ بیورو کتابوں کی نمائش میں حصہ لیتا ہے، پاکستان میں تین نمائشیں لگا چکا ہے اور ابھی تک 35 لاکھ روپئے کی کتابیں بیچ چکا ہے۔ بیورو اردو کتابت شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ سکھانے کے مرکز بھی چلاتا ہے، کتابت کے 31 مرکز کھلے ہوئے ہیں جن میں سے ۔۔۔ عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔ بیورو کا ایک خاص کام اصطلاحات سازی ہے۔

گجرال کمیٹی رپورٹ: 1972 میں وزارت تعلیم نے اردو کے مسائل پر غور اور اس کے فروغ سے متعلق ایک کمیٹی جناب اندر کمار گجرال سابق مرکزی وزیر کی صدارت میں مقرر کی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ 1975 میں پیش کی جس میں 187 سفارشات تھیں۔ اس کے بعد ترقی اردو بورڈ کی ایما پر وزارت تعلیم نے پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے تجویز کیا کہ حکومت ہند اور ریاستی سرکاریں قابل قبول سفارشات کو عمل میں لائیں ۔۔۔ ان سفارشوں پر عمل ہو چکا ہے ۔۔۔

[illegible] اردو پروگرام نشر کئے گئے ہیں جا [illegible] اردو
[illegible] اردو ریلوے ٹائم ٹیبل چھپے گئے۔ اسٹیشنوں کے نام اردو میں لکھے
خاص خاص علاقوں میں منی آرڈر اور پی پی کے فارم اردو میں چھپے گئے۔ جموں
اردو بولنے والوں کے فارم اور اسسٹنٹ وغیرہ کی فہرست اردو میں
سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز نے اردو اساتذہ کی دس ماہ کی ٹریننگ
ذمہ داری سنبھال لی ہے۔

ساہتیہ اکاڈمی

: یہ اکاڈمی ایک عرصے سے دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ ہر سال اردو کی بہترین کتاب کے مصنف کو انعام و اعزاز سے نوازتی ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ

: یہ ادارہ علاقائی زبانوں میں قومی موضوع پر عام فہم زبان میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ اردو کتابیں بھی شامل ہیں۔

چلڈرنس بک ٹرسٹ

: یہ ادارہ خاص طور پر بچوں کے لئے کتابیں شائع کرتا ہے، ان میں اردو کتابیں بھی ہوتی ہیں۔

تعلیم بالغان

: وزارت کا یہ شعبہ ہر سال نئے پڑھے لکھے بالغوں کے لئے لکھی گئی کتابوں کا ایک مقابلہ کراتا ہے جس میں اردو پر بھی انعام دیا جاتا ہے۔

کلچر کا محکمہ

: یہ محکمہ ہر زبان کے اعلیٰ مصنفوں کو ان کی ادبی خدمات کے لئے انعام و اکرام سے نوازتا ہے، اور ان کی کتابیں شائع کرانے میں مدد دیتا ہے۔ اردو، عربی اور فارسی کے عالم بھی ہوتے ہیں۔

وزارت اطلاعات و نشریات

وزارت تعلیم کے بعد اردو کے فروغ میں سب سے زیادہ کام وزارت اطلاعات و نشریات کرتی ہے۔

رجسٹرار آف نیوز پیپرس

: اگر اردو بولنے والوں کی تعداد اور اردو اخبار و رسائل کی تعداد کا تناسب نکالا جائے تو محسوس ہوگا کہ غالباً اردو والے دوسری زبان [illegible]

جاتے ہیں کہ کہیں زیادہ اخبار پڑھتے ہیں، لیکن درحاصل ایسا نہیں۔ اخباروں کی تعداد زیادہ ہے اور پڑھنے والوں کی کم، لہٰذا ان کی اشاعت زیادہ نہیں۔

اشاعت کے سلسلے کی پہلی کڑی یعنی اخباری کاغذ کی فراہمی کا کام رجسٹرار نیوز پیپرز کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اخباروں کو اپنا نام رکھنے، رجسٹرڈ نمبر لینے اور کاغذ حاصل کرنے کے لئے اسی دفتر سے رجوع کرنا پڑتا ہے، رجسٹرار کو وزارت کی ہدایت ہے کہ چھوٹے اخباروں یعنی پندرہ ہزار تک کی اشاعت والے اخباروں (اردو کے نوے فیصد اخبار اسی زمرے میں آتے ہیں) کے ساتھ خاص رعایت رکھی جائے۔ چنانچہ اس پالیسی سے اردو والوں کو بہرحال فائدہ پہنچتا ہے۔

پریس انفارمیشن بیورو: کاغذ کی فراہمی کے بعد صفحات کو بھرنے کا مرحلہ آتا ہے، چھوٹے اخبارات نہ تو تربیت یافتہ عملہ رکھتے ہیں، نہ نامہ نگار، اور نہ خبر ایجنسیوں کے خریدار ہوتے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو اردو اخباروں کو اردو میں حکومت ہند سے متعلق اطلاعات، صدر، وزیر اعظم اور دوسرے وزیروں کی تقریریں (بشمولیت عام بجٹ، ریلوے بجٹ) انگریزی مضامین کے ترجمے، اردو میں براہ راست لکھے گئے مضامین، تصویریں اور چھپے کاغذ پر چربے مہیا کرتا ہے جو لیتھو پر چھاپے جا سکتے ہیں اور اردو کے چھوٹے اخبارات کے لئے بہت مفید ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو: حکومت کا خبروں کا شعبہ، جو ریڈیو اور ٹی وی کے لئے خبریں تیار کرتا اور پیش کرتا ہے، چھوٹے اخباروں کی سہولت کے لئے روزانہ آدھے گھنٹہ کا سست رفتار بلیٹن پیش کرتا ہے یعنی اس میں خبریں اتنی ٹھہر ٹھہر کر سنائی جاتی ہیں کہ سننے والے آسانی سے نقل کر سکتے ہیں، اردو اخبار والے اس طرح تازہ ترین خبریں بغیر خبر ایجنسی پر خرچ کئے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح اگر حکومت ہند سے متعلق معلومات پریس انفارمیشن بیورو دیتا ہے تو تازہ خبریں آل انڈیا ریڈیو۔

آل انڈیا ریڈیو روزانہ نو گھنٹے سے زیادہ کا ایک اردو پروگرام نشر کرتا ہے جسے اردو سروس کہتے ہیں، اس کے علاوہ "اردو مجلس" پروگرام ہے، اور یہ دونوں پروگرام بہت مقبول ہیں۔ ریڈیو روزانہ متعدد بلیٹن اردو خبروں کے نشر کرتا ہے، جو سری نگر، جموں، جالندھر، شملہ، لکھنو، پٹنہ، رانچی اور حیدرآباد سے ریلے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مشہور عام وودھ بھارتی پروگرام میں بھی اردو کے پروگرام وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں، اردو نشریات کے خاص مرکز سری نگر، جالندھر، جموں، دلی، لکھنؤ، پٹنہ، بھوپال اور حیدرآباد ہیں۔

ریڈیو نے اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کو ہمیشہ اپنے دامن میں جگہ دی ہے چنانچہ

کے علاوہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپیندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی
نے آزادی کے بعد جوش ملیح آبادی، روش صدیقی، ساغر نظامی، ڈاکٹر عابد حسین
وغیرہ ریڈیو کے علاوہ ڈائرکٹر پروڈیوسر رہے، ساغر نظامی جب
چیف پروڈیوسر (اردو) تھے ان کے معاون کمال احمد صدیقی اس عہدے پر فائز رہے

دوردرشن اور فلمس ڈویژن: دور درشن میں دلی، جالندھر، سری نگر
کے ٹیلی ویژن پروگرام نشر ہوتے ہیں جو پاکستان تک میں مقبول ہیں، فلمس ڈویژن
میں متعدد ڈاکومنٹری اردو زبان میں بنایا جاتا ہے، اس کے علاوہ تقریباً ہر نیوز ریل کا
اردو ترجمہ کشمیر اور دیگر اردو والے علاقوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔

ڈی اے وی پی: وزارت اطلاعات کا تیسرا محکمہ، ڈائرکٹوریٹ آف ایڈور
ٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی، اردو اخباروں کو اشتہارات مہیا کرتا ہے، یہاں پر بھی دیکھا
جاتا ہے چھوٹے اخبارات اور رسائل کو زیادہ رعایت دی جاتی ہے، اس کے علاوہ
اردو میں پوسٹر، پمفلٹ اور کتابچے وغیرہ بھی شائع کرتا ہے۔

پبلی کیشنز ڈویژن: وزارت اطلاعات کا یہ محکمہ ہندوستان کا سب سے
بڑا ناشر کتب ہے، یہ سال میں سو سے زیادہ کتابیں مختلف علاقائی زبانوں میں
شائع کرتا ہے، اس کا ایک اخبار "یوجنا" گیارہ زبانوں میں جن میں اردو بھی شامل ہے
شائع ہوتا ہے، اس کا رسالہ "آج کل" 1942 سے اردو میں مسلسل شائع ہو رہا ہے
اور اس وقت مسلسل شائع ہونے والے رسالوں میں قدیم ترین اردو رسالہ ہے
بہترین طباعت و کتابت کے کئی انعامات حاصل کر چکا ہے، پبلی کیشنز ڈویژن سالانہ
کتابیں شائع کرتا ہے۔

اس مختصر سے جائزے سے واضح ہو گیا ہوگا کہ حکومت ہند نے اردو کی تعلیم و تدریس
کے لئے نہ صرف ساری سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں بلکہ وہ اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے
کوشاں رہتی ہے، اسی طرح مختلف ریاستوں میں اردو کے فروغ کے لئے جو کوششیں
ہو رہی ہیں ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج تیرہ ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں
جن کو ریاستی سرکاریں مالی امداد دیتی ہیں، یہ اکیڈمیاں اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال،
جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، راجستھان، آندھرا پردیش، کرناٹک، گجرات، [illegible]
[illegible] میں قائم ہیں۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ

اردو، ہندی، ہندوستانی: ایک مذاکرہ

خدا بخش لائبریری کے زیر اہتمام اردو، ہندی، ہندوستانی کے باہمی تعلق پر اردو ہندی زبان کے دودانوں اور دانشوروں کے درمیان تبادلہ خیال کے لئے مذاکرہ کا انعقاد کیا۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے جلسہ کی غرض پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے ان میں مذہب اور زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے مذہب میں کوئی برائی نہیں ہے اگر اس کی صحیح روح کے ساتھ اس کو اختیار کیا جائے۔ مذہب کا غلط استعمال فرقہ پرستی اور منافرت کو جنم دیتا ہے۔ ڈاکٹر بیدار نے اردو، ہندی دونوں زبان اپنے رسم الخط اور ادبیات کے لحاظ سے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی بول چال کی زبان دونوں کی ایک ہی ہے۔

ہندوستانی زبان سے متعلق مہاتما گاندھی کے خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر بیدار نے اس بات پر زور دیا کہ اردو اور ہندی کے دانشوروں اور دودانوں کو اسی لئے ایک جگہ جمع کیا گیا کہ ہم اس امکان پر غور کریں کہ کیا کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور ہندوستانی جسے ہندوستانی عوام بولتے ہیں اس کی ترقی ہو سکے۔

ڈاکٹر بیدار کے ان تمہیدی کلمات کے بعد ہندی زبان کے نوجوان اہل قلم کی نمائندگی کرتے ہوئے اپوروانند نے اردو، ہندی کے تعلق اپنے ساتھ تجربے واضح خیالات پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جو لوگ ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار اردو کو ٹھہراتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور جو لوگ اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں وہ بھی غلط فہمی کے شکار ہیں۔

ڈاکٹر اپوروانند نے جیسے پہلے ہی بہتر انداز میں زبان سے متعلق اٹھائے جانے والے کی وضاحت کی اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ اردو اور ہندی اگرچہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں لیکن اب یہ دونوں زبانیں اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی خوبیوں کے ساتھ زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے۔ جو لوگ اردو میں شامل فارسی اور عربی الفاظ کا

میں شامل مشکل سنسکرت کے الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں ان کا اعتراض کرنا صحیح
ـــ ہندی ہماری ادبی زبان ہے پھر بھی اس کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو
کے لئے نہیں شدید کوشش کا سہارا لینا پڑتا ہے پھر جب ہم دوسری زبان کو پڑھنا چاہیں
چاہئے کہ مطالعہ کریں کہ جس میں ممکن شدید نہ آئیں۔ یہاں بھی ہم ڈکشنری سے مدد لے سکتے
شری رام دین جی (پٹنہ یونیورسٹی) نے ہندی کے اہل قلم کی نمائندگی کرتے ہوئے
کہ اردو میں جو قیمتی سرمایہ ہے اس کو دیوناگری اسکرپٹ میں شائع کرنا چاہئے اس طرح
رچناؤں کو اردو میں چھاپنا چاہئے اس سے دونوں زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے
قریب ہوں گے اور دونوں زبانوں کے بولنے والوں کو فائدہ پہنچے گا ۔

شری کیسری کمار سنگھ (صدر مگھی اکادمی) نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی اردو۔
اختلافی مسئلہ کو ابھارنے اور پرانے گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ ہم
سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہمیں اس مسئلہ پر علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہئے
ایک باغ ہے اردو، بنگلہ، تلگو، ملیالم اور سبھی علاقائی زبانیں اس چمن کی کیاریاں
کوئی ترقی نہیں کرے اور مرجھا جائے تو ہندوستان کے اس باغ کی ایک کیاری کا نقصان
اور اس چمن کا نقصان ہوا۔ سبھی زبانوں کی ترقی کے لئے خوشگوار فضا بنانا ہماری
شری کیسری نے اردو۔ ہندی کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ا
میں کچھ خوبیاں ایسی ہیں کہ جس کی وجہ سے ہندی کے ادیب اور پڑھے لکھے لوگ
اشعار اور اردو کے محاورے اور ضرب الامثال بولنے پر مجبور ہیں۔ میں ہندی
کہتا ہوں کہ آپ بھی اس چیلنج کو قبول کیجئے اور ہندی کو ایسی زبان بنائیے کہ لوگ از
زبان کو اوپر سے تھوپنے اور لادنے سے زبان ترقی نہیں کرسکتی۔

ڈاکٹر محمد محسن سابق صدر شعبہ نفسیات نے فرمایا کہ زبان کلچر کا حصہ ہے اگر
مشترکہ تہذیب یا ہندوستانی زبان کی بات کی جاتی ہے تو اقلیت کو یہ خطرہ
ہے کہ اکثریت ہم پر اپنا کلچر لادنا چاہتی ہے۔ پروفیسر محسن نے امریکہ کی مثال
بتایا کہ مشترکہ تہذیب کی کوشش امریکہ میں ناکام ہو چکی ہے اور اس سے
مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر نظیر محمد شعبۂ ہندی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بتایا کہ ہندی کی ترقی
ہندی والوں نے یا کسی ایک فرد یا ایک قوم نے حصہ نہیں لیا بلکہ سب نے مل جل

نصیب بنایا ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے خاص طور پر رحیم جائسی اور کبیر داس وغیرہ کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے یہ مشہور واقعہ بیان کیا کہ رحیم کے دربار میں ایک بار ایک پنڈت جی نے ایک دوہا سنائی جو انھیں اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے اصرار کرکے اسے (۳۶) بار سنا اور ہر ایک بار ایک لاکھ روپیہ یعنی کل ۳۶ لاکھ روپیہ عنایت کیا۔ اسی طرح تلسی کی بیٹی کی شادی کے موقع پر رحیم نے کافی روپیوں سے اس کی مدد کی تھی۔

انھوں نے زبان کے ساتھ مذہب کا ذکر کرتے ہوئے بیدار صاحب کی اس بات کی تائید کی کہ اگر مذہب کو اس کی سچی روح کے ساتھ اپنایا جائے تو کشیدگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی کو بیناؤں کو اردو اور اردو نظموں کو ہندی کا جامہ پہنایا جانا چاہیئے۔ انھوں نے خود اپنی کاوش کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کی کلیات کو وہ ہندی میں ترجمہ کر چکے ہیں جو اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے جلد شائع ہوگی۔

ڈاکٹر محمد انصار اللہ استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی گفتگو میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ اردو ہندی سے زیادہ قدیم ہے۔ اردو (جس کا قدیم نام ہندوستانی بھی ہے) موجودہ ہندی سے قدیم ہے اور فن عروض اردو قواعد اور شاعری کے مختلف اصناف کی روایت اردو میں زیادہ قدیم ہے اور دکن کے تمام مخطوطات اردو رسم الخط میں ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی ادب کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے لازم ہے کہ اردو رسم الخط میں محفوظ قدیم مخطوطات اور متعلقہ سرمائے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور اس کے لئے انھوں نے فارسی رسم الخط کو سیکھنا لازم قرار دیا۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے موجودہ عنوان کے تحت ایک مضمون پیش فرمایا جس میں پنڈت سندر لال کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی اہمیت کی اور آزادی کے سلسلے میں اس کی خدمات کی طرف اشارہ فرمایا اور اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ اردو زبان کو اس کے رسم الخط اور اس کی ادبی روایات کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع فراہم ہونا چاہیئے کیونکہ یہ زبان ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہندوستانی صوبوں میں رابطہ کی زبان بننے کی لائق

صرف اردو ہے۔

انھوں نے لسانیات کی روشنی میں اس تلخ حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اردو اور ہندی دونوں الگ الگ زبان ہیں اور "ہندوستانی" نام کی کسی زبان کا یہاں وجود نہیں ہے۔

پروفیسر عطاءالرحمن عطا کاکوروی نے فرمایا کہ اردو کا قدیم نام ہندی رہا ہے اس لئے اکثر اردو شعرا کے تذکروں کے نام "تذکرہ ہندی" ہیں۔ مصحفی کے تذکرہ کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس تذکرے میں تمام اردو شعرا کے تذکرے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا نام "تذکرہ ہندی" ہے۔

بہار کے مشہور اہل قلم جناب تقی رحیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ زبان کے سلسلے میں تمام باتیں دستور ہند میں واضح شکل میں موجود ہیں۔ ہندی ہماری قومی زبان ہے اور اسی کو رابطہ کی زبان بننا ہے لیکن ہندی اردو کا سہارا لئے بغیر ملک کے لئے رابطہ کی زبان نہیں بن سکتی۔ ہندی سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی اہل بہاری یا جیانی یا کسی ہندی شاعر یا ادیب کو ہوگی لیکن اس پہلو پر غور کرنا چاہئے کہ آخر کیا حرج ہے کہ غیر ہندی صوبوں میں ہندی کی مخالفت ہورہی ہے۔ "ہندوستانی زبان" کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ ہم اور آپ جو اس وقت گفتگو کررہے ہیں یہ ہندوستانی زبان ہے۔ اردو اور ہندی کی اپنی مستقل حیثیت ضرور ہے لیکن ادبی سطح کو چھوڑ کر عوامی سطح پر ہم جو زبان بولتے ہیں اگر آپ اسے اردو رسم الخط میں لکھیں تو اردو ہے اور ہندی میں لکھیں تو ہندی ہے۔ یہی عام فہم زبان "ہندوستانی" ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے یہ ہندوستان کی زبان ہے اور ہندو مسلمان سب کی زبان ہے۔ اردو کا اس کا مقام ملنا چاہئے اور اس کی ترقی میں ہندی کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ ہندی اردو کی مدد سے رابطہ کی زبان بن سکے۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے ان تمام اہم نکات پر مختصر روشنی ڈالی جو اس وقت کے شرکاء نے اپنی اپنی تقریروں میں پیش کی تھیں۔

جناب احمد یوسف نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے ہندی کی اس حیثیت پر اردو والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ کبھی اردو کی طرف سے اٹھایا گیا ہے۔ اصل مسئلہ اردو کا ہے۔ اردو کا حق اسے کیسے د

جائے۔ یہی بنیادی مسئلہ ہے اور اسی پر زور دینے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی اختتامی گفتگو میں ڈاکٹر رام ولاس جی کی اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ اردو ساہتیہ یا ادب کو ہندی میں اور ہندی ساہتیہ کو اردو میں آنا چاہئے کہا کہ اس سے ہم لوگ اور زیادہ قریب آسکیں گے۔ انھوں نے خدابخش لائبریری کے ایک پروجیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندی یا علاقائی زبانوں میں جو تحقیقی ادب پیش کیا گیا ہے وہ اردو میں ترجمہ کرایا جائے گا تاکہ اردو داں حلقہ ہندی کے عالموں کے خیالات سے استفادہ کرسکے۔ انھوں نے رسم الخط پر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور ہندی کے رسم الخط کو الگ الگ باقی رہنا چاہئے۔ انھوں نے بتایا کہ جب بھی بڑا ادب پیش کیا جائے گا تو فارسی عربی یا سنسکرت کو سہارا بنایا جائے گا۔ لیکن عام بول چال کی زبان میں ہمیں سیدھے سادے الفاظ ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹی وی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ یہ اسی لئے مقبول ہوا کہ ان میں ملی جلی زبان استعمال ہوتی ہے۔ انھوں نے میڈیا کو کنٹرول کرنے تک اس بات کو پہنچانے پر زور دیا کہ وہ اپنی تقریروں اور پروگراموں میں اردو، ہندی کے ملے جلے اور سادہ الفاظ استعمال کریں تاکہ دونوں زبانیں ہم آہنگ ہوکر ساتھ مل سکیں اور زبانوں کا مقصد ترسیل، یعنی بات کو دوسروں تک پہنچانا پورا ہوسکے۔

اس سے قبل جناب جاوید اختر صاحب، شعبۂ ہندی پٹنہ یونیورسٹی نے اردو کے مخالفین کے اس دعوی کو کہ اگر ہندوستان میں اردو کو اس کا حق دیا گیا تو ہندوستان ٹکڑوں میں بٹ جائے گا — رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ حقیقت سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں ایک زبان، ایک مذہب اور ایک تہذیب کے تصور کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ایک مشترکہ تہذیب کا نام ہے جو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ انھوں نے زبان کے مسئلہ کو مذہب کے مسائل سے جوڑنے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اس سے زبان کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اردو والوں کو صرف عربی اور فارسی پر ہی زور نہیں دینا چاہئے۔ اس سے اردو کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ ہندی میں بھی کچھ ایسے شبد ہیں جن پر اردو والوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو ہندی کے رشتہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اردو کا تعلق کھڑی بولی سے ہے جب کہ ہندی کا تعلق کھڑی بولی سے ملتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی

باقی صفحہ ۱۳۶ پر

مہیشور دیال

[illegible]

کوئلے اور پٹرولیم جیسے توانائی کے روایتی وسیلوں میں تیزی سے کمی کی وجہ سے توانائی کے غیر روایتی ذرائع کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے جتنی پہلے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ امید کی جاتی ہے کہ 2000ء تک ان ذرائع سے توانائی کی کل مانگ کا 20 فی صد حصہ پورا ہو جائے گا۔

کوئلے کے متبادل طور پر توانائی کے نئے اور پھر سے قابل استعمال ذرائع سے توانائی کی سالانہ پیداوار یا بچت 25 کروڑ ایک لاکھ 70 ہزار ٹن ہو جائے گی۔ اس میں سے کوئلے کے مقابل 4 کروڑ 78 لاکھ 80 ہزار ٹن توانائی حیاتیاتی گیس کے پلانٹوں سے، 4 کروڑ 78 لاکھ ٹن بہتر چولہوں سے، 3 کروڑ 9 لاکھ 40 ہزار ٹن کے برابر بائیو ماس سے اور دو کروڑ ٹن کے برابر توانائی سورج کی حرارت سے حاصل ہوگی۔

کھانا پکانے سے لے کر بڑے بڑے صنعتی کارخانوں تک توانائی کی متواتر بہم رسانی کا انتظام کرنا ہمارے ملک میں ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ قدرتی ایندھن کے تیزی سے ختم ہونے اور توانائی کے روایتی ذرائع کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے توانائی کے بارے میں منصوبہ بندی کرنے والوں کے لئے اس سوال پر پھر سے غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ پودوں اور جنگلی جانوروں کی تباہی، سیلابوں سے نقصان، تہ نشیں مادوں کا جمع ہونا، جنگلات کی کٹائی، چارے اور ایندھن کی کمی، نیز صنعتوں کے لئے خام مال کی قلت ملک کے لئے قلت اور تشویش اور توجہ کا سب سے بڑا سبب بنی ہوئی ہے۔ لہٰذا ملک میں اقتصادی و سماجی ترقی کے عمل کو متعین کرنے میں حیوانات و نباتات کی متوازن ترقی، مٹی، پانی، پودوں اور حیوانی زندگی کے وسیلوں کی بقا کے استعمال اور اس کی پھر سے تعمیر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔

سکریٹری، محکمہ غیر روایتی ذرائع توانائی، حکومت ہند

نیز کاروباری ذریعوں کا حصہ بتدریج کم ہوتا گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حصہ 1980 میں 40
فیصد رہ گیا تھا۔ جبکہ 54-1953 میں یہ حصہ 67 فیصد تھا۔ اس پس منظر نیز 1970 کے
عشرے اور 1980 کے ابتدائی برسوں میں توانائی کے بحران کو دیکھتے ہوئے بہت سے قابل استعمال
توانائی کی ٹیکنالوجیاں زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

آج ایک دور افتادہ گاؤں کا کسی بجلی کے گرڈ سے رابطہ قائم کرنے کا خرچ حوصلہ شکن
ہے اور شائد ایسا ہی رہے گا۔ گاؤں میں کسی کاروباری سرگرمی کی عدم موجودگی میں توانائی کی کھپت
بہت کم ہے۔ دوسری جانب بجلی کے کسی نظام کو کسی گاؤں تک پہنچانے میں ترسیل سے نقصان بھی
زیادہ ہوگا۔ توانائی کے غیر مرکوز اور بکھرے ہوئے غیر روایتی ذرائع گاؤں کے لئے بہت موزوں ہیں کیونکہ ایک
تو ان کے استعمال کا خرچ بہت کم ہے دوسرے ان کا ماحولیات پر کوئی ناموافق اثر نہیں پڑتا اور یہ
ذرائع آسانی سے مقامی طور پر دستیاب ہیں۔

توانائی کے صارفین اور منتظمین کے طور پر گاؤں کے لوگوں کی توانائی کے پروگرام میں سرگرم
شرکت غیر مرکوز پیمانے پر توانائی کی پیداوار کی کامیابی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ ملک میں گنجائش کی
ضروریات کے مطابق بائیو گیس کے پلانٹوں، بہتر قسم کے چولہوں اور متعدد شمسی آلات کا بڑے
پیمانے پر استعمال ہو سکتا ہے۔

1986ء کے قومی نکاتی پروگرام میں گاؤں کے لئے توانائی پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ دیہی
علاقوں توانائی کی بہم رسانی کے عمل میں دالفیع پتا بجلی کے بکھرے نظاموں، سولر فوٹو وولٹیکس
بائیو ماس میں سے گیس کی تیاری کے ذریعہ گاؤں میں بجلی پہنچانا (سب) پانی نکالنے والے پمپوں
کے ذریعہ پانی کی بہم رسانی اور چھوٹے پیمانے کی آبپاشی، فصل کو خشک کرنے، لکڑی
خشک کرنے، پانی سے شورہ نکالنے نیز ایندھن اور چارے کے لئے اور بائیو ماس گیس تیار
کرنے والے پلانٹوں کے لئے خام مال کے طور پر توانائی پیدا کرنے کی غرض سے سورج کی گرمی
سے حاصل ہونے والی توانائی کا استعمال شامل ہونا چاہئے۔

متبادل توانائی کی دستاویز توانائی کے متبادل ذرائع کے بارے میں تازہ ترین
دستاویز "توانائی 2001" میں آئندہ 15 برسوں
کے لئے بعض مقاصد طے کئے گئے ہیں۔ ان میں بائیو گیس میں ٹیکنالوجی کی ترقی، بہتر اقسام کے
چولہے، سورج کی حرارتی توانائی کا استعمال، توانائی کے باغیچے، ہوا کی طاقت نیز پانی
سے بجلی پیدا کرنے جیسی ٹیکنالوجیوں کی تشہیر شامل ہے۔

[illegible] ترقیات کے [illegible] نمبر ۳

[illegible] دستاویز ۲ ایک مسودہ بجلی کے خلاف کشش حرارت پیدا ہونے والی [illegible] اور صرف بنانے کے غیر روایتی بجلی پلانٹوں کے لئے مشینری [illegible] [illegible] اور پارک لگانے قابل عمل بنانا ہے

[illegible] ہے اور جا پروگرام بہتر ایسے دیہات بنائے جائیں گے جو توانائی کے [illegible] خود کفیل ہوں گے۔ جہاں غیر روایتی توانائی کے کئی نظام اور آلات کام میں لائے جائیں گے ساتویں منصوبے میں پہلے 5 ہزار اور دیہا پروگرام قائم کئے جائیں گے۔

چھوٹے اور بڑے پیمانے کی رضاکار تنظیموں کی مناسب شرکت کا یقینی اہتمام کیا [illegible] اور اگر ضرورت ہوئی تو خاص خاص علاقوں کے لئے نئی تنظیموں کو فروغ دیا جائے گا [illegible] پیدا کرنے اور گاؤں کی سطح پر معیار زندگی کو بہتر بنانے [illegible]

توانائی کے غیر روایتی ذرائع کے محکمے کے مستقبل کے منصوبے [illegible] کہ ساتویں منصوبے اور بعد کے منصوبوں کے دوران ملک کی ترقی میں غیر روایتی توانائی نظاموں اور طریقوں کا حصہ پچھلے منصوبے کی نسبت کہیں زیادہ ہونا چاہئے۔ اس بات یاد رکھنی چاہئے کہ جہاں غیر مرکوز نظام دور دراز علاقوں کے لئے کار آمد ہوں گے وہاں ایک مقام پر واقع بڑے بڑے نظام آخیباتی مہنگے اور پلانٹوں کے نقصان، بجلی گھر اور پلانٹ کی صلاحیت کے کم استعمال کی صورت میں مشکلات سے پر ثابت ہوں گے

اب یہ بات بڑے پیمانے پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ جہاں دیہی آبادی کی توانائی کو پورا کرنے کے لئے بائیو گیس اور ایسی دوسری تکنالوجیوں کے شعبے میں خاص کوششیں جاری رہنی چاہئیں وہاں اب یہ ضروری ہے کہ پسماندہ [illegible] علاقوں میں توانائی ضروریات کے پروگرام کو شروع کیا جائے۔ اس پروگرام میں سماجی جنگل بانی، بائیو گیس، چولھے، شمسی توانائی، ہوا سے توانائی اور انسانی کے مقامی طور پر دستیاب دیگر وسیلے [illegible] تاکہ گاؤں کے لوگوں کی توانائی کی تمام ضروریات پوری کی جا سکیں۔

2001 تک ملک میں 25 کروڑ ایک لاکھ 70 ہزار ٹن کوئلے کے برابر [illegible] پیدا کرنے یا غیر روایتی توانائی کے وسیلوں کے ذریعہ اس کے برابر دوسری توانائی کی بچت [illegible] حاصل کرنے کی تجویز ہے۔ اس میں 15 ہزار میگا واٹ بجلی کی پیداوار بھی شامل [illegible] درج ذیل اسباب کو دیکھتے ہوئے یہ نشانہ حاصل کرنا ممکن اور قابل عمل ہے

بائیو ماس کی صلاحیت | ہزار میگاواٹ [illegible] صرف بائیو ماس سے

ملک میں ہر سال جو بائیوماس پیدا ہوتا ہے اس کا اندازہ 2490 ملین ٹن کا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک ہزار ہیکٹیر زمین سے 5 میگاواٹ بجلی تیار کی جا سکتی ہے۔ اس لئے توانائی کے لئے نباتات کی کاشت کے ساتھ ساتھ بجلی تیار کرنے والے پلانٹ بھی قائم کیے جائیں گے جو بجلی کے لئے گیس تیار کریں گے اور دیہی توانائی کے لیے مربوط پروجیکٹ چلائے جائیں گے جہاں سے ایندھن کی لکڑی اور [illegible] دستیاب ہوں گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف گنے سے حاصل ہونے والے فضلے سے 2000 میگاواٹ بجلی تیار کی جا سکتی ہے۔ گنے، چاول، [illegible] اور ایسی دوسری فصلوں سے جو زرعی فضلہ حاصل ہوگا اس کی بنیاد پر گیس تیار کرنے والے بائیوماس سے بھی بجلی حاصل ہوگی جو نئی ٹیکنالوجی سے بہت کم خرچ پر تیار کی جا سکے گی۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ 6000 میگاواٹ بجلی بائیوماس سے تیار کی جائے گی۔ اگر 25 لاکھ ہیکٹیر رقبے میں توانائی کے لئے درکار نباتات کی کاشت کی جائے تو اس سے براہ راست توانائی کی پیداوار میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوگا۔

ملک کے تقریباً 12 کروڑ 15 لاکھ دیہی گھروں میں سے ایک کروڑ 60 لاکھ سے لے کر دو کروڑ 20 لاکھ گھر اپنی توانائی کی ضروریات بائیوماس سے پوری کر سکتے ہیں۔ ہر گھر کے لئے ہر روز اوسطاً 4 مکعب میٹر گیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ 2001 تک ملک بھر میں ایک کروڑ 20 لاکھ بائیو گیس پلانٹ لگانے کی تجویز ہے۔ ان میں اجتماعی اور ادارہ جاتی پلانٹ بھی شامل ہیں۔

ملک کے بڑے دریاؤں کے کناروں پر واقع تمام بڑے شہروں میں اور قصبوں میں گندے پانی کی صفائی کے پلانٹ لگانے کی تجویز ہے جن کے ساتھ توانائی پیدا کرنے والے یونٹ بھی لگائے جائیں گے۔ ملک میں اس وقت نو میٹروپالیٹن شہر اور 67 دیگر شہر ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ 2001 تک میٹروپالیٹن قصبوں اور کچھ بڑے شہروں میں گندے پانی سے 50 میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی تجویز ہے۔

شمسی توانائی کے شعبے میں حالیہ ترقی سے پتہ چلا ہے کہ اس ذریعے سے میگاواٹ بجلی کے کارخانے چلانا ممکن ہے۔ آئندہ کچھ برسوں میں ٹیکنالوجی میں مزید ترقی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ سورج کی گرمی سے تیار ہونے والی بجلی اگر روایتی ذرائع سے حاصل ہونے والی بجلی سے سستی نہیں ہوگی تو قیمت کے لحاظ سے مہنگی بھی نہیں ہوگی۔

محکمے نے سورج کی گرمی سے 30 میگاواٹ بجلی تیار کرنے والے پلانٹ کا خاکہ تیار کر لیا ہے۔ اس قسم کے بجلی گھر راجستھان اور کچھ دوسرے علاقوں میں لگائے جا رہے ہیں۔

زیادہ بجلی تیار کرنے کی صلاحیت کے شمسی حرارتی بجلی گھروں کی بجلی پر لاگت ڈیزل سے چلنے والے بجلی گھروں سے زیادہ نہیں ہے ۔

شمسی فوٹو وولٹیکس کے شعبے میں تیکنالوجی کی ترقی سے لاگت کم ہونے کی توقع ہے ۔ اعلیٰ نوعیت سولر سیل تیکنالوجی اور باریک شمسی سیلوں کی ترقی سے یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ آئندہ کچھ برسوں میں بجلی تیار کرنے کے یہ ذرائع بھی قابل عمل ہو جائیں گے ۔

پھر سے استعمال ہونے والی توانائی کی ترقی کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے گا جو دیہی اور شہری علاقوں میں غیر روایتی توانائی کے بہت سے نظاموں اور پراجیکٹوں کے لئے کم شرح سود کے قرضوں کے ذریعہ سرمایہ مہیا کرے گا ۔

بینکوں اور دیگر سرمایہ کار اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ کم شرح سود کے قرضوں کے ذریعہ صنعتوں اور نجی افراد کی مالی امداد کریں تاکہ وہ توانائی کی بچت اور تیاری کے لئے غیر روایتی توانائی کے نظاموں اور آلات کو استعمال کریں یا انھیں تیار کریں ۔

بات پر زور دیا کہ اردو کسی مخصوص علاقہ کی زبان نہیں ۔ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو کرناٹک میں کنڑا اور بنگال میں بنگلہ کی طرح اس کا بھی اپنا اسٹیٹ ہوتا ۔ اس لئے اردو کو ہم کسی ایک خول میں بند کر کے نہیں دیکھ سکتے ۔ یہ ہمارے ملک کی زبان ہے ۔ اس سچائی کو ہمیں قبول کر لینا چاہیئے ۔

اس تمہیدی مذاکرہ میں طے پایا کہ اس موضوع پر ایک وسیع ہمہ جہتی اور زیادہ نمائندہ سمینار کرنا بہتر ہوگا ۔ اس کے لئے اکتوبر نومبر کی تاریخیں تجویز کی گئیں ۔

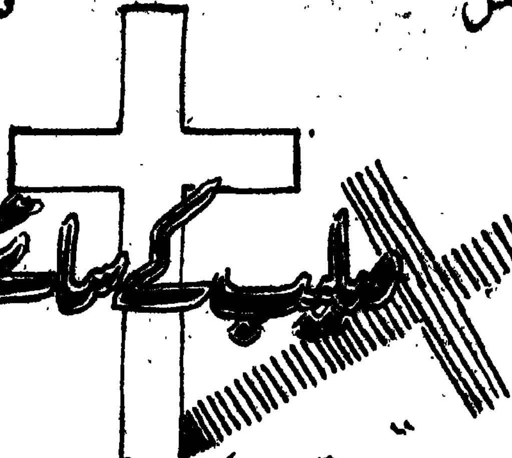
ہی دیر میں ترکی تیر اندازوں نے انھیں بھس کی طرح اڑا کر رکھ دیا ۔ رات کا فائدہ اٹھا کر سینٹ جائلس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ۔ ہزاروں فرنگی عورتیں قید ہو کر ایشیائی حرم سراؤں میں پہنچ گئیں ۔

لیکن مزدلفان کا معرکہ سر ہوا ہی تھا کہ خبر آئی کہ ایک بڑی فرنگی فوج ایشیائے کوچک میں دور تک بڑھ آئی ہے ۔ اس مرتبہ ان کا رخ جنوب کی طرف تھا ۔ لیکن جلد ہی ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ۔ ایشیائے کوچک کی بے آب و گیاہ تپتی ہوئی پہاڑیاں ان کا قبرستان بن گئیں اتنے میں قلج ارسلان اپنی فوج کے ساتھ آ پہنچا اور فرنگیوں کو کاٹ کر رکھ دیا ۔ فرنگیوں کی ایک تیسری فوج کا بھی یہی حشر ہوا ۔

(باقی آئندہ)

امین مالوف / قاضی جلیل احمد

مسلسل قسط ۱۱



صلیب کے سائے میں

باب دوم قبضہ و استحکام ۱۱۰۰ء — ۱۱۲۸ء

ہمیشہ یوں ہی ہوا کرتا تھا کہ فرنگی جب ایک قلعہ لے لیتے تو دوسرے پر حملہ کر دیتے تھے ان کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ سارا شام ان کے زیر تسلط آ گیا اور مسلمانوں کو انہوں نے ملک سے نکال باہر کیا

فخر الملک ابن عمار
والی طرابلس

طرابلس کے دو ہزار دن "

اتنی ساری شکستوں، مایوسیوں اور ناکامیوں کے بعد ۱۱۰۰ء کے موسم گرما میں اہل دمشق کو خوشخبریاں ملیں جن سے اُن کے دل میں ایک بار پھر امید کی کرن پھوٹی اور دمشق کے بازاروں میں تل بروکیڈ اور مسلن کے بیوپاری کا ناپوسی میں ایک دوسرے کو خوش خبریاں سنانے لگے۔

ان میں پہلی خوشخبری جو جولائی کے اوائل میں ملی یہ تھی کہ سینٹ جائیلس جس کی ترپیولی میں ہمارے وسطی شام کو فتح کرنے کی آرزو کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی، اپنے فرنگی کمانڈروں سے اختلافات کی وجہ سے اچانک قسطنطنیہ چلا گیا تھا۔

اسی ماہ جولائی کے آخر میں دوسری خبر جو پہلی سے بھی زیادہ عجیب اور دل خوش کن تھی یہ تھی کہ ایکڑ کے محاصرہ کے دوران ایک تیر سے زخمی ہو کر یروشلم کا حاکم گاڈفری ہلاک ہو گیا (ابن قلانسی)

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اسے زہر آلود تیر کھلا کر ہلاک کیا گیا اور یہ عمل ایک [illegible]
نے اسے پیش کیے تھے۔ ایک اطلاع یہ تھی کہ وہ ایک وبا کا شکار ہو کر ہلاک ہوگیا
کی اطلاع نے قبولیت عام حاصل کی۔ یروشلم کی فتح کے ایک سال کے اندر فرنگیوں کا
بات کی پیش گوئی نہیں کرتی کہ حالات بدل رہے تھے۔

اس قیاس آرائی کو اس خبر سے اور بھی تقویت ملی کہ فرنگیوں میں سب سے زیادہ
بوہیمنڈ ایک معرکے میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کو گرفتار کرنے والا دانشمند تھا۔ دانشمند
شہر ملاطیہ پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ خبر سنتے ہی بوہیمنڈ اپنے آدمیوں کو [illegible]
کی مدد کے لئے روانہ ہوا۔ بوہیمنڈ کا یہ فعل ناعاقبت اندیشانہ تھا کیونکہ ملاطیہ پہنچنے کے
دشوار گزار پہاڑی علاقے سے ایک مہینے کی مسافت طے کرنی پڑتی اور یہ سب [illegible]
قبضے میں تھا۔ دانشمند کو جب بوہیمنڈ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے کمین لگا
اور اس کے پانسو ساتھی نائٹس کمین گاہ کے قریب پہنچے تو ان پر تیروں کی بارش برسا
اتنا تنگ تھا کہ فرنگی نائٹوں کے گھوڑے آزادی سے پوزیشن بھی تبدیل نہیں کر سکتے
نائٹس ہلاک ہو گئے اور خدا نے مسلمانوں کو بڑی فتح دی اور بوہیمنڈ گرفتار ہو کر قید
لکھتا ہے۔ بوہیمنڈ کو گرفتار کر کے اس کے کئی ساتھیوں کے ساتھ اناطولیہ میں نکسر کے
زنجیروں [illegible] روانہ کر دیا گیا۔

فرنگی حملہ آوروں کے تین بڑے لیڈروں کے یکے بعد دیگرے شام سے بے خبر
اطلاع پا کر مسلمانوں نے سمجھا کہ ان کے دن پلٹنے والے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو فرنگی ناقابل
شکست ہونے کے دل سے قائل ہو چکے تھے اپنا خیال بدلنے لگے۔ کیا اب وقت نہیں آگیا
ایک کاری ضرب لگائی جائے۔ ایسا سمجھنے والوں میں کم از کم ایک شخص تھا جس کا نام [illegible]
اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کوئی بڑا حامی دین اور مجاہد اسلام تھا۔ بلکہ اللغازی کے [illegible]
ایسی طرح سے واضح ہو گیا تھا کہ وہ کتنا مطلبی اور خود غرض ہے۔ اس کے علاوہ ۱۱ [illegible]
پہلے اسے جہاد کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ گوران کے علاقہ کا ایک بدو
اس سے شکایت کرتا رہا کہ فرنگی اس کے علاقے میں لوٹ کھسوٹ مچا رہے ہیں
ان فرنگیوں کی اس لوٹ کھسوٹ کا کوئی سدباب ہونا چاہئے۔ ایک دن جب
اس کا دست راست [illegible] لوٹ کھسوٹ کی ایک ایسی ہی مہم سے لوٹ رہے تھے [illegible]
[illegible]

اس لئے بدلہ لینے کے لئے بالدون نے دمشق پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور اس کے لشکر نے بڑی بے اکثر کی اور سارے مضافات دمشق کو تباہ اور ویران کر کے رکھ دیا۔ اس اچانک حملے سے طغتگین اتنا خائف ہو گیا کہ اس نے ٹریجرڈ کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ٹریجرڈ کو ایک خطیر رقم بطور تاوان ادا کرنے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن دکاک کی کمزوری کو محسوس کر کے ٹریجرڈ اور بھی شیر ہو گیا اور اس نے صلح کی اس پیشکش پر کوئی توجہ نہیں دی اور چھ افراد پر مشتمل جو ڈیلیگیشن اس سے ملنے آیا تھا اس سے کہا کہ یا تو دکاک عیسائیت قبول کر لے یا دمشق اس کے حوالے کر دے۔ اس جواب سے دکاک بھی مشتعل ہو گیا اور اس نے عیسائی سفیروں کو قتل کر دیا۔

اس واقعہ کی خبر جوں ہی گاڈفری کو ملی وہ فوج لے کر ٹریجرڈ کی مدد کو چل پڑا اور دونوں نے مل کر حوالی دمشق کی تباہی میں جو کچھ بھی کسر رہ گئی تھی وہ پوری کر دی۔ دکاک قلعہ دمشق میں بیٹھا اپنے علاقے کی تباہی دیکھتا رہا اور امید کرتا رہا کہ یہ طوفان بالآخر سر سے گزر جائے گا اور حملہ آور بالآخر اپنے علاقوں کو لوٹ جائیں گے۔ لیکن حکمران کی اس بے عملی سے دمشق کے لوگوں کی ناراضی دکاک کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی ـــ اور اسے صورت حال پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا ہی پڑا۔ لوگ عموماً ترک سپاہیوں کی نااہلی اور بزدلی سے سخت نالاں اور ناراض تھے کہ زمانہ امن میں تو وہ سڑکوں پر بیٹھے یا اینٹھتے اکڑتے پھرتے تھے لیکن شہر کے پھاٹک پر جوں ہی دشمن نمودار ہوتا تو وہ خوف زدہ چوہے کی طرح بل میں دبک رہتے۔ دکاک رعایا میں ایک بار پھر سرخروئی حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ عملی قدم اٹھانا چاہتا تھا اور فوری۔

اس لئے گاڈفری کی موت کی خبر سن کر اسے بہت خوشی اور اطمینان حاصل ہوا اور بوہیمنڈ کی گرفتاری سے اسے اور بھی زیادہ ڈھارس ملی۔ ماہ اکتوبر ۱۱۰۰ء میں دکاک کو اپنا بدلہ چکانے کا موقع ملا۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ گاڈفری کی موت کی اطلاع پا کر اس کا بھائی کاؤنٹ بالڈون والی ایڈیسہ پانچسو نائٹوں اور پیادہ سپاہیوں کو لے کر یروشلم کو روانہ ہوا۔ اس کے گزرنے کی اطلاع پا کر دکاک اس کے مقابلے کے لئے دمشق سے روانہ ہوا۔ بیروت کے قریب دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ بالڈون ایک بے اصولا اور ظالم سردار تھا جیسا کہ اپنے محسن اور باپ کے ساتھ اس کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک چالاک اور بہادر سپاہی بھی تھا اور اگر یروشلم پر اسے قبضہ کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو وہ دمشق کے لئے سخت مہلک خطرہ بن سکتا تھا۔ اگر دکاک کاؤنٹ بالڈون کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ [illegible] خطرہ [illegible] سدباب ہو جاتا۔ اس مہم کے لئے [illegible]

کاؤنٹ بالڈون شمال سے ساحل ساحل بڑھتا ہوا جنوب کی طرف آرہا تھا۔ امیدیہ تھی کہ جب تک اس کے بیروت پہنچنے کی امید تھی۔ بیروت پہنچنے سے پہلے اسے نہر الکلب کو عبور کرنا تھا اور نہر الکلب کا جنوبی حصہ مصر کی عملداری میں تھا۔ نہر الکلب کا دہانہ ایک پہاڑ تھا جہاں راستہ بہت تنگ ہوجاتا تھا۔ دکاک نے اپنے آدمیوں کو ان ہی گھاٹیوں میں روپوش کردیا تھا اور بالڈون کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے جاسوس دشمن کی پیش قدمی کی اسے مسلسل اطلاع دیتے رہے۔

نہر الکلب ہمیشہ ہی سے جھگڑے کی جھونپڑی بنی رہی تھی اور جب بھی کوئی فاتح اس راستے کامیابی سے گزر جاتا تو اس کی سنگی چٹانوں پر اپنا کارنامہ تحریر کرنا نہ بھولتا۔ لہٰذا رعمسیس اور بخت النصر سے لے کر رومن شاہ سپٹی مس تک سبھی فاتحین کے کارنامے ان سنگی چٹانوں پر دکھائی دیتے تھے۔ لیکن ان چند فتح مندوں کو چھوڑ بے شمار جیالے اور بہادر ایسے بھی تھے اس علاقے سے فاتحانہ گزرنا نصیب نہ ہوا۔ ان کے کارنامے سنگی چٹانوں پر نہیں تھے۔ ان کی اس ساری وادی میں بکھری ہوئی تھیں اور دکاک کو یقین تھا کہ بالڈون کے ناٹوں کی ہڈیاں انہی بے شمار ہڈیوں میں شامل ہو جائیں گی۔ اور دکاک کی اس رجائیت کی کافی وجہ موجود اس کی فوج فرنگی کمانڈر کے مقابلے میں چھ سات گنا زیادہ تھی اور پھر اچانک حملہ کا جو فائدہ ہو سکتا تھا اسے حاصل تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی پچھلی بے عزتیوں کا بدلہ لے گا اور ... کے امیروں میں اسے پھر اعلیٰ مقام اور مرتبہ حاصل ہو جائے گا اور وہ پھر سے وہی اقتدار حاصل ... گا جو فرنگ کی آمد سے اس سے چھن گیا تھا۔

تریپولی کا حاکم قاضی فخر الملک جو ایک سال قبل اپنے بھائی جلال الملک کا جانشین قرار دیا گیا تھا۔ بالڈون اور دکاک کی جنگ کا نتیجہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دکاک ... عرصے سے تریپولی پر لگی ہوئی ہیں اور بالڈون کی شکست کی صورت میں تریپولی پر دکاک کا یقینی ہے بصورت دیگر اسے دکاک کی بالادستی قبول کرنی پڑے گی جس کا نتیجہ کسی طرح ... کے لئے خوش گوار نہیں ہو سکتا تھا۔

فخر الملک کو کوئی چیز اپنی بقا کی کوشش سے روکنے والی نہ تھی۔ جب اسے بالڈون کے تریپولی کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی تو اس نے قیمتی تحفے تحائف سامان رسد وغیرہ اس کی خدمت میں روانہ کئے اور اس نے ایک سفیر کو اس ہدایت سے روانہ کیا کہ وہ بالڈون سے تنہا ملاقات کی کوشش کرنے اور تنہائی میں اسے دکاک کے منصوبے سے آگاہ کرے۔ یہاں ...

اس نے بالڈون کو دکاک کی فوجی طاقت اور پوشیدہ مقامات کی بھی نشاندہی کی اور اسے اس کا مقابلہ کرنے کی تدابیر بھی بتائیں۔ بالڈون نے قاضی تریپولی کا شکریہ ادا کیا اور نہر الکلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ دکاک اپنے تیر اندازوں کے ساتھ نہر الکلب کے پہاڑی راستوں میں فرنگیوں کی گھات لگائے بیٹھا تھا اور اسے فخر الملک بالڈون سے سازش کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ اسے آخر تک دھوکے میں رکھنے کے لئے فرنگی بھی مقررہ راستے سے جونیہ کے قصبے تک بڑھتے آئے اور دکاک کو یقین ہو گیا کہ کوئی دم جاتا ہے کہ فرنگی اس کے تیروں کا نشانہ بن جائیں گے۔ لیکن جونیہ کے بعد اچانک انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ دکاک دشمن کو یوں اپنے بچھائے ہوئے جال سے پلٹتے دیکھ کر حیرت میں آیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہئیے۔ اس کے امیروں نے اسے فرنگیوں پر حملے کا مشورہ دیا لیکن اس نے صرف چند تیر اندازوں کو تیر چلانے کا حکم دے کر پھر خاموشی اختیار کی اور دشمن کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکاک کی فوج میں بددلی کے آثار پیدا ہونے لگے ترک اور عرب سپاہی ایک دوسرے کو بزدلی کا طعنہ دینے لگے اور مسلم فوج کا حوصلہ پست ہو گیا۔ صبح تک مسلم فوج لبنان کی پہاڑیوں میں پسپا ہو آئی اور بالڈون کے ساتھی اطمینان سے نہر الکلب کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

قاضی تریپولی نے قصداً فرنگیوں کی مدد کی تھی یہ سمجھ کر کہ تریپولی کا خطرہ فرنگیوں سے نہیں بلکہ دکاک سے ہے جیسا کہ خود دکاک نے بھی دو سال پہلے قرنونا کے ساتھ کیا تھا۔ دوسری مرتبہ فرنگی خطرہ کو کمتر سمجھا گیا تھا۔ لیکن یہی خطرہ تیزی سے پھیلتا گیا۔ نہر الکلب کے واقعہ کے ۳ ہفتے کے اندر بالڈون نے اپنے یروشلم کا حاکم ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر اطراف واکناف کے علاقوں کی فتح کی تدبیروں میں مصروف ہو گیا۔ ایک صدی کے بعد جب ابن الاثیر نے ان تاریخی حادثات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے ال بردویل (بالڈون) ہی کو فتح مشرق کے لئے فرنگیوں کو اکسانے والا قرار دیا۔ اس کے نزدیک بالڈون سارے فرنگیوں کا سردار تھا اور اس میں کچھ بہت غلط بھی نہ تھا کیونکہ گویہ نائٹ (بالڈون) بہت سے فرنگی سرداروں میں ایک تھا جو اس حملے Invasion میں شریک تھے۔ لیکن عرب کی منتشر طاقت کے مقابلے میں فرنگی ایک متحدہ محاذ کی صورت دکھائی دیتے تھے۔

لیکن مسلمانوں کے پاس ابھی حکم کا ایک پتہ باقی تھا۔ ان کی عددی طاقت فرنگیوں سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ یروشلم کی تسخیر کے بعد اکثر فرنگی اپنے ملکوں کو واپس ہو چکے تھے۔ چنانچہ تخت نشینی کے وقت بالڈون کے ساتھ چند سو سے زیادہ نائٹس باقی نہ تھے۔

ملی بین خبر آنے لگیں کہ اس مرتبہ فرنگیوں کی پہلے سے کہیں بڑی فوج آ رہی ہے [illegible] جو قسطنطنیہ میں داخل ہوگی۔

اس خبر سے سب سے بڑے دانشمند اور قلیج ارسلان کو تشویش لاحق ہوئی جو [illegible] دوچار نہ کر پائے تھے۔ انہوں نے آپس میں سمجھوتہ کے ذریعہ فرنگیوں کا راستہ [illegible] کی ٹھانی تاکہ فرنگیوں کو ایشیائے کوچک میں مزید آگے بڑھنے سے روکا جا سکے۔ اڈیسہ و سے لیس پوری طرح فرنگیوں کے قبضے میں تھے لہٰذا ان دونوں نے ان سے دو گھات لگانے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ چنانچہ جنوب مشرقی اناطولیہ کے راستے میں جتنے آب تھے ان کو مسموم کر دیا گیا۔

مئی ۱۱۰۱ء میں سلطان کو پتہ چلا کہ فرنگیوں کی ایک لاکھ فوج آبنائے باسفورس کو قسطنطنیہ میں داخل ہوگئی ہے اس مہم کا سردار سینٹ جائلس ہے جو اس وقت قسطنطنیہ مقیم تھا۔ سلطان نے نہایت احتیاط کے ساتھ فرنگی فوجوں کی پیش قدمی کی نگرانی شروع کی تاکہ موقعہ اور مقام دیکھ کر ان پر حملہ کیا جا سکے۔ سمجھا جاتا تھا کہ پہلا مقام اس فوج کے راستے میں نکائیہ ہوگا۔ لیکن فرنگیوں نے نکائیہ کا رخ نہیں کیا نہ بحیرہ مرمرہ یا قسطنطنیہ ہی میں ان کی آمد کی مصدقہ اطلاع وصول ہوئی۔ قلیج ارسلان حیران تھا کہ فرنگی فوج کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ایک دن اچانک یہ اطلاع ملی کہ فرنگی فوجیں انقرہ کی دیواروں کے نیچے پہنچ چکی ہیں۔ کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ فرنگی یوں چپ چاپ ایک ترک قلمرو کے وسط میں سے گزرتے ہوئے ان کے بیچ و بیچ ایک شہر تک پہنچ جائیں گے اور سلطان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔ سلطان کے انقرہ کی مدد کو پہنچنے سے پہلے ہی فرنگیوں نے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور قلیج ارسلان کو چار سال پہلے کا زمانہ یاد آ گیا لیکن یہ وقت صرف افسوس کرنے کا نہیں تھا کیونکہ فرنگیوں کے اس حملہ نے اس کے سارے قلمرو کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ لہٰذا اس نے جنوب کی طرف پھر کمین لگائی لیکن فرنگیوں نے جنوب کے بجائے شمال مشرق کا رخ کیا۔ اب پتہ چلا کہ ان کا مقصد نکسر NiKsar کو فتح کر کے انطاکیہ کے والی بوہیمنڈ کو چھڑانا تھا۔

فرنگیوں کے اس نئے اقدام پر سلطان کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ خوشی اس کی کہ وہ اب بہتر مقام پر دشمن کی گھات لگا سکتا تھا چنانچہ اس نے مرزیفان کے مقام پر گھات لگائی۔ بالآخر فرنگی فوج مرزیفان کے قریب دکھائی دی۔ تعداد میں یہ لوگ زیادہ نہ تھے جو تھے وہ پیادوں کا ایک غول جس میں لڑنے والے کم اور عورتیں اور بچے زیادہ تھے۔ چنا

بوربچہ یا تیندوا



اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بوربچہ اور تیندوے میں کیا فرق ہے۔ بعض لوگ چیتے کو بھی اس سے مخلوط کرتے ہیں۔ چیتا تو ایک جداگانہ نسل کا جانور ہے جس کو ہم بعد میں لیں گے۔ بوربچہ اور تیندوے کے متعلق تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے بجز اس کے کہ بڑے بوربچہ کو عموماً تیندوے سے موسوم کرتے ہیں اور موٹے کو بوربچہ کہتے ہیں۔ مشہور شکاری اسٹرنڈیل بوربچہ اور تیندوے کے حسب ذیل خصوصیات ظاہر کرتے ہیں۔

بوربچہ	تیندوا
۱) سائز چھوٹا ۴½ تا ۶ فٹ	(۱) سائز بڑا (۶½ تا ۸½ فٹ)
۲) سر کی ساخت گول	(۲) سر کی ساخت لمبی شیر سے ملتی جلتی
۳) جسم پر بال زیادہ لمبے جس کی وجہ سے حلقے زیادہ واضح نہیں ہوتے۔	(۳) بال کم لمبے اور حلقے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔
۴) دم بلحاظ جسامت زیادہ لمبی ہوتی ہے	(۴) دم بلحاظ جسامت کم لمبی ہوتی ہے۔
۵) ریڑھ کی ہڈی کے منکوں کی تعداد (۲۱) ہوتی ہے۔	(۵) ریڑھ کی ہڈی کے منکوں کی تعداد (۲۲) ہوتی ہے
۶) زیادہ خبیث آبادی کے قریب رہنے والا	(۶) زیادہ تر جنگل میں رہنے والا [illegible]

عادات و اطوار، جسم کی ساخت، غذا، شکار مارنے کا طریقہ، رنگ روپ میں کوئی بنیادی فرق بوربچے اور تیندوے میں نہیں ہے۔ البتہ مختلف مقامات کی آب و ہوا اور جنگل کی وجہ سے ان کے رنگ کی گہرائی، جسامت، جسم پر نشانات جن کا اصطلاحاً

گل کچھا ان کے سائز اور درمیانی فاصلے اور وضع میں تھوڑا تھوڑا فرق ہو
بعض کا رنگ ہلکا زرد اور بعض کا گہرا یا سرخی مائل زرد ہوتا ہے۔ گل بعض
قریب اور چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور بعض کے بڑے بڑے اور دور دور ہوتے ہیں
مرہٹواڑی کے لوزبچوں کے گل بڑے اور دور دور پائے جاتے ہیں۔ تلنگانہ کے
لوزبچوں کے گل دور دور اور بڑے سائز کے ہوتے ہیں اور چھوٹے قد کے لوزبچوں
عموماً قریب اور چھوٹے ہوتے ہیں مگر بعض کافی بڑے لوزبچوں کے گل بھی قریب اور چھوٹے
میں آئے ہیں۔ بعض کے جسم اور گردن پر بال بہت چھوٹے اور بعض کے نسبتاً بڑے
ہیں۔ کھال بھی بعض کی موٹی اور بعض کی کم موٹی ہوتی ہے۔ مگر عموماً شیر کی کھال سے ز
ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا لوزبچہ آٹھ فٹ یا انتہا ساڑھے آٹھ فٹ ہوتا ہے۔ (۷½) ف
بھی چھوٹا شیرنی کے برابر ہوتا ہے مسٹر برینڈر نے بڑے سے بڑا لوزبچہ ۷ فٹ ۹ ا
بعض شکاری اس سے بہت زیادہ بڑے اعداد بھی دیتے ہیں۔ مسٹر شکسپیر ۸ فٹ
لوزبچہ بیان کرتے ہیں۔

کشمیر میں کہا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا لوزبچہ ۹ فٹ ایک انچ کا مارا گیا اور ایک
(۵½) انچ کا مارا گیا۔ مہاراجہ کوچ بہار نے ایک ۸ فٹ ۴ انچ کا لوزبچہ مارا۔ ایک
کے لوزبچہ کا وزن (۱۶۰) پونڈ بلندی ۲ فٹ ۱۱ انچ دی گئی ہے۔ اس کی دم بھی بہ نسبت
کے زیادہ لمبی اور (۲۸) سے (۳۸) انچ تک ہوتی ہے۔ وزن (۶۰ - ۷۰) پونڈ سے ا
تک ہوتا ہے۔ آبادی کے قریب رہنے اور گھروں میں گھسنے والے لوزبچے عموماً چھوٹے ہو
میں نے صرف پلے ہوئے سیاہ لوزبچے دیکھے ہیں۔ اس کی آواز بہ نسبت دیگر لوزبچوں کے
اور مہیب ہوتی ہے۔ ایک دفعہ نظام آباد میں سرکس پارٹی میرے سکونتی مکان کے عقب
اتری۔ اس میں علاوہ اور جانوروں کے ایک سیاہ لوزبچہ بھی تھا۔ یہ رات کو اکثر
اس کی آواز گھیرے مشابہ ہوتی تھی جس میں آخری (ک) بہت لمبی کھینچتی تھی ا
پوری لمبان میں آواز کا ایک خاص اتار چڑھاؤ ہوتا تھا جس میں ایک قسم کا بھیانک
سیاہ لوزبچہ، لوزبچہ کی کوئی علٰحدہ قسم نہیں ہے۔ بعض دفعہ معمولی لوزبچوں کے بچوں
میں ایک سیاہ پیدا ہوتا ہے۔ سیاہ لوزبچی معمولی رنگ کے لوزبچے کے ساتھ سا
کرلیتی ہے۔ ایک دفعہ کلکتہ کے عجائب خانے میں ہم نے اسی قسم کی دوستی کا نظارہ
کشمیر میں سفید لوزبچے بھی ہوتے ہیں۔ ان کو (Snow Leopard) کہتے ہیں۔

زیادہ چیتے اور سفید رنگ پر سیاہ دھبے اور ان کے اطراف نیلے بھورے ابھرے ہوئے دھبے ہیں جو نہایت خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ علم بوڑھوں سے پوچھا ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا ۲ فٹ کا ہوتا ہے۔

تیندوا اور چیتے کا فرق: چیتہ ایک جداگانہ نسل کا جانور ہے۔ اس کے جسم کی ساخت بہت سبک ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں لمبے لمبے اور کمر پتلی ہوتی ہے۔ سر گول اور دونوں آنکھوں کے پاس نیچے تک سیاہ دھاری ہوتی ہے۔ رنگ صندلی یا زیادہ صحیح طور پر سنہری یعنی سونے کا سا ہوتا ہے اس پر سیاہ دھبے ہوتے ہیں۔ یہ دھبے تیندوے کے جسم کے سیاہ گل یا حلقوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تیندوے کے گل کے بیچ بیچ اندر رنگ کا حصہ ہوتا ہے اور چیتے کے جسم پر سیاہی کا سا دھبہ ہوتا ہے۔ اس کی دم پر بھی سیاہ دھبے ہوتے ہیں اور آخر میں نوک کے پاس دو تین حلقے ہوتے ہیں اور آخری نوک ہمیشہ صندلی ہوا کرتی ہے۔ بخلاف بلی کی نسل کے دوسرے جانوروں کے اس کے پنجے کسی قدر کتے کے مانند ہوتے ہیں یعنی ناخن زیادہ تر باہر نکلے ہوئے اور کسی قدر خول کے اندر رہتے ہیں (Semi Retractile) تیندوا یا شیر کی طرح خول کے اندر پوری طرح بند نہیں ہو جاتے۔ پاؤں کے نیچے کی گدیاں بہ نسبت تیندوے کے سخت ہوتی ہیں تاکہ بھاگنے میں زمین پر پاؤں اچھی طرح جم سکے۔ اس کی دوڑ بہت تیز ہوتی ہے۔ دنیا کے سب جانوروں میں اس کی رفتار تیز تر قرار دی گئی ہے جو ۷۰ میل فی گھنٹہ سے زیادہ تک پہنچتی ہے۔ مگر یہ تھوڑی ہی دور تک برقرار رہتی ہے۔ یہ عموماً سو دو سو گز سے زیادہ اس رفتار سے نہیں دوڑتا۔ ہرن کو جو بقیہ تمام جانوروں میں تیز دوڑنے والا جانور ہے اور سو سوا سو گز کے اندر پکڑ لیتا ہے۔ عموماً جھنڈے میں سے کالے کو دیکھ کر چھپتا ہوا جا کر اچانک حملہ کرتا ہے۔ اگر ہرن پہلے ہی سے خبردار ہو کر بھاگ رہا ہو تو پھر نہیں ملتا برابر پہنچ کر پچھلے پاؤں کو اندر کی طرف مار کر گرا دیتا ہے اور پھر گلا پکڑ لیتا ہے اور ایک پاؤں سینگ پر رکھ دیتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہوا کا رخ دیکھ کر شکار پر حملہ کرتا ہے۔ جدھر سے اس کی ہوا شکار پر نہ جانے پائے۔ نہ معلوم یہ کس حد تک صحیح ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر ممکنہ آڑ اور زمین کے ہر نشیب و فراز سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ چیتے کے جسم کا طول ۷ فٹ تک اور اونچائی (۳۲-۳۴) انچ ہوتی ہے۔ دم (۳۰) انچ تک لمبی ہوتی ہے۔ وزن (۶۰-۷۵) پونڈ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چیتا انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ گھیر لیا جائے تو کچھ یوں ہی سے بے معنی حملے کرتا ہے۔ جنگل میں یہ صرف چھوٹے جانور

جنگلی بکری، بھیڑیں یا مادہ چیتل مار کر کھاتا ہے۔ بندر کو بھی کھا جاتا
سدھا کر اس سے ہرن کے شکار کا کام لیا جاتا ہے۔ پاردی اس کو پھاند
میں۔ چیتے صبح اکثر اپنے بلوں کے کسی خاص مقام پر کھیلتے اور
ہو جاتے ہیں۔ اس کا پتہ لگا کر پاردی وہاں تانت کے پھندے لگا کر
بیٹھ جاتے ہیں۔ چیتے بھاگتے ہوئے آکر پھاند میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کے
کمبل لے کر ان پر پہنچ جاتے ہیں اور کمبل ڈال کر رسیوں سے باندھ دیتے
میں پاردیوں کو کچھ زخم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اگر دیر کی جائے تو چیتے نکل بھا
اس کو سدھانے کا منظر بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور
میں رسیاں باندھ کر گویا بالکل جکڑ دیتے ہیں۔ پھر شکاری کمبل اوڑھ کر د
کی طرف بھاگتے ہوئے آتے ہیں اور خاص قسم کی آواز نکالتے ہیں۔ چیتے کے منہ سے
پہنچ جاتے ہیں۔ چیتہ پھنکارتا اور دانت نکالتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ آدمی کی
اس کو عادت ہو جاتی ہے۔ چھ مہینے میں یہ ٹریننگ ختم ہو جاتی ہے۔ اکثر صرف
رسی یا زنجیر بندھی ہوئی پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ سابق میں شوقین رئیس و راجہ
دیکھنے کیلئے چیتے ٹرین کروا کر رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی چیتہ کی سلیم
سرو نگر میں کبھی کبھی ان کا شکار کروایا جاتا تھا۔ چیتا اب ہمارے ملک کا باشندہ
بعض لوگ کہتے ہیں کہ عادل آباد کے بعض جنگلوں میں اب بھی ہے۔ مگر جن
چیتا اور لوزبچہ کا فرق سمجھنے والے شکاریوں سے دریافت کیا کسی کو چیتا
میں نظر نہیں آیا۔ گاؤں کے لوگ غلط فہمی سے لوزبچہ کو بھی چیتا کہہ دیتے ہیں
کہ کئی سال قبل چیتے عادل آباد میں بہ تعداد قلیل پائے جاتے تھے۔ میرے نا
بھی آج سے تقریباً ۶۵ سال قبل کا اپنا مشاہدہ چیتوں کی موجودگی کے متعلق بیا

لوزبچہ کی عادات و اطوار: بخلاف شیر کے لوزبچوں کا عموماً مستقل
لوزبچہ کا زمانہ حمل مثل شیر کے (۱۵) ہفتہ تک بیان کیا جاتا ہے بعض شکار
ہفتہ بھی لکھا ہے۔ دو یا چار بچے پیدا ہوتے ہیں۔ لوزبچہ اپنے بچوں کی
آدمی یا دوسرے جانوروں پر حملہ کر دیتی ہے۔ بہ نسبت شیرنی کے لوزبچہ
زیادہ محبت کرتی ہے۔ کبھی نر اور مادہ دونوں بچوں کی حفاظت میں حصہ
مسٹر شکسپیر لکھتے ہیں کہ لوزبچہ حملہ اور بچاؤ میں شیر سے بھی زیادہ باہمت

لوزبچہ بعض دفعہ بلاوجہ حملہ کرنے کے بھی واقعات سننے میں آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے موقعوں پر آدمی بے حس و حرکت کھڑا ہو جائے تو لوزبچہ اکثر و بیشتر قریب آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر پلٹ کر چلا جاتا ہے۔ اگر بھاگے تو مصیبت آئی۔ لوزبچہ کی ہمت کے متعلق متضاد واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی یہ بہادرانہ حملہ کرتا ہے۔ بڑا تیندوا بھی اپنے بڑے جسم کو بھی آسانی سے مار لیتا ہے جس پر شاید چھوٹی شیرنی بھی حملہ کا خیال نہ کرے اور کبھی کم ہمتی سے بھاگتا ہے۔ مسٹر ڈنبار برینڈر نے لکھا ہے کہ ایک لوزبچہ کو انھوں نے بڑے سینگوں والے مینڈھے کے سامنے سے بھاگتا دیکھا۔ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک لوزبچہ نے سانبھر کے بچے کو پکڑ لیا۔ مادہ سانبھر نے حملہ کیا۔ لوزبچہ اپنے شکار کو لے کر درخت پر چڑھ گیا۔ ماں نیچے سے حملہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لوزبچہ درخت پر آسانی چڑھ سکتا ہے۔ اور بعض دفعہ خصوصاً جہاں شیر زیادہ ہوں اپنا شکار بھی کسی گھنی جھاڑ پر چھپا رکھتا ہے۔ جنگلی کتوں سے یہ بھی بہت ڈرتا ہے اور فوراً درخت پر چڑھ جاتا ہے شیر اور مگرمچھ بھی اس کے خاص دشمن ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض شکاریوں کی تحقیق کے بموجب جن میں مسٹر ڈنبار برینڈر بھی شامل ہیں، لوزبچہ ترس سے بہت ڈرتا ہے۔ لوزبچہ کو اکثر اوقات گارے پر سے بھگا کر ترس اس کا شکار چھین لیتا ہے۔ حالانکہ ترس کے برابر بڑے کتے کو لوزبچہ با آسانی مار لیتا ہے۔ لوزبچہ، نیل، نر سانبھر، بڑے نر چیتل یا نر سور کے سوا باقی تمام جنگل کے جانوروں کو مارتا ہے۔ جنگلی مرغی، مور، گیدڑ اور سانپ، گرگٹ، کیکڑے تک کھا جاتا ہے۔ لوزبچہ اپنے شکار پر چھپ کر جھپٹ کر حملہ کرتا ہے۔ اگر جانور نے پہلے سے دیکھ لیا تو اکثر اوقات بلا حملہ کئے پلٹ کر چلا جاتا ہے۔ بڑے جانور کا یہ گلا پکڑ کر لٹک جاتا ہے۔ خون بہنے یا دم رکنے سے جانور مر جاتا ہے۔ بہتے ہوئے خون کو لوزبچہ چاٹ لیتا ہے۔ گلا پکڑنے کے علاوہ سامنے کے دونوں پنجوں سے بھی جسم کو پکڑنے اور ڈھکیل کر گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے مارے ہوئے جانور کو یہ سینے کی طرف سے کھانا شروع کرتا ہے۔ مگر بعض گھنے جنگل کے تیندوے شیر کی عادت اختیار کر لیتے ہیں اور پیچھے سے رانوں کے پاس سے کھانا شروع کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض شیرنی کی اولاد ہوتے ہیں جو بعض اوقات کسی بڑے تیندوے سے دوستی پیدا کر لیتی ہے۔ کرنل گلسفرڈ لکھتے ہیں کہ ایک لوزبچہ نے ایک دفعہ ایک موٹے بیل کی ناک کو بلڈاگ کتے کی طرح پکڑ لیا جب بیل گر گیا تو پیچھے کھینچ کر گلا اور پیٹ چاک کر دیا۔ اس طرح گلا پکڑنے کے بغیر بیل کو مار دیا۔ جانور اچھی

وقت لوز بچہ گردن نہیں بلکہ ہمیشہ گلو پکڑتا ہے۔
بعض شیر کے لوز بچہ یہاں میں بہت شاذ و نادر آتا ہے۔ تیندوے سے بر بہتر
کی سماعت و بصارت بہت قوی ہوتی ہے۔ قوت شامہ شیر سے زیادہ تیز ہوتی
بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کی سماعت شیر سے کسی قدر کم مگر بصارت زیادہ ہوتی ہے۔
میں ہندو دیکھنے والا غالب حس سماعت پھر بصارت ہے۔ لوز بچہ کا حس اول بصارت
اس کے شکار میں بہ نسبت شیر کے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہانکے میں لوز
سامنے آتا ہے۔ جہاں کہیں بیٹھا ہے دبکا بیٹھا رہتا ہے۔ قوت برداشت اور رضا
طبیعت کا خاصہ ہے۔ مصیبت کے وقت بھی یہ آواز نہیں نکالتا۔ اگر گھی کے اندر
نکالا جا سکے۔ بعض دفعہ درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور ہانکہ والے گزرنے کے بعد
اپنا راستہ لیتا ہے۔ لوز بچہ اور شیر کو دیکھ کر پرندے شور مچاتے ہیں جس سے اس کا
جاتا ہے۔ لوز بچہ عموماً مغرب کے وقت یا اس کے بعد (۹ - ۱۰) بجے تک پانی پینے آ
د(۱۲) ایک بجے رات کو آتا ہوا بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کبھی صبح کے (۴ سے ۵) بجے بھی
آبادی کے قریب رہنے والے لوز بچے اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی گاؤں میں آجاتے ہیں
دیکھے رہتے ہیں۔ بکروں کا منڈا کہیں رہتا ہو تو منڈے کے قریب لوز بچہ اندھ
ہی آکر منڈلاتا رہتا ہے۔ دھنگر دعوت دعات کرتے رہتے ہیں اور بھگا
تھوڑی دیر بعد پھر آجاتا ہے۔ یا تو دھنگر اس کو دیکھ کر اس کی موجودگی
ہو جاتے ہیں یا اندھیری رات میں یا کہیں دبکا ہوا ہو تو خود بکرے اس کے
دیتے ہیں۔ اگر یہ کہیں دور بھی ہوا اور جانور اس کی بو پا جائیں تو فوراً بے
ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ کئی دفعہ مجھے بکروں کی یہ حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔
میں مہتم شکار گاہ کی بکریوں کا منڈہ بڑے دلچسپ طریقے سے رکھا جاتا ہے۔ ا
درخت ہے۔ جس کے درمیان سے تاڑ کا درخت نکلا ہوا ہے یعنی نیچے تا
کا اندر دوسرے درخت کا تنہ بالکل ملا ہوا ہے۔ اس درخت کے نیچے منڈ
منڈے کے اطراف ایک کانٹے کا حصار پانچ فٹ اونچا لگایا گیا ہے۔ درخت کے
پر بیچوں بیچ جہاں سے تاڑ کا جھاڑ اوپر نکلا ہوا نظر آتا ہے تقریباً (۲۲-۱
بلندی پر لکڑیاں باندھ کر تقریباً مچان سا تیار کر دیا گیا ہے اور اس پر ہی آد
کے لئے بیٹھتا ہے اس کے علاوہ زمین پر بھی منڈے کے نزدیک دو تین دھ

عابدہ رخسانہ



انسان کے چہرے پر ناک جو عضو ہے جسے کہ ہم چہرے کی شمع کہا جاتا ہے۔ اگر ناک ستواں ہو تو چہرے کا حسن بڑھ جاتا ہے لیکن ہر چہرے پر ستواں ناک بھلا ہو یہ ممکن نہیں کیونکہ ناک کی بناوٹ چہرے کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اگر کھڑا چہرہ ہو تو اس پر ستواں ناک [illegible] ہوگی، بہرحال ناک کئی طرح کی ہوتی ہے۔ خوبصورت ناک، بھدی موٹی ناک، [illegible] ناک، لمبی ناک، ستواں ناک، ہیبتناک ناک، وحشتناک ناک، خوفناک ناک، [illegible] سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ناک ہی وہ واحد عضو ہے جو کسی انسان کی شخصیت کو حسین اور مکمل بناتا ہے۔ [illegible] اگر ناک ستواں نہ ہو تو کیا انسان کی شخصیت غیر متوازن ہو جاتی ہے؟ ان سوالوں کے جواب پانے کے لئے ہم کو سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ اصل شخصیت کس کو کہتے ہیں، اور کیا شخصیت کسی ایک عضو کی خوبصورتی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ شخصیت نام ہے ایک مکمل پیکر کا جس میں انسانی جسم کے تمام اعضاء شامل [illegible] کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کا چہرہ خوبصورت نہ بھی ہو تو اس کے باطن کی خوبصورتی اس کی شخصیت کو نکھار دیتی ہے اور [illegible] بھی بخشتی ہے لیکن اس کے برعکس اگر کسی فرد کا باطن برائی اور بدی کی [illegible] سے [illegible] اس کی شخصیت غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ اس طرح کسی فرد کے چہرے پر ناک [illegible] ستواں [illegible] ستواں ناک [illegible] [illegible] غیر [illegible] کے داغ [illegible]

... ہو جائے تمام دنیا کا تصور ابھرنے لگے تو وہ بھی ایک ایسا نقص ہوگا جو انسان کی شخصیت کا توازن بگاڑ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شخصیت کو متوازن بنانے میں کسی ایک عضو کا دخل نہیں ہوتا بلکہ تمام اعضا مل کر کسی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں اور اگر کسی فرد کا کوئی ایک عضو خراب ہو تو اس کی خرابی یا نقص کو دوسرے اعضاء کا حسن اپنے اندر چھپا کر اس کی بدصورتی یا خرابی کو دبا دیتا ہے اس لئے کسی بھی فرد کا کسی ایک عضو کی خرابی یا خامی کی وجہ سے یہ سوچنا کہ اس کی پوری شخصیت مسخ ہو جائے گی سراسر غلط ہے؟ اور پھر کانٹ کے نظریے کے مطابق اگر حسن کے بارے میں غور کریں تو حسن انداز نظر کا نام ہے اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس کو مکمل شخصیت کا مالک کہہ سکتے ہیں اور بناک والا کون ہے؟ انسان کا جسم اور جسمانی حسن تو فانی ہے جو وقت کے ساتھ ڈھل جائے گا، فنا ہو جائے گا، لیکن یادگار زمانہ تو عہد ساز شخصیتیں ہوتی ہیں. جن میں صورت کے ساتھ ساتھ سیرت کا حسن بھی شامل ہوتا ہے۔ کسی بھی فرد کی شخصیت کامیابی اور ناکامی، اچھائی اور برائی، خوبصورتی اور بدصورتی کے تصادم اور امتزاج سے بنتی ہے، جو فرد زندگی کے حوادث اور نشیب و فراز سے گھبرا کر فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے آپ کو زمانے کے سرد و گرم سے چھپا کر رکھتا ہے وہ کمزور، بزدل اور غیر متوازن شخصیت کا مالک ہوتا ہے، اور ایسے افراد کو زندگی کے حوادث بھی کمزور اور حقیر جان کر ٹھکرا دیتے ہیں، ایسے افراد کا حسن تو محض اسی کی وجہ سے باقی رہ جاتا ہے لیکن ان کی شخصیت نہیں بن پاتی بلکہ وہ سماج کا ایک مجہول کردار بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور ان کے برخلاف جو افراد بہادر، حوصلہ مند اور باہمت ہوتے ہیں وہ اپنی خوبصورتی، بدصورتی، کامیابی، ناکامی کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر ہی زندگی کے حوادث کا مردانہ وار سامنا اور مقابلہ کرتے ہیں۔ زندگی کے حوادث بھی انہی کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر ان کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں جو بہادر اور حوصلہ مند ہوں، جو زندگی کے حوادث سے کھیلنا جانتا ہے وہ دوسروں کے دکھ درد کو بھی محسوس کرتا ہے اور ان دکھی لوگوں کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمو کر ان کو نیا عزم و حوصلہ بخشتا ہے۔ وہ دوسروں کی خامیوں کی تشہیر کرنے کی بجائے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بجائے دوسروں کی خوشیاں چھین کر اپنی زندگی بنانے کے دوسروں کے درد و غم کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنے حصے کی خوشیاں دوسروں پر نچھاور کر دیتا ہے اور دوسروں

[illegible] ایک کو وقف کرتا ہے۔ یہی فرد ایک دن یادگار زمانہ بنتا ہے جس
قربانی کی مکمل شخصیت [illegible] کے سامنے آتی ہے۔ سماج میں کچھ خود غرض افراد
ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں پر ظلم ڈھا کر، دوسروں کے حدود قسم میں
اضافہ کر کے، دوسروں کی تحقیر و تذلیل کر کے، دوسروں کے دامن کی خوشیاں
لوٹ کر کبھی شادی کے نام پر مظلوموں سے سودا بازی کر کے کبھی جہیز کے نام پر ناجائز
مطالبات کر کے، دوسروں کی غربت، کمزوری اور مجبوری کا فائدہ اٹھا کر یہ سمجھنے لگتے
ہیں کہ ہم اونچی ناک والے ہیں، لیکن وہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ [illegible] ناک ایسی ہے
جو کسی دن کسی مظلوم کی آہ سے کٹ جاتی اور بددعاؤں سے مٹ بھی سکتی ہے اور
بگڑ بھی سکتی ہے، اس کا حسن بدصورتی میں بھی بدل سکتا ہے۔ یہ کبھی کسی جیالے
انقلابی نوجوان کی باہمت اور حوصلہ مندی کی تیز دھار سے کٹ بھی سکتی ہے
اور کسی دن یہ معجزہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی باغی نوجوان سرے سے اس کو ناک
ماننے سے ہی انکار کر دے اور وہ خود اونچی ناک کا کوئی اعلیٰ ترین تراشا ہوا نمونہ پیش
کر کے یہ ثابت کر دے کہ حقیقتاً ایسا نوجوان جو اپنے اندر سماج کے فرسودہ رسم و رواج
کی بیڑیوں کو اپنے انقلابی ذہن اور اپنی انداز فکر سے کاٹنے کی جرأت رکھتا
ہو، جو سماج کے خود ساختہ پروردگاروں کی پیدا کردہ برائیوں کو اپنی ہمت و
حوصلے سے مٹا سکتا ہو۔ جو سماج کی رگوں میں دوڑنے والے زہر جہیز کا
خاتمہ کرنے کی اور اسی زہر سے دوسروں کو محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کر سکتا ہو
جو زمانے کی اونچ نیچ کو مٹا کر ایک ایسا صحت مند معاشرہ جنم دینے کی اپنے اندر
ہمت رکھتا ہو، جو برابری اور مساوات کی بنیادوں پر تشکیل پائے اور جس میں
ایک کا غم سب کا غم بن جائے تو صحیح معنوں میں اسے ہی انقلابی
اور باغی نوجوان ناک والا کہا جا سکتا ہے۔

تقریباً رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ باوجود اس انتظام کے لوگ بھی وقتاً فوقتاً بکریاں اٹھا
لے جاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ منڈیر کے بیچ میں کود گیا۔ تقریباً (۲۵) بکریاں منتشر ہو کر بھاگ
گئیں۔ ایک کو تو وہ اٹھا لے گیا مگر باقی میں صرف (۱۰) واپس آئیں باقی [illegible]
[illegible] جنگل میں بھاگ کر غائب ہو گئیں۔ ایک دن [illegible] صاحب کی [illegible] اٹھا
لے گیا۔ [illegible] گئے [illegible] صاحب [illegible] ایک [illegible]

تسنیم فاطمہ برلاس

دیے رہے ہیں صدا بن پکارے ہوئے

زندگی کا یہ زہر — یہ خوابوں کا ٹوٹنا — ارمانوں کا قتل — اپنی نا تمناؤں کی آرزو میں سانسیں بسر کرنے کا جتن — یہ تنہائی — یہ گھٹن — یہ نہ صرف ایک انسان کے ہی بلکہ ہر انسان شاید اسی انداز فکر کو لئے جیتا ہے — اس قدر قادر ہوتے ہوئے بھی کس قدر مجبور ہے!

آج میں اپنے ذہنی سفر میں خود کو اس وسیع و عریض کائنات میں کتنی اکیلی — یہ میرا اکیلا پن کوئی دیکھ نہیں سکتا — کوئی سمجھ نہیں سکتا، سوائے خدائے بر قادر مطلق کے — ہاں — شاید اسی کے سہارے، اسی کی رحمت کی آس لئے کا دروازہ میں اپنی زخمی روح کو لئے رساں رساں بھٹک رہی ہوں۔

"تم" میری نادان تمنا تھے — میری انتہائی معصوم آرزو کے پیکر تھے — اور نادانی میں — تم کو میں نے روح کی تمام تر گہرائیوں سے محسوس کیا۔ میں کیا مجھے زندگی کو نیا موڑ دینا پڑے گا، اور اس نئے موڑ پر میں یوں بچھڑ جاؤں گی اور میری تمام فریادیں — میری آرزوؤں کے صنم — میری خواہشات کی کلیاں — میری روح کا کرب — میرے ذہن و دل کی یہ ساری پکاریں — تم کو میرے وجود تک نہ لا سکیں گی —!

ایسا ہوا تو کیوں —؟ پھر تمہارا نام، تمہاری یاد میرے لئے ایک اٹل حقیقت تھی — میں نے ایسا تو نہیں سوچا تھا کہ تم یوں قدم قدم — ڈگر ڈگر — نفس میرے ذہن کے کینوس پر پھیل جاؤ گے —!

اور اب یہ سب کچھ سوچنا کتنا بوجھ لگتا ہے، اور اس بوجھ کے ساتھ جینا اور جینا

کرنا کہ تم میرے لئے کچھ نہ تھے ——— میرے لئے تم کچھ تھے کتنا دشوار ہے، اور یہ کہنا کہ تم میری دوستی کا پاس تھے، اور "ہو" ... تو جیتے جیتے یہ سفر ٹھٹک سا جاتا ہے۔

آج میں نے خود کو اپنی ڈائریوں سے نکالا ہے ——— اور دیکھ رہی ہوں ——— وقت کا نقش اور فاصلوں کی دوری کتنے لمحوں میں طے کرلی جاتی ہے ——— مجھے اس معصوم اور اس جہاں دیدہ "وجود" میں زمین و آسماں، سیاہ و سفید جیسا فرق نظر آیا ——— کیسے اور کس طرح میں یہ زندگی کاٹ رہی ہوں ——— کتنے نشتر، کتنا گہرا زخم، کتنا خون ——— میرے وجود سے یوں بہتا رہے گا؟ میری اس گونگی پکار و لہو کی صدا کوئی سن کیوں نہیں پاتا؟ ایک ——— ایک انسان ——— بھرپور انسان کی تلاش ——— اب تکمیل کیوں نہیں ہو پاتی؟ ——— یہ میری اپنی لڑائی، میرا جہاد، مجھے شہادت کی سعادت سے کیوں نہیں نوازتا ——— ؟ اور اگر ان جذبوں میں صداقت نہیں تو پھر میں یہ جراءت کیوں نہ کرپاتی کہ میں انہیں قتل کردوں ——— اور معاوضہ میں ساری سزا بھگت لوں؟

شاید میرے خوابوں نے یہ کوشش کی، جہاں بھی خلوص کا گداز پایا، جہاں انسانیت کا جیون دیکھا، جہاں محبت کو صرف ایک وجود میں سمٹا پایا، وہاں ——— اسی انسان میں ——— میں نے تمہارا تعاقب کیا مگر کہاں ——— ؟ دروازے کھلے، روشنی نظر آئی ——— اور وہ ساری علامتیں غائب ہوگئیں، پھر تم اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ زندہ ہوگئے ——— میں نے جانا تمہارا وجود، تمہارا تصور میرے جینے کے لئے ایک "صحت مند" تحریک ہے جو مجھے جینے بھی دیتی ہے ——— سانسیں بھی لینے دیتی ہے ——— زندگی کی ہر امنگ کو کھینچ لینا بھی سکھاتی ہے ———

دیکھا "تم" نے ——— تمہاری چاہ ——— اور تمہیں دھوکہ دینے کا احساس میرے اندر کس قدر شدت پسندی پیدا کر رہا ہے ——— اور تمہارا خیال کہ میں انتہا پسند ہوں ——— آج قبول ہی کرلوں ——— کیونکہ میری انتہاء کے آگے بھی "تم" ہو اور میری "انتہاء" بھی تم ہو ———

یہ اور بات ہے کہ تم میری آواز اور یہ صدائیں کبھی نہ سن پاؤ گے پھر بھی میری حیات تمہیں پکارے جائے گی ——— !!

...درخت والی چٹان پر بیٹھا - بکریاں اور ڈھنگر بدستور درخت کے نیچے [illegible] بکریاں [illegible] پر بطور گارے کے [illegible] ہو گئی - یہ [illegible] مغرب کے [illegible] گھومنا شروع کر دیا - چاروں طرف سے [illegible] کی آوازیں آتی رہیں مگر [illegible] کے قریب [illegible] (ماخوذ)



... کے زیر اہتمام ایک طرحی مشاعرہ بمقام ... مسجد ... بتاریخ ... اگست ۱۹۸۰ء بصدارت ... منعقد ہوا۔ ان طرحی غزلوں سے چند اشعار قارئین ... کے لئے

(۱) سائے منوہر لعل بہار

دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گیا — دل جو دریا تھا ... کر
زخم رہ رہ کے آرام جاں بن گئے — درد بڑھ کر میرا خود ...
تیرگی میں قدم جب ہراساں ہوئے — ان کا نقش قدم رہ...
جب سفینے کو ساحل نے ٹھکرا دیا — بڑھ کے طوفان خود آ...
دل کی تقدیر ہے خوب چمکی ہوئی — جب سے دل آپ کا آئینہ...
چشم ساقی کی دریا دلی دیکھئے — میکشوں کے لئے مے...
توڑ کر سارے رشتے خدا کی قسم — دل کی خاطر تنہا آپ ...

-o-

(۲) عزیز بہارتی

آپ کو چھو کے میں کیا سے کیا بن گیا — ایک پتھر تھا میں، آ ...
بے خیالی میں ان پر، نظر کیا گئی — بے سبب اک نیا وا...
مجھ سے پردہ ترا، صاف کہتا ہے یہ — میں یقیناً کوئی دوسر...
... جھجک دوسروں سے ملے ہم مگر — خود سے ملنا کٹھن مرح...
بعد مدت کے ہم اپنے پاس آ گئے — دور ہونا تھا ... کام
میں کو پہچان لوں، اب یہ ممکن نہیں — وقت ایسا ...
آپ اپنے تعاقب میں ہوں میں عزیز — کتنا ... یہ سلسلہ

۳ مومن خاں شوق

عشق میں دل مرا کیا سے کیا بن گیا
رزمِ تمنا کا پھر سلسلہ بن گیا

آخرِ شب کا نالہ نوا بن گیا
پھول بکھری ہوئی اک دعا بن گیا

زندگی پیچ و خم سے گزرتی رہی
رنگ چلتے گئے راستہ بن گیا

ہر غمِ دشمنوں نے دیا تھا مگر
یہ خدا کا کرم ہے دوا بن گیا

حسنِ گلشن میں جب ساقی نے انگڑائی لی
شوقِ منظر بڑا خوشنما بن گیا

—o—

۴ محمود شریف محمود

ب اے رشادیہ

اب ارادہ مرا حوصلہ بن گیا
شوقِ منزل ہی خود رہنما بن گیا

رشتۂ پیار کی جانے لگی ہر صدا
ٹوٹ کر دل بڑے کام کا بن گیا

وحشی بن گئے ننگِ انسانیت
جن کی نظروں میں پیسہ خدا بن گیا

لوٹنا، پیٹنا، مارنا، کاٹنا
اس زمانے کا یہ قاعدہ بن گیا

جسم نے مانا برے ہر زمانے میں تھے
اب تو سارا زمانہ برا بن گیا

غرق بیڑہ ہوا، قوم غارت ہوئی
جب کبھی نا اہل ناخدا بن گیا

زندگی کے مسائل تو محمود تھے
آج جینا ہی خود مسئلہ بن گیا

—o—

۵ ابوالفاروق شعور

کتنا حسنِ عمل خوشنما بن گیا
مثلِ غنچہ کھلا پھول سا بن گیا

ستم [illegible] سے اترا ہے جب قافلہ
بہتے دریا [illegible] راستہ بن گیا

[illegible] مسئلہ [illegible]
بڑھتے بڑھتے وسیع دائرہ بن گیا

[illegible] سارے گنہ [illegible]
جو گنہ گار تھا پارسا بن گیا

[illegible]
[illegible] بن گیا

[illegible]
آج [illegible] بن گیا

[illegible] اس طرح
ایک تنکا شعور آسرا بن گیا

مستان منظور

آج انسان بھی کیا سے کیا بن گیا
ہر نفس بے حسی کی ردا بن گیا

آپ ہم سے ہوئے جس گھڑی اجنبی
اجنبیت کا اک سلسلہ بن گیا

کچھ خبر بھی نہیں اپنے بےخود ہیں ہم
کب ترا غم، غم [illegible] بن گیا

[illegible] قدم
اب تو منظور بھی پارسا بن گیا

—o—

۷ ثاقب نذیری بنارسی

عزم میرا بڑے کام کا بن گیا
مشکلیں ہٹ گئیں راستا بن گیا

اب مجھے خوف طوفاں نہ ہوگا کبھی
میری کشتی کا تو ناخدا بن گیا

صبح سے شام تک غرق صہبا ہوتا
آج سنتا ہوں وہ پارسا بن گیا

سب سنورتے ہیں چہرہ مرا دیکھ کر
میں سبھی کے لئے آئینہ بن گیا

کل حقارت سے سب دیکھتے تھے جسے
آج وہ شخص کتنا بڑا بن گیا

جس کے سائے میں کھیلے، پلے اور بڑھے
آج کل وہ شجر دیوتا بن گیا

آپ ثاقب کو پھر دیکھئے غور سے
پہلے تنہا تھا اب قافلہ بن گیا

—o—

۸ محبوب علی منصور

ذرد لب جب سے نام خدا بن گیا
دافعِ رنج و غم اور بلا بن گیا

تھا بلا پہلے اب کربلا بن گیا
دشمنِ جاں وہ اب برملا بن گیا

پہلے کیا چیز تھا اب یہ کیا بن گیا
"ٹوٹ کر دل بڑے کام کا بن گیا"

ان کو اعجاز گویائی جوں ہی ملا
بت جو پہلے تھا اب وہ خدا بن گیا

نہ ہوا دوست دشمن ہی کہہ دے مجھے
کیا یہ سمجھوں گا اک رابطہ بن گیا

شامل حال جب نصرت حق ہوئی
دیکھو دریا میں بھی راستا بن گیا

چومنا منصور کا جھوم کر دار پر
حق کے اظہار کی اک ادا بن گیا

۹ قاضی محمد ہادی صدیقی جامی

نا کا آنا بڑے کام کا بن گیا
جو لگا ہاتھ اُن کا دوا بن گیا

ب تھا ثابت تو قیدی تھا تنظیم کا
"ٹوٹ کر دل بڑے کام کا بن گیا"

دیا کا ترقی کا کیا راز ہے
یہ بفضلِ خدا ناخدا بن گیا

بلِ ایماں کی صحبت میں جامی رہا
دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا بن گیا

―○―

۱۰ میر ابراہیم علی حاجی

رم انساں کا مدعا بن گیا
اے خدا یہ مرض لا دوا بن گیا

کتنے اسرار کا آئینہ بن گیا
"ٹوٹ کر دل بڑے کام کا بن گیا"

لِ فرعون کوئی خدا بن گیا
نیل میں اور اک راستہ بن گیا

یا کے دربردہ افسانے مشہور ہیں
وہ بظاہر بڑا پارسا بن گیا

گئی وہ جگہ سجدہ گاہِ جہاں
جس جگہ آپ کا نقشِ پا بن گیا

یا صحبت سے اہلِ خرابات کے
اب تو واعظ کا گھر میکدہ بن گیا

ر حاجی کا اخفش کی اس بحر میں
منزلِ حسن کا رہنما بن گیا

―○―

۱۱ قائم جعفری

حیرت ہوا کیا سے کیا بن گیا
جس نے دیکھا اُسے آئینہ بن گیا

محبت کا محنت کا تھا امتزاج
آج بچوں کا یہ مشغلہ بن گیا

تلک رہزنی میں جو مشہور تھا
دیکھتا ہوں کہ وہ رہنما بن گیا

ے ریزے میں وہ جلوہ گر ہو گئے
دل مرا ٹوٹ کر آئینہ بن گیا

یں میری رگِ جاں سے نزدیک تر
یہ تصور ہی اک قاصد بن گیا

کی آنکھوں کے پیمانے چھلکا گئے
وہ جہاں بھی گیا میکدہ بن گیا

الفت میں قائم اکیلا نہیں
اہلِ دل مل گئے قافلہ بن گیا

سید عبدالولی قادری

صمد سا محسنِ اردو ہے پھر تو کیا غم ہے

(جناب صمد [illegible] نے نادر و نایاب کتب و رسائل کو جمع کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کا اعتراف کرتے ہیں، اگرچہ بقول خود صمد صاحب ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ "ارے میکنک صاحب....." ایک بزرگ دانشور نے صمد صاحب کا یہ ریمارک سن کر فرمایا کہ وہ [illegible] کہ جیسی کرن کی تاب نہ تھی اب آفتاب [illegible] مقام شد

سچ ہے صمد صاحب پیشہ کے لحاظ سے مکینک ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی دین اور [illegible] کی بناء پر کتابوں کے جوہری ہیں۔ جب جناب ولی قادری نے بی بی سی کے جناب رضا کا مضمون دیکھا (جو اسی شمارہ میں درج ہے) اور اوپر کا شعر سنا تو فی البدیہہ یہ شعر سنایا

زمانہ آپ کو کچھ بھی کہے صمد صاحب! نگاہ داریِ اردو ادب مسلّم

جناب حسن الدین احمد نے موصوف سے خواہش کی وہ اس نظم کو مکمل کریں۔ چنانچہ دو دن [میں] جناب ولی قادری نے مندرجہ ذیل نظم مکمل کر دی۔ جو ہدیۂ قارئین شاداب ہے)

نہ کہیو آج بھی اردو کی زلف برہم ہے
صمد سا محسنِ اردو ہے پھر تو کیا

زمانہ آپ کو کچھ بھی کہے صمد صاحب!
نگاہ داریِ اُردو ادب مسلّم

یہ وہ خزانۂ علمی جمع کیا تو نے
کہ جس قدر بھی لٹے داد و آفریں

ہر اک کتاب میں پوشیدہ ساز نادر آواز
زبانِ اردو کی موسیقیت کا سر

نہیں یہ کام کچھ آساں - کاوشِ جاں ہے
نتیجۂ طلب و ذوق و جہدِ پیہم

دیا ہے اہلِ ادب کو ادب کا سرمایہ
حفاظت اس کی تو لازم [illegible]

ہر اک جانچے، یہ کام تیرا آساں ہو
علم و خلق کی خدمت [illegible]

[illegible] کا شہرہ [illegible] یہ صمد کا سرمایہ
[illegible] تہذیب [illegible]

دعا ولی نے یہ کی ہے قبول ہو یارب!
کہ رحمتِ ابدی کا یقین [illegible]

ماہنامہ حیدرآباد شاداب

جنرل ایڈیٹر
محمد عظیم الدین احسن

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

جلد: ۴ شمارہ ۱۰۴ اکتوبر ۱۹۹۰ء

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب | یوسف ناظم | ڈاکٹر محمد یوسف الدین

پروفیسر رضی الدین احمد | منیر احمد صدیقی | محمد منظور احمد منظور

ڈاکٹر منشاء الرحمن خان منشا | ... جی ... | ...

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
...	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
...ل	90	270	65	35	225
...ت	1000	2500	450	300	2000

قیمت ۵ روپے

ٹیلیفون 229161

دفتر ماہنامہ شاداب 147-165-5 ... حیدرآباد

فہرست

حرفِ اول

غم کو تسکین دے گئے ہیں شجیعؔ آج تسکینِ غم سے کیا ہو گا

والاشان پرنس معظم جاہ بہادر شجیعؔ کا ۱۳ اور ۱۴ ستمبر کی درمیانی رات میں ایک بجے فرزن ولا، ریڈ ہلز، حیدرآباد میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۹۰ سال تھی۔ حضرت شجیعؔ کے انتقال سے خاندانِ آصفی کا ایک اور چراغ گل ہوا اور حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کا ایک اہم دور ختم ہو گیا، خصوصاً شعر و ادب کی دنیا کا ایک عظیم نقصان ہوا۔ شجیعؔ مرحوم کی شہرت بہ حیثیت شاعر پورے برصغیر ہند میں تھی، ان کے دو شعری شہ پارے "ذوقِ شجیع" اور "جذباتِ شجیع" کے نام سے شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں، مرحوم غزل کے مایۂ ناز شاعر اور ایک خاص رنگ کے حامل تھے، ان کی غزلیں ہند و پاک کے نامور موسیقاروں نے گائی ہیں اور وہ عوام و خواص میں برابر برابر مقبول ہیں، اپنے دور کے تقریباً سبھی شعراء کو حضرت شجیعؔ کی سرپرستی حاصل تھی، آپ کے ادبی دربار پہلے ہل فورٹ (موجودہ رٹز ہوٹل) اور بعد میں ماؤنٹ پلیزنٹ جوبلی ہلز (موجودہ مفخم جاہ انجنیئرنگ کالج) میں اپنی آپ نظیر ہیں، اس دربار سے جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، صفی اورنگ آبادی، آزاد انصاری، سہا مجددی، خمار بارہ بنکوی، فانی بدایونی، نجم آفندی، بہزاد لکھنوی، تاج قریشی، شاہد صدیقی، حیرت بدایونی، اوج یعقوبی، مولانا معز الدین ملتانی، ناصر زیدپوری، سعید شہیدی اور خواجہ شوق وابستہ رہے ہیں، علاوہ ازیں جو بھی ادیب و شاعر حیدرآباد آتا اس دربار کی حاضری کو اعزاز سمجھتا، اس دربار کی جھلکیاں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، صدق جائسی اور جوش ملیح آبادی نے اپنی کتابوں "آتی جاتی لہریں" "دربار در دربار" اور "یادوں کی بارات" میں بیان کی ہیں۔

حضرت شجیعؔ حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے چھوٹے فرزند، پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر کے حقیقی برادر خورد، آصف ثامن نواب میر برکت علی خان مکرم جاہ بہادر اور پرنس کرامت علی خان مفخم جاہ بہادر کے حقیقی چچا اور شہزادی احمد النساء المعروف شہزادی پاشاہ (زوجہ نواب کاظم جنگ علی پاشاہ) کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کی والدہ دلہن پاشاہ مادرِ دکن خود بھی شاعرہ تھیں اور اعجاز تخلص کرتی تھیں، مادری سلسلے سے مرحوم جہانگیر جنگ کے نواسے اور قدرت نواز جنگ کے حقیقی بھانجے تھے۔ پرنس کی پہلی شادی ترکی النسل شہزادی نیلوفر سے

[illegible]

کیا تھا جب ان کی بیگم [illegible] حرم [illegible] ان کے بطن سے پرنس شہامت
شہامت جاہ یہاں پرنسس [illegible] پرنسس عالیہ کلثوم تولد ہوئیں۔
حضرت [illegible] حیدرآباد کی تہذیب کا گہوارا تھا، آرائش بلدہ کے وہ پہلے میئر
تھے، آپ کے زمانے میں آرائش بلدہ نے ہزاروں دوکانات تعمیر کروائے، نظام دکن کی فوج
میں میجر جنرل کا عہدہ بھی حاصل تھا۔ فراخدلی میں ان کا جواب نہیں تھا، اپنی عالی شان قیام
گاہ ماونٹ پلیزنٹ واقع بنجارہ ہلز کو انھوں نے اطبیوں کی جانب سے قائم شدہ پہلے انجینئرنگ
دے دیا جو سلطان العلوم ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے نواب مکرم جاہ انجینئرنگ کالج
نام سے قائم ہوا ہے ●

ممتاز اردو طنز نگار اور مزاحیہ کالم نویس فکر تونسوی کا ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کی صبح
گووند ولبھ پنت ہاسپٹل میں انتقال ہوگیا، ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ پسماندگان میں:
علاوہ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ فکر تونسوی، جن کا اصل نام رام لال تھا، نے اپنی ادبی
کا آغاز لاہور کے ماہنامے "ادب جدید" کی ادارت سے کیا، بعد ازاں روزنامہ "ملاپ"
سے وابستہ ہوئے اور اس کا مزاحیہ و طنزیہ کالم "پیاز کے چھلکے" لکھنے لگے، تقریباً
مدتوں ایک روز آنہ یہ کالم لکھا اور ادب و صحافت میں ایک غیر معمولی مقام حاصل کیا، لوگ اس کالم کو
اشتیاق سے پڑھتے، بعض لوگ تو صرف یہ کالم پڑھنے کے لئے اخبار خریدتے۔ اس کالم کو غیر معمولی
اور قبول عام حاصل ہوا، ان کی تحریرات کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ دوسروں پر ہنسنے کے ساتھ
اپنے آپ پر ہنسنا جانتے تھے، وہ عوام کے مسائل سے واقف تھے اور انہی روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے
مسائل پر روز آنہ پیاز کے چھلکے اتارتے جانا انہی کا کام تھا، اپنے اصولوں کے خلاف زندگی
انھوں نے کبھی کسی طرح کی مصالحت نہیں کی اور بے خوف و خطر، حکومت و اقتدار سے ڈرے بغیر
اور ظالموں اور ستم رانوں کی پرواہ کئے بغیر سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف اپنی لیکھ
جدوجہد میں مصروف رہے ●

کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام ۱۰ / ۱۱ / ستمبر کو حیدرآباد
میں پہلی کل ہند اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ ۱۰ ستمبر کو دن کے ۲½ بجے اندرا پریہ
ہال باغ عامہ میں سردار بوٹا سنگھ مرکزی وزیر داخلہ کانفرنس کا افتتاح کرنے والے تھے،
خصوصی مہمانوں میں مسٹر پی۔ اندرا ریڈی وزیر تعلیم، مسٹر مدد کرشنا نائیڈو وزیر جنگلات، پروفیسر
نونیت راؤ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر شیال جی صدر نشین یونیورسٹی گرانٹس

ماہنامہ شاداب حیدرآباد   اکتوبر [illegible]

اور ڈاکٹر نجیب بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو شریک تھے۔ تقریباً تین سو مندوبین جو
جنوبی ہندوستان کے اردو والے، مرکزی وزیر سردار بوٹا سنگھ نے یہاں صبح ۱۱ بجے
جوبلی ہال باغ عامہ میں گووند ولبھ پنت صد سالہ تقاریب کا افتتاح کیا لیکن وہ پہلے سے [illegible]
کے وعدے کے باعث اردو کانفرنس کا افتتاح نہ کر سکے، کہا جاتا ہے کہ سردار بوٹا سنگھ کی [illegible]
کے پیچھے سیاست کام کر رہی ہے، جلیل پاشاہ نے مرکز کے ساتھ ریاستی وزرا کو [illegible] اسے
غیر سیاسی اور قومی رنگ دینا چاہا، مگر مدھیہ پردیش کا کرسی اور مرکزی وزیر صنعت [illegible]
بلند طور پر یہ نہیں چاہتے تھے کہ اردو کے بارے میں مرکزی اور ریاستی اقدامات کا ایک [illegible]
سے اظہار ہو، وجہ کچھ بھی ہو آخر وقت مرکزی قیادت نے کنارہ کشی اختیار کی اور ایک طرح سے اردو
کے مفاد کو نقصان پہنچا۔ وزیر جنگلات جی مدد کرشنا نائیڈو نے مرکز سے مطالبہ کیا کہ وہ حیدرآباد
میں ایک اردو یونیورسٹی قائم کرے۔ ریاستی حکومت اس سلسلہ میں ہر طرح کی مدد کرنے اور اس
یونیورسٹی کے قیام کے لئے دو سو ایکڑ اراضی فراہم کرنے کے لئے تیار ہے، اردو کے سلسلہ
میں ریاست کے دیگر اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا ریاستی حکومت کو یہ فخر
حاصل ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو میڈیم اقامتی اسکول قائم کیا، نیز حکومت نے اردو
کی نصابی کتب کی طباعت کا انتظام کیا، سال گذشتہ (۱۰) اردو جونیر کالج قائم کئے اور کئی [illegible]
جونیر کالجوں میں اردو متوازی جماعتوں کا آغاز کیا، برسوں سے مخلوعہ اردو اساتذہ کی [illegible]
کو پُر کیا۔ یہ کہتے ہوئے مرکز سے مطالبہ کیا کہ وہ اردو کے مفاد میں فوری اقدامات کرے۔ [illegible]
مرکزی وزیر داخلہ سردار بوٹا سنگھ اگر شریک کانفرنس ہوتے تو قوی امید تھی کہ وہ دوسرے مرکزی
اقدامات کے ساتھ حیدرآباد میں یونیورسٹی کے قیام کا بھی اعلان کرتے اور اردو کا مسئلہ کسی قدر
بعجلت آگے بڑھتا۔ وزیر موصوف کی عدم شرکت کی وجہ سے اردو والوں کے وفد نے ان سے
ملاقات کی اور ایک یادداشت ان کے حوالے کی جس پر انہوں نے ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا۔

اس اردو کانفرنس میں جو قرار دادیں منظور کی گئیں ان میں متفقہ طور پر مطالبہ کیا گیا کہ
حیدرآباد میں ترقی اردو بیورو کی ایک شاخ قائم کی جائے۔ آندھرا پردیش، بہار، [illegible]
کرناٹک اور دیگر علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہے اردو
کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ گجرال کمیٹی کی سفارش کے بموجب شمالی ہند میں
ایک اور جنوبی ہند میں ایک اردو جامعہ کو قیام عمل میں لایا جائے اور جنوب کے لئے
حیدرآباد کو ترجیح دی جائے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ [illegible]

یہ کہ شعبہ قائم کیا جائے مختلف ریاستوں میں آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن اردو پروگراموں کا اہتمام کیا جائے، اردو میڈیم کے طلبہ کو ہمت افزائی کے خصوصی انعامات، تعلیمی وظائف دئے جائیں اور مختلف قومی اداروں اور ایجنسیوں میں مسابقتی امتحانات میں اردو کا انتظام کیا جائے۔

کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث آئے اور جو مطالبات پیش کئے گئے ان کی اکثریت کا تعلق ریاست سے ہے اور چند کا مرکز سے۔ کارپردازان کانفرنس کی غالباً یہ کوشش تھی کہ ریاستی اور مرکزی دونوں قائدین کو مدعو کیا جائے تاکہ دونوں اردو کے مطالبات تسلیم کریں۔ اس اختلاف کا ہونا تھا، سیاست درمیان میں آگئی اور تلگو دیشم اور کانگریس کا سوال بھی ہوگیا۔ اردو والوں کے مطالبے واجبی اور مستحق ہیں۔ ضرورت ہے کہ اردو کے سبھی ادارے ان کی تائید کریں تاکہ ریاست اور مرکز دونوں پارٹی سیاست کو درمیان میں نہ لائیں۔ حکومتی سطح پر مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے عمل آوری کی صورت پیدا کریں۔

یقین ہے کہ ایک مسلمان اسلام کی فروغ و اشاعت میں جو کامیابی حاصل کرسکتا ہے وہ ممالک کے لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ اسلام انسان کے ذہن اور عقل کو مخاطب کرتا ہے۔ مغربی معاشرہ علم کی آواز کو قبول کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہاں پر انھوں نے زور دے کر اس امر کی تصدیق کی کہ اسلام ہر صفت انسان کی فکر اور جذبات کو متاثر کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

ڈاکٹر الیسن نے اپنے اس منصوبہ کا اعلان بھی کیا کہ وہ برطانیہ میں ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ غیر مسلم بچوں کو نئے طریقوں سے قرآن پڑھا سکیں۔ نیز قرآنی تعلیمات اور سائنس میں ایسی مطابقت بتا سکیں۔ [redacted] نے کہا کہ مغربی افراد بالخصوص سائنسدانوں کو سائنٹفک طریقے سے اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی چاہئے۔ اسی طرح علماء کو چاہئے کہ وہ قرآن کے معنی اور مطالب بیان کرتے وقت جدید سائنسی طریقے اختیار کریں۔

ڈاکٹر المشرقی جو ڈاکٹر الیسن کے معاون عرب سائنسداں نیز مشرقی یمن کے رہنے والے ہیں، نے کہا کہ ڈاکٹر الیسن نے زندگی میں کبھی نہ تو شراب کو ہاتھ لگایا ہے اور نہ سور کے گوشت کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ قبول اسلام کے بعد وہ یقیناً اسلام کے فروغ میں بھرپور حصہ لیں گے۔ ڈاکٹر المشرقی برطانیہ جانے سے قبل خرطوم (سوڈان) ...

(صفحہ ۸)

مشاورت حیدرآباد
اکتوبر

سید ابوالحسن علی ندوی

قسط اول

یہ ملک گویا ایک [illegible]

ڈائلاگ (DIALOGUE) کی ضرورت و افادیت:

ہمارے اس دور اور ہمارے ملک میں سیاسی کانفرنسوں، مذہبی جلسوں، علمی تعلیمی اور ادبی نشستوں کی کمی نہیں، شاید کوئی دن خالی جاتا ہو کہ کوئی ایسی نشست نہ ہوتی ہو، جس کانفرنسوں کی بھی کمی نہیں، مگر وہ خاص اغراض کے ماتحت کی جاتی ہیں، اور ان میں بے تکلف تبادلۂ خیال کی نوبت کم آتی ہے، ضرورت ہے کہ رسوم و تکلفات سے آزاد ہو کر جس طرح ایک خاندان یا ایک محلہ کے لوگ کسی جگہ اکٹھے ہو کر بے تکلف بات چیت کرتے ہیں، دوستانہ و محبت آمیز گلہ شکایت ہوتی ہے، غلط فہمیاں رفع کی جاتی ہیں، اپنے خاندان یا محلہ کے فلاح و بہبود کے لئے مشورے ہوتے ہیں، بکھرے ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، اسی طرح ہم کبھی کبھی کسی مرکزی مقام پر جمع ہو کر دوستانہ بے تکلفانہ گفتگو و تبادلۂ خیال کریں۔ اسی خیال و غرض کے تحت DIALOGUE زیادہ مفید سمجھا گیا جس سے امید ہے بہتر نتائج نکلیں گے، اسی خیال کے ماتحت آپ حضرات کو آج تکلیف دی گئی ہے۔

اصل فکر و پریشانی کی بات اور خطرناک صورت حال:

حضرات! انسان کے لئے بیماری کوئی غیر فطری چیز نہیں ہے، صحت کا اعتدال سے ہٹ جانا اور بیماری کا شکار ہو جانا انسانی فطرت کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح سے زندگی کی علامت ہے، پتھر غلطی نہیں کر سکتا، درخت غلطی نہیں کر سکتا، انسان ہی غلطی کرتا ہے، اس لئے غلطی ہو جانا پریشانی کی بات نہیں، بعض اوقات [illegible] پریشانی کی بات یہ ہے کہ انسانوں کی کسی بڑی جماعت کا کسی غلط راستے پر پڑ جانا، اپنی سفلی خواہشات اور [illegible]

[illegible] کے پیچھے بیان ہو جاتا، تاریخ انسانی کے لئے بھی اور تقدیر انسانی [illegible]
[illegible] ہے، [illegible] بگڑے ہوئے حالات سے
[illegible] احتساب پیدا کرنے والی طاقتوں سے آنکھیں [illegible] والے [illegible]
[illegible]
[illegible] اصل تشویش کی بات یہ ہے کہ انسان بار بار ایسی ذہنیت، فساد اور [illegible]
[illegible] نظر آنے لگا ہے کہ [illegible]
[illegible]

لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ ایسے ہر موقع پر کچھ ایسے افراد میدان میں آگئے زمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حالات کا مقابلہ کیا، ان خطرناک رجحانوں اور قبائل [illegible] بن کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے جان کی بازی لگا دی، انسانی تہذیب کا تسلسل قائم ہے، محض نسلی تسلسل نہیں بلکہ انسانی خصوصیات کا تسلسل جو ہر دور انسانی احساسات و جذبات، اعلیٰ مقاصد، اخلاقی تعلیمات اور ان کی بقا و ترقی وجاہت اور قربانی کا جذبہ جو اس وقت تک چلا آرہا ہے، یہ درحقیقت انہیں لوگ ہے، جو بگڑے ہوئے حالات میں میدان میں آئے اور انھوں نے زمانہ کے چیلنج کو قبول ان بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ لڑایا اور بعض اوقات زمانہ کی کلائی موڑ دی کی بدولت انسانیت زندہ ہے۔

ہر زمانہ کے شاعر، ہر زمانہ کے ادیب اور ہر زمانہ کے اہل دل زمانہ کی [illegible] کرتے چلے آئے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد بھی انسانی خوبیوں کا سرمایہ، جذبات اور نیک انسان موجود رہے ہیں، یہ اصل میں انہیں لوگوں کی جد و جہد کا نتیجہ اس وقت اپنے مفادات سے آنکھیں بند کر کے میدان میں آگئے، انھوں نے اپنے خاندانوں کے لئے بھی اور آئندہ نسلوں کے لئے بھی خطرہ مول لیا، زمانہ کا رخ انسانیت کی کھیتی ان کی کوششوں اور قربانیوں کے پانی سے ہری بھری ہو گئی۔

انسانیت کے بقا کی حقیقی ضمانت

انسانیت کی بقا کی حقیقی ضمانت وہ جری، دلیر، جانباز اور دردمند انسان [illegible] دل، اشکبار آنکھیں اور سلگتے اور جلتے ہوئے دل و دماغ رکھتے ہیں، حالات کا سامنا کریں، ہر چوٹ کو برداشت کریں اور تاریخ کے دھارے کو بدلیں۔

جاتا کیا نہیں لگا دیں۔ جب کبھی اس جسم کا کوئی عضو خراب ہوتا ہے تو پورا سماج پورا معاشرہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے، خواہ دیکھنے میں آپ کو نظر نہ آئے، جیسے ایک فربہ جسم جس میں کئی طرح کی بیماریاں پوشیدہ باقی ہیں لیکن اس کا فربہ جسم سب پر پردہ ڈالے رہتا ہے۔ دیکھنے والوں کو دھوکا ہوتا ہے، اور سمجھتے ہیں کہ یہ انسان بہت تندرست ہے، لیکن حقیقت میں وہ بیماریوں کا مجموعہ ہے

سماج کو سب سے بڑا خطرہ ظلم کا مزاج پیدا ہو جانا اور اس سے بڑھ کر اس کو نا پسند کرنے والوں اور اس کے روکنے کے لئے جان کی بازی لگا دینے والوں کا فقدان

کسی سماج کے لئے سب سے بڑا خطرہ خواہ وہ دنیا کا قدیم سماج ہو یا جدید سماج ہو یہ ہے کہ اس کے اندر ظلم کا مزاج پیدا ہو جائے، پھر اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس ظلم کو نا پسند کرنے والے اس معاشرہ میں انگلیوں پر بھی نہ گنے جا سکتے ہوں، دوربین تو دور، بین خوردبین سے بھی ان کو نہ دیکھا جا سکتا ہو، پورے سماج میں چند درجن آدمی بھی ایسے نہ ہوں جو اس ظلم کو اس سنگدلی کو اس قساوت کو اور [illegible] کو کمزوروں پر دست درازی کو نا پسند کرتے ہوں اور اپنی نا پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوں، کم از کم نا پسند کرنے والے تو مل جائیں گے جو چار چھ آدمیوں کی موجودگی میں کہہ دیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے، بڑے خطرے کی علامت ہے، لیکن اپنی نا پسندیدگی کا اعلان کریں اور اس کے لے کر میدان میں آ جائیں، ایسے افراد کی جب کسی سماج میں، کسی معاشرہ میں کمی ہوتی ہے تو اس معاشرہ اس معاشرہ اور اس سوسائٹی کو کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ہے، جب کسی معاشرے میں ظلم پھیلنے لگا ہو اور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہو، جب ظلم کے لئے یہ معیار بن گیا ہو ظالم کون ہے؟ ظالم کی قومیت کیا ہے؟ ظالم کا فرقہ کیا ہے؟ ظالم کی زبان کیا ہے؟ ظالم کس برادری سے تعلق رکھتا ہے، تو انسانیت کے لئے عظیم خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، جب انسانوں کو اس طرح خانوں میں بانٹا جانے لگے، جب آدمی اخبار میں کسی فساد یا ظلم و زیادتی کی خبر تو پہلے اس کی نگاہیں یہ تلاش کریں کہ کس فرقہ کی طرف سے یہ بات شروع ہوئی، اور نقصان کس کو پہنچا، جب ظلم کے ناپنے اور ظالم ہونے کا فیصلہ کرنے کا یہ پیمانہ بن جاتا ہے کہ وہ کس قوم، فرقہ، طبقہ، برادری سے تعلق رکھتا ہے تو اس وقت معاشرہ کو کوئی طاقت، کوئی ذہانت کوئی سرمایہ اور بڑے بڑے منصوبے نہیں بچا سکتے

مذاہب اور تاریخ عالم کا متفقہ فیصلہ:

[illegible] مذہب، انسانی تاریخ اور فلسفہ اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے [illegible]

چاہتا ہوں (اور مجھے یہ اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرز فکر غالب ہے وہ مجھے کام کرے) کہ اس ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور آپ کی پہلی توجہ کا مستحق ظلم و تشدد کا رجحان، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی بے قیمتی ہے (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اور جنگ کی بناء پر لوٹ سے خاندانوں اور محلوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدہ کے لئے انسان کی جان لے لینے قتل عام اور مظالم کی کثرت ہے کہ آخر میں سب سے شرمناک حقیقت جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کو جلا دینا یا زہر دے کر مار دینا کیا ہے۔

جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت کرنے والا اور مہربان ہے، اس قتل سے خوش نہیں ہو سکتا اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا اور اس کے نتیجے میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا اور وہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا۔

خدا کے وجود کے بعد جس حقیقت پر تمام مذاہب، فرقوں اور مکاتب خیال کا اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ ظلم (خواہ کسی سے سرزد ہو) بڑا گناہ (مہاپاپ) اور ملکوں اور قوموں کے حق میں سم قاتل ہے، اور اس کا نتیجہ دیر یا سویر نکل کر رہتا ہے اور اس کی موجودگی کوئی ملک یا قوم (خواہ اس کے پاس کیسے ہی قدرتی وسائل، جنگی طاقت، عددی کثرت، شاندار تاریخ اور علم و ادب کے اور فلسفہ کے خزانے ہوں) پھل پھول نہیں سکتی۔

لیکن جو لوگ مذاہب پر اعتقاد نہیں رکھتے وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اور سفاکی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور وہ تہذیبیں جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ و ادب کے صفحات پر ان کے روشن نقوش ہیں زوال کا شکار ہو گئیں، اور داستان پارینہ بن کر رہ گئیں، اس صورت حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل اور انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ سخت قوانین، عبرت ناک سزاؤں، ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ کو سختی سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ بات سمجھ لینا چاہئے

جارحیت اور تشدد کا انجام خودکشی اور خانہ بربادی ہے

فرقہ پرستی، جارحیت اور تشدد کا یہ رجحان ملک کو زمانہ دور اور ... ہنگ

کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے جو بار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی اسی غلطی کو خوب سمجھتے ہیں، کہ فرقہ وارانہ منافرت، لسانی، علاقائی عصبیت، پہلے ملک کی آزادی کے دو اہم عنصروں (ہندو مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی پھر یہی زہر لوگوں اور مختلف طبقات اور برادریوں کی باہمی کشمکش، لسانی، صوبائی، علاقائی تعصبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہو جائے گا، تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور اس کے پسندیدہ شہروں کو اپنا لقمہ بنانے لگی، اور یہ ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

تعمیری کاموں اور خدمتِ انسانیت کا سب سے بڑا محرک اور راز یہ ہے کہ انسان کبھی انسان سے مایوس نہیں ہوا

انسانیت کے حال و مستقبل اور سارے تمدنی، معاشی، سیاسی حتیٰ کہ اخلاقی اور مذہبی مسائل کا انحصار اور تمام فلسفوں و افکار و نظریات کا دار و مدار تمام تر اس پر ہے کہ انسانی وجود اور محفوظ ہے، اس کو اپنی زندگی کی طرف سے اطمینان، انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس اور اس کے تقدس پر غیر متزلزل عقیدہ ہے، اس عقیدہ نے کہ انسان ہی اس دنیا کی پیدائش کا مقصود اور اس کائنات کا سب سے بیش قیمت وجود ہے اور اس کے اندر بہتر سے بہتر بننے کی صلاحیت موجود ہے، دنیا کے ذہین ترین، شریف ترین اور لائق ترین انسانوں کو انسانوں پر محنت صرف کرنے پر آمادہ کیا، اور انھوں نے ان کی ذہنی صلاحیتوں اور ان کے ذہن و دماغ کے سوتوں کو چھیڑا، اور وہ تمام اصلاحی، تعمیری، تخلیقی، علمی، ادبی، تمدنی اور روحانی شاہکار وجود میں آئے جن پر قدیم و جدید دنیا کو فخر ہے، تاریخ کے قدیم ترین دور سے لے کر ہمارے زمانے تک جس چیز نے انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھی، وہ خدا کی یہ نعمت ہے کہ اچھے انسان، انسان سے مایوس نہیں ہوئے، انھوں نے اس کو ناقابل علاج مریض اور ناقابل اصلاح حیوان نہیں سمجھا، وہ کبھی اس کے وجود سے ایسے متنفر نہیں ہوئے کہ اس کی صورت دیکھنے تک کے روادار نہ ہوں، انھوں نے کبھی اس کے زندہ رہنے کے استحقاق کا انکار نہیں کیا، انسانیت کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے، وہ ہوا کے تیز جھونکوں اور طوفان کے تھپیڑوں میں بھی جلتا رہ سکتا ہے، اور انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمت والوں اور انسانیت کا درد رکھنے والوں نے برسوں بے تیل بتی کے انسانیت کا چراغ روشن رکھا، انھوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور مسلسل فاقہ کر کے جنگلوں اور بیابانوں، تنہا کے کے مصائب کی راتوں اور دنوں

میں یقین تھی انسانیت کی خدمت کی، انتھک ہے کوئی چیز ان کی ہمت توڑنے کو ان کے عقیدے کا اظہار سے روکنے کے لئے کافی نہ تھی، ان کی نہ ختم ہونے والی قوت کار اور ان کی حیرت انگیز قوت عمل کی بنیاد یہی تھی کہ وہ انسان کو دست قدرت شاہکار (MASTERPIECE) سمجھتے تھے، ان کو انسان کی فطرت سلیم پر یقین تھا، ان کو یقین تھا کہ انسان کے لئے برائی عارضی اور بھلائی فطری اور اصلی ہے، ان کو کہ وہ انسان پر جو محنت کریں گے وہ کبھی نہ کبھی رنگ لائے گی۔ ان کے عقیدہ میں اس چمن کو کھلنا اور حسین بننا چاہیئے۔ عالم انسانی میں کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک انگیز نہیں کہ انسان انسان سے ناامید ہو جائے۔ اور اس سے زیادہ افسوسناک ہے کہ وہ اس نفرت و یاس کے جنون میں بے زبان عورتوں اور معصوم بچوں پر دست کرے اور کلیوں کو کھلنے اور مسکرانے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دے۔ تعلیم و تربیت اصلاح و ترقی، معاشی خوش حالی ہو یا سیاسی استحکام، یہ نشیمن جس شاخ پر قائم ہے ہمیشہ جس شاخ پر قائم رہے گا، وہ انسانی زندگی کے تحفظ اور امن و امان کی فضا اس لئے نشیمن کو سجانے اور بنانے کے منصوبوں اور اس کی ترتیب و تنظیم کی بجائے پہلے اس شاخ کی حفاظت ضروری ہے۔

ملک کی سب سے بڑی طاقت اور دولت حق گو اور بے اور جانباز انسانوں کا وجود ہے۔

ملک کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ اور جینے اور کھلنے پھولنے کے لئے اس کا سب سے بڑا سہارا ایسے حق گو اور بے لاگ انسانوں کا وجود ہے جو بڑے سے بڑے نازک موقعہ پر ظلم کو ظلم، ناانصافی کو ناانصافی اور غلطی کو غلطی کہہ سکتے ہیں، اگر آپ دا قو کی بیداری اور اس کی زندگی کی صلاحیتوں کو جانچنا چاہتے ہیں، اور یہ اندازہ کرنا کہ وہ قوم یا ملک انسانیت اور اخلاق اور علم و فن کی امانت کی حفاظت کی کہاں تک ہے، تو یہ دیکھئے کہ اس میں کتنے ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو تنقید کے موقعہ پر اپنے کی جسارت کرتے ہوں، جو صریح غلطی کے موقعہ پر بڑی سے بڑی اکثریت ا سے بڑی طاقتور حکومت کو برملا ٹوک دیتے ہوں، جو مظلوموں اور کمزوروں کے لئے سینہ تان لیتے ہیں، اور بگڑے ہوئے حالات میں عقل کے بوالہوس کو چھوڑ کر دیوانے پھرنے لگتے ہوں، اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرتے ہوں، جن کو آئندہ

فوائد اور وقت کے مصالح کا پاس نہ رکھتے ہوں، جو حق کی ...
یں اپنی قوم کا معتوب بننے کو، اپنی قوم کا محبوب بننے پر ہزار بار ترجیح دیتے ہوں، جب
سارے ملک میں زیادتی، حق تلفی، جانبداری اور مصلحت پرستی کی ہوا چل رہی ہو ...
یا کھانا پینا بھول جائیں اور حالات کو درست کرنے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں جو
قت کے مسئلہ کے سامنے تمام مسائل کو بالائے طاق رکھ دیں، ہر طرح کے اختلافات کو
بھلا دیں، بلاتمیز قومیت و ملت انسانی جان و آبرو کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دیں
اگر ایسے افراد اس قوم کی تعداد کے مناسب اور ضرورت کے مطابق پائے جاتے ہیں تو اس قوم
ور اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس و ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں، اس کی ہر پریشانی
دور ہو جائے گی، ہر کمی پوری ہو جائے گی، بیشتر مجرم اور دشمن دوست بن جائیں گے، انہی کی
اخلاقی برتری کا ساری دنیا میں آوازہ بلند ہوگا، اس کے ملک میں خوش حالی، سرسبزی اور شادابی
بت و الفت کا دور آکر رہے گا، اس کی بین الاقوامی حیثیت اچانک بلند ہو جائے گی، اقوام
ممالک نازک حالات میں اور بین الاقوامی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے اس کی مدد کے طالب ہوں گے

انسانیت کا آخری سہارا دو طبقے (یعنی مذہبی انسان اور اعلیٰ دانشور) ہیں جن میں سب سے آخر میں بگاڑ آتا ہے۔

جب کبھی انسانی نسل پر کسی دور میں اخلاقی گراوٹ کا ایسا دورہ پڑتا ہے، یا وہ کسی
نسانی سازش یا کسی انتشار پسند طاقت کا شکار ہوتی ہے، اس وقت دو طبقے میدان میں آتے
یں، ایک دانشوروں کا طبقہ اور ایک مذہبی انسانی کا طبقہ، یہ دو طبقے ہیں جن میں بگاڑ
(CORRUPTK) سب سے اخیر میں داخل ہوتا ہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے، قیاس بھی یہی چاہتا
ہے، اور عقل سلیم (COMMON SENSE) کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ سب سے آخر میں جس طبقہ
میں فساد داخل ہوتا ہے اور خرابی آتی ہے، وہ مذہبی آدمیوں کا طبقہ ہے، اس کے بعد دانشوروں کا
طبقہ ہے، لیکن جب دانشوروں میں اور مذہبی انسانوں میں بگاڑ CORRUPTION
آجائے تو پھر اس معاشرہ کا دیہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خدا حافظ ہے، (خدا حافظ تو ہر حال میں
یا اطمینان ہے) لیکن پھر اس معاشرے کو کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس وقت ہندوستان میں یہ موڑ آگیا ہے کہ ... کی جماعت دانشوروں کی
جماعت، سیاسی جماعتیں اور دانش گاہوں کے فضلا کی جماعت میدان میں آئے ...
سوال ... [illegible]

انھیں ہم سیاسی مفادات سے بالکل الگ آنکھیں بند کرلیں یا ہم نے کوئی مطلب بھی پیدا کرنے سے ہماری پارٹی پاور میں آئے گی اور ہمیں حکومت ملے گی، ایسی خالص نیک کام تھا کہ جب ہم کو اپنا انعام ملنے کا اور جب حکومت تحائف میں رکھ کر دینے جانے لگی، تو اللہ کے بندوں نے کہا کہ ہم نے اس لئے کام نہیں کیا تھا، ہم نے تو ہمدردی کیا تھا خلوص کے ساتھ کیا تھا، خدا کی خوشنودی کے لئے کیا تھا ہمیں اس کا انعام نہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں سب سے خطرناک دور ۔

میں بغیر کسی معذرت کے صاف کہتا ہوں کہ میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، میں سمجھتا کہ ہمارا ہندوستانی معاشرہ کبھی ایسے خطرے سے دوچار ہوا ہو جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے میں بالکل اس پر معذرت پیش کروں گا ہندوستان کا جسم بارہا مجروح و نزار ہوا، ہندوستان نے شکست کھائی، ہندوستان پر برطانیہ کی بدیسی حکومت رہی، یہ سب تاریخی واقعات لیکن ہندوستان کی روح اور ہندوستان کا ضمیر اس طرح سے کمزور نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہو، ہندوستان کی تاریخ میں کبھی ایسا دور نہیں آیا کہ برائی کو ظلم کو اس آسانی کے ساتھ گوارا کر لیا گیا ہو جس آسانی کے ساتھ آج گوارا کیا جا رہا ہے بلکہ اس کو فلسفہ بنایا جا رہا ہے، اس کے ذریعہ سے جماعتوں کو مستحکم اور منظم کیا جا رہا ہے اس کے ذریعہ ہندوستان میں حکومت کا استحقاق ثابت کیا جا رہا ہے، ہندوستان مصیبتوں کا شکار ہوا ہے، لیکن ضمیر انسانی، ہندوستان کا (CONSCIENCE) زندہ اس نے اپنا کام کرنا، اپنا (FUNCTION) کبھی چھوڑا نہیں، اس وقت جو اصل خطرہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ جس کو شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

.....(باقی)

ڈاکٹر ادم ریاش، مسٹر ارون بھولے، مسٹر ایس پی مکھرجی، پروفیسر محسن اور ڈاکٹر ... نے خوبصورت سے متعلق کچھ باتیں سامنے رکھیں جن میں پنڈت سندر لال کی کتاب "گیتا اور قرآن" کا ذکر بھی ہوا، گیتا کے فلسفۂ عمل کا تذکرہ بھی ہوا، گیتا کے ۳۹ کے ... ترجمانی کی الفاظ میں ۔ کرشن جی کو حسن نظامی اور بعض دوسرے مفکروں نے جو پیغمبر خیال ... امکانات ہوئی ——— صدر جلسہ ... صاحب کی اس قرارداد پر جلسہ اختتام کو پہنچا کہ ڈاکٹر حسن الدین احمد ... [illegible]

جہاد

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن کریم اور احادیث نبویؐ میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو پردے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے۔ جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں۔ یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کیلئے ہر قسم کی جد و جہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی، دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنے عزیز و قریب کی، اہل و عیال کی، خاندان اور قوم کی جان قربان کر دینا اور مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کے لئے اگر جنگ کے میدان میں لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن ہے اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس کہ اتنے اہم اور اتنے ضروری اور وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ مفہوم کے میدان میں محصور کر دیا گیا ہے۔ یہ بات ہماری

یہی اور سکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تعلیم اور شریعت کو دنیا میں لے کر آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے۔

آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، وجدان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی اور قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد ہی ان کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے اسی لئے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھے رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصد سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے۔

سورۂ نساء میں ہے: لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (النساء)

ترجمہ: مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور بیٹھے رہیں اور جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں۔ اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی لئے جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ، ان دونوں لفظوں کے معنی ایک نہیں ہیں بلکہ دونوں میں خاص و عام کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمن سے لڑنا بھی ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی

سورہ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال ۔ یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا۔ جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک جوکھم میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے۔ مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت، شخص اور قوم کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے اگر ان دونوں کی باطل محبت ہمارے دل سے ہٹ جائے تو ہم کامل ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اُمت کو سکھایا۔ اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ سو برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا۔ ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی۔ اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انھوں نے تلوار کی چھاؤں میں گزارے۔ وہ دنیا کو معلوم ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات ۲)

ترجمہ: مومن وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور [illegible]

[illegible]

...سچے اترنے والے لوگ ہیں۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ الایہ (آل عمران۔ ۲۰)

ترجمہ: پھر جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ان کے گناہوں کو ان سے اتار دوں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔

جہاد کی قسمیں

جب جہاد کے معنیٰ محنت، سعی، تبلیغ اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔ علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ کرنا ہے اور اسی کا نام اللہ کے ہاں "جہادِ اکبر" ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے آپ نے صحابہ سے جو ابھی لڑائی کے میدان سے آئے تھے، فرمایا، "تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے نفس سے لڑنا ہے۔"

حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں۔ (جوا کنز العمال کتاب الجہاد ص۲۸۵ ج ۲) چنانچہ ابن نجار نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا کہ:

"بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے جہاد کرے۔"

یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم اللہ کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔" یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (عنکبوت۔ ۷)

ترجمہ : اور جنھوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف
اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔
اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف
میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر
کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور
ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔ سورہ کے آغاز میں ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (عنکبوت-۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے
جہاد کرتا ہے۔ اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔
اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول
میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لئے
اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے یہ جہاد
کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے۔ سورہ حج میں ارشاد ہوا:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا
جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ (الحج-۱۰)

یہ "اللہ میں محنت اور جہاد کرنا" وہی جہاد اکبر ہے جس پہ ملت ابراہیمی
کی بنا ہے یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان
کر دینا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ:

المجاهد من جاهد نفسه   بحوالہ کنز العمال کتاب الایمان

صـ ۲۹ ج۔۱ یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ
ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟
عرض کیا، جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔
فرمایا، نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔
یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے
سینہ میں ہے۔

جہاد بالمال

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے ' دنیا کا ہر کام پیسہ کا محتاج ہے اس لئے اس جہاد کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جد و جہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور ان سیرابیوں سے دینِ حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا اور اس لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے۔ قرآنِ پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں بلکہ یہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہوا قابلِ لحاظ ہے کہ ان میں ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان ہے۔

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے۔ انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   گر زر طلبی سخن درین است

جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان مال و دماغ کی قوت کو صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا' جہاد ان تمام اقسام میں شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو اور اس کی آخ

خود خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دیتا ہے نیز اگر دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آ پڑے اور حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی درجۂ کمال ہے۔ ایسے جاں نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے صلے اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے اس لئے ارشاد ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (بقرہ - ۱۹)

ترجمہ: جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔

ان جاں نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں "شہید" ہے یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندۂ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے (صحیح مسلم کتاب الجہاد)

اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انھوں نے ادا کی تھی اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے۔ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ (آل عمران)

اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اس وقت اس لئے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارخانہ ختم نہیں ہوا تھا وہ بھی اپنی حسنِ نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے اس لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کیلئے غازی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء - ۱۰) ترجمہ: اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے پھر وہ یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب ہو جاتا ہے تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران: ۲۰) ترجمہ: تو جنھوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت موثر الفاظ میں ہے۔ اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا سماں [illegible] سو برس بعد بھی وہی عالم ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بے تاب نظر آتا ہے۔ یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی اور فرمایا۔ کہ مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسری مرتبہ زندگی ملے اور اس کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دوں۔ (صحیح مسلم کتاب الجہاد)

ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے۔ ان کا یہ نہیں ہے کہ میں دوسروں کو مار ڈالوں بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را ! ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ [illegible] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیردستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، [illegible]

باقی بر صفحہ ۵۲۶

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

موت اور نیند



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الزمر ۴۲)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مرا ان کو کھینچ ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقررہ تک، اس بات میں پتے ہیں ان لوگوں کو جو دھیان کریں۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے اُن جانوں کو (جن کا وقت موت آگیا ہے) ان کی موت کے وقت (مکمل طور پر کہ زندگی بالکل ختم ہو جائے) اور ان جانوں کو بھی جن کو موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت (یہ تعطل بالکلیہ نہیں ہوتا ایک حیثیت حیات کی باقی رہ جاتی ہے مگر ادراک نہیں رہتا اور موت کی صورت میں نہ ادراک رہتا ہے نہ حیات) پھر (اس معطل کرنے کے بعد) ان جانوں کو تو (بدن کی طرف عود کرنے سے) روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو (جو نیند کی وجہ سے معطل ہو گئی تھیں اور ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا) ایک میعاد معین (یعنی مدت) تک کے لئے آزاد کر دیتا ہے (کہ پھر واپس جا کر بدن میں بدستور سابق تصرفات کرنے لگے) اس (مجموعہ تصرفات الٰہیہ) میں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں (خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بلا شرکت غیرے تمام عالم کے انتظامات کرنے پر) دلائل ہیں (جن سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر استدلال کرتے ہیں)

معارف القرآن: موت اور نیند کے وقت قبض روح اور فرق کی تفصیل

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا

توفی کے لفظی معنی لے لینے اور قبض کر لینے کے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جانداروں کی ارواح ہر حال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیر تصرف ہیں جب چاہے ان کو قبض کر سکتا ہے اور واپس لے سکتا ہے اور اس تصرف خداوندی کا اظہار ہر جاندار روزانہ دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ نیند کے وقت اس کی روح ایک حیثیت سے قبض ہو جاتی ہے، پھر بیداری کے بعد واپس مل جاتی ہے اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بالکل قبض ہو جائے گی پھر واپس نہ ملے گی۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ قبض روح کے معنی اس کا تعلق بدن انسانی سے قطع کر دینے کے ہیں کبھی یہ ظاہراً و باطناً بالکل منقطع کر دیا جاتا ہے۔ اسی کا نام موت ہے اور کبھی صرف ظاہراً منقطع کیا جاتا ہے باطناً باقی رہتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف حس اور حرکت ارادیہ جو ظاہری علامت زندگی ہے وہ منقطع کر دی جاتی ہے اور باطناً تعلق روح کا جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ روح انسانی کو عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر کے اس عالم سے غافل اور معطل کر دیا جاتا ہے تاکہ انسان مکمل آرام پا سکے۔ اور کبھی یہ باطنی تعلق بھی منقطع کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی حیات بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

آیت مذکورہ میں لفظ توفی بمعنی قبض بطور عموم مجاز کے دونوں معنی پر حاوی ہے۔ موت اور نیند دونوں میں قبض روح کا یہ فرق جو اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ سونے کے وقت انسان کی روح اس کے بدن سے نکل جاتی ہے مگر ایک شعاع روح کی بدن میں رہتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے اور اسی رابطۂ شعاعی سے وہ خواب دیکھتا ہے۔ پھر یہ خواب اگر روح کے عالم مثال کی طرف متوجہ رہنے کی حالت میں دیکھا گیا تو وہ سچا خواب ہوتا ہے اور اگر اس طرف سے بدن کی طرف واپسی کی حالت میں دیکھا تو اس میں شیطانی تصرفات ہو جاتے ہیں وہ رؤیا صادقہ نہیں رہتا۔ اور فرمایا کہ نیند کی حالت میں جو روح انسانی اس کے بدن سے نکلتی ہے تو بیداری کے وقت آنکھ جھپکنے سے بھی کم مقدار وقت میں بدن میں واپس آجاتی ہے۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

ڈاکٹر عبداللہ الیسن اسلام کی آغوش میں

عربی اخبار **عکاظ** کے مطابق برطانیہ کے سائنسدان ڈاکٹر آرتھر الیسن اسلام کی حقانیت کے اس وقت معترف ہوگئے جب انھوں نے قرآن کی روشنی میں انسان کی نفسیات اور روحانیت پر تحقیق کی۔ قاہرہ کی حالیہ کانفرنس میں شریک ڈاکٹر الیسن نے اسلام قبول کرنے کے بعد کہا کہ مسلمان اسلام کی سائنٹفک حقیقتوں سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو اب تک متعارف نہیں کرا سکے ہیں۔ ڈاکٹر الیسن جو کہ برطانوی یونیورسٹی کے شعبۂ الیکٹریکل والیکٹرانک انجینئرنگ کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہیں اور اب جن کا اسلامی نام عبداللہ الیسن ہے، نے مغربی سائنسدانوں پر زور دیا کہ وہ اسلام کا مطالعہ کریں جو بیک وقت انسان کے فکر و جذبات کو مخاطب کرتا ہے۔

اسلام ایک سائنٹفک دین ہے اور دوسرے مذاہب اور نظریات کی طرح جدید سائنسی تحقیقات کی نفی نہیں کرتا بلکہ بہت سی سائنٹفک اور ٹکنالوجیکل مشاہدات کی تصدیق کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سارے سائنسداں جب اپنی تحقیقی ضرورت کے تحت قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس حقانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور بالآخر اسلام قبول کرکے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

ڈاکٹر الیسن "سوسائٹی برائے نفسیات و روحانی مطالعہ" کے چھ سال تک چیرمین رہے ہیں ان کی اس حیثیت نے انھیں اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ مختلف مذاہب و نظریات بشمول اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کر سکیں۔ قاہرہ میں "قرآن میں طبی معجزات" پر منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں ڈاکٹر الیسن نے اس کانفرنس میں نیند اور موت کے درمیان تعلق پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ انھوں نے یہ تحقیق الیکٹرک اور الیکٹرونک آلات جو کہ ان کی مخصوص فیلڈ ہے کی

مدد سے کی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کانفرنس کے لئے مقالہ لکھتے وقت ان
قرآن کی روشنی میں نفسیاتی اور روحانی ادویات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر الیسن کی
حیرت انگیز نتائج سامنے آئے جس سے بڑی حد تک موت اور نیند کے
تعلقات و دیگر مظاہر کی فطری مطابقت سامنے آئی ہے۔ ڈاکٹر الیسن کے
خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانہ نہ تھا جب میری اس تحقیق نے حیرت انگیز اور
سامنے لائے اور اس طرح میں نے اسلام کو پالیا۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظا
مغرب اسلام کے سائنسی طریقہ کار سے اب تک ناواقف ہے۔ انہوں نے کہا کہ کا
ہوئے مباحث سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آئی کہ اسلام سائنس کی
کرتا اور اب وہ قرآن کی روشنی میں نفس انسانی کے مطالعہ میں اپنی مزید قوت صر

قاہرہ کانفرنس کے لئے مقالہ تیار کرتے وقت سورۂ زمر کی چند آیات نے ڈاکٹر ا
بہت متاثر کیا۔ مزید غور و فکر کرنے کے لئے ڈاکٹر الیسن نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ ا
پروفیسر ڈاکٹر یحییٰ المشرقی کے ساتھ تحقیق شروع کی۔ اس تحقیق سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ
مشاہدات و دلائل بھی قرآن کے اس انکشاف کی تصدیق کرتے ہیں کہ نیند اور موت د
ہی عمل کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر الیسن نے کہا کہ اس سے پہلے وہ قرآن کی اس تعلیم سے و
جس کی بڑی حد تک ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے غیر مسلموں کو قرآ
سے اب تک واقف نہیں کرایا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے تجربات نے بھی اس بات کی تصدیق ک
انسان سو جاتا ہے تو اس کے جسم سے کوئی چیز نکل جاتی ہے اور جب وہ دوبارہ جسم
ہے تو آدمی جاگ اٹھتا ہے لیکن موت کے بعد "وہ چیز" انسانی بدن میں دوبارہ داخ
ہے یہی وہ بات ہے جسے سورۂ زمر میں بیان کیا گیا ہے لہٰذا میں قرآن کے اس انکشا
ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مسلمانوں کا داعیانہ ذمہ داریوں سے فرار اور غیر مسلموں کو قرآن کی سائنسی حقیقتوں
نہ کرانے پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر الیسن نے کہا کہ دوسرے مذاہب خصوصاً ہندوازم
نے اپنی تعلیمات سے دوسری تہذیبوں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ اپنی تہذیب اور عقیدے
معاشروں پر گہری چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ مسلمانوں کو اسلام کے تعارف اور غیر مسلموں کے
لائق توجہ بنانے کے لئے کافی محنت اور جد و جہد کرنے کی ضرورت ہے

ڈاکٹر الیسن نے کہا کہ برطانیہ میں ہزاروں ہندو اور ان کے مذہبی رہنما رہتے ہیں

از ڈاکٹر حسن الدین احمد

بھگوت گیتا اور صوفیا کی تعلیمات

حیدرآباد کے معروف مصنف ڈاکٹر حسن الدین احمد نے خدابخش لائبریری میں گیتا کا پیام اور اس کے اردو ترجمے پر اپنا لکچر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ شری مد بھگوت گیتا کے جتنے ترجمے اردو زبان میں ہوئے ہیں اتنے دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے لکچر میں بھگوت گیتا کے اردو ترجموں میں مسلمانوں کا حصہ یا Contribution پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ شری مد بھگوت گیتا کے جو ترجمے مسلمانوں نے کئے ہیں ان کا شمار اعلیٰ معیار کے تراجم میں ہے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اپنے لکچر کی تمہیدی کلمات میں مذہب کے تقابلی مطالعہ پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ:

آج دنیا نے انسانوں کے ایک وسیع تر خاندان کی حیثیت حاصل کرلی ہے جس میں مختلف مذاہب اور عقیدوں کے لوگ بستے ہیں اس لئے ان میں سے ہر ایک گروہ کا فرض ہے کہ وہ دوسرے کو سمجھنے اور مشترک اقدار کو تلاش کرنے اور ان کو سامنے لانے کی کوشش کرے۔ خود ہمارے عظیم دیس میں بھی مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے بستے ہیں، ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ کثیر المذاہب معاشرے کے آداب سے واقف ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ مذہبی کتابوں کو محدود گروہوں کی اجارہ داری اور عقیدت مندی کے حصار سے نکال کر عالمی سطح پر لائیں، اور ان کا مطالعہ بھی تنگ نظری اور اجنبیت سے بلند ہوکر علمی نقطۂ نظر سے اور انتہائی خلوص و احترام سے کریں اور جو اقدار مشترک ہیں ان کو اجاگر کریں۔ انھوں نے بھگوت گیتا اور صوفیاء کی تعلیمات پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ:

یہ کہنا شاید درست نہ ہو کہ شری مد بھگوت گیتا اسلامی تصوف کا ماخذ ہے لیکن شری مد بھگوت گیتا اور اسلامی تصوف میں کچھ اثرات مشترک ضرور ملتے ہیں، شری مد بھگوت گیتا کی تعلیم اور تصوف کی تعلیم میں ہم آہنگی واضح ہے، اس کو جاننا ضروری ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اسلام سے متعلق

وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ وہ کسی جدید دین کے
انھوں نے بتایا کہ حضرت ابتدائے انسانیت ہی سے ہر زمانہ اور ہر ملک میں اپنے رسول
بھیجتا رہا جو اپنے زمانے اور اپنے اپنے ماحول میں پیش کرتے رہے۔ حضرت محمد صلی اللہ
نے ان کو مکمل فرمایا اور سابقہ رسولوں کی تصدیق فرمائی، ان تعلیمات میں وقتاً فوقتاً تو
نے من مانی تبدیلیاں کر لیں۔ اس ادعا کی روشنی میں اگر کسی اور مذہب میں کوئی ایسی بات
جو اسلامی تعلیمات میں بھی موجود ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام نے ان یا نور
مذاہب سے مستعار لیا ہے بلکہ مسلمانوں کے خیال کے بموجب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشترک
انسانی تحریف یا مداخلت سے بچ گئے اور باقی رہ گئے دوسرے مذاہب کی کتب میں ان
اثرات کے ملنے پر نہ تعجب کرنے کا کوئی محل ہے نہ اس مجرد بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے
میں یہ اثرات باہر سے آئے، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام کا منبع اور ماخذ ایک ہی ہے۔

اس کے برخلاف دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے
اور تصوف میں جو اجزا مشترک ہیں وہ اس وجہ سے ہیں کہ گیتا کے خیالات کا اثر راست
تصوف پر پڑا ہے۔ ایسا کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف اسلام کے لیے ایک اجنبی ہو
اسلام نے ان مذاہب سے کوئی خیال یا تعلیم مستعار نہ لی بلکہ بن بلائے مہمان کی طرح
دوسرے مذاہب سے آئے، خواہ پہلے نقطۂ نظر کی تائید کی جائے یا دوسرے کی، یہ بات
ہے اور مزید تحقیقات کی طالب بھی کہ بہت ساری تعلیمات گیتا اور تصوف میں مشترک
مسلم علمائے تصوف ادعا کرتے ہیں کہ علم تصوف علوم اسلامی کے ظاہری اور باطنی مو
کا مکمل خاکہ ہے جس کی بنیاد قرآن اور حدیث پر ہے، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی روشنی
مسئلے کا مطالعہ کیا جائے تو دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد نے بھگوت گیتا کے اردو ترجموں کا تفصیلی تعارف کراتے
فرمایا کہ اردو میں اب تک اس کے (۳۹) ترجمے دریافت ہو چکے ہیں۔ اردو ترجموں پر
ڈالتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اب تک دلکش ترجمے ایسے دریافت ہوئے ہیں جو مسلمانوں
ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے بھگوت گیتا کے مختلف اردو ترجموں پر روشنی ڈا
جگہ جگہ سے ان کے اقتباسات پیش فرمائے:

ڈاکٹر حسن الدین احمد کے لکچر کے بعد ڈاکٹر میر نجم الدین علی خان، جناب حمید اا

ڈاکٹر ماجد الدین القاضی



امراض قلب، اسباب اور علاج

خالق کائنات نے ہر مرض اور ہر عارضہ کے علاج و مداوا کے سارے اسباب مہیا کر دیئے ہیں اور بنی نوع انسان کو عقل سلیم عطا کی ہے تاکہ وہ جستجو اور کاوش کے ذریعہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوشیدہ عناصر سے استفادہ کرتے ہوئے تلاش اور کھوج کے ذریعہ کسی بھی مرض کا مجرب علاج تلاش کر سکے اور احتیاطی تدابیر کے ذریعہ مختلف امراض سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے.

عالمی ادارہ صحت نے "صحت" کی جو تشریح کی ہے اس کی رو سے صرف بیماری سے شفایابی کا نام صحت نہیں بلکہ مکمل جسمانی تندرستی، ذہنی سکون اور سماجی و معاشی آسودگی ہی حقیقت میں صحت کہلاتی ہے۔

معالج امراض قلب کی حیثیت سے میں اپنی بات کو اپنے ہی موضوع سے متعلق امور قلب کو تندرست رکھنے سے متعلق احتیاطی تدابیر تک محدود رکھنا پسند کروں گا

بخار وجع مفاصل۔ جوڑوں کے درد پر منتج امراض قلب

جوڑوں کے درد "گٹھیا" کے ساتھ بخار اور جوڑوں کے درد اور اعصابی تناؤ کے نتیجے میں ہونے والے امراض قلب کے انسداد اور ان سے حفاظت کے معاملہ میں مغربی دنیا امریکہ اور جیسے ترقی یافتہ ممالک نے حالیہ عرصہ میں نمایاں ترقی کی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں امراض میں مبتلا ہونے والوں کی اوسطاً تعداد ایک لاکھ میں ۹ تا ۲ ہے جبکہ ہندوستانی کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے سروے کے بموجب ۵ تا ۱۵ سال کی عمر کے ۱۲۰۰ بچوں میں اوسطاً ۲ سو بچے وجع مفاصل "گٹھیا" کے بخار میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں انتہائی گنجان یعنی سلم علاقوں کی زندگی، کم غذائیت، قوت بخش غذاؤں، طبی سہولتوں کا فقدان یا ناکافی طبی سہولتیں شامل ہیں۔ اس مرض میں عام طور پر جو ظاہر ہوتی ہیں ان میں گلے میں خراش اور سوجن ہوتی ہے اور چھالے آجاتے ہیں جو ہفتے تک برقرار رہتے ہیں۔ چند دنوں تک ایسا کوئی عارضہ لاحق ہو تو فوری مناسب توجہ دی جانی چاہئے اور حلق کا "کلچر" کرانا چاہئے۔

ایس۔ پی۔ اے نے جو احتیاطی تدابیر تجویز کئے ہیں ان کے بموجب وجع مفاصل وعیت کے امراض قلب میں مبتلا مریضوں کو ڈینٹل یا دانت نکالنے یا کسی قسم کی جراحی سے قبل اینٹی بائیوٹک ادویات دینا چاہئے۔

بدبختی سے ترقی پذیر ممالک میں تعلیم اور شعور کی کمی، گندگی سے پرہیز اور پاک رہنے کی عادتوں سے محرومی کے باعث جراثیم سے پھیلنے والے اور متعدی امراض میں ہیں۔ ان میں بعض بیماریاں ایسی ہیں جن سے قلب بھی متاثر ہوجاتا ہے جو انتہائی مہلک اور تشویشناک بھی بن جاتا ہے بعض معمولی باتوں سے غفلت رفتہ رفتہ انسان کو خطرہ میں مبتلا کردیتی ہے۔ حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی اور پاک وصاف رہنے کی ہی کئی قسم کی بیماریوں سے انسان کو محفوظ رکھتی ہے۔ ناخن کی بروقت تراش، ہاتھ طرح دھونے، مکان خاص طور پر باورچی خانے کو پاک وصاف رکھنے، مکھیوں اور مچھروں انسداد اور کوڑا کرکٹ اور گندی ہوجانے والی اشیاء کی فوری تلف کردینے کی کئی بیماریوں سے نجات کی ضامن ہوتی ہے۔

صفائی وپاکی کو اپنا نصب العین بنانے اور اس ضرورت کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنے کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم اس عربی قول کی تختی النظافۃ من الایمان ا

[illegible]

طبی کوتاہی، نیم حکیمی اور بدعنوانیاں

ڈاکٹر یا مریض کی لاعلمی، کوتاہی یا غفلت کے نتیجے میں نظام قلب میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

خواتین اور صحت سے متعلق مشہور تحقیقاتی رسالہ کے حالیہ شمارہ میں کہا گیا ہے کہ منافع کمانے اور زیادہ سے زیادہ مال کی نکاسی کی جستجو نے صنعتوں کو ایسی راہ پر ڈال دیا ہے کہ وہ اپنے مال کے مضرت رساں اثرات کی پرواہ کئے بغیر بہر طور ان کی زیادہ سے زیادہ فروخت کے ذریعہ منافع کمانے کو اپنا واحد نصب العین بنا چکی ہیں۔

ادویات تیار کرنے والی صنعتوں نے منافع کمانے کے لئے تشہیر کے ایسے طریقے اختیار کئے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ادویات نتائج و عواقب کی پرواہ کئے بغیر تجویز کریں۔ حد سے زیادہ دوائیں تجویز کرنے کی وبا ساری دنیا میں عام ہوگئی ہے۔ ڈاکٹرس عام طور پر ادویات کے ساتھ فراہم کئے جانے والے پرچیوں میں تفصیلات کی بنیاد پر اندھا دھند طریقہ پر مریض کی خاطر یہ دوائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کے امکانی مضرات اور طویل مدتی نقائص اور پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں لگایا جاتا جس کے باعث اکثر و بیشتر ادویات کے غلط اور بے دریغ استعمال کے نتیجہ میں لوگ قلب پر حملہ اور کینسر جیسے موذی امراض میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور تولیدی نقائص میں مبتلا ہوجاتے ہیں جس سے بچے مختلف قسم کی بیماریوں کے ساتھ عالم وجود میں آتے ہیں۔ عام قواعد یہ ہیں کہ کوئی حاملہ خاتون ابتدائی ۳ ماہ تک کسی بھی قسم کی دوا کے استعمال سے قطعی طور پر احتراز کرے۔

امراض قلب میں مبتلا افراد عام طور پر خواتین مانع تولید گولیوں اور تولیدی صلاحیتوں کو فروغ دینے والی ادویات کے استعمال کے سلسلہ میں حد درجہ احتیاط کریں بلکہ کسی ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر کے مشورہ کے بغیر ان ادویات کو ہاتھ نہ لگائیں۔ خیر نیم حکیموں کی کارستانیوں اور غلط ادویات کے ذریعہ استعمال ہونے والے سے تباہ کن اثرات کو چھوڑئیے۔ اب ترقی یافتہ دنیا میں پائی جانے والی ستم ظریفیوں پر نظر ڈالئے۔

قلب پر حملہ اور اچانک انتقال ISCHARMIC HEART DISEASE (IHD)

دنیا کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں ۲۰ ویں صدی کے دوران سب سے عام عارضہ قلب کے مختلف امراض رہے ہیں جن میں سب سے زیادہ اموات ہوتی رہیں۔ اب یہ رجحان کم ترقی پذیر ممالک میں بھی عام ہوتا جارہا ہے۔ صرف برطانیہ میں ہر سال تقریباً ۱۶۰,۰۰۰ اموات (IHD) سے ہوتی ہیں۔ ان میں سے نصف سے زیادہ اموات آناً فاناً یعنی اندرون ۲ گھنٹے ہوجاتی ہوں ... [illegible]

جس کا فوری مداوا ممکن ہو سکتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے اور اچانک قلب جو کہ مختلف اعضاء کو پمپ کرنے کا کلیدی کام انجام دیتا ہے کارکردگی سے محروم ہے CARDIAC ARREST کہا جاتا ہے یا پھر قلب جامد و ساکت ہو جاتا ہے میں مریض کے قلب کو فوری طور پر مصنوعی طریقہ کے ذریعہ کارکرد بنانے کی تدابیر اکثر و ثابت ہوئی ہیں۔ اس لئے ترقی یافتہ ممالک میں عام آدمیوں کو بھی ایسی ٹریننگ دی جاتی ذریعہ وہ کسی مریض کے قلب کے اچانک جامد و ساکت ہو جانے پر مصنوعی طریقوں سے اور شوک بجا کر اس کے قلب کی کارکردگی کو بحال کر دیا جا سکتا ہے۔

امریکہ میں ہر سال (۵۰) لاکھ عام آدمیوں کو قلب کے پمپ کو فوری دوبارہ کارکرد تدابیر کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ کار انتہائی سادہ اور آسان ہے۔ اس میں صرف چند گھنٹوں میں ہی عام آدمی کو اس کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ اس طریقہ اور صحیح استعمال سے ساری دنیا میں لاتعداد زندگیوں کو بچایا جا رہا ہے۔

امریکن ہارٹ اسوسی ایشن اور امریکن ریڈ کراس نے جو نیا طریقہ کار وضع کیا۔ کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ اس طریقۂ کار کی تفصیل درج ذیل ہے

۱) سینہ کا تیزی سے مساج کیا جائے۔ ایک منٹ میں ۶۰ تا ۸۰ مرتبہ کی بجا پورے سینہ کی مالش ہوتی رہے اس طرح تیزی سے مساج کیا جائے۔

۲) مریض کے منہ سے منہ ملا کر اس کے تنفس کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ صرف دو مرتبہ ہی ایک تا ½۱ سکنڈ تک آہستہ سے سانس چھوڑیئے۔

۳) سانس کی نالی میں کوئی رکاوٹ ہو تو اس کو دور کیا جائے۔

۴) قلب کی الکٹرک کرنٹ تھراپی کے لئے عملہ کو BEFIBRILLATOR سے تربیت دی جائے۔

۵) امریکہ میں گذشتہ موسم گرما میں منعقدہ نیشنل کانفرنس کے مرتب شدہ رہنما یا میڈیکل ایسوسی ایشن کے ۸ جون کے شمارہ شائع ہوئی ہیں۔

امراض قلب کی کثرت اور اسباب

ساری دنیا میں قلب کے امراض عام ہوتے جا رہے ہیں اور قلب کی مختلف

سے پھیل رہا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خواتین سگریٹ نوشی کی عادی ہوتی جارہی ہیں۔ علاوہ ازیں مرغن غذاؤں کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ آرام طلبی ہے اور فیشن بن گیا عام طور سے ہے عام طور پر تین اسباب ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ عمر کی طوالت، رگ پٹھوں میں سختی اور تناؤ کا پیدا ہوجانا اور عمر کے ابتدائی حصے میں ہی خاندان سے ورثہ کے طور پر ملنے والے نقائص۔ ان حالات میں علاج قدرے مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ جو نقائص رفتہ رفتہ پختگی حاصل کرلیتے ہیں ایک عمر کو پہنچنے کے بعد لا علاج بن جاتے ہیں۔

اس لئے کسی بھی قسم کے نقص کو ابتدائی مرحلہ میں ہی دور کرنے کی تدابیر اختیار کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ ابتدائی عمر سے ہی ایسی احتیاط ضروری ہے جس کے باعث پیرانہ سالی تک پہونچنے کے باوجود قلب کی کارکردگی حسب معمول برقرار رہے۔

اس سلسلہ میں عوام کو باشعور بنانے اور ابتدائی عمر ہی سے محتاط زندگی بسر کرنے کا عادی بنانے کے لئے باقاعدہ مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ عام لوگوں میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہو اور بے احتیاطی کے نتیجے میں ہونے والے سنگین نتائج وعواقب اور صحت پر مضر بلکہ مہلک اثرات سے وہ بخوبی واقفیت حاصل کرسکیں۔

عام آدمی کو باشعور بنانے کی ضرورت

عام آدمی کو باشعور بنانے کی ضرورت علاج کے لئے کھوج اور زیادہ مجرب طریقۂ علاج کی جستجو سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس جانب خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں عوام کو باشعور بنانے اور ان کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں لاکھوں افراد محتاط زندگی بسر کرنے کے عادی بن گئے ہیں۔ ان کی غذائی عادات میں نمایاں تبدیلی ہوگئی ہے۔ چربی پیدا کرنے والی غذاؤں کے حد سے زیادہ استعمال سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ جسمانی محنت اور فزیکل اکسرسائز پر وہ خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ کاہلی اور آرام طلبی سے گریز کرتے ہیں۔

گزشتہ دو دہوں کے دوران سگریٹ نوشی ترک کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کے نتیجہ میں سگریٹ نوشی سے ہونے والی اموات میں ۲۰ تا ۳۰ فیصد کی کمی ہوگئی ہے۔ عصری تحقیق کے نتیجہ میں ایسے مصنوعی آلات بھی دریافت ہوگئے ہیں جو مصنوعی طریقوں سے قلب کی کارکردگی کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں پیس میکرس PACE MAKERS اور ڈیفبلیٹرس

شامل ہیں۔ یہ الیکٹرانک آلات قلب کی مختلف پیچیدگیوں پر قابو VENTILALORS
پانے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ امراض قلب کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ خون کو قلب سے شریانوں کے ذریعہ دماغ سے لے کر پاؤں کے ناخن تک جسم کے مختلف اعضاء کو باقاعدگی کے ساتھ خون پہنچانے کا نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے شریانوں کی دبازت بڑھتی جاتی ہے یعنی ان میں موٹائی آجاتی ہے جس کے باعث ان کا اندرون کم ہوتی جاتی ہے۔ اندرونی حصہ میں کھردراپن پیدا ہونے لگتا ہے۔ چکنی غذاؤں کے استعمال سے خون میں شامل ہو جانے والی چربی شریانوں کے اس کھردرے حصے میں جمع ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ شریانوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مختلف مقامات پر خون کی تیزی سے گذرگاہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں جن سے قلب میں درد محسوس ہونے لگتا ہے اور قلب پر حملہ ہوتا ہے۔

سگریٹ نوشی، خون کا دباؤ اور ذیابطیس کے نتیجہ میں خون کی شریانوں کی حسب معمول کارکردگی زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اعصابی تناؤ، تشنج، غصہ، غیظ و غضب کے نتیجہ میں اچانک قلب کی شریانیں کام کرنا بند کر دیتی ہیں۔ ان شریانوں میں کوئی رکاوٹ نہ بھی ہو تو بعض اوقات غیر معمولی غصہ اور اعصابی تناؤ کے نتیجہ میں قلب کی شریانیں کام کرنا بند کر دیتی ہیں۔ ان تمام باتوں سے پرہیز قلب پر اور ہلاکت سے محفوظ رکھتا ہے۔

ہائی بلڈ پریشر

ہر شخص کو اپنے خون کے دباؤ کے معیار سے واقف رہنا چاہیئے۔ خون کے دباؤ میں زیادتی یا کمی کا بروقت علاج کرا لینا چاہیئے اور اس کے لئے کسی اچھے ڈاکٹر ہی سے رجوع ہونا زیادہ بہتر ہے۔

بیشتر صورتوں میں بلڈ پریشر پر قابو پانا بہت آسان ہوتا ہے۔ خون کے دباؤ کو معمول پر برقرار رکھنے کے لئے کوئی مشکلات درپیش نہیں ہوتیں۔ اس طرح قلب پر حملے کے اندیشوں سے محفوظ رہنا ممکن ہو سکتا ہے۔

امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا میں معمولی نوعیت کے خون کے دباؤ کا بھی فوری علاج کرانے پر فوراً اور خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

عالمی ادارہ صحت کے رہنمایانہ اصولوں کے بموجب ۹۰ تا ۹۴ کے بلڈ پریشر کو بھی

خطرہ کی سرحد تک پہنچ جانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے اور اس کا پانی ملی میٹر سے زیادہ علاج ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاج کے لئے دوا کے استعمال سے قبل وزن میں کمی کرنے اور غذائی عادات میں تبدیلی کرتے ہوئے غذاؤں کو متوازن بنانے پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔

۲۔ سگریٹ نوشی : سگریٹ نوشی کے عادی افراد پر قلب پر حملہ کا بہت زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ سگریٹ نوشی تو درکنار سگریٹ پینے والوں کے قریب بیٹھنا اور ان کے چھوڑے ہوئے دھوئیں کی زد میں آنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ سگریٹ کے فلٹر کے باعث اس کے مضر اور خطرناک اثرات ہرگز زائل نہیں ہو سکتے۔ سگریٹ نوشی ہر حالت میں قلب کی شریانوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔

۳۔ چربی یا چکنائی کا حد سے زیادہ استعمال : چکنائی اور چربی والی غذاؤں کا حد سے زیادہ استعمال گھی، مسکہ، انڈے اور مٹھائیاں چربی کو بڑھاتے ہیں۔ جنہیں کولسٹرال CHOLESTEROL کہا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ترکاریاں اور پھل کھائیے اور صحت مند رہئے۔ گھی اور مسکہ کی بجائے ویجیٹبل آئیل مثلاً سویابین آئیل وغیرہ سے پکوان زیادہ مفید رہے گا۔

مرغ کو اس کا چمڑا نکال کر پکائیے کیونکہ چمڑے میں زیادہ چربی ہوتی ہے۔ انڈے کی زردی ہفتہ میں ایک مرتبہ سے زائد مت کھائیے۔ اومیگا ۳ آئیل جو مچھلیوں میں ہوتا ہے خون میں چربی کو گھٹانے میں معاون ہوتا ہے۔ اس سے خون گاڑھا نہیں ہوتا ہے اور شریانوں میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب نہیں بن پاتا۔ مرغن غذاؤں کے استعمال سے پرہیز کیجئے اور صحت مند رہئے۔ بچپن ہی سے متوازن غذاؤں کا عادی ہونا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ بچوں کو مٹھائیاں اور آئسکریم وغیرہ حد سے زیادہ نہیں کھانا چاہئے۔

قلب کے امراض عام طور پر ایسے طبقہ میں نمایاں ہوتے ہیں جہاں غذائی عادتیں مغربی طرز کے کھانوں کی نہیں ہوتیں اور جہاں زود ہضم غذاؤں کی بجائے ثقیل قسم کی غذائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ غذا کی مقدار کو مقررہ حد سے بڑھنے نہیں دینا چاہئے۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی پابندی ہی ہمیں صحت مند و تندرست رکھنے کے لئے کافی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"نحن قوم لا نأكل حتى نجوع وإذا أكلنا لا نشبع"

"ہم ایسے لوگ ہیں جو بھوک محسوس ہونے پر کھاتے ہیں اور جب کھاتے ہیں اس قدر

جتنا کھاتے کہ سارا پیٹ بھر جائے "

یہ ایک قول ہی صحت کا سب سے بڑا راز ہے۔ اس سلسلہ میں فارسی کا ایک
بھی قابل غور ہے :

خوردن برائے زیستن
نہ کہ
زیستن برائے خوردن

اس کے معنی ہیں کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے غذا استعمال کرنا چاہیئے۔ صرف
رہنے کے لئے زندہ رہنا نہیں ہے۔ ہمیں صرف اس حد تک متوازن اور معتدل غذا
کرنا چاہیئے جو ہمارے زندہ رہنے اور کار توانائی کے لئے کافی ہو۔ ہمیں یہ نہیں تصور کر
چاہیئے کہ ہم صرف کھانے کے لئے زندہ ہیں اور بے دریغ طریقہ پر غذائیں استعمال کرنے
اپنا شعار نہیں بنانا چاہیئے

۴۔ **روزآنہ جسمانی ورزش کی اہمیت:** پیدل چلنا سب سے بہتر جسمانی ورزش
حد سے زیادہ اور مرغن غذاؤں سے پر
کاہلی اور آرام پسندی سے احتراز سے آپ ذیابیطس میں مبتلا ہونے سے بھی بچ سکتے ہیں
کسی بھی صحت مند انسان کے لئے روزآنہ ۳۰ منٹ تیزی کے ساتھ پیدل چلنا اس کو
صحت مند اور بیماریوں سے محفوظ و مامون رکھتا ہے اور اس کا قلب انتہائی صحت مند
کارکرد اور طاقت ور رہتا ہے۔

۵۔ **موٹاپا:** امراض قلب کے متاثرین سے متعلق برسوں سے جمع شدہ اعداد و شمار سے
واضح ہوتا ہے کہ ان امراض سے متاثر ہونے والے مرد و خواتین میں اکثریت موٹے اور
ہوتے ہیں ۳۰ سال قبل بھی موٹاپا ایک بڑی وجہ امراض قلب کی تسلیم کی جا چکی ہے۔ موٹا
اور وزن کے حد سے زیادہ بڑھ جانے پر قلب کے نظام کی ساری کارکردگی پر زبردست
بوجھ پڑتا ہے اور اس نظام کو رفتہ رفتہ متاثر کرتا ہے :

۶۔ **ذہنی الجھن اور تشنج:** آج کے دور میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی
ذہنی الجھن یا دباؤ سے محفوظ ہے۔ یہ زندگی کا لازمہ
بن گیا ہے۔ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ فکر دامنگیر ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی الجھن میں مبتلا
رہتا ہے۔ ان الجھنوں کو غالب آنے نہ دیجئے۔ اپنے ایقان و ایمان کو مستحکم بنا
کسی ذہنی الجھن کے لئے خواب آور گولیاں یا ادویات کے استعمال سے زیادہ مفید اور

مجرب طریقہ کار یہ ہے کہ آپ خدا سے لو لگائیں، مراقبہ اور عبادات میں مصروف رہیں۔ نماز کے عادی بن جائیں۔ کام اور مصروفیت کے موقع پر غصہ اور برہمی سے احتراز لازمی ہے کیونکہ ایسے حالات میں اچانک برہمی اور غیض و غضب اور جذبات میں آجانے سے قلب پر حملہ ہو سکتا ہے۔ تنگ مزاج انسان جو بات بات پر جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتا ہے عجلت پسندی سے کام لیتے ہوئے جذباتی ہو جاتا ہے اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان وقفہ کو کم کرتا رہتا ہے۔

۷۔ **شراب نوشی:** قلب اور اس کی شریانوں کو مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے معدہ کو صاف اور کارکرد رکھنے کے علاوہ جگر کو بھی صحت مند رکھنا ضروری ہے۔ شراب نوشی راست جگر کو متاثر کرتی ہے اور قلب کے انتہائی نازک خلیوں کو تباہ کرتے ہوئے قلب کی کارکردگی کو متاثر کر دیتی ہے۔ شراب کے استعمال سے قلب کی دھڑکن حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہی اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شراب انسان کو اس کی خودداری سے محروم کرتی ہے۔ اور توانائی زائل ہوتی رہتی ہے۔ شراب کے استعمال سے قلب پر حملہ کے اندیشے بڑھ جانے کے علاوہ کینسر سے ہلاکت کا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

۸۔ **بچوں کی رہنمائی:** بچپن ہی سے بچوں کو پاک و صاف رہنے اور متوازن غذا کا عادی بنانا ان کی تندرستی اور صحت کے علاوہ درازی عمر کی ضمانت حاصل کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس لئے ابتدائی عمر ہی سے بچوں میں صحت و صفائی اور غذاؤں کے استعمال کے سلسلہ میں توازن کا عادی بنانے پر خصوصی توجہ دی جانی چاہئے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہمیں اس دنیائے فانی میں محض اپنی آخرت کو بہتر بنانے کی خاطر زندگی گزارنا ہے کیونکہ ہماری حقیقی زندگی تو آخرت ہی ہے۔ موت سے کسی کو رستگاری نہیں۔ ہر ایک کو ایک نہ ایک دن جانا ہے کسی کو ہمیشہ دوام نصیب نہیں اس لئے اپنی زندگی کو متوازن بنانے ہی میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی مضمر ہے۔

سلسلہ صفحہ ۴۲

متعدد تنظیمیں مثلاً سروے آف انڈیا، نیشنل ریموٹ سینسنگ ایجنسی، پولیٹیکل سروے آف انڈیا، بھارت کا محکمہ موسمیات، متعدد یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے یونیسکو اور آئی ٹی یو سی این جیسے بین الاقوامی اداروں کی مدد سے اس شعبے میں

سائنس جزو

حیاتیاتی ماحول کے ذخائر کا نظریہ

محترمی!

بھارتی نژاد، لوگوں کو ہانگ کانگ سے انڈمان و نکوبار جزائر میں سکونت، ہونے کی اجازت دینے کی تجویز ماہرین ماحولیات کی طرف سے مخالفت کئے جانے سے ترک کردی گئی ہے۔ شمالی امریکہ میں لاکھوں ہیکٹر غیر کاشت شدہ زرخیز زمین، جنگلات کی جگہ گذشتہ (۲۰۰) برسوں میں متعدد قصبے، شہر، فارم اور مکانات بن گئے ہیں۔ بڑی بڑی صنعتیں قائم ہوگئی ہیں۔ امریکہ کی شکل و صورت بالکل بدل گئی۔ لاکھوں لوگ وہاں آباد ہوگئے ہیں اور متحدہ امریکہ ایک بڑی طاقت بن گیا ہے۔ ہمیں اپنے لوگوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے فطرت کے عطیے کا استعما کرنا چاہیئے جن کا ایک بڑا حصہ غریبی کی سطح کے نیچے زندگی بسر کرتا ہے اور نیم ا زندگی گذارتا ہے۔ . . .

آپ کا . . . . .

ایڈیٹر کو مذکورہ بالا خط تحریر کرنے والے کے پاس ان ماہرین ماحو کے مقابلے میں کہیں زیادہ معقول اور صحیح دلائل موجود ہیں، جنھوں نے معیشت کے تحفظ کے نام پر انڈمان میں ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کردی تھیں۔ فطرت پر اور ترقی پسندوں کے درمیان یہ ٹکراؤ اس وقت سے چلا آرہا ہے جب سے انسا معیشت حیوانات کے عدم توازن کے بغیر ترقی کے خطرناک نتائج کو سمجھا ہے۔

انسان اور حیاتیاتی ماحول کا پروگرام

۱۹۷۰ء میں یونیسکو کی عام کانفرنس کے سولہویں اجلا میں "انسان اور حیاتیاتی ماحول کا پروگرام" شروع کیا گیا تھا جس میں ترقی کے ساتھ مربوط تحفظ پر زور دیا گیا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد حیاتیاتی ماحول کے وسائل معقول استعمال اور تحفظ اور نیز انسان اور ماحول کے درمیان تعلق کو بہتر بنانے کے"

فضا اور سماجی علوم کے دائرے میں ایک بنیادی حکمت ہے۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد کل کی دنیا پر آج کی کارروائیوں کے اثرات کی پیش گوئی کرنا اور اس طرح سے حیاتیاتی ماحول کے قدرتی وسائل کا موثر طور سے انتظام کرنے کے لئے انسان کی صلاحیت میں اضافہ کرنا بھی ہے۔ مذکورہ پروگرام کے علاوہ فطرت کے تحفظ کے لئے بہت سے قومی اور بین الاقوامی پروگرام ہیں۔

چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اور نیا نظریہ کیوں شروع کیا جائے یا حیاتیاتی ماحول کے ذخائر کے بارے میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟ سیدھے سادے الفاظ میں مقصد یہ ہے کہ نباتات، حیوانات وغیرہ کی مجموعی گوناگونی کو برقرار رکھا جائے۔ اس کا مقصد محض جانوروں کی خصوصی اقسام جیسے ہاتھی، شیر کی نسل کے تحفظ کو یقینی بنانا نہیں ہے موجودہ پروگرام میں حیاتی گوناگونی کا مجموعی تحفظ شامل نہیں ہے ان پروگراموں میں پودوں کی نسلی گوناگونی کے تحفظ کی بھی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

انسان اور حیاتیاتی ماحول کے پروگرام کی اصل بنیاد قدرتی وسائل کے تحفظ ہوا اور پانی صاف کرنے کی صلاحیت، مٹی کی زرخیزی پر ہے۔

پودوں اور جانوروں کی نسلی گوناگونی سمیت حیاتیاتی گوناگونی کا تحفظ، انسان کے ترمیم کردہ اقتصادی نظاموں کا جائزہ، معیشت حیوانات کو برقرار رکھنے کی تکنالوجی کو فروغ دینا اور ان شعبوں میں تربیت دینا مذکورہ پروگرام کی اہم خصوصیات ہیں۔

سر الیگزینڈر فلیمنگ نے پنسلین کی دریافت کی اور بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان کی صلاحیت میں مزید اضافہ ہوا۔ زیادہ تر حیوانات ۹۰ فیصد سے لے کر [illegible] تک اب بھی نظر انداز ہیں۔ صرف ایک بہت چھوٹے حصے پر تحقیق کی گئی ہے۔ گرم ملکوں کے جنگلات میں تخمیناً ۲ ملین ریشوں اور دواؤں کے ذخائر کی حیثیت سے رکھنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن بدقسمتی سے بیشتر جنگلات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

اعداد و شمار کی بنیاد پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ بہت زیادہ اقتصادی صلاحیت کی حامل اقسام کے روئے زمین پر ختم ہونے کی وجہ سے کچھ بہت ہی اہم حیاتیات

ہمیشہ کیلئے معدوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تخمینہ کے مطابق پودوں کی ۲۵ ہزار اقسام نیز ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی ایک ہزار سے زائد اقسام بیسویں صدی کے اختتام تک معدوم ہو جائیں گی۔

ہر ایک جاندار حیاتیاتی کیمیا کا ایک کارخانہ ہے جس میں زبردست صلاحیت موجود ہے انسان زمین پر اپنی تجربہ گاہوں میں جتنی کیمیائی اشیاء تیار کر سکتا ہے" کے مقابلے میں ایک معمولی سا جرثوم اپنی پوری زندگی میں کہیں زیادہ متعدد قسم کی کیمیاوی اشیا تیار کر سکتا ہے اور ہر ایک قسم وہ بے مثال چیز تیار کرتی ہے جسے کسی دوسرے نے تیار نہیں کیا ہو۔

نسلی گوناگونی

خاص اقسام میں نسلی گوناگونی بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس گوناگونی سے وہ خام مال بنتا ہے جس پر زیادہ پیداوار والی فصلوں اور گھریلو جانوروں کی نسل کا دارومدار ہے۔ تاہم کیڑے مکوڑے جراثیم وغیرہ میں جو فصلوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، بذاتِ خود تیز رفتار ارتقائی تبدیلیوں کی صلاحیت ہوتی ہے۔ فصلوں کے تحفظ کے لئے خود فصلوں کی نئی نئی تناسلی صلاحیتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات صرف اگائے ہوئے بے شمار پودوں یا گھریلو جانوروں یا جنگلی جانوروں کی مدد سے ممکن ہو سکتی ہے۔

ساتویں دہے میں انڈونیشیا میں چاول کا ایک نیا کیڑا پہنچا ہے جو تمام چھوٹے قسم کے چاولوں کے لئے بہت زیادہ خطرناک تھا۔

"بھورے ٹڈے" نام کے اس کیڑے نے انڈونیشیا میں تقریباً دھان کی پوری فصل تباہ کر دی۔ یہ کیڑا پورے ایشیا میں پھیل سکتا تھا۔ ایک ہنگامی تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کیرالا میں چاول کی کچھ ملکی اقسام (مثلاً پٹابی قسم) میں اس کیڑے کی مزاحمت کرنے کی قوت ہے تب یہ صرف وقت کی بات تھی کہ مذکورہ اقسام میں پائی جانے والی مزاحمت کی مناسب قوت کو چاول کی زیادہ سے زیادہ پیداوار والی اقسام میں شامل کیا جائے اور اس طرح ان کا تحفظ کیا جائے لیکن جیسے جیسے فصلوں کی زیادہ پیداوار والی اقسام پھیلتی جا رہی ہیں سینکڑوں دیسی اقسام اور ان کے ساتھ ساتھ نایاب اشیاء ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ قدرتی پودوں کی

بہت زیادہ تباہی کی وجہ سے جنگلی فصلوں کا بھی نقصان ہوتا ہے کوئی بھی شخص بآسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اس چیز سے زرعی پیداوار کی رفتار کو برقرار رکھنے میں ہماری مسلسل کامیابی کو کس طرح نقصان پہونچے گا۔

مصنوعی حالات کے تحت جانوروں کی صرف ایک قسم کا تحفظ بھی بہت مہنگا ہے۔ جنگلی بکری کی ایک قسم کے لئے سال میں لاکھوں روپے خرچ ہوں گے۔ تصور کیجئے یہ اقسام بے شمار ہوں تو اس کا واحد قابلِ عمل حل یہ ہے کہ قدرتی حالات کے تحت حیاتیاتی گوناگونی کے اس قیمتی ورثہ کو برقرار رکھا جائے۔

انسان اور حیاتیاتی ماحول کے پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ حیاتیاتی ماحول کے ذخائر کا ایک عالمی نظام قائم کرکے حیاتیاتی گوناگونی کو جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھا جائے۔ پہلے حیاتیاتی ماحول کی نشاندہی ۱۹۷۶ء میں کی گئی تھی اور اس وقت ۶۵ ملکوں میں ۲۴۳ ذخائر ہیں۔ یہ ذخائر عالمی پیمانے پر ایک نظام تشکیل دینے کیلئے یکجا ہیں جس میں قدرتی اور مصنوعی اقتصادی نظاموں کے تحفظ اور اور انتظام کے متعلق اطلاعات کے تبادلے کی سہولیات مہیا ہیں۔

ہر حیاتیاتی ماحول کے ذخیرے میں قدرتی اقتصادی نظاموں کی مجموعی گوناگونی اور علاقے کے مصنوعی' زرعی و اقتصادی نظاموں کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک گوناگونی شامل ہوگی۔ مذکورہ پروگرام محض تحفظ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس پروگرام کے تحت ان علاقوں میں اقتصادی نظام دوبارہ تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جہاں یہ ختم کئے گئے ہیں یا ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ایک چوتھائی حصے کو اس قسم کی تشکیلِ نو کی ضرورت ہے چنانچہ حیاتیاتی ماحول کے ذخیرے کا آخری کام اقتصادی نظام کی تجدید کی کوششوں کے سلسلے میں مرکزی حیثیت سے خدمت انجام دینا ہے۔

تحفظ کے متعلق سائنس اور حیاتیاتی ماحول کے ذخیرے کے دائرے کے اندر معیشت حیوانات کے بارے میں مربوط تحقیقی پروجیکٹوں کو مذکورہ پروگرام میں اعلیٰ ترجیح حاصل ہے۔ حیاتیاتی ماحول کے ذخائر طویل مدت کے بنیادی اور اطلاقی تحقیقی پروگرام چلانے کے لئے محفوظ ترین جگہیں فراہم کرتے ہیں حاصل کردہ

اعداد و شمار ماحولیاتی تبدیلیوں اور رجحانات نیز ان کی تبدیلیوں پر ان کے عکوس کے بارے میں پیشن گوئی کرنے کی غرض سے نمونے تیار کرنے کے لئے بہت قیمتی ہوں گے۔

بھارتی علاقہ حیاتیاتی گونا گونی سے مالا مال ہے۔ تخمینے کے مطابق علاقہ میں پودوں کی تقریباً ۴۵ ہزار اقسام نیز جانوروں کی ۶۵ ہزار اقسام ہیں۔ انسانی اور حیاتیاتی ماحول کے پروگرام کے متعلق بھارتی قومی کمیٹی ۱۹۷۲ قائم کی گئی تھی جو ماہرین کا ایک کلیدی مشاورتی گروپ ہے۔ مذکورہ کمیٹی نے ملک میں تیرہ جگہوں کی نشاندہی کی تھی جن میں حیاتیاتی ماحول کے ذخائر صلاحیت ہے۔

مذکورہ ذخائر میں نیل گری (تامل ناڈو، کرناٹک اور کیرالا) نمدا (اروناچل پردیش)، نندہ دیوی (اتر پردیش)، اتر کھنڈ، پھولوں کی (اتر پردیش) انڈمان کے جنوبی جزائر، منار کی کھاڑی (تامل ناڈو) کازیرنگا (آسام)، سندربن (مغربی بنگال)، تھار ریگستان (راجستھان) مناس (آسام)، (مدھیہ پردیش) نوک ریک (میگھالیہ) اور رن کچھ (گجرات) شامل ہیں۔ ان منار کی کھاڑی میں سمندری معیشت حیوانات کا نظام ہے۔

حیاتیاتی ماحول کے چھ ذخائر (نیل گری، نمدا، نندہ دیوی، اتر منار کی کھاڑی اور نوک ریک) میں سے جن کے لئے پراجیکٹ رپورٹیں تیار ہو چکی ہیں، صرف نیل گری وجود میں آیا ہے۔ یہ ستمبر ۱۹۸۶ء میں قائم ہوا تھا۔ منصوبے پر عمل درآمد کیلئے مرکزی امداد ابھی جاری کی جانی ہے۔ ساتویں منصوبے میں حیاتیاتی ماحول کے ذخائر کے لئے چھ کروڑ روپے کی رقم مختص ہے۔ سال ۱۹۸۶-۸۷ء کیلئے ۱.۲۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ نیل گری پراجیکٹ پر موجودہ عملہ (جنگلی جانوروں اور جنگلات کے متعلق محکمے) عمل کرے گا۔ توقع ہے کہ بھارت میں انسان اور حیاتیاتی ماحول کے پروگرام کے تحت جلد ہی تیزی آ جائے گی۔ نیل گری میں حیاتیاتی ماحول کے ذخائر سے سائنسدانوں اور ماحولیات کے ماہرین کو گرانقدر مواقع اور تجربات حاصل ہوں گے

باقی برصفحہ

(پی آئی بی آف انڈیا)

نوجوانوں کی ترقی و بہبود کی پالیسی

کسی بھی ملک کی تقدیر وہاں کے نوجوانوں سے وابستہ ہوتی ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہیں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بوجھ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں اداروں حتیٰ کہ ممالک کو چلانے کے لئے نوجوان کو آواز دی جارہی ہے۔

ایک زبردست سماجی گروپ کی حیثیت سے نوجوان بھارت میں ملک کی آبادی کے ایک تہائی حصہ پر قابض ہیں جو ہماری ترقی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ کافی اہم ہے کہ ملک کی ترقی و فروغ کا مقصد طے کرتے وقت نوجوانوں کے مسائل اور ان کی آرزوؤں پر توجہ دی گئی۔ ملک کی ترقی بالمقابل فنون لطیفہ، ثقافت، کھیل، سائنس، ٹکنالوجی اور سیاست میں نوجوانوں کے ناقدانہ رول کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت نے نوجوانوں سے متعلق ایک قومی پالیسی کی پیشکش کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ تھا کہ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں نوجوانوں کے امور اور کھیل منصوبے کے پورے اخراجات ۴۳ء۲۹ کروڑ روپیہ اور ساتویں پانچ سالہ منصوبہ میں ۲۰۰ کروڑ روپیہ اس مقصد کیلئے رکھے گئے۔ وزیر اعظم نے سنہ ۱۹۸۶ء میں ۲۰ نکاتی پروگرام میں کھیل شامل کرنا اہم سمجھا ہے۔

کھیل میں تیز رفتاری

جسمانی تعلیم اور کھیل کے قومی ادارے کی سوسائٹی اور ہندوستان کی اسپورٹس اتھارٹی دونوں کو ایک دوسرے میں ضم کرکے بھارت کے وزیر اعظم کے تحت کھیلوں کا نیا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔

حکومت نے ہر ضلع میں مخصوص کھیل سے وابستہ میدانوں میں ضلع کی سطح پر ہونے والے ٹورنامنٹ میں جیتنے والے اسکولوں کو نئی کھیل دس ہزار روپے

نقد انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کھیل سے متعلق ذہانت کا انتخاب کیا جاسکے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران اس اسکیم کے تحت ۱۹ ریاستوں اور مرکز کے علاقوں میں ۹۰۰ سے زیادہ اسکولوں نے ۱ء۵ کروڑ روپے کے نقد انعامات جیتے۔

اسپورٹس اتھارٹی آف انڈیا نے ۱۴ سال تک کے بچوں کے لئے نیشنل سپورٹس ٹیلنٹ سرچ کمیشن بنایا ہے نیز مخصوص علاقوں میں مقامی کھیلوں سے وابستہ ذ کی ہمت افزائی کے لئے مخصوص علاقہ وار کھیلوں کا پروگرام بھی شروع کیا گیا ہے۔

سوشلسٹ ممالک کے اسپارٹا کیند کی طرح چار پائلٹ پراجیکٹ منائے جائیں گے جن میں طلبا، کارکن اور عام لوگ ڈرل اور کسرتوں وغیرہ کے سا پروگرام میں شریک ہوں گے۔ ۱۹۸۵ء میں ریاست کی سطح پر قومی کھیل دو شروع کیا گیا تھا جس کا انعقاد دو برسوں میں ایک بار ہوتا ہے۔ امپھال میں پہلی بار یہ تہوار شمال مشرقی علاقے اور سکم کے علاقائی کھیلوں اور عسکری فنو کے فروغ کے لئے منعقد ہوا تھا۔

حکام کے ذریعہ کھیلوں کو بہتر بنانے کے لئے کوچنگ کو فراموش نہیں کیا ہے۔ کھیلوں کی اصلاح و فروغ اور کھلاڑیوں کی بہتر تربیت کے لئے کھیلوں کے غیر معمولی کوچوں کے لئے دورناچاریہ انعام کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ثقافتی سرگرمیاں

۲۵ برسوں کے بعد ۱۹۸۵ء میں آل انڈیا یو کلچرل فیسٹیول منعقد ہوا تھا اور تب سے ہر سال یہ سلسلہ جاری ہے۔ حیدرآباد میں ۱۹۸۶ء میں نوجوانوں کا پہلا قومی لوک تہوار منعقد ہوا تھا جس میں دیہی نوجوانوں کے پروگرام نے نیا جوش و خروش عطا کرنے کے لئے نہرو یووا کیندریہ سنگھٹن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس تنظیم نے مذکورہ پروگرام کو مزید تقویت بخشی۔ سماجی خدمات اور قومی ترقی کے شعبوں میں نوجوانوں اور رضاکار اداروں کی غیر معمولی خدمات کی نشاندہی کے لئے سالانہ قومی یوتھ ایوارڈ کا اہتمام کیا تھا اس سلسلے میں پہلا انعام نوجوان کا قومی دن منائے جانے کے موقع پر ۱۲ جنوری ۱۹۸۷ء کو دیا گیا تھا۔

چار علاقائی مرکز قائم کرکے اور لیڈرشپ کی تربیت فراہم کرکے

اور گاندھی تحریک کو تقویت دی گئی تھی۔ یہ پروگرام ۸۲-۱۹۸۱ء میں عوامی خواندگی
کے عوامی پروگرام میں ۱٫۸۵ لاکھ سے زیادہ طلبا کو شریک کر کے تقریباً ۲٫۴ لاکھ
ان پڑھ افراد کو مستفید کیا۔ نوجوانوں کے اشتراک سے ماحولیات کی بہتری
اور گنگا کی صفائی اور بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے ایسے پراجیکٹوں میں
بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

مزید تحریک

نوجوانوں کی قوت وصلاحیت کو مکمل طور پر بروئے کار
لانے کے عمل کو غیر اطمینان بخش خیال کرتے ہوئے سرکار
نے نوجوانوں سے متعلق ایک قومی پالیسی کی تشکیل کی ہے جس کا مقصد نوجوانوں
کو تعلیم وتربیت کی سہولیات خصوصاً جدید ٹکنالوجی میں فراہم کرنا ہے تاکہ انھیں
روزگار حاصل ہو سکے۔ اس سے نوجوانوں میں ملک کے آئین اور اس کے
قوانین کی تعظیم بڑھے گی اور ہمارے ثقافتی ورثہ کی بیداری میں اضافہ ہوگا۔

مذکورہ پالیسی سے یہ بھی توقع ہے کہ نوجوانوں کی سماجی برائیوں کو ختم کرنے اور
امن، سیکولرزم، عدم تشدد اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے بروئے کار لایا جائے گا۔
اور یہ پالیسی نوجوانوں میں مستقل مزاجی، تہذیب، خود اعتمادی، دردمندی، کھیلوں کے
جذبے اور سائنسی مزاج کے فروغ کی کوشش کرے گی۔

علاوہ ازیں خود ساختہ، ترقی اور سماج اور فرقوں کی خدمات اور قوم کی تعمیری
تدابیر میں ان کی شرکت کے ذریعہ مذکورہ پالیسی نوجوانوں میں بہتر افراد پیدا کرے گی۔

تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کے وزرا برائے نوجوان امور
اور کھیل کا ایک بہت اہم اجلاس بہت جلد بنگلور میں منعقد ہوگا۔ اس اجلاس
میں نوجوانوں کی مختلف سرگرمیوں کے قومی پراجکٹ مثلاً عملی خواندگی، گنگا ایکشن منصوبہ
بنجر زمینوں کے فروغ اور بے گھروں کے لئے گھر کے عالمی سال پر غور وخوض کیا جائیگا۔

کالجوں میں قومی خدمت سے متعلق اسکیم کے فروغ کا جائزہ لیا جائیگا
اور ایک عملی منصوبہ تشکیل کیا جائے گا۔ نوجوانوں کے قومی استحکام اور ریاستوں کے
قومی استحکام پر گفت وشنید کے علاوہ یوتھ ہوسٹل اسکیم کی ترقی کا جائزہ بھی لیا جائیگا۔
نہرو یووا کیندر سنگٹھن کا رول اور ان کے کام اور ریاستوں کے تعاون کی

تعلیمات پر بھی غور وخوض کیا جائے گا۔ اسکاؤٹس اور گائڈز کی تحریک کو فروغ دیا جائے گا۔

مذکورہ اجلاس میں کھیل سے وابستہ امور پر الگ سے غور کیا جس میں ضلع کے متعدد مقامات اور دیگر جگہوں کے کھیلوں کے میدانی اور بنیادی ڈھانچہ کے فروغ، کھیلوں کی ترقی وفروغ، نئی تعلیمی پالیسی کے اداروں میں جسمانی اور یوگا کے فروغ کھیلوں کی وسیع پیمانے پر ضرورت ریاست کے ذریعہ ادا کئے گئے رول، ذہانت کے خصوصاً انتخاب کو بنا کھیلوں کے فروغ اور کوچنگ وغیرہ کے امور پر غور وخوض کیا جائے گا اور ریاست کی سطح پر کھیلوں سے وابستہ اداروں کی حکمت عملی کے لئے رہنما کرنے پر بھی غور کیا جائے گا۔

ہفتہ وار "مہذب" جاری کیا، ۱۸۹۱ء کے بعد تین ماہوار رسالے الفرقان، دل اور مورخ شائع کئے، ایک ہفتہ وار اخبار "ظریف" اور عورتوں کے معاشرتی مسائل [illegible] میں پندرہ روزہ "عصمت" جاری کیا۔ ۱۸۸۷ء میں شرر نے دلگداز نکالا جس کے ذکر کے بغیر ادب لطیف کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا، اس رسالے میں شرر ایک انشاء پرداز نظر آتے ہیں، ایک ایسے انشاء پرداز جس کی انشاء پردازی نے انشاء پردازوں کو متاثر کیا۔" ص۱۲

غرض عبدالحلیم شرر لکھنوی کی ہستی میں ایک جامع الکمالات شخص تھی، دسمبر ۱۹۲۶ء میں بمقام لکھنؤ ان کے انتقال کے ساتھ ہی ایک عہد ادب ہوا، ادب لطیف کا گہوارا سونا ہوگیا، اردو ادب کی تاریخ میں شرر کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

سید مطہر مہدی



طنز و مزاح

۱

شوکت تھانوی

طنز و مزاح کے متعلق سلمیٰ صدیقی نے اپنے مضمون میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے

"گذشتہ پچاس برسوں میں اس "صنفِ ادب" کی طرف بھی توجہ دی گئی اور آہستہ آہستہ نصف صدی کی مدت طے کرنے کے بعد طنز و مزاح کے بلب کو ادب نے اپنی سرپرستی میں قبول کر لیا۔"

طنز و مزاح کا استعمال نثر و نظم ہر دو میں ہوتا ہے، اس کے استعمال کے لئے نہ مخصوص ہیئت کی قید ہے اور نہ کوئی متعین اجزائے ترکیبی ۔۔۔ یہ تو صرف اور صرف طرزِ نگارش یا اندازِ تحریر کوئی بھی صنف بذاتِ خود طنزیہ، مزاحیہ یا ظریفانہ نہیں ہوتی، بلکہ ظرافت، مزاح اور طنز اظہار کے سلیقے

طنز و مزاح کے واضح نقوش ہمیں ابتداء میں مغربی ادب سے ہی ملتے ہیں۔ مغربی ادب سوئفٹ نے طنز کے تیر و نشتر برسائے ہیں تو برنارڈ شاہ نے طنز کی شدت میں مزاح کا عنصر شامل مغربی ادب کے ساتھ اردو ادب میں بھی طنز و مزاح کی داغ بیل پڑی۔

اردو ادب میں سب سے پہلے "اودھ پنچ" نے مزاح کا انداز اپنایا۔ پھر غالب نے اپنے خطوط ظریفانہ رخ اختیار کیا جو مزاح کی شگفتگی کے ساتھ طنز کی کاٹ بھی رکھتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے منظوم طنز و مزاح کے ذریعہ سماجی زندگی پر "تازیانے" کا کام انجام دیا۔ سرشار نے مزاحیہ کردار بطورِ "خوجی" کو نمائندہ بنایا تو نذیر احمد نے خالص طنزیہ کردار کی نمائندگی "مرزا ظاہر دار بیگ" کو بخشی۔ طنز و مزاح میں اودھ پنچ کے مضمون نگار کے علاوہ سرشار، فرحت اللہ بیگ، پطرس، رشید احمد صدیقی، عظیم بیگ چغتائی، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن (پھر آزادی کے بعد لکھنے والوں میں) کرشن چندر، فرقت کاکوروی، فکر تونسوی، خواجہ عبدالغفور، مجتبیٰ حسین، ...

یوسف ناظم، دلاور فگار، رشید قریشی اور مجتبیٰ حسین وغیرہ شامل ہیں اور قابل ذکر ہیں۔
ان صفحات میں شوکت تھانوی کا ذکر مقصود ہے جن کے تعلق سے فکر تونسوی نے یوں لکھا ہے:

"شوکت تھانوی ہر فن مولا تھے، افسانے، ڈرامے، شاعری، خاکے اور کالم نگاری — اگر ان سے محفوظ رہا تو تنقید — بلکہ بقول ان کے تنقید سے وہ محفوظ رہے اور اللہ تعالیٰ کا ان پر بڑا کرم ہے۔"

شوکت تھانوی ۱۹۰۴ء کو تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صدیق احمد صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل تھے، مولانا کا پورا نام "محمد عمر" تھا۔ انھوں نے خود اپنا تاریخی نام اپنی سوانح میں "تسخیر احمد" لکھا ہے۔ ان کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی، لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ یہیں گزارا۔ تھانوی مخصوص نام کے تھے جبکہ 'زبان' کے لحاظ سے مکمل لکھنوی محسوس ہوتے تھے، لکھنوی روزمرہ اور محاوروں پر کافی عبور تھا۔ تحریر سلیس، صاف اور رواں ہوا کرتی تھی۔ ان کی تحریر پڑھنے کے بعد بے ساختہ "واہ" نکل جاتی۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر دماغی میں اپنی نظیر آپ تھے۔

سب سے پہلے غالباً "اودھ اخبار" لکھنؤ کے ادارتی عملہ میں کام کیا پھر لکھنؤ کے دوسرے روزنامہ "حق" میں آ گئے اور اپنا ایک رسالہ "کائنات" نکالا۔ "سرپنچ" کے مدیر بھی رہے۔ تقریباً ۱۹۲۹ء میں "سودیشی ریل" خود کو ممتاز کروایا اور پھر یہ سلسلۂ تحریر چل پڑا تو شہرت کے زینے طے کرتے چلے گئے۔ ان کا سب سے پہلا ناول "دل پھینک" ہے۔ مختصر مزاحیہ مضامین کے علاوہ یہ ناول لکھ کر انھوں نے یہ راز آشکارا کر دیا کہ وہ واقعی منفرد انداز تحریر کے حامل ہیں۔ انھوں نے بغیر پلاٹ کے بھی ہر مضمون کو انتہائی دلچسپ پیرائے میں پیش کیا جو ان کے انوکھے طرز بیان اور الفاظ کی چست بندش کا نمونہ ہیں۔ ان کی تحریر شگفتہ اور برجستہ ہونے کے علاوہ خوشنما اور قابل دید ہوا کرتی۔ ان کی تحریر کا بناؤ، چناؤ اور بے تکلفانہ انداز و سلیقہ اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر سبزواری نے طنز کی یوں وضاحت کی ہے:

"طنز ایک طرح کی تنقید ہے، ایک قسم کا عمل جراحی ہے، اس کے نشتر کس قدر نوکیلے ہوتے ہیں۔ طنز کی ادب میں اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے ..... طنز ہی کے ذریعہ کسی کی خامیوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور طنز کے لئے اشاریت لازمی عنصر ہے۔"

شوکت تھانوی کی تحریر کا خاصا "اشاریت" ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں بذریعہ طنز سماجی کمزوریوں کی نشاندہی ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی تحریر کے ذریعہ اصلاح کی سعی بھی کرتے ہیں۔ ناول "دل پھینک" میں ایک نواب صاحب کی سادہ لوحی جو عشق کے مدارج طے کرتی ہے اس میں

مزاح نگار نے عشق کی ان خامیوں کی نشاندہی کی ہے جہاں عاشق اپنے تمام ہوش کھو کر صرف بدحواس نظر آتا ہے۔ عاشق اور بدحواسی کے شکار ہیرو کو مصنف نے ایک تعلیم یافتہ سوسائٹی کا نقلِ محفل بنا دیا ہے جہاں مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکیاں اور نوجوان "خندہ زن" نظر آتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے اپنے ناول "مولانا" کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے "میں ڈاڑھی نہیں رکھتا، سر نہیں گھٹاتا، شرعی پاجامہ نہیں پہنتا، لمبا کرتہ اور چوگوشہ ٹوپی بھی میرے لباس میں شامل نہیں ہے اس کے باوجود جج صاحب کے یہاں میرا نام "مولانا" پڑ گیا۔ قصور صرف یہ ہوا کہ جج کے گھر آ کر حسب عادت میں نے جو نماز پڑھی تو سارا گھر میرے گرد اس طرح جمع ہو گیا گویا میں کوئی کرتب دکھا رہا ہوں۔ سب سے پہلے مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے نزہت نے دیکھا اور وہ ایک دم چیخ اٹھی "گڈ لارڈ نماز" بس پھر بھاگ بھاگ کر سب کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا ...... میں نے سلام پھیرا تو سب ہنس ہنس کر مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ جج صاحب نے کہا بھئی تم تو بڑے اللہ والے نکلے، بے بی نے اچھا نام رکھا ہے "مولانا"۔

ان کا ایک اور ناول "بڑ بھس" خود اپنے نفس مضمون کی وضاحت کرتا ہے۔ اس میں لب گور میر صاحب کی بوالہوسی کا خاکہ جس پرلطف انداز سے پیش کیا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ دراصل "بڑ بھس" ایک اصلاحی ناول ہے جس کا ہر باب نصیحت آمیز اور مقصدیت سے لبریز ہے۔

ان کا ایک ناول "۱۹۴۰" عنوان میں تبدیلی کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن) بعد میں "۱۹۵۸" کے نام سے بھی شائع ہوا۔

انھوں نے کئی ناول، خاکے، مضامین اور افسانے لکھے جن میں "سسرال"، "انشاء اللہ"، "بکواس"، "سپنے"، "شیطان کی ڈائری"، "کائنات تبسم (۲۰ افسانوں کا مجموعہ)"، [illegible]، "مسز خاتون"، "بیوی"، "موج تبسم"، "بحر تبسم"، "خدانخواستہ"، [illegible]، "قیامت"، "حماقۃ الحکماء"، "سودیشی ریل" اور "بڑ بھس" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریر میں آمد ہی آمد کا انداز نمایاں ملتا ہے وہ مزاح کے ساتھ لطیف پیرائے میں طنز بھی کر جاتے ہیں۔ ان کے یہاں مزاح و طنز بے مقصد نہیں ہوتا بلکہ ان میں اخلاقی و اصلاحی پہلو نمایاں ہوا کرتے ہیں چاہے وہ اخباری تحریر ہو یا ریڈیائی تحریر ہر ایک میں تعلیم، تبلیغ، مشرقیت و شرافت ہوا کرتی ہے۔

"[illegible] محل" نامی ایک کتاب میں انھوں نے جملہ ۱۴ ادبی شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے

حجاب، آغا حشر، اثر لکھنوی، آنند نرائن ملا، اختر شیرانی، اصغر گونڈوی، محمد اقبال،
پریم چند، پطرس، پیارے لال شاکر، جاں نثار اختر، جذبی، جگر، جوش، حسرت،
مجاز، کرشن چندر، علی سردار جعفری اور نیاز فتح پوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شیش

حرفِ اول میں لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں ان شعرا اور ادبا کا تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے جن سے میں کسی
صورت سے مل چکا ہوں اور میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرا ذاتی مطالعہ ہے اور مجبور
ہے کہ میں نے اپنے مطالعہ کو 'ہمیشہ غیر مستند' سمجھا ہے۔"

عقیدے کے اعتبار سے وہ "پختہ مسلمان" تھے اور اعمال کی کمزوریوں کو تا
وشرمسار رہا کرتے۔ لکھنؤ ریڈیو میں ان کا کردار "منشی جی" ایک منفرد انداز لئے
پھر جب تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوئے تو ریڈیو لاہور میں اس منشی جی کی جا
"قاضی جی" کے حصہ میں آئی۔ ہر دو کردار کی معصوم دل لگیوں سے سامعین لوٹ پوٹ ہو

شوکت تھانوی شعر بھی موزوں کرتے تھے، ان کی شاعری کا اندازہ اس سے ا
ہے کہ وہ جب کبھی کسی مشاعرے میں کلام پیش کرتے تو سامعین اپنے اپنے انداز
الاپ کر انھیں "ہوٹ" کرتے لیکن باوجود اس کے وہ شعر کہنے سے باز نہیں آ۔
کی پہلی غیر شعوری کوشش ملاحظہ فرمائیے:

"نہ روٹی نہ سالن میں بھوکا رہوں گا — ارے میرے اللہ میں کس سے

اپنی شاعری کے تعلق سے خود ان کے احساسات ملاحظہ ہوں:

"یہ شاعر بھی ہیں، جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو
آجاتی ہے، خدا کے لئے انہیں سمجھاؤ کہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور
شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر "یوم نجات" مناؤ۔"

آپ کی شاعری کی نمائندہ نظمیں شہادت عظمیٰ، روح روان وطن، فیملی پلاننگ
قابل ذکر ہیں۔ وہ (شذرات) ایڈیٹوریل بھی لکھا کرتے تھے۔ فروری ۱۹۳۰ء میں
نے ظریف نمبر نکالا جس کا ایڈیٹوریل شوکت تھانوی ہی نے لکھا۔

شوکت تھانوی کالم نگار بھی تھے، کالم نویسی میں وہی مزاح نگار کامیاب
جو حاضر دماغی کے ساتھ مسائل کا ادراک رکھتا ہو، وقت، زمانے اور عوام کے مزاج
سے آگاہی رکھتا ہو، اس کے علاوہ وسیع معلومات اور پاکیزہ مذاق کا حامل بھی ہو تاکہ

کوئی بات کہہ کر ہنسا بھی سکے اور موقع محل کی مناسبت سے طنز کے تیر بھی چلا سکے تاکہ سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کا تدارک بھی ہو سکے۔ مولانا کی حاضر دماغی خوش مزاجی میں انفرادیت اور انوکھا پن ہوا کرتا تھا۔ ان کی پہلو دار شخصیت میں بڑی ہمہ گیری و تنوع تھا۔ ان کی کالم نگاری کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

خدائی فوجدار، عدم مساوات، لسانی مسائل، شیڈیولازم، بیگم صاحبہ، مشہور پیشے، خاکسار رشوت وغیرہ۔ کالم نویسی کا آغاز "ہمدم" سے کیا اور تحریک، اور اخبار، سرخ، طوفان، ہند حق اور جنگ میں مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ ہندو پاک کے اخبارات ان کے کالم کے بغیر اپنے آپ کو "ادھوری صحافت" تصور کرتے تھے۔ ان کا ایک کالم "پروفیسر" کے عنوان سے ہے پیش خدمت ہے:

"ایک زمانہ تھا کہ پروفیسر، علم اور تجربہ کی اس مشین کو کہتے تھے جو تعلیمی کالجوں میں پائی جاتی تھی اور جس سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ جاہلوں کو عالم بنایا جائے۔ لیکن آج کل کئی قسم کے پروفیسر نظر آتے ہیں جیسے میجک کے پروفیسر، پروفیسر بلاقی وغیرہ۔ پروفیسر رام مورتی، جو دو موٹروں کو کان پکڑ کر روک لیتا تھا اور ہاتھی کو اپنے سینے پر اس طرح کھڑا کر لیتا تھا جس طرح آپ یا ہم بچوں کو کھلاتے ہیں۔ اب بتائیے اگر وہ پروفیسر کہلاتا تھا تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ اسی طرح آج کل لنکا میں ایک پروفیسر بی ڈی لوک پیدا ہوئے ہیں جو بغیر آنکھ کی مدد کے دیکھنے کا طریقہ ایجاد کر چکے ہیں اور اب اس فکر میں ہیں کہ اندھوں کو موٹر ڈرائیوری کی تعلیم دے کر کارآمد بنا دیں۔ ان کا یہ معجزہ نمائی کیا اس کی مستحق نہیں ہے کہ وہ اپنے کو پروفیسر کہیں... ایسے ہی پتہ نہیں کون کون پروفیسر ہیں جیسے پروفیسر شہباز جادوگر، پروفیسر فاکس اور پروفیسر ڈھول وغیرہ..... وہ دن دور نہیں جب، باورچی پروفیسر چمن خان اور درزی، پروفیسر درزی خان، اور غسال، پروفیسر غسل خان کہلائیں گے۔"

کالم "موازنہ لکھنو و لاہور" میں ان علاقوں کی تہذیب کے ساتھ ساتھ وہاں کے انسانوں کا موازنہ بھی کیا ہے جو مزاح کی شگفتگی کے ساتھ تیر و نشتر سے معمور ہے۔

شوکت تھانوی کچھ دن فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے

وہ بیک وقت کالم نگار، مزاح نگار، طنز نگار، پیروڈی گو، لطیفہ گو، بذلہ سنج، مضمون نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، شاعر، ظریف، ریڈیو آرٹسٹ اور فلم آرٹسٹ غرض کہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ طنز و مزاح کا یہ البیلا فنکار ... ۱۹۶۳ ... ان کا ...

میں بلا کی برجستگی اور سادگی میں کبھی کبھی طنز کے تیر و نشتر بھی۔ اس طرح مزاح نگاری کے ساتھ طنز کا استعمال بھی نہایت سلیقے سے کیا ہے۔ ان کی ظرافت کے پردے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی اخلاقی، سیاسی یا سماجی پہلو پر طنز ہوتا تھا۔ اردو دنیا میں "اودھ پنچ" کے بعد شوکت تھانوی کا "سرپنچ" "طنز و مزاح کا گراں مایہ خزانہ" ان کے ستّو کے قریب سدا بہار تصانیف زندہ و تابندہ انتخابات ہیں جن کے مطالعے سے اردو کے "مزاحیہ ادب" میں شوکت تھانوی کا مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔

انھوں نے تقریباً (۶۰) ساٹھ برس کی عمر پائی۔ کینسر (Cancer) کا عارضہ لاحق ہوا اور بھی سنہ ۱۹۶۳ء (دسویں ذی الحجہ) کو عید ہی کے دن اپنی "یاران شگفتگی" کو اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ درحقیقت زندہ دلی کے ایک دلکش و نفیس مرقع کا نام "شوکت تھانوی" تھا ان کی موت سے اردو طنز و مزاح نگاری کو شدید نقصان پہنچا۔

خانہ بدوش زیست کی ہلچل میں تھے اسیر
موت آ گئی، سکون ملا، گھر کے ہو گئے

تیرے در کے فقیر ہوتے ہیں
کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

موت سے زیست کا شعلہ کہاں بجھتا ہے علیم
صرف احساس کو اک نیند سی آ جاتی ہے

سلسلہ نمبر (۲۲)

اسلام اللہ کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے۔ سورۂ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں، آخری آیت ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ ٥

ترجمہ: اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہ وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا ضامن ہے۔

(ماخوذ)

ڈاکٹر مجید بیدار

عبدالحلیم شرر

شخصیت اور فن

کہانی کہنا اور کہانی لکھنا یہ دو ایسے کارنامے ہیں جن کی بدولت انسان کے شعور اور تخیل کو بالیدگی ملتی ہے اور دلچسپ و دلفریب مسرت و شادمانی کے ساتھ فکری بصیرت سے بھی مستفید ہوتے ہیں۔ اردو زبان اور ادب کی تاریخ میں کہانی لکھنے کا عمل داستان سے شروع ہو کر دور جدید کی مختصر افسانہ اور افسانچہ نگاری تک پہنچتا ہے۔ کہانی لکھنے کی سرزمین میں کہانی کا ایک ایسا روپ بھی نمایاں ہوتا ہے جو دلپذیر اور دلربا ہونے کے علاوہ فکر اور تخیل کو کئی وادیوں کی سیر کراتا اور شعور کو نئی انچ بخشتا ہے۔ کہانی کے اسی روپ کو "ناول" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا سلسلہ ۱۸۵۷ء کی غدر کے بعد سے شروع ہو کر آج تک چل رہا ہے۔ اردو ادب کے فکشن میں ناول ایک ایسی واحد صنف ہے جو گذشتہ تقریباً ایک سو بیس سال سے نثری ادب پر حکمرانی کر رہی ہے۔

اردو کے نثری ادب میں کہانی کو ناول کے روپ میں پیش کرنے والوں کی صف میں عبدالحلیم شرر لکھنوی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ناول کو محض کہانی یا قصہ کے اظہار کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ تاریخی واقعات سے قصے چن چن کر ناول کے فن میں ایک ایسی وضع کی بنیاد ڈالی جسے اردو ادب میں "تاریخی ناول" کی حیثیت میں شامل کیا جاتا ہے۔ شرر لکھنوی نہ صرف تاریخی ناول نگاری کے بانی ہیں بلکہ اس طرز کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے کا سہرا بھی شرر کے سر ہے۔

ادب ہمیشہ کسی نہ کسی مقصد سے وابستگی رکھتا ہے۔ شرر کا ناول لکھنا بھی ایک مقصد

مولانا آزاد کالج - روضہ باغ - اورنگ آباد

... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شکیل احمد "چند اہم نثر نگار" میں لکھتے ہیں:

"شرر نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب امراء کے دربار اجڑ چکے تھے۔ ادیب و شاعر ہی میدان کارزار میں رہ گئے تھے۔ اُن کے سامنے شکست خوردہ عوام اور ان کے مسائل تھے، وہ اپنی گم شدہ توقیر ... کی تلاش میں تھے، شرر نے ... ناولوں ... سے ... میں بیداری پیدا کی، اپنے قلم کو ... ماضی ... سے ... کے نقوش ... کے ذہنوں میں منتقل کرکے ان میں حرکت اور حرارت پیدا کی جا سکے، انھوں نے اپنے قاری کو ماضی کی سیر ضرور کرائی لیکن یہ فن دل کے بہلانے کے لئے راہ فرار اختیار کرنے اور گزشتہ عافیت تلاش کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ ماضی سے سبق لیتے ہوئے حوصلہ بڑھانے اور مستقبل کے لئے کچھ کر دکھانے کے لئے تھا، آہ و فغاں کی جگہ بیداری کی لے کی ضرورت تھی اور اس دور کے اکثر ادیب و شاعر اسی فرض کو نباہنے کی جدو جہد کرتے رہے"

شرر کی تاریخی ناول نگاری کے پس پردہ درحقیقت گم شدہ تہذیبی نقوش ابھار کر قوم کو ... کرنا تھا تاکہ وہ مستقبل میں متحرک اور ترقی یافتہ قوم بن سکے۔ چنانچہ شرر کی ناول نگاری کا آغاز ۱۸۵۷ء کی غدر کے ۲۸ سال بعد ۱۸۸۵ء میں ہوتا ہے جبکہ انھوں نے پہلا ناول "دلچسپ" لکھا۔ شرر کی ناول نگاری کی شروعات سے قبل ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار نے کہانی کو ناول کے پیرائے میں بیان کرنے کی بنیاد رکھ دی تھی لیکن وہ بذات خود لفظ ناول اور اس کے فن سے واقف نہ تھے۔ شرر لکھنوی ہی وہ یگانۂ روزگار ہیں جنھوں نے شعوری طور پر انگریزی لفظ "ناول" مفہوم یا ... قصے کے لئے رواج دیا۔ اور فنی خصوصیات کی تکمیل کرتے ہوئے ایسے ناول لکھے جو اردو ادب کی ساکھ بن گئے۔ شرر کے ناولوں میں علمیت، ادبیت، فنکارانہ چابکدستی کے علاوہ ایک ... انداز پایا جاتا ہے اور تمام تر ناول قاری کی توجہ کو اپنی مٹھی میں بند رکھتا ہے، اسی امتیاز کی وجہ سے شرر اردو ناول نگاری کے میدان میں منفرد مرتبہ کے حامل قرار دئے جاتے ہیں۔

مولانا شرر لکھنو کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین نواب واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ شرر لکھنوی کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں شرافت حسین مرزا "شعاع ادب" میں لکھتے ہیں:

"شرر ۱۸۶۰ء میں بمقام لکھنو پیدا ہوئے اور گھر پر کچھ دنوں تعلیم حاصل کرتے رہے لیکن صرف آٹھ برس بعد ان کے والد نے ان کو کلکتہ بلوالیا اور وہیں فارسی اور عربی

درسیات کی ابتدا ہوئی، کچھ دن بعد شرر لکھنؤ آ گئے اور یہاں اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا
اور نانا ۱۵ برس کی عمر میں نانا کی جگہ دربار میں ملازمت حاصل کی۔ ۱۹ برس کی عمر میں
مولانا کی شادی ہوگئی، اسی زمانے میں آپ مولوی عبدالحی سے عربی کتب کا درس
لیتے تھے، چونکہ تحصیل علم کا شوق تھا اس لئے دلی کا سفر اختیار کیا اور علم حدیث کی
تحصیل کی، اسی سفر میں ان کی ملاقات سرسید احمد خان سے بھی ہوگئی اور دلی میں
قیام کے دوران ہی میں انھوں نے مولانا محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ایک مذہبی رسالہ توحید
کا اردو میں ترجمہ کیا، یہی شرر کی پہلی تصنیف تھی۔ ۱۸۵-۱۸۶

شرر لکھنوی اردو کے ناول نگار ہونے کے علاوہ ایک بہترین عالم اور علم دین کے محقق تھے، انھوں
نے علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی تھی، علم حاصل کرنے کی لگن ان کا اہم ترین مشغلہ تھا، ان
کی علم دوستی اور حصول علم کی کوشش کے گن گاتے ہوئے "مصنفین اردو" کے مؤلف لکھتے ہیں:
سید علی حیدر نظم طباطبائی سے منطق و فلسفہ پڑھا اور اسی زمانے میں علم مغربی حاصل کیا
حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی اور چندے مطب بھی کیا۔ نظم طباطبائی سے شاعری
میں تلمذ کا شرف حاصل کیا، ۱۸۸۱ء میں اودھ اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے
اور اپنی ادارت میں ہفتہ وار رسالہ "محشر" نکالا، پھر اودھ اخبار سے قطع تعلق کر کے پہلا
ناول "دلچسپ" لکھا ..... ۱۸۸۷ء میں رسالہ "دلگداز" جاری کیا جو آپ کے
آخری دم تک جاری رہا، ۱۸۹۲ء میں آپ دکن تشریف لائے، نواب وقار الامراء نے اپنی
ریاست سے دو سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا، ۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامراء
کے صاحبزادے کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے، انگلستان سے واپسی کے چھ ماہ
بعد آپ دکن سے پھر لکھنؤ آئے۔ ۹۱

شرر کو شعر گوئی اور ناول نگاری سے فطری دلچسپی تھی، اس کے علاوہ علم حدیث، علم فقہ،
فلسفہ اور طب میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے، شرر تخلص کے ساتھ شاعری کی لیکن وہ شاعری
میں مقبول نہ ہو سکے بلکہ اردو کے ایک نامور ناول نگار اور تاریخی واقعات کو ناول کے روپ
میں پیش کرنے والے ایک مشہور ادیب کی حیثیت سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

اردو ادب میں شرر کے مرتبہ کا جائزہ لیتے ہوئے علی احمد فاطمی نے اپنی کتاب "تاریخی
ناول فن اور اصول" میں لکھا ہے:

اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی ... ۱۰ ... بالطبع ...

واقعہ یہ ہے کہ شرر وہ اولین ناول نگار ہیں جنہوں نے اپنے ناول کے [illegible] میں تاریخ کا با ضابطہ استعمال کیا اور اپنے پہلے تاریخی ناول ملک العزیز ورجنا (۱۸۸۸ء) کے ذریعہ اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی [illegible] ادبی زندگی کے وسائل سے اردو فکشن کے سرمایہ [illegible] تاریخی ناول ہو گئے [illegible] ایسے حالات اور وسائل جن کی بدولت عبدالحلیم شرر نے ناول نگاری کے فن سے وابستگی اختیار کی اور اردو ادب کے سرمایہ کو سربلندی عطا کی، [illegible] جانب اشارہ کرتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

"پھر حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ کچھ دنوں کے لئے بیکار ہو گئے، اس بیکاری نے اور منشی سجاد حسین (ایڈیٹر پیام یار) کی دوستی نے ان کو ناول لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی [illegible] کے درمیان ان کا پہلا ناول "دلچسپ" منظر عام پر آیا" ص ۱۴۳

ناول نگاری کے آغاز سے قبل عبدالحلیم شرر "اودھ اخبار" سے وابستہ تھے اور اس اخبار کے لئے مضامین لکھنا شروع کیا۔ مضمون نگاری میں انہوں نے خاص مقبولیت حاصل کی اور بعض مضامین کی سر سید احمد خاں نے بھی تعریف کی ۱۸۸۴ تا ۱۸۸۱ تک مضامین کا سلسلہ جاری رہا پھر ۱۸۸۵ء میں "دلچسپ" ناول لکھ کر انہوں نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ شرر کے اکثر ناول تاریخی واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس لئے انہیں تاریخی ناول نگار کی حیثیت میں شمار کیا جاتا ہے، انہوں نے تقریباً ۲۰ ناول ۱۵ تاریخی اور سوانحی کتابیں اور ۶ ضخیم مضامین کے مجموعے اپنے پیچھے چھوڑے ہیں۔ صحافت کو پیشہ بنانے والے اس ادیب نے جب ناول کے میدان کو اختیار کیا تو اردو ادب کی تاریخ میں ایک تہلکہ مچ گیا اور انہیں اردو میں تاریخی ناول نگاری کے بارے میں ناقدین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ شرر کی ناولوں کی ضروری تفصیلات عہد واری اساس پر پیش ہیں تاکہ ان کی ادبی کوششوں کو عہد واری اساس پر دیکھا جا سکے۔

۱۸۸۵ء میں شرر نے اپنا پہلا ناول "دلچسپ" لکھا جس کا تمام تر پلاٹ مشرقی ہے اور فرخ کی سوانح کی داستان بیان کرتے ہوئے عشق کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، جنوری ۱۸۸۷ء میں پہلی بار "دلگداز" نکالا، اس دوران دوسرا ناول "دلکش" تحریر کیا۔ مشرقی داستانوں کا انداز نمایاں ہے پھر بھی اس ناول کے پلاٹ میں [illegible] دلی کا جوش تخلیق کیا گیا ہے۔ اس ناول کی زبان بڑی پیاری ہے۔

بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناول "درگیش نندنی" اشاعت ۱۸۶۵ء اور اردو ترجمہ کی اشاعت ۱۸۸۵ء کے درمیان انھوں نے اسکاٹ کا مشہور ناول طلسمان TALISMAN مطالعہ کیا اور چند جذبات انگیز پہلوؤں سے مشتعل ہو کر جواباً جنوری ۱۸۸۸ء میں بہ تسلسل ملک العزیز ورجنا کی اشاعت کا اعلان کر دیا۔ شرر کا یہ پہلا تاریخی ناول تھا جو اپنی روح مزاج اور ہیئت کے اعتبار سے بالکل مختلف تھا اور اردو کا پہلا تاریخی ناول تھا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس ناول میں شاہ رچرڈ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی معرکہ آرائیاں اور میدان جنگ کے نظارے پیش کئے گئے ہیں جس میں بھی تاریخی حکایتیں اور عشق کی کہانی بھی شامل ہے۔

اردو ادب میں منفرد مقام حاصل کرنے والا ناول "فردوس بریں" شرر کے قلم سے ۱۸۹۹ء میں عالم وجود میں آیا۔ اسی سال شرر نے "حسن انجلینا" ناول بھی لکھا۔ ڈاکٹر احسن فاروقی "فردوس بریں" کے متعلق لکھتے ہیں:

"فردوس بریں ان کے تمام ناولوں میں بہتر ہے۔ اس میں اتفاق سے وہ کچھ ایسی کامیابی ضرور حاصل کر گئے ہیں کہ ان کا نام اس کی وجہ سے یاد رہے گا۔ اس ناول میں ان کی عام کمزوریوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی خوبیاں بھی آگئی ہیں جو قابل تعریف ہیں۔" ص ۱۱۵

اسماعیلیوں اور باطنیوں کے حیرتناک واقعات کو حسین اور زمرد کے عشق کے روپ میں "فردوس بریں" لکھی گئی ہے جس کے اہم کردار شیخ علی وجودی کی فطرت میں شرر نے متعدد خصوصیات کو نمایاں کیا ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں "فردوس بریں" اپنی ادبی اور فنی خصوصیات کی وجہ سے منفرد مقام رکھتی ہے۔

"حسن انجلینا" بھی ۱۸۹۹ء کی تصنیف ہے جس میں شرر نے روس اور ترکی جنگ کے نقشے کھینچے ہیں۔ یہ ناول سنی شیعہ تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے لکھا گیا جس میں روس اور شام کی معرکہ آرائی کو قصے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

سندھ کے الصدوی خاندان کا قصہ اپنے ناول "منصور موہنا" میں بیان کرتے ہوئے شرر نے ۱۸۹۱ء میں لکھتے ہوئے اس ناول کے ذریعہ محمود غزنوی کی پوزیشن بحال کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ لٹیرا نہیں تھا۔ ۱۸۹۱ء میں شرر کا ناول "قیس و لبنیٰ" شائع ہوا جو عرب کے عشق پسند جیالوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء کے عرصے میں شرر نے کوئی ناول نہیں لکھا۔ "تاریخ ادب اردو" میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے:

"۱۸۹۵ء میں وہ انگلستان گئے اور تقریباً چھ مہینے وہاں گزارے۔ انگریز

ناولوں کے مطالعے کا اعتراف شرر نے جا بجا کیا ہے اور اپنے مضمون کے لئے ناول کا لفظ بھی بالالتزام استعمال کیا ہے" (۱۹)

شرر نے ۱۸۹۹ء میں دو ناول لکھے: "ایام عرب" ناول میں شرر نے عرب جاہلیت کے زمانے کی معاشرت پیش کی ہے جس کا دوسرا حصہ ۱۹۰۰ء میں شائع لیکن "ایام عرب" کے پہلے حصے کی خوبی دوسرے حصے میں قائم نہ رہ سکی ۱۸۹۹ء میں لکھا گیا شرر کا دوسرا ناول "فلورا فلورنڈا" ہے جس میں ہسپانیہ کے عہد خلافت حالات ناول کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں اور وہ ظلم بھی بتائے گئے ہیں جو عیسائیوں نے مسلمانوں پر اسپین میں ڈھائے گئے تھے۔

خلاف شریعت پردے کے نقصانات کو بنیاد بنا کر شرر نے ۱۹۰۱ء میں "بدالنساء کی مصیبت" لکھا۔ یہ ایک مختصر ناول ہے لیکن اس کے پلاٹ کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست اپنی کتاب "بیسویں صدی میں اردو ناول" میں واضح کرتے ہیں:

"شرر نے "بدالنساء کی مصیبت" ۱۹۰۱ء میں پردے کی خرابیوں کو پیش کیا۔ پردے کی مخالفت کا خیال ان کے اپنے زمانے کے لحاظ سے بڑی حد تک انقلابی تھا شرر نے اس میں پردے کی مخالفت کی ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا یہ بہت ہی مختصر ناول اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ ناقابل یقین اتفاقات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے" (۲۰)

"شوقین ملکہ" ۱۹۰۶ء میں لکھا ہوا ایسا ناول ہے جس میں صلیبی لڑائیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں دوبارہ پردے کی مخالفت میں "آغا صادق کی شادی" ناول لکھ کر شرر نے لکھنؤ کی چہل پہل اور ایک معزز ایرانی کی شادی کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں شرر کی تین ناولیں "فتح اندلس"، "ماہ ملک" "فلپانا" ظہور میں آئیں۔ "فتح اندلس" میں شرر نے پانچویں صدی عیسوی میں جب مسیحیت رومیوں کا قومی مذہب بن رہا تھا، رومیوں کی معاشرت اور ان کی تہذیب کو نمایاں کرتے ہوئے اسپین پر عربوں کی فتح کو ظاہر کیا ہے۔ ناول "ماہ ملک" دولت غوریہ کے عروج اور کارناموں کے علاوہ ان کی معاشرت کے ساتھ ساتھ شہنشاہ ملک کے حقیقی حالات کو ناول کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جبکہ ناول "فلـ

میں طرابلس کی سرزمین پر صحابہ رضؓ کے حملوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں شرر کا ناول "غیب داں دلہن" تصنیف ہوا جو ایک اصلاحی ناول کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کردار نگاری بہتر انداز میں دکھائی دیتی ہے، شرر کا ناول "زوال بغداد" ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا جس کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے واضح طور پر لکھا ہے :

"شرر نے زوال بغداد کے ذریعہ ایک مقصد کو بھی پیش کیا ہے، بغداد کی تباہی کے اسباب کو بڑی فنی مہارت سے پیش کرتے ہوئے انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں کی آپسی پھوٹ نے کس طرح بغداد جیسے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی ..... اس ناول میں شرر نے شیعہ سنیوں کے جھگڑے اور ان کے اسباب علماء کی بحثوں کو بھی پیش کیا ہے" ص۱۱۱

شرر نے ۱۹۱۳ء میں دو ناولیں لکھیں۔ "رومتہ الکبریٰ" میں قدیم سلطنت روم کے زوال اور "حسن کا ڈاکو" جلد اول میں عیش پرست رئیسوں کی بدحالی بیان کی گئی ہے۔ حسن کا ڈاکو" کا دوسرا حصہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا، دونوں حصوں میں کہانی کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

شرر نے سب سے زیادہ ناول ۱۹۱۴ء میں لکھے۔ "یوسف و نجمہ" "خوفناک محبت" "بغداد کی حسینہ" اور "اسرار دربار حرام پور" اس عہد کی یادگار ہیں۔ یوسف و نجمہ میں عشق کی حسین وارداتیں اور "خوفناک محبت" میں ہندوستان کی شریف زادیوں کی جبلت کے باوجود عصمت کی حفاظت کے جذبے کو ناول کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، بغداد کی حسینہ میں حسن و عشق پرستی کے پس منظر میں بغداد کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اسرار دربار حرام پور کے موضوع کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں :

"اسرار دربار حرام پور میں والیان ریاست کی غیر انسانی عیش پسندی، بے رحمی اور بد اعمالیوں کو ظاہر کیا گیا ہے اس زمانے کے نواب رام پور کی عیش پرستی اور بدکرداری کی وجہ سے رعایا بے حد پریشان تھی ..... شرر نے یہ ناول لکھ کر اخلاقی جرأت اور انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے اور اس کے ذریعہ بعض والیان ریاست کی عیش پرستی، عیاشی اور ان کی غیر انسانی حرکتوں کے اچھے نقشے کھینچے ہیں" ص۱۱۳

۱۹۱۶ء میں "فاتح مفتوح" اور ۱۹۱۷ء میں "پایک حرم" ناول شائع ہوئے جن کے

توسط سے شرر نے مسلمانوں کی حکمرانی کے کارنامے پیش کیے ہیں۔ "فاتح مفتوح" میں فرانس میں عربوں کے داخلے کی تصویر کھینچی گئی ہے جبکہ "بابک خرمی" کے ذریعہ سلطنت عباسیہ کے زمانے کے ملازمین کی تاریخی ناول کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، شرر نے سنہ ۱۹۱۲ء میں "عزیز مصر" ناول تحریر کیا جس میں عہد بنی طولون کا دلچسپ حال بیان کیا گیا ہے، سنہ ۱۹۲۳ء میں شرر نے "طاہرہ" جیسی اصلاحی ناول لکھی اور "افسانۂ قیس" ناول کے ذریعے لیلیٰ مجنوں کی تاریخی تحقیق کو قصے کے حسب میں بیان کیا ہے، سنہ ۱۹۲۶ء میں شرر نے ناول "مینا بازار" لکھ کر شاہجہاں کے دور کے ایک تاریخی واقعہ کو مختصر انداز میں پیش کیا ہے، ان ۲۸ ناولوں کے علاوہ شرر نے مزید ۹ ناولیں ایسی لکھیں جن کی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ "لعبت چین" میں شرر نے فتوح ماوراء النہر کے حالات تحریر کیے ہیں۔ "مقدس نازنین" میں ایک حسینہ کے پوپ بن جانے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ "جویائے حق" میں پیغمبر اسلام کی سوانح بطور ناول لکھی گئی ہے۔ "ملکۂ زنوبیہ" میں عرب نژاد اور ایک حسین شہزادی کے رومانی حالات واضح کیے گئے ہیں۔ "شیریں ملکۂ عجم" میں فرہاد کی معشوقہ کے حالات موجود ہیں۔ "شہید وفا" مسلمانوں کے اخلاق اور جوش جہاد کے کارنامے پیش کیے گئے ہیں۔ "شہزادی حبش" میں حبش کی شہزادی کے حسن و عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ "میوۂ تلخ" کے ذریعہ دیرینہ تجربات کو واضح کیا گیا ہے شرر نے بنگالی ناول "درگیش نندنی" کا انگریزی سے ۱۸۸۶ء میں اردو میں ترجمہ کیا تھا، اس طرح شرر لکھنوی نے جملہ ۴۰ ناولیں لکھیں۔

عبد الحلیم شرر کی تاریخی و سوانحی کتب میں تاریخ خلافت، ابوبکر شبلی، ثانی اثنین، عصر قدیم، قرۃ العین، سیر رجال، سیر نسوان، حسن بن صباح، خواجہ معین الدین اجمیری، ذی النورین، ابو الحسنین، صد پارۂ دل، مشاہیر عالم، تاریخ اسلام اور دیگر تاریخی ۱۵ کتابیں لکھیں۔ شرر کے مضامین ۷ جلدوں میں شائع ہوئے، جلد اول میں عاشقانہ مضامین، جلد دوم میں تاریخی و جغرافیائی مضامین، جلد سوم میں سیر و سوانح پر مضامین، جلد چہارم میں ادب و تحقیق پر، جلد پنجم میں اصلاح قوم پر، جلد ششم میں تاریخی واقعات پر اور جلد ہفتم میں نظمیں اور ڈرامے شامل ہیں۔ اس طرح شرر نے تاریخی ناولوں کے علاوہ موضوعاتی مضامین کا ایک بہترین ذخیرہ چھوڑا ہے۔

عبد الحلیم شرر ناول نگار، مضمون نگار، ادب لطیف کے نمائندہ ہونے کے علاوہ ایک بہترین صحافی بھی تھے، ڈاکٹر عبد الودود خان نے "اردو نثر میں ادب لطیف" کے ذریعہ واضح کیا ہے:

"شرر نے اپنے دوست عبد الباسط کے مشورے سے ہفتہ وار "محشر" نکالا سنہ ۱۸۹۰ء میں

ڈاکٹر محمد منشاءالرحمن خاں منشاء

مکان و لامکاں سے اور آگے
ہمیں جانا ہے یاں سے اور آگے

ہم اہلِ دل کا مقصودِ نظر ہے
جمالِ این و آں سے اور آگے

اڑانوں کا یہ عالم ہے تو پھر ہم
بڑھیں گے آسماں سے اور آگے

جہاں پہنچے ہیں اربابِ تجسس
بہت کچھ ہے وہاں سے اور آگے

بہت رنگیں، بڑے دلکش مناظر
ہیں ماہ و کہکشاں سے اور آگے

ذرا چل کر تو دیکھیں کیسے کیسے
جہاں ہیں اس جہاں سے اور آگے

جو پا سکتے نہیں ہیں گردِ میری
وہ پہنچیں گے کہاں سے اور آگے

وفا میں منشا ہیں لاکھوں مراحل
دل و جاں کے زیاں سے اور آگے

۱۱ اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور

مرزا غفار بیگ اثر

اُن سے ناطہ توڑ کر تڑپا کیا اپنی جگہ
فیصلہ اپنی جگہ تھا، سلسلہ اپنی جگہ

تیز رفتاری ہے لازم قُربِ منزل کے لئے
رہنما اپنی جگہ ہے، راستہ اپنی جگہ

دل کا مالک وہ کہ جس کو دل سے دلچسپی نہیں
سلطنت اپنی جگہ، فرماں روا اپنی جگہ

پاس ہو کر بھی تمہارے دل میں گنجائش نہیں
سامنا اپنی جگہ ہے، فاصلہ اپنی جگہ

سرخرو دونوں یہاں کوئی کسی سے کم نہیں
خونِ دل اپنی جگہ، رنگِ حنا اپنی جگہ

وہ [illegible] ہے تو پھر [illegible] ٹل سکتا نہیں
بے اثر اپنی جگہ، دستِ دعا اپنی جگہ

کوٹھی قدسیہ باغ - پوسٹ جاورہ - ضلع رتلام - مدھیہ پردیش

غزل

عزیز ناگپوری

حادثوں کا جہاں سلسلہ بن گیا
اُس کے گھر کا محافظ خدا بن گیا

خاک بھی کیمیا اُس زمیں کی بنی
جس زمیں پر ترا نقشِ پا بن گیا

موت پیغام اپنا سنانے کو تھی!
اک تبسم ترا آسرا بن گیا

کارنامے بھی کچھ لوگ ایسے کئے
اُن کا کردار اک آئینہ بن گیا

آبرو کی جسے کوئی پروا نہیں
آشنا آپ اُن کیوں بے وفا بن گیا

حادثے جس قدر مجھ پہ آتے گئے
اور پختہ مرا حوصلہ بن گیا

صبح بے چین ہم، شام بے چین ہم
وقت اب ہم پہ گویا سزا بن گیا

دوست جس کو سمجھتے رہے ہم عزیز
وہ بھی اب تو مخالف مرا بن گیا

شجیع

اب کرم کر، ستم سے کیا ہوگا
دل سلامت ہے غم سے کیا ہوگا

ہم نے ان کی جفا بھی سہہ ڈالی
ہم سمجھتے تھے، ہم سے کیا ہوگا

سب محبت کی مہربانی ہے
کیا ہوا ہم سے، اور کیا ہوگا

ہے تغافل بھی ایک شانِ کرم
اب تمہارے کرم سے کیا ہوگا

بے قراری میں یاد آتے ہو
پرسشِ دم بہ دم سے کیا ہوگا

ہم تمہارے ستم کو جان گئے
ہم نہ سمجھے ستم سے کیا ہوگا

غم کو تسکین دے گئے ہیں شجیع
آج تسکینِ غم سے کیا ہوگا

غزل

ابوزاہد سید یحییٰ حسینی قدر عریضی

ے یہ شہادت کا مطلب　　موت سے بچنے کا مطلب
شکر ترا اے حسنِ طلب　　مشکل آساں ہو گئی اب
ٹ گئیں امیدیں سب　　دیکھئے کیا ہوتا ہے اب
مری حالت پر پھر اب　　ایک نگاہِ غور طلب
ا ہے وقت معین جب　　غیب سے بن جاتا ہے سبب
س کی عنایت، کس کا غضب　　ہے یہ فریب حسنِ طلب
سن سمجھ لیتا ہے سب　　عشق کی نظروں کا مطلب
وٹ گیا دامن ان کا　　لوٹ گیا دل ہائے غضب
مسئلۂ دل کیا نکلے　　تنگ ہو جب دنیائے سبب
ا ہی سمجھ سکتا ہے بس　　اپنے تڑپنے کا مطلب
د ہے جو محروم جو دل　　وہ بھی ہے اک اللہ کا غضب
ری نظروں کے ماروں کی　　موت بھی ہے تشریح طلب
ل کو حاصل کرنے کا　　خار سکھا دیتا ہے ادب
ے ہے وابستہ امید　　کون کرے گا ترک طلب
بجھنے والے، دیکھ مگر　　کفر نظر ہے ترکِ ادب
شق عقیدہ حسن آزاد　　ربط وتناسب ہے یہ عجب
یری خرد سے باہر ہے　　تیرے تبسم کا مطلب
ا میں طلب دل کی رکھنا　　یہ بھی ہے اک توہینِ طلب

قدر جو یادِ رخ میں کٹے
دن سے ہے بہتر ایسی شب

سرزمین دکن

مومن خاں شوق

شوق ارضِ دکن
یعنی میرا وطن
شاہدانِ چمن
گل رُخ و گل بدن
دلکش و خوب رو
چاندنی سے بدن
حسن میں شوخیاں
عشق میں بانکپن
پیر ہوں یا جواں
سب میں مستانہ پن
ہندو مسلم یہاں
جیسے گنگ و جمن
یوں ہیں قومیں یہاں
جیسے پھولوں کا بن
گولکنڈہ منبر
چار مینار فن
جامعہ کا مہک
رشکِ مشکِ ختن
مسکنِ اولیاء
مرکزِ علم و فن
ہیں سراج و ولی
صدرِ بزمِ سخن
کارناموں سے ہے
جگ میں نام دکن
تلگو، اردو یہاں
انجمن در انجمن
شوق رشکِ شفق
میرا رنگِ سخن

○

سلسلہ

میر ہاشم

یوں خبر اڑتی ہے
اک شاخ سے نازک سی کلی ٹوٹ گئی

پھر خبر ملتی ہے
اس غنچہ کی اک اک پتی
ایسی بکھری ہے
کہ
ہر تیز ہوا کا جھونکا
اس کو بے خوف مسل دیتا ہے

پھر کوئی کہتا ہے
اک زرد سا پھول
منتظر ہے
کوئی بے نام ہوا کا جھونکا
آئے اس کو اڑا کے لے جائے
پھر خیال ہے
اک شاخ سے
نازک سی کلی
ٹوٹ گئی

———

ماہنامہ

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جوائنٹ ایڈیٹر: محمد نعیم الدین احسن

شرح تعاون

خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
150 روپے	25 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
270 〃	65 〃	36 〃	225 〃
2500 〃	450 〃	300 〃	2000 〃

[illegible] صرف [illegible] روپے

پتہ: ماہنامہ [illegible]، 11-5-147 [illegible] حیدرآباد 500004

نومبر [illegible]

جلد [illegible] شمارہ 11

پرنٹر پبلشر [illegible] نے [illegible] میں چھپوا کر دفتر [illegible]
[illegible] حیدرآباد 500004 [illegible] سے شائع کیا
ٹیلیفون: 229161

[illegible]

(اداریہ)

حرف اول

حکومت حیدرآباد نے پرانے شہر حیدرآباد میں اردو میڈیم ریذیڈنشیل اسکول قائم کرکے پورے ملک میں اولیت کا مقام حاصل کیا۔ جناب بشیر الدین بابو خاں تلگو دیشم ایم ایل اے کی مساعی سے نظام الدین میں ایک اور اردو میڈیم ریذیڈنشیل اسکول قائم ہوا نیز کرناٹک اور اے پی کے دیگر علاقوں میں بھی ایسے اسکول کھولے جانے کا وعدہ کیا جارہا ہے۔ نیز مرکزی حکومت کی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت پورے ملک میں نوودیا ودیالیوں کا ایک جال بچھایا جارہا ہے۔ خود آندھرا پردیش میں ۱۶ اضلاع میں (۱۶) اسکول قائم کئے گئے ہیں۔ یہی صورت حال ملک کے دیگر اسٹیٹس میں بھی موجود ہے۔ ان تمام اسکولوں میں داخلہ کے لئے طلباء کا انٹرنس ٹسٹ لیا جاتا ہے۔ یہ ٹسٹ مادری اور علاقائی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے اور مالی اعتبار سے پس ماندہ طبقات کے طلباء کے پورے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ اردو والوں کو اس کا موقعہ حاصل ہے کہ مادری زبان اردو میں ٹسٹ دیں۔ نیز علاقائی زبانوں یعنی اے پی کی حد تک تلگو، مہاراشٹرا کی حد تک مراٹھی، کرناٹک کی حد تک کنڑی، ٹامل ناڈو کی حد تک ٹامل اور ہندی ریاستوں کی حد تک ہندی میں یہ ٹسٹ دیا جاسکتا ہے۔ اردو والے یہ شکایت تو کرتے ہیں کہ اردو کے ساتھ حکومتی مشنری کا رویہ مخالفانہ ہے لیکن نہایت افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اردو کے لئے جو آسانیاں میسر ہیں ان سے ہم خود استفادہ نہیں کرتے۔ چنانچہ اس سال اردو میڈیم حیدرآباد ریذیڈنشیل اسکول میں انٹرنس ٹسٹ کے لئے پہلے تو کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی۔ پھر مجلس علم و فن ایجوکیشنل سوسائٹی حیدرآباد کی کوششوں سے کچھ درخواستیں پیش ہوئیں اور ان درخواست گذاروں کو اس ٹسٹ کیلئے کوچنگ بھی کی گئی۔ اس کے باوجود طلباء کی مطلوبہ تعداد اس اسکول کے لئے منتخب نہیں کی جاسکی۔ یہی حال مرکزی حکومت کی نوودیا ودیالیوں کا بھی ہے۔ اس رعایت سے محروم رہنے اور اس سنہری موقع سے فائدہ

[illegible] چند سطریں ضرورت ہے کہ اردو والے ان اشعار [illegible]
[illegible] کے لئے آئندہ سال تک شائع کئے جائیں سے علیا رکو چھٹی لیں اور
جو اس شش کے لئے کوشش کا انتظام کریں تا کہ وہ اس شش میں کامیاب
ہوں اور ان [illegible] کی [illegible] سے استفادہ کریں

حافظ شیرازی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ اور غزل کی اہم خصوصیات ان کا ایجاز اور ایمائیت ہے یہی وجہ ہے کہ ان اشعار کی تشریحات مختلف ہیں اور انہیں مجازی و حقیقی معانی پہنائے جا سکتے ہیں۔ موضوع متنوع ہیں اور موزوں و مناسب الفاظ کا انتخاب و برمحل استعمال بے مثال ہے اور شیرینی و موسیقیت ایسی جاری و ساری ہے کہ خود بقول حافظ

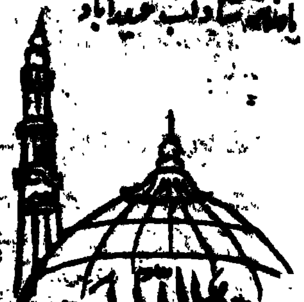
زِ شعرِ حافظِ شیرازی می گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

حافظ اپنے زمانے کے عالم و فاضل شخص تھے۔ انھوں نے تمام علوم حاصل کئے، فقہ و عرفان، حکمت و الٰہیات، اخلاق و آداب، ہیئت و ہندسہ موسیقی و متوجہ کھیلوں سے کامل آگاہی رکھتے تھے۔ قرآن مجید حفظ کیا، کتب کی کشاف پر حاشیہ لکھا، درس قرآن و علوم حکمت میں اتنے مصروف خود اپنا کلام مرتب نہ کر سکے۔ اپنے شعر کی عظمت و جاذبیت کا انہیں خود احساس

ندیدم بہتر از شعرِ تو حافظ بقرآنی کہ اندر سینہ داری

شعرِ حافظ کی سندِ قبولِ عام مسلمہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر [illegible] سے عمدہ نسخہ تھا۔ آج صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ ذوق کو پھر ابھارا جائے۔ [illegible] اسی لئے [illegible] نے کلام حافظ کے منتخب اشعار کا منظوم ترجمہ پیش کیا۔ اب ایک اور منظوم ترجمہ پیشِ نظر ہے جو بے مثل اور لاجواب ہے۔ مولوی محمد احتشام الدین [illegible] دہلوی نے [illegible] حافظ کی (۷۰۰) دیں غزلوں کا منظوم ترجمہ [illegible] شمس المطابع [illegible] سے [illegible] ۱۵ شوال ۱۳۰۶ھ میں طبع کرایا [illegible] ترجمہ کلام [illegible] خصوصیت یہ

ہے



محترمہ عائشہ بیگم

رحمۃ للعلمین ! ہدایتِ الٰہی کی تکمیل کے پیکرِ نور

عیدِ میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک موقع پر آج ہم یہاں جمع ہیں۔ خالق کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو اپنے تمام احسانات اور انعامات سے بہرہ اندوز ہونے اور فائدہ حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لئے خیر البشر نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم پیکر مثال بنا کر مبعوث فرمایا تو ایمان لانے والوں پر یہ لازم گردانا کہ وہ اپنے شکر و امتنان کے اظہار کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجیں اور ہر شعبۂ زندگی میں آپ کی اطاعت و پیروی کر کے کامیابی و کامرانی دنیا و آخرت دونوں جگہ حاصل کریں،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا
سورۃ الاحزاب
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ كُلِّ اَلْفِ اَلْفِ مَرَّةٍ

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک پر لازم ہے، اتباعِ سنت ہی روحِ عبادت ہے اور حاصلِ بندگی، جو بھی آپ سے جتنا قریب ہوگا، اللہ جل شانہٗ سے اسی قدر قریب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی مقصد کے لئے مبعوث فرمایا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیام جو قرآن پاک کے ذریعہ آپ پر نازل ہوا، مخلوق تک پہنچائیں اور اپنے عمل اور نمونے سے اس پر عمل کو سب کے لئے آسان اور ممکن العمل بنا دیں:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا،

"اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائیں جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے یعنی نوشت وخواند سے ناواقف تھے، پڑھنا لکھنا نہیں لیکن ایسے علوم کی دولت سے مالا مال تھے جو اللہ تعالیٰ نے خود انہیں سکھائے تھے اور ایسی باتوں سے واقف تھے جو خود اللہ تعالیٰ نے انہیں بتائی تھیں۔ اور سب سے بڑا فضل الٰہی یہ تھا کہ قرآن کریم آپ پر نازل کیا گیا تھا اور وہ تمام علوم منجانب اللہ ودیعت فرمائے گئے تھے جو بنی نوع انسان کی بہتری کے ضامن تھے اور ان کی رہبری کے لئے ضروری تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (۱۶۴ آل عمران)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں سکھاتے رہتے ہیں۔

نیز فرمایا:

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۞ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ (الفتح)

"وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں"

نیز یہ بھی فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ)

"(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، بالخصوص ایمانداروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں۔"

نیز یہ صراحت بھی فرمادی کہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞ (النجم)

"اور وہ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں نہیں بناتے ان کا ارشاد صرف وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے"

محمد رسول برحق اور ہادیٔ دینِ مطلق کی پیروی کا اس طرح حکم فرمایا کہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب)

"تم لوگوں کے لیے رسول اللہ میں ایک عمدہ نمونہ موجود ہے"

پس وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر)

"اور رسول جو کچھ تم کو دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو"

اور یہ واضح فرمادیا کہ:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

نیز وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (احزاب)

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔"

نیز آپ کے اعلیٰ مقام اور درجات کا اس طرح ذکر فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝ (احزاب)

"اے نبی بے شک ہم نے آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ (مومنین کو) بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کو) ڈرانے والے ہیں (سب کو) اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔"

مزید فرمایا:

يس ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

"یٰسین قسم ہے قرآن حکیم کی کہ بے شک آپ پیغمبروں میں سے ہیں اور سیدھے راستے پر ہیں۔"

پھر یہ بھی وضاحت فرمادی کہ:

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

"آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتلا دیا ہے۔"

پھر یہ بشارت عطا فرمائی کہ:

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۝ (النساء)

اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہا مان لیگا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بر متنبہ بھی فرمادیا کہ:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا

"اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اسے امر حق واضح ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے ہو لیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

پس جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کے بارے میں اپنے کلام پاک میں یہ صراحت فرمادی ہے اور اس کا اعلان فرمادیا کہ

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (القلم) "بے شک آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں"

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا) آپ کی بعثت کا مقصد تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر ہونا ہے

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء) "اور ہم نے آپ کو ایسے اخلاق حسنہ دے کر اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر جہان کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے"

تو ہمارے لئے لازم ہے کہ اس ذات والا صفات کو ہم اپنے لئے مشعل راہ بنائیں اور جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی کی ہے اور ہمارا ہر عمل آپ کی اطاعت کے ہے ہونا چاہئے تاکہ دنیا و آخرت دونوں سے بہرہ یاب ہوں۔

حضور اکرم، سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تمام اخلاق و فضائل میں اشرف و اعلیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اخلاق و عادات کی تمام خوبیاں اور کمالات اور اعلیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں جمع فرمادی تھیں کہ ان محاسن کا احاطہ کرنا قدرت و طاقت کے باہر ہے۔ آپ اُمّی تھے یعنی کچھ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ خود آپ کو ایسے علوم عطا فرمائے تھے جو کائنات میں کسی اور کو نہیں دیئے گئے۔ اس آپ علم و حکمت کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، سب سے محترم، سب سے زیادہ مہذب سب سے زیادہ حلیم و بردبار، سب سے زیادہ پاک دامن و عفیف، سب سے زیادہ

زنے والے، سب سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے، سب سے زیادہ سخی، سب سے زیادہ کریم، سب سے زیادہ بہادر، سب سے زیادہ حسین، غرض آپ جملہ جسمانی اور روحانی کمالات کے جامع تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ازدواجی تعلقات حسن معاشرت اور اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آپ ازواج مطہرات رض کے حقوق میں پوری مساوات و عدل ملحوظ رکھتے تھے۔ کسی طرح کا فرق نہ کرتے تھے، رہی محبت تو آپ فرمایا کرتے کہ یا اللہ! جس کا مجھے اختیار ہے اس کی تقسیم تو میں نے مساوی کر دی لیکن جو بات میرے بس میں نہیں ہے اس پر مجھے ملامت نہ کیجئے۔ اختیاری چیز سے مراد معاملات و معاشرت ہے اور غیر اختیاری سے مراد محبت اور میلان طبع ہے۔ چنانچہ ازواج مطہرات رض میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رض سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ایک بار حضرت صفیہ رض نے حضرت عائشہ رض سے کہا کہ اگر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے راضی کر دو تو اپنی باری تم کو بخش دوں گی۔ چنانچہ حضرت صفیہ رض کی باری کے دن حضرت عائشہ رض آپ کے پاس حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا: عائشہ! واپس جاؤ یہ تو صفیہ رض کی باری ہے، انھوں نے جواب میں پورا واقعہ بیان کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ رض سے خوش ہو گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز عصر پڑھ لیتے تو تمام ازواج مطہرات کے گھروں میں مختصر وقت تشریف لے جاتے، ان کے پاس بیٹھتے، ان کے حالات معلوم کرتے، جب رات ہوتی تو وہاں تشریف لے جاتے، جہاں باری ہوتی شب وہیں بسر فرماتے۔ اور باری میں کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے سفر کے وقت بھی ازواج مطہرات رض کے درمیان قرعہ ڈالتے جن کا نام نکل آتا وہی ساتھ جاتیں۔

غیر مسلم حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرت ازدواج پر اعتراض کرتے ہیں اور بعض معمولی مسلمان عورتیں بھی اس بہکاوے میں آجاتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بھی عقد اپنے نفس کے لئے نہیں ہوا تھا بلکہ تمام عقد اسلام کے [illegible] ازواج مطہرات رض میں صرف ایک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رض باکرہ تھیں [illegible] باقی سب بیوہ اور معمر۔ پہلے عقد کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ سال تھی اور [illegible] کی عمر ۴۰ سال۔ آپ کا انتقال [illegible] ۶۵ سال کی عمر میں ہوا اور جب تک [illegible] نے دوسرا عقد نہ فرمایا اور ۲۵ سے ۵۰ سال تک عمر کے [illegible]

کس قدر عظیم ہے۔ بی بی خدیجہؓ نے اپنی جان و مال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت وقف کر دیا۔ نبوت کے وقت بی بی خدیجہؓ کی عمر ۵۵ سال تھی۔ بڑھاپے کا وقت اور یہ بی بی کا تصور ہے ان کی ہزاروں ہزار روپے کی جائیداد غریبوں، حاجتمندوں اور محتاجوں میں تقسیم فرما دی تھی۔ مگر وہ اس پر فخر کرتی تھیں۔ پہلی وحی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پریشان گھر تشریف لائے، بی بی جان نے آپ کو دلاسہ دیا آپ پریشان نہ ہوں، آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ورقہ بن نوفل کے پاس لے اس عیسائی عالم نے اپنے علم کی بنا پر آپ کو نبوت کی بشارت دی۔ سب سے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آپ پر ایمان لا کر اسلام لائیں اور آخر وقت تک استقامت میں پیکر صدق و صداقت رہیں۔ سیرت ابن ہشام میں لکھا ہے کہ "وَكَانَتْ لَهُ وَزِيرَةَ عَلَى الْإِسْلَامِ"۔ حضرت خدیجہؓ اسلام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص وزیر رکھتی تھیں۔ بی بی خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی اتنی تعریف کرتے حضرت عائشہؓ کو ایک روز رشک ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہتر دے دیا ہے۔ اشارہ خود اپنی طرف تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا سے اچھی اللہ تعالیٰ نے مجھے نہیں دی (یعنی تم ان سے اچھی نہیں ہو) کیونکہ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب اور لوگوں نے میرے ساتھ کفر کیا اور ایسے وقت میری تصدیق کی جب اور لوگوں نے تکذیب کی اور انھوں نے میری مالی مدد کی جبکہ اور لوگوں نے مجھ کو محروم رکھا اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان سے اولاد بھی عطا کی جب کہ دوسری بیویوں سے مجھے اولاد نہیں ملی۔

ازواج مطہراتؓ میں صرف ایک حضرت عائشہ صدیقہؓ کم عمر اور کنواری تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد حضرت خولہ بنت حکیمؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ چاہیں تو کنواری سے کر لیں چاہیں تو بیوہ سے۔" آپ نے کنواری کون ہے اور بیوہ کون؟ حضرت خولہؓ نے جواب دیا کنواری عائشہ بنت ابوبکر صدیق اور بیوہ سودہ بنت زمعہ ہیں جو آپ پر ایمان لا چکی ہیں اور آپ کا اتباع کرتی ہیں۔ آپ دونوں سے نکاح کے لئے حضرت خولہؓ کے ذریعہ ہی پیام بھجوائے۔

پیام ملنے پر حضرت عائشہؓ کے والد نے انکار نہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوا کر آپ سے نکاح کر دیا اور حضرت سودہؓ نے فوری رخصتی کے بعد نبوت کے گھر آ گئیں

اپنے خود سنبھالی۔ جو حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد بہت ضروری تھا۔ حضرت سودہؓ بوڑھی ہو گئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا "مجھے شوہر والی خواہش نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ کی بیویوں میں قیامت کے روز میرا حشر ہو، آپ مجھے اپنے نکاح میں رکھیں اور میری باری کا دن عائشہؓ کو دے دیا کریں"۔ آپ نے قبول فرما لیا اور قرآنی آیت سے بھی اس کی توثیق ہو گئی۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جب بیویاں بیک وقت آپ کے نکاح میں تھیں ان بیویوں کے پاس باری باری رات گزارتے یعنی حضرت عائشہؓ کے پاس دو رات، ایک ان کی اور ایک حضرت سودہؓ کی باری کی اور باقی ازواجؓ کے پاس ایک ایک رات۔

حضرت عائشہؓ سے عقد کے وقت آپ کی عمر ۶ سال تھی۔ آپ کی رخصتی ۹ سال کی عمر میں ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۹ سال گزارے اور وفات نبویؐ کے بعد تقریباً ۵۰ سال زندہ رہ کر ۵۸ ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے ۹ سے ۱۸ سال کی عمر تک زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزارا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی خاص تربیت فرمائی اور آپ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو بہ نظر غائر دیکھتیں اور ذہن نشین رکھتیں۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ سکھانے اور عمل کر دکھانے کے لئے اللہ رب العزت کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ اس لئے آپ کی زندگی کے کسی پہلو کو ازواج مطہراتؓ نہیں چھپاتی تھیں اور حضرت عائشہؓ نے تو بطور خاص آپ کے گھریلو اور دات کے اعمال کا بیان فرمایا ہے نیز عورتوں کے مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص طور پر دریافت فرماتیں اور دوسروں تک پہنچا دیتیں۔ آپ بڑی صاحب فہم و فراست تھیں۔ حضرت امام زہریؒ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویاں اور ان کے علاوہ باقی تمام عورتوں کا علم جمع کیا جائے تو حضرت عائشہؓ کا علم سب کے علم سے کافی بڑھا ہوا رہے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جب کبھی مشکل پیش ہوتی تو حضرت عائشہؓ سے رجوع فرماتے، روایت حدیث میں تابعین کرام کے ساتھ بہت سے صحابہؓ بھی حضرت عائشہؓ کے شاگرد تھے۔ ان کی روایات کی تعداد ۲۲۱۰ بتائی گئی ہے اور شاگردوں کی تعداد سینکڑوں لکھی ہے۔ آپ نے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد تقریباً ۴۸ سال بڑی مستعدی اور فیاضی سے علم دین کی اشاعت کی۔ عورتیں اور لڑکے پردے کے اندر مجلس تعلیم میں بیٹھتے اور باقی حضرات پردے کے باہر بیٹھ کر آپ سے دینی علوم حاصل کرتے مختلف قسم کے سوالات کئے جاتے تھے اور وہ سب کا جواب دیتی تھیں، دینی مسائل معلوم

ہر سلسلے میں کوئی شرماتا تو فرماتی تھیں کہ شرماؤ مت کھل کے پوچھو۔ ہر سال حج کو تشریف لے جاتیں تو
ہر طرف سے لوگ آتے اور آپ کے خیمہ کے باہر ٹھیر کر دینی سوالات کرتے۔ کبھی زمزم کے
قریب بیٹھ جاتیں کہ تشریف فرما ہو جاتیں اور فتوے طلب کرنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ حضرت عائشہ
کا شمار مستقل مفتیوں میں تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت ہی سے مفتی ہو گئی تھیں۔ حضرت عمرؓ
حضرت عثمانؓ خود آدمی بھیج کر ان سے مسائل معلوم کراتے تھے۔ حضرت امیر معاویہ
نے کاغذ بھیج کر مسئلہ کا حل آپ سے دریافت کرواتے۔ بہت سے لوگ خط لکھ کر مسائل

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کا ذکر کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے
ازدواج تعلیم و تبلیغ کے لئے تھی۔ آپ کی بعثت کا مقصد قولاً اور عملاً اسلام کو دنیا میں پھیلانا
زندگی کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں آپ نے رہبری نہ فرمائی ہو، نماز و عبادت سے لے کر بیویوں
تعلقات، آل و اولاد کی پرورش، پاخانہ، پیشاب اور طہارت کے مسائل جن میں ازواج
مطہرات کے ذریعہ ہی امت کو رہنمائی ملی۔ یہ نکاح جنسی اور نفسانی جذبات کی بنا پر
نہ تھے جب کہ آپؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں پہلی شادی کی۔ پھر ۲۵ سے ۵۰ سال
تک صرف ایک زوجہ خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ زندگی گزاری جو آپؐ سے عمر میں ۱۵ سال
اور بیوہ تھیں۔ آپ کے انتقال پر حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ سے عقد فرمایا
پانچ سال حضرت سودہؓ کے ساتھ گزارے جو کافی عمر تھیں اور حضرت عائشہؓ کی
کے بعد جنہوں نے اپنی باری سے ان کے حق میں دستبرداری کر لی تھی۔ اس کے بعد میں حضرت
کی رخصتی ہوئی۔ پھر ۵۰ سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہو گئیں اور باقی ازواج سے
دو تین سال میں عقد ہوئے جو سب کی سب معمر اور بیوہ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
عمل کی طرح کثرت ازدواج بھی اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے تھا۔

نکاح کی حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو نوجوان نکاح کی ذمہ
اٹھانے کی طاقت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نکاح کر لے۔ جو ذمہ داری نہ اٹھا سکتا ہو ا
چاہیے کہ شہوت کا زور توڑنے کے لئے روزے رکھے۔

مزید ارشاد فرمایا کہ عورتوں کے حسن و جمال کی بنا پر نکاح نہ کرو اور نہ ان کے مال
دولت کی وجہ سے۔ ہو سکتا ہے حسن و جمال انہیں تباہی کے راستے پر ڈال دے
مال و دولت انہیں سرکشی میں مبتلا کر دے اس لئے شادی دین اور اخلاق کی بنا پر
پھر فرمایا جس کسی مرد نے کسی عورت سے تھوڑے یا زیادہ مہر پر نکاح کیا اور

اور اگر مہر ادا کا ارادہ نہیں ہے تو اس نے عورت کو دھوکا دیا پھر وہ مہر ادا کئے بغیر مرگیا تو وہ (روز قیامت) خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہوگا کہ زنا کا مجرم ہوگا۔

صاحب استطاعت کے لئے بلوغ کے فوری بعد نکاح مسنون ہے، آپ کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ با برکت نکاح وہ ہے جس میں کم سے کم مصارف ہوں۔

بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی عمر ابھی پندرہ سال کی تھی کہ کئی بڑے بڑے گھرانوں سے پیام آئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ حضرت علیؓ اس وقت اکیس سال کے تھے آپ نے اپنا مدعا ظاہر کیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا فرما کر دریافت فرمایا "علی! تمہارے پاس کچھ مال بھی ہے؟" علی نے کہا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک گھوڑے اور زرہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں"۔ فرمایا "گھوڑا تو سپاہی کے پاس رہنا ہی چاہئے۔ جاؤ اپنی زرہ بیچ ڈالو" حضرت علیؓ گئے [illegible] میں زرہ بیچ آئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو بھیج کر کچھ خوشبو وغیرہ منگوائی، حضرت انسؓ کے ذریعہ حضرت ابو بکر، عثمان، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین اور چند انصار کو بلوایا اور خطبۂ نکاح پڑھ کر نہایت سادگی سے دونوں کا عقد کر دیا۔ اور اعلان فرمایا گواہ رہو میں نے چار سو مثقال چاندی پر اپنی بیٹی فاطمہ کا نکاح علی کے ساتھ کر دیا۔ بعدہ آپ نے دعا فرمائی، چھوہارے بانٹے گئے اور شب میں ام ایمنؓ کے ہمراہ انتہائی سادگی کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے گھر بھیج دیا۔ عشاء کے بعد خود وہاں پہنچے اور دونوں کے حق میں دعا فرمائی۔ آپ نے جہیز میں جو سامان دیا وہ چاندی کے بازو بند، دو یمنی چادریں، چار گدے، ایک کمبل، ایک تکیہ، ایک پیالہ، ایک چکی، ایک پلنگ، ایک مشکیزہ اور گھڑا تھا۔

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

***

قسط

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ملک معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر

زندہ اور بیدار ضمیر کی کارفرمائی اور انقلاب آفرینی

مجھے یہ ڈر ہے کہ ہندوستان کا ضمیر کہیں مر نہ گیا ہو، اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ کیا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اتنے بڑے ملک میں کسی دلِ دردمند کی کراہ سننے میں نہیں آتی کہ تڑپ کر کسی نے فریاد کی ہو اور قلندرانہ شان سے میدان میں آگیا ہو، لیڈر اپنی جگہ پر، سیاست اپنی جگہ پر، دانش گاہیں اپنی جگہ پر، لائبریریاں اپنی جگہ پر، خطیب و مقرر اپنی جگہ پر، بلکہ GENIUS INTELLIGENT قسم کے انسان اپنی جگہ پر، لیکن وہ ضمیر کہاں ہے جو معاشرہ کی اس پستی پر، انسانیت کی اس پستی پر خون کے آنسو روئے؟ انسانیت کی اصلاح ضمیر نے کی ہے، کفنگ اور شمشیر نے نہیں کی ہے، سپاہ اور فوج نے نہیں کی ہے، خزانوں اور دولت کی بہتات نے نہیں کی ہے، علم انسانی کی ترقی نے نہیں کی ہے، ٹکنالوجی اور سائنس نے نہیں کی ہے، بلکہ ایک ضمیر انسانی نے کی ہے جو سب پر غالب آیا، جہاں وسائل نہیں تھے، اس نے وہاں وسائل پیدا کر لئے، آپ دیکھئے جب کسی کے چوٹ لگتی ہے، اور جب کوئی بیقرار ہوتا ہے وہ کیا کر لیتا ہے، ایک آدمی کے پاس علم کا ڈھیر ہے، لیکن اس کے دل میں درد نہیں ہے، اور کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے، وقت گزر جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کرتا، مجھے جو خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ضمیر تعطل کا شکار ہو گیا ہے، اس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے، یہ خطرہ کی بات ہے، اس لئے کہ انسانیت کی آس اسی ضمیر سے ہے، جب یہ ضمیر بیدار رہتا ہے، اس کو اللہ کی طرف سے روشنی ملتی ہے، پیغمبروں کی طرف سے اس کو غذا ملتی ہے، اور یہ پرستی کا شکار نہیں ہوتا، طاقت پرستی کا شکار نہیں ہوتا، تو پھر یہ ضمیر وہ کام کرتا ہے جو بڑی بڑی سلطنتوں سے اور بڑی بڑی فوجوں سے نہیں ہو سکتا ...

نے کچھ صالح ضمیروں نے، کچھ درد مند ضمیروں نے اپنے اپنے زمانہ میں کیا کام کرلیا یہ خود ان ہی میں، یہ روشنی کیا رکھتے تھے، ان کے پاس کیا سرمایہ تھا؟ لیکن انھوں نے ایک نیا معاشرہ پیدا کرلیا، ایک نیا دور ان کی ذات سے شروع ہوگیا۔

ملک کا اخلاقی زوال اپنی آخری حد پر

آج ہمارے معاشرے کو ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو میدان میں آئیں اور ملک کو اخلاقی زوال سے بچائیں، اخلاقی زوال اپنی آخری حد تک پہونچ گیا ہے ایک آدمی کسی حادثہ کا شکار ہوجائے تو یہ تو ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے کہ اس کے قرب و جوار میں کہرام مچ جائے، لوگ جمع ہوجائیں، مائیں اپنے گھروں سے نکل آئیں اپنے بچوں کو چھوڑ دیں، کوئی پانی لے کر آئے، کوئی دوا لے کر آئے کہ ہمارے بھائی معلوم نہیں کہاں جارہے تھے، حادثہ کا شکار ہوگئے، لیکن اس ملک کی اخلاقی گراوٹ کا حال یہ ہے کہ اس وقت لوگ ان مرے ہوئے کچلے ہوئے انسانوں کے ہاتھ سے گھڑیاں نکال لیتے ہیں، اور ان کے پرس کی تلاشی لیتے ہیں، اس وقت بجائے اس کے کہ ان خشک لبوں پر پانی کا ایک قطرہ ڈالیں، وہ ظالم ان کی قیمتی چیزیں لوٹنے میں لگ جاتے ہیں، آپ یہ واقعات تاریخ میں پڑھتے تو یقین نہ کرتے اور دوسرے ملک کے لوگ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن ہم کیا کریں، ریلوں میں بار بار ایسے حادثے پیش آتے ہیں، قریب کی دیہاتی آبادی دیکھتی ہے کہ ایک آدمی دبا ہوا ہے، دو تختوں کے بیچ میں اس کا بدن آگیا ہے، وہ کہتا ہے میرا سب کچھ لے لینا لیکن کسی طرح مجھے اس شکنجہ سے نکال دو، انھوں نے اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین لی اور اس کی جیب سے کچھ روپے نکال لیے اور اس کو مرتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے، جو معاشرہ اس سنگدلی کی حد تک پہونچ گیا ہو اس معاشرہ کی تصویر کو دیکھ کر بھلا دل خوش ہوسکتا ہے؟ اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ معاشرہ دنیا میں باقی رہے گا کوئی بڑا قیادت کا رول ادا کرے گا؟

میں نے کئی مرتبہ اس کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک مسافر بڑے ارمانوں کے ساتھ بمبئی سے آرہا ہے تھوڑی سی پونجی بچاکر، سنا ہے کہ ماں بیمار ہے، [illegible] لاؤں گا، وہ میری صورت دیکھ کر خوش ہولیں گی، ان کے اندر طاقت آجائے گی، وہ آنکھیں کھول [illegible] ابھی وہ اسٹیشن سے چلا ہی تھا کہ اسے چھرا بھونک دیا گیا، ادھر ماں تڑپ رہی [illegible] بھائی نے جان دے دی [illegible]

کچھ لوگ بیشک ضروری سیاسی اور علمی مشغلہ کی بات ہو سکتی ہے [illegible]
کی تعداد [illegible] ہے، میں کہتا ہوں اس کے دشمن اگر خود مسلمان ہو جائیں
معاشرے کے لئے کوئی خوشی اور اطمینان کی بات نہیں، کوئی عزت کی بات نہیں، پڑھے
لکھے لوگ ہوں، مگر ظلم سے نفرت نہ ہو، گناہ سے نفرت نہ ہو، CORRUPTION سے
وہ معاشرہ زندہ ہے، اگر نہیں ہے اور [illegible] ہے کہ وہ دوسری قوموں کی قیادت کر

ملک کے ایک عظیم دانشور کا اقتباس اور ایک دیکھتے ہوئے دل

میں اس موقعہ پر سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم کے
کا ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جو انہوں نے ۷ نومبر ۱۹۴۶ء کو
سلور جوبلی کے موقعہ پر دیا تھا، اس وقت ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر، وزیر اعظم ہند پنڈت
[illegible] نگر میں مولانا آزاد، وزیر داخلہ سردار پٹیل، وزیر تعلیم مسٹر راجگوپال چاری
کے علاوہ صدر مسٹر جناح اور عبوری حکومت INTERIM GOVERNMENT
وزراء، ہندوستان کے چوٹی کے دانشور، ماہر تعلیم اور سوشیل ورکر موجود تھے، یہ دور
کر فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا، دارالحکومت دہلی میں چاقو زنی کی وارداتیں پیش
جبلی کی تاریخیں مقرر ہو گئی تھیں اور التوا ممکن نہ تھا، ملک کے ممتاز و معزز مہمانوں
پر بحفاظت پہنچانے کے لئے حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے، یہ اقتباس آج بھی برمحل، در
انگیز اور رنج ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا :-

"آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں
کے دلوں میں آپ کے لئے جگہ ہے، آپ کی یہاں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی
کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے درد دکھ کے ساتھ چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں، آج ملک
میں منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام [illegible] معلوم ہو
یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن
شخصیتوں کے پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوان سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم
اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ [illegible] کیسے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے
[illegible] کیسے [illegible] سکیں گے؟ یہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں، شاعرِ ہندی نے کہا تھا کہ "ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے، اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا" مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے دیس سے، اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو لرزنے نہ دیجئے"

اپنے فرقہ اور اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے اور ان کی خبر لینے کے بجائے دوسرے فرقہ کو وعظ و نصیحت

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ عام طور پر جو لوگ اس صورتِ حال میں کچھ کرنے کے لئے بھی کمربستہ ہوتے ہیں، وہ اپنے فرقہ یا جماعت کی اصلاح و تربیت کے پرمشقت اور محنت طلب کام کو چھوڑ کر دوسرے فرقہ اور جماعت کو وعظ و نصیحت، اس کو اخلاقی و عملی درس دینے اور اس پر واقعات کی ذمہ داری عائد کرنے کے آسان کام کو اختیار کر لیتے ہیں، قوموں کی جدید تعمیر و تشکیل، مختلف عناصر میں دیانت دارانہ اور مساویانہ طریقہ پر ہم آہنگی پیدا کرنے، اور ملک کو اس خطرہ سے بچا لینے کے لئے (جو ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹک رہا ہے) فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیئے، حیرت اور اس سے زیادہ حسرت کی بات ہے کہ اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے، اور تمام مصلحتوں اور خطروں سے بے نیاز ہو کر طاقت اور اکثریت کے منہ پر حق بات کہنے والے افراد بہت کم نظر آتے ہیں، اور یہ کسی ملک کا سب سے بڑا ضعف اور خطرہ کی نشانی ہے۔

خاص طور پر موجودہ حالات اتنے غیر معمولی، اتنے تشویشناک اور اتنے مہیب ہیں کہ اب معمولی اخلاقی اپیلوں یا حکومتی انتظامات سے کام نہیں چل سکتا، اس کے لئے تو ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑنے اس کی روح کو چیخ کر پکارنے، اور انسانی شرم و حیا انسانیت دوستی اور خوفِ خدا کے آخری رمق سے کام لینے کی ضرورت ہے جس سے یقیناً ابھی تک اس قدیم مذہبی ملک اور یہاں کا ترم اور پریمی دل خالی نہیں ہوا ہے۔ اس کے لئے چند آدمیوں کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلنے کی ضرورت ہوگی، اس کے لئے کچھ مدت کے لئے اپنے تمام کاموں کو ملتوی اور بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہوگی

قوم کی تعمیر اور شعور و ضمیر کی تربیت میں مجرمانہ کوتاہی

ہمیں اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اس ملک کا انسان بیدار کرنے کے لئے اور انسان کو انسان سے محبت کرنے کا سبق سکھانے کے لئے، انسانی جان، انسانی ناموس کی قیمت ذہن نشین کرنے کے لئے کہاں تک اور کتنی جدوجہد اور اس کے لئے کب کوئی ہمہ گیر تحریک چلائی ہے؟ ہم نے حصول آزادی کے لئے یقیناً بازی لگادی، دوسری طرف اس سے برطانیہ کا قصر استعمار تزلزل میں آگیا، اس کا نتیجہ ناممکن بات ممکن ہوگئی، اور ہندوستان کو آزادی مل گئی، لیکن ہمیں اس کا اعتراف کرنا ہم نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جتنی کوشش کی، قوم کے ضمیر کو آزاد کرانے کی ادنی کوشش نہیں کی، ہم نے اس کو برطانیہ کے ظلم سے متنفر بنایا، لیکن ظلم کی ہر شکل سے متنفر بنانے کی کوشش نہیں کی، آج بھی ہم ملک کی تعمیر کی جتنی کوشش کر رہے ہیں، قوم کی تعمیر اس کی آدھی کوشش بھی نہیں کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ملک موجود اور قوم موجود نہیں، ہم اپنی زمین آج بھی دوسرے کے قبضہ میں دوسرے کے قبضہ میں دینے کے لئے تیار نہیں (اور یقیناً نہ ہونا چاہیئے) لیکن ہم بے تکلف اپنے ہی جسم کو زخمی کرتے ہیں، اپنا ہی بازو کاٹنے کے لئے آتے ہیں، اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گھر ڈھاتے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کا گلا ...

ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کوئی کام شدید جدوجہد، خطرات اور قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، قوم کی انسانیت کا احترام اور باہمی اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لئے ہم کو ایک مجنونانہ اور سرفروشانہ جدوجہد کی ضرورت ہے، ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دور پر کھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کی تباہی نہ ختم ہونے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کا جاتا ہے، ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے ہیں جو تاریخ کا رخ اور دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری، ان کی صاف گوئی اور ان کی جانبازی پورے ملک اور قوم کو بچالے جاتی ہے، یہی لوگ ملک کے معمار ہوتے ہیں، ان کا حکیمانہ عمل اس شعر پر

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اکثر ایسے لوگ سیاست اور حکومت کے ایوانوں سے باہر ملک کے بے لوث اور سچے روحانیوں اور دانشوروں میں پائے جاتے ہیں جن کی نیتوں پر شبہ نہیں جن کی صداقت اور بے غرضی مسلم ہوتی ہے اور ان کا دامن ہر داغ سے پاک ہوتا ہے۔

خدا نخواستہ پیدا ہو گیا تو ان تمام طبقوں میں اور اپنے مصنف سے بالاتر ہو جائیں، یہ بھی ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں لگ گیا ہیں کہ اس بگڑتے ہوئے ماحول میں بیماری کیا لگ گئی ہے اور یہ سمجھ کر کہ اس ملک یا اس تہذیب کی قسمت میں تباہی لکھی ہوئی ہے اور اب یہ کشتی تو ڈوب کر ہی رہے گی، اس لئے ڈوبنے سے پہلے کچھ فائدہ اٹھالیں اور اپنی خواہشات پوری کرلیں، تو یہ تبدیلی کسی قوم کے لئے ایسی قیامت ہوتا ہے، پھر اس قوم کو کسی مصنوعی تدبیر یا دنیا کی کسی بڑی طاقت سے بچایا نہیں جا سکتا، اگر دنیا کے سارے مفکر اور تمام فلاسفر جمع ہو جائیں اور حکومت کے سارے وسائل موجود ہوں تو بھی اس ملک یا تہذیب کو کوئی بچا نہیں سکتا، اس لئے کہ دانشور اور مذہب کا صحیح علم رکھنے والا اور اس پر عمل رکھنے والا طبقہ ان خطرات سے آگاہ ہو جاتا ہے، جو برادر کشی، انسان دشمنی، مردم آزاری، سفاکی اور سنگدلی سے پیدا ہوتے ہیں، انہوں نے مذہبی کتابوں میں خدا کا ان کے ساتھ معاملہ اور تاریخ میں ان کا انجام پڑھا ہوتا ہے، وہ قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ اور ان کے حقیقی اسباب و علل سے باخبر ہوتے ہیں، ان کو معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ خرابیاں کسی معاشرہ یا اجتماعی نظام میں پیدا ہو جاتی ہیں، تو اس کے نتیجے میں کیا تباہیاں آتی ہیں؟ اس لئے وہ اس صورت حال سے سب سے زیادہ تشویش اور خطرہ محسوس کرتے ہیں، ہر طبقے سے زیادہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے، اور وہ اس موقعہ پر میدان میں آجاتے اور ملک، قوم اور معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

میں اس موقعہ پر بلا کسی معذرت کے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھوں گا جس میں ماضی کے آئینہ میں حال کی بولتی ہوئی تصویر موجود ہے اور اس کی اصلاح کے لئے ایسے ہی لوگوں سے توقع ظاہر کی گئی ہے جن کے دماغوں میں کچھ بھی بھی روشنی اور دلوں پر انسانیت کا رہا سہا صدمہ اور اثر ہو۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ۝

(سورۂ ہود - ۱۱۶)

تم سے پہلے کے انسانی نسلوں اور گروہوں میں کچھ ایسے صاحب شعور لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں فساد اور بگاڑ کو منع کرتے ان میں تھوڑے ہی لوگ ایسے تھے جو اس خصوصیت کے حامل تھے اور ہم نے ان کو (اس عام تباہی) سے بچا لیا، باقی جنہوں نے اس زیادتی اور ظلم کا راستہ اختیار کیا وہ انہیں آسائشوں اور لذت عیش کے راستے پر چلتے رہے جن کے ذرائع وسائل ان کو مہیا کئے گئے تھے وہ مجرم تھے۔

چار نکاتی (ہمہ گیر اور طویل المیعاد) پروگرام کی ضرورت

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے جو ملک کے لئے تباہ کن، اس کو بدنام کرنے والا، بیرونی دنیا کی نگاہ میں اس کو غیر وقیع، بے اعتبار، غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ثابت کرنے اور جس کی اصلاح یا تدارک میں ملک کے ذی شعور، درد مند اور انسان دوست طبقہ کی بہت اور صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں، ایک ہمہ گیر طویل المیعاد پروگرام کی ضرورت ہے جس پر ملک کے دانشوروں، اصلاحی اور تعلیمی کام کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں کو جلد توجہ کرنی چاہئے۔

میں اس سلسلہ میں ان چار نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک فوری طور پر موثر اور مفید ہو سکتے ہیں۔

۱۔ خالص مذہبی، اخلاقی، انسانی بنیاد پر عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش دوروں، وفود، ملاقاتوں، محلوں، بستیوں، گاؤں اور قصبات کی سطح پر جلسوں اور خطابات جن میں انسان کی جان، اس کی عزت و آبرو، مال و املاک کی قدر و قیمت ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جائے ان کے احترام و تحفظ کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے۔

مذہبی، اخلاقی و انسانی بنیاد پر یہ کام اس لئے مفید اور موثر ہے کہ اس ملک کے باشندوں کا مزاج فطرتاً مذہبی، امن پسند، محبت آشنا اور انسان دوست واقع ہوا ہے، وہ اسی زبان کو زیادہ سمجھتے ہیں، اور اسی راستے سے ان کے دل و دماغ تک پہونچنا آسان ہے اور اس کا اثر مستقل اور دیرپا ہوتا ہے، دوسرے اس لئے کہ (افسوس اور شرم کے ساتھ یہ بات کہنی ہے) بار بار تجربوں کے بعد عوام کا سیاسی پارٹیوں اور الکشن کے موقعہ پر منشور اور اعلانات پر بھروسہ اور عقیدہ اٹھتا جا رہا ہے، اور وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے۔

۲۔ پرائمری کے مرحلہ سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مرحلہ تک نصاب تعلیم، تاریخ کے مضامین اور اس کے نصاب کی اصلاح، جو ملک کے دو بڑے فرقوں (مسلمانوں اور غیر مسلموں) کے دل و دماغ میں منافرت کے بیج بونے کا ذمہ دار ہے، چونکہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ بچپن کے ابتدائی دور سے شروع ہو جاتا ہے اور کتاب میں پڑھی ہوئی باتیں (بالخصوص جب ان کو واقعات، قصوں اور کہانیوں سے مستحکم کیا جائے اور استاد اس کے پرجوش مبلغ و داعی ہوں) طالب علم کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ ان ہی اور نصابی کتابوں کی باتوں کو ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن و دماغ ڈھل جاتا ہے، اور ان کی پوری زندگی اسی کے سایہ میں گزرتی ہے، یہ وہ زہر ہے جو آ

پورے معاشرے میں پھیلا ہوا ہے اور وہ کسی وقت ہانڈی کا ابال اور جذباتی اشتعال بن کر فرقہ وارانہ فسادات اور عملی تصادم کی شکل اختیار کرلیتا ہے جب تک اس نصاب تعلیم کی (جس کی داغ بیل انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد اور "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" DIVIDE AND RULE کے اصول کے ماتحت ڈالی تھی) اصلاح نہیں ہوگی، اس امن و آشتی باہمی اعتماد اور دونوں فرقوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ ہندوستانی پریس میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کی موثر اور طاقتور اور منظم اور مخلصانہ کوشش، یہ اخبارات اپنے ہیجان انگیز مضامین، سنسنی خیز خبروں اور تصویر کا بالعموم ایک رخ پیش کرنے اور ایک فرقہ کے ظلم اور ایک فرقہ کی مظلومیت ہی کو نمایاں کرنے کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کے دل میں نفرت و عداوت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں اور کسی فرقہ جماعت یا آبادی کے ایک عنصر کی طرف سے شکوک و بدگمانیوں کا ایک بادل بنا دیتے ہیں۔

میں نے کچھ عرصہ ہوا لکھنؤ میں ایران جرائد کی ایک معقول تعداد کے سامنے جو ایڈیٹرس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے فارسی کے ایک مشہور شعر کا ایک مصرعہ پڑھا تھا۔ ع

زیر قدمت ہزار جان است

شاعر محبوب کو مخاطب کرکے کہتا ہے تیرے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، اس لئے چلنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اس مصرعہ میں صرف ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ میں نے اس کو اس طرح پڑھا تھا۔ ع

زیر قلمت ہزار جان است

آپ کے قلم کے نیچے ہزاروں انسانی جانیں ہیں اس لئے لکھنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے

۴۔ برطانوی حکومت نے اپنی اس کمزوری اور اس حقیقت کا احساس کرکے کہ اس کے نمائندے ہندوستان میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں اور وہ سات سمندر پار سے اس ملک اور اہل ملک کی کی مرضی کے خلاف اس پر اپنا قبضہ اور اقتدار قائم کئے ہوئے ہے، ہندوستان میں اپنے اور پبلک کے درمیان ایک "ایجنسی" کی ضرورت سمجھی تھی جو اس کا پبلک پر رعب و داب قائم رکھے اور جس سے یہاں کے عوام دہشت زدہ اور مرعوب رہیں" اور جس کے سہارے وہ یہاں اپنے جابرانہ قوانین نافذ اور حالات کو کنٹرول کرسکے، یہ پولس کا ادارہ تھا اور چونکہ پولیس حکومت میں اسی کی بنیاد اسی نظریہ پر پڑی تھی، اس لئے اس نے اس کی تربیت دہشت انگیزی پر کی تھی، اس کو جان بوجھ کر ہر طرح کی اخلاقی تربیت ہم وطنوں کے احترام

لطیف و بلند انسانی احساسات و جذبات سے الگ رکھا تھا، اس کا نتیجہ اس کیریکٹر کی شکل میں ظاہر ہوا جو اس ادارہ کا نہ صرف امتیازی نشان بلکہ قابلِ تعریف اور باعثِ افتخار بن گیا تھا

لیکن اب جبکہ ہندوستان آزاد ہے، اور ہمارے منتخب کئے ہوئے بھائیوں کا کام اس ملک پر حکومت کرنا نہیں بلکہ اس کا انتظام سنبھالنا ہے اور پبلک کی خدمت کرنا ہے، پولس کا معیار اور اس کے بارے میں نقطۂ نظر بدلنا چاہئے، اور اس مفید ادارہ کی تربیت (جو ملک کی آبادی کا ایک اہم جزء اور قابلِ احترام عنصر ہے) بالکل دوسرے نہج پر ہونی چاہئے اس میں اخلاقی تربیت، ہندوستانی شہریت، اور انسانی احساسات، دوسروں کی مدد کا جذبہ کمزوروں پر رحم، چھوٹوں پر شفقت اور پاکباز انسانوں کا احترام اور اپنے فرائض کو بہتر سے بہتر طریقہ پر ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ وہ اس طرح سے اہلِ ملک اور اپنے ہم وطنوں کی نظر میں مونس و غمخوار اور معاون و مددگار نظر آئیں، دوسرے ملکوں میں حتیٰ کہ خود برطانیہ میں ان کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

انوکھی معذرت

حضرات! "پیامِ انسانیت" کے داعیوں اور کارکنوں نے آپ کو اسی توقع پر یہاں آنے کی اور ایک جگہ جمع ہو کر ملک کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینے، اور اس کو تبدیل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لئے زحمت دی، میں نے آپ کے سامنے ملک کی موجودہ صورتِ حال کا جو مہیب نقشہ پیش کیا ہے اس میں قطعاً مبالغہ اور رنگ آمیزی نہیں ہے، اور اس پر جس تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے اس میں بھی تخیل آرائی یا بدشگونی سے کام نہیں لیا ہے، میں آپ سے اپنی صاف گوئی اور تلخ نوائی کی معافی مانگتے اور اس پر معذرت کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھنے کے بجائے کہ

دکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس پر متاسف اور نادم ہوں کہ میں اس سے بڑھ کر صاف گوئی اور اس سے زائد تلخ نوائی کی جراءت نہ کرسکا، اور میری زبان و قلم نے میرے دردِ دل کا ساتھ نہیں دیا اور لکھنؤ کے قدیم شاعر امیر مینائی کا شعر پڑھ کر رخصت ہوتا ہوں کہ ؎

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے　　پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا، تمہیں ناگوار ہوتا

ڈاکٹر سید احمد [illegible]

انسانی شعور و دانش پر قرآنِ حکیم کے اثرات

قرآنِ حکیم انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہمہ گیر و ہمہ پہلو، دستور العمل، انسانی حقوق و وقار کا نقیب، انسانیت کی تعمیر و فلاح کا نصابِ کامل اور ایک مکمل نظامِ حیات کا مظہر اور آئینہ دار ہے جس میں سمندر کے موتیوں کی سی [illegible] رسائی اور آب و تاب ہے۔ اس سرچشمہ علم و حکمت، مشعلِ راہ ہدایت اور مینارۂ نور نے انسانی شعور و دانش، عالمی تہذیب و تمدن اور انسانوں کے دل و دماغ پر ایسے گہرے و دوررس اثرات اور مستحکم و خوشگوار نقوش مرتسم کیے ہیں کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی تاریخ یا نظام میں نہیں ملتی کیوں کہ یہ ایسا قولِ فیصل ہے جس نے تمام انسانی مسائل کو حل کر دیا ہے اور جس نے روئے زمین کے ہر حصے تک اپنے احکام و قوانین پہنچائے اور ان کا قابلِ عمل ہونا ثابت کیا ہے۔

اس کی کلیدی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک عالمگیر پیغامِ انسانیت ہے۔ ([illegible]) جو نہ صرف مسلمانوں کی ہدایت و نجات بلکہ تمام انسانوں کی صلاح و فلاح اور رہنمائی کے لئے ([illegible]) ذریعہ وحی الٰہی بواسطہ حضرت جبرئیل علیہ السلام، خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بتدریج نجماً نجماً تقریباً ۲۳ سال کی مدت یعنی ۶۱۰ تا ۶۳۲ عیسوی میں نازل ہوا۔ زمانۂ نزولِ قرآن کا یہ تاریخی پس منظر بھی ذہن نشین رہے کہ آپؐ کی بعثت "انسانیت کے بلوغ کے عروج پر اور بین الاقوامی واقفیت (INTERNATIONAL COMPREHENSION) کے دور کے آغاز پر ہوئی ہے جبکہ عالمی انسانی معاشرہ باہمی تعارف

[illegible]

عموماً تنازعات، ملک گیری کی ہوس اور ظلم و استبداد کا شکار تھا اور اللہ
یہاں تک کہ اصول پسندی اور اکرام انسانیت کا کوئی واضح اور باضابطہ تصور نہیں

قرآن کا موضوع انسان ہے۔ قرآن کریم کا موضوع انسان ہے
میں شک نہیں کہ انسان کا بہترین مطالعہ خود انسان کا مطالعہ ہے۔ چنانچہ
(جمع ناس) کسی نہ کسی عنوان سے تقریباً (۱۸۰) بار قرآن کا مخاطب ہے (
۱۰۳/۲) مزید برآں قرآن مجید کی ایک سورت کا عنوان "الانسان" (الدھر) اور
آخری سورت کا نام "الناس" ہے جس میں الناس پانچ مرتبہ مذکور ہے۔ نیز
یاایھا الانسان یعنی اے انسان! (۶/۸۴ - ۶/۸۲) اور یاایھا الن
یعنی اے لوگو! (۱۶۸/۲ - ۱/۴) کے عمومی خطاب سے معمور ہے۔ یہاں مخاطب
انسانی ہے۔ بلا امتیاز رنگ و نسل، ملک و ملت اور زبان و قومیت۔ قرآن
کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اگر انسان صدق و صفا، غور و فکر اور اطمینان و اخلا
ساتھ اس کا مطالعہ کرے گا تو وہ ضرور اس کی آنکھوں کو پُرنم کر دے گا اور
دل و دماغ کے پٹ کھول دے گا اور اس کی تمام علمی و عملی اور فکری و شعو
کو متحرک کر دے گا کیونکہ انسان اپنے رب سے ہم کلام ہے اور خود اپنا مو
آپ پڑھ رہا ہے اسی لئے یہ قرآن انسانوں کو بدلنے اور ان میں فکری
اور ہمہ گیر تعمیری انقلاب لانے کی حیرت انگیز اور اثر انگیز قوت رکھتا ہے
کا تمام تر مقصود علم و ہدایت کے ذریعے نفس انسانی کی تہذیب و تربیت
اس طرح قرآن پورے انسان کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اس کے علم و دا
بھی اور اس کے شعور کو بھی۔ نیز فلسفۂ قرآن کے بموجب، شعور انسانی کی معرا
ہے کہ انسان اپنے خالق کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسانیت اور خدمت
شعار بنائے (۷۷/۲۲، ۳/۳۹، ۲۶٫۲۴/۱۷)۔

نزول قرآن کی ا
قرآن ہدایت کا ہر جامع عنوان ہے
وغایت انسان کی ہد
و فلاح و رہنمائی ہے۔ اسی لئے اس میں ہدایت و فلاح کا ہر جامع عنوان
ہے۔ قرآن حکیم، حکمت علمیہ و عملیہ، دین و ایمان، عبادات و معاملا

حقوق و فرائض، معاشرت و معیشت، تہذیب و تمدن، قانون و اخلاق، اخوت و مساوات، عدل و احسان، امن و سلامتی اور تزکیہ ظاہر و باطن وغیرہ۔ جیسی جامع و نافع تعلیمات سے عبارت ہے گویا یہ انسان کی اجتماعی و انفرادی زندگی کے تمام ضروری اور اہم شعبوں کے علوم و معارف کا بیش بہا خزینہ ہے۔

کیونکہ اسلام کی بنا اسی فرمان الٰہی پر ہے اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول دین (نظام حیات) یعنی الاسلام (۳/۱۹) کا جوہری خلاصہ، اساسی تہذیب اور اصولی اعتبار سے اس کی تمام تعلیمات کا نچوڑ اور ما حاصل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بھر دیا گیا ہے اور ہدایت الٰہی کی ساری حکمت بالغہ اور جامعیت و حقیقت اس حکیمانہ و نافع کتاب عظیم میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ اس لئے یہ بات یقین کامل سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن پاک دنیا کے سارے اصلاحی لٹریچر، فلاحی پروگرام، تمدنی تاریخ اور ہر فکری و تعمیری انقلاب پر بھاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی واحد اور مکرم و معظم کتاب ہے۔

قرآن ایک جامع فلسفہ حیات ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج کی افراط میں مبتلا اور تفریط کی ماری پیسی اور بھٹکی ہوئی، افلاس و جہالت اور مرض و الم کا شکار، مادہ پرست و خدا فراموش اور بے چین و مضطرب نوع انسانی کی ہدایت و نجات اور فوز و فلاح قرآن حکیم کے فلسفۂ حیات اور اس کے فطری و ابدی قانون میں مضمر ہے جو ایک کامل اور جامع و نافع نظام حیات کا آئینہ دار ہے اور یہی وہ واحد فلسفۂ حیات ہے جو ہر دور میں عالم انسانیت کے لئے مینارۂ نور اور مشعل راہ بن کر اقوام عالم کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

خالق انسان اور حکیم مطلق نے قرآن مجید کے ذریعے جو اصول و ضوابط اور کلیات متعین کئے ہیں ان کی اصل نوعیت ایک مقدس قانون اور دستور اساسی کی ہے جس پر عمل کرنا منصوص ہے (۲/[illegible]) اور جو ابدی اور کافی و وافر ہے (۱/[illegible]) اور ہر قسم کی کمی و بیشی، تغیر و تبدل و تحریف اور مجہول سے قطعاً مبرا ہے (۱۸/۱ - ۱۹/۸۹) بلکہ ہر بات صاف و واضح اور محکم بیان کی گئی ہے (۱۱/۲)

(باقی آئندہ)

حنیف سیف ہاشمی

ناظم القرآن سعد صدیقی

گذشتہ گرمائی چھٹیوں میں میں اپنے ریسرچ کے کام کے سلسلے میں حیدرآباد گیا تھا تو مجھے وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں سے ملاقات کا موقع ملا جن میں ایک جناب شیخ سعد حسین سعد صدیقی بھی ہیں۔

جناب شیخ سعد حسین سعد صدیقی صاحب ایک تجربہ کار آئی۔اے۔ایس آفیسر ہیں جو آج کل سکریٹری بحالیٔ کمشنر لینڈ ریفارم و لینڈ سیلنگ کے عہدے پر فائز ہیں۔ سعد صاحب شہر حیدرآباد کے مشہور و معروف ایڈوکیٹ جناب شیخ ارشاد حسین صاحب واثق مرحوم کے خلف الرشید ہیں۔ واثق حیدرآباد کے ایک باکمال شاعر تھے جو ریاض خیرآبادی، مضطر خیرآبادی اور رفاعی کنتوری جیسے استادان سخن سے فیضیاب تھے۔ اس طرح سعد صاحب کو شاعری ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔ آپ کا سن ولادت ۱۹۳۶ء ہے اور عمر عزیز کے سترھویں سال سے یعنی ۱۹۵۳ء سے شاعری کر رہے ہیں۔ بی ایس سی، ایل ایل بی کی ڈگریاں ہی نہیں بلکہ آئی اے ایس کے عہدے پر پہنچنے کے بعد ۱۹۸۵ء میں اردو میں بھی ایم۔اے درجہ اول میں پاس کیا ہے۔ اور گذشتہ سال ڈاکٹر یوسف سرمست صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے لئے ایک مقالہ "قرآن مجید کے اردو ترجموں اور تفسیروں کا تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے لکھ رہے ہیں۔ نثر و نظم دونوں میں یکساں قادر ہیں۔ آپ کے ادبی مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

سعد صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کا ایک دیوان "نیرنگی" کلیات کی صورت میں زیر اشاعت ہے جس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ (رعنائی) میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں اور دوسرے حصہ (عکاسی) میں انگریزی نظموں کے منظوم تراجم زینت پذیر ہیں اور ستمبر ۱۹۸۳ء سے آپ نے

صدر شعبۂ اردو سہادری کالج شیموگہ ۵۷۷۲۰۳

قرآن شریف کا منظوم ترجمہ و تفسیر کا کام شروع کیا ہے

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

الہامی متن سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کسی غیر زبان نثر یا شعر کا ترجمہ اپنی زبان اردو میں ہو بہو کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں! اور پھر عربی زبان کا ترجمہ جس قدر مشکل ترین چیز ہے وہ اور کسی دوسری زبان کا نہیں۔ لیکن یہاں سوال خالص عربی زبان نہیں بلکہ کلام الہی کے ترجمہ کا ہے! قرآن مجید کی آیات کو جامعیت اور اصلی اثر انگیزی کے ساتھ نظم کے سانچے میں ڈھال کر کلام الہی کو عام فہم رنگ و آہنگ دینا انتہائی نازک اور مشکل کام ہے کیونکہ قرآن مجید خدا کا کلام ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کی زبان بھی ہے جس میں تھوڑی سی فروگذاشت مستوجب عذاب بنا جاتی ہے۔ جیسا کہ خدا کا کوئی ہمسر و ثانی نہیں ویسا ہی اس کے کلام کا بھی کوئی جواب نہیں ہے .... چونکہ دین اسلام کل عالمی تحریک کا داعی ہے لیکن عربی زبان کل عالم کی زبان نہیں ہے اس لئے اس کو تراجم و تفاسیر سے مختلف زبانوں میں پھیلانے اور تعلیم و تعلم کا ذریعہ قرار دینے کے لئے خود ہمارا اپنا دینی تقاضا مجبور ہے۔

اسی بناء پر قرآن مجید کے بے شمار زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں اور اس پر مختلف انداز میں تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں۔ عصری تقاضوں کے پیش نظر کلام الہی کو شاعری کی سطح پر منظوم رنگ و آہنگ بھی دیا جانے لگا ہے۔ قرآنی آیات پاک کے بہت سے منظوم ترجمے منظر عام پر آئے ہیں اور اچھے ترجمے بھی آئے ہیں۔ کسی نے ترجمے کے ساتھ قرآنی تفسیر کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ لیکن یہ اہتمام سعد حسین صاحب کے ترجموں میں دلکش انداز میں نظر آتا ہے۔ اتنا ہی نہیں جس قدر اجتہاد اور جدت طرازی سے کام لے کر سعد صاحب نے قرآن مجید کے تاریخی گوشوں کو عام فہم انداز میں پیش کیا ہے میرے خیال میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے بہرکیف آپ کو اس نثر و نظم سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ سعد صاحب کس حد تک دینی معلومات میں گہرے اور کلام الہی کے بحر ذخار کے غواص ہیں۔

سعد صاحب! آپ جانتے ہیں کہ کلام پاک کے کئی منظوم و منثور ترجمے کئے جا چکے ہیں اور نثر میں ان گنت تفسیریں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن نظم میں منظوم ترجمے کے ساتھ ساتھ تفسیر بھی [illegible] ہے۔ میرے خیال میں آیات پاک کا ترجمہ فقط قرآن فہمی کا [illegible] نزول آیات کا محل وقوع اور ان کے تاریخی اسباب و علل اور حالات [illegible] اس سلسلے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟ اور کیا آپ

کہ تراجم قرآن کی نوعیت بھی وہ ہے، جس کا ہیں نے ابھی ذکر کیا ہے؟

حنیف صاحب! آپ نے قرآن کے منظوم ترجموں میں جن خامیوں کی طرف اشارہ ہے وہ بلاشبہ میرے پیش نظر رہے ہیں۔ اس لئے میں نے اپنے تراجم میں آیت واری ترجمے ساتھ ساتھ تفسیر منظوم کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ میرا طریقۂ کار یہ ہے کہ میں آیات کے ترجمہ کے ساتھ تفسیر آیات کو بھی نظم کا جامہ پہنا دیتا ہوں اور جہاں تک خلاصۂ تفسیر کا تعلق اس کا حصہ الگ رکھتا ہوں اور آیات کو لفظی ترجمے کے ساتھ الگ حصۂ نظم میں شمار کرتا ہو ایسا کرنے سے تفسیر اور ترجمے میں کوئی ٹکراؤ اور رکاوٹ پیش نہ ہوگی بلکہ اچھی طرح قاری سمجھنے میں بالکل آسانی ہوگی اور کسی قسم کا الجھاؤ اس کے ذہن میں پیدا نہ ہوگا۔

آپ کے خیال میں کیا قرآن کا لفظی منظوم ترجمہ ممکن ہے؟

جی نہیں! قرآن کا لفظی منظوم ترجمہ بہت مشکل بلکہ محال ہے۔ تفسیر یا تفہیم آیات میں بڑی آسانی ہوتی ہے اور یہی میرا "طریقہ" کار ہے۔

آپ نے اپنے منظوم ترجمے کے لئے کون سے قرآن کے اردو ترجمے کو پیش نظر رکھا ہے؟

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کو تو آپ جانتے ہی ہونگے جنھوں نے پورے قرآن پاک کا ترجمہ اور چار پاروں کی تفسیر کی اور بقیہ چھبیس پاروں کی تفسیر مولانا محمود الحسنؒ کے شاگرد ارشد مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے کی ہے۔ یہ دونوں ترجمے قرآنی تراجم کے گراں مایہ سرمائے میں عظیم الشان مقام رکھتے ہیں اور بلا لحاظ فرقہ و ملت سب انھیں مستند مانتے ہیں۔ میں نے انھیں تراجم سے استفادہ کیا ہے اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قوسین میں تشریح کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ جو چیز نثر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے پیش کی ہے میں نے نظم میں پیش کر دی ہے۔

اور مزید تفاسیر و تراجم کی جانب بھی اشارہ فرمائیے جن سے آپ نے اقتباس و مطالعہ کا فیض اٹھایا

دیگر تراجم و تفاسیر جن سے میں نے استفادہ کیا ہے ان میں مولانا حضرت شاہ عبد القادرؒ محدث دہلوی کا قرآن مجید مع ترجمہ و موضح القرآن ترجمہ القرآن الحکیم کنز الایمان از اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی احمد رضا خان صاحب ترجمان القرآن (چار جلدوں میں) ۱۹۲۳ء مولانا ابوالکلام آزاد تفہیم القرآن (چھ جلدوں میں) ۱۹۴۹ء مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، القرآن الحکیم مع ترجمہ و تفسیر (دو جلدوں میں) ۱۹۵۳ء مولانا عبد الماجد دریابادی، قرآن پاک مولانا فتح محمد جالندھری، تفسیر ابن کثیر (تین جلدوں میں) تفسیر ابن عباس، ابن عباس ترجمہ تفسیر مولانا عابد الرحمٰن صدیقی

قرآن مجید کے منظوم ترجمے اور کس کس نے کئے ہیں اور ان کے اسمائے گرامی بھی ذرا بتلا دیجئے۔

ینگے ناقدانہ ترجمے ہوئے ہیں اور پورے قرآن کا بھی ترجمہ ہو لیا ہے اور جزوی ترجمے
۔ جزوی تراجم میں کیف بھوپالی، مولوی محمد حبیب اللہ صاحب وفا حیدرآبادی
اور رشید بیدری نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن شہاب اکبرآبادی نے پورے قرآن
پارے جو بلاشبہ غیر معمولی کارنامہ ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک واحد ترجمہ ہے جو
لکھا گیا ہے۔ کیف بھوپالی نے مفہوم لے کر قرآنی آیات پاک کو شعر کے سانچے میں ڈھال
نیت پیدا کر دی ہے۔ اس کی غنائیت، کیف و سرود، جامعیت اور لطافت تیر بہدف
ہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ کیف بھوپالی کا یہ ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ "آیات
ہے بقول ان کے "یہ ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم القرآن ہے"۔ اور مولوی محمد حبیب اللہ وفا
رشید نے بھی جہاں تک اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے قرآنی آیات پاک کے مفہوم سے ہی کیا ہے
بات تو صاف اور صریح ہے کہ شعر کے سانچے کے لئے بحر و وزن کی قید ضروری ہوتی
ق یا ترجمے کے لئے بحر کا انتخاب شاعر کی اپنی صلاحیت اور اس پر منحصر ہے۔ تو میں
تھا کہ آپ نے اپنے تراجم کے لئے کس بحر کا انتخاب کیا ہے اور اگر کسی مخصوص بحر
یوں؟ ذرا یہ بھی بتاتے چلئے؟

ت بالکل صحیح ہے کہ قرآن کو منظوم کرنے کے لئے کسی ایک ہی خاص بحر کی قید ممکن نہیں
منظوم ترجمے پیش ہوتے رہے ہیں لیکن میں نے اپنے ترجمے کے لئے بحر رمل مثمن محذوف
علاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) یہ بحر نثر سے قریب ہے اور تفسیر کے کام میں
سانی ہوتی ہے۔

آپ نے کتنے پارے منظوم کئے ہیں؟

ہد کا مکمل ترجمہ کر لیا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ ناس سے لے کر سورۂ النبا
جمے کے علاوہ منظوم مفہوم کلمات اسلام، کلمات نماز، ایمان مجمل اور ایمان
جمہ کیا ہے اور انہی قرآنی آیات کو میں نے انگریزی زبان میں بھی نثر کی شکل میں ڈھال
لیا ہے مثال کے طور پر سورۂ فیل کا منظوم ترجمہ اور اس کی منظوم تفسیر پیش ہے

ے میں کر رہا ہوں ابتدا جو ہے بے حد مہرباں، جو رحم والا ہے بڑا

الفیل کی منظوم تفسیر

عالم ولادت سے رسول اللہ کی ابرہہ کی وادی محسّر میں شامت آگئی

نام جس کا ابرہہ تھا اک بڑا حاکم شقی
[illegible] وہ ظالم تھا وہ

یمن کا وہ تھا نائب خود ہی حبش کے شاہ کا
ایک دن جا کر وہ ظالم خود یمن کا بن گیا

اس نے جب کعبے کو دیکھا آیا دل میں یہ شر
اک یمن کے قرب میں ایسا بنایا اس نے گھر

اور جا کر لوگ سب کرنے لگیں اس کا طواف
بھول جائیں سب یہ کعبہ تھی غرض جس کا طواف

وہ بھی سمجھا یمن میں کعبہ جب بن جائے گا
نام و دولت کے سوا وہ [illegible] گا

پھر کہاں اس کا کہاں کعبہ خلیل اللہ کا
کعبے بن جاتا یمن مکہ رسول اللہ کا

جب یمن کو حج کی نیت سے نہیں آیا کوئی
ابرہہ نے بیت رب کو توڑنے کی ٹھان لی

ہاتھیوں کی فوج لے کر جانب مکہ بڑھا
کیسا وہ بدبخت تھا جو توڑنے کعبہ بڑھا

ہاتھیوں کی فوج پر تھا ناز اس کو اس قدر
کچھ نہیں تھا اس کے دل میں اپنے مولا کا بھی ڈر

عقل میں جب آ گیا تھا اس قدر اس کی غرور
تھا ضروری توڑنا قدرت کو بھی اس کا غرور

آسماں پہ کچھ پرندے غول بن کر چھا گئے
چونچ میں، پنجوں میں لے کر اپنے کنکر آ گئے

ان کے پتھراؤ سے بالآخر تباہی وہ بھی
ابرہہ اور ہاتھیوں کی فوج بھی ماری گئی

کافروں نے مسلموں کو جب ڈرا دھمکا دیا
یاد رب نے ابرہہ کا واقعہ دلوا دیا

کافروں کو اور مسلمانوں کو یہ سمجھا دیا
خود محمد کی اماں کا رب نے ہے وعدہ کیا

سورۃ الفیل کا منظوم ترجمہ

کیا نہیں دیکھا یہ تو نے، تو نے کیا جانا نہیں
اور اگر دیکھا سنا ہے اس کو کیا مانا نہیں

کیا عمل رب نے کیا تھا ہاتھیوں والوں کے ساتھ
کام کیا رب نے کیا تھا ان کی سب چالوں کے ساتھ

کیسے تیرے رب نے ان کے مکر کو پلٹا دیا
چالبازی نے خود ان کی ان کو ہی دھوکا دیا

رب نے بھیجے واسطے ان کے پرندے غول غول
پتھروں کے پھینکے کنکر جو ان پر گول گول

ڈھیر ہو کر رہ گیا وہ لشکری بھس پر پڑی
فوج خود کھائے ہوئے بھوسے کی صورت ہو گئی

قیمتی!

• تم اپنی زندگی خود فراہم کرو، یہ جنت کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دی جائے۔ یہ دل کی دوکان ہی ہے اعمال صالحہ کی نقدی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

سید حامد

مدارس اور سائنسی تعلیم

...یں بہت سی چیزیں، ناقابلِ تقسیم ہیں۔ مثال کے طور پر شخصیت، سچائی
...یجئے۔ انھیں کے زمرے میں علم آتا ہے۔ مسلمانوں سے اپنے طویل دورِ انحطاط
...بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے علم کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔
...علم ، عصری علم
...کیا جائے کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب علم کی دو خانوں میں تقسیم تھی۔
...کی تصدیق تاریخ کرے گی۔ اوائلِ اسلام کے دور میں مسلمانوں کی تسخیرات
...ن کی رہینِ منت تھی۔ امتدادِ ایام نے اول الذکر کو ضعیف اور خود مسلمانوں نے
...کے ساتھ دو خاص جذبہ کے تحت، مفلوج کر دیا۔ اور دینی اور عصری علوم اس حد تک
...ان کے طالب بھی بٹ گئے، دونوں کی دنیائیں الگ ہو گئیں اور ملت دو لخت
...تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کے اقبال مندی کے دور میں جغرافیائی
...تی اور علمی تسخیرات کے شانہ بہ شانہ چلیں۔ سائنس کا مشہور مورخ جارج سارٹن
...ٹھویں صدی عیسوی سے گیارھویں صدی عیسوی تک ساری دنیا میں علوم کے جو اضافے
...لما اور مسلمانوں کی بدولت ہوئے۔ بارھویں صدی سے ڈھلان کا زمانہ شروع ہوا جس
...ھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے بہت تیز ہو گئی۔ علمی پسپائی کا نتیجہ تو ہم دیکھ چکے
...وقت ہم علمی پسماندگی اور بازگشت کے نتائج سے دوچار ہیں۔ ہم نے اپنے مدارس
...دینی تعلیم تک محدود رکھا یا اس میں اِلا غیر دینی مضامین کو شامل رکھا جن کو

دنیا میں [illegible] کی ترقی نے فرسودہ انداز کار ترک کر دیا تھا۔ یہاں اس خورد گیری سے مدعا ان بزرگوں کی نیت پر شبہ کرنا نہیں، ان کا حسن نیت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حسن نیت کے ساتھ ان سے غلط فیصلہ کرنے میں سہو ہوا۔ ان کی منشاء یہ تھی کہ بادِ مخالفت کے تھپیڑوں سے مسلمانوں کی کشتی کو محفوظ کیا جائے۔ ان کا مقصد دفاعی تھا اور دفاعی نقطۂ نگاہ اختیار کر لینے کے بعد پسپائی اور تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آیا اور اب یہ عالم ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر مسلمان تعلیمی اعتبار سے دنیا کی پسماندہ ترین جماعتوں میں سے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق یہ عبرت ناک مشاہدہ بھی منکشف ہوا ہے کہ اسلامی ممالک کی عام معاشی پسماندگی کے علاوہ ان ممالک میں جہاں مذہب کے اعتبار سے آبادی مخلوط ہے ان کا شمار آبادی کے تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ترین طبقے میں ہوتا ہے۔

دنیا کی ترقی کی رفتار دن بدن تیز ہوتی جا رہی ہے یہ سب کچھ سائنس یعنی علوم اور ٹکنالوجی کے زیر اثر ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیاوی علوم کے ذخیرے کو دوگنا ہونے میں قریباً قرن لگتے تھے اور اب یہ عالم ہے کہ عالمی علوم ہر سات سال کے اندر دو چند ہو جاتے ہیں۔ اس دور میں جانبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ علوم کی ترقی کی اس رفتار کا ساتھ دیا جائے۔ دراں حالیکہ ہم ان غیر دینی مضامین کو جن کی حیثیت اب تقویم پارینہ سے زیادہ نہیں ابھی تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ بہت کھلی ہوئی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے نصاب کی تشکیل نو اس ڈھنگ سے ہو کہ ان کا دینی عنصر محفوظ رہے اور ان کے غیر دینی مضامین کو زمانے کے ساتھ ہم قدم کر دیا جائے۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ادیان و مذاہب میں جتنا زور تحصیل علم پر اسلام نے دیا ہے اتنا زور کسی دین یا مذہب نے نہیں دیا۔ نصوص قرآن و احادیث رسولؐ تدبر و تفکر، تحصیل علم و آگہی کی تاکید کرتی ہیں۔ نفس دین کا تعلق ان دوامی حقیقتوں سے ہے جو تغیر ناپذیر ہیں، بقیہ علوم ہر آن بدلتے رہتے ہیں، آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ ان بقیہ علوم میں ہمارا واسطہ علوم کی ممیوں سے نہ ہونا چاہیے۔ جو ہزارہا سال سے زندگی سے محروم ہیں، بلکہ زندگی پر استہزا کی شکل میں اہرام مصر یا اس کے باہر محفوظ ہیں۔ یہ بات بھی غالباً تشریح طلب نہ ہو کہ زندگی کی طرح علوم کا کارواں بھی ہر لمحہ آگے بڑھ رہا ہے اور کارواں کے جو افراد ایک لمحہ بھی تلووں سے کانٹا نکالنے کے لئے رکتے ہیں وہ شاعر کی زبان میں صدہا سال پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اس کائنات میں جہاں ہر شئے حرکت میں ہے، اس گنبد دوّار کے نیچے جہل، حرکت و نہضت کا دور دورہ ہے اور [illegible]

جبکہ حقیقت صرف خورشید کے گرد گردش کرتی ہے بلکہ اس طرح کی حرکت سے متعلق ہو کر
اپنی دھری پر بھی رقصاں رہتی ہے، اگرچہ جواز اس بات کا ہی ہے کہ انسان آرام اور سکون اور
توقف و تامل اور لیسپائی اور بازگشت کو ریاضت و حرکت، عمل اور پرواز، اقدامیت اور پیش رفت
پر ترجیح دے۔ سائل الذکر حالتیں موت کی نیند بنا کرتی ہیں اور آخر الذکر زندگی کی نشانیاں ہیں۔
اوپر کی گفتگو سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہوگی کہ تحصیل علم سے کوئی مفر نہیں، یہ بھی کہ علم
ہمہ گیر اور ناقابل تقسیم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ علم کی ترقی کی رفتار خوش خرامی اور سست روی کا
کی متحمل نہیں ہو سکتی؛ لہٰذا ہمارے دینی مدارس بھی اس آگہی کو جذب کئے بغیر جو مختلف علوم
نسل انسانی کو بخش رہے ہیں اور اس رفتار کو اختیار کئے بغیر جو زندگانی نے اپنائی ہے فرسودہ
اور دور دراز کار ہو جانے سے بچ نہیں سکتے۔

ایک دوسرے زاویے سے بھی جو خالصتاً دین کے مقصد کو اپنی گرفت میں لاتا ہے، اس
مسئلے کو دیکھئے، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس کا مطلب
یہ نکلتا ہے کہ ہمارا دین زندگی کے سارے گوشوں کو محیط ہوگا۔ وہ خانقاہ میں بیٹھنے کی تعلیم
دینے کے بجائے عملی زندگی میں ہماری رہنمائی ہر قدم پر کرے گا۔ ہم جانتے ہی ہیں کہ عملی زندگی میں
دین تو آتا ہی ہے دنیا اپنی ساری وسعتوں، پیچیدگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے
زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور انسانوں کی مختلف بستیوں کے ایک دوسرے پر انحصار کو دیکھتے
ہوئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارے مدارس میں وہ اہم علوم بھی پڑھائے جائیں جنہوں نے گذشتہ
دو سو سال میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور جن کے ہمہ گیر اور ہر لحظہ بڑھتے ہوئے اثرات
سے کوئی متنفس محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اگر ہمارے علماء دور حاضر کے بے شمار پیچیدہ مسائل
سے دوران تعلیم واقفیت حاصل نہیں کریں گے تو وہ ملت کی موثر اور ہمہ جہت رہنمائی کیسے کر سکیں گے

ایک پہلو یہاں اور بھی لائق توجہ ہے، یہ دور دین سے بے تعلقی کا دور ہے، [illegible]
دینی [illegible] اس صدی کے آغاز تک باقی تھی وہ اب تقریباً تار تار ہو چکا ہے۔ [illegible]
پر [illegible] نہیں ہوئی۔ ایک طرف الحاد کی [illegible] دوسری طرف [illegible]
نظر آ رہے ہیں کہ [illegible] جو پہلے سے [illegible] کر کے ٹکڑے ٹکڑے
کر دیں اور امید یہ کی [illegible]
کا جواب دیں گے۔ مگر کیا ہم نے [illegible] کرنے کے لئے تیار کیا ہے؟ [illegible]
[illegible] مختلف علوم سے ان کی واقفیت اس حد تک ہے کہ وہ [illegible]

[illegible] وقت اس بات کی ہے کہ وہ الحاد اور دوسرے مذاہب کے [illegible] [illegible]
پر [illegible] کے نقصانات [illegible] کر سکے ہیں۔ [illegible] کسی [illegible]
[illegible] اور [illegible] چھوٹے [illegible] اگر جواب [illegible] ہے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ [illegible]
[illegible] کہ صرف افراد [illegible] اور [illegible] یا آرائش [illegible] کے [illegible]
کا [illegible] سمجھا جانے میں ایک [illegible] کو بھی [illegible] چاہیئے یا نہیں؟ اگر ہم [illegible]
کے [illegible] ایک [illegible] پہلے آ رہے ہیں تب تو یہ سیلاب [illegible] جانا یقینی ہے
اسے [illegible] تحریک کرکے خود بھی زندگی سے [illegible] آ ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہیئے
ہیں تو [illegible] اہتمام کرنے چاہییں

١۔ [illegible] اس بات کی جو ایک [illegible] کے مطابق ہماری آبادی کے ۸۰ فیصد کو گھیرے ہوئے ہے جلد سے جلد پوری علمی کوشش کے تحت دور کی جائے ———

٢۔ مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اہم عصری مضامین بھی پڑھائے جائیں۔

ایک اور پہلو اس مسئلہ کا غالباً اس کی اہمیت کو منظر عام پر لے آئے۔ انسان نے ہمیشہ آرائش [illegible] کی کوشش کی ہے۔ موجودہ زمانے میں ٹکنالوجی اور صنعت اور پیداواری صلاحیتوں کی ترقی اور توسیع نے اس طلب کو بہت تیز کر دیا، مارکیٹ کا پول بالا ہے اور انسان انواع و اقسام کے سامان نمائش و آسائش کی ترغیب کے مقابلے میں بے بس [illegible] ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا اثر ہمارے دیکھتے دیکھتے دینی مدارس پر یہ پڑا کہ [illegible] چونکہ ان مدارس میں والدین ان بچوں کو بھیجتے ہیں جن کی تعلیم کے اخراجات [illegible] کی وجہ سے [illegible] نہیں ہو سکتے یا ان کی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں یہ توقع نہیں ہے کہ وہ انگریزی اسکولوں میں کامیاب ہو سکیں گے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اس وضع کے طالب علم مسند فضیلت پر بیٹھیں گے تو وہ مسلمانوں کی رہنمائی کیونکر کریں گے اور دوسرے مذاہب [illegible] اسلام سے [illegible] کیونکر کرائیں گے۔ [illegible] اسلام پر [illegible] پر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں ان کا شافی اور مسکت جواب کیسے دیں گے؟
ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ [illegible] دینی مدارس
کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کے اہم مضامین ضرور پڑھانے چاہئیں۔ [illegible]
[illegible] یہ سوچنا پڑے گا کہ ہر ہر وہ نصاب کے [illegible] کی جائے تاکہ
[illegible] سائنس اور انگریزی [illegible] اس [illegible]

[illegible] حیدرآباد

[illegible] بھی پر درست تبدیل کرنا پڑے گی اور اساتذہ کا انتخاب میں ایک یا دو سال کی مدت کا اضافہ بھی کرنا ہو۔ اس سے بھی ایک سوال وسائل کا ہے۔ ہمارے بیشتر مدارس مالی مشکلات سے دوچار ہیں اور ان میں سے بیشتر ملت کے عطیات پر انحصار کا شکار ہیں۔ وہ اپنے معلمین کو بہت قلیل تنخواہیں دے کر کسی طرح گزر کرتے ہیں اور [illegible] نادر جو اسے دین کے ساتھ ہے یہ اساتذہ کے قلیل تنخواہیں قبول کر لیتے ہیں لیکن گرانی اور مادیت کے اس دور میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ محض دین کی خاطر اساتذہ قلیل تنخواہوں کو قبول کرتے رہیں گے بعد جہاں تک کہ سائنس اور ریاضی اور انگریزی کا تعلق ہے اس کو پڑھانے والے بازار کی شرح کی تنخواہ پر اصرار کریں گے۔ کچھ ادارے شاید ایسے بھی ہوں جو اس مطالبے کو مان لیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے انھیں ایک اور مسئلے سے دوچار ہونا پڑے گا، کیا ایک ہی ادارے کے اساتذہ کو دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے؟ ایک وہ جو دینی مضامین پڑھاتے رہیں گے اور قلیل تنخواہوں پر صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزاریں گے، دوسرے وہ جو جدید مضامین پڑھانے کے لئے عصری تعلیمی اداروں میں مروجہ شرح مشاہرہ لینے پر اصرار کریں گے۔ تنخواہوں میں اس قسم کا فرق رکھنا بہت سی ناروا رنجشوں اور شکوؤں کو جنم دے گا۔ علاوہ بریں یہ طریقہ کار کسی کو بھی، خصوصاً دینی مدارس کو، زیب نہیں دیتا کہ قدر و قیمت کے لحاظ سے غیر دینی تدریس کو دینی تعلیم پر فوقیت دی جائے، اس طرح دین اور اس کی تعلیم کے وقار کو صدمہ پہنچے گا۔

مذکورہ دشواری کے حل کی طرف پہلا مثبت قدم سید ہاشم علی صاحب شیخ جامعہ کے زیر ہدایت اور پروفیسر اسرار احمد صاحب پروفیسر شعبۂ دینیات کے اہتمام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اٹھایا۔ اس طرح انھوں نے ان توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کے عظیم بانی سید والا گہر نے ابتدا سے وابستہ کی تھیں اور حسن اتفاق سے جس قسم کی خدمت کے لئے یونیورسٹی کو اس کے نئے چارٹر نے مکلف کر دیا ہے۔ ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کی ایک دفعہ کی رو سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی ترقی کے لئے کوشش کرے۔ موجودہ [illegible] میں نے آپ کو [illegible] یہاں جمع کیا ہے، اسی اختیار کو استعمال کرنے کا ایک مبارک تجربہ ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم مدارس میں ان اساتذہ کو بڑے بڑے مشاہروں پر رکھیں جو عصری [illegible] کے عادی ہو چکے ہیں، یونیورسٹی کی طرف سے یہ اہتمام کیا جا رہا ہے کہ اسلامی مدارس سے فارغ [illegible] موجودہ اساتذہ [illegible] کے ذریعہ اس قابل کر دیا جائے کہ [illegible] سکیں [illegible] ہم اساتذہ [illegible] ہوں گے اور [illegible]

تیں [illegible] پڑتے۔ جن میں جنت خواں کی دشواریوں کی توقع اور ان کی نشاندہی [illegible]
کر [illegible] اُن دشواریوں، رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا ذکر کر کے آپ کو [illegible]
نہ [illegible] اس موقع پر جس کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا ہے کسی قسم کی تخریب اندیشی
[illegible] سے متاثر کرنا چاہتے۔ ہم اپنی ملت کو اس اہم کام میں جو یونیورسٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے تعاون
دینا چاہئے۔ دراصل ہمارا فرض ہے کہ شہر شہر قریہ قریہ کوشش کر کے وسائل فراہم کریں تاکہ ہمارے
مدارس کو عموماً جو جو مسلم دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان سے نجات ملے، اور اس سے ترتیب کردہ اہم
عصری مضامین کو اپنے نصاب میں داخل کر کے چلانے کے متحمل ہو سکیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے
بیدار مغزی اور دوراندیشی سے کام نہیں لیا اور اس مستحسن اسکیم کو زبانی خراج ادا کر کے اپنے گھر
میں بیٹھ گئے تو ان عزائم کو ٹھیس لگے گی جو یہ عظیم یونیورسٹی اٹھی ہے، ٹھیس پہنچ جائے گی، خدا
نہ کرے کہ ایسا ہو۔ آپ کے علم کے لئے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دینی تعلیم کے اداروں کو ایک لڑی
میں پرونے کی خاطر اتر پردیش میں ایک انجمن "دینی تعلیمی کونسل" کے نام سے قائم کی گئی تھی، اس
نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو ہم کم ہمتوں کے تصور سے بھی آگے ہے۔ حال ہی میں اس
انجمن کا سالانہ اجلاس بنارس میں ہوا جس میں یہ طے پایا کہ دینی تعلیمی اداروں کو ایک لڑی میں
پرونے اور دینی تعلیم کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر ریاست میں ایک دینی تعلیمی
کونسل بنائی جائے اور پھر مرکزی فیڈریشن معرض وجود میں لایا جائے جو اس نظام کی نگرانی اور
دستگیری کر سکے۔ میری گزارش یہ ہوگی کہ اس اجلاس میں اس قرارداد کی تائید کی جائے اور ا
اقدامات کی نشاندہی بھی جس کے ذریعہ ہم اس تنظیمی مقصد کو حاصل کر سکیں۔

دینی اداروں میں، انگریزی اسکولوں کے مساوی، انگریزی، سائنس اور ریاضی کے مضامین
داخل کرنا ایک انقلابی اور جدید آفریں قدم ہوگا۔ اس قدم کو اٹھانے کے لئے تیاری کے بہت سے مراحل
طے کرنے پڑیں گے۔ مبادا کہ ہم اصلاح و تجدید کے جوش میں تیاری کے مراحل کو ایک چھلانگ میں
طے کرنا چاہیں۔ عزم کا تقاضہ ہے کہ پہلے ایک چھوٹی بساط پر تجربہ کر کے دیکھا جائے اور تجربہ
کی روشنی میں ضروری ترمیمیں کرنے کے بعد اس پروگرام کو پھیلا دیا جائے۔ ہمیں دانستہ یا نادانستہ
ایسی صورت حال پیدا کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے جو اکثر دینی مدارس کے طلباء میں عصری مضامین
کے شمول کے لئے ضابطہ [illegible] اور انتشار شکن بے تابی پیدا کر دے۔ خطبہ دینے والا خود ایک
عرصے سے عصری مضامین کے شمول پر مصر رہا ہے، وہ خوش ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے
اس ضمن میں ایک قابل قدر مثبت قدم اٹھایا ہے لیکن وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس [illegible] کام کر

مدارس پروگرام کو ترویج دینے سے پہلے ملک گیر سطح پر مالی، افرادی اور تربیتی وسائل کا اہتمام ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نفع کی بجائے نقصان کا خطرہ لاحق ہو جائے گا

اس کے علاوہ ہمیں اچھے اکابر علماء سے اجتماعی طور پر یا فرداً فرداً اس اہم مسئلہ اور اس کی تفصیلات اور جزئیات پر مشورہ کرنا چاہئے۔ ورنہ اس سے مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا ہے، لیکن اتنا اہم معاملہ کب تک پیچھے کرنا روا نہ ہوگا۔ اچھا ہو اگر اس کانفرنس کی دوسری کڑی کے طور پر مل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نظام اور دینی جامعات کے ارباب اہتمام کو ان تجاویز پر غور کرنے کے لئے وقت دے جو موجودہ کانفرنس کے نتیجے کے طور پر ترتیب پائیں۔

ممکن ہے ایسا ہو سکے یا نہیں لیکن یہ چاہتا ہے کہ منکرہ عصری مضامین کے داخل نصاب ہونے کے بعد بھی عربی جامعات اور مدارس میں سنجیدگی، انہماک، شائستگی اور ریاضت، ادب اور ذمہ داری کی وہ فضا قائم رہے جو انہیں عصری اداروں سے ممتاز کرتی ہے۔

جامعۃ ہدایت جے پور کے ایک سیمینار میں راقم سواد کو یہ تجویز رکھنے کا موقع ملا تھا کہ ان مدارس اور جامعات میں جنہیں ضروری وسائل دستیاب ہیں، تین طرح کا نصاب بیک وقت چلایا جا سکتا ہے۔ ایک صرف دینی، دوسرا دینی اور سائنسی (بہ شمول انگریزی و ریاضی) اور تیسرا صرف عصری۔ لائحہ عمل کو بالآخر طے کرتے وقت اس تجویز پر بھی غور ہو سکتا ہے

جن لوگوں کو کھیل کود سے شناسائی ہے (اور یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کھیل زندگی کی نقل کرتے ہیں اور اسے ڈھنگ سے گزارنے کی تربیت دیتے ہیں) وہ جانتے ہیں کہ ہر اچھا کھلاڑی کو پہلے اس عمل سے گزارنا ہے جسے گرمانا کہتے ہیں۔ اس عمل کے باعث ایک طرف دوران خون بتدریج تیز ہوتا ہے دوسری طرف ساری شخصیت اپنے جسمانی، ذہنی اور روحانی پہلوؤں کے ساتھ مقصد پر مرکوز ہوتی ہے۔ بازی گاہ کے باہر زندگی کے دوسرے مقاصد و مشاغل میں منصوبوں کی کامیابی کے لئے بھی گرمانے کا عمل ناگزیر ہے اور یہاں اس عمل سے مراد ہے جز وقتی ساتھ تیاری اور پہلے چھوٹے پیمانے پر تجربہ۔

چند سطور مدارس میں ایک عرصے سے جمود کا عالم ہے۔ جناب سید ہاشم علی [illegible] محترم پروفیسر اسرار احمد صاحب اور ان کے رفقائے کار کی بالغ نظری، جرأت اور ہمت [illegible] جمود کو توڑنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ قدم اور اس کے [illegible] تعلقات ہماری ملت کی موجودہ کیفیت کو متاثر کریں گے اور مدارس کے نظام تعلیم کی [illegible] کریں گے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور ہمارے علوم اسلامیہ اور عصری [illegible] نظام تعلیم کی تجدید میں مشورہ اور تعاون دیں۔ (ماخوذ) ★★★

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کیلئے لائحہ عمل

میں نے اس کانفرنس کے لئے جو مقالہ تیار کیا ہے وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نے دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے حصے میں ان اقدامات کا ذکر کیا ہے جو کہ اس عظیم مقصد کی بازیابی کے لئے ضروری ہوں گے۔ مجھے خوشی ہے پانچ نشستوں میں جو مقالات پیش کئے گئے ان میں ہمارے فاضل شرکاء نے دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ضرورت کو روز روشن کی طرح عیاں اور واضح کر دیا۔ قابل مبارکباد ہیں وہ حضرات کہ انہوں نے کس باریک بینی، بالغ النظری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علوم کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ وہ ان کے استقبال کے لئے تیار اور ان کو رائج کرنے کوشاں ہیں۔ میرے جیسا کوئی سائنس کا طالب علم اگر سائنس کی اہمیت اور افادیت بیان کرے ایک عام اور متوقع بات ہے لیکن اگر یہ پیش رفت ان اصحاب کی طرف سے ہو جن تک ہم یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں تو میری نظر میں یہ نہایت مبارک عمل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہرگز فروغ سائنس کے پیغام کی اس سے بہتر پذیرائی نہیں ہو سکتی تھی۔

آپ کا وقت قیمتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے مقالے کے پہلے حصے کو آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کے ہر پہلو پر نہایت روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سائنسی تعلیمات کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد ہمارے سامنے پہلا مسئلہ یہ آتا ہے کس نوعیت کی سائنسی تعلیم ان مدرسوں میں شروع کی جائے؟ کیا ان میں وہی اور ویسی تعلیم ہو جو ہمارے سائنسی اسکولوں میں ہوتی ہے یا پھر صرف اس کا عملی پہلو ہی لیا جائے کہ فی الحال جیسے دینی مدارس روایتی تعلیم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کے لئے ہم کو ایک ماڈل کو اپنانا ہوگا جس کے تحت نہ صرف یہ کہ وہ سائنس سے واقف ہوں بلکہ اس کی [illegible]

پیدا کیے جا رہے ہیں لیکن ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کے لیے مواقع کتنے محدود ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے لیے مناسب روزگار کا انتظام بھی ہو سکے تو اس سے دینی تعلیم کی تبلیغ و فروغ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی بلکہ دینی مدارس کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے میں میری کچھ تجاویز و خیالات ہیں جو میں آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ دینی مدارس میں تعلیم کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بنیادی سطح پر جو تعلیم دی جائے اس میں سائنسی علوم لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کیے جائیں یا ہم جنرل سائنس اور ریاضی کو دو مضامین کی حیثیت میں لے سکتے ہیں۔ جنرل سائنس میں طلبہ کو سائنس کی بنیادی باتوں اور اصولوں سے ان کے گرد و پیش کے پس منظر کے ساتھ روشناس کرایا جائے۔ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے کہ بچہ اپنے چاروں طرف پائی جانے والی چیزوں کی حقیقت و کارکردگی سے واقف ہو سکے تاکہ اس میں نہ صرف مشاہدے کی قوت بلکہ تجزیے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس بنیادی تعلیم کے بعد ہم طالب علم کے سامنے دو راستے رکھیں گے۔ اگر وہ دینی تعلیم اعلیٰ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس بنیادی تربیت کے بعد اسے پوری تندہی سے دینی علوم کے حصول کا موقع ہوگا۔ یہاں پر اساتذہ کا بھی یہ کام ہوگا کہ جو بچہ دینی تعلیم کے لئے زیادہ کوشاں اور محنتی ہوں ان کی رہنمائی اس سمت میں کی جائے۔ اس طرح فارغ التحصیل ہونے والے طلبا میں سے مبلغ، عالم، خطیب، امام حضرات اور دیگر مساجد دینی [illegible] گے جن کی کاوشیں دین کی نشر و ترویج میں مددگار ہوں گی۔ بنیادی سطح کی تعلیم کے بعد دوسرا راستہ ان طلبا کے لیے ہوگا جو تعلیم کے ساتھ کوئی ایسا دنیاوی ہنر و علم سیکھنا چاہیں گے جو ان کو باعزت روزگار فراہم کر سکے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان طلبا کو ہم اپنے دیگر اسکولوں میں مروج اعلیٰ تعلیم سے روشناس کرائیں یا ان کو عملی کام پالی ٹکنک کے انداز کا سکھایا جائے۔ میرے خیال میں اگر ان کو روایتی سائنسی نصاب میں تعلیم دی جائے، جیسا کہ کچھ خاص مدارس کا رجحان [illegible] تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہائی اسکول یا میٹرک کی سطح کی سائنسی تعلیم کا اگر ہم نے انتظام کر دیا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ کون سا کالج یا یونیورسٹی ان کو لے گی؟ علاوہ ازیں اس میں اخراجات بھی بہت زیادہ ہوں گے دشواریاں بھی ہوں گی۔ ہمارے زیادہ تر طلبا [illegible] سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اکثریت [illegible] میں ہے۔ جہاں سے صرف میٹرک تک تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے [illegible] طلبا سے یہ امید نہیں کر سکتے کہ یہ دوسرے شہروں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے متحمل ہوں۔ اس کے علاوہ چونکہ ان مدارس میں داخلے کے واسطے عموماً عمر کی قید نہیں ہوتی اس [illegible]

مختلف طلباء اس عمر کے دائرے میں ہیں آئیں گے جن کو کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ ملتا
اگر بفرض محال کسی طرح یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو ان کو داخلہ مل جائے گا تو ان کی تعلیم و تربیت
قسم کے ماحول میں اور اردو زبان میں ہوئی ہوگی۔ اس لئے یہ کالج میں ہونے والی انگریزی تعلیم
جس کی سطح کے مطابق اپنے آپ کو نہ پا کر نہ صرف یہ کہ احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے بلکہ ممکن ہے
کہ ان میں منفی رجحانات بھی پیدا ہو جائیں اور بے سبب عصبیات تو یہ ہے جس کا مختلف انداز
بیان تو یہ ہے کہ ہمارے پاس وسائل کی فی الحال اتنی کمی ہے کہ ہم اس تنگ دستی کے عالم
کسی سائنس ٹیچر کو انٹر یا ہائی اسکول کا نصاب پڑھانے کے لئے نہیں لا سکتے۔ اس پس منظر میں
واضح ہو جاتا ہے کہ روایتی ہائی اسکول اور انٹر کی سائنس ہمارے مدرسوں کے لئے فی الحال غیر
ہے۔ چونکہ معاشی صورت حال کا روزگار سے گہرا تعلق ہے اس لئے اگر ہم سائنسی تعلیم و تر
کو روزگار سے جوڑ سکیں تو یہ دوہری خدمت ہوگی جس سے بیک وقت دو مسائل حل ہوں
لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اپنی دوسری سطح کی سائنسی تعلیم کو صد فی صد عملی شکل دیں یعنی
کہ مختلف قسم کے ایسے ہنر سکھائے جائیں جو ان کے علاقوں کے لئے مفید ہوں۔ مثال کے
آلات زراعت کی مرمت جن میں عام اور مشینی ہل، تیل اور بجلی کے پمپ اور ٹریکٹر دیہاتوں میں
ہیں۔ اس کے علاوہ اسکوٹر، موٹر سائیکل مرمت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن مکینک کے کام کے
گھریلو صنعت اور دستکاری کا کام بھی ان کو سکھایا جا سکتا ہے۔

ان راہوں کا تعین کرنے کے بعد دوسرا مسئلہ نصاب اور اساتذہ کا آتا ہے۔ بنیاد
کی سائنس کے لئے بھی یہ عرض کروں گا کہ NCERT کی کتابوں کی بجائے اس مقصد کے لئے
کتابیں تیار کی جائیں کیونکہ NCERT کی کتابوں کا پس منظر دوسرا ہے۔ وہ اس نظام تعلیم
تیار کی گئی ہیں جو کہ کم از کم بارہ سال تک چلتا ہے جب کہ ہماری بنیادی تعلیم حد سے حد
درجے تک کی ہوگی۔ علاوہ ازیں ہمارے مدارس کی کتابوں میں قدرت کی صناعی کی تفصیل کے
قادر مطلق کا بیان بھی ہونا چاہئے تاکہ نہ صرف یہ کہ بچے کا ذہن دو حصوں میں تقسیم نہ ہو بلکہ اس کو
کی قدرت کو پہچاننے اور سمجھنے کا بہتر موقع ملے۔ اس سطح کی تعلیم کے لئے ہر باتح النظر معلم کو
ماہ کی تربیت کے بعد تیار کیا جا سکتا ہے اور اس طرح کا انتظام مجھے یقین ہے کہ مرکز فروغ
اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر نگرانی ہو سکتا ہے۔ دوسری سطح پر جو ترمیمی نصاب
ہوگا اس کی تیاری بھی ہم کو اس طرح کرنی ہے کہ ہر اہم اور متعلقہ چیز کی کتب عام فہم ا
زبان میں دستیاب ہو۔

اب جہاں تربیت کا تعلق ہے اس کے لئے میرے ذہن میں کچھ تجویزیں ہیں۔ ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو اہم علاقے ہیں جہاں ایسے طالب علموں کی تعداد زیادہ ہو وہاں پر متعلقہ آبادی اور اہل خیر کی مدد سے ایسے تربیتی مراکز کھولے جائیں جہاں نہ صرف یہ کہ تربیت دی جائے بلکہ اس مرکز کا تجارتی استعمال بھی ہو۔ مثلاً اگر گھڑیوں کی مرمت کی تربیت کا سلسلہ ہو تو وہاں نہ صرف یہ کہ طلباء کو گھڑیوں کی مرمت سکھائی جائے بلکہ وہاں کے رہنے والوں کی گھڑیاں مناسب اجرت پر درست کی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے علاقوں میں جو ورکشاپ اور کارخانے پہلے سے قائم ہیں، ان کے مالکان سے رابطہ قائم کرکے ایک ایک، دو دو طالب علم کو تربیت کی غرض سے وہاں لگا دیا جائے جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ Apprenticeship کا ماڈل ہے جس کا استعمال آج ہر بڑی کمپنی کرتی ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کے تربیتی مراکز ان مدارس دیگر ان اداروں میں کھولے جائیں جو اس سے متفق ہوں۔ ان مراکز میں صرف دینی مدارس سے منسلک طلباء کی تربیت کا اہتمام ہو۔

تیسرا اہم مسئلہ وسائل کا ہے۔ وسائل و ذرائع کی ضرورت ہم کو ہر ہر قدم پر ہوگی اور اس سلسلے میں میں نے کچھ ذہنی اور کچھ عملی کاوشیں کی ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نصاب بنیادی سطح کا ہو یا اعلیٰ درجات کا، اس سے متعلق کتابیں ہم کو آسان اردو زبان میں طلباء کو فراہم کرانی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم کو ان دیگر اداروں کے وسائل اور تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو اردو کے فروغ کا کام کر رہے ہیں۔ میرا اشارہ خاص طور سے ترقی اردو بیورو کی طرف ہے۔ یہ ادارہ اردو میں نصابی اور غیر نصابی کتابوں کی تیاری پر کثیر رقم صرف کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے ہر سائنسی مضمون کی اردو میں لغات تیار کی ہیں اور یہ کام ابھی جاری ہے۔ ایسی ہی ایک کمیٹی سے میں وابستہ ہوں۔ اس لئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ محض کاغذی کارروائی یا خانہ پری نہیں ہے بلکہ صدق دل سے یہ کام ہو رہا ہے۔ اردو کے ذریعہ سائنسی تعلیم کے فروغ کے لئے بھی یہ ادارہ کوشاں ہے۔ اس ماہ کی ۱۹ اور ۲۰ تاریخ کو نئی دہلی میں اس ادارے کے زیر اہتمام ایک سمینار کا انعقاد ہوا تھا جس کا موضوع تھا کہ سائنس اور ٹیکنیکل تعلیمات کو اردو کے ذریعہ کیسے پھیلایا جائے۔ راقم الحروف بھی اس سمینار میں شریک تھا۔ میں پروفیسر ابوالکلام صاحب سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ان کی اجازت کے بغیر اس سمینار میں مرکز فروغ سائنس کے منصوبے وہاں کے شرکاء کو پیش کر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس کی پذیرائی ہوئی جس میں ہر کسی نے ہر شعبہ سائنس اور انجینئرنگ کے اداروں کے سربراہ ... میں شامل تھے

تجویز [illegible] کی [illegible] سائنس سے [illegible] اہتمام کرتے [illegible] ان کو [illegible] سائنس کمیونٹی [illegible] سکیں۔ مجھے بتایا گیا ہے [illegible] نے جس میں [illegible] سے [illegible] انجینئرنگ کالج کو ۱۱۲ [illegible] انجینئرنگ کالج بنگلور کے [illegible] کا غیر [illegible] کیا بلکہ اس کو [illegible] کی منظور شدہ [illegible] میں شامل بھی کیا۔ اگر [illegible] کے اراکین بھی اس تجویز سے متفق ہوں تو میرے خیال میں کم از کم نصاب کی تیاری میں اردو سے ہم کو کافی مدد مل سکتی ہے۔

جہاں تک تحقیقی مراکز قائم کرنے کا سوال ہے اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ [illegible] نئی تعلیمی پالیسی کے تحت حکومت نے غیر شہری علاقوں میں تربیتی مراکز [illegible] نہ صرف [illegible] دیا ہے بلکہ اس کے لئے کافی سرمایہ بھی فراہم کیا ہے۔ ان کو حکومت نے [illegible] Polytechnic کا نام دیا ہے۔ میں ایک بات یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس نئی تعلیم کی [illegible] میں آر۔ کے۔ [illegible] صاحب نے کافی کردار ادا کیا ہے جو کہ حکومت کی اس اہم وزارت ایجوکیشن سکریٹری ہیں۔ گذشتہ دنوں موصوف نے ایک نشست میں بذات خود اس بات کو [illegible] کہ نئی تعلیمی پالیسی پسماندہ طبقوں کو نظر میں رکھ کر بنائی گئی ہے اور جن چار اقلیتوں کو تسلیم کیا گیا ہے ان میں پہلا نمبر [illegible] کا ہے۔ اس پس منظر میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر [illegible] کریں تو ہمارے قصبات اور دیہات میں ایسے تربیتی مراکز چلانے کے لئے حکومت کی مدد ہو سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے اگر میں یہ کہوں کہ ہماری پسماندگی کی ایک [illegible] بھی ہے کہ ہم مواقع سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہماری قوم میں اب بھی [illegible] کافی [illegible] موجود ہیں لیکن افسوس ہے بہت کم [illegible] حکومت کی مدد لیتے ہیں کیونکہ ان کی اکثریت [illegible] واقفیت ہی نہیں ہے۔ یہ پیش رفت بہرحال اراکین مرکز کو کرنا ہوگی۔ لیکن ساتھ ہی میں [illegible] چاہوں گا کہ حکومت اور اس کی پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں اس لئے ہر قدم [illegible] کرنے ہوگا۔ [illegible] کے تحت ہم کو [illegible] جنوبی ہندوستان [illegible] تعلیمی ٹرسٹ قائم کرنے ہوں گے جن سے ہم اپنے تعلیمی ادارے چلا سکیں۔ [illegible] ہوتا ہے لیکن [illegible] نے بہت اعلیٰ قسم کی تعلیم [illegible] منظور [illegible] لیکن اگر ہم [illegible] قوم کی [illegible] ہے تو ہم کو [illegible]

ہوں گی اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کو ختم کرنے میں مدد کریں۔

علاقے کے طور پر دہرانا چاہوں گا کہ سائنسی تعلیمات کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد ہمارے سامنے [illegible] مسائل ہیں۔ نصاب کی تیاری، اساتذہ کی تربیت اور وسائل کا انتظام [illegible] سب حضرات سے گذارش ہے کہ ان مسائل کے حل تلاش کرنے میں اراکین مرکز کی مدد کریں۔ اپنی رائے، اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں بھی کوئی بات ہم سب کو ایک نیا راستہ دکھا دے۔ لیکن معذرت کے ساتھ یہ گذارش بھی کروں گا کہ اس وقت ہمارا مقصد ان مسائل کا حل ڈھونڈنا ہے اس لئے ہم تمام تر فکر و صلاحیت کو اسی جانب موڑ دیں تاکہ ہمارے یہاں آنے اور جمع ہونے سے مرکز اور اس کاز کو کچھ فائدہ پہنچے۔

آخر میں میں پروفیسر اسرار احمد صاحب اور دیگر اراکین مرکز فروغ سائنس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے وقت کی ضرورت کو پہچانتے ہوئے ایک خوش آئند ابتدا کی ہے۔ شروعات ہمیشہ مشکل اور پہلا قدم ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔ لیکن جس نے پہلا قدم اٹھا لیا اللہ تعالیٰ اس کا پورا سفر آسان کر دیتا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ کاروان اپنی منزل مقصود کو پہنچے۔

★ ★ ★

ہر غزل کا ترجمہ اسی بحر و قافیہ میں کیا گیا ہے جو اصل فارسی غزل کا ہے۔ ردیف کا بھی [illegible] ہے جو اصل کے [illegible] الفاظ اکثر برقرار رکھے گئے ہیں جو اردو میں مشترک و مانوس ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ اصل سے بہت قریب ہو گیا ہے اور اس خصوصیت میں دنیا بھر کے [illegible] میں [illegible] ہے۔ [illegible] پیش کیا جائے گا۔

[illegible]

[illegible]

پیش [illegible]

احمد فراز ــ درد کا شجر

پاکستانی شاعر احمد فراز جدیدیت کی تاریخ میں ایک اہم
منفرد شاعر ہے۔ ہجرت اور فسادات کے ہنگامہ میں جدید غزل کا ایک نیا تجربہ
۱۹۴۷ء میں جب برصغیر دو نیم ہوا، زندگی نیم جان ہو گئی۔ سرحدوں کے دونو
کا شیرازہ بکھر گیا۔ خون کی ہولی کھیلی گئی۔ ننگ و ناموس کی دھجیاں اڑ گئیں۔ جغر
دو دلوں سے اس کے لئے غزل ہی ایسی صنف تھی جو بہت مناسب بہت مو
تھا اور آشوب دل دونوں کی واردات اسی توسط (MEDIUM) سے کہی؟
ناصر کاظمی نے بھی غزل کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا۔ ناصر کاظمی نے ہجرت کا ذاتی طو
تھا۔ بستیاں جلتے، زندگیوں کو نیست و نابود ہوتے اور ننگ و ناموس
دیکھا تھا۔ انسان کی درندگی کے یہ مناظر ناصر کاظمی کے صفحۂ ذہن پر مرتسم ہ
اس کے لئے آشوب آگہی اور آشوب گری تھی جو منجمد ہو گیا ہے۔

احمد فراز نے ہجرت کا ایسا تلخ گھونٹ نہیں پیا لیکن مزاج کی
یہ وہ شاعر ہے جو دنیا بھر کی شکستوں کا جال اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے
درد کا وہ شجر ہے جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن جس کے چھتنار
رجحانات کے تھکے ماندے مسافر سکون محسوس کرتے ہیں۔ جدید لب و لہجہ
ہوتے بھی قدیم ہے کیونکہ اس کے یہاں میر و غالب کا آہنگ ملتا ہے اور
بھی۔ یہ وہ چارہ گر ہے جس کی زنبیل میں "نسخۂ کیمیائے محبت" بھی
شعلہ بداماں آتش بجاں ہے اور اپنی وفات میں طرح طرح ملامت
احمد فراز کی تخلیق "جاناں جاناں" اردو کے شعری سرمایہ

سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

یہ تر تجربات کا آئینہ دار تصنیف ہے۔ عنوان بیاض کے گہرے معنویت کا حامل
۔ لفظ 'جاناں' کی تکرار محض صوتی حسن کے لئے نہیں ہوا ہے بلکہ دو تاثر
ل ہے۔ گریز کا تاثر جو فضائی بسیط پہنائیوں کو ایک لمحہ ایک ایک سے
تا ہے تو تکرار بھی تھا اور تسلسل آرزو کا ثبوت بھی ہے۔ اس میں دل آدم کا وہ
پنہا ہے ابھرتے ہوئے بھی بنیا ہے کہیں عیاں اور کہیں نہاں دکھائی دیتا ہے
یہ وہ تمدن کی صبح صادق سے لے کر آج تک محبوب حیات انسان کا محور رہا ہے
زسے اس مرکزی اہمیت کو لفظ 'جاناں' کی صوتی تکرار سے مستحکم بنانا چاہا ہے
یہ لفظ بھی سنگ گراں کی طرح آج کے دور کی تشکیک کے سبب بنیاد کا پتھر
کے قابل دکھائی دیتا ہے۔

عنوان جاناں جاناں کی اس گہری معنویت کو جب ہم اپنے ذہنی
ظر میں رکھ کر اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بتدریج واضح ہوتا ہے کہ جدیدیت
ے غزل میں کس کس طرح نفوذ کرتی ہے۔ جدیدیت کو بہتر سمجھنے کے لئے ایسی نگارشات
وہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں جن میں پرانے سانچوں کو بدلے بغیر اظہار خیال کیا گیا ہو
ت ان تخلیقات کے جن میں سانچوں کو بدل دیا جاتا ہے۔ اس طرح ہیئت کی یکسانیت
ع اور مفہوم کی بہ نسبت قدامت کو پرکھنے میں سہولت بخش ہوتی ہے۔
ہئی تبدیلی بھی جدیدیت کا ایک پہلو ہے لیکن بیک وقت ہیئت اور موضوع کی
تفہیم کے راستے میں رہبر راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ انداز فکر کا بدلنا کوئی تعجب خیز بات
یونکہ فکر کا تعلق عقل و دانش سے ہوتا ہے۔ اسی لئے فکر، فکر نو ہوتے
میں ایک متوقع پیشرفت ہوتی ہے۔ چاہے اس کے خدوخال کتنے ہی نامانوس
ں کیوں نہ ہوں لہٰذا تنہا جدیدیت محض فکر نو نہیں ہے۔ یہ فکر نو سے زیادہ
یا اور متبدل احساس ہے جس کو اس کا تغیر تا اور گہرائی سے قبول کرتا، جس کا وقوع
۔ ہوتا ہے جو ایک کے بس کی بات نہیں یہ منقلب اور متبدل احساس ہے
فرا ایک رویہ کو جنم دیتا ہے جس کو طرح طرح خارجی 'رد عمل' [illegible] سے نکل کر
([illegible]INAL) ہو جاتی ہے۔ یہ رویہ فرد کا اپنا ہوتا ہے۔ اس کے
تخلیق عہد کے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

شاہد ہے و تجربات ہوتے رہیں گے اور ان کی اقدار بھی تقسیم کرتے چلے اور ہم سمجھیں کہ زمان و مکان بھی سمٹتے ہی نظر آئے جب ان کو جوڑ دیتے [illegible] جنہیں ہم نسلی فاصلے (GENRATION GAP) کا نام دیتے ہیں۔ اگر پچھلی نسل اور نوجوان نسل کے درمیان یہ فاصلہ اب کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ عمر ہی دور کے لوگ آج بھی ایک دور رس اور بھرپور انقلاب سے دوچار ہو ڈالٹن کے نا قابل تقسیم جوہر کو دنیا نے آئن اسٹائن کی اضافیت کی [illegible] ہو گیا ہے جبکہ نہ صرف جوہر (ATOM) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا بلکہ کا اپنا وجود بھی ختم ہو گیا (ELECTRAN) ثابت ہو کر [illegible] اور یہ توانائی میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہے۔ اس انقلاب سے عمر نسل کے کلاسیکی [illegible] قیمتیں ہی نئی نسل تہذیب و تمدن کی علمبردار بن گئی ہے۔ تہذیب کی وہ قدر جامد اور قطعی معلوم ہوتی تھیں اضافیت کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ [illegible] بے کراں احساس ہے کہ جن کو لوگ مذہب اور محبت بھی پرکاہ کی طرح [illegible] احمد فراز نے اس کا ادراک ہے۔ کہتے ہیں ؎

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے — اور سے اور ہوئے درد کے [illegible]

آ فصیل شہر سے دیکھیں غنیم شہر کو — شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر [illegible]

بدلے ہوئے حالات نے محبوب ہی سے یہ سلوک نہیں کیا خود محبوب [illegible]
تہذیب بھی بدلا ہے ؎

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے — ہر کوئی اپنے ہی سائے سے [illegible]

حیات کیلئے مقصد اور شاعری کیلئے موضوع باقی نہیں رہے۔ نہ [illegible]
نہ ہی غم جاناں؟ فراز کہتے ہیں ؎

گزر گیا غم جاناں و غم جہاں سے کوئی — وہ [illegible]

[illegible] کا پہلا زمانہ اول کا ہے یہ اپنی [illegible] جہاں [illegible]

قفس کی طرح ہے جس میں بار یا جتنی کیفیت کے تحت میں شاعر [illegible] ہے

روتے ہوئے جب اک جزیرہ جہاں کو فراز تم — دیکھو کہ کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

یہ جزیرہ جہاں جو فرد کی تنہائی کا غماز ہے از سر نو [illegible] سے [illegible]
یہ جہان [illegible] وابستہ ہر شے ایک خاص زاویے میں ابھر کا نظر آتا ہے [illegible]
وہ [illegible] کا مجموعہ ہے ۔ یہ زاویہ ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول :
"یا تو خود اپنی جگہ سے ہٹ کر نظر آتا ہے [illegible] خود موضوع کو [illegible]
اس کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے ۔"

پاکستانی تاریخ اپنے ابتدائی چند برسوں میں جس جوار بھاٹے اور مد و جزر کا شکار
" احمد فراز کی شاعری لہر لہر اس کی آئینہ دار ہے ۔ چاہے وہ پہلا فوجی حکومت کا دور [illegible]
ہو اور بنگلہ دیش کی علیحدگی انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے ۔

ہجوم جلوۂ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں — جراحتوں کے چمن ہیں بہار کا [illegible]

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز — کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فراز — شہر نا پرساں میں تیری چشم تر دیکھے گا کون

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں — اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

یا یہ مصرعہ — کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

احمد فراز کے حق میں عصری حسیت زیادہ گہری ہے [illegible] شہر نا پرساں [illegible]
[illegible] ہر زمانہ [illegible] نصیب ہوا [illegible] کا [illegible] حال ہوا ۔ [illegible]

تو آئینہ فروش و خریدار کور چشم — اس شہر میں فراز دکان ہنر نہ کھول

[illegible] جہاں [illegible] [illegible]

[illegible]

یہ حقیقت بھی اتفاقی ہے کہ [illegible] مقالات تک اخبار کے زیر [illegible] سے [illegible] اور غداری تک [illegible] اور ملک کے زیر عنوان تماشا [illegible] ظلم و استبداد تک پہنچے ہوئے ہیں ساحر فراز نے ان سب کا [illegible] [illegible] کوشش کی ہے کہ یہ زہر [illegible] کو شگفتہ [illegible] [illegible] یہی وہ مقام ہے جہاں اشعار منفرد مقام پر پہنچتے ہیں۔

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو کہ جس کو حال سنایا اسے [illegible]

وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجئے کہ جس سے عشق کرو بے وفا [illegible]

جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا اب آگہی کا زہر زباں پر [illegible]

ان اشعار کے بعد یہ اعتراف بھی ملاحظہ ہو ۔

یہ میری نظمیں یہ میری غزلیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
وہ تیرا شاعر ترا مغنی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
کہ جیسے چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

[illegible] اقبال کی نظم "عاشق ہرجائی" نے حسن سے [illegible] دوسرے پیکر حسن میں منتقل ہو جانا [illegible] شعرائے عہد [illegible] تجربات

جنسیت کا نمودار ہوتا ہے۔ شخص واحد سے وابستگی کی بجائے یہاں جذبے سے وابستگی ہے۔ احمد فراز کے یہاں وہ محبوبہ بھی ملتی ہے جو کسی اور کی رد کردہ ہے اور ایسے عاشق بھی جو ناکام عشق اور نامراد محبت ہیں۔ احمد فراز کی تخلیق ' تو بہتر ہے یہی ' میں رد کردہ لوگ درد مشترک کے احساس سے باہم منسلک ہو جاتے ہیں۔ شعر دیکھئے ؎

اپنا اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

اس درد مشترک کے سبب یکجائی ایسی چیز ہے جو اردو شاعری میں نوآمدہ، نوولد اور ابھی بڑی حد تک اجنبی ہے۔ تکرارِ وفا کا یہ جذباتی اظہار، میرے خیال میں برصغیر کی تقسیم ہی کا شاخسانہ ہے۔ ملک کی سیاسی تقسیم نے جذبۂ وفاداری پر بھی عمل جراحی کیا۔ جذباتی سطح پر یہ عمل جراحی، تکرارِ عہدِ وفا کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس سفاک حقیقت نے ہی احمد فراز کو یہ جرأت عطا کی کہ وہ رد کردہ کرداروں کا تذکرہ کر سکیں۔ اس سے ہٹ کر بھی احمد فراز کے یہاں محبت اور وفا دونوں متزلزل نظر آتی ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک جو تمہیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

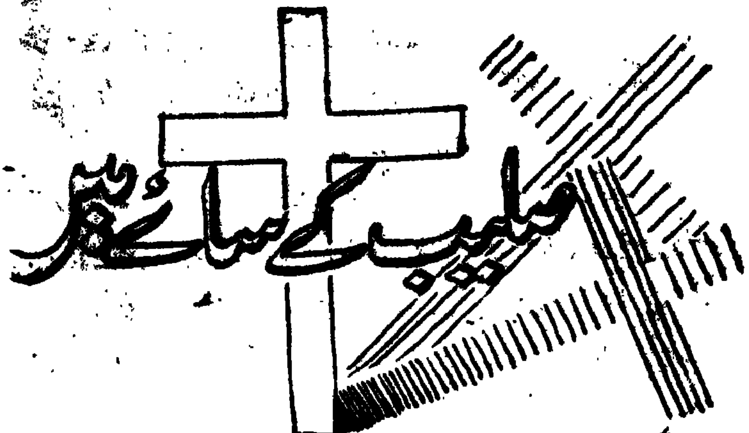
وہ مدتوں کی جدائی کے بعد ہم سے ملا تو اس طرح سے کہ ہم گریز کرنے لگے

یہ بھی اک شیوۂ منافقت ہے جانے والے کو جو رستہ ہی دے

احمد فراز کی شاعری غم جاناں اور غم دوراں کا ایک خوشگوار امتزاج ہے لیکن یہ امتزاج ایک شاعر کو یا طوعاً ناخواستہ پسند ہے۔ محبوب کے آنچل میں در آئی ہوئی ریت چھاننے کے عمل سے وہ کچھ خوش نہیں ہے تاہم محبوب کے لمس کا نتیجہ ہے کہ ریت بھی رنگ حنا پا گئی ہے اور خونِ دلِ فنکار کی سرخی رنگِ حنا کی سرخی سے اس طرح گھل مل گئی ہے کہ اب اسے آسمانِ حیات کو رنگین کرنے والی شفق کا نام دینا پڑتا ہے۔

امین مالوف / قاضی جلیل احمد

مسلسل
قسط



فرنگی اس تہری ضرب سے عرصے تک سنبھل نہ سکے۔ اگر پے بہ پے ان پر شکستیں وارد نہ ہوتیں تو ممکن تھا کہ وہ سارے مشرق وسطی میں اپنی نوآبادیاں قا لیکن ان شکستوں کی وجہ سے جو عددی نقصانات انھیں پہنچے اس کی وجہ سے مشرق ان کی بڑے پیمانے پر آبادکاری ممکن نہ رہی۔ لہٰذا انھوں نے چیدہ چیدہ مقامات پر کرکے اپنی بقا اور تحفظ کا سامان پیدا کیا۔ اور یہی قلعے جو سارے شام ولبنان میں ہیں صلیبی دور کی یاد دلاتے ہیں لیکن ان قلعوں سے بھی زیادہ موثر ہتھیار جو دو سو صلیبیوں کو مشرق وسطی میں قائم رکھنے کا باعث بنا وہ تھا اقوام عرب کا جمود، یہ عمل ان کی سب سے بہتر مثال ابن الاثیر کے اپریل ۱۱۰۲ء معرکہ طرابلس کے بیان میں ملتی ہے۔

"سینٹ جائلس "خدا کی اس پر لعنت ہو" خلیج ارسلان سے ذک اٹھانے کے بعد شا واپس ہوا۔ اس کے ساتھ صرف ۳۰۰ آدمی باقی رہ گئے تھے۔ والی طرابلس فخرالملک شاہ ملک اور والی حمص کو لکھ بھیجا کہ سینٹ جائلس کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر اس سے بہتر موقعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا جبکہ اس کے پاس مٹھی بھر ساتھیوں کے سوا بھی باقی نہیں رہا ہے۔ دقاک نے دو ہزار سپاہی روانہ کئے اور والی حمص اپنی فوج کر خود آ موجود ہوا۔ اور طرابلس کے پھاٹک کے سامنے فخرالملک کی فوج بھی ان سے

اور تینوں فوجیں ایک ہی سینٹ جائیلس سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔ سینٹ جائیلس نے اپنی فوج کے سو سپاہی شامیوں کے مقابلے کے لئے، سو سپاہی طرابلس والوں کے مقابلے میں اور پچاس حمص کی فوج سے لڑنے کے لئے روانہ کئے اور باقی پچاس اپنے ساتھ رکھے۔ فرنگیوں کی شکل دیکھ کر ہی حمص والوں نے راہ فرار اختیار کی اور تھوڑی ہی دیر بعد دمشق والوں نے بھی دشمن کو پیٹھ دکھائی۔ صرف طرابلس والوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ دمشق اور حمص کی فوجوں سے نجات پانے کے بعد سینٹ جائیلس نے اپنی حاصل قوت طرابلس والوں کی طرف جھونک دی۔ طرابلس کو شکست فاش ہوئی اور ان کے سات ہزار سپاہی کام آئے"۔

تین سو سپاہیوں کا ہزاروں پر غلبہ؟ ناقابل قیاس! لیکن آگے ان اتحادیوں کی اندرونی کیفیت کا پتہ لگائیں۔ دقاق فخر الملک سے ہزار الکلب میں اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ فخر الملک کی جاسوسی اور رہبری کی وجہ سے فرنگیوں کو دقاق کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ہزار الکلب کی لڑائیوں میں۔ فخر الملک کی غداری کی وجہ سے یروشلم ہاتھ سے گیا۔ دقاق کی اس انتقامی کارروائی نے فرنگیوں کے لئے طرابلس میں حکومت کا راستہ صاف کیا۔

اس کے صرف چھ ہی ہفتوں بعد اس علاقے کے حاکموں نے اپنی خودغرضی اور نفسانفسی کی بدولت ایک فتح کو بھی اکارت جانے دیا۔ ایک فتح کا فائدہ بھی پوری طرح نہ اٹھا سکے۔

مئی ۱۱۰۲ء میں دو ہزار مصری فوج وزیر الافضل کے بیٹے شرف کی کمان میں فلسطین میں داخل ہوئی اور یافہ کی بندرگاہ کے قریب رملہ کے مقام پر بالڈون کی فوج کو اچانک جا گھیرا اور شکست فاش دی۔ بالڈون بہ مشکل خود کو دشمنوں سے بچا سکا۔ بہت سے نائٹ یا تو گرفتار ہوئے یا مارے گئے۔ مصری فوج اگر چاہتی تو اسی دن یروشلم پر قبضہ کر سکتی تھی۔ ابن الاثیر لکھتا ہے:

"شرف کے لوگوں میں سے بعض نے اس سے کہا کہ ہمیں فوراً آگے بڑھ کر القدس پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ دوسروں نے کہا ہمیں یافہ پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ شرف کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو [illegible] کہ بیت المقدس پر قبضہ کرے یا یافہ پر۔ وہ اسی گومگو کی حالت میں تھا کہ فرنگیوں کے لئے [illegible] سمندر کے راستے سے مدد آ پہنچی اور شرف مقصد نے [illegible] اپنے ملک مصر کو واپس ہو گیا۔"

شرف کی کامیابی سے حوصلہ پا کر قاہرہ کے حاکم نے دوبارہ فلسطین کی فتح کے لئے فوج روانہ کی لیکن دونوں ہی ارقات نا[illegible] حالات نے اسے ناکامی سے ہمکنار کیا۔ ایک مرتبہ زمینی راستے سے [illegible] کی [illegible] اور سمندری راستے سے [illegible] بحری فوجوں میں کوئی ربط قائم نہ رہا، دوسری مرتبہ [illegible]

سپہ سالار ایک حادثہ میں مارا گیا۔ ابن الاثیر اس کی دلچسپ تفصیل یوں بیان کرتا ہے
اس کے متعلق یہ پیشین گوئی مشہور تھی کہ وہ اپنے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگا
جب وہ بیروت کا والی مقرر ہوا تو اس نے سارے شہر کی سڑکوں کے پتھر کھود کر نکلوا دیے تاکہ
گھوڑے کے ٹھوکر کھا کر گرنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ لیکن تقدیر کے آگے تدبیر
نہیں چلی۔ لڑائی میں اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سپہ سالار گھوڑے سے گر کر
بدقسمتی کھو بیٹھا۔ الافضل کی روانہ کی ہوئی ہر مہم کا یہی حال ہوا اور فرنگی بالمشافہ
فلسطین میں مصروف رہے۔

سنہ ۱۱۰۴ء میں حیفہ اور یافہ کی تسخیر کے بعد انھوں نے آکرہ کی بندرگاہ پر حملہ کیا
علاقوں میں یہ ایک بندرگاہ ایسی تھی جہاں سردیوں یا گرما ہر موسم میں جہاز لنگر انداز ہو سکتے تھے
کسی مدد کی امید نہ دیکھ کر بادشاہ مصر نے اپنی اور اپنی رعایا کی جانوں کی سلامتی کی شرط پر شہر
قبول کیا۔ بالڈون نے شرط منظور کر لی لیکن ابن قلانسی لکھتا ہے کہ جوں ہی مسلمان اپنے
گھر لے کر شہر سے باہر نکلے فرنگیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور مال و اسباب لوٹ کر بہت
قتل کر دیا۔ الافضل نے قسم کھائی کہ وہ اس شکست کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ سال بہ سال
رہا لیکن ہر بار نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ سنہ ۱۱۰۵ء میں رملہ میں جو موقع مصر کو ملا
کی زندگی میں دوبارہ انھیں نصیب نہ ہوا۔

اسی طرح شمال میں بھی ترک امیروں کی غفلت اور لاپروائی نے فرنگیوں کو اپنے
قدم جمانے کا موقع فراہم کیا۔ مثلاً اگست سنہ ۱۱۰۰ء میں بوہیمنڈ کی گرفتاری کے بعد انطاکیہ کو
کسی والی اور حکمران کے سات بچے تک یوں ہی پڑی رہی لیکن نہ تو قلیج ارسلان، نہ رضوان
دانشمند نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انطاکیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ٹانکرڈ کو
بھتیجے ٹینکرڈ کو موقع مل گیا کہ وہ اس پر قبضہ کر لے۔ چنانچہ سنہ ۱۱۰۲ء میں اس نے انطاکیہ پر
البیرہ کے علاقے کو اجاڑ کر رکھ دیا اور رضوان کا دربہ تو ڈاک سے بھی ناسزا پیغام نہ
ٹینکرڈ کو کہلا بھیجا کہ اگر اسے امن سے رہنے کا موقع دیا جائے تو وہ ٹینکرڈ کی کسی بات کا
جواب نہ دے گا۔ ٹینکرڈ نے جواباً اس سے مطالبہ کیا کہ البیرہ کی جامع مسجد کے گنبد پر ایک
استادہ کی جائے۔ رضوان نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔

سنہ ۱۱۰۳ء میں دانشمند نے بوہیمنڈ کے عزائم سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے بھی
ایک دکھ بھلا کے تاوان اور بیا مجی سیان کی بیٹی کی رہائی کے وعدے پر قید سے آزاد

ابن الاثیر لکھتا ہے :

"قید سے آزاد ہوتے ہی بوہمنڈ سیدھا انطاکیہ پہنچا جس سے فرنگیوں کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے پڑوسی علاقوں سے تاوان کی ادا کردہ رقم وصول کر لی اور اس طرح مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا اس کی وجہ سے بوہمنڈ کی گرفتاری کی خوشی کو بھول گئے۔"

اس طرح اپنا نقصان پورا کرنے کے بعد بوہمنڈ نے اطراف کے علاقوں کی طرف توجہ دی۔ ۱۱۰۴ء میں انطاکیہ اور ایڈیسہ کی فوجوں نے مل کر حران کے مضبوط حصار پر حملہ کیا جو شام سے ان کو جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے اور اگر فرنگی اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے عراق تک کا راستہ ان کے لئے کھل جاتا۔ اسی طرح اس کی تسخیر کا فوری نتیجہ یہ تھا کہ حلب کا شہر پوری طرح فرنگیوں کے نرغے میں آ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب بڑی ہمت اور مستقل مزاجی کے محتاج تھے لیکن فرنگیوں کے پاس ان دونوں کی فراوانی تھی اور اقوام عرب کے باہمی نفاق نے ان کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور کر دی تھیں۔ بغداد کے دو بھائی برکیارق اور محمد کی آپسی خانہ جنگیاں زوروں پر تھیں جس میں بغداد وقفہ وقفہ سے ایک سے دوسرے کے قبضے میں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ موصل میں اتابک قربوقا کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور اس کے جانشین جکرمش کے قدم ابھی جمے نہ تھے۔

حران میں بھی حالات بے ربط، تتر بتر اور ابتر تھے، ملک شاہ کے ایک حلیف بیارمان کے حاکم کو اسی کے ایک سردار نے قتل کر دیا تھا اور شہر میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ ایسے وقت میں فرنگیوں نے حران کو آ گھیرا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ جب جکرمش اور اس کے ہمسایہ سوکمن کو فرنگیوں کے اس اقدام کی اطلاع ہوئی اس وقت وہ آپس میں عداوت پر کمربستہ تھے۔ سوکمان اپنے ایک بھتیجے کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا جو جکرمش کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن اس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انھوں نے آپس میں صلح و صفائی کرانے کی کوشش کی تاکہ متحدہ طور پر دشمن کا مقابلہ کیا جا سکے۔ دونوں نے عہد کیا کہ وہ صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کام کریں گے۔ چنانچہ ان کی متحدہ فوجیں حران کی مدد کے لئے روانہ ہوئیں۔ سوکمان کے ساتھ سات ہزار سوار تھے اور جکرمش کے ساتھ تین ہزار۔ دونوں فوجوں کا دریائے بلیخ کے کنارے فرنگیوں سے مقابلہ ہوا [illegible] ایک چھوٹا سا دریا ہے۔ مسلمانوں نے بظاہر راہ فرار اختیار کی اور ایک [illegible] تک [illegible] پیچھا کرتے رہے۔ اس کے بعد [illegible] سرداروں کے اشارہ پا کر ترک [illegible]

واپس پلٹ پڑا اور فرنگیوں کو گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا

تنکرد و بوہمنڈ اپنی فوجوں سے بچھڑ گئے اور انھوں نے ایک پہاڑی
لی۔ وہ رات کی تاریکی چھا جانے تک وہاں چھپے رہے اور اس کے بعد انھوں نے
کی، ان کے ساتھ صرف چھ نائٹ صحیح سلامت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔
فرنگیوں کے اس حملہ میں شریک ہونے والے سرداروں میں یروشلم کا حاکم
تھا۔ اس نے بھی فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور
سپاہیوں نے اسے قید کر لیا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے دونوں
پھر سے بغض و عناد پیدا ہو گیا۔

جکرمش کے لوگوں نے اس سے کہا اگر سارا مال غنیمت سوکمان والے لے
ہمیں کیا کہیں گے۔ اور انھوں نے زور دیا کہ سوکمان کے خیمے سے زبردستی بالڈون
چھین لیا جائے۔ چنانچہ جکرمش نے ایسا ہی کیا، سوکمان جب میدان جنگ سے لوٹا تو ا
کی اس حرکت سے سخت تکلیف پہنچی لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کو کسی انتقا
سے باز رکھا اور جو ہتھیار اور فرنگیوں کا فوجی لباس اس کے ہاتھ لگا تھا اس سے ا
کو آراستہ کر کے قلعہ کی طرف جہاں فرنگیوں نے قبضہ کر رکھا تھا بڑھا۔ فرنگیوں نے جب
اپنے ساتھیوں کو مظفر و منصور واپس آتا دیکھا تو انھوں نے شہر پناہ کے دروا
دے اور استقبال کے لئے آگے بڑھے، سوکمان نے انھیں قتل کر کے قلعہ پر قبضہ

حران کی اس فتح کے دوررس نتائج برآمد ہوئے جیسا کہ ابن قلانسی لکھتا ہے
کے لئے یہ ایک لاثانی فتح تھی۔ فرنگیوں کی جمعیت پر شدید ضرب لگی تھی۔ ان کی تعداد میں
واقع ہوئی تھی اور ان کی جارحانہ طاقت میں قرار واقعی کمی پیدا ہوئی تھی۔ اسی تناسب
مسلمانوں کی ہمت بڑھ گئی تھی، ان کا جذبہ اپنے دین کی دفاع کے لئے بڑھ گیا تھا۔ اور
لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے اور یقین ہو گیا کہ فتح مندی نے اب فرنگیوں
فرنگیوں میں کم از کم ایک شخص ایسا موجود تھا جس کی ہمت پر اس شکست سے ا
کی تھی وہ تھا بوہمنڈ۔ چنانچہ چند ماہ بعد اس نے اپنے وطن کی راہ لی اور پھر کبھی واپس
حران کی جنگ کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ صلیبیوں کی مشرق کی سمت پیش قدمی ہمیشہ
رک گئی لیکن اس فتح سے فاتحین اسی طرح فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے جیسے ان سے
لوگ قاصر رہے تھے۔ سوکمان اور جکرمش کی ناچاقیاں پھر سے شروع ہو گئیں اور

مش کو تنہا پا کر اس پر حملہ کیا اور اس کو شکست دی۔ اس لڑائی میں جکرمش کی ایک
مدد گار شہزادی ٹنیکرڈ کے ہاتھ لگی جس کی بازیافت کے لئے جکرمش نے اس کے بدلے یا تو
ڈون ثانی کی رہائی کا پیشکش کیا یا پھر پندرہ ہزار دینار زر طلائی تاوان ادا کرنا منظور کیا۔
ڈ نے تاوان قبول کیا یہ سوچ کر کہ بالڈوین کو پھر کسی موقعہ سے آزاد کرایا جا سکتا ہے
معاملہ یہاں ختم نہیں ہوگیا۔ چار سال بعد تل بشیر کے مقام پر اکتوبر ۱۱۰۸ء میں دو فوجیں
کے سامنے ہوئیں۔ ایک فوج ٹنیکرڈ کی سرکردگی میں پندرہ سو فرنگی نائٹس اور پیادوں کے
تو کیل کا نشے سے لیس اور ان کی مدد کے لئے چھ سو ترک سواروں کا رسالہ جو الپنو کے رضوان
روانہ کیا تھا، دوسری فوج امیر موصل جوالی کی جس کے میمنہ میں عرب میسرہ میں ترک اور
میں فرنگی فوجیں بالڈوین ثانی اور اس کے لڑکے جوسلین کی قیادت میں، جن کی تعداد
ہزار تھی۔ دس سال پہلے کون یہ خیال بھی کر سکتا تھا کہ ترک اور فرنگی یوں اکٹھے ہو جائیں گے،
مورخ کی ان چالوں میں فرنگی بجائے مسلم ایشیائی کے شریک بن گئے تھے، لیکن عرب مورخین کسی
کا اظہار نہیں کرتے، ان کے نزدیک ٹنیکرڈ کا بالڈوین کی رہائی سے خائف ہونا ایسا ہی تھا
جیسے رضوان کا ٹنیکرڈ کی مدد کرنا۔

۱۱۰۸ء میں جوالی نے موصل پر حملہ کر کے جکرمش کو شکست دی اور موصل کے ساتھ
علاقے کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔ جوالی نے محسوس کیا کہ وہ بالڈوین کی سرپرستی کر کے آسانی سے
ساتھ فرنگیوں کے درمیان نفاق کا بیج بو سکتا ہے اس لئے اس نے بالڈوین کو آزاد کر کے اس کے
ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا، ابن الاثیر لکھتا ہے:

جوں ہی بالڈوین کو رہائی نصیب ہوئی وہ ٹنیکرڈ سے ملنے کے لئے انطاکیہ روانہ ہوا اور اس سے ایڈیسہ
کی واپسی کی خواہش کی۔ ٹنیکرڈ نے اسے تیس ہزار دینار، گھوڑے، اسلحہ اور زرہ بکتر دینے کا پیش کش کیا
لیکن ایڈیسہ کی واپسی سے انکار کیا اور جب بالڈوین جوش غضب میں انطاکیہ سے روانہ ہوا تو ٹنیکرڈ نے
اس کا تعاقب کر کے اسے روکنے کی کوشش کی اس کوشش کے دوران دونوں میں جھڑپیں ہوئیں ابن الاثیر
لکھتا ہے کہ وہ دن بھر آپس میں لڑتے رہے اور شام کو ایک جا دستر خوان پر کھانا کھایا کرتے تھے۔
ان کو آپس کی یہ لڑائی اور دشمنی ختم ہو گئی جب ان میں نااتفاقی تھی تب انطاکیہ کے
ذہن کے مطابق ان کی کوشش کی۔ اس سے انطاکیہ کا ایک Patriarch
تھا جنہوں نے اقرار کیا کہ واپس جانے سے پہلے جو ٹنیکرڈ کا بیان تھا اسے ضبط کیا
کہ بالڈوین کی رہائی کی صورت میں ایڈیسہ اسے واپس کر دے۔ والی انطاکیہ (ٹنیکرڈ) نے
باقی بر صفحہ

حبیب احمد

آل انڈیا ریڈیو آزادی سے قبل

ملک میں سب سے پہلی ریڈیو نشریات کی کوشش تجرباتی طور پر یکم اگست ۱۹۲۱ء کو کی گئی جب کہ صوبائی گورنر جارج لیلڈ کی ایما پر محکمہ ڈاک و تار نے بمبئی کے ٹائمز آف انڈیا دفاتر سے موسیقی کا ایک خاص پروگرام نشر کیا تھا جسے اس صوبائی گورنر نے پونے میں سُنا۔ اس وقت سے آج تک ہندوستانی ریڈیو نے زبردست ترقی کی ہے۔ منصوبہ بند ترقی نے ملک کو دنیا کے دیگر ریڈیو کے جال کے ہمسر کر دیا۔

ریڈیو کلب آف بنگال نے یکم نومبر ۱۹۲۳ء سے ریڈیو پروگرام کا آغاز کیا تھا۔ صوبائی ریڈیو کلب مدراس کی جانب سے ۳۱ رجولائی ۱۹۲۴ء سے ریڈیو پر باقاعدہ پروگرام آنا شروع ہوئے اس کے لئے کرشنا سوامی چیٹی نے روزانہ ڈھائی گھنٹے کا پروگرام ترتیب دیا تھا جو شام کے اوقات میں موسیقی و ندا کرے پر مشتمل ہوتا تھا۔ مدراس سے یہ نشریات ۱۹۲۷ء میں بند ہو گئیں تاہم مدراس میونسپل کارپوریشن نے ۱۹۳۰ء میں دوبارہ نشریات کا اہتمام لیا۔ ملک میں ریڈیو کی منظم ترقی کا آغاز انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی کے قیام کے بعد سے شروع ہوا۔ مارچ ۱۹۲۶ء کو حکومت نے ایک اعلامیہ جاری کرتے ہوئے ریڈیو نشریات کے اداروں کے قیام کے لئے درخواستیں طلب کیں اور اس کے ایک سال بعد انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی قائم کی گئی۔ ۲۳ رجولائی ۱۹۲۷ء کو سر ابراہیم رحمت اللہ انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی کی جانب سے کلکتہ سے نشریات کا آغاز ہوا اور ۱۹۲۷ء کے ختم تک [illegible]

اسسٹنٹ ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد۔ اے پی۔

مانہ نشریاتی اسٹیشن وضع کیے گئے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں [illegible] ایک
بے چھوٹا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا اور اس سال کے ختم تک ملک میں ریڈیو سیٹس کی تعداد
ہزار سے متجاوز ہو گئی۔ ریڈیو نشریات کی تاریخ میں ۱۹۳۰ء کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ
سال پہلی بار انڈین براڈ کاسٹنگ سروس قائم کی گئی جس کے ذریعہ ریڈیو نشریات
ت حکومت کے کنٹرول میں آ گئیں۔

حیدرآباد میں ریڈیو کی شروعات: حیدرآباد میں ۱۹۳۲ء کے آخر میں
یو نمودار ہوا جب کہ محکمہ ڈاک کے ایک ملازم محبوب علی نے ایک اسٹیشن قائم
۔ اس کے دو سال بعد حکومت حیدرآباد نے اس اسٹیشن کو اپنے تحت لے لیا اور ۱۹۳۹ء
اسے دکنی ریڈیو کا نام دیا گیا۔

۱۹۳۵ء سے پہلے دہلی میں ٹرانسمیشن وانی سے نشریاتی سروس کا آغاز ہوا۔ اگست
۱۹۳۵ء میں برٹش براڈ کاسٹنگ کمپنی (بی بی سی) کے ایک ممتاز پروڈیوسر لیونل فیلڈن
نشریاتی کنٹرولر کا عہدہ حاصل کیا۔ دلی اسٹیشن نے یکم جنوری ۱۹۳۶ء سے اپنے
پروگرام کا آغاز کیا۔

آل انڈیا ریڈیو اے آئی آر: ہندوستان کے ریڈیو نے اپنی ترقی کے
پر اس وقت ایک اور جست لگائی جب کہ جنوری ۱۹۳۶ء انڈین براڈ
کاسٹنگ سروس آل انڈیا ریڈیو سے موسوم ہوئی۔ مختلف ترقیاتی مدارج کے
یہ نام آج تک یونہی برقرار ہے۔

لیونل فیلڈن کے دور میں ریڈیو نے منظم ترقی کی [illegible] پانچ سال
آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر [illegible] کے عہد دور میں پشاور ریڈیو کو جس نے ۱۹۳۵ء
میں نشریاتی پروگرام کا آغاز کیا تھا، کو شمال مغربی سرحدی صوبائی حکومت کی
سے حکومت ہند نے حاصل کر لیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] نے پہلی مرتبہ ریڈیو پر اسکول کی نشریات کو مستقل شامل کیا اور دا
اہم خصوصیت کیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ہارمونیم کے استعمال پر پابندی
عظیم قائدین کے یہ ملک کی نظریہ غیلڈن ہندستانی ثقافت
چاہتے تھے جنھوں نے لیاقت وغیرہ کو خدمت خلق کا ذریعہ بنایا۔ فیلڈن
جاتا تھا اندر پنڈت نہرو، آصف علی، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر انصاری
جانتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ ریڈیو کے پروگرام تخلیقی ہوں
اسی وقت خبر نامہ تبدیل ہوا جبکہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے
تامل، تلگو، بنگالی اور ہندستانی میں خبروں کا آغاز ہوا۔
فیلڈن کے بعد مسٹر اے ایس بخاری نے جولائی
کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً ۶ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ا
حیثیتوں سے ریڈیو کی ترقی میں اپنا حصہ لیا۔ وہ انگریزی اور اردو کے
تھے۔ انھوں نے نشریات کو مشرقی تہذیب کا پیرہن دیا۔ وہ خود ڈرا
اور ہدایت کار بھی تھے [illegible] نے اپنے فنکارانہ کے ذریعے ارد
اہم مقام حاصل کیا۔
عبوری حکومت کے دور میں ستمبر ۱۹۴۶ء کو سردار ولبھ
وزیر اطلاعات و نشریات کا جائزہ لیا۔
ملک کی تقسیم اور ریڈیو: ملک کی تقسیم آل انڈیا ر
اختلاط ہوئی۔ ۲ر جون ۱۹۴۷ء کو دہلی براڈکاسٹنگ ہاؤس سے وائسر
بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح نے تقسیم ہند پر اپنی
آل انڈیا ریڈیو نے تاج برطانیہ سے ہندستان کو اقتدار
تاریخی منظر کا آنکھوں دیکھا حال راست نشر کیا۔ اس نے ۱۴ اور ۱۵
کی درمیانی شب اقتدار کی منتقلی کی رسم کا پارلیمنٹ کے وسطی ہال سے
کیا جس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی مشہور تقریر "مقدر کے
کیا تھا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو کراچی اپنا رشتہ توڑ کر
[illegible] نشریہ جاتا تھا [illegible]

اپریل ۱۹۴۷ء کو پہلی مرتبہ نشر ہوئی تھی جبکہ وہ اس وقت دلی میں منعقد ایشیائی تعلقات کانفرنس کو خطاب کر رہے تھے۔ مئی ۱۹۴۷ء کو کلکتہ میں ان کے پہلے دعائیہ اقتباسات کو ریڈیو نے نشر کیا۔ آزادی کے بعد ریڈیو نے براڈکاسٹنگ ہاوز دلی میں ان کے دعائیہ کو روزانہ شام ریکارڈ کرتا اور رات ۹½ بجے اسے نشر کرتا تھا۔ یہ سلسلہ گاندھی جی کے انتقال تک جاری رہا۔

گاندھی جی پناہ گزینوں سے خطاب کرنے [illegible] نومبر ۴۷ء کو براڈکاسٹنگ ہاوز تشریف لائے تھے۔ انھوں نے ۲۰ منٹ تک نشریہ سے خطاب کیا۔

جب باپو کو شہید کر دیا گیا تب ان کی المناک خبر شام ۶ بجے کی خبروں میں سنائی گئی جسے ممتاز نیوز ریڈر میلول ڈی میلو نے سنایا۔ اس خبر کو رات ۸½ بجے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کیا گیا۔ پنڈت نہرو نے اپنی تاریخی تقریر 'ایک روشنی جو ہماری زندگیوں سے اوجھل ہو گئی' کی۔

ایک اسسٹنٹ [illegible] کے طور پر [illegible] ریڈیو نے دلی سے گاندھی جی کی شہادت پر ۳۰ اور ۳۱ جنوری اور یکم فروری کو راست نشریہ کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے جلوس جنازہ کا آنکھوں دیکھا حال ڈی میلو نے انگریزی میں مسلسل دس گھنٹوں تک نشر کیا تھا۔ *

سلسلہ صفحہ [illegible]

اس فیصلہ کو تسلیم کرتے ہوئے ایڈلیس بالڈون کو واپس کر دیا۔

لیکن بالڈون جانتا تھا کہ نیمروڈ کی یہ قلب ماہیت اس کے متعلق قلب کے آئندہ [illegible] والی ہے اس کے منفعت کا نتیجہ ہے اس لئے ایڈلیس آنے کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ [illegible] کی طرح جتنے مسلمان قیدی تھے انھیں آزاد کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ایک کمانڈر [illegible] کو قتل کروا دیا جس نے [illegible] توہین کی تھی۔

بالڈون اور عوالی کے اس میل جول سے صرف نیمروڈ ہی پریشان نہ تھا بلکہ [illegible] تھا اور بار بار نیمروڈ کو عوالی کے خطرے سے آگاہ کرتا جاتا تھا کہ اگر عوالی [illegible] زیر [illegible] ممکن نہ رہے گا اور اس طرح ایک [illegible] مسلمان [illegible] کے خلاف متحد ہونے لگے تھے اور [illegible]

[illegible]

نام کتاب : **چاندنی کے پھول**

مصنف : **مومن خان شوق**

قیمت : ۱۶ (سولہ) روپئے صفحات : ۱۲۸

ناشر : مصنف ، اشرف ولا ۲۳-۴-۱۱ ، ...

تبصرہ نگار : **کلیم الحسن**

— ००० —

محمد قلی قطب شاہ کے شہر حیدرآباد میں سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد جو شعراء ابھرے ہیں جناب مومن خان شوق بھی ایک ہیں۔ شوق نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ ایک مزاج، پُرخلوص، ہمدرد اور انسان دوست فرد بھی ہیں۔ مختصر سے عرصے میں ا... حیثیت شاعر اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ ملک کے تقریباً ہر رسالہ میں ان کا چھپتا رہتا ہے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں ان کا پہلا مجموعہ "بدلتے موسم" شائع ہو کر مقبولیت ہے۔ مطبوعہ کتابوں کے انعامی مقابلوں میں اس کتاب پر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی سے انعام بھی دیا گیا۔

زیر تبصرہ مجموعہ "چاندنی کے پھول" مومن خاں شوق کی کاوشوں کا دوسرا جس میں زیادہ تر نظمیں ہیں۔ ایک حمد، ایک نعت شریف، چند قطعات اور متفرق شامل ہیں۔ شوق کی شاعری کا نمایاں وصف حسن ایجاد ہے جس کی سحر کاری ا... کے ہر موضوع میں جھلکتی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات رنگا رنگ ہیں۔ وہ کبھی ... کے گن گاتے ہیں، کبھی قصیدۂ لب و رخسار چھیڑ دیتے ہیں تو کبھی غم ہائے دوراں کی اور کبھی زندگی کے تلخ و شیریں سچائیاں۔ ان کی شاعری میں اثر انگیز تغزل ... نظمیں میں انسانی قدریں، دکھ درد، معاشی بحران، حالات حاضرہ کے واقعات ... روشن سویرا، زندگی دوست معاملات سے بحث کرتی ہیں۔ زیادہ تر نظمیں ... نظموں کی چاشنی کی بدولت ان میں ملائم کاری، شگفتگی اور بے ساختگی کی کیفیت پیدا ... سے ... "آندھرا پردیش ایکتا کا گھر"، "حرم کی تبدیلی"، "اجالوں کا ... صبح کا بھی، ایک سوال، موت کا رقص، زینہ بہ زینہ بڑھتے جائیں، اردو کی فر... کے ... آگ، ... دو آوازیں، اتفاق، ذکر نظمیں ہیں۔ ان ...

کی نامور شخصیتوں پر بھی منظوم خراج شامل ہے۔ جن میں خاص طور پر بہادر شاہ ظفر، بابو [illegible] مینار عظمت (اندرا گاندھی) اور آفتاب سخن (فراق) وحدت تاثر کی آئینہ دار نظمیں ہیں۔

نظموں کی طرح شوق کی غزلیں بھی متاثر کن ہیں۔ مومن خان شوق کی غزلوں میں ایسے کئی اشعار ملیں گے جو اپنے تیکھے لہجے، انوکھے پن اور شگفتہ اسلوب کی وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور عصری جدید اظہار کے نقوش چھوڑتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چاندنی کے پھول فکر شوق کا اظہار ہیں — موسموں کا عکس ہیں، گفتار ہیں، کردار ہیں
صلہ کی فکر نہ پرواہ کسی ستائش کی — ترے خلوص کی دولت ملی خزانہ ملا
احساس درد مندی انسان کا ہے جوہر — اخلاص ہو جہاں بھی انسانیت وہاں ہے
وقت نہ دے گا ساتھ کسی کا — خواب نہ دیکھو تاج محل کے
بنا لے اپنی ہمت ہی کو رہبر — اگر منزل کا جلوہ دیکھنا ہے
ہم ملاقات کو چلے تھے مگر — وہ ملے بھی تو فاصلے سے ملے
آپ آئے تو جیسے بہار آگئی — زندگی مسکرائی کلی کی طرح
فطرت شناس نظریں ہر شئے کو جانچتی ہیں — ہم نے بھی شوق دیکھا اک حسن سادگی میں

عبارت مختصر مومن خان شوق کی شاعری میں حسن کی سادگی اور فطرت کی شائستگی کا خوشگوار امتزاج 'چاندنی کے پھولوں کی سی مہک'، تازگی اور شگفتگی رکھتا ہے۔ آج کے شکست و ریخت کے ماحول میں ان کی شاعری غور و فکر کے ساتھ کیف و انبساط کے سامان مہیا کرتی ہے۔ یہ مجموعۂ سخن پڑھنے والوں کو متاثر کرے گا۔

* * *

غزل

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں منشا

ہر حال میں مقصودِ نظر بن کے رہے ہیں
ہم موجِ تلاطم میں گہر بن کے رہے ہیں

یہ حسنِ طبیعت کا کرشمہ ہے کہ ہم لوگ
خاروں میں بھی رشکِ گلِ تر بن کے رہے

یہ فخر، یہ اعزاز میسر ہے ہمیں کو
ہر بزم میں ابھرتا ہوا ہنر بن کے رہے

رستے ہوئے زخموں کے دکھنے کی بدولت
حیرت وہ خورشید و قمر بن کے رہے

ہم جب بھی چلے راہ کے سنگین مراحل
اڑتی ہوئی سی گردِ سفر بن کے رہے

جن لوگوں نے اپنائی روشِ لطف و کرم کی
تپتے ہوئے صحرا میں شجر بن کے رہے

فن کار ہی منشا پاشیٔ افکار سے منشا
پیغامبرِ نورِ سحر بن کے رہے ہیں

۱۱ - ۱۱ ستار کا ٹاؤن - ناگپور

غزل

شیخ سعد حسین سعد صدیقی

کلیم بن کے خدا سے سوال پوچھوں گا
کمال کیا ہے کوئی لازوال پوچھوں گا

پل گئی مری ہستی بدل کے کیوں مجھ سے
تری نگاہ سے میں یہ سوال پوچھوں گا

مخفی ہے، کلیوں سے، سورج سے، چاند تاروں سے
ہے کیا حقیقتِ حسن و جمال پوچھوں گا

بلا کے بزمِ طرب میں تو آئی اے ہمدم
نہ جانے تجھ سے میں کیا کیا سوال پوچھوں گا

ہے جو گردشِ دوراں [illegible]
عروج تیرے یہاں کیوں ہے زوال پوچھوں گا

ہے سعد اک مشیت گناہ کیوں میرا
میں اپنے رب سے بس اتنا سوال پوچھوں گا

مقام معراج ۱۶۳، خیریت آباد، حیدرآباد - ۱ - اے پی

غزل حافظ

مع ترجمہ مولانا آغا محمد سجاد حسین

الا یا ایها الساقی ادر کاسا و ناولها | که عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکل‌ها

آگاہ اے ساقی پیالے کا دور چلا، اور وہ دے | کیونکہ ابتدا میں عشق آسان نظر آیا لیکن مشکلیں آپڑیں

به بوی نافه‌ای کاخر صبا زان طره بگشاید | ز تاب جعد مشکینش چه خون افتاد در دل‌ها

اس نافہ کی مہک کی قسم جو آخر، صبا اس طرہ سے کھولے گی | اس کے مشکیں گھنگرالے بالوں کی شکن کی وجہ سے دلوں میں کتنا خون ہو گیا

به می سجاده رنگین کن گرت پیر مغان گوید | که سالک بی‌خبر نبود ز راه و رسم منزل‌ها

اگر تجھے پیر مغاں کہے تو مصلیٰ شراب سے رنگ لے | اس لئے کہ سالک منزلوں کی راہ و رسم سے بےخبر نہیں ہوتا ہے

مرا در منزل جانان چه امن عیش چون هر دم | جرس فریاد می‌دارد که بربندید محمل‌ها

مجھے محبوب کے پڑاؤ میں کیا امن و عیش؟ جبکہ ہر دم | گھنٹہ اعلان کر رہا ہے کہ کجاوے کس لو

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنین هایل | کجا دانند حال ما سبکباران ساحل‌ها

اندھیری رات اور موج کا خوف اور ایسا خوفناک بھنور | ساحلوں کے بےفکرے ہمارا حال کب سمجھ سکتے ہیں؟

همه کارم ز خود کامی به بدنامی کشید آخر | نهان کی ماند آن رازی کزو سازند محفل‌ها

خودغرضی کی وجہ ... میرے تمام کام انجام میں بدنامی پر پہنچے | وہ راز کب چھپ سکتا ہے جس سے محفلیں گرم ہوں؟

حضوری گر همی خواهی از او غایب مشو حافظ | متی ما تلق من تهوی دع الدنیا و اهملها

اے حافظ تو حضوری چاہتا ہے تو اس سے غائب نہ ہو | جب تیری محبوب سے ملاقات ہو تو دنیا کو چھوڑ اور اسکو ترک کر دے

منظوم ترجمہ از مولوی احتشام الدین حقی

سن اے ساقی چلا ساغر دے آ تا سہل تھا دل کا | مگر اب عشق میں ہے سامنا مشکل پہ مشکل کا

جو بوئے نافہ طرے سے صبا پھیلے کو کھول آئے | بھرے دل زلف مشکیں پیچ کیا کیا کھائے خون دل کا

مصلّے رنگ لے مے سے اگر پیر مغاں کہہ دے | کہ رہبر کو ناواقف نہ رسم و راہ منزل کا

یہ کالی رات، طوفاں سر پہ، منہ پھاڑے بھنور آگے | دل ... بیتا کو جانے کیا سبکساران ساحل کا

ہوئیں خود مطلبی میں کام میں آخر وجہ رسوائی | رہا کب راز بن کر مشغلہ دوں میں نقل محفل کا

ہیں کیا منزل جاناں میں لطف امن و آسائش | جگاتے ہر گھڑی گھڑیال باندھو بند محمل کا

حضوری چاہیے گر حافظ تو رکھ پیش نظر اس کو
اُسے دیکھے تو دنیا چھوڑ دے یہ پھینک دے چھلکا

غزل

مخلص مصور

احسان ترا اے حسنِ ازل واللہ برائے نام نہیں
وہ فیض دیا ہے تو نے ہمیں جو فیض؟

جس روز تمہارا ذکر نہیں جس روز لبوں پر نام نہیں
وہ صبح ہماری صبح نہیں، وہ شام ہم

ہم صاحبِ دل، ہم اہلِ نظر جلووں ہی سے کھیلا کرتے ہیں
یہ کھیل ہمارا ہے جس کا آغاز تو ہے

اشکوں کی تجلی بالآخر کچھ آبرو رکھتی ہے ورنہ
ہیں گھر یہ اندھیرے ہنستے ہیں جس گھر

اے طائرِ گلشن اڑتا جا ہر وقت سنبھل کر گلشن میں
ہر ایک شجر کی شاخوں پہ [illegible] پھیلائے ہو۔

پھولوں میں بسیرا ہے لیکن کیوں اشک بہاتی ہے شبنم
آرام کہاں پھر ملتا ہے گلشن میں آ

منزل کی طرف جانا ہے اگر آرام و سکوں سے توبہ کر
پھر کیسے کٹے گا تیرا سفر دو گام چلا دو

اے ساقیٔ میخانہ یہ بتا میخانے کا عالم کیا ہوگا
گردش میں رہے گا ہر جنبش گردش میں

ہم شمعِ وفا کے پروانے کب جان کی پروا کرتے ہیں
ہم آگ میں اپنی جلتے ہیں یہ اور کسی

انمول محبت ہے کہ نہیں بازارِ جہاں میں دیکھا ہے دل
پھر اس کو خریدے کیا کوئی وہ جس کا اگر

احساسِ محبت کا عالم کردار سے پیدا کرتے ہیں
یہ کام ہمارا ہے مخلص یہ اور کسی کا کام نہیں

جلد ۴ : شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

قیمت فی پرچہ 5 روپیے

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

شرح تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپیے	150 روپیے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیے
دو سال	90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب ، 11-5-147 ، ریڈ ہلز ، حیدرآباد 500004

ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر شاداب 11-5-147 ، ریڈ ہلز ، حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا۔ ٹیلیفون: 229161

فہرست

حرفِ اوّل

سی سی ایم بی

۲۶ نومبر ۱۹۸۷ء کو ہمارے وزیر [illegible] عثمانیہ سے متصل تارناکہ اپل روڈ پر حیاتیات کا عضویاتی و سالماتی مرکز (Centre for Cellular and Molecular Biology) کا افتتاح کیا اور یہ قوم کے نام معنون کیا۔ ۳۰ کروڑ کے صرفے سے تیار شدہ یہ کامپلکس سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مرکز میں ایسے حساس آلات فراہم کئے گئے ہیں اور اس جدید ترین طریقوں سے انہیں تحقیقی کام کے لئے مہیا کیا گیا ہے اور ایسا فنکارانہ اور حسن افروز ماحول کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ سائنسدان یہاں کام کرنے پر فخر محسوس کریں گے اور یکسوئی اور توجہ کے ساتھ کام کر کے تحقیقی میدان میں آگے بڑھ سکیں گے۔ دنیا کے تیس ممالک کے سائنسدان افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے۔ مرکز کے انتظام کو سراہا اور بتایا کہ پہلے ہی سے اس مرکز کا اشتراک و تعاون ان کو حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دس سال سے یہ مرکز ریجنل ریسرچ لیباریٹری حیدرآباد میں کام کر رہا تھا اور اب اپنی مخصوص عمارتوں میں کام کرنا شروع کیا ہے، مرکز کا مختصر تعارف اسی شمارہ میں دیا جا رہا ہے۔ یقین ہے کہ یہ مرکز ہمارے ملک اور ہمارے سائنسدانوں کے لئے سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ مقام قائم اور مستحکم کرنے کا باعث ہوگا۔

اخراجات خورد و نوش میں بچت

سی سی ایم بی نے ایک اور سمت میں خوشگوار رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔ کئی اور مسائل کے ساتھ ہمارا ملک خشک سالی سے نپٹنے میں بھی مصروف ہے۔ C.C.M.B نے طے کیا کہ وہ اپنے مہمانوں، شرکاء بیرونی سائنسدانوں سب کے لئے سادہ سے سادہ لنچ و ڈنر کا انتظام کرے اور اس طرح جو رقم بچے وزیر اعظم کے خشک سالی ریلیف فنڈ میں دے دیا جائے۔ چنانچہ کھانے کا انتظام کرنے والے اداروں نے 32,000/= روپئے بچا کر دئے اور CCMB نے اپنی طرف سے اس میں 17,000/- روپئے شریک کر کے جملہ 49,000/- روپیوں کا چک وزیر اعظم کو پیش کیا۔ ان دنوں جب کہ اپوزیشن کی طرف سے وزیر اعظم اور مرکزی وزراء کے دوروں اور دیگر اخراجات پر سخت اعتراض کئے جا رہے ہیں CCMB نے اس سمت میں ایک روشن مثال قائم کی ہے اگر اس پر سبھوں کی جانب سے عمل کیا جائے تو ہمارے کئی مسائل حل ہو جائیں گے۔

اردو یونیورسٹی

کملا نہرو پالی ٹکنک سلور جوبلی تقاریب
چیف منسٹر این ٹی راما راؤ نے صدارتی تقری
ساتھ ہندی میں بھی یہ کہہ کر کی کہ وزیراعظم تیلگو نہیں سمجھ سکتے اس لئے
کر رہے ہیں ، وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ مسٹر راما راؤ کی طرح شدھ ہندی میں نہیں ہے بلکہ اس میں اردو الفاظ
انھوں نے مزید کہا کہ دیش کو مضبوط رکھنا ہے تو زبان کی بنیاد پر نہیں سوچنا چا
کمزور ہو جائے گا ۔ نیز زبان کو یک جہتی اور ایکتا کے لئے استعمال کیا ج
وزیراعظم کے ان ریمارکس سے پہلے ہی سردار موہن سنگھ سلوج
جلیل پاشاہ آرگنائزنگ سکریٹریز نے اے ۔ پی کانگریس آئی کمیٹی
پر استقبال کرتے ہوئے انھیں ایک یادداشت پیش کی جس میں
حیدرآباد میں ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جانی چاہئے ، اردو ملک میں
قومی یک جہتی کی زبان کی حیثیت سے اہم مقام رکھتی ہے ۔ ماضی میں
جامعہ کی سطح پر نہایت کامیابی کے ساتھ ذریعہ تعلیم بنایا گیا
خالص ہندوستانی زبان ہے جسے اب بین الاقوامی مقام حاصل
اور تمام دنیا کی یونیورسٹیوں میں اردو شعبے قائم کئے جا کر اس کی تع
کیا گیا ہے ۔ جملہ مضامین ادب ، سائنس و ٹکنالوجی کی جامعا
سلسلے میں جامعہ عثمانیہ کے کامیاب تجربہ سے فائدہ اٹھا
اردو یونیورسٹی قائم کی جا سکتی ہے جو ہمارے ملک کے نام کو اور کا
میں اپنا مؤثر حصہ ادا کرے گی ۔ امید ہے کہ ہمارے فعال وزی
اردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں جلد عملی قدم اٹھائیں ۔

*

(سلسلہ صفحہ ۱۲)

ہے ۔ ڈاکٹر ایم ۔ آر ۔ سری نیواسن Dr.M.R. Srinivason چیرمین
اور معتمد محکمۂ ایٹمی توانائی نے ۔ جونکی لیبارٹری کی اہمیت و افادیت کا اظہ
بتایا کہ " جونکی " بنگالی لفظ ہے جس کے معنی " جگنو " ہوتے ہیں ۔

ڈاکٹر سید احمد معین الدین نجمی*

مسلسل — قسط دوم

انسانی شعور و دانش پر قرآنِ حکیم کے اثرات

قرآن کی جامعیت کے تعلق سے مشہور مفسر قرآن امام احمد القرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) نے الجامع الاحکام القرآن معروف بہ تفسیر قرطبی میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک معترض نے سوال کیا کہ قرآن کی جامعیت کا دعویٰ ہے تو اس میں نمک مرچ اور کھانے کے مسالوں وغیرہ کا کہاں ذکر ہے؟ جواب یہ ہے کہ قرآنی الفاظ ما ینفع الناس (۲/۱۶۴) "انسان کو فائدہ پہنچانے والی ہر چیز" کا عموم ان سب میں شامل اور محیط ہے۔

⑤ پہلی وحیِ الٰہی کا اعجاز

پہلی وحی الٰہی نے عالمی شعور و دانش و تہذیب پر جو گہرے اور دور رس اثرات چھوڑے ہیں اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش ہے۔ قرآن مجید کی پہلی وحی جو ۶۱۰ء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ سورہ العلق کی مندرجہ ذیل ابتدائی پانچ آیات (ترجمہ) ہیں: ۱۔ (اے محمدؐ) پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے کائنات پیدا کی ۲۔ (جس نے) جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے (علق) سے انسان کی تخلیق کی ۳۔ پڑھئے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے ۴۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا ۵۔ انسان کو وہ علم دیا جس کو وہ نہ جانتا تھا۔ (۹۶/۱-۵)۔ آیات بالا میں وحی الٰہی کا افتتاح لفظ اقراء (پڑھو) سے ہوتا ہے۔ گویا قرآن کا پہلا حکم تحصیل علم سے مؤکد ہے کیونکہ علم الٰہی کے بغیر انسان ہدایت، ضلالت، حق و باطل، اور خیر اور شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی پہلی

---

* پروفیسر اسلامک لا اینڈ (سابقہ) محمد عارب، سوڈان، نائجیریا و سنگاپور یونیورسٹی

سکتا ہے نہ رسول کو، نہ جن کو پہچان سکتا ہے اور نہ ایمان کو۔ اس لئے
حضور کی عظمت اور فضیلت سے معمور ہیں (آپ نے) فرمایا علم و بشارت
علیہ وسلم) نے کہ ۱۔ علم اسلام کی زندگی اور ایمان کا رکن ہے (ابوالشیخ) ۲
اور ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے (ابن ماجہ) ۳۔ طالب علم کے لئے فرشتے
اور آسمان و زمین کی تمام مخلوق عالم کے لئے دعا کرتی ہے۔ عالم کی فضیلت
جیسے چاند کی تاروں پر (ابوداؤد)۔

غرض کہ احسان و کرم الٰہی نے انسان کو علم و قلم سے سرفراز فرماکر اصحاب
بنایا تاکہ علم کی اشاعت و ترویج فن قلم سے ہر دور میں ہوتا رہے اور دنیا میں انسان
فیضان جاری و باقی رہے۔ انسان اصل میں بالکل بے علم اور جاہل تھا اِنَّهٗ كَانَ
(۳۳/۷۲)، علیم و حکیم ذات اقدس نے حضور علم و دانش (۹۶/۱-۵) سے آ
باشعور اور مہذب بنایا اور بیش بہا علوم و فنون اور معارف اور حکمت علمیہ
سائنسی علوم و دیگر علوم جدیدہ وغیرہ) سے نوازا۔ کیوں کہ جن چیزوں کو بھی انسان
تحقیق اور عقل کے ثمرات و نتائج سمجھتا ہے۔ وہ دراصل قادر مطلق کی دین اور
انسانوں کے دل و دماغ کا خالق اور مالک بھی ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْ
ہی سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ نہیں جانتے" (۳/۶۶)

نیز قرآن مقدس ایسا بحر العلوم و المعارف اور گنجینۂ حکمت و دانش ہے کہ ہر ا
عالم ہو یا جاہل، کم فہم ہو یا دانشور، عوام ہوں یا خواص، چراغ ہدایت اور ر
نیز اس کتاب عظیم میں ہمہ گیر فیض رسانی اور نفع رسانی کی زبردست قوت اور
چنانچہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب چار چیز
عبارت، اشارت، حقائق و لطائف۔ عبارت عوام کے لئے، اشارت خواص
اولیاء کے لئے اور لطائف انبیاء کے لئے۔

⑥ قرآن اور سائنسی علوم

قرآن حکیم کے حیرت انگیز، فکر انگیز اور اثر انگیز مضامین اور فطری اصول
و معارف اور اس کے اسالیب بیان اور دلائل و براہین سے ہر کسی پر
ہے کہ قرآن، سائنسی علوم کو شجر ممنوعہ قرار نہیں دیتا۔ زمانہ کا ہر علم، و قت

عروج دار تعالیٰ کی ہر حکمت، جو روح اسلام کی مخالف نہ ہو، مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ خالق مطلق نے کائنات کو انسان کے لئے (۲۹/۲) اور انسان کو اپنے لئے پیدا کیا (۵۶/۵۱) اور اپنے خلیفۃ اللہ (۳۰/۲) کے اعزاز کے ساتھ تسخیر کائنات (۱۳/۴۵) کا علمبردار بنایا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (۹۱۱ھ) نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد (۶۶۱۶) ہے جن میں احکام کے متعلق (۵۰۰) آیات ہیں جب کہ "القرآن والعلوم العصریہ" کے مطابق نظام کائنات کے متعلق (۷۵۰) آیات ہیں۔ ان اعداد و شمار ہی سے ظاہر ہے کہ قرآن اور سائنسی علوم میں کتنی عظیم ہم آہنگی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے قرآن کو جو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے وہ اس طرح ہے:

۱. علم احکام ۲. علم مناظرہ ۳. علم آلاء اللہ ۴. علم ایام اللہ ۵. علم آخرت (الفوز الکبیر)۔ شاہ صاحبؒ کی یہ ایک اصولی، علمی اور فلسفیانہ تقسیم ہے۔

علم آلاء اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے عجائبات و نعمتوں کا علم) کو موجودہ زمانے میں علم کائنات یا علم سائنس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قرآن کے اسی حکیمانہ اعجاز و امتیاز سے تحریک پاکر قرون وسطیٰ کے "مسلمان" قرآن کے سرچشمۂ علم و حکمت سے اس طرح فیض یاب ہوئے کہ وہی موجودہ سائنس اور علوم جدیدہ کی تاسیس و بنیاد رکھنے والے قرار دئے گئے۔ کیا دنیا الکندی، رازی، ابن سینا، ابن رشد، خوارزمی، فارابی، جابر بن حیان، ابن ہیثم، البیرونی، ابن نفیس اور الزہراوی جیسے عالمی شہرت یافتہ ماہرین علوم سائنس کو بھول سکتی ہے جنھوں نے سائنسی علوم کے ہر شعبہ یعنی ریاضی، فلکیات، کیمیا، طبعیات، بیالوجی، میڈیسن اور سرجری میں اپنی بلند پایہ تحقیقات سے دنیائے علم و دانش کو روشناس کرایا۔ ان تمام کے کارہائے نمایاں کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

دوسری طرف قرون وسطیٰ میں جب نئے علوم و فنون کی اشاعت ہوئی تو ایسی علمی گتھیاں سلجھانے کے لئے علم کلام و منطق کے جید علماء و مفکرین کا ایک دور آیا جو نئے علوم اور قرآن میں ہم آہنگی کے حامی اور موئید تھے جن میں امام غزالیؒ، امام فخرالدین رازیؒ، ابن تیمیہؒ اور ابن خلدونؒ قابل ذکر ہیں جنھوں نے انفس و آفاق دونوں پیمانات پر آیات اللہ (عقد الٰہی نشانیاں) کی نشاندہی کی اور علم و حکمت کے قرآنی اشارات کو سائنسی کلیات کا ماخذ بنانے کی کوشش کی۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان علماء و مفکرین اور سائنسدانوں کا رویہ سائنسی علوم سے متعلق ہمیشہ قرآنی ہدایات کے مطابق متوازن و معتدل رہا۔ تعارض و تضاد کی کوئی نوبت نہیں

آئی کیونکہ انھوں نے ہمیشہ جدید علوم کو قرآن حکیم کے تابع بتلایا اور قرآن
حکمت و فلسفہ ہمیشہ ان پر غالب رہی۔

⑦ مطالبۂ قرآن

یہ ایک المیہ اور مقام عبرت و حیرت ہے کہ مسلمان اسلام کے محور و مرکز
اور سنتِ رسولؐ سے دن بہ دن ہٹتے جا رہے ہیں۔ سیدھی سادھی، سہل
تعلیمات اسلامی پر عمل کرنے اور حیات زندگانی میں احکام شریعت کے مطابق
کے بجائے، ہمارا معاشرہ بدقسمتی سے مختلف اور متنوع غیر اہم فروعی مسائل
رسم و رواج کی پابندی میں الجھا ہوا ہے۔ نیز انفرادی و اجتماعی اور دینی و د
کے ہر شعبہ میں حکمت و ذکاوت، اتحاد و تنظیم، تعاون و توازن اور ڈسپلن
فقدان ہے۔ بے جا رسوم و بے ہنگم عادات کو روبہ عمل لانے میں لیا اوقات فرا
و سنن کا بھی پاس و لحاظ نہیں ہوتا کیونکہ ہم روح اسلام اور حقیقت دین دا
نادانستہ انجان ہوتے جا رہے ہیں اور مختلف تاویلات کے ذریعہ صراط
غلط راہ پر گامزن ہیں۔ واضح رہے کہ بدی کبھی اپنی اصلی شکل میں رونما ہونے
نہیں کرتی بلکہ وہ کسی نہ کسی نیکی کا نام نہاد لبادہ اوڑھ کر ہی سامنے آتی ہے
و انتشار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے طرز زندگی اور اتباع شریعت میں جمود اور تضا
دن بہ دن وسیع ہوتی جا رہی ہے اور یہی ہماری تمام ناکامیوں، ہزیمت و ذلت
و انحطاط کا کلیدی اور بنیادی سبب ہے۔

قرآن کا انسان سے یہ سیدھا سادا مطالبہ ہے کہ وہ ایمان و عمل صالح
اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (۳۲/۷) یعنی کتاب و سنت کے ذریعہ صراط
کو اختیار کر لے تاکہ فلاح دارین (۴/۱۴) کا مستحق ہو جائے۔ کیونکہ تعلق مع
تعلق باللہ دراصل تعلق بالقرآن والسنت ہے اور یہی اسلام کا نصب العین
(۶/۱۴۳ - ۳۳/۷)۔ چنانچہ حضرت موسٰی علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ جب
تیر مرض و مرگ، حادثہ و غم کی صورت میں چار سو چل رہے ہوں تو ہم کہاں
کریں؟ فرمایا "تیر انداز یعنی اللہ تعالیٰ کے پہلو میں آجاؤ"۔ قرآن
حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔ ومن یعن اللہ فمالہ من مکو

اللہ تعالیٰ ذلیل کر دے اسے پھر کوئی عزت نہیں دے سکتا۔" (۲۲/۱۸)

اعتصام بالکتاب (۲۳) کے تعلق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جامع ارشاد گرامی ہمارے لئے چراغ راہ اور مشعل فکر و عمل ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "یاد رکھو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ——

" —— جو سرکش قرآن کو چھوڑے گا، اللہ تعالیٰ اس کی کمر توڑے گا اور جو کوئی اسے چھوڑ کر اور بات کو اپنی ہدایت کا ذریعہ بنائے گا اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا یہی خدا کی مضبوط رسی ہے، یہی پر از حکمت نصیحت ہے اور یہی صراط مستقیم ہے جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا۔ جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا، اس نے انصاف کیا۔ اور جس نے اس کی طرف دعوت دی، اس نے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔" (جامع ترمذی)

امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت کے باب القرآن میں لکھا ہے کہ۔

" اے مسلمانو! اس قرآن کی عزت کرو (تلاوت و تدبر اور تعمیل کے ذریعہ) اپنے آپ کو برے اعمال سے بچاؤ اور ہر وقت ادب سے رہو ورنہ قرآن تمہارا مخالف ہو جائے گا۔"

اگر ہم نے غفلت اور بے عملی کا شکار ہو کر تمسک بالقرآن اور حبل اللہ (قرآن) کو چھوڑ دیا تو قرآن حکیم کا یہ انتباہ ہماری چشم بصیرت کو کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

" رسول نے کہا، اے میرے رب!

میری قوم نے اس قرآن کو (جو واجب الاتباع ہے) چھوڑ رکھا ہے۔" (۲۵/۳۰)

تمہید مسلمانوں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت کا مقیاس و مدار عمل قرآن پر منحصر ہے۔ چنانچہ معلم و شارح قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد گرامی ہے:

" قرآن ہی کی وجہ سے ایک قوم اوج کمال پر پہنچتی ہے تو اسی کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے قعر مذلت میں گر تی ہے۔" (صحیح مسلم)

حقوق کے تحفظ میں پوری طرح چوکس جو بنیادیں قائم کی گئی ہیں وہ حق اور انصاف پر مبنی ہے۔ متعدد عام انتخابات نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ملک کی اکثریت کٹر پن، منافرت اور غیر رواداری کی ہمنوا نہیں ہے اسی لئے ہندوستان میں نہ صرف جمہوری نظام برقرار ہے بلکہ اس کی جڑیں روز بروز استوار ہو چکی ہیں۔ ان حالات میں ہندوستان اور اس کے عوام (جس میں اقلیتیں بھی شامل ہیں) دونوں کا مستقبل تابناک ہے۔

محمد کلیم الدین احسن

"سی سی ایم بی"

FOR CELLULAR AND MOLECULAR BIOLOGY.

حیاتیات کا عضویاتی و سالماتی مرکز ہندوستان میں ریسرچ کا ایک ادارہ ہے کہ اس پر ہم جتنا فخر کریں کم ہے۔ آج سے دس سال پہلے یہ مرکز لیبارٹری (آر۔آر۔ایل) حیدرآباد کی عمارت میں حیاتیات سے متعلق مدد کے لئے قائم کیا گیا۔ جلد ہی جامعہ عثمانیہ سے متصل علاقہ تارناکہ اپل روڈ علاقے پر اس مرکز کے لئے خصوصی عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی اور ۲۶ نومبر ہمارے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اس مرکز کا افتتاح کرکے اسے قوم یہ مرکز اپنی خوبیٔ تعمیر اور حسن ماحول میں کسی حسین ملکہ کا محل معلوم ہوتا ہے کے افتتاح میں جہاں ۳۰ بیرونی ممالک کے سائنس دانوں نے حصہ لیا و اور آرٹسٹوں نے حصہ لے کر بتا دیا کہ سائنس اور حسن ولطافت ایک ہی سکہ اور اس کامپلکس میں دونوں کا حسین امتزاج موجود ہے۔

اس کامپلکس کے احاطہ میں چھوٹی چھوٹی چٹانیں، باغ، پھولوں کے۔ اور رنگوں کی مناسبت کے پودے موجود ہیں، ہر منزل پر کافی کا انتظا ایک خوبصورت باغ بن گیا ہے جہاں ایک ہزار مہمانوں کو مدعو کیا جا سکتا ہیں ۳۲ ایرکنڈیشنڈ کمرے موجود ہیں جہاں آرام سے مقیم رہ کر سائنس تحقیقاتی امور میں مرکز میں حاصل اعلیٰ اور غیر معمولی سہولتوں سے استفا اپنی تحقیق میں مصروف رہ سکتے ہیں۔

اس عظیم الشان مرکز کا یہ کامپلکس ۱۱ کروڑ کے صرفہ سے بنایا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پورا شہر حیدرآباد بھی تاریکی میں ڈوب جائے تو یہ کامپلکس جگمگاتا رہے گا۔ اس کامپلکس میں ۲۰ کروڑ روپئے مالیت کے ایسے حساس آلات موجود ہیں کہ انہیں ہر وقت ایرکنڈیشنڈ ماحول میں رکھنے کے لئے بجلی کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کے لئے یہاں ایک عصری جنریٹر نصب کیا گیا ہے جو شہر کی برقی فیل ہونے کی صورت میں اس کامپلکس کو برقی مہیا کرتا رہے گا۔

اس مرکز کی دوسری خصوصیت ایک واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ ہے جس سے ایسا پاک وصاف پانی ملے گا کہ اتنا اچھا پانی پورے ملک میں کہیں بھی نہ مل سکے گا۔

اس مرکز میں نہ کہیں کال بیل ہوگی اور نہ ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دے گی جو بھی پیام دینا مقصود ہو اسے کلوزڈ سرکٹ ٹی وی پر دیا جائے گا۔ یہ ٹی وی سٹ ہر جگہ اور ہر کرے بشمول کیفے ٹیریا اور اسٹور روم میں موجود ہیں۔ ڈائرکٹر اپنے کمرے میں بیٹھا وقت واحد میں (۸) سائنس دانوں کی ٹی وی کانفرنس منعقد کر سکتا ہے اور ہاٹ لائن پر کسی کو بھی طلب کر سکتا ہے۔

اس مرکز میں ایک کنٹرول روم ہے جو دن رات تمام سروسز سے باخبر رہتا ہے، سائنسدانوں کو اپنی ضرورت کی چیزوں کے لئے کسی بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں۔ ضرورت کی تمام چیزیں ان کے کمروں میں موجود رہتی ہیں۔ مزید ضرورت پر وہ ٹی وی سرکٹ کی مدد سے اس کی تکمیل کروا سکتے ہیں۔

لیبارٹری میں ایک جانور گھر بھی ہے جو ایرکنڈیشنڈ ہے، ہوا چلتی رہتی ہے کہ جراثیم جمع نہ ہونے پائیں، سائنسداں ضرورت کے وقت جانور گھر میں داخل ہو سکتے ہیں انتظام ایسا ہے کہ جانور اپنے پنجرے سے نہ نکل سکیں، اگر کوئی جانور نکل بھی جائے تو جانور گھر کے دروازے تک بھی نہیں آ سکتا کہ اسے دوبارہ پنجرہ میں بٹھا دیا جاتا ہے۔

اس مرکز میں حیاتیات کے بارے میں ایسی جامع معلومات جمع کی گئی ہیں، ایسے جدید اور حساس آلات نصب کئے گئے ہیں اور کامپلکس میں تحقیقات کے لئے ایسا سازگار ماحول پیدا کیا گیا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سائنسداں اس مرکز میں تحقیقی کام کرنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھیں گے۔

نوبل انعام یافتہ امریکی سائنسداں ڈاکٹر فرانسس کریک Dr.Francis Crick

نے افتتاحیہ سمپوزیم میں اپنا عالمانہ دلچسپ مقالہ "سالماتی حیاتیات، ماضی و مستقبل" پیش کیا اور مرکز کی افادیت کا اعتراف کیا۔

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہیلتھ (NIH) امریکہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اڈوین Dr. Edwin Becker نے بتایا کہ NIH اور CSIR کے مابین تحقیق کا ایک معاہدہ ہے جس کے تحت مل کر کام کیا جاتا ہے اور اس طرح CCMB کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔

جرمنی کے پروفیسر کے ۰ ایچ ۰ شیٹ Prof. K.H. Schiet نے کہا کہ ان کے انسٹیٹیوٹ اور CCMB کے مابین بڑا مفید اور نفع بخش اشتراک عمل ہے۔ انگلستان کے امپیریل کینسر ریسرچ فنڈ کے ڈپٹی ڈائرکٹر مائیکل کرمپٹن Michael Crumpton نے اعتراف کیا کہ CCMB بھارتی سائنس کے تاج کا ایک ہیرا ہے۔ انٹرنیشنل یونین آف بائیو کیمسٹری کے صدر ڈاکٹر میرین گرونبرگ مانا Dr. Marianne Grunberg Manago نے تسلیم کیا ہے کہ CCMB میں تحقیق کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں وہ پوری دنیا میں سے بہترین میں سے ایک ہیں۔ غرض CCMB کا قیام سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کے راستے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یقین ہے کہ ہمارا ملک اس عصری ترقی میں اپنا اعلیٰ مقام قائم کرے گا اور دوسروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

اس مرکز میں محکمہ ایٹمی توانائی اور انڈین کونسل آف سائنٹیفک ریسرچ کے تعاون سے حیاتیات کے عضویاتی اور سالماتی مرکز میں فاسفورس ۳۲ اور سلفر ۳۵ تحقیق کے لئے تیار کئے جاتے ہیں اور انہیں بیرون ملک بھی برآمد کیا جاتا ہے، اس سنٹر میں اعلیٰ مالیت کے ریڈیو ایسو ٹوپس بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ یہاں پلازما پروٹین کے بارے میں تحقیق جاری ہے، جلدی امراض اور دیگر بیماریوں کے جراثیم کے سرایت کر جانے کے اندرونی عمل میں بھی کام کیا جا رہا ہے۔ کینسر کے بارے میں بھی ریسرچ جاری ہے، اس مرکز کا زرعی میدان میں بھی کافی فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔

اس مرکز میں حیاتیاتی سالمات کی ایک لیبارٹری "جونکی" Jonki ہے جو سائنسی محققین کی برادری کے لئے ایک نہایت اہم سہولت مہیا کرتی ہے اور حیاتیات کے جدید امور کی تحقیق میں معروف سائنسدانوں کے کام کو آگے بڑھانے میں بہت

اسرار احمد

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم

(سنٹر فار پروموشن آف سائنس علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے تحت "دینی مدارس اور سائنسی تعلیم" کانفرنس کے افتتاحی خطبہ کا اقتباس)

اس کانفرنس کے موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اس مرکز کے قیام کا پس منظر اور اس کی رفتار و غایت آپ کے سامنے پیش کروں۔

تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے، ہندوستان میں ہر سال ہونے والے نیوکلیر فزکس کے سمپوزیم کے موقع پر ایک گفتگو کے دوران میرے ایک ساتھی سائنسدان نے یہ اظہار خیال کیا "یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ ملک کے کسی بھی سائنسی مذاکرے میں مسلم شرکاء کی تعداد ایک یا دو فی صد سے زیادہ نہیں ہوتی جب کہ ملک میں مسلمانوں کی تعداد دس فی صدی سے بھی زیادہ ہے"۔ پھر اس نے یہ سوال کیا "کیا اسلام سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کا مخالف ہے؟" اس سوال کا جواب جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑا میں نے دیا۔ لیکن اس بظاہر چھوٹی سی غیر رسمی گفتگو نے ذہن کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میرے ہندو ساتھی سائنسداں کے اس معصومانہ سوال نے مہمیز کیا کہ مسلمانوں کے علمی ماضی پر نظر ڈالی جائے۔ اس شوق و جستجو نے جب ہمارے علمی ماضی کی سیر کرائی تو معلوم ہوا کہ تقریباً تیرہویں صدی عیسوی تک اس زمانے کے علوم جدیدہ بشمول سائنس اور ریاضی کے میدانوں میں تابندگی ہی تابندگی کا دور دورہ تھا اور اس کے بعد تن آسانی، کورانہ تقلید، علمی تکبر، تعصب اور گروہ بندیوں کا اندھیرا ہی اندھیرا۔ میرے ساتھی کے سوال سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ کس طرح کسی مذہب کے پیروکاروں کی کسی علمی میدان میں نااہلی اس مذہب کے خدوخال کو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل کر دینے کا باعث بنتی ہے۔

میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا فرانس میں لگا جہاں یہ لطیفہ سننے کو ملا۔

کہ کسی خیالی بازار میں ایک صاحب، انسان کا دماغ خریدنے گئے۔ دکان پر ہر مذہب

کے ماننے والوں کے دماغ رکھے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر دکاندار نے اسے بتایا۔ یہودی دماغ کی قیمت ایک ڈالر، عیسائی دماغ کی چار ڈالر اور مسلمان دماغ کی قیمت خریدار حیرت سے بولا۔ عجیب بات ہے جو اس وقت دنیا میں اپنی ذہانت اور تحلیقی [illegible] لئے مشہور ہیں، ان کا دماغ سب سے سستا اور مسلمانوں کا اتنا مہنگا۔ دکاندار نے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مسلمانوں نے الجبرا کی ایجاد کے بعد سے اپنے دماغ ہی کب کیا۔ ان کے دماغ کا سارا مغز محفوظ ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے! کتنی شدید چوٹ ہے اس لطیفے کے نرم کوڑوں کی۔ یہ ہیں وہ ذہنی جھٹکے اور ہمارا اپنا خود کا مشاہدہ کہ ہندوستانی مسلمان سائنس ٹکنالوجی کے میدان میں ملک کے دوسرے فرقے کے مقابلے میں بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے جا رہے ہیں، جس نے مجھے اور میرے رفقائے کار سید ابوالہاشم رضوی اور ڈاکٹر مجیب کو یونیورسٹی کے زیر انتظام ایک ایسے مرکز کے قیام کی تجویز پیش کرنے کی راہ پر لگایا کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پسماندگی کو [illegible] طور پر دور کیا جا سکے۔

مرکز فروغ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کے سکشن (c) کے تحت مارچ ۱۹۸۵ء کے اواخر میں قائم کیا گیا۔ بنیادی طور پر اس مرکز کے قیام کا [illegible] ہندوستانی مسلمانوں پر سائنسی علوم کی تحصیل و تحقیق کی اہمیت کو واضح کرنا، انھیں [illegible] راغب کرنا اور مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں بشمول دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کو فروغ اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ اپنے قیام کے وقت سے اب تک یہ مرکز [illegible] مشکلات کے باوجود مسلم اسکولوں کے سائنسی اساتذہ کے لئے پانچ تربیتی کورسوں [illegible] کر چکا ہے جو کافی کامیاب ہوئے۔ گذشتہ سال مرکز نے ایک کانفرنس کا بھی انعقاد کیا تھا ملک کے چیدہ چیدہ مسلم سائنس دانوں اور ماہرین تعلیم نے شرکت کی اور جنھوں نے مرکز [illegible] مضمونوں پر غور و خوض کے بعد اسے زیادہ مفید اور قابل عمل شکل دی۔ اس کے علاوہ مرکز تعلیمی اداروں کی ایک ڈائرکٹری تیار کرنے اور ان کے سروے کا کام بھی کر رہا ہے۔ [illegible] پر میں اس امر کو ریکارڈ میں لانا چاہوں گا کہ مرکز کے تحت چلنے والے مختلف پروگراموں [illegible] میں مجھ سے کہیں زیادہ میرے رفقائے کار اور سائنسی فیکلٹی کے اساتذہ کا ہاتھ ہے۔

مرکز کے اس مختصر تعارف کے بعد اب میں اس کانفرنس کے اصل موضوع کے بارے

ند باتیں گوش گزار کرنا چاہوں گا۔

ہندوستان میں مسلم زیر انتظام جدید تعلیمی اداروں کے مقابلے میں دینی تعلیمی اداروں تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر صرف صوبہ یو۔ پی میں ایسی دینی درس گاہوں کی تعداد بیناً پانچ سو کے قریب ہے جہاں درجہ آٹھ کے مساوی یا اس سے اونچی سطح کی تعلیم دی جاتی ہ اور جن میں دو سو سے لے کر چند ہزار تک مسلم طلباء زیر تعلیم ہیں۔ وہ دینی مکاتب جن میں پرائمری کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن کی تعداد ہزاروں میں ہے ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلم اسکولوں اور کالجوں کی تعداد تین سو سے بھی کم ہے اور ان میں مسلم طلباء کی تعداد اوسطاً ۶ فیصد زیادہ نہیں۔ کم و بیش یہی صورت حال صوبۂ بہار کی ہے۔ بلکہ وہاں پر دینی درس گاہوں کی تعداد سلم سیکولر اسکولوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ چونکہ سرکاری اور غیر مسلم سیکولر اسکولوں عموماً مسلم طلباء کی تعداد ملک میں مسلم آبادی کے تناسب سے کافی کم ہوتی ہے اس لئے یہ ے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلم خواندگی کا کم سے کم پچاس فیصد دینی تعلیمی اداروں کا ہون منت ہے۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں یق پیش رفت کے کسی بھی منصوبہ بند کام میں دینی مدارس کو نظر انداز کرنا ایک غیر حقیقت سندانہ عمل ہوگا۔

بات اتنے پر ہی ختم نہیں ہوتی، جونیر ہائی اسکول اور ہائی اسکول میں داخل ہونے والے لم طلباء کی اکثریت دینی مکاتب کی راہ سے آتی ہے۔ ان مکاتب میں ریاضی اور سائنس نلیم پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ نتیجتاً مکاتب کی راہ سے آنے والے مسلم طلباء یا تو خود کو کلاس کمزور پاکر تعلیم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں یا گھسلتے ہوئے چلتے ہیں اور جیسے ہی موقع ملا ان این بالخصوص ریاضی سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ دور حاضر میں ریاضی کی اہمیت اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ نسی مضامین کی بات تو درکنار عصری علوم کی ہر شاخ میں کسی نہ کسی سطح پر ریاضی میں عبور حاصل کئے بغیر رت حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ بلکہ ہم تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کمپیوٹر سائنس میں ریسرچ کی ی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب خالص ادبی مضامین کے طلباء کے لئے بھی ریاضی کی کچھ نہ کچھ جانکاری روری ہو جائے گی۔

اس پس منظر میں دیکھئے اور ماتم کیجئے کہ آج ریاضی میں ہماری کمزوری ضرب المثل بن چکی ہے۔ اس کمزوری کے نتائج کی ایک مثال کے طور پر میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ سائنس کی ایک اہم شاخ

فزکس کو پڑھنے سے اکثر مسلم طلبا ءکتراتے ہیں کیونکہ اس مضمون کے لئے ریاضی میں مضبوط بنیاد ہونا ضروری ہے۔ شمالی ہند کے تین مسلم اداروں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شبلی کالج اعظم گڑھ سیفیہ کالج بھوپال میں فزکس کے پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں مسلم طلباء کی تعداد عموماً بالترتیب پچپن فیصد، پندرہ فیصد اور دس فی صد سے زیادہ شاید ہی کبھی رہی ہو۔

ان حقائق کی روشنی میں مرکز نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کے لئے دینی مدارس میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم کی ترویج کی کوشش انتہائی ضروری ہے اور یہ کہ جتنی جلد اس سمت میں عملی اقدام اٹھایا جا سکے بہتر ہوگا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کام کی ابتدا کس طرح ہو کیوں کہ ہم اس اندیشہ کے اسیر تھے کہ کہیں بعض حلقوں میں ہماری اس کوشش کو دینی معاملات میں مداخلت نہ سمجھا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے مختلف الخیال لوگوں سے مشورہ بھی کیا مگر کوئی بات واضح طور پر سامنے نہ آسکی۔ اس مرحلے کی تفصیل سے قطع نظر میں یہ ضرور بیان کرنا چاہوں گا کہ جب چند ہمارے مخلص ساتھیوں نے ہم کو اس سمت قدم نہ اٹھانے کا مشورہ اس خیال کے پیش نظر دیا کہ دینی مدارس ایک انتہائی مفید اور نیک کام کر رہے ہیں اور وہاں سائنسی تعلیم سے جدیدیت پھیلے گی تو ہم نے جواباً یہ عرض کیا کہ ہم بھی مدارس کی افادیت کے قائل ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ہم، آپ نے اپنے بچوں کو ان مدارس میں کیوں نہ بھیجا اور کیوں ہم اس بات کے لئے برابر کوشاں رہتے ہیں کہ ہمارے بچے سائنسی مضامین لیں۔ اس سوال کا جواب ان کے پاس اس کے سوا کیا ہوتا کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلباء کا بظاہر کوئی مستقبل نہیں۔

قصہ مختصر یہ طے ہوا کہ قیاس آرائیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بجائے کیوں نہ ایک سوالنامے کے ذریعہ خود دینی مدارس سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ سائنس کو داخل نصاب کرنے کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ ہمارے موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے نہ صرف اس خیال کی پذیرائی کی بلکہ انہوں نے اس بابت دینی مدارس کے نام ایک پر اثر اپیل بھی جاری کی۔ سوالنامے کے ذریعہ اس سروے کا کام ابھی جاری ہے لیکن اب تک جتنے بھی جوابات آئے ہیں ان سے کھل کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ عام قیاس و گمان کے برخلاف مدارس کی ایک اچھی خاصی تعداد سائنس اور ریاضی کو اپنے نصاب میں داخل کرنے کے لئے تیار ہے۔

ہمارے سامنے اکثر یہ سوال اٹھایا گیا کہ مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کا فائدہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں اتنا عرض کروں گا کہ قطع نظر اس حقیقت کے کہ ملک میں ایک سائنسی انقلاب برپا ہو چکا ہے اور جس کمیونٹی نے اس انقلاب سے چشم پوشی کی اس کا مقدر پسماندگی کے علاوہ کچھ اور نہ ہوگا

گاندھی جی شخصیت اور ظرافت

انسان چاہے کتنا سنجیدہ ہو، اور چاہے وہ کتنی ہی نازک گتھی کو سلجھانے میں منہمک ہو
نا ایسے موقعوں پر بھی طنز و مزاح کی حس انسان کو اس گراں بار بوجھ سے قدرے ہلکا
دیتی ہے ۔ یہی بات مہاتما گاندھی پر بھی صادق آتی ہے، جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ وہ
یا زندگی کے اتنے تنازعات میں خود کو بچائے ہوئے ہیں، تب انھوں نے کہا " لیکن یہ
یے طنز و مزاح کے باعث ہے ، اگر یہ نہ ہو تو شاید میں خودکشی کر لیا ہوتا "۔
مزاح کا انسان کے حواس خمسہ پر راست اثر ہوتا ہے ، گاندھی جی کی طرز زندگی میں اس
نعر جنرلائیننگ کی مانند تھا ۔ وہ اپنے خون کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے قہقہے کے ساتھ امنڈ
تے تھے ۔

جی ۔ بی ۔ شاہ کی زبانی وہ مشرق کے ایک ایسے واحد انسان تھے جس میں ظرافت بھری
۔ انھوں نے خود ایک بار یہ ریمارک کیا تھا کہ اگر انھیں عطیہ ظرافت حاصل نہ ہوتا تو شاید
بیمار ہو چکے ہوتے ۔ گاندھی جی کے قہقہوں میں ایک مقصد اور تجربہ پنہاں تھا ۔ علم اور
و دانش کے ساتھ ان کے قہقہوں کے چار رخ تھے ۔ ذہنی ، جسمانی ، دانشورانہ اور روحانی ۔
کے قہقہے نظم کے مانند ، ایک شاعر کی تخلیق کے مصر تھے ۔ اس میں حریت ، آزادی اور
وں کو ختم کرنے کا عزم تھا ۔ وتدان شکن اپنی مسکراہٹ ان کا ہمیشہ شخصی کردار رہا ۔
زندگی کی طویل راہوں میں ان کے احساس ظرافت نے انھیں، دم آخر تک ذہنی جسمانی
روحانی طور پر مکمل برقرار رکھا ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سچائی پر ان کے مکمل ایقان ،
لاقی اقدار اور آزادی ایسی تھی جیسا کہ درجۂ اول کے مزاح کا رہا ہو ۔

ان کی ظرافت میں موثر و وسعت دونوں کردار شامل تھے۔ ان کی سوانح حیات کے ایسے اوراق پیش ہیں، جن کا انھوں نے مزاح کے طور پر سنجیدہ تجزیہ کیا ہے۔ اپنی ابتدائی شادی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

" منگنی لڑکا اور لڑکی کے والدین کی جانب سے انھیں شادی کے بندھن میں جوڑنے کا قول ہے، جو ناقابل خلاف ورزی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا سمجھوتہ ہے جو بالکل والدین کے درمیان طے پاتا ہے، اس سے بچوں کو کوئی تعلق نہیں۔

میرے شاید تین منگنیاں ہو چکی تھیں، حالانکہ میرے علم و اطلاع کے بغیر .... مجھے ہلکا سا یاد ہے کہ میری تیسری منگنی اس وقت ہوئی تھی جب کہ میں صرف ۷ برس کا تھا۔"

ہندوؤں میں شادی آسان بات نہیں۔ دولہا اور دلہن کے والدین اس میں اپنے آپ کو تباہ کر لیتے ہیں۔ وہ اپنا مال متاع، اپنا وقت گنوا دیتے ہیں۔ چاہے با آواز ہو کہ نہیں، یا کر خشگی، وہ اس ہماہمی میں کبھی خود بیمار ہو جاتے ہیں اور اپنے پڑوسیوں کا چین خراب کر دیتے ہیں۔ یہ ہماہمی، طمطراق وغیرہ خاندان میں آئندہ ہونے والے واقعہ کی للکار کی تیاریوں کا نقارہ ہوتے ہیں۔

اس شادی سے مجھے خیال خاطر نہیں رہا، سوائے اس کے کہ اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملے، ڈھول پیٹے جانے لگے، شادی کی برات نکالی گئی، اچھے کھانے کھلائے گئے اور ایک اجنبی لڑکی کھیلنے کے لئے ملی۔

پس یہ شادی شدہ طفل زندگی کی ایک نئی دہلیز پر داخل ہوئے اور گاندھی نے اختیار شوہر کے حصول میں کوئی وقت نہیں گنوایا اور وہ ۶۲ سال تک ازدواجی رشتہ سے منسوب رہے

گوشت خوری پر

بہ حیثیت طفل گاندھی جی توہمات کے سبب اندھیرے میں تھے جس کے باعث وہ خونخوار جانور اور مافوق الفطرت چیزوں کے خوف کا شکار تھے۔ اس خوف سے نکل آنے کے لئے انھوں نے گوشت کھانا شروع کر دیا۔ ان کے الفاظ میں "پس مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گوشت خوری اچھی چیز ہے اور وہ مجھے توانا اور نڈر بنا دے گی۔ اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز نکل جا سکتے ہیں

لندن میں بہ حیثیت ایک طالب علم، انھیں ترکاری کے کھانے کے لئے کئی دنوں تک عملاً بھوکا رہنا پڑا۔ سیر بھر روٹی کھانے کسی سستے ریسٹورنٹ کے لئے مجھے روز آنہ ۱۲ میل

سافت طے کرنی پڑتی لیکن میں پھر بھی مطمئن نہیں ہو پاتا ۔ اس دوڑ دھوپ میں
ا فرینگٹن اسٹریٹ پر ایک "سبزی خوروں" کے رسٹورنٹ پہنچا۔ اس مقام نے
ے اسنا باغ باغ کر دیا جیسا کہ ایک بچہ اپنی پسند کی چیز حاصل کرنے کے بعد محسوس
تا ہے۔ انگلستان میں میری آمد کے بعد یہ میرا پہلا کھانا تھا جو میرے دل کو بھایا۔
وہ سبزی خوروں کی انجمن کے رکن بھی بن گئے۔ اور اس کے بزرگ ارکان سے بات
یت کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں " ان لوگوں کو سوائے غذا اور بیماری کسی دوسری چیز پر
ت کرنے کی عادت نہیں تھی۔"

کئی سال بعد ۱۹۴۲ء میں سیواگرام میں گاندھی کی خود نوشت لکھنے والے مشہور امریکی
ولیس فشر کے ساتھ ظہرانہ تناول کرتے ہوئے، گاندھی جی نے اپنے مہمان کو مشورہ دیا
وہ سبزیوں میں زیادہ نمک اور لیمو چھڑکے۔ یہ پوچھنے پر کہ آیا وہ اس کے مزے کو
ختم) ہلاک کرنا چاہتے ہیں گاندھی جی نے ہنستے ہوئے کہا " نہیں اس میں مزید لذت
اکرنا ہے "۔ فشر نے کہا کہ " آپ اتنے عدم تشدد پر کاربند ہیں کہ آپ مزے
بھی ہلاک (ختم) نہیں کریں گے "۔ گاندھی جی نے جواب دیا " اگر آدمیوں کے مرنے کا
بنہ ہی سبب ہو تو انہیں کوئی اعتراز نہیں "۔
اس قسم کے زندہ دل واقعات عام طور پر گاندھی جی کے آشرم میں ہوتے ہیں۔

چپ ساد

کسی موقع پر گاندھی جی نے کہا تھا کہ اگر کوئی ایسی چیز ہے جسے ایٹم بم تباہ نہیں کر سکتا
ہے " عدم تشدد"۔ صرف ہونٹوں کو بند رکھنے سے چپ ساد لی نہیں کی جا سکتی۔
ہاہم کسی کی زبان کاٹ کے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ انسان خاموش رہتا ہے جو بات
لے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود غیر غلط الفاظ نہیں دہراتا ہے۔
یہ پوچھنے پر کہ وہ ہفتہ میں ایک بار کیوں چپ ساد لیتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک
اس طرح گفتگو سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ اس دن ساری مراسلت تحریر میں ہوتی ہے۔
اپنے آپ میں ایک گہری تعاون کے احساس کفایت شعاری رکھتے ہیں۔ ایک دن
موش "مون" رہنے سے انھیں ان کے ذہن کو درکار توانائی حاصل ہوتی ہے، اور وہ
دم تشدد کی جنگ کے لئے خود کو تروتازہ رکھنے تیار ہوتے ہیں۔ ان کے لئے (۲۴) گھنٹے
ایک دن ناکافی ہوتا ہے۔

بھابن اور تہذیب

لندن کے گاندھی جان کو تہذیب کی علامت قرار دیتے ہیں۔ جیاکٹ
اور انگریزی آداب مجلس کو بالکل بوجھ اور اپنے قیام انگلستان کو ناقابل برداشت
ہیں۔ وہ کانٹے اور چھری کے لئے اجنبی تھے۔

محلے میں نائی اور بالوں کو صحیح ڈھنگ سے آراستہ کرنے کے لئے مجھے ایک
آئینے کے سامنے دس منٹ کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں آئینہ تو
کی تعریف میں آتا ہے اور اسے صرف اس وقت دیکھنے کی اجازت تھی جب کہ
حجام میری حجامت بنواتا تھا۔ میرے بال کسی بھی طرح ملائم نہیں تھے۔ مجھے اخیر
سے رکھنے کے لئے باقاعدہ برش کے ساتھ جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ میں ہر وقت
ٹوپی رکھتا اور نکالتا رہتا تھا اور بالوں کو درست کرنے کے لئے میرے ہاتھ خو
بالوں کی سمت بڑھ جاتے تھے۔

یہ بات ۱۸۸۷ء کی تھی۔ ۴۳ سال بعد جب گاندھی بدن میں ایک لنگوٹی ا
ایک اونی شال ڈالے نمودار ہوئے تب ایک لندن کے لڑکے نے ان سے پوچھا کہ
پتلون کہاں ہے؟ انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جب ایک انگریز خا
سامنے آئی اور ان کے ساتھ ناچ کرنے کو کہا تب انھوں نے جواب دیا کہ کسی بھی
والدین ہی میرے اعضا رہیں۔ جب جی۔جی۔ شاہ نے یہ استفسار کیا کہ کیا گول
نے تمھارے پیمانے کو نہیں آزمایا؟ تب گاندھی جی نے جواب دیا کہ وہاں صبر و
کام سے بھی زیادہ کی ضرورت ہے۔

گاندھی جی اسی لباس میں بادشاہ جارج پنجم سے جانے پر ملاقات کے لئے
روانہ ہوئے، ملاقات سے قبل گاندھی جی کو ایک کارڈ دیا گیا جس میں تحریر تھا کہ
صرف شاہ انگلستان کو دیکھنے پر قانع ہیں۔ گاندھی جی اسی کارڈ پر یہ تحریر کر دیا کہ
ہم دونوں کو دیکھنے پر قانع ہے۔

بات چیت کے دوران شاہ انگلستان نے گاندھی جی سے یہ استفسار کیا
انھوں نے ہندوستان میں شاہ کے فرزند کا مقاطعہ کیا۔ گاندھی جی نے جواب دیا"
نہیں آپ کے فرزند کا نہیں بلکہ تاج برطانیہ کے سرکاری نمائندہ کا"۔

پوشاک

گاندھی جی پوشاک کے معاملے میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اپنے آبائی طرز
میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن انھیں مغربی کپڑوں کے ساتھ زیادہ پر تزاع اور دلچسپ
دجہ جدوجہد کرنی پڑتی۔ وہ کہتے ہیں " اس لئے کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کے لباس کا تعین کرتا
تھا، اس کے مطابق میری بیوی ایک پارسی ساڑی زیب تن کرتی تھی اور بچے پارسی قمیص و
پہنتے تھے۔ بے شک کوئی بھی جوتے یا موزے کے بنا نہیں ہو سکتا۔ یہ جوتے ان کے پیروں کو
دکھاتے تھے اور موزے ان کے پیروں کو پسینے سے تر کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی پنڈلی میں
آجاتا تھا۔ انھوں نے بڑے ہی پس وپیش کے بعد کانٹے اور چھری کا استعمال قبول کیا۔
تہذیب کی ان علامات سے میری فریفتگی ختم ہو گئی۔ تب انھوں نے کانٹے اور چھری کو چھوڑ دیا،
آج وہ اپنے آپ کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں، اس تہذیب کے بوجھ سے بالکل آزاد۔"
طوفان، تلاطم اور خطرے کی گھنٹی کے بارے میں گاندھی جی کہتے ہیں " کسی ایک
مشترکہ خطرے کے سامنے وہ سب ایک ہو جاتے ہیں اور سارے اختلافات بھول کر صرف
ایک کے اور صرف خدا کے بارے میں سوچتے ہیں، جو سفینہ کنارے پر لگ جائے، اور تلاطم و
ختم ہو جائے، آسمان صاف و شفاف اور سورج نکلنے لگے، لوگ خطرے کے ختم ہونے
کی خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور تب ان کی زبان سے خدا کا لفظ بھی چلا جاتا ہے۔
ڈربن میں ایک کلرک انھیں فن بک کیپنگ کی تربیت دے رہا تھا جو انھیں نہ تو اسکول
میں حاصل ہوئی اور نہ لندن میں، وہ یاد کرتے ہیں کہ وہ کلرک اپنے کام کے بارے میں
بہت پھینکے دکھاتا تھا جس سے وہ مزید الجھن میں پڑ جاتے تھے۔ تب انھوں نے
اس کلرک سے اپنی کوتاہی کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈیبٹ کے بارے میں پوچھ ڈالا اور
جانے یہ سیکھا کہ ڈیبٹ کے معنی پراسسری نوٹ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں " میں نے
بک کیپنگ پر ایک کتاب خریدی اور اس کا مطالعہ کرنے لگا جس نے مجھ میں اعتماد
پیدا کیا ہے۔"

وکالت

بہ حیثیت بیرسٹر گاندھی کو لنکن کی طرح انتہائی غیر فطری اور روحانی تجربہ ہوا
کہتے ہیں میں نے بیرسٹر کے پیشہ کو ایک برا کام پایا۔ تھوڑا علم اور زیادہ دکھاوا۔
بہ حیثیت طالب علم میں نے سن رکھا تھا کہ وکالت کا پیشہ جھوٹ بولنے والوں کا
پیشہ ہوتا ہے لیکن یہ بات کبھی مجھ پر صادق نہیں آئی۔ مجھے جھوٹ بول کر نہ تو پیسے

کمانے کی خواہش تھی اور نہ رغبت تھی۔

جنوبی افریقہ سپریم کورٹ کے ایک جج نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ کوئی وکالت نہیں اس عدالت میں ایک مقدمہ میں بحث کرتے ہوئے گاندھی جی نے یہ اقبال کر لیا تھا کہ ان کے موکل کے حسابات میں تفاوت ہے۔ گاندھی جی نے سے کہا کہ ان پر بنا کسی سماعت کا الزام لگایا جانا چاہئے اور جب اس جج نے وہ کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ فرد جرم نہیں بلکہ صرف ایک مشورہ تھا۔ گاندھی مقدمہ جیت لیا تھا۔

سب سے پہلے مقدمہ کے بارے میں اپنی سوانح حیات میں گاندھی لکھتے ہیں ایسا حجاب تھا جیسا کہ ایک دلہن پہلی مرتبہ اپنے سسرال کے گھر آتی ہے۔ وہ لکھتے " میں مقدمہ کی پیروی کے لیے کھڑا ہو گیا، لیکن میرا دل میرے جوتوں میں بیٹھا ہوتا تھا، میرا سر لرز رہا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ساری عدالت ایسا ہی کر میں نے سوچ لیا کہ کوئی سوال نہ پوچھے، اگر ایسا ہو تو جج اور وکیل دونوں ہنس تے اور بلاشبہ حاضرین بھی اس منظر سے لطف اندوز ہوں گے۔ میں یہ سو پھر بیٹھ گیا اور اپنے موکل سے کہا کہ وہ اس مقدمہ کی پیروی نہیں کر سکتے۔

جراءتِ اقبال

گاندھی جی کسی چیز کے اعتراف کرنے کا اعلیٰ ترین ہمت کا بہترین پیکر تھے۔ وہ " میں مقدمہ کی پیروی اور انھیں چلانے سے واقف نہیں تھا، میرے ساتھ چند د افراد تھے جنھوں نے میرے اس حجاب کے بوجھ کو کم کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد یہ حجاب ختم ہو گیا، اور میں یہ اس تجربہ کو سیکھ لیا کہ ہائیکورٹ میں مقدمہ دائر کرنا اور

گاندھی جی اپنے آپ کو ایک عورت سے بھی ترجیح دینے میں کوئی قباحت محسوس تھے۔ جی۔ بی۔ شاہ کہتے ہیں کہ ان میں ۷۵ فی صد نسوانیت ہے لیکن گاندھی جی نے دیا نہیں صد فی صد"۔

شریمتی پولک کے مطابق، عورتیں گاندھی جی کو ان کی نسوانیت پر بے حد چاہتی ایک بار سروجنی نائیڈو کو تحریر کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں " امید کہ تم نے مجھ میں کے جذبہ کو نہیں کھویا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں تمھارے جیسی اور تمھاری مزدوریا سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بہ حیثیت ایک عورت شمار کیا۔

[illegible] گاندھی نے چند عورتوں کے لئے مغربی عورتوں کی تعریف کے [illegible] سے سمجھتے ہیں کہ وہ بیکار رسمات کے لئے جنگلی آدمی یا آدمی کا کھلونا نہ بنیں۔ وہ ہندوستانی [illegible] سے کہتے ہیں کہ وہ زر و زیور کے خول سے اپنے آپ کو آزاد کرکے حقیقی عورت کی حیثیت سے کام کریں۔ وہ ہندوستان کی پوری آبادی کو اپنا خاندان تصور کرتے ہیں۔ بے شک ان کے دل میں ایک عورت کی روح تھی۔

گاندھی اور بچے

گاندھی جی بچوں کو سچائی کے مسیحا کا حقیقی سفیر مانتے تھے۔ وہ ورڈس ورتھ کے اس قول پر یقین رکھتے تھے کہ جنت ہمارے کمسن بچوں میں رہتی ہے اس لئے وہ بچوں کے ساتھ رہتے تھے، انہیں خط لکھتے تھے، ان کی پیٹھ تھپکتے تھے اور انہیں شاباشی دیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے سر پر کیچڑ لگائے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ تب ایک انگریز خاتون انہیں اس حالت میں دیکھ کر الجھن میں پڑ گئی، گاندھی جی نے اس خاتون کے شبہات کو دور کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ یہ کیچڑ نہیں ہے بلکہ ارض کا تاج پہن رکھا ہے۔

گاندھی جی کا آشرم ایک خوشگوار جنت سے کم نہیں تھا، وہ کسی کفارہ ادا کرنے والے سنیاسی کا خشک یا ویران مقام نہیں تھا۔ یہاں روزمرہ کے گھریلو سرگرمیاں ہوا کرتی ہیں۔ ہنسی مذاق بھی چلتا تھا، نہ صرف سیاسی فیصلے ہوا کرتے تھے بلکہ میاں بیوی کے اختلافات مالک نوکر کے تنازعات بھی طے پاتے تھے، بچوں کو پند و نصیحت کی جاتی تھی، دعائیہ ہوا کرتا تھا، الغرض یہاں تمام طبقات کے دانشوروں اور تمام آدمیوں کے کمل انجمنیں تھیں۔ یہاں تک کہ بچوں کو بھی اس میں شریک رکھا جاتا تھا۔

اس استفسار پر کہ اس آشرم کی دیواروں پر مصوری کی کوئی تصویر نہیں لگائی جاتی گاندھی جی نے جواب دیا، وہ ان تصویروں کو لگانے کی کوشش نہیں کرسکتے اس لئے کہ وہ غریب آدمی ہیں۔ لیکن یہ بھی دیکھئے کہ قدرت کے نظاروں کے مشاہدے سے یہ دیواریں مجھے محدود کئے ہوئے ہیں اور وہ اس کے مدمقابل ہیں، وہ ان پر تحدید کرتی ہیں اور ان کی آزادی کو جکڑتی ہیں۔ گاندھی کہتے ہیں وہ کبیر کے ایک گیت سے پریشان حال مریضوں کو دم دلاسہ دلانے کو ناممکن سمجھتے ہیں، لاکھوں ہو کے ایک نظم تقویت بھری خدا کے لئے کہتے ہیں۔

گاندھی جی کے روز کے معمول میں جلسۂ عام اور دعائیہ اجتماع اور آٹوگراف اور درشن حاصل کرنے والوں کا تانتا ہے۔ انھوں نے آٹوگراف و درشن حاصل کرنے والوں کے لئے فیس [illegible]

کیونکہ ... تم ... فقیر ... جاتی تھی۔ وہ چند ...
... کیا کرتے تھے۔ ایک نوجوان ... بالوجی کے تالاب آ...
کر ... اہاں تھا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ درست دستخط کی صورت میں ...
ہو جائے گی۔ اس کے پاس مقررہ فیس سے زائد ... کر گاندھی جی ...
ادا کر دیں میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔

انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے جب انہیں ایک ننگا فقیر کہا گاندھی جی نے
ایک غیر ارادی تمنا کی حیثیت سے قبول ہے اور چرچل کا شکریہ ادا کرتے
ہیں سمجھا کہ وہ ایک عرصہ دراز سے ایک فقیر بننے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ
ایک زیادہ مشکل کام ہے۔

گفتار

گاندھی جی گفتگو میں چالاک اور ہوشیار رپورٹروں کو بھی تعجب میں ڈال
وہ اپنے مختصر اظہار خیال اور نپے تلے الفاظ کے استعمال میں مشہور تھے
کہ وہ کچھ نہیں اور اس کے بعد کچھ نہیں کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ ڈالتے
بھی ان کے خیالات کے بہاؤ میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ ان کے نقاد ...
قوم نے گاندھی جی کی خطابت سے زیادہ ان کی خاموشی سے بہت کچھ سیکھا
ریمارک پر کہ وہ کس لئے ایک دن "مون" رکھتے ہیں، گاندھی جی نے کہا کہ
ایک ہفتہ واری تعطیل مناتے ہیں۔

وارناسی میں ایک مندر کی یاترا کا تجربہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے
میں علم کے کنویں جیسا ہی۔ وہاں کے قریب گیا تب میں نے وہاں خدا کو تلاش
خدا کو پانے میں ناکام رہا۔ مجھے دکشنا دینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔
ایک پیسہ پیش کیا تب اس مندر کا نگران پنڈت جلال میں آ کر اس
کو اٹھا کر پھینک دیا۔ وہ مجھ پر غرانے لگا کہ تم نے اس طرح توہین کی۔
سیدھے جہنم رسید ہو گے۔ اس کا یہ قول مجھ پر اثر انداز نہیں ہوا۔
پیسہ کو اٹھا لیا اور اپنی راہ لی اور اپنے تئیں یہ اطمینان کر لیا کہ وہ برہمن ایک
محروم ہو گیا اور میں نے ایک پیسہ کی بچت کی۔ لیکن یہ مہاراج کس لئے
چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے مجھے دوبارہ بلوایا۔

(باقی پر صفحہ ...)

پروانہ ردولوی

مولانا ابوالکلام آزاد۔ امام انشا، ادب و صحافت

سرزمین حجاز پر مکہ معظمہ میں 1888ء کی ایک صبح، ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام اس کے والدین نے فیروز بخت رکھا اور یہی فیروز بخت جوان ہو کر محی الدین احمد ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہوا۔

مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیرالدین اپنے اہل وعیال کے ساتھ 1898ء میں کلکتہ آ گئے۔ تعلیم کا سلسلہ مکہ میں بڑے بھائی ابوالنصر غلام یسین کے ساتھ شروع ہی ہو چکا تھا۔ اب کلکتہ کے اساتذہ سے درس لینے لگے۔ 1903ء میں جب ان کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی وہ درس نظامی سے فارغ ہو گئے، جب کہ عام طلباء اس عمر میں اس کی نصف مسافت بھی کم طے کر پاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود درس دینے لگے۔

ان کے گھر میں عالیہ نام کی ایک مغلانی سینے پرونے پر ملازم تھی۔ اس کے بھائی شعر بھی کہتے تھے اور اچھے خاصے ادیب بھی تھے۔ ان سے مولانا کو شعر کی ترغیب ہوئی۔ انھوں نے ایک دو غزلیں داغ کو بھیجیں۔ پہلی غزل بمبئی کے ایک گلدستے "ارمغان فرخ" میں چھپی۔ شعر کا شوق اتنا تھا کہ 1900ء میں جب کہ ان کی عمر 12 سال تھی "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ کلکتہ سے جاری کیا جس میں طرحی کلام شائع ہوتا تھا۔ یہ آٹھ مہینے جاری رہا۔ 1901ء میں مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی کی کتاب تذکرۂ صادقہ پر تقریظ لکھی۔ ناشر نے عنوان میں لکھا تھا "ریویو بر کتاب مستطاب تذکرۂ صادقہ از جمیع فضائل ومحاسن، شاعر با کمال، سخنور بے مثال ابوالکلام آزاد احمد صاحب دہلوی مقیم کلکتہ"۔

کم عمری میں اتنی شہرت نصیب ہو گئی تھی کہ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہی مولانا آزاد ہیں۔

آزاد کے والد مولانا خیرالدین ایک محدود عالم اور فاضل دینیات تھے اور اپنے مریدوں میں حضرت کے نام سے مشہور تھے۔ آزاد کو لوگ بچپن میں چھوٹے حضرت کہتے تھے۔ والدہ ماجدہ مکہ کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک جگہ ان کے باب میں لکھتے ہیں۔" ان کی اخلاقی اور دماغی بصیرت پر اب جس قدر غور کرتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر اعتبار سے وہ بلند درجہ کی تھیں۔ وہ نہایت فیاض اور سیر چشم تھیں۔ مفلس اور مصیبت زدہ آدمیوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ والد مرحوم نے ایک خوبصورت دوشالہ ان کے لئے منگوایا۔ جس دن انھوں نے اسے اوڑھا، اسی دن ام حبیب ان سے ملنے کے لئے آئی۔ یہ ایک غریب بیوہ تھی ہمارے گھر کے قریب رہتی تھی۔ اس نے ایسا قیمتی دوشالہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ میں لے کر نہایت طامع نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی اور بار بار کہنے لگی کہ ایسی چیز ہم غریبوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ والدہ نے فوراً دوشالہ کاندھے سے اٹھا کر اس کے کاندھے پر ڈال دیا۔ "

آزاد کو انسان دوستی اور نرم دلی اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھی۔ خودداری اور عزت نفس کی دولت سے بھی وہ مالا مال تھے ان کے افکار و خیالات پر ان خصوصیات کی گہری چھاپ تھی 14 سال کی عمر میں ان کے کہے ہوئے یہ اشعار ان کے ذہنی رجحانات کی بھرپور رہنمائندگی کرتے ہیں:

ہوں نرم دل کہ دوست کے مانند رو دیا ۔۔۔ دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی
آزاد یہ خودی کا نشیب و فراز دیکھ ۔۔۔ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم کا بیان ہے کہ

" سچ تو یہ ہے کہ آزاد نے بچپن نہیں دیکھا۔ ... برس کی عمر سے معلوم ہوتا تھا کہ ننھے ننھے کندھوں پر ایک سر ہے جس میں ایک بڑا اونچا دماغ ہے۔ "

مولانا آزاد کی شادی ان کے والد کے ایک مخلص مرید آفتاب الدین صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا بیگم سے ہوئی۔ زلیخا بیگم نے اردو اور فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی کی مبادیات سے واقف تھیں۔ صرف ایک لڑکا ہوا جس کا چار برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ زلیخا بیگم میں مشرقی خواتین کی تمام خوبیاں

لیکن مولانا کے بار بار جیل جانے سے ان کی طبیعت پر ایک مسلسل اداسی چھا گئی تھی۔ مولانا صاحب 1942 میں بمبئی کے تاریخی اجلاس کانگریس کی صدارت کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو بیگم کے چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔ اپنا دکھ درد چھپا کر انھوں نے خدا حافظ کہا۔ غبار خاطر کے ایک خط میں مولانا آزاد نے اس آخری رخصت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

"گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر درپیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ سوچنے لگی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

مولانا آزاد بہت مصروف آدمی تھے۔ جدوجہد آزادی اور مطالعہ میں دن رات کی مصروفیت کے باوجود وہ ایک صاحب دل اور درد مند شوہر بھی تھے۔ "انڈیا ونز فریڈم" میں وہ لکھتے ہیں:

"جب احمد نگر سے مجھے بنکورا منتقل کر دیا گیا تو وہاں سے حکم رہائی کے بعد میں کلکتہ پہنچا۔ ایک جم غفیر ہوڑہ اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے بینڈ کو بند کرنے کی درخواست کی۔ جب ہوڑہ کے پل پر سے گزرا تو مجھے ماضی کی یاد آئی مجھے وہ دن یاد آیا جب تین سال پہلے میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے بمبئی روانہ ہوا تھا۔ میری بیوی مجھے الوداع کہنے کے لئے گھر کے دروازے تک آئی تھی۔ میں اب تین سال کے بعد آیا ہوں تو میرا گھر خالی ہے اور وہ قبر کی آغوش میں ہے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ کار کا رخ بدل دیں تاکہ میں اس کے مزار تک پہنچ سکوں۔ میری کار پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ایک ہار اس کی قبر پر چڑھایا اور فاتحہ پڑھی"

مولانا آزاد مذہب، سیاست، رسم و رواج ہر میدان میں اجتہاد کے قائل تھے انھوں نے ہندوستانی قوم کے افراد کو نئی راہوں سے روشناس کرایا۔ تاریک راستوں

میں عزم و عمل کی شمعیں روشن کیں۔ لوگ انھیں امام الہند کہتے تھے مگر بقول عرش ملسیانی مرحوم وہ درحقیقت امام انسانیت تھے۔ انھوں نے اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے ہمیں بھائی چارے کا درس دیا۔ انھوں نے اپنا سب کچھ ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر پر نچھاور کر دیا۔ وہ اپنے ہی اس شعر کی زندہ تصویر تھے۔

چھوڑا نہ غم نے کچھ بھی مرے جسم زار میں ۔۔۔ اب جان ہے سو وہ بھی نہیں اختیار میں

ادب و صحافت کے میدان میں مولانا آزاد کی خدمات رہتی دنیا تک باقی رہیں گی۔ نوعمری میں نیرنگ عالم جاری کیا۔ وہ بند ہوا تو 1901 میں "المصباح" کو ان کی ادارت کا فخر حاصل ہوا۔ چونکہ یہ رسالہ عید کے دن جاری ہوا تھا اس لئے اس کے اداریہ کا عنوان بھی "عید" تھا۔ مولانا کا طرز تحریر اتنا اثر انگیز تھا کہ اس اداریے کو بہت سے اخبارات نے نقل کیا جن میں لاہور کا "پیسہ اخبار" بھی شامل تھا۔ اس زمانہ میں مولانا کی پہلی تصنیف "اعلان حق" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے "مخزن" لاہور، "احسن الاخبار" کلکتہ اور "موقع عالم" صروتی وغیرہ میں مضامین لکھے منشی نوبت رائے نظر لکھنو سے "خدنگ نظر" شائع کرتے تھے۔ اس کے نثری حصہ میں اضافہ کیا گیا اور یہ کام مولانا آزاد کے سپرد ہوا۔ "خدنگ نظر" میں ایک مضمون بعنوان "عکس ریز" لکھا تو مولانا شبلی نے ان سے کہا کہ "الندوہ" کے لئے ہر ماہ ایسا ہی مضمون لکھا کریں۔ 2 ستمبر 1903ء کو مولانا کی ادارت میں "لسان الصدق" کا اجراء ہوا۔ یہ پرچہ بہت مقبول ہوا۔ ملک کے مشہور جرائد مثلاً "وکیل" امرتسر اور "پیسہ اخبار" لاہور وغیرہ میں بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ "لسان الصدق" کے مقاصد علمی اور ادبی بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم کی اصلاح کرنا بھی اس کا ایک مقصد تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں مولانا کے ذہن میں جو بات تھی وہ آگے چل کے ہندوستان کی آزادی اور قومی یک جہتی کے حصول کی شکل اختیار کر گئی جس پر وہ آخری وقت تک قائم رہے۔ "لسان الصدق" کا آخری شمارہ اپریل مئی 1905 کا مشترکہ شمارہ تھا۔ بعد میں مولانا آزاد نے چھ ماہ تک "الندوہ" کی ادارت کی خدمات انجام دیں وہاں سے بمبئی چلے گئے اور بمبئی سے امرتسر گئے جہاں "وکیل" کی ادارت کرتے رہے۔ 1906 میں از

کے بڑے بھائی ابو النصر غلام یٰسین آہ کا کلکتہ میں انتقال ہوگیا۔ آہ کے انتقال کے بعد ان کے والد نے انھیں کلکتہ بلا لیا۔ یہاں وہ ہفتہ وار "دارالسلطنت" کے ادارہ تحریر میں شامل ہوگئے مگر اس اخبار کے مالک آزاد خیال نہ تھے۔ مولانا کی آزاد خیالی سے وہ متفق نہ ہوسکے اسلئے انھوں نے دارالسلطنت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ 1908 میں مولانا آزاد نے غیر ملکی سفر کیا۔ اب وہ قومی اور بین الاقوامی مسائل میں سرگرمی سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ عراق مصر، شام، ترکی اور فرانس کا دورہ کر کے وہ ہندوستان واپس آگئے۔

تاریخ عالم نئی کروٹیں لے رہی تھی۔ سامراجی طاقتیں نو آبادیاتی نظام کو پھیلا رہی تھیں۔ نئی نئی تحریکیں ابھر رہی تھیں مسلم لیگ، کانگریس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے قائم ہوچکی تھی۔ یکم جون 1912ء کو مولانا آزاد نے صور اسرافیل پھونکا۔ 'الہلال' کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ ہندوستان کے لوگ غفلت سے بیدار ہونے لگے۔

"الہلال" کی مقبولیت میں دیکھتے ہی دیکھتے اتنا اضافہ ہوا کہ اسی کی اشاعت گیارہ ہزار کے قریب ہوگئی۔ الہلال کے ذریعہ مولانا نے مسلمانوں کو فکری انقلاب کے تمام وسائل فراہم کئے۔ جواہر لال نہرو نے "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھا ہے۔ "اسلام کی صحیح روایات میں رچے ہوئے مولانا آزاد علمی بصیرت اور فضیلت سے اسلامی ممالک میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا نظریہ سیاست پرانے لوگوں سے جداگانہ تھا۔ وہ ہر بات میں اقلیت کے علمبردار تھے۔ انھوں نے مسلمانوں سے الہلال میں ایک نئی زبان سے خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور ان کے نقطۂ نظر ہی میں جدت نہ تھی بلکہ ان کی تحریر کا رنگ بھی نیا تھا۔ ان کا اسلوب بیان جاندار اور پرزور تھا۔ انھوں نے قدامت پرستی کے قلعہ پر حملہ کیا۔ اگرچہ بوڑھوں نے بہت تیوری چڑھائی مگر نوجوانوں کے دلوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔

مولانا آزاد نے مشیام سندر چکرورتی کے ذریعہ انقلاب پسندوں کی صف میں شامل ہوکر اس تحریک کو تیزی سے پھیلانا شروع کردیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اپنے قلم کا سہارا لیا۔ اپنی تقریروں سے بھی انھوں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو آزادی کی طرف بلایا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

"کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسا غفلت شکن سے سرگشتگان خواب ذلت

ورسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ اٹھو کیونکہ بہت سو چکے ، اور بیدار ہو کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے ہو جو تمہیں موت کی جگہ حیات ، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔ یاد رکھو ہر محبت کے لیے ایک بغض دنیا میں لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب تک کہ متکبر و مغرور نہ ہو۔ نیکی کو اگر پسند کروگے تو اس کی خاطر بدی کو برا بھلا کہنا ہی پڑے گا اور خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کی دشمنی کی پرواہ نہ کرو "

انگریز اس بات کو کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ الہلال اس کی چولوں کو کمزور بنا تا رہے اس لئے الہلال کو پریس ایکٹ کے ذریعہ دبا دیا گیا۔ 1915 میں مولانا آزاد نے اپنے اس اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں ، ہمالیہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کرلیں تو وہ ایک وقت کے لئے بھی ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔ البلاغ نکالا۔ انھوں نے البلاغ کو باقی رکھنے کی بڑی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے حکومت بنگال نے انہیں حدود بنگال چھوڑ دینے کا حکم دیا اور وہ رانچی چلے گئے ۔1920 میں رانچی سے رھائی ملی تو وہ مہاتما گاندھی کے دست راست بن گئے۔ دونوں میں باہمی ارادی اور ذہنی ربط بھی بڑھ گیا۔ پھر گرفتاریوں اور رہائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو اگسٹ 1947 میں ہندوستان کی آزادی سے دو سال پہلے ختم ہوا۔

مگر انھوں نے جس آزاد ہندوستان کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہوگیا وہ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم بنائے گئے۔

افسوس اس بلند پایہ مصنف اور ادیب ، عاقل و بالغ سیاست داں اور صاحب بصیرت رہنما نے 22 فروری 1958 کو ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آفتاب جو 1888ء کو مکہ مکرمہ میں دارالاسلام کے عین سامنے واقع ایک مکان میں پیدا ہوا تھا 22 فروری کو دھلی کی مسجد شاہجہانی کے قریب اردو پارک میں ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔ لیکن اس کا یہ پیغام آج تک سنائی دیتا ہے کہ

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

اقبال سپرو

خدا بخش لائبریری میں آمدہ تازہ مواد کا علامہ اقبال کے سلسلے میں تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسی ذیل میں اقبال کے بارے میں حالیہ تحقیقات نے دو رُخ اختیار کئے ہیں۔ ایک کا زبردست دھارا خاموشی لیکن تندہی کے ساتھ انھیں پنج خاندان، جھوٹا، فریبی اور سستی شہرت پسند کرنے والا شخص ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک قیاسی تحقیق کی رو سے (جگناتھ آزاد) اقبال ایک ٹوپی بیچنے والے درزی کی اولاد تھے۔ ایک اور تحقیق کی رو سے (تارا چرن رستوگی) وہ خاصے جھوٹے بھی تھے ایسے کہ اپنا نسب نامہ کمال چابکدستی سے اس طرح تراشا کہ 'سپرو' بن بیٹھے تاکہ سر تیج بہادر سپرو سے قرب ہو اور آسان شہرت مل جائے۔ دوسرے قیاسی محقق لکھتے ہیں:

> "اقبال کو سپرو خاندان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ بات اس طرح شروع ہوئی کہ اقبال اور سر تیج بہادر سپرو کے درمیان اچھے تعلقات تھے سپرو موصوف کا داماد جو آئی سی ایس افسر تھا اقبال کو اپنا کلام سنا کر مشورہ لیا تھا اقبال نے اس سے اپنے کشمیری برہمن ذات ہونے کا ذکر کیا اور اپنی گوتر سپرو کہی۔ اقبال کو اس پس منظر میں اپنی شہرت کے سامان دکھائی دیتے تھے۔"

خدا بخش لائبریری کے تازہ وارد، کشمیر کے معروف سماہی شیرازہ میں کشمیری محقق غلام نبی ناظر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مورث اعلیٰ لولی حاجی 'سپر' نامی گاؤں کے رہنے والے تھے جہاں کے پرانے کھاتوں میں جو اندراج ملتا ہے ان کی رو سے لولی حاجی کے نام پر "لولیہ" اور "لول گنی" دو کھیت ریکارڈ میں موجود پائے گئے۔ 'سپرو' کی وجہ تسمیہ کے بارے میں غلام نبی ناظر لکھتے ہیں۔

> "محمد یوسف ٹینگ صاحب اور ابن مہجور صاحب کی تحقیق کے مطابق سپرو ہندوؤں کی کسی گوتر مالا کا نام نہیں بلکہ جو لوگ تحصیل کولگام کشمیر

کے سپر گاؤں سے نقل وطن کر گئے ہیں انھوں نے آبائی گاؤں کے تعلق
سے جیسا کہ عام طور پر کشمیر میں ہوا کرتا ہے اپنے نام کے ساتھ سپرو جوڑ
دیا ..... (جیسے) کنزر، شنکر گڑھ کے پاس ایک گاؤں ہے یہاں
سے جو لوگ باہر آ کر بس گئے کنزرو کہلائے ..... (کشمیر میں تقریباً ہر
اصل 'واڑ'، پر ختم ہوتی ہے جیسے کچلو، ہنڈو، منشو، نہرو۔)

محقق موصوف نے سپر گاؤں کی بہت سی معاصر یا سینہ بسینہ روایات بھی اپنے اس
دعوے کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ علامہ اقبال کے اجداد دراصل اسی گاؤں
سپر کے رہنے والے تھے جہاں سے ایک مرحلے پر وہ 'چکو چولند' نامی گاؤں کی طرف منتقل ہوگئے
اور وہاں سے سیالکوٹ، جہاں علامہ کی پیدائش ہوئی۔
اس تحقیق سے علامہ ہی نہیں پورے سپرو خاندان کے آغاز پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

اور قطع نظر اس بات کے کہ دور حاضر کے کسی بھی میدان میں چاہے وہ زراعت ہو، صنعت و حرفت ہو، بزنس ہو، انڈسٹری ہو یا سروس ہو، سائنس سے آراستگی کے بغیر دلخواہ کامیابی محال ہے اور اس بات سے بھی قطع نظر کہ سائنس سے رشتہ استوار کئے بغیر مسلمانوں کا پھر سے دنیائے علم و دانش کے منصب امامت پر فائز ہونا تو درکنار عالمی برادری میں ایک باوقار مقام حاصل کر لینا بھی ممکن نہیں۔ ہم مدارس میں سائنس کی ترویج کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان میں روشن دماغی اور بلند خیالی پیدا کرتی ہے، پڑھے لکھے کے امتیاز کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے۔ ان سب سے سوا اس لئے کہ نت نئے سائنسی انکشافات اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے سماجی، معاشی، سیاسی انقلابات کے اس دور میں مدارس سے فارغ علماء سائنسی علوم اور سائنٹفک طریقۂ کار سے گہری واقفیت حاصل کئے بغیر مسلم کمیونٹی کی دانشمندانہ رہبری کے اپنے فریضے کو بخوبی انجام دینے سے قاصر رہ جائیں گے۔ ہمارے سروے نے یہ واہمہ دور کر دیا ہے کہ مدارس کی اکثریت سائنس کی پذیرائی نہ کرے گی اس لئے اب ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح مدارس کے بنیادی مقصد پر اثر انداز ہوئے بغیر ان کے نصاب میں حسب ضرورت سائنس کو داخل کیا جا سکتا ہے

(صفحہ ۲۴ سے آگے پڑھیے) وامق صاحب کی زندگی اور شاعری کا یہ جو دستاویزی
فلم بنی ہے اس کے تمہیدی حصے میں ترقی پسند تحریک کے پچاس برسوں کی مختصر
تاریخ بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وامق صاحب کی خود نوشت سوانح
عمری اس دستاویزی فلم کے ساتھ مل کر ترقی پسند تحریک کے طلباء کے لئے ایک

خدا بخش لائبریری کا اہم پروجکٹ

اردو ادیبوں کی آپ بیتی معہ ویڈیو فلم

خدا بخش لائبریری پروجکٹ کے تحت عظیم شاعر وامق جونپوری نے اپنی خود نوشت سوانح عمری مکمل کرلی ہے جس میں ذاکر حسین، سبط حسن، رشید احمد صدیقی سجاد ظہیر اور دوسرے لوگوں کے اصل خطوط اور دوسری اہم دستاویزوں کے ساتھ ساتھ ۱۹۳۶ء میں ہندستان کی جس عظیم ادبی تحریک نے اپنے شاندار سفر کا آغاز کیا تھا اس کے ہر سنگ میل کو ناپ تول کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس ترقی پسند تحریک کے عروج زوال کی کہانی دی گئی ہے جس میں وامق ہر موڑ پر شریک ہی نہیں شریک غالب رہے ہیں جلے دنوں ان کی بعض تحریروں کو لے کر کافی ہلچل رہی تھی اور بعض مشہور ترقی پسندوں نے ن پر نکتہ چینیاں بھی کی تھیں لیکن آخر کو سب مانتے گئے کہ وامق کا مطلب خود احتسابی ہے گالی دینا نہیں، وامق تو اب بھی اپنے کو ترقی پسند ہی کہتے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدا بخش کے آپ بیتی پروجکٹ کے سلسلے میں وامق صاحب کی صرف یہ تصنیف ہی اردو والوں کو نہیں ملی۔ بلکہ ان پر تین گھنٹوں کا ایک شاندار طویل ویڈیو فلم تیار ہوا ہے جس میں ان کی آپ بیتی کا نصف ان کی زبان سے سنا گیا ہے اور ان کا قیمتی کلام بھی۔ خدا بخش لائبریری ایسے ویڈیو فلم سبھی اہم شعرا کے سلسلے میں تیار کرا رہی ہے۔ اہم شعرا کے علاوہ اہم نقاد، اہم افسانہ نگار، اہم صحافی، اہم محقق اور اہم مفکر بھی خدا بخش آرکایوز کا قیمتی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ ابھی تک اس آرکایوز میں جن مشاہیر کے ویڈیو تیار ہو چکے ہیں ان میں جذبی، کیفی، سردار، فیض، ملا، عصمت چغتائی، سید حامد، کرنل زیدی، صالحہ عابد حسین، کیف بھوپالی، مسعود احمد برکاتی، حسن احسان، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ابو الخیر کشفی، حیات اللہ انصاری، جوگندر پال، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، علی محمد خسرو، بدر الدین طیب جی، حکیم عبد الحمید، خورشید عالم خاں،

وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں وامق جونپوری، جذبی اور کیف بھوپالی پر طویل ترین فلمیں بنی ہیں جو تین تین گھنٹے کی ہیں۔ خدا بخش آرکائیوز کیلئے یہ فلمیں دو جگہ بنتی ہیں دہلی اور پٹنہ دہلی میں پرائیوٹ والی فلمیں ہونے کے سبب آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو نہیں پاتا۔ پٹنہ میں اطمینان کے ساتھ تین گھنٹے اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ وقت مل جاتا ہے کیونکہ یہاں جو مشاہیر بلائے جاتے ہیں وہ چند گھنٹے کے بجائے چند دن کے لئے اطمینان سے آتے ہیں۔ لائبریری میں قیام کرتے ہیں اور پھر ان پر فلم بنتی ہے۔

وامق کی یہ فلم ان کی خود نوشت کے ساتھ مل کر اردو کے کسی جدید شاعر کی سب سے اہم دستاویز ہو گئی ہے۔ جہاں تک ان کی خود نوشت کا تعلق ہے، وامق نے اس میں بہت سے مسئلے چھیڑے ہیں ان کے منجملہ خاص نکات یہ ہیں کہ آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک اتنی تیزی سے کیوں گھلتی چلی گئی۔ زندگی کی شمع دونوں سروں پر جلانے والے جیالے ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں ہر نازک موقع پر کاسۂ گدائی کیوں نظر آنے لگا ہے۔ ترقی پسندی آج بھی زندہ ہے آئندہ بھی زندہ رہے گی لیکن ترقی پسند ادیب کیوں زوال آمادہ ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالوں اور ان کے اوپر تفصیلی بحث پر مشتمل وامق جونپوری کی خود نوشت سوانح عمری خدا بخش لائبریری پروجیکٹ کے تحت مکمل ہو گئی ہے اور جلد ہی طبع ہو کر منظر عام پر آ جائے گی۔

وامق جونپوری اس مشہور تاریخی شہر میں پیدا ہوئے جس نے کبھی شیر شاہ کو جنم دیا تھا اور ہمارے عہد میں رشید احمد صدیقی کو۔ ان کی عمر دو چار سال میں اسی کو پہنچ جائیگی وامق صاحب مشہور ترقی پسند پرچے "شاہراہ" کے ایڈیٹر رہے۔ پھر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر نظام سے وابستہ رہے اور آخر میں سرینگر کے انجینئرنگ کالج کے دفتر کے سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے کلام کے مجموعوں کے نام چیخیں، جرس اور شب چراغ ہیں۔ وامق صاحب اس وقت کے ترقی پسند لکھنے والوں میں سب سے معتبر فنکار ہیں اور پچھلے دنوں انھوں نے "قومی آواز" میں کچھ متنازعہ مسئلے چھیڑے تھے جس سے بہت دنوں کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ہر تحریک میں کسی بزرگ کی موجودگی کتنی مفید ہوتی ہے۔ ایسا بزرگ جو بار بار غلط راستہ اختیار کرنے والوں کو ٹوک سکے اور روک سکے۔

(سلسلہ ص ۳۲ پر)

محمد نور الاسلام صدیقی

خاندان برامکہ کی فیاضیاں

مشرقی ممالک میں یوں تو بہت سی سلطنتیں قائم ہوکر اپنے کارناموں کی یاد چھوڑ کر فنا ہوگئیں۔ ان میں خلافت عباسیہ کی تاریخ بڑی شاندار ہے۔ علوم وفنون کی قدردانی اور دنیاوی امور میں ہر طرح کی ترقی و عروج کے لئے مشہور اور اپنی آپ مثال ہے۔ لیکن اس سلطنت کے عروج و ترقی میں چار چاند لگانے والا مشہور و معروف برامکہ کا خاندان ہے جن کے تذکرہ کے بغیر سلطنت عباسیہ کا تذکرہ نامکمل نظر آتا ہے۔

آج ہم اس خاندان کی بے مثال فیاضی کا تذکرہ کریں گے۔

خاندان برامکہ کے اوصاف جمیلہ میں ان کی فیاضی اور سخاوت کی مثال تاریخوں میں کسی دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتی۔ یحییٰ برمکی دنیا کے ممتاز اور مشہور اہل کمال سے گزرے ہیں۔ فصاحت اور بلاغت، برجستہ گوئی، آداب مجلس، فنون جنگ سے واقفیت اور مہارت، اہل علم کی قدردانی اور غربا پروری ان میں عام تھی۔ اس خاندان کے لوگ صائب الرائے، بردبار، عالی حوصلہ، خوش اخلاق اور شجاع تو تھے ہی لیکن ان کی سخاوت کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔

خلافت عباسیہ کا مشہور شاعر ابو نواس کیا خوب لکھتا ہے:

ترجمہ" برامکہ وہ تھے جنہوں نے بادشاہوں کے صفات کو اپنایا اور لوگوں کو سکھایا۔ جس پودے کو لگایا اس کی نگہداشت و پرداخت کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ جب عمارت بناتے تو اس کے استحکام کا خیال رکھتے۔ جب لوگوں کی بھلائی کا کام کرتے تو اس کو بقائے دوام کا لباس پہناتے۔"

مکان ۲۹۳ ۔ آغا پورہ ۔ ۲ ۔ [illegible]آباد

اس خاندان نے اپنے مداحوں کو نوازا، شاعروں اور عالموں کی سرپرستی کی، عالمین کی پوشیدہ طور پر خدمت کی، حکیموں، طبیبوں اور صاحب کمال لوگوں کو مالا مال کر دیا۔ بے نواؤں اور فلاکت زدہ لوگوں کی ایسی سرپرستی کی کہ ان کا امراء میں شمار ہونے لگا۔ جب کسی شریف اور معزز شخص کی تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو اس پر سخاوت کی ایسی بارش کی کہ وہ تمام عمر کے لئے تنگدستی سے دور اور خوشحالی سے ہمکنار ہو گیا۔ انتہا یہ کہ جب کوئی شریف آدمی اپنی زبوں حالی سے مجبور ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا اور دوسرے لوگ ان سخی امراء کو اس کی زبوں حالی سے مطلع کرتے تو ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کیا جاتا اور باخبر کرنے والے بھی انعام واکرام سے نوازے جاتے۔

چنانچہ اسحٰق موصلی دربار خلافت کا مشہور موسیقار تھا۔ فضل برمکی کو ایک دن اس نے ایسا گانا سنایا کہ اس نے خوش ہو کر ایک لاکھ درہم اور خلعت سے سرفراز کیا۔ دوسرے دن پھر طلب کیا۔ اسحٰق دیر سے پہنچا تو فضل ناراض ہوا اور تاخیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو اسحٰق موصلی نے عرض کیا کہ خلیل کندی جو بغداد کا ایک مشہور امیر ہے آج بازار میں پیدل چلتا اور نہایت ہی ابتر حالت میں نظر آیا میں نے اس کو گھر پہنچا کر پانچ ہزار دینار بطور قرض پیش کئے۔ یہ سن کر فضل آب دیدہ ہو گیا اور مجھے دعائیں دے کر پچاس ہزار دینار انعام دیئے کہ تم نے ایک معزز امیر کے حال سے واقف کرایا اور پھر خلیل کے حال پر ایسا کرم کیا کہ وہ پھر شاہانہ شان سے گزارنے لگا۔

علامہ ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی ایک مرتبہ پریشان ہو کر یحییٰ برمکی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ مالی مشکلات بیان کیں۔ پھر سلام کر کے اپنے گھر چلے آئے تو ایک خادم نے لا کر ایک تھیلی جس میں ہزار دینار تھے یحییٰ کی جانب سے علامہ کو پیش کی اور کہا کہ یحییٰ نے کہا ہے کہ کل پھر تشریف لائیں وہ چار روز تک روز آنہ جاتے اور ہزار دینار وصول کرتے رہے اس کے بعد خودداری سے مجبور ہو کر جانا بند کر دیا تو پھر یحییٰ نے بلا کر بوقت رخصت دو لاکھ درہم، ایک مکان معہ ضروری سامان مرحمت فرمایا اور درخواست کی کہ آپ تمام عمر بغداد ہی میں رہیں۔ چنانچہ علامہ مستقل طور پر بغداد ہی میں قیام پذیر ہو گئے اور اس عدیم المثال فیاضی کی تعریف کرتے رہے۔

ایک عیسائی جبریل بن بختشوع۔ بنو عباس کے دور میں طبیب تھا۔ شاہانہ شان و شوکت سے زندگی گزارتا تھا۔ دربار خلافت سے جو تنخواہ اور انعام واکرام ملتا تھا۔ اس کے علاوہ خاندان برامکہ سے اس طبیب کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا جو حسب ذیل ہے:

یحییٰ بن خالد برمکی — چھ لاکھ درہم سالانہ
جعفر بن یحییٰ برمکی — بارہ لاکھ درہم سالانہ
فضل بن یحییٰ برمکی — چھ لاکھ درہم سالانہ

اسحٰق موصلی جو دربار خلافت کا نہایت مشہور موسیقار ہے بیان کرتا ہے کہ ایک دن یحییٰ برمکی نے علی الصباح مجھے بلایا۔ اس زمانے میں میرا مکان بہت چھوٹا تھا یہاں تک کہ گھوڑا بھی دہلیز سے باندھا جاتا تھا۔ اتفاقاً اسی روز ایک آدمی سویرے آیا اور اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لین دین کے جھگڑوں کو چکانے میں دوپہر ہوگئی اس کے بعد میں دربار میں پہنچا۔ یحییٰ نے ہنس کر کہا کہ حلیۂ صبوح کی اچھی قدر کی۔ میں نے معافی چاہی اور اصل واقعات عرض کر دیئے۔ میرا حال سن کر یحییٰ کو شرمندگی سے پسینہ آگیا۔ پھر میرا گانا سنا اور ایک قیمتی خلعت، ایک راس اسپ مطوق اور ایک لاکھ درہم انعام دیا۔ پھر اپنے وکیل کو بلا کر حکم دیا کہ اسحٰق کے مکان پر جاکر بالاخانے سے دیکھو جس قدر مکان گردوپیش نظر آئیں وہ خرید لو قیمت مالک مکان جو مانگے دے دو۔ پھر شاہی طرز کی ایک عمارت تعمیر کرا دو۔ وکیل جب میرے مکان کے بالاخانے پر آکر بیٹھا تو میں نے تیرہ قطعہ مکانات منتخب کئے جس کو خرید کر جدید عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوگیا۔ تیسرے دن میری طمع بڑھی۔ میں نے چاہا کہ اور چند مکانات خرید کر اس عمارت میں اضافہ کر دوں تو معلوم ہوا کہ ابونصر احمد اصفہانی دو چند قیمت دے کر وہ مکانات خرید رہا ہے اور ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے۔ چار سے پانچ کے صناعوں کو زیادہ معاوضہ دے کر ہم سے چھین لیا۔ باعتبار نقش و نگار اور مطلا کاموں کے بغداد میں یہ عمارت اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی تھی۔ ابونصر احمد کا اور میرا دونوں مکان تعمیر ہوگئے تو خواجہ حساد وکیل نے یحییٰ برمکی کو مطلع کیا۔ حکم ہوا کہ یہ مکانات شاہانہ طریقہ پر آراستہ کئے جائیں، ہر قسم کے ظروف نقرئی، بیش قیمت آلات اور زربفت کے پردے اور اس قدر لونڈی غلام بھیج دئے جائیں۔ جب تمام امور مکمل ہوگئے تو ایک لاکھ درہم اخراجات دعوت کے لئے عنایت کئے گئے۔ بعد انتظام یحییٰ برمکی مع صاحبزادوں اور ندیموں کے ہمراہ میرے جدید تعمیر شدہ مکان تشریف لائے اور مجلس عیش و طرب برپا ہوئی۔ پھر بالاخانے پر تشریف لے گئے اور ابونصر احمد کا عالی شان محل دیکھ کر فرمایا کہ یہ خوشنما عمارت کس کی ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ ابونصر احمد کا محل ہے اور جس کی طرف

سے مجھے جو تکالیف پہنچی تھیں بیان کیں۔ یحییٰ نے میری باتیں سن کر خوب قہقہہ لگائے جس سے میں بہت شرمندہ ہوا۔ ابوالنصر کی ایک دیوار میرے مکان سے متصل تھی اس کو یحییٰ کے حکم سے منہدم کر دیا گیا۔ پھر یحییٰ میرے مکان سے اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ جہاں دسترخوان چنا گیا۔ یہ محل چاندی اور سونے کے برتنوں سے جگمگا رہا تھا ہر طرف عطر کی خوشبو مہک رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر یحییٰ نے مجھے بلایا اور ساز و سامان، غلام و کنیز اور سونے اور چاندی کے برتن کے علاوہ دونوں مکان مجھے عنایت کر دے اور فرمایا کہ یہ دونوں مکان تمہارے لئے میرے ملازمین نے تعمیر اور آراستہ کئے ہیں لیکن تم کو اب تک اس لئے چکر میں رکھا تھا کہ کہیں تم کو شادیٔ مرگ نہ ہو جائے۔ چلتے وقت کے دونوں بیٹوں نے بیس بیس ہزار دینار عنایت فرمائے الغرض یہ خاندان برامکہ علماء، شعراء، صاحب کمال اور حاجت مندوں کے لئے ابر رحمت تھا جو سب پر فیاضی کی بارش کرتا تھا۔ اس دور میں سخاوت ایسی صفت تھی کہ ہر امیر اس صفت سے خود کو متصف کرنا چاہتا تھا اور بعض جگہ یہ صفت اہل فارس اور اہل عرب کے درمیان ایسی باعث فخر صفت بن جاتی کہ ہر امیر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا اور ان حالات میں اراکین سلطنت اور درباری امراء اپنی فضول خرچی کے باعث تنگدست بھی ہو جاتے تھے۔

کسی نے یحییٰ برمکی کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھ کر دریافت کیا کہ مرنے کے بعد خدا نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ یحییٰ نے جواب دیا کہ یوں تو اگر حساب کیا جائے تو کروڑوں روپیہ عطا کیا گیا لیکن پوشیدہ طور پر علماء و صالحین کو جو میں مدد کیا کرتا تھا ان میں حضرت سفیان ثوری کو ایک ہزار درہم ماہوار دیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کی دعاؤں کی بدولت بخش دیا۔

پیدائش ۷۱۷ء ۔ وفات ۷۷۸ء۔

حضرت ابو عبداللہ سفیان بن سعد بن حبیب رافع الثوری المکوفی کا شمار اقطاب اسلام اور ارکان دین میں ہوتا ہے۔ علم حدیث کے امام تھے۔ خلیفہ مہدی عباسی بھی آپ کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔

جب تری شان کرمی یہ نظر جاتی ہے	زندگی کتنے مراحل سے گزر جاتی
بے طلب مجھ کو دئے جاتا ہے دینے والا	مانگتا بھی نہیں جھولی مری بھر جاتی

امین مالوف / قاضی جلیل احمد

سلسل قسط ۱۳

صلیب کے سائے میں

یا جنگ میں انطاکیہ اور الیپو کی فوجوں کو کامیابی ہوئی۔ جوالی جان بچا کر بھاگا
یا لشکر کے ایک بڑے حصے نے تل بشیر میں بالڈون اور جوسلین کی پناہ لی۔
نے ان مسلمانوں کو پناہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب مورخین بالڈون کی تعریف کرتے ہیں
عیسائی مورخین کے پاس اس کے لئے تعریف کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ تل بشیر کے معرکے
ن کی شکست کی اطلاع جب شہر میں پہنچی تو اہل شہر بشمول ارمنی لوگوں نے فرنگیوں
ے سے اتار پھینکنے کی کوشش کی۔ اس کے انتقام میں بالڈون نے ارمنی پادریوں کو جمع کر کے
میں نکلوا ڈالیں۔

مر موصل میں جوالی بھی اپنے مخالفین کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس شکست
وقار بہت گھٹ گیا تھا اور رفتہ رفتہ وہ اپنے علاقے، اپنے خزانے اور اپنی فوج سے بھی
بیٹھا اور سلطان محمد نے اس کے سر کی قیمت مقرر کروا دی۔ لیکن جوالی نے ہار نہیں مانی۔
یکے بعد دیگرے میں وہ اصفہان پہنچا اور اپنے سر سے کفن باندھ کر سلطان محمد کے سامنے زمین بوس
ن کو اس پر رحم آگیا اور اس کی خطا معاف کر دی اور کچھ عرصے بعد ایران میں کسی علاقے
حکم بھی بنا دیا۔

ناطر کی فتح نے ٹنکریڈ کو بام عروج پر پہنچا دیا اور انطاکیہ کی مملکت اپنے علاقے میں ایک

بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرا۔ دمشق کی حیثیت اس کے مقابلے میں محض ایک باجگذار ریاست کی رہ گئی اور شیرز کی حیثیت امیر الامرا کی۔ قتل الشیر کے چند ہفتوں بعد دمشق نے یروشلم کے ساتھ عارضی صلح کا معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدے کے شرائط کی رو سے دمشق اور یروشلم کے درمیان ساری مزروعہ اراضی کا زرِ لگان تین فریقوں یعنی ترکوں، فرنگیوں اور کسانوں میں برابر تقسیم ہوگا۔ چند ماہ بعد دمشق نے ایک اور معاہدہ کے ذریعہ وادیٔ بقاع کے سارے حصے سے یروشلم کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ اس طرح دمشق کی حیثیت ایک کمزور فریق کی ہو کر رہ گئی۔ ان کی زراعت فرنگیوں کے رحم و کرم پر تھی اور ان کا سامانِ تجارت اکرہ کی بندرگاہ سے ہو کر جاتا تھا جس پر جینوا کے تاجروں کا قبضہ تھا۔ مملکت شام کے شمال اور جنوب دونوں حصوں پر فرنگی سیادت نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔

فرنگیوں نے یہیں پر بس نہیں کیا۔ سنہ ۱۱۰۸ء میں وہ اپنی ایشیائی فتوحات کے سبب سے ظلم پھیلانے کے دہانے پر کھڑے تھے۔ لبنان کے سارے ساحلی شہر فرنگی نرغے میں تھے اور مقامی حاکموں میں نہ اتنی ہمت تھی اور نہ طاقت کہ فرنگی یلغار کو روک سکتے۔

ان کا سب سے پہلا ٹارگٹ ترپولی تھا۔ سینٹ جائلس اس شہر کا ۱۱۰۳ء سے محاصرہ کیے ہوئے تھا اور اس نے شہر پناہ کے مقابل ایک نئے قلعے کی تعمیر شروع کی تھی جو آج بھی اسی کے نام سے موسوم ہے۔ فرنگیوں کی آمد کے زمانے میں شہر ترپولی اتنا وسیع نہ تھا اور اس کی حد بندگاہ بینا تھی۔ اس قلعہ کی تعمیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترپولی سے نہ کوئی قافلہ تجارت باہر نکل سکتا تھا اور نہ شہر میں داخل ہو سکتا تھا جو سینٹ جائلس کی زد میں نہ پڑتا ہو۔

قاضی فخرالملک ہر قیمت پر اس قلعہ کو تباہ کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کی تعمیر کے دوران راتوں میں شب خون کے ذریعہ ترپولی کے سپاہی قلعے کے محافظوں کو قتل کرتے اور دیواروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ ستمبر سنہ ۱۱۰۴ء میں قاضی شہر کی قیادت میں ترپولی کی ساری فوج نے قلعہ پر چھاپہ مارا۔ کئی فرنگی سورما ہلاک اور زخمی ہوئے اور قلعہ کا ایک حصہ جل کر تباہ ہو اس آگ میں سینٹ جائلس بھی بُری طرح جھلس گیا اور پانچ ماہ انہی زخموں سے ہلاک ہوگیا۔ مرتے وقت اس نے قاضی فخرالدین کے سفیروں کو بلایا اور ان کے سامنے ایک تجویزِ صلح پیش کی۔ ترپولی والے قلعہ پر حملہ سے احتراز کریں گے اور اس کے جواب میں تجارتی قافلوں کو بلا روک ٹوک ترپولی جانے دیا جائے گا۔ قاضی فخرالدین نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

یہ ایک عجیب طرح کا معاہدہ تھا۔ دنیا میں کہیں کوئی محاصرہ ایسا نہیں ہوتا جس میں محصور

علاقے میں رسد پہنچانے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس معاہدے سے تین دن کے بعد بحری جہاز اور تجارتی کاروان دھڑا دھڑ قلعے میں آنے جانے لگے۔ بات دراصل یہ ہے کہ فرنگیوں کو جینوا اور قسطنطنیہ سے ایک بحری بیڑہ کی آمد کا انتظار تھا جس کے آتے ہی وہ قلعہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ ادھر تریپولی والوں کو بھی ایک اسلامی فوج کی مدد کے لئے آمد کی توقع اور انتظار تھا۔ منطقی طور پر یہ مدد صرف مصر ہی سے مل سکتی تھی کیونکہ مسلمان ملکوں میں قابل ذکر بحری بیڑہ صرف مصر ہی کے پاس تھا۔ لیکن مصر کے وزیر الافضل اور قاضی فخر الملک کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ الافضل کا باپ قاضی فخر الملک کا غلام تھا اور قاضی کا سلوک زمانۂ غلامی میں اس کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ اور الافضل اپنے باپ کی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ادھر قاضی فخر الملک الافضل سے مدد حاصل کرنے کے بجائے شہر تریپولی کو سینٹ جائلس کے سپرد کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر تریپولی کو شام سے کوئی مدد ملنے کی توقع نہ تھی۔

لہٰذا جب حران میں امیر سوکمان کی فتح کی اطلاع قاضی فخر الملک کو پہنچی تو اس نے جکرمش کے ساتھ کافی مال و دولت بھی روانہ کی تھی اور اس مہم کا سارا خرچ برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ سوکمان کے منہ میں پانی بھر آیا اور فوج لے کر وہ تریپولی کی طرف روانہ ہوا لیکن وہ تریپولی سے چار دن ہی کی مسافت پر تھا کہ اس کے قلب پر حملہ ہوا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی فوج بددلی کا شکار ہو کر تتر بتر ہو گئی اور یوں فخر الملک کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

۱۱۰۵ء میں برکیارق کا بعارضہ دق انتقال ہو گیا اور اس طرح سلجوقی سلاطین کی آپس کی خانہ جنگی اختتام کو پہنچی۔ اور شام، عراق اور ایران محمد بن ملک شاہ سلجوقی کے زیر عنان آ گیا۔ قاضی فخر الملک نے ایک بار پھر مدد کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ دونوں میں نامہ و پیام کا تبادلہ ہوا۔ سلطان نے مدد کے وعدے کئے لیکن ان کے ایفا کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔

اس دوران میں شہر کا محاصرہ پھر سے سخت کر دیا گیا۔ سینٹ جائلس کے انتقال کے بعد فرنگی فوج کی عنان آل سردانی کے تفویض ہوئی Count of Cerdagne جس نے شہر کے محاصرہ کو اور سخت کر دیا۔ شہر میں غذائی اجناس کی قیمتیں چڑھنے لگیں۔ لوگ شہر چھوڑ کر جانے لگے۔ فخر الملک نے سختی کے ساتھ اس کارروائی کو بند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تریپولی کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ کسی امدادی فوج کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور فرنگی بیڑے کی آمد کی اطلاعیں گرم تھیں۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر فخر الملک نے خود بغداد جانے کی ٹھان لی تاکہ سلطان محمد اور خلیفہ مستظہر باللہ کو امداد کے لئے راضی کر سکے۔ اس کی عدم موجودگی میں شہر کی عنان اس کے

ابن ہاشم کے سپرد کی گئی اور سپاہیوں کو چھ مہینے کی تنخواہ پیشگی دی گئی۔ قاضی فخر الملک
لئے پانچسو سواروں کے رسالے کے علاوہ بے شمار تحفے تحائف اور حمل ونقل کے لئے جانور
لو ساتھ رکھا گیا۔ اس طرح مارچ ۱۱۰۸ء کے آخر میں فخر الملک تریپولی سے براہ خ
ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ روانگی فرنگیوں کی اجازت سے تھی یعنی فرنگیوں نے فخر الملک کو اتحا
اور جہاد کی آگ بھڑکانے کی اجازت دی تھی۔ یا ہو سکتا ہے کہ بیروت تک وہ کشتیوں
کے بعد باقی سفر اس نے خشکی کے راستے کیا ہو۔ کیونکہ خشکی کے راستے سے بغداد جانے
بن قلانسی ہی کے پاس ملتی ہے۔

بہر حال سفر چاہے براہ خشکی تھا یا براہ آب فخر الملک کا پہلا پڑاؤ دمشق میں
ہاک اور قاضی زیر بحث کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ لیکن اتفاقاً انہی دنوں دکاک کا
ز زیر غور ان) اس کی جگہ اتابک تغتگین (TAGTAGIN) نے لی تھی۔ یہ ایک
ور فرنگیوں سے اسکے تعلقات کا شام کے حالات پر آئندہ بیس سال تک اثر پڑتا ر
کے برخلاف وہ نہایت چالاک اور بے اصولا آدمی تھا۔ قاضی فخر الملک ہی کی طرح وہ بھی
تجربہ کار آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے قاضی فخر الملک کا بہت پرتپاک استقبال کیا۔ اس
بڑی ضیافت کا اہتمام کیا۔ اسی طرح قاضی فخر الملک نے بھی شہر پناہ سے باہر ہی قیام

بغداد میں فخر الملک کا استقبال اور بھی زیادہ شاندار تھا۔ وہاں اس کے ساتھ
روا کے جیسا سلوک ہوا۔ سلطان محمد نے اپنی کشتی میں اسے دجلہ کے پار اتارا۔ محلات
ون اس کا شاندار استقبال اور ضیافتیں ہوتی رہیں۔ سلطان اور خلیفہ دونوں نے اس
کی بوچھار کردی۔ سارا بغداد فرنگیوں کے خلاف فخر الملک کے جہاد کی تعریف میں رطب

لیکن جب اصلی امداد کا وقت آیا تو سلطان محمد نے ایک فوج کثیر قاضی فخر ا
کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ وہ پہلے موصل کا رخ کرے اور موصل کو جوالی کے قبضے
کے بعد تب کہیں تریپولی کا رخ کرے۔ فخر الملک کی امیدوں پر پھر سے اوس پڑ گئ
حالات اتنے الجھے ہوئے تھے کہ ان کو سلجھانے کو ہفتوں کی نہیں برسوں کی ض
کے علاوہ موصل بغداد کے شمال میں تھا جبکہ تریپولی بغداد کے مغرب میں۔ یعنی فوج
جا کر پھر مغرب کی سمت سفر کرنا تھا اور اس طرح بروقت تریپولی کو مدد پہنچانا نا
سلطان کے پاس اس عذر کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اس کے نزدیک تریپولی سے زیا
اہمیت تھی۔ لہٰذا قاضی فخر الملک ایک بار پھر بے نیل ومرام واپس ہوا۔

اگست ۱۱۰۹ء میں جب وہ دمشق پہنچا تو اسے سقوط ترپولی کی اطلاع ملی۔ اس کی بروقت آمد سے مایوس ہو کر حکام شہر نے شہر ترپولی پر مصر کے وزیر الافضل کی سیادت تسلیم کرتے ہوئے اسے دعوت دی کہ وہ آکر شہر کی حفاظت کرے۔ الافضل نے شہر کی مدد کے لئے بحری راستے سے غذائی اجناس اور اس کے ساتھ ہی شہر کے انتظام کے لئے گورنر روانہ کیا۔ جس نے ترپولی پہنچتے ہی عمار الدین کے سارے خاندان کو گرفتار کر کے خزانے اور نقد جواہرات سمیت مصر روانہ کر دیا۔

ادھر فرنگی ترپولی پر آخری حملے کی تیاریاں زور و شور کے ساتھ کر رہے تھے۔ بالڈون آف یروشلم، بالڈون آف اذلسہ، ٹینکرڈ آف انطاکیہ بھی وہاں اپنی اپنی فوجوں سمیت موجود تھے۔ اوائل موسم گرما میں فرنگیوں کے حملے کی ابتدا ہوئی۔ پہلے ہی حملے میں انھوں نے اپنے متحرک مینار قلعہ ترپولی کے قریب پہنچا دئیے۔ یہ دیکھ کے اہل شہر کا حوصلہ پست ہو گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ شہر کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ شہر میں رسد ختم ہو چکی تھی۔ الافضل کی موعودہ مدد کا پتہ نہ تھا کیونکہ ہواؤں کا رخ ان کے خلاف تھا۔ شاید یہی خدا کی مرضی تھی۔ ۱۲ر جولائی ۱۱۰۹ء کو فرنگیوں نے ایک بڑا حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور یوں دو ہزار دن کے محاصرے کے بعد یہ سناروں اور کتب خانوں کا ملک یہ قاضی القضات اور نذر جہازرانوں کی بستی بالآخر فرنگیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ شہر تباہ اور برباد کر دیا گیا۔ ایک ہزار کتابوں کا دار العلم تباہ کر دیا گیا۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ فرنگیوں نے فیصلہ کیا کہ شہر کا ایک تہائی حصہ جنیوا والوں کو ملے گا اور دو حصے سینٹ جائلس کے فرزند کو۔ جو کچھ بالڈون نے مانگا وہ اسے دے دیا گیا۔ اکثر و بیشتر شہریوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ باقی لوگوں کو ان کی جائیداد سے بے دخل کر کے انہیں شہر سے نکال دیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے شہر ٹائر کا رخ کیا۔ فخر الملک نے اپنی زندگی کے باقی دن نواح دمشق میں پورے کئے۔

رہا مصر کا بحری بیڑہ تو وہ ترپولی کے سقوط کے آٹھ دن بعد ٹائر پہنچا۔ ابن قلانسی کے الفاظ میں یہ سب خدا کی نافرمانیوں کی سزا تھی۔ فرنگیوں کا دوسرا ہدف بیروت تھا۔ شہر کے اطراف ساگوان اور بلوط کے جنگل تھے جن کی لکڑی سے مینار سازی میں بڑی سہولت تھی۔ بیروت میں ترپولی کی شان و شوکت نہ تھی لیکن اپنی بندرگاہ کی وجہ سے یہ بھی ایک آسودہ حال شہر تھا۔ فروری ۱۱۱۰ء سے بیروت کا محاصرہ شروع ہوا۔ پانچ ہزار شہریوں نے شہر کی دفاع میں جان لڑا دی۔ فرنگیوں کا اتنا سخت مقابلہ اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا۔ لہٰذا ۱۳ر مئی کو جب شہر فتح ہوا تو حملہ آوروں نے دل کھول کر بدلہ چکایا۔ ایسا زبردست کشت و خون شاید ہی کہیں ہوا ہو۔

دوسرے سال موسم گرما میں ملک فرنگ سے مزید فوجیں آ پہنچیں اور انھوں نے صیدا

گھیرے میں لے لیا۔ اصل شہر جو فرنگیوں کی آمد کے وقت سے آج تک بہادری سے اپنے شہر کی حفاظت کر رہے تھے اب حوصلہ ہار گئے۔ اب مقابلہ صرف لاحاصل تھا بلکہ اس کا نتیجہ کشت و خون اور تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے قاصد فرنگیوں کے پاس روانہ کئے کہ شہر کے لوٹ اور بھڑے جوالتی کی صورت میں ان کی جان بخشی کی جائے۔ فرنگیوں نے ان کی شرط مان لی۔ ۱۲ دسمبر ۱۱۱۰ء کو شہر فرنگیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ کوئی قتل و خون نہیں ہوا۔ البتہ شہر کے اکثر لوگوں نے ہجرت کر کے ٹائر اور دمشق میں سکونت اختیار کی۔

اٹھارہ مہینے کی قلیل مدت میں دنیائے عرب کے ۴ بڑے شہروں پر فرنگیوں کا قبضہ ہوگیا۔ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا شہر بدر کر دیا گیا۔ ان کے امیر، ان کے قاضی، ان کے متقیان شرع موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ان کی مسجدوں کو پامال کیا گیا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت فرنگیوں کو، ٹائر، الیو، دمشق، قاہرہ، موصل یہاں تک کہ بغداد تک پر قبضہ کرنے سے روکنے والی باقی نہیں رہی تھی۔ کیا کسی میں ان کو روکنے کی ہمت باقی تھی؟ مسلمان لیڈروں میں شاید نہیں، لیکن گذشتہ تیرہ برسوں میں فرنگیوں کی زد میں آنے والے ملکوں اور شہروں کے عوام میں جذبہ مقاومت جاگنے لگا تھا۔ جذبۂ جہاد ایک مرتبہ پھر بیدار ہو رہا تھا۔ محض نعرہ نہیں بلکہ ایک حقیقت کے طور پر۔ بیانگ دہل کے گروہ، شاعر اور ارباب مذہب ایک نئے جذبہ کے ساتھ جہاد کی تلقین کرنے لگے تھے۔ انہی پرجوش لوگوں میں ایک الیو کا قاضی عبدالفضل ابن خشاب بھی تھا۔ چھوٹے قد کا آدمی جس کے ارادے بلند تھے۔ اس نے اپنے کردار کی بلندی اور نفس کی پارسائی کے بھروسے پر فرنگیوں کو روکنے کا بیڑہ اٹھایا اور ملت عرب کو ان کی گہری نیند سے جگانے کا قصد کیا۔ آزادی کی صدا الفضل کے حلقوم سے ایک بار پھر بلند ہونے لگی۔

صفحہ ۵۶

بتایا گیا ہے کہ درخت کے کچھ حصے طبیعت میں تیزی لانے، اشتہا پیدا کرنے اور دستوں، کوڑھ اور پیٹ کے کیڑوں وغیرہ کے علاج کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ شیشم کی چھال میں ایک رنگ بھی ہوتا ہے۔ تنے کے اندرونی حصے کی لکڑی میں ایک تیل ہوتا ہے جسے مویشیوں کی منہ، کھر کی بیماریوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ***

شہباز حسین

ہندوستان میں اقلیتیں

یہ قدرت کا فیصلہ تھا کہ ہندوستان مختلف تہذیبوں، قوموں، فرقوں اور مذہبوں کا ارہ بنے۔ ہندوستان کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے فتہ رفتہ مختلف نسلوں اور قوموں کے میل جول سے ایک دلکش مرقع بن گئی جس کی بنیادی وصیات روا داری، میل جول، مطابقت اور ہم آہنگی ہیں۔ ہزاروں سال کی لمبی تاریخ ا دوسرے ملکوں کے ان گنت تہذیبی دھارے آئے اور یہیں سرزمین میں جذب ہو کر ایک لئے۔ دنیا کا کون سا مذہب ہے جس کے ماننے والے یہاں نہیں ہیں اور دنیا کی کون تہذیب ہے جس کی جھلک یہاں نہیں ملتی۔

طالع آزماؤں، مہم جوؤں، فاتحوں کے قافلے جوق در جوق آتے رہے مگر یہیں کے ر رہ گئے۔ اس لین دین کی وجہ سے ہماری معاشرت، ہمارا فلسفہ اور ہماری ذہنی خت کو بقائے باہم کا وصف عطا ہوا ہے جو ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریوں برسوں سے مختلف مذاہب کے ماننے والے بھائیوں کی طرح اس ملک میں رہ رہے ں لیکن جب ہندوستان نوآبادیاتی استحصال کا شکار ہوا اور برطانوی حکومت کے زیرنگیں تو فاتحوں نے اپنے مفاد کے لئے ہمارے اتحاد کو نقصان پہنچایا۔ اپنی حکمت عملی سے ہیں وہ احساسات اور جذبات پروان چڑھے جو ہمارے بنیادی مزاج کے منافی لیکن ہمارے ملک کی دانش مند قیادت نے ہمارے دیرینہ اتحاد کو پارہ پارہ ہونے بچا لیا اور ملک کا ایک ایسا دستور بنایا جس میں رنگ و نسل، مذہب اور علاقے بے کسی امتیاز کے بغیر ہر شہری کو یکساں حقوق دیے گئے۔

آزادی کے فوراً بعد ملک کی تعمیر و ترقی کا کام صحیح بنیادوں پر شروع ہوا۔

بڑے بڑے کارخانے کھلے، سڑکیں اور نہریں بنیں، ہسپتال اور اسکول کھولے
اور قومی زندگی کے ہر شعبے کو بہتر بنانے کے عظیم الشان منصوبے بنائے گئے
اس سے جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اس سے ہندوستان کے سبھی شہریوں کو فا
پہنچا اور آئندہ بھی جو پروگرام بنا رہے ہیں وہ ملک کے تمام شہریوں کے لئے ہیں۔ مگ
عمومی پروگراموں سے قطع نظر اقلیتوں کی مخصوص تہذیبی، سماجی اور مذہبی ضرورت
کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

دستور ہر شہری کو ضمانت دیتا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے جیسے
میں چاہے رہے اور جس طرح چاہے انجمن بنائے یا کسی انجمن میں شریک ہو۔ دس
مذہب کی تبلیغ کی بھی اجازت دیتا ہے اور تبدیلی مذہب کی بھی۔ اقلیتوں کا یہ بہت اہم اور
دستور کے ہدایتی اصولوں میں یکساں سیول کوڈ کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے
بارے پہلوؤں سے قطع نظر ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے
موجودہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بار بار اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ
سیول کوڈ کسی فرقے پر اس کی مرضی کے خلاف مسلط نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے
کا رویہ کیا ہے اس کی واضح مثال شاہ بانو کیس ہے جس میں مسلمانوں کے بڑے
کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے مسلم مطلقہ عورتوں
متعلق نان و نفقہ کا قانون پارلیمنٹ سے پاس کرایا اور اس طرح مسلم رائے عامہ کا
کرتے ہوئے ہندوستان کے جمہوری اقدار کی پاسداری کی۔ ہندوستان کی جمہوری
نے مسلمانوں کے عائلی قوانین میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کی اور جب کبھی اس سلسلے
بات اٹھی تو یہ بات بڑی وضاحت سے کہی گئی کہ اس سلسلے میں اصلاح اور ترمیم
ان ہی تجاویز پر عمل کیا جائے گا جس کا مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے کیا جائے

ہندوستان میں اقلیتوں کو اپنی عبادت گاہوں، درسگاہوں، تعلیمی اداروں
مذہبی انجمنوں کو قائم کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں ا
عالی شان مسجدیں اور گردوارے تعمیر ہوئے ہیں، بے شمار تعلیمی ادارے ہیں
خود چلاتی ہیں انھیں حکومت کے فنڈ سے بھرپور امداد دی جاتی ہے۔ ہزاروں مد
مدرسے ہیں جنھیں مختلف سرکاری اسکیموں کے تحت مدد ملتی ہے۔ حکومت کا جو
تعلیمی نظام ہے اور جو تعلیمی ادارے ہیں اس کے دروازے سبھی کے لئے کھلے

دستور میں صراحت موجود ہے کہ ہندوستان کی حکومت سیکولر ہوگی جس کے معنی یہ ہیں حکومت کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے اور حکومت سبھی مذاہب کا یکساں احترام کرتی ہے۔ یہ بڑی بنیادی ضمانت ہے جو اقلیتوں کو مذہبی بنیادوں پر ہر قسم کے تفریق سے محفوظ رکھتی ہے۔

ہندوستان میں آزادی سے قبل ایک نوآبادیاتی اور جاگیردارانہ سماج قائم تھا۔ سات سو کے قریب چھوٹی بڑی دیسی ریاستیں تھیں، ہزاروں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقدار تھے، ذات پات کی بندشوں نے معاشرے کو ہر طرح سے جکڑ رکھا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد تعلیم اور ترقی کا جو عمل شروع ہوا اس سے ملک کے مروجہ سماجی ڈھانچے پر ضرب پڑنے لگی۔ زمینداری کے خاتمے اور تیز رفتار صنعتی ترقی نے متعین رول کو بدلنا شروع کردیا۔ جمہوری حقوق نے پسماندہ ذاتوں اور طبقوں کو ایک نئی طاقت عطا کی اور انھوں نے اس طاقت کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ صنعتی ترقی نے روزگار کے مواقع فراہم کئے اور خود روزگاری کے بے شمار دروازے کھلے جس سے خوشحالی کی لہر ان لوگوں میں بھی آئی جو اس سے پہلے محروم تھے۔ دیسی سماج میں ان گنت تبدیلیاں آئیں اور روایتی دولت مند اور اقتدار یافتہ طبقہ اپنے لئے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے مذہبی احیاء پرستی سے بھی مدد لی گئی۔ اس کے علاوہ جو لوگ نئے نئے دولت مند بنے تھے انھیں بھی سماج میں عزت و وقار حاصل کرنے کے لئے روایتی سماجی اداروں خصوصاً مذہبی اداروں کی سرپرستی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس مسابقت میں مذہب کی اصل تعلیم اور اس کی روح نظر انداز ہوگئی اور نام نہاد مذہبیت کو فروغ حاصل ہوا۔

جمہوری نظام میں ایک لابی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ملک کے عظیم تر مقاصد کے سامنے ایک چھوٹے گروہ کے مفادات پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آتے۔ لہٰذا یہ لابی اپنے موثر بنانے کے لئے طرح طرح کے اقدام کرتی ہے تاکہ حکومت کو یہ بتایا جائے کہ اگر اس کے مفادات کی حفاظت نہیں کی گئی تو رائے عامہ منحرف ہوسکتی ہے۔ یہ لابی معاشی بنیادوں پر بنتی ہے اور مذہبی بنیادوں پر بھی۔ ایسا ہونا کچھ برا بھی نہ ہوگا کہ اگر یہ لابی اپنے گروہی مفادات کو ملک کے وسیع تر مفادات کے تابع رکھتی ہے مگر ایسا ہوا نہیں۔ آج جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے وہ سبھی کے لئے تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کی حکومت کی مختلف کوششوں کے علاوہ اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ اقلیتیں اپنے

مفاد کو سمجھیں اور ایسا کوئی کام نہ کریں جن سے حالات مزید خراب ہوں۔

مختلف اسباب کی وجہ سے تعلیمی اور معاشی ترقی میں مسلمان پچھڑ گئے۔ یقینیہ اور اس کے عواقب سے بھی وہ دو چار ہوئے لہٰذا لازمی طور سے ایسے اقدام کی ضرورت محسوس کی گئی جو اس طبقے کی سماجی بہتری اور ذہنی استحکام کے لئے ضروری ہو۔ اس میں نیشنل انٹگریشن کونسل کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس کی متعدد میٹنگوں میں ہدایات وضع کی گئیں جو فرقہ وارانہ اتحاد، اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی کے لئے ضروری تھیں۔ ریاستی حکومتوں کو ہدایتیں دی گئیں اور مرکز نے عوامی اداروں کی مدد سے ملک میں ایسی فضا تیار کرنے کی کوشش کی جو ہر قسم کی فرقہ وارانہ منافرت ہو۔ رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا گیا کہ ان ہدایات کو نہ صرف ایک واضح شکل دینا ضروری ہے بلکہ دیکھ بھال بھی ضروری ہے کہ ان ہدایات پر کس حد تک عمل ہوا۔

اس مقصد کے پیش نظر مئی 1983 میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ریاستی کو پندرہ نکات پر مشتمل ایک ہدایت نامہ جاری کیا تھا جو فرقہ وارانہ فسادات کی روک اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی اور متعلقہ مسائل کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے 15 نکات اس قابل ہیں کہ انہیں نقل کیا جائے:

1. ریاستی حکومتوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ ایسے اضلاع میں جہاں فرقہ وارانہ ہونے کا احتمال زیادہ ہو ایسے ضلع مجسٹریٹ اور پولس افسر تعینات کئے جائیں کارکردگی، غیر جانبداری اور سیکولر مزاج اور ریکارڈ رکھتے ہوں۔ فرقہ وارانہ کی روک تمام ضلع مجسٹریٹ اور پولس سپرنٹنڈنٹ کے بنیادی فرائض میں شامل ان کو ترقی دیتے وقت اس ضمن میں ان کی کارکردگی کو خاص اہمیت دی جائے۔

2. ضلع انتظامیہ اور پولس افسران کو جو اعلیٰ کارکردگی اور غیر جانبداری کا مظاہرہ انعامات دئیے جائیں۔

3. جو لوگ فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلاتے ہیں یا تشدد میں حصہ لیتے ہیں ان سخت کارروائی کی جائے۔

4. فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث افراد پر مقدمہ چلانے کے لئے خصوصی عدالتیں جائیں تاکہ مجرموں کو جلد سے جلد سزا دی جا سکے۔

5. فرقہ وارانہ فسادات میں جن کا نقصان ہوا ہے ان کو فوری امداد دی

اوران کی آبادکاری کے لئے قدم اٹھائے جائیں۔

6۔ فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے کے لئے ذرائع ابلاغ خصوصاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے مدد لی جائے

7۔ اخبارات کے ایڈیٹروں اور پبلشروں سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کے اخبارات اور رسائل میں اشتعال انگیز اور قابل اعتراض بھڑکانے والی باتیں شائع نہ ہوں۔ بدقسمتی سے کچھ اخبارات ایسی خبریں شائع کرتے ہیں جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی ہے۔ ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر صاحبان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اس معاملے میں حکومت سے تعاون کریں تاکہ اس طرح کے مواد کی اشاعت کو روکنے کی تدبیر نکل سکے۔

8۔ پولس کے محکمے میں بھرتی کے لئے ریاستی حکومتوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اقلیتوں کا خاص خیال رکھیں۔ سلیکشن کمیٹی میں اقلیتی فرقہ کا نمائندہ شامل کیا جائے۔

9۔ مرکزی پولس فورس میں بھرتی کے لئے مرکزی حکومت بھی یہی طریقہ اختیار کرے۔

10۔ ریلوے، بینکوں اور پبلک سیکٹر کے کارخانوں میں روزگار کے مواقع بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں۔ ان محکموں کو اقلیتی فرقے کے افراد کو بھرتی کرنے کے لئے خصوصی توجہ دینی چاہئے۔

11۔ بہت سی ملازمت کے لئے مقابلے کے امتحان ہوتے ہیں۔ اقلیتی فرقے کے افراد ان امتحانوں میں کامیابی حاصل کرنے کی اہلیت حاصل کرسکیں اس کے لئے اقلیتی تعلیمی اداروں میں کوچنگ کلاسیں شروع کرنے کی ہمت افزائی کی جائے۔

12۔ جن علاقوں میں اقلیتی فرقے کی آبادی زیادہ ہے۔ وہاں حکومت یا نجی اداروں کے ذریعہ انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ یا پالی ٹکنک قائم کی جائے تاکہ اقلیتی فرقوں میں تکنیکی مہارت پیدا ہو۔

13۔ مختلف ترقیاتی پروگراموں خصوصاً 20 نکاتی پروگراموں پر عملدرآمد سے جو اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور فائدے حاصل ہو رہے ہیں ان میں اقلیتوں کو بھی جائز اور مناسب حصہ ملنا چاہئے۔ ان پروگراموں کی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لئے جو کمیٹیاں قائم کی جائیں ان میں اقلیتی فرقوں کے افراد کو بھی شامل کیا جائے۔

14۔ متعدد مقامی مسائل جیسے موقوفہ جائداد پر ناجائز تصرف، قبرستانوں میں مداخلت وغیرہ ایسی شکل اختیار کرلیتے ہیں جن سے اقلیتوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسے مسائل کے حل کے لئے فوری اور اطمینان بخش کارروائی کی جاتی ہے۔

15۔ اقلیتوں کے مسائل کی طرف مسلسل اور خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ اس کام

میں سہولت پیدا کرنے کے لئے مرکزی وزارت داخلہ میں ایک خصوصی سیل قائم کیا جائے جو ان ہدایات کی عمل آوری پر نظر رکھے۔

مرکزی وزارت داخلہ میں اس مقصد کے لئے ایک سیل قائم کر دیا گیا ہے جس کے انچارج ڈپٹی سکریٹری کی سطح کے ایک افسر ہیں۔ اب یہ سیل وزارت بہبود کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ان 15 نکات کے سلسلہ میں ازسرنو تمام ریاستوں کو خصوصی مراسلے لکھے۔ حال میں ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی بنائی گئی ہے جو ان ہدایات پر عمل درآمد کی نگرانی رکھے گی۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ عمل درآمد کی مختلف سطحیں ہیں اور ہر جگہ ایسے افراد نہیں ہیں جو ان ہدایات پر صدق دل سے عمل کریں جو حکومت نے جاری کی ہیں۔ اس کے باوصف اعلیٰ سطح پر وزیر اعظم کی طرف سے نگرانی اور پوچھ گچھ سے حالات یقیناً بہتر ہوں گے۔

تاریخی اور تہذیبی لحاظ سے اردو کا مسلمانوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے حکومت ہند نے متعدد قدم اٹھائے ہیں جن میں ترقی اردو بورڈ کا قیام بڑا اہم ہے۔ یہ بورڈ 1969ء میں محترمہ اندرا گاندھی کی ایما پر قائم ہوا تھا اور اب تک اس ادارے نے 650 سے زائد نصابی اور درسی کتابوں کے علاوہ حوالے کی کتابیں، فرہنگیں بچوں کی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ اردو، اردو لغت اور انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری کا کام مکمل کر لیا گیا ہے اور دس جلدوں میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت بھی ملد متوقع ہے۔

اس ادارے کی طرف سے ملک کے متعدد حصوں میں کتابت کے 31 مرکز کھولے گئے ہیں جن میں چار لڑکیوں کے لئے مخصوص ہیں۔ 3 مرکز خوشنویسی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہیں۔ ان مرکزوں کی وجہ سے کاتبوں کی کمی دور ہوئی ہے اور اردو کی اشاعتی اداروں کو تربیت یافتہ کارکن مہیا ہو گئے ہیں۔

متعدد ریاستوں میں ریاستی حکومتوں نے اردو اکادمیاں قائم کی ہیں جو ادیبوں اور شاعروں کو انعام دینے کے علاوہ اچھی کتابوں کی اشاعت میں مالی امداد دیتی ہیں۔ حکومت ہند کے مختلف اداروں، پبلیکیشنز ڈویژن، ساہتیہ اکاڈمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی طرف سے بھی اردو کے رسائل اور کتابیں شائع

ہوتی ہیں۔ پاپولر سائنس کی کتابوں کے لئے جو انعامات دئے جاتے ہیں ان میں اردو بھی شامل ہے۔ وزارت تعلیم کی طرف سے ہر سال اردو کی اچھی کتابیں معقول تعداد میں خریدی جاتی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اردو پروگراموں کو مناسب نمائندگی دی گئی ہے۔ لال قلعہ کے جشن جمہوریت کے مشاعرے میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین شریک ہوتے ہیں۔ اردو غزل کی مقبولیت اس وقت انتہائی بلندیوں پر ہے۔ اور نئے گانے والوں کے کیسٹ اور ریکارڈ نئے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔

بہار اور اتر پردیش میں اردو تعلیم کے لئے بڑی تعداد میں استاد مقرر کئے گئے ہیں بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی ہے اور اس کے لئے عملہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کا پورا خرچ مرکزی حکومت برداشت کرتی ہے اور گذشتہ برسوں میں ان دونوں یونیورسٹیوں میں بہت سے نئے شعبے کھلے ہیں، تعمیرات ہوئی ہیں اور توسیع و ترقی کے متعدد منصوبوں پر عمل ہو رہا ہے۔

مرکزی وقف کونسل کی طرف سے اوقاف کی جائیداد کی نگرانی اور حفاظت کا کام بڑی سنجیدگی سے کیا جا رہا ہے۔ وقف کونسل نادار مگر ہونہار طالب علموں کو وظیفے اور مالی امداد دیتی ہے۔

سنٹرل حج کمیٹی بمبئی، مرکزی وزارت خارجہ کی نگرانی میں کام کرتی ہے اور حاجیوں کی سہولت کا خیال رکھتی ہے۔ ہر سال 20 ہزار سے زائد زائرین حج کے لئے جاتے ہیں جن کے علاج معالجے کے لئے خصوصی میڈیکل ٹیم بھیجی جاتی ہے۔ مکہ مکرمہ میں انڈین میڈیکل مشن مستقل طور سے کام کرتا ہے اس مذہبی فریضے کی ادائی کے لئے حکومت ہند ہر قسم کی سہولتیں مہیا کرتی ہے۔

ہندوستان کا دستور، جمہوری ادارے اور عدلیہ اقلیتوں کی حفاظت، بھلائی اور بہتری کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا دستور ایک مثالی دستور ہے۔ ہماری پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں اقلیتوں کے نمائندے موثر طور سے اپنی بات کہتے ہیں۔ پریس کی آزادی ان کے حقوق کو مزید تقویت عطا کرتی ہے۔ سینکڑوں اخبارات اقلیتوں کے نقطۂ نظر کو روزانہ پیش کرتے ہیں اور اپنے موقف کے لحاظ سے حکومت کی سخت تنقید بھی کرتے ہیں۔ عدلیہ آزاد ہے اور دستوری

باقی پر صفحہ (۹)

بھارتی شیشم۔ کالا سونا

شیشم ایک بڑا اور کم و بیش سدا بہار درخت ہے جس کا تنا سیدھا اور اس کے اوپر پوری گول چھتری ہوتی ہے۔ اس کی چھال کافی باریک ہوتی ہے جس کا رنگ خاکستری ہوتا ہے۔ اس پر چوڑی چھوٹی دراڑیں ہوتی ہیں۔ ریشے پتلے ہوتے ہیں اور چھلکے لمبائی میں اترتے ہیں۔ شیشم کی لمبائی مختلف مقامات پر مختلف ہوتی ہے۔ یہ درخت 45 میٹر کی بلندی اور 5 میٹر کی محیط تک چلا جاتا ہے۔ مغربی گھاٹ کے جنوبی خطے میں شیشم کے ایسے درخت پائے جاتے ہیں جو 45 میٹر اونچے ہوتے ہیں اور جن کا گھیرا 6 میٹر تک ہوتا ہے۔ بلندی میں سے تنے کی لمبائی 21 میٹر تک ہوتی ہے۔

شیشم کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں اور کم و بیش جگہ جگہ پر جنگل کے دوسرے درختوں میں ملتے ہیں۔ قدیم مرطوب جنگلات کی نمو شیشم کے اگنے کے لئے نہایت عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ شیشم کی نسبت سے سدا بہار گرم مرطوب جنگلات اور خشک گرم پت جھڑ والے جنگلات میں [illegible] ہیں۔

مقامات: شیشم کے درخت نیم بالائی [illegible] کے خطے سے لے کر مغربی بنگال، مہاراشٹر، گجرات، مغربی اور جنوبی ہند تک پھیلے ہوئے ہیں نیز جزائر انڈمان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بہار میں شیشم کہیں کہیں پایا جاتا ہے اور زیادہ بلند و گھیرے دار بھی نہیں ہوتا۔ اترپردیش میں شیشم [illegible] پت جھڑ والے خشک جنگلات میں پھیلا ہوا پایا جاتا ہے۔ مرکزی ہند میں پایا جاتا ہے۔ سینٹ پڑا کی پہاڑیوں میں سطح سمندر سے 610 میٹر کی بلندی پر شیشم کے درخت دکھائی دیتے ہیں لیکن کہیں بھی بکثرت نہیں پائے جاتے۔ مہاراشٹر کے چند جنگلات اور جنوبی گجرات کے جنگلات میں شیشم کے درخت کافی قد و قامت کے ہوتے ہیں۔ جنوبی جزیرہ نما ہند میں یہ درخت سطح سمندر سے 1500 فٹ تک کی بلندی تک پایا جاتا ہے۔

لیکن اس درخت کی بہترین نشو و نما مغربی گھاٹ پر ہوتی ہے۔

بھارت سے باہر جاوا میں یہ وہاں کا ایک دیسی پودا ہے۔ جزیرہ لنکا اور زنجبار میں شیشم کی کاشت کے نتائج حوصلہ افزا رہے ہیں لیکن کینیا میں نہیں۔

شیشم کی قدرتی آماجگاہوں میں سائے میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 30 درجے سے 40.8 درجے سیلسس ہوتا ہے اور کم سے کم درجہ حرارت صفر سے لے کر 15.6 درجے سیلسس ہوتا ہے۔ اس درخت کی نشو و نما کے لئے بارش کی سالانہ اوسط 762 ملی میٹر سے 5080 ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ گرم آب و ہوا والے علاقوں میں یہ درخت ٹھنڈی اطراف کو ترجیح دیتا ہے خشک علاقوں میں فروری مارچ کے مہینوں میں اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور نئے پتے اپریل مئی میں نکل آتے ہیں۔ نمی والے علاقوں میں درخت کے پورے پتے شاذ و نادر ہی جھڑتے ہیں۔ اس پر خالص سفید رنگ کے پھول مختلف اوقات پر آتے ہیں۔

مقام کے مطابق چپٹی پھلیاں دسمبر سے اپریل تک آتی ہیں اور کچھ دیر درخت سے لٹکی رہتی ہیں۔ ان میں سے اکثر پھلیاں مون سون کے آغاز کے وقت جھڑ جاتی ہیں اور اس طرح جنگل کی آگ سے محفوظ رہتی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ درخت قدرتی طور پر بہت بڑے پیمانے پر اُگتا ہے۔

درمیانہ روشنی: شیشم کے پودے کو خاص طور پر جوانی میں کافی سایہ درکار ہوتا ہے لیکن اسے دھوپ اور روشنی کی ضرورت درمیانہ ہوتی ہے۔ یہ اوپر سے پڑنے والی روشنی سے بہت مستفید ہوتا ہے اور اگر اسے کھلی جگہ میں لگایا جائے تو اس کے بڑھنے اور سایہ دار ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔ شیشم کے پودوں کو پالے سے نقصان پہنچتا ہے۔ جو پودے خشک سالی کے حالات میں لگائے جاتے ہیں انہیں ابتدائی مرحلوں پر بہت نقصان پہنچتا ہے اور یہ تو فیصلہ شدہ امر ہے کہ یہ درخت خشک حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ چھ ماہ کے مسلسل خشک موسم میں کھڑا رہ سکتا ہے۔ بیج سے نکلنے والے اور پودے لگائے جانے والے درختوں کو مویشی اور بھیڑ بکریاں کھا جاتی ہیں لیکن جن علاقوں میں گھاس اور بیلیں وغیرہ زیادہ پھیلتی ہیں وہاں ہلکے پیمانے پر مویشیوں کا چرایا جانا ان درختوں کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ درخت سب سے اچھا وہاں اُگتا ہے جہاں سے پانی کا نکاس ہو جاتا ہو لیکن زمین گیلی رہتی ہو پھر بھی خشک زمین میں بھی اچھے درخت اُگنے کی صلاحیت موجود رہتی ہے۔ یہ درخت ناقص نکاس یعنی پانی جمع ہونے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ درخت ساگوان کے مقابلے میں آگ سے بھی جلد نقصان اٹھاتا ہے اور کئی بار گھاس پھوس سے بھرے خطوں میں آگ لگنے سے پوری طرح ختم ہو جاتا ہے۔ بہت جھڑ کے جنگلوں میں زمین پر ہر برس جو آگ لگتی

ہے۔ شیشم اس کا آسانی سے مقابلہ کر لیتا ہے۔ اس کا جھاڑی بھی اچھا نتیجہ ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کئی اقسام کی پھپھوندی اور دیمک شیشم کی لکڑی پر اثر ڈالتی ہے۔

نئے درختوں کی تیاری: چونکہ ان درختوں کے بیج سے نئے درخت اُگ آتے ہیں اسی لئے جہاں پر شیشم کے جنگل ہیں وہاں قدرتی طور پر نئے جنگلوں کا پھر سے اُگ کھڑے ہونا بہت آسان ہوتا ہے۔ جنگلات میں بیجوں سے نئے پودے نکلتے ہیں۔ یہ عمل بارش کے موسم کے آغاز میں ہوتا ہے۔

شیشم کے لئے انتہائی سازگار حالات درمیانہ سایہ، خالی زمین اور نرم و نم دار مٹی ہے۔ قدرتی طور پر اُگ آنے والے پودوں کی … میں نشوونما کے سلسلے میں بہترین نتائج، اوپر سے داخل ہونے والی روشنی کے … سے حاصل ہو … ہیں۔ جہاں بانس کی جھاڑیاں قدرتی طور پر اگنے والے پودوں کی نشوونما میں رکاوٹ ڈال دیتی ہیں وہاں جنگلی گھاس کی کثرت سے بہت سے قدرتی طور پر اگنے والے پودے رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان پودوں کو آگ … اور مویشیوں کی چرائی سے بچایا جائے تو ہلکے سایہ میں ان کا نشوونما اچھی ہوتی رہتی ہے۔

جڑوں کو چوسنے والے: شیشم کا پودا جڑوں کے چوسنے والے اجزاء سے بڑی آسانی سے پھر اُگ آتا ہے۔ جڑوں میں سے پودوں کا پھر سے نکلنا عموماً کافی تعداد میں خاص طور پر ایسے حالات میں جہاں روشنی کافی ہو اچھا ہوتا ہے۔ چنانچہ جڑوں میں سے پودوں کے پھوٹنے کے عمل کو یقینی بنانے کے لئے جڑوں کو چھیلنے کے طریقے کی سفارش کی جاتی ہے۔ شیشم کے پودے کی شاخیں خوب پھولتی ہیں لیکن شاخیں کس موسم میں کاٹی جاتی ہیں اس کا نئی شاخیں پھوٹنے پر بہت اثر پڑتا ہے۔

براہ راست پودے لگا کر، بیج سے نکلنے والے پودوں کو لگا کر، جڑوں میں سے نکلنے والے پودے لگا کر یا نشوونما کی جڑیں لگا کر مصنوعی ڈھنگ سے شیشم اگانا ممکن ہے۔ تاہم پودگاہوں سے شاخوں والے پودے لے کر خاص طور پر مغربی گھاٹ پر لگانا بہت فائدہ مند ہے۔ ہر حالات میں زمین سے گھاس پھوس اور جڑوں کو صاف کرنا بہت موزوں ہے۔

بیج چھوڑنے والے درختوں کی جسامت، عمر اور حالات کا بیج میں سے پودے نکلنے کی صلاحیت، پودوں کے زندہ رہنے کے امکانات یا ابتدائی پودے کی نشوونما پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہر قسم کے درخت کے بیج اچھے ہوتے ہیں۔ بیج جمع کرنے کا موسم مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ پکی ہوئی پھلیاں عموماً مارچ اپریل میں شاخوں سے توڑ کر دھوپ میں خشک کی جاتی ہیں۔ ان میں بیج نکالا نہیں جاتا بلکہ پھلیاں توڑ کر کاشت کر دی جاتی ہیں۔ بیج کی پھلیاں درختوں سے شاخیں تراش کر اکٹھی کی جاتی ہیں۔

تازہ بیجوں سے پودے پھوٹنے کا تناسب کافی زیادہ رہتا ہے لیکن اگر انہیں ایک برس یا اس سے زیادہ رکھا جائے تو ان کے پھوٹنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اگر بیجوں کو پٹ سن کی بوریوں یا مٹی کے برتنوں میں رکھا جائے تو وہ چھ ماہ تک بہت اچھے رہتے ہیں لیکن ایک برس بعد ان کی قوت جاتی رہتی ہے۔ بیج کاشت کرنے کے سات دن بعد عموماً بیج پھوٹ پڑتا ہے اور 25 دن میں پودا نکل آتا ہے۔

براہ راست کاشت: جہاں موسم خشک ہو وہاں شیشم کی سیدھی کاشت سب سے اچھا طریقہ ہے۔ اس طریقہ میں پھل کے ایک ایک دانے والے ٹکڑے کر لئے جاتے ہیں اور بارشیں شروع ہوتے ہی لگا دئے جاتے ہیں۔ اگر بیج 1.8 میٹر کی باہمی دوری پر لگائے جائیں تو نتائج بہت اچھے نکلتے ہیں۔ ایک ہیکٹر [illegible] کے لئے 27 کلوگرام پھلیاں کافی ہوتی ہیں۔ کامیابی کا انحصار باقاعدگی سے گھاس پھوس کی صفائی اور مٹی کے نرم ہونے پر ہے۔

ڈیرہ دون میں جو تجربے کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ پودے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لگا کر بھی شیشم اگایا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ سے پودے چار برس میں 3 میٹر بلند ہو جاتے ہیں۔ اگر پودے مٹی سمیت اٹھا کر پہلی بارش میں ہی دوسری جگہ لگا دئے جائیں تو 90 فی صد پودے زندہ رہ جاتے ہیں جبکہ سردیوں میں ایک سے دوسری جگہ پودے لگا دینے سے سو فی صد کامیابی ہوتی ہے۔

بہار اور اڑیسہ کے تجربات سے پتہ چلا ہے کہ پودوں کو ایک سے دوسری جگہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ پودا ایک برس کا ہو ورنہ ممکن ہے کہ زمین کی گھاس اور جڑیں اسے کھا جائیں۔ جہاں نمی زیادہ ہو وہاں شیشم کے ڈنڈے لگا کر شجرکاری کرنا بہترین طریقہ ہے۔

نشوونما کی ترقی کی رفتار: قدرتی حالات میں شیشم کی نشوونما کی رفتار شروع میں سست ہوتی ہے اور بعد کے مرحلوں میں بھی اسے تیز نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر بیجوں کی صورت میں پودے لگائے جائیں اور ان کی مناسب دیکھ بھال کی جائے تو بالیدگی کافی تیز ہو سکتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کرنول میں شیشم کے درخت کے تنے کی موٹائی ۱۱۰ برس میں، اور میسور میں 80 برس میں 1.83 میٹر ہو جاتی ہے جب کہ جنوبی گجرات میں 60 برس میں تنا 1.05 میٹر موٹا ہوتا ہے۔ بالیدگی کی شرح خشک کی بجائے نم دار علاقوں میں تیز رہتی ہے۔ شیشم کے تنے کی بیرونی لکڑی زردی مائل سفید ہوتی ہے جبکہ اندرونی قلبی حصے کی لکڑی سرخی مائل بھوری سے گہری سرخ ہوتی ہے جس میں سیاہ ریشے ہوتے

[illegible]

ہوتا ہے اور بعض اوقات بھورا اور سیاہی مائل بھوری بھی ہوتی ہے۔ یہ لکڑی بہت بھاری ہوتی ہے اور اس کا اوسط وزن 3 میٹر کے تخمینے پر 12 فی صد نمی کے ساتھ 5 کلوگرام ہوتا ہے۔ لکڑی جب تازہ ہو تو اس میں ہلکی اور بھینی خوشبو ہوتی ہے۔ للہذا لکڑی یہ بہت مضبوط اور ساگوان سے بہت سخت ہوتی ہے اور برما کے ساگوان کی قدرے زیادہ لچک رکھتی ہے چنانچہ شیشم کی لکڑی بہت سے عمارتی کاموں کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

شیشم کے قلبی حصے کی لکڑی کھلی ہوا میں پانی کے رابطے میں کافی دیر پا رہتی ہے اسے کیڑا لگنے سے بچانے کے لئے کسی کیمیائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تاہم بیرونی پرت کی جلدی خراب ہو جاتی ہے اور اس پر کیڑوں اور دیمک وغیرہ کا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا استعمال کرنے سے پہلے اسے محفوظ کرنے کا عمل کرنا ضروری ہے۔ کیمیائی عمل سے کیمیات اس میں اچھی طرح جذب ہو جاتی ہیں۔

عمدہ ترین لکڑی میں شمار: بھارتی شیشم کی لکڑی سختی کی وجہ سے چیرنی مشکل ہوتی ہے لیکن اسے مشین میں آسانی سے چیرا جا سکتا ہے اور اس کی سطح ہموار کی جا سکتی ہے جس پر پالش ہو سکتی ہے۔ اسے بھاپ دے کر موڑا بھی جا سکتا ہے۔

فرنیچر تیار کرنے کے لئے بھارت کی شیشم کی لکڑی کا شمار دنیا کی بہترین لکڑیوں میں ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھارتی شیشم بہت مقبول ہے جہاں اس سے پیانو کے بکس بنائے جاتے ہیں۔ یہ ایک بیش قیمت آرائشی لکڑی بھی ہے جو نقاشی، پلائی وڈ بنانے اور پتّرے چڑھانے کے لئے بھی بہت موزوں ہے۔ یہ لکڑی خاص طور پر سانچے بنانے، چھپائی کے ٹھپے تیار کرنے، ریاضی آلات اور شکنجے تیار کرنے کے لئے بہت موزوں ہے۔ شیشم کی لکڑی توپ گاڑیوں کے پہیے، اسلحہ کے ڈبے، فوج کے ویگن، پلنگ اور صندوقوں کی آرائشی بگھیاں بنانے کے کام آتی ہے۔ اسے کشتیوں کے تلے، زرعی آلات، کنگھے، استرے کے دستے اور برشوں کے دستے بنانے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ عام عمارتی کاموں کے لئے یہ لکڑی بہت مہنگی رہتی ہے۔ جہاں یہ لکڑی دستیاب ہو وہاں اسے مختلف کاموں کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس کی چھال اور بالائی شاخیں ایندھن کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں۔ پتے چارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کافی کے باغیچوں میں شیشم کے درخت سائے کے لئے لگائے جاتے ہیں۔

باقی ہے

کلیم ضیاء

منچلا فوجی

یوں تو ہر سال میں گرمی کی چھٹیاں گزارنے اپنے آبائی وطن جایا کرتا تھا۔ لیکن اس سال کی طرح کبھی میرے احباب نے میرا خیر مقدم نہیں کیا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ تمام ادبی اور نیم ادبی رسائل اور اخبارات میں میری نظمیں، غزلیں، افسانے اور مضامین کی اشاعت نے ہم وطن لوگوں میں میری قدر و منزلت دوچند کر دی تھی، ہر محفل میں میرا ہی ذکر رہتا۔ میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست بھی منعقد کی گئی جس میں وطن کے مشہور بزرگ شاعر کے علاوہ نوجوان شعراء اور ادباء نے میری کاوشوں کو کافی حد تک سراہا۔ یکے بعد دیگرے کئی مختصر نشستیں ہوئیں، کچھ دوستوں نے میرے فن پاروں کو موضوع سخن بنا کر کئی مضامین بھی لکھے، دعوتوں اور پکنک پارٹیوں کا تانتا سا بندھ گیا، ان تمام سرگرمیوں میں دن پر لگا کر اڑتے گئے۔

باغوں کی فرحت بخش ہوائیں، کھیتوں میں لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں، کنویں اور پنگھٹ پر حسیناؤں کا ہجوم، آزاد فضا، بے فکری اور دوستوں کے ساتھ گزرتے ہوئے پر مذاق لمحے مجھے اسیر کئے ہوئے تھے۔ اس ماحول سے نکل کر دوبارہ بمبئی آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن انسان کا سوچا ہوا اور چاہا ہوا کب پورا ہوتا ہے۔ نوکری کے تار مجھے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ رزق کا خیال تو رزاق کو بھی بھولنے پر مجبور کر دیتا ہے، میں بھلا اپنے جنت نشان وطن کو کیسے چھوڑنا گوارا نہ کرتا۔ لیکن اسکولوں میں وقت سے قبل حاضری نہ دینے پر نوکری چھوٹ جانے کے خدشے نے، بالآخر وطن عزیز چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

سسیر ولنا ریج اور دوستوں کی رفاقت نے ٹکٹ ریزرو Reserve کرنے کی مہلت بھی

شعبۂ اردو، اسمٰعیل یوسف کالج، جوگیشوری (ایسٹ)، بمبئی 400060، مہاراشٹرا

مندی بھیا۔ بہم آمدورفت کے ٹکٹ پر سکنڈ کلاس کے ڈبے میں ہی سفر کرنا پڑا۔ جو لوگ سفر کر چکے ہیں انھیں میری حالت کا بخوبی اندازہ ہوگا، ان مراحل کا بیان کرنا کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ سکنڈ کلاس کے ڈبے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ لہٰذا مجبوراً مجھے نوجیوں کے لئے مخصوص ڈبے میں ریل کے پلیٹ فارم چھوڑنے کے کچھ لمحے پیشتر اسی ڈبے میں کچھ جٹا دھاری سے داخل ہو گئے۔ عزیزوں، رشتے داروں اور احباب سے بچھڑنے کا غم لئے میں ایک کھڑا ہو گیا، الوداعی گاڑی آگئی، گارڈ نے وہسل دی اور ریل گاڑی پلیٹ فارم پر یاس کی تصویر بنے لوگوں کو چھوڑ کر اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہو گئی۔

سرسبز و شاداب کھیت ہرے بھرے باغات مجھ سے جیسے روٹھ گئے تھے تیز رفتاری کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑنے پر تلی ہوئی تھی۔ میرا دل رہ رہ کر دوبارہ آبائی وطن کی ضد کر رہا تھا۔ اس کی حالت اس بچے کی سی ہو گئی تھی جس سے اس کا کھلونا چھین لیا گیا ہو۔ ذہن گذری ہوئی خوش گوار صبحوں اور شاموں کی رنگینی میں گم تھا۔ دوڑتے بھاگتے مناظر ایک ایک احباب کی شکل میری آنکھوں کے سامنے میرا دل چاہتا کہ میں ہر ایک کا نام لے لے کر انھیں پکاروں اور انھیں اپنے پاس بٹھا کر پھر ان سے میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں کروں، دل پر اختیار نہ ذہن پر قابو، کہ بس رکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اچانک نوجیوں کے قہقہوں نے میرے خیالات کا سلسلہ چکنا چور کر دیا۔ میں کسی پاگل کی طرح ان کے چہرے دیکھنے لگا۔ یک بیک مجھے یوں لگا گویا کسی نے مجھے گہری نیند سے جھنجوڑ کر جگا دیا ہو۔ کتنے خوش تھے وہ لوگ، کتنی خوشی تھی اور یہ قہقہے بلا وجہ ہی نشر نہیں ہو رہے تھے بلکہ نوجیوں نے ان سادھوؤں کو تضحیک کا نشانہ بنا لیا تھا جو میری طرح جگہ نہ ملنے کے باعث اسی کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے تھے۔ کبھی ان کے لمبے اور مصنوعی بال زیر بحث آتے، کبھی ماتھے کے لمبے تلک اور گیروے کپڑے، کبھی انگلی کے اشارے سے ایک دوسرے کو ہنسنے پر اکساتے، سادھوؤں کی لمبی زلفوں کو چھیڑتے۔ غرض ان کی تفریح کا سامان مفت ہاتھ آگیا تھا۔ ان نوجیوں کی ان نازیبا حرکات کا بہت دکھ ہوا، ساتھ ہی ساتھ غصہ بھی آیا خود بھی ان کے رحم و کرم پر تھا نہ کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اقدام کر سکتا تھا بس خود ہی خود کر رہ گیا۔ میرے نزدیک یہ تذلیل ان سادھوؤں کی نہیں ہو رہی تھی بلکہ

ذلیل ہوتی تھی جس کے یہ سادھو پابند ہوتے تھے۔ پتہ نہیں یہ جب یہ
شن اور مذہب بیزاری کب انسان کے دل و دماغ سے نکلے گی۔ کب ہم زندگی کو
ب، ذات پات، قوم اور رنگ و نسل کے مہیب غار سے نکل کر صرف اور صرف
انی گلزار میں لہلہاتے ہوئے دیکھیں گے۔

ابھی میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ایک سادھو کی چیخ نے مجھے
جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سادھو کی لمبی چوٹی سلیپر پر بیٹھے
ایک فوجی نے کچھ دیر قبل کھینچ کر دیگر فوجیوں کو ہنسنے کا سامان فراہم کیا تھا، اس فوجی
تھ میں ایک جیبی چاقو تھا جس کی نوک پر سرخ سرخ خون چمک رہا تھا اور یہ خون اس
ھو کے سر سے بہہ رہا تھا جس کو اپنے مذاق کا نشانہ بنا کر فوجی نے زخمی کر دیا تھا۔
ظر کو دیکھ کر دوسرے سادھوؤں نے فوجی نوجوان کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔
جیوں کے قہقہے بلند ہوئے جیسے یہ خون کسی انسان کا نہ ہو کسی جانور کے سر سے
ہو۔ زخمی سادھو نے بے چارگی کے عالم میں اوپر والے کو آواز دے کر اپنی مدد کی
تمنا کی۔ اس کے منہ سے اس فوجی کے لئے سراپ (بددعا) کے الفاظ ادا ہونے
۔ مجھے اس سادھو کے اپنے ہی خون میں رنگے ہوئے چہرے کو دیکھ کر جھرجھری سی
۔ دوسرا سادھو زخمی سادھو کے سر پر راکھ لگانے لگا۔ ابھی فوجیوں کے قہقہوں
یلے ہی تھے کہ کسی اسٹیشن پر ریل رک گئی۔ پلیٹ فارم پر سامان بیچنے والوں
از کچھ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے ڈبوں سے
رورت کی چیزیں خریدنے لگے۔ میں نے بھی گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں اپنا
سمیٹا اور ڈبے سے باہر کود پڑا۔ اب اس منحوس ڈبے میں مزید رکنا میرے بس سے
۔ دوسرے کسی ڈبے میں ہر طرح کی تکلیف برداشت کی جا سکتی تھی مگر ان انسانیت
یات سے پیچھا چھڑانا ضروری تھا۔ میرے ساتھ ان سادھوؤں نے بھی ڈبہ چھوڑ دیا۔
ہمارے پیچھے دو ایک فوجی جوان بھی پلیٹ فارم پر اترے لیکن اب وہ ہم سے
انے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک فوجی نے کچھ پھل خریدے اور اپنے ساتھیوں
۔ بھی لے گئے۔ اسٹیشن بڑا تھا۔ شاید یہاں ریل کو دیر تک رکنا تھا۔ سب لوگ اپنی ضروریات
شیا خریدنے میں مصروف تھے اور فوجی کیلے کھا کر پلیٹ فارم پر پھینکے جا رہے تھے
دفعتاً ایک شخص جلد بازی میں چھلکے پر پھسل جانے سے گر پڑا۔ اس کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر

پہیوں سب کو بھٹنے کا موقع مل گیا۔ وقت گزرتا رہا اور لوگوں کے کام ختم ہو
گئے اور ٹرین نے وصل دی گاڑی چل پڑی۔ دھیرے دھیرے ڈبے آگے
جو لوگ اپنے ڈبوں سے دور رہ گئے تھے وہ بھاگ بھاگ کر اپنے ڈبوں میں چڑھنے
شروع ہو گئے۔ اچانک بھاگتے بھاگتے ایک آدمی کا پیر انھی کیلے کے چھلکوں پر پڑا جو
پھینکے گئے تھے۔ سنبھلتے سنبھلتے بھی وہ شخص اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور تیز
کے بھاگتے ہوئے پہیوں پر جا گرا، کسی نے زنجیر کھینچی، گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ ا
کھینچنے کے بعد بھی رکتے رکتے اس شخص کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے جو پھسل

لوگوں کا ہجوم اس ڈبے کے گرد جمع ہو گیا۔ پولس نے ہجوم کو منتشر کرنے کی
کیا۔ بہر حال جب اس شخص کو اسٹریچر پر لٹایا گیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا
وہی فوجی جوان تھا جس نے کچھ دیر قبل سادھو کو زخمی کر کے ان کا مضحکہ اڑایا تھا
اس کے ٹوٹے پھوٹے اعضاء اس کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔

سلسلہ صفحہ (۲۴)

مہاتما کے لقب کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ صرف مہاتما
کے آلام کو سمجھتا ہے۔
وہ ایک مہاتما سے بھی بلند ایک مکمل انسان تھا۔ وہ ایک کرم
انسانی آنکھ سے ہر آنسو نکالنا چاہتے تھے۔ ان کی ظرافت چھلکا رہے
تھی بلکہ وہ ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھا۔ انتہائی بحران کے موقعوں پر
ہنسا چکی، لندن میں پہلے باضابطہ عشائیہ میں وہ سبزی کے سالن کے بارے
تھے۔ تب ان سے کہا گیا کہ وہ ایک باتہذیب سوسائٹی کے لئے بدسلیقہ ہیں۔
کہا کہ "اگر وہ بہتر سلیقہ نہیں اپنا سکتے تو یہاں سے باہر چلے جائیں اور کسی
ریسٹورنٹ میں کھانا کھالیں اور باہر میرا انتظار کریں۔ گاندھی نے کہا کہ بے حد
بات ہے۔ میں باہر چلا"
گاندھی کبھی خوشی کے موقع پر بھی آنسو بہاتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں جب کہ
کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے تب کستوربا کا دیہانت ہو گیا۔ باپو
تھا۔ باپو ایک مثالی انسان کا تصوری تصور تھے۔ وہ یقیناً ایک انسان ہو
بھی ایک انسان سے زیادہ تھے۔

غزل

سکندر توفیق

…ب عقل کے حباب بہ ہر سو بکھر گئے
بحرِ جنوں میں کتنے جزیرے ابھر گئے

…پہچان پوچھ پوچھ کے خود وقت تھک گیا
آئینے سارے سامنے سے ظلمت اتر گئے

…موئی تھی نگاہ، خسارہ عظیم تھا
شمع، مشعل، چراغ وہ شمس و قمر گئے

…سو ٹھیک نہ پائے تو پلکوں کی آگ تھے
ٹپکے تو خاکِ تیرہ کے تیور سنور گئے

…ب اپنا واقعہ تھے، بہ بانگِ دہل رہے
آئی اجل تو آپ سے اپنے مکر گئے

…نجیاں فریب نہ دھوکا ہی فصل تھا
نابیں کدھر سے ذات کے ذرّے بکھر گئے

…ے زندگی کے ساتھ تو بے سمت و بے جہات
افسانہ بن کے لوگ بہت سے سُدھر گئے

…ا گئے بیان کی سرحد کے بیچ میں
گمنام ماورائے گرفتِ نظر گئے

…یا ہو کے مٹے ہو، دودھ ہو پانی کہ آگ ہو
پیلے وہی جو پیاس سے خود اپنی بھر گئے

…ں ہے دل میں یاد کی بھینی مہک تو کیا
مرجھائے خواب آنکھوں میں، یہ مدِ نظر گئے

…سرہ نما ہیں رو بہ فروشانِ بے خروش
لے کر دوکانِ شیشہ گراں سے ہنر گئے

…ازِ آرزوئے نشیمن کا ذکر سن
باہر قفس سے ٹوٹے ہوئے بال و پر گئے

ڈالا تھا کیا پڑاؤ شبستاں کے بیچ میں
صبح ہوئی قریب تو ناچار گھر گئے

بیت الثمین - تلک نگر - حیدرآباد ۴۴

محمد منیر (منیر حیدرآبادی)

جب رُخِ یار نظر آتا ہے
شمس بے کار نظر آتا ہے

جب جنوں حد سے گزر جاتا ہے
ہر طرف یار نظر آتا ہے

جن کو جلوہ نہیں اک بار نصیب
ہم کو سو بار نظر آتا ہے

ایک لمحے کی خوشی کے پیچھے
غم کا انبار نظر آتا ہے

جو وفا ساتھ نبھانے کو کہا
دست بردار نظر آتا ہے

دل کی دھڑکن تو یہ کہتی ہے منیر
منتظر یار نظر آتا ہے

16-9-297 …

فارسی غزل

مولانا شمس الدین محمد حافظ شیرازی

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
اگر وہ شیرازی معشوق، ہمارا دل تھام لے
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
تو اس کے دلفریب تل کے عوض میں سمرقند و بخارا بخش دوں

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
اے ساقی باقی شراب بھی دیدے، اسلئے کہ تو جنت میں نہ پاسکے گا
کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ را
رکنا باد کی نہر کا کنارا، اور مصلیٰ کی سیرگاہ

فغاں کیں لولیانِ شوخِ شیریں کارِ شہر آشوب
فریاد کہ یہ شریر، شیریں کار شہر کو فتنہ میں مبتلا کرنیوالے معشوق
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را
دل سے صبر کو اس طرح لوٹ لے گئے جیسا کہ ترک مالِ غنیمت کے خوان کو

ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی ست
ہمارے ناقص عشق سے، یار کا حسن بے نیاز ہے
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
حسین چہرے کو آب و رنگ اور تل اور خط کی کیا ضرورت ہے

من از آں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
میں اس روز بروز بڑھنے والے حسن سے جو کہ یوسف رکھتے تھے جان گیا
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را
کہ عشق زلیخا کو، پاکی کے پردے سے باہر نکال لائے گا

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
گوئیے اور شراب کی بات کر، اور زمانہ کا راز کم تلاش کر
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را
اس لیے کہ دانائی سے کسی نے یہ معمہ کھولا ہے نہ وہ کھولے

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
پیارے نصیحت سن لے۔ اس لئے کہ جان سے زیادہ پیارا رکھتے ہیں
جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را
سعادتمند نوجوان، بوڑھے سمجھدار کی نصیحت کو

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں خدا تجھے معاف کرے تو نے اچھا کہا
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را
لعل جیسے شکر چبانے والے ہونٹوں کو کڑوا جواب زیب دیتا ہے

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخواں حافظ
اے حافظ تو نے غزل کہی اور موتی پروئے آ اور خوش الحانی سے پڑھ
کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریا را
اس لیے کہ آسمان تیری نظم پر ثریا کے ہار نچھاور کرے گا

اردو ترجمہ: مولانا قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

---

۱ یوسف کا روز افزوں حسن ہی زلیخا کی بدنامی کا سبب بنا۔ ۲ میدانِ عشق و محبت میں دیوانگی درکار ہے نہ کہ عقل و دانش۔ ۳ محبوب کی تلخ کلامی باعثِ لذت ہے۔

مولوی احتشام الدین حقی

منظوم ترجمہ غزل حافظ

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا

سنبھال اے ترک شیرازی پھرے یہ دل نہ یوں مارا
سمرقند و بخارا خال کا فر پر ترے وارا
نصیحت مان لے پیارے کہا دانا بزرگوں کا
سعادتمند جواں رکھتے ہیں جی او رجان سے پیارا
پلا ساقی مے باقی کہ جنت میں نہ پائیں گے
مصلے اور رکنا باد کی یہ سیر و نظارا
گرے دل چھیننے کو یہ حسیں آفت کے پرکالے
کہ لوٹے خوان یغما لوٹنے پر ترک یکبارا
جمالِ یار مستغنی ہے ایسی ادھی الفت سے
نہیں محتاج رنگ و خال وخط وہ حسن خود آرا
کبھی دیتی ہے دن دونی ترقی حسن یوسف کی
کہ ہوگا پردۂ شرم زلیخا عشق میں یارا
سرود و مطرب و مے ہو، یہ رازِ دہر مت بوجھو
بہ حکمت کھل چکا عقدہ یہ کھولا جس نے وہ ہارا
دیا دشنام، میٹھا کر دیا منہ واہ کیا کہنا
جواب تلخ ان ہونٹوں سے؟ لب ہیں یا شکر پارا
پروئے ہیں جو موتی آبِ لحن خود سنا حافظ
فلک اس نظم پر عقد ثریا وار دے سارا

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

مکتبہ شاداب

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی جامعاتی تعلیمی نصاب کے لئے مطبوعہ کتـ

کتاب	مصنف	مترجم
۱۔ مباحث مشرقیہ جلد اول حصہ اول و دوم	مصنفہ امام فخرالدین محمد ابن عمر رازی	مترجمہ حکیم سید عبدالباقی شـ
۲۔ جمہوریہ افلاطون	انگریزی مترجم بنجامن ڈیوس و ڈیوڈ جیمس وغیرہ	؍؍ مرزا محمد ہادی
۳۔ اخلاق نقوماخیس (ارسطاطالیس)	انگریزی مترجم ے ای سی ویلڈان	؍؍ ؍؍
۴۔ اصول نفسیات (جلد اول دوم سوم)	مصنفہ سر ولیم جیمس	؍؍ ؍؍ مولوی احسان ا
۵۔ طوق اور تفکرات	؍؍ میجر جنرل سر جان میلکم	؍؍ قاضی تلمذ حسین و میر محمو
۶۔ نفسیات عضوی	؍؍ پروفیسر ولیم میگڈوگل	؍؍ معتقد ولی الرحمٰن
۷۔ تاریخ فلسفۂ جدید اول و دوم	؍؍ ڈاکٹر ہیرالڈ ہوفڈنگ (جرمن)	؍؍ خلیفہ عبدالحکیم
۸۔ تاریخ سلطنت روما	؍؍ جے۔ بی۔ بیوری	؍؍ سید ہاشمی فریدآ
۹۔ توازن قوت یعنی تاریخ یورپ	؍؍ آرتھر حسیال	؍؍ حمید احمد انصاری
۱۰۔ شخصی قانون بین الاقوام	؍؍ جان ویسٹلیک	؍؍ مسعود علی علیگ
۱۱۔ نظریات سیاسیہ	؍؍ ولیم آرچیبالڈ ڈننگ	؍؍ قاضی تلمذ حسین و ڈاکٹر ہـ
۱۲۔ جغرافیہ عالم اول و دوم	؍؍ ای مارسڈن و ٹی آلفورڈ سمتھ	؍؍ سید ہاشمی فریدآباد
۱۳۔ قانون و رواج ہنود	؍؍ جان ڈی مین	؍؍ اکبر علی موسوی
۱۴۔ ہند کی معاشی حالت (اکبر کی وفات کے وقت)	؍؍ ڈبلیو ایچ مورلینڈ	؍؍ محمد حبیب الرحمٰن
۱۵۔ تاریخ وسط ہند (جلد اول و دوم)	؍؍ میجر جنرل سر جان میلکم	؍؍ قاضی تلمذ حسین و میر محمو
۱۶۔ رولرز آف انڈیا (مادھوجی سندھیا)	؍؍ ایچ۔ جی۔ کین	؍؍ حکیم سید محمد عبدالسـ
۱۷۔ ؍؍ ؍؍ (مارکوئس آف ڈلہوزی)	؍؍ سر ولیم ولسن ہنٹر	؍؍ سید محمد احمد دہلوی
۱۸۔ ؍؍ ؍؍ (مارکوئس کارنوالس)	؍؍ ڈبلیو ایس سیٹن کار	؍؍ محمد عبدالستار
۱۹۔ ؍؍ ؍؍ (مارکوئس ویلزلی)	؍؍ ڈبلیو ایچ ہٹن	؍؍ محمود شوکت دہلوی

یہ اور ایسی کئی نادر کتب مکتبۂ شاداب میں موجود ہیں۔ خواہشمند حضرات ربط پیدا کریں

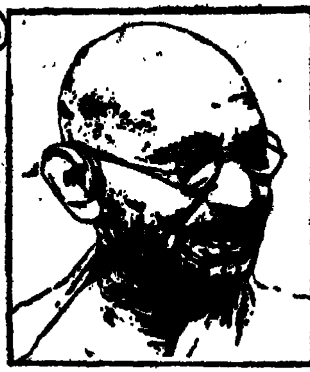
Telephone [illegible]

No. 37 979/84. Postal Regd. No. H/HD 993

Monthly SHADAAB Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-500 004. A. P.

Vol. 4 No. 12 DECEMBER 1987



[illegible]

سمندر کی بوندوں کی طرح ایک رہئے۔



Price Rs. 5/